محمد اسد

ایک یورپین بدوی

سوانح حیات، تصنیفات
مطالعات اور تبصرے

ترتیب و تدوین
محمد اکرام چغتائی

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

Marfat.com

Marfat.com

محمد اسد

ایک یورپین بدوی

(سوانح حیات، تصنیفات، مطالعات اور تبصرے)

ترتیب و تدوین

محمد اکرام چغتائی

پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی

70، شاہراہِ قائدِ اعظم، لاہور

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

138222

ISBN - 978-969-8460-11-2

طبع اول	2009
تعداد	500
ترتیب و تدوین	محمد اکرام چغتائی
سرورق	محمد جاوید
قیمت	600.00

ناشر

پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی

70-شاہراہِ قائدِاعظم-لاہور

تقسیم کار

کوآپرا بک سنٹر اینڈ آرٹ گیلری

70-شاہراہِ قائدِاعظم-لاہور

فون: 042-7321161, 7322926

طابع: مکتبہ جدید پریس، لاہور

Marfat.com

محمد اسد (۱۹۰۰ء-۱۹۹۲ء) کی بیگمات

عزیزہ (سابقہ ایلسا، م-۱۹۲۷ء)

منیرہ بنت حسین (م-۱۹۷۸ء)

پولا حمیدہ اسد (م-۲۰۰۷ء)

کے نام

Marfat.com

Muhammad Asad (1929)

Marfat.com

فہرستِ مندرجات

دیباچہ		7

سوانح

1- اپنے بارے میں	محمد اسد (مترجم: محمد الحسن الحسنی)	13
2- محمد اسد صاحب (سابق لیوپولڈوائس) کے حالات زندگی	ڈاکٹر ایچ۔بی۔خاں	75

تصانیف (تراجم)

3- شاہ راہِ مکہ (تلخیص وتبصرہ)	عبدالحمید صدیقی	112
4- شاہراہِ مکہ	ڈاکٹر ایچ۔بی۔خاں	144
5- سفرنامۂ اسد	مولانا ابوالحسن ندوی	149
6- محمد اسد--شمال مغربی اسپین (۱۹۲۷ء)	مائیکل وُلف (مترجم: ڈاکٹر تصدق حسین راجا)	165
7- روحِ سنت	محمد اسد (مترجم: محمد حنیف ندوی)	185
8- اسلام--دوراہے پر	محمد اسد (مترجم: عبدالعزیز خالد)	195
9- مغرب کی روح	محمد اسد (مترجم: ڈاکٹر محجوب سبحانی)	204
10- صلیبی جنگوں کا سایہ	محمد اسد (مترجم: طاہر منصور فاروقی)	214
11- اسلام کے متعلق مغربی رویہ	محمد اسد (مترجم: ڈاکٹر محجوب سبحانی)	222
12- مغرب کی نقالی کیوں؟	محمد اسد (مترجم: ایضاً)	224
13- کچھ تقلید کے بارے میں	محمد اسد (مترجم: محمد جمیل احمد)	228
14- عرفات	محمد اسد (مترجم: محکمہ احیاء ملت اسلامیہ، لاہور)	239
15- احیائے ملت اسلامیہ	محمد اسد (مترجم: ایضاً)	243

Marfat.com

16- اصول دستورِ اسلامی	محمد اسد (مترجم: ایضاً)	252
17- ہم پاکستان کیوں بنانا چاہتے ہیں؟	محمد اسد (مترجم: سید قاسم محمود)	292
18- اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول	محمد اسد	309
19- پیش نظر مسئلہ-اسلامی ریاست کیوں؟	محمد اسد (مترجم: غلام رسول مہر)	312
20- مملکت وحکومت کے بنیادی اصول	پروفیسر گرونے باؤم (مترجم: ایضاً)	334
21- شہری اور حکومت	محمد اسد (مترجم: حیدر علی مولجی طہٰ)	337
22- پاکستان اور شریعت اسلام	منور علی	353
23- اسلامی ریاست میں سیاسی ڈھانچہ	ضیاء شاہد	357
24- اسلام کیا کہتا ہے؟	محمد اسد (مترجم: سید قاسم محمود)	361

تنقید وتبصرہ

25- اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول	ادارہ نقطہ نظر، اسلام آباد	385
26- اسلامی ریاست اور مسلم طرز حکومت	محمد شبیر قمر	392

مطالعات

27- محمد اسد	سید سلیمان ندوی	394
28- اسلام اور تعینِ راہ کی کشمکش	محمد عزیر	396
29- علامہ محمد اسد	محمد اسحاق بھٹی	411
30- محمد اسد بطور ترجمان وشارح حدیث	محمد ارشد	428
31- علامہ محمد اسد اور علامہ محمد اقبال	کلیم اختر	449
32- اسلام اور مغرب	محمد ارشد	458
33- علامہ محمد اسد اور پنجاب یونیورسٹی-وصل وفصل	ڈاکٹر زاہد منیر عامر	522
34- محمد اسد	سید اشفاق حسین	541

اظہارِ رائے

35- محمد اسد: قیمتی ہیرا	پروفیسر خورشید احمد	549
36- اسد کا قصہ طولانی ہے لیکن مختصر یہ ہے	ڈاکٹر تحسین فراقی	558

Marfat.com

دیباچہ

نومسلم محمد اسد (سابق لیوپولڈ وائس) بیسویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں آسٹرو ہنگیرین ایمپائر کے ایک دور افتادہ علاقہ میں پیدا ہوئے اور طویل عمر پا کر اسی صدی کی آخری دہائی میں سپین کے ایک چھوٹے سے شہر میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے (۱۹۹۲ء)۔ یوں دیکھیں تو محمد اسد کی ذات قریب قریب پوری ایک صدی کا آئینہ ہے، جس میں اس دور کے نمایاں فکری رجحانات، علمی سطح پر مشرق و مغرب کی آویزش اور ان کے تہذیبی بُعد کو کم کرنے کی مختلف النوع کوششوں، دنیائے اسلام کو درپیش گوناگوں مسائل اور مروجہ سیاسی میلانات کی جھلک منعکس ہے۔

محمد اسد یہودیوں کے ایک جانے پہچانے مبلغ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اسی ماحول میں ان کی چشم شعور وا ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ویانا یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر تلاش روزگار میں سرگرداں رہے۔ بالآخر خاصی تگ و دو کے بعد انہیں جرمنی کے ایک اخبار میں ملازمت مل گئی اور وہ اس کے نامہ نگار کی حیثیت سے مشرق وسطیٰ کے بلاد اسلامیہ کے حالات حاضرہ کے متعلق تجزیاتی رپورٹیں بھجوانے نکل کھڑے ہوئے۔ برسوں وہ فلسطین سے افغانستان تک اپنے فرائض منصبی انتہائی ذمہ داری اور دیانتداری سے ادا کرتے رہے۔ ان کی ارسال کردہ روداودں کا کچھ حصہ کتابی صورت میں منظر عام پر آ گیا، جس کے سرسری مطالعہ ہی سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ انہوں نے ان اسلامی ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کا کس قدر باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔ اپنی صحافتی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اس شب و روز کی ''بادیہ پیمائی'' نے انہیں مسلمانوں کی عمومی زندگی سے تو آشنا کر دیا، لیکن ابھی وہ امن و سلامتی کے دین یعنی اسلام کی اصل روح تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ بہر حال ان اسفار نے ان کے قلب میں نرمی اور گداز پیدا کر دیا اور انہوں نے جب اُم الکتاب یعنی قرآن حکیم کا بنظر غائر مطالعہ کیا تو انہیں دائرۂ اسلام میں داخل ہونے میں کسی ذہنی یا جذباتی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس تبدیلیٔ دین سے ان کے تمام خاندانی رشتے ناطے ٹوٹ گئے، لیکن انہوں نے اس کی ذرہ بھر پرواہ نہ کی اور اپنی نومسلم جرمن بیوی اور اس کے معصوم بچے کو لے کر حرمین شریفین کی جانب چل پڑے۔ مکہ پہنچتے ہی جرمن بیوی بھی داغ مفارقت دے گئی، لیکن انہوں نے پامردی سے ہر طرح کے نامساعد حالات کا مقابلہ کیا اور سعودی عرب میں اپنے پانچ سالہ قیام (۱۹۲۷ء-۱۹۳۲ء) کے دوران میں انہیں وہ سب کچھ ملا، جس کی ایک انسان خواہش کر سکتا ہے۔ سب سے بڑی تو ایمان کی دولت تھی اور جو

Marfat.com

پروردگار نے انہیں فراوانی سے عطا کر دی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی اس پروردگار نے انہیں ایک سیلانی روح بھی دے رکھی تھی، جو انہیں کہیں جم کر بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ کسی پرانے سفر میں ایک عمر رسیدہ کردستانی شخص نے انہیں کہا تھا کہ ''اگر پانی بے حرکت جوہڑوں میں کھڑا رہے تو یہ گندہ، کیچڑ سے لت پت اور بدبودار ہو جاتا ہے۔ اگر بہتا رہے تو یہ پاک صاف رہتا ہے۔'' یہ بات اسد کی سیلانی روح کو وقفے وقفے سے کچوکے دیتی رہی اور بالآخر وہ اپنی عرب بیوی اور شیر خوار بچے کو لے کر چین، مشرقی ترکستان وغیرہ کی سیاحت کو چل پڑے۔ اس طویل سفر کا پہلا پڑاؤ ہندوستان تھا۔ خوش قسمتی سے یہاں ان کی ملاقات علامہ محمد اقبال سے ہوگئی، جنہوں نے اپنی چشم بینا سے اس نومسلم اور نووارد کے قلب و ذہن میں پوشیدہ فطری جوہر کو پہچان لیا اور اسے ایک ایسی راہ سجھائی، جو اس کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ اقبال کے مخلصانہ مشورے کا فوری اثر یہ ہوا کہ اسد جن ممالک کی سیاحت کے لیے رخت سفر باندھ کر چلے تھے، وہ کہیں کونے ہی میں پڑا رہ گیا اور انہوں نے اپنے تمام قوائے ذہنی و باطنی دین اسلام کی خدمت اور اپنے خیر خواہ یعنی اقبال کے خواب کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے وقف کر دیئے۔

بقول مولانا مودودی ''......دور جدید میں اسلام کو جتنے غنائم یورپ سے ملے ہیں' ان میں یہ [یعنی محمد اسد] سب سے زیادہ قیمتی ہیرا ہے'' اور اس ہیرے کو جس جوہری نے سب سے پہلے پہچانا، وہ علامہ اقبال تھے۔ جب اسد نے برصغیر ہی میں مستقل قیام کا فیصلہ کر لیا تو اقبال کو ان کے لیے کوئی ڈھب کی ملازمت تلاش کرنے کی فکر دامنگیر ہوئی۔ انہوں نے مقدور بھر کوشش کی کہ انہیں اسلامیہ کالج (لاہور) کے شعبہ اسلامیات کا سربراہ مقرر کر دیا جائے، لیکن وہ بعض وجوہ کے سبب کامیاب نہ ہو سکے۔ ابتدائی ملاقاتوں میں اقبال نے اسد کو صحیح بخاری کے انگریزی ترجمہ و تشریح کی تجویز پیش کی، جس کو اسد نے قبول کرتے ہوئے اس کو ایک بڑے منصوبے کی حیثیت سے شروع کر دیا۔ صحاح ستہ کے کسی مجموعہ احادیث کو انگریزی میں منتقل کرنے کی یہ اولیں کوشش تھی۔ ترجمے کے علاوہ اس کے طباعتی اخراجات کے لیے اقبال نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا اور اکبر حیدری کے توسط سے نظام دکن سے خاصی معقول رقم کا بندوبست ہو گیا۔ اس کے بعد ترجمہ وطباعت کے مراحل بلا رکاوٹ تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگے۔ انہی دنوں علامہ اقبال کی تجویز پر دارالسلام (جمال پور' پٹھانکوٹ) کے قیام کا مسئلہ زیر غور تھا اور اقبال چاہتے تھے کہ ان کے اس brain-child کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اسد ہی کو سونپی جائے، لیکن حیدر آباد دکن کے انگریزی سہ ماہی مجلہ ''اسلامک کلچر'' کا مدیر مقرر ہونے کی وجہ سے انہیں اقبال سے معذرت کرنا پڑی، چنانچہ مولانا مودودی کو اس عہدے کے لیے نامزد کر دیا گیا۔ روز بروز بڑھتی ہوئی علالت کے باعث اقبال جمال پور میں قائم ہونے والے ادارے کے لیے زیادہ فعال کردار ادا نہ کر سکے، لیکن اسد کی مشاورت اور اولیں رکن ہونے کی حیثیت سے ان کے بھرپور تعاون نے یہ کمی محسوس نہ ہونے دی۔ وہ جب بھی اقبال سے ملتے، اس ادارے کے حوالے سے ہونے والی پیش رفت سے انہیں مطلع کرتے۔ ساتھ ساتھ لاہور میں مقیم جرمن ڈاکٹروں سے اقبال کا علاج بھی کراتے رہے، لیکن ایک روز اپنے ہی قائم کردہ پریس میں مصروف کار تھے کہ انہیں اقبال کے انتقال پُر ملال کی خبر ملی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے گرد

Marfat.com

تاریکی کے بادل چھا گئے ہوں۔

محمد اسد اپنی ایک غیر مطبوعہ تحریر میں لکھتے ہیں کہ یہ اندوہناک خبر سنتے ہی جونہی وہ اقبال منزل پہنچے تو

''اقبال آنکھیں موندے بستر پر سیدھے لیٹے تھے۔ان کے چہرے پر مکمل آسودگی کے آثار نمایاں تھے۔یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی گہری فکر میں غلطاں ہیں۔ان کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا اور مجھے ذاتی طور پر یوں لگا جیسے وہ کسی وقت بھی اپنی آنکھیں کھولیں گے اور کہیں گے کہ 'میں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔' اقبال پہلے شخص ہیں جنہوں نے غیر مبہم سیاسی اصطلاحات میں شمالی ہند میں پاکستان کے نام سے ایک علیحدہ مسلم ریاست کا تصور پیش کیا اور پھر عمر بھر اپنے ہی بنائے ہوئے خاکے میں رنگ بھرتے رہے۔''

اسد، اقبال کے جنازہ کے ساتھ چلتے ہوئے بادشاہی مسجد پہنچے، نماز جنازہ ادا کی اور اقبال کے جسد خاکی کو لحد میں اتارنے تک وہیں افسردہ کھڑے رہے۔اپنی اسی غیر مطبوعہ تحریر میں وہ رقمطراز ہیں:

''جب بھی میں لاہور آتا، ڈاکٹر محمد اقبال سے ملنے ضرور جاتا۔ان ملاقاتوں میں پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے امکانات پر گھنٹوں بحث ہوتی تھی۔ہم دونوں اس نئی اسلامی مملکت کے قیام کے پُرجوش حامی تھے۔اقبال ان مسائل سے کماحقہٗ آگاہ تھے، جن سے اس نوزائیدہ ملک کو نبرد آزما ہونا تھا۔اقبال اپنے ایام جوانی میں اور حصول تعلیم کے زمانہ میں ایک جوشیلے قوم پرست جیسے جذبات رکھتے تھے۔اس دور میں انہوں نے ''ہندوستان ہمارا'' جیسی جوشیلی نظم قلم بند کی تھی، جو اس وقت سے اب تک مقبول قومی ترانہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔اسی اثناء میں اقبال اپنے قوم پرستانہ تصورات سے کنارہ کش ہو گئے اور ماورائے قومیت پر مبنی امت مسلمہ کے تصور کو اپنے اندر جذب کر لیا۔بعد میں ان کا یہی شدید جذبہ پاکستان کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا۔کیونکہ میرے ذاتی نظریات اور رجحانات بھی یکساں تھے، اس لیے ہم دیر تک ایسے لائحہ عمل پر گفتگو کرتے رہتے جو مستقبل میں قائم ہونے والی اس مملکت کے انتظام و انصرام کے لیے ضروری سمجھے جاتے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ ہمارے مابین یہ موضوع بھی زیر بحث رہتا تھا کہ کسی طرح اپنے سیاسی رہنماؤں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ کھل کر مشترکہ مؤقف کی حمایت کریں۔میں نے بہت سے ایسے مضامین سپرد قلم کئے جن میں یہ صراحت کی گئی کہ پاکستان کیوں ناگزیر ہے۔میری یہ تمام تحریریں یورپ کے مختلف رسائل و اخبارات میں شائع ہوئیں۔ان میں سے بعض کا اردو ترجمہ لاہور کے ایک مقبول روزنامہ میں بھی شائع ہوا۔علاوہ ازیں میں نے اس موضوع پر لاہور اور دہلی کے علمی اجتماعات میں کئی لیکچر بھی دیئے۔''

Marfat.com

اقبال تو اس دارفانی سے رخصت ہو گئے، لیکن انہوں نے اسد کو جو راہ سجھا دی تھی، ایک تلمیذ رشید کی طرح وہ اس پر گامزن رہے۔ اقبال کی فرمائش پر انہوں نے صحیح بخاری کا جو انگریزی ترجمہ شروع کیا تھا، وہ اسی کو آگے بڑھانے میں مصروف رہے۔ ان کا ارادہ اسے چالیس حصوں میں مکمل کرنے کا تھا، لیکن ابھی اس کے پانچ حصے ہی اشاعت پذیر ہوئے تھے کہ دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور انہیں گرفتار کر کے ہندوستان میں مقیم ہزاروں جرمن اور اطالوی قیدیوں کے کیمپ میں نظر بند کر دیا گیا (یکم ستمبر ۱۹۳۹ء)۔ ان کے نجی پریس کو تالا لگا دیا گیا۔ صحیح بخاری کے ترجمہ کے مسودات وہیں پڑے رہے۔ بیوی اور بیٹے نے چودھری نیاز علی خاں کے گھر پناہ لی۔ وہ برسوں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے اور ان ایام اسیری میں وہ کوئی علمی کام نہ کر سکے۔ طویل نظر بندی کے بعد جب انہیں رہا کیا گیا (۱۴- اگست ۱۹۴۵ء) تو ہندوستان کا سارا منظر نامہ ہی تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ چاہتے تو صحیح بخاری کے ادھورے کام کو دوبارہ شروع کر سکتے تھے، لیکن اب حالات کچھ ایسا رخ اختیار کر چکے تھے کہ انہوں نے اس منصوبے کو مؤخر کر دیا اور اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے جس علیحدہ مملکت کا خواب دیکھا تھا، اس کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وہ بمبئی کے قریب واقع نظر بندوں کے کیمپ سے رہا ہوتے ہی سیدھے ڈلہوزی (موجودہ ہماچل پردیش، بھارت) پہنچے اور آتے ہی ''عرفات'' کے نام سے سہ ماہی انگریزی مجلّہ کا اجراء کیا۔ ستمبر ۱۹۴۶ء تا جولائی ۱۹۴۷ء اس کے نو شمارے شائع ہوئے۔ ان میں جو مضامین چھپے وہ تقریباً سبھی اسد ہی کے تحریر کردہ ہیں۔ ان مضامین کے سرسری مطالعہ ہی سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اقبال نے اسد کو جس منزل کی نشاندہی کی تھی، وہ انہیں اب بالکل سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تحریک پاکستان کے عمیق تجزیے کے بعد اسد کو یقین ہو گیا تھا کہ مسلمان حریت پسندوں کا یہ قافلہ آسودۂ منزل ہونے والا ہے، چنانچہ وہ ہر طرح کی دنیاوی ترغیبات سے ہٹ کر ایک مخلص کارکن کی حیثیت سے اس تحریک کے فکری اور نظریاتی محاذ پر سرگرم عمل ہو گئے۔ مزید یہ کہ انہوں نے اس مجلّہ کا جو نام رکھا یعنی ''عرفات'' اس میں بھی اقبال کی سوچ کارفرما ہے یعنی اتحاد بین المسلمین یا ''پاسبانی حرم'' کے لیے کرۂ ارض پر بسنے والے تمام مسلمانوں کا یکجا ہونا۔ ان کی نظر میں یہ صرف ایسا وسیع و عریض میدان نہیں ہے، جہاں حجاج کرام اکٹھے ہوتے ہیں، بلکہ یہ ایک علامت ہے، پوری دنیا کے مسلمانوں کی باہمی اخوت، بھائی چارے، یگانگت اور ایک جگہ اکٹھے رہنے کی۔

ڈلہوزی سے ''عرفات'' کا نواں اور آخری شمارہ جولائی ۱۹۴۷ء میں طبع ہوا۔ اس سے اگلا شمارہ چھپنے کی نوبت ہی نہیں آئی، کیونکہ اس کے ایک مہینہ بعد پاکستان معرض وجود میں آ گیا اور اسد اپنے دیرینہ دوست مولانا مودودی، ان کے چند رفقا اور دیگر ساتھیوں کو بذریعہ ٹرک جمال پور، پٹھانکوٹ سے بحفاظت لاہور لے آئے۔ یہاں پہنچتے ہی انہوں نے نجی سطح پر اور پھر حکومت پنجاب (پاکستان) کے قائم کردہ محکمہ احیاء ملت اسلامیہ کے سربراہ کی حیثیت سے نئی اسلامی مملکت کے دینی، نظریاتی اور آئینی تقاضوں کو پورا کرنے پر فوری توجہ دی۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں انہوں نے ریڈیو پاکستان (لاہور) سے جو سات تقریریں نشر کیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ استحکام پاکستان کے لیے کن

Marfat.com

عوامل کولازمی قرار دیتے ہیں۔ اپنے محکمہ سے انہوں نے جس مجلّہ کا اجراء کیا، اس کا نام بھی ''عرفات'' رکھا۔ اس کا ایک ہی شمارہ شائع ہوا اور اس میں بھی انہوں نے آئین سازی پر ایک طویل اور فکر انگیز مقالہ لکھا، جس میں ایک نئے اسلامی ملک کی بنیادی دستاویز یعنی آئین کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے ہم اس خاکے میں رنگ نہ بھر سکے اور برسوں یہ سرزمین بے آئین رہی، حالانکہ اسد چاہتے تھے کہ اس اہم مسئلہ کو ایک ڈیڑھ برس میں نپٹا دیا جائے۔

محمد اسد اگر مذکورہ بالا محکمہ میں کچھ دیر اور سربراہ رہتے تو شاید یہ کام بھی کر جاتے، لیکن پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے انہیں فوراً وزارت خارجہ میں ایک اہم عہدے پر تعینات کر دیا اور پھر انہیں اقوام متحدہ بطور مختار کل سفارت کار امریکہ بھجوا دیا گیا۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ وزارت خارجہ میں ملازم ہونے تک اسد کے پاس ان کے آبائی ملک یعنی آسٹریا کا پاسپورٹ تھا، لیکن جب انہیں ایک سرکاری وفد میں نمائندہ پاکستان کی حیثیت سے ایک اہم ذمہ داری سونپ کر مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک بھجوایا جانے لگا، تو انہوں نے اپنے افسران بالا کو متوجہ کیا کہ ان کے پاس ابھی تک آسٹرین پاسپورٹ ہے اور انہیں یہ عجیب سا محسوس ہوتا ہے کہ اس پاسپورٹ پر پاکستان کی نمائندگی کی جائے۔ چنانچہ لیاقت علی خاں کی خصوصی ہدایت پر انہیں جو پاسپورٹ جاری کیا گیا، اس پر پاکستانی شہری درج تھا اور یہ پہلا پاسپورٹ تھا جو تشکیل پاکستان کے بعد کسی شہری کو دیا گیا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اسد پہلے شخص ہیں، جن کو پاکستانی پاسپورٹ جاری ہوا اور انہوں نے بھی اس کی یوں قدر کی کہ مرتے دم تک اپنی اس پاکستانی شہریت سے دستبردار نہیں ہوئے۔

وزارت خارجہ میں ایک اعلیٰ افسر کی حیثیت سے انہوں نے نوزائیدہ مملکت پاکستان کے دیگر اسلامی ممالک بالخصوص سعودی عرب سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے میں جو خدمات سرانجام دیں، وہ لائق صد تحسین ہیں۔ افسوس کہ وہ زیادہ دیر تک اس ملک سے اپنے سرکاری تعلق کو برقرار نہ رکھ سکے۔ ان کے اردگرد سازشوں اور بے بنیاد افواہوں کا ایک ایسا جال بچھا دیا گیا، کہ اس سے رہائی کے لیے ان کے پاس سوائے مستعفی ہونے کے اور کوئی متبادل راستہ نہ رہا۔ رہی سہی کسر پنجاب یونیورسٹی کے ارباب بست وکشاد نے پوری کر دی، جن کی دعوت پر وہ لاہور میں ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے انعقاد کے لیے پون برس انتھک محنت کرتے رہے اور ان کی امریکی بیوی پولا حمیدہ اسد (م-۲۰۰۷ء) بطور سیکریٹری ان کے ساتھ بلاتنخواہ کام کرتی رہی۔ تعجب ہے کہ جب تمام انتظامات مکمل ہو گئے اور مختلف ممالک کے مدعوئین کو ہوائی ٹکٹ بھی ارسال کر دیئے گئے تو انہیں بیگم سمیت استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ جب اس کانفرنس کی روداد اور پیش کردہ مقالات کتابی صورت میں شائع ہوئے (۱۹۶۰ء) تو اس میں محمد اسد کا کہیں نام تک موجود نہیں۔ ان کے محبوب ترین ملک یعنی پاکستان کے اس ''طرز سلوک'' نے انہیں چونکا تو دیا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی آرزوؤں کے اس مسکن سے ایام جوانی میں جو جذباتی تعلق قائم کیا تھا، اس میں فرق نہیں آنے دیا۔ ادھر سے وقفے وقفے سے گرم ہوائیں تو چلتی رہیں، لیکن اسد نے ان کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اس خطے سے اپنی محبت کی شمع کو روشن رکھا۔ دیکھا جائے تو وہ حقیقی معنوں میں محسن پاکستان تھے اور انہیں بلاشبہ Intellectual

Marfat.com

founder of Pakistan کہا جاسکتا ہے۔

پولا حمیدہ اسد اپنی ایک غیر مطبوعہ تحریر میں لکھتی ہیں:

''انہیں [یعنی اسد کو] پاکستان دل و جان سے عزیز تھا۔ وہ تصور پاکستان سے محبت کرتے تھے، حالانکہ اس ملک نے ان کے ساتھ معاندانہ رویہ اپنایا، لیکن وہ کبھی اس طرز سلوک کے شاکی نہیں رہے۔ وہ پاکستان کے پہلے شہری تھے اور آخر عمر تک انہوں نے پاکستان کے ساتھ اس گہرے تعلق کو قائم و دائم رکھا۔''

پاکستان کے علاوہ محمد اسد اگر کسی اور ملک سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے تو وہ سعودی عرب تھا۔ کیونکہ بقول پولا صاحبہ ''پاکستان سے ان کی محبت کا تعلق دماغ سے تھا اور سعودی عرب سے دل کا۔'' ان کی بہت سی یادیں اس ارض پاک سے جڑی ہوئی تھیں۔ ان کی پہلی نومسلم جرمن بیوی کا مکہ میں انتقال ہوا (۱۹۲۷ء) اور اسے وہیں دفن کرنا پڑا۔ دوسری بیوی منیرہ بنت حسین (م۔۱۹۷۶ء) کا تعلق یہیں کے ایک قبیلہ سے تھا، جس کے بطن سے مدینہ طیبہ میں طلال کی ولادت ہوئی (۱۹۳۲ء)۔ سعودی عرب کے بانی شاہ عبدالعزیز ابن سعود (م۔۱۹۵۳ء) انہیں اپنا بیٹا سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے وہاں کے شاہی خاندان بالخصوص شاہ فیصل نے ان کی عزت افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ سعودی عرب میں اپنے پانچ سالہ قیام میں متعدد بارسوخ اشخاص سے ان کے دوستانہ مراسم تھے، لیکن ان سب سہولتوں اور آسائشوں کے علی الرغم انہیں اس ملک سے فطری لگاؤ تھا۔ جب بھی وہ یہاں آتے، مغربی لباس پہننا چھوڑ دیتے، عربی زبان ہی میں گفتگو کرتے اور یہاں کے طرز زندگی ہی کو اپنا لیتے۔ پولا حمیدہ اسد نے تو ایک جگہ لکھا ہے کہ ان کی روح بدوی تھی اور صحرا کی تا حد نظر پھیلی ہوئی دنیا میں وہ خود کو یوں محسوس کرتے، جیسے اپنے ہی گھر میں مقیم ہیں۔ جوانی میں اسد جرمنی کے ایک اخبار Frankfurter (Allgemeine) Zeitung میں بطور نمائندہ برائے مشرق وسطیٰ ملازم رہے۔ اسی اخبار کے ایک معتبر لکھاری کارل گیونٹر سیمون نے ان کی وفات سے چار سال قبل دونوں میاں بیوی کا انٹرویو لیا۔ سیمون کے ایک سوال کے جواب میں پولا صاحبہ نے کہا:

"He [Asad] is a Bedouin, who have always wandered."

زیر نظر کتاب کے عنوان ''محمد اسد۔ایک یورپین بدوی'' کا یہی پس منظر ہے۔

لاہور

یکم جنوری ۲۰۰۹ء

محمد اکرام چغتائی

Marfat.com

محمد اسد/ مترجم: محمد الحسن الحسنی

اپنے بارے میں

میرا خاندان اور ماحول

میرے بچپن کا ابتدائی زمانہ پولینڈ کے شہر لو (Lwow) میں گزرا جو اس وقت آسٹریا کے قبضہ میں تھا۔ میرا مکان اتنا ہی خاموش اور پُرسکون تھا' جیسا کہ اس کے سامنے والی سڑک۔ یہ ایک طویل سڑک تھی جس کے دونوں کناروں پر شاہ بلوط کے درخت لگے ہوئے تھے اور جو لکڑیوں کی چپٹیوں سے ایسی ڈھکی رہتی تھی کہ اس پر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس کی وجہ سے پورا دن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اونگھتی ہوئی شام ہو۔

مجھے اس سڑک سے ایک خاص قسم کا لگاؤ اور انس پیدا ہو گیا تھا' جو میری عمر کو دیکھتے ہوئے قبل از وقت تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا مکان اسی سڑک پر واقع تھا بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے' وقار اور تمکنت کی اس خوشگوار ادا نے جو اس بارونق اور جھلملاتے ہوئے شہر کے قلب سے ہوتی ہوئی جنگلوں کے سکون اور اس قبرستان کی خاموشی تک نظر آتی تھی' (جو جنگل کے اندر واقع تھا) اس نے مجھے مسحور کر رکھا تھا۔

خوبصورت گھوڑے گاڑیاں جب ان راستوں پر تیز روی کے ساتھ گزرتیں تو گھوڑوں کی ٹاپوں سے ایک حسین نغمہ ابلنے لگتا یا اگر جاڑوں کا زمانہ ہوتا اور سڑک پر برف کی ایک فٹ موٹی تہ جمی ہوتی اور اس پر پھسلنے والی گاڑیاں گزرتیں تو اس وقت گھوڑوں کے نتھنوں سے بادل کے ٹکڑوں کی طرح بھاپ نکلتی نظر آتی اور سرسراتی ہوئی تیز ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے گھوڑوں کی گھنٹیاں بجنے لگتیں۔ اگر آپ کو اس قسم کی سواری پر بیٹھنے کا کبھی اتفاق ہوتا اور آپ کے چہرے پر ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے لگتے' اس وقت آپ بھی یہی محسوس کرتے کہ یہ صبار فتار گھوڑے آپ کو مسرت کی ایک ایسی دنیا میں پہنچا دینا چاہتے ہیں جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔

گرمیوں کا زمانہ ہم لوگ دیہات میں گزارا کرتے تھے جہاں میرے نانا کا مکان تھا۔ وہ ایک دولت مند بینکر تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس خاصی جائداد تھی جو ان کے بڑے خاندان کے لئے آرام و آسائش اور تفریح مہیا کرنے کے لیے بہت کافی تھی۔ ایک چھوٹا سا انگڑائیاں لیتا ہوا چشمہ وہاں سے گذرتا تھا جس کے کنارے صنوبر کے درخت لگے ہوئے تھے۔ گودام اور مال خانے خاموش اور پُروقار گایوں سے بھرے رہتے تھے' جس میں جانوروں

Marfat.com

کے جسم کی بدبو کے ساتھ ساتھ کسان لڑکیوں کی ہنسی مذاق کی گونج (جب وہ شام کے وقت دودھ دوہنے کے لئے آتی تھیں) بھی سنائی دیتی تھی۔ یہ بھی ضروری تھا کہ تازہ تازہ دودھ اسی وقت بالٹیوں سے لے کر پیا جائے۔ پیاس بھوک کی وجہ سے نہیں' بلکہ اس لئے کہ انسان میں ایک خواہش یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ فطرت سے قریب تر ہو کر ان نعمتوں سے لطف اندوز ہو۔

اگست کے یہ گرم دن میں نے کسانوں کے ساتھ گزارے جو گیہوں کاٹنے میں مصروف رہتے تھے۔ پھر ان کی عورتیں بڑی دلچسپی اور انہماک کے ساتھ اس کو ایک طرف جمع کرتیں۔ جوان اور نوخیز لڑکیاں جو نظروں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ بھرے ہوئے جسم' حرارت سے بھرپور بانہیں' جن کی قوت کا اندازہ آپ کو اس وقت ہوتا جب وہ اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی آپ کو اپنے بازو میں جکڑ کے گیہوں کے ڈھیروں کے پاس کھینچتی تھیں' اگرچہ میری عمر اس وقت ایسی تھی کہ میں اس ہنسی مذاق سے کوئی اور نتیجہ نہیں نکال سکتا تھا۔

میں نے اپنے والد کے ساتھ ویانا' برلین اور آلپسکے پہاڑی سلسلے بوہیمیا کے جنگلات' بحر شمال اور بحر بالٹک جیسے دور دراز مقامات کے سفر بھی کئے جو میرے لیے کسی طرح ایک نئی دنیا سے کم نہ تھے۔ ہم میں سے جس کسی کو بھی اس سفر کا موقع ملتا' ریل سیٹی دیتی اور اس کے پہیے حرکت میں آنے لگتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے شدت شوق میں ہمارے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔

وہاں میرے ساتھ کھیل کے ساتھی بھی ہوتے۔ ایک بھائی ایک بہن اور بہت سے چچیرے بھائی اتوار کو جب ہفتہ بھر کے تعطل سے فرصت ملتی تو شہر سے باہر پیدل سفر کے پروگرام بنتے اور ہم عمر خوبصورت لڑکیوں سے چوری چھپے ملاقاتیں ہوتیں۔ ایک عجیب نشہ سا تھا جس میں گھنٹوں ہم لوگ ڈوبے رہتے تھے۔

یہ بچپن کا ایک معصوم' پُر مسرت اور حسین دور تھا جس کی یاد بھی آج بڑی تسلی بخش اور خوشگوار ہے۔

میرے والدین' بہت مطمئن اور فارغ البال تھے۔ دراصل وہ اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی اولاد کے لئے جی رہے تھے'اس لئے ان کی ساری توجہ ہماری ہی طرف تھی۔ شاید یہ میری ماں کی نرم مزاجی اور خاموشی کا اثر تھا کہ میں آنے والے چند برسوں میں اپنے کو نئے ماحول اور نئے (اور بڑی حد تک منحوس) حالات کا عادی بنانے میں بآسانی کامیاب ہو گیا۔ اسی طرح میرے والد کی اندرونی بے اطمینانی اور بے چینی کا عکس بھی مجھ پر پڑے بغیر نہ رہ سکا۔

کچھ اپنے والد کے متعلق

میرے والد کا ذکر آ گیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کچھ تعارف کرا دیا جائے وہ ایک ہنس مکھ اور شگفتہ طبیعت کے انسان تھے۔ نحیف سا جسم' گندمی رنگ' سیاہ اور جذباتی آنکھیں' جوان کے ماحول سے کسی طرح ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتی تھیں' جوانی میں ان کو ریاضی اور طبعیات سے بہت دلچسپی تھی' لیکن ان کی یہ تمنا کبھی پوری نہ ہوئی۔ پھر مجبوراً انہوں نے وکالت پڑھی اور باوجود اس کے کہ اس میں وہ بہت کامیاب رہے' انہوں نے کبھی بھی اس

Marfat.com

میں کوئی دلچسپی محسوس نہ کی۔شاید اس کا سبب یہ احساس رہا ہو کہ ان کا محبوب مشغلہ اور موضوع اب ان کی دسترس سے باہر تھا' جس کی وجہ سے تنہائی کا ایک مستقل احساس ان پر مسلط رہتا تھا۔

ان کے والد تسروِتس (Czervowitz) کے جو اس وقت آسٹریا کا مقبوضہ تھا' ربی (یہودی عالم) تھے۔

مجھے ابھی تک ان کا رنگ روپ اچھی طرح یاد ہے خوش مزاج اور خوش طبع' پتلی انگلیاں' بے حد حساس چہرہ جس پر بہت جلد تاثر کے آثار ظاہر ہونے لگتے تھے' سفید لانبی داڑھی' وہ فلکیات سے خاص دلچسپی اور شغف کے ساتھ ساتھ اپنے ضلع میں شطرنج کے بھی ممتاز کھلاڑی تھے اور شاید یہی قدر مشترک تھا جس کی وجہ سے ان میں اور روم کے آرتھوڈوکس آرچ بشپ میں بہت گہری دوستی قائم ہوگئی تھی جو خود شطرنج کے ایک بہت اچھے ماہر تھے۔دونوں نہ معلوم کتنی شامیں کھیل کر گزار دیتے تھے اور اپنے اپنے مذاہب کے الہیاتی مسائل پر بحث و مباحثہ بھی کرتے رہتے تھے۔ممکن ہے کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ جب میرے دادا کو طبیعیات سے اتنی دلچسپی تھی تو انہوں نے اپنے لڑکے کے اس شوق اور رجحان کی ضرور پذیرائی کی ہوگی' لیکن یہ بات نہ تھی۔انہوں نے ابتداہی میں یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ ان کو اپنے خاندان کے اس مذہبی ورثہ کی حفاظت کرنا ہے جو نسلاً بعد نسل محفوظ چلا آرہا ہے۔انہوں نے میرے والد کے لئے کوئی اور مشغلہ پسند نہ کیا۔ان کی اس رائے اور ارادہ میں ان کے چچا کی ایک افسوس ناک یاد کو بھی ضرور دخل رہا ہوگا' جنہوں نے خاندان کی روایات اور تاریخ سے عجیب و غریب طریقہ پر بغاوت کی تھی' یہاں تک کہ اپنے آباؤ اجداد کے دین کو بھی خیر باد کہہ دیا تھا۔

ہمارے ان روایتی یا تاریخی چچا نے جن کا نام بھی ہمارے گھر میں کبھی بلند آواز سے نہیں لیا گیا' کسی ایسے ہی ماحول میں پرورش پائی تھی جہاں دینداری کا خاصا اثر تھا۔نوجوانی میں وہ مکمل ربی بن گئے تھے' پھر ان کی شادی ایک ایسی عورت کے ساتھ کردی گئی جس سے (جہاں تک میرا اندازہ ہے) ان کو ذرہ برابر بھی محبت نہ تھی۔

چونکہ ربی کے پیشہ میں اتنی آمدنی نہیں تھی جو ان دنوں ان کے لئے کافی ہوتی' اس لئے انہوں نے سمور فروشی کا کاروبار شروع کردیا۔اس کے لئے وہ ہر سال یورپ کے سمور کے مرکزی بازار لائپ تسک (Leipzig) کا سفر کیا کرتے تھے۔ایک بار حسب معمول جب ان کی عمر پچیس سال کی تھی' وہ اسی قسم کے ایک طویل سفر کی نیت سے سواری پر باہر نکلے۔یہ انیسویں صدی کے نصف اول کا واقعہ ہے۔لائپ تسک میں انہوں نے معمول کے مطابق سمور فروخت کیا' لیکن گھر واپس آنے کے بجائے انہوں نے اپنی گاڑی بھی فروخت کردی اور گھوڑا بھی' انہوں نے داڑھی بھی منڈوادی اور اپنی بیوی کو فراموش کر کے جس سے انہیں پہلے ہی محبت نہیں تھی' انگلستان چلے گئے۔وہاں کچھ عرصہ تک مزدوری وغیرہ کر کے اپنا خرچ چلاتے رہے اور ساتھ ہی ریاضی و فلکیات کا مطالعہ بھی شروع کردیا۔قیاس یہ کہتا ہے کہ ان کے مالک نے ان کے اس شوق مطالعہ کو دیکھ کر ان کی ذہنی صلاحیتوں کا اندازہ کیا ہوگا اور آکسفورڈ میں رہ کر مزید تعلیم اور مطالعہ جاری رکھنے میں مدد کی۔بہر حال آکسفورڈ میں انہوں نے اس سلسلہ کی مکمل تعلیم حاصل کی اور عیسائیت قبول کرلی۔پھر اپنی بیوی کو طلاق نامہ بھیجنے کے کچھ عرصہ بعد اُن" کافروں" کی کسی لڑکی سے شادی کرلی۔اس کے بعد سے ہمارے خاندان کو ان کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ہاں اتنا البتہ معلوم ہوا کہ وہ یونیورسٹی میں فلکیات کے پروفیسر

Marfat.com

تھے، پھر نائٹ ہوگئے اور اسی حالت میں ان کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

اس عبرتناک انجام نے میرے دادا کو اس بات مطمئن کر دیا تھا کہ وہ میرے والد کے معاملہ میں جن کو ''کفار'' کے علوم سے رغبت تھی، انتہائی سخت اور بے لوچ پالیسی اختیار کریں۔ ان کے لئے ربی ہونا ضروری تھا، کسی خاص مقصد یا جذبہ سے نہیں، بس اس لئے کہ ہونا چاہئے تھا، لیکن میرے والد بھی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والے نہیں تھے، چنانچہ ہوتا یہ تھا کہ دن میں تو وہ طالمود کا مطالعہ کرتے اور رات کو خفیہ طور پر ایک سیکنڈری اسکول کی درسیات پڑھتے رہتے۔ ایک عرصہ کے بعد انہوں نے اپنی والدہ کو اس خفیہ تعلیم سے آگاہ بھی کر دیا۔ اگرچہ یہ طرزعمل ان کی والدہ کو بہت گراں گزرا، مگر اپنی نرم دلی کی وجہ سے انہوں نے یہ سوچا کہ لڑکے کو تعلیم کا جو ایک اچھا موقع مل گیا ہے، اس میں رکاوٹ ڈالنا ایک طرح کا ظلم ہے۔

بائیس سال کی عمر میں انہوں نے یہ پورا انصاب جو آٹھ سال کا تھا، چار ہی سال میں مکمل کر لیا۔ اس کے بعد بی۔ اے کے امتحان میں شریک ہوئے اور امتیازی پوزیشن سے کامیاب ہوئے۔ جب سند ان کو مل گئی تو ان کی والدہ نے یہ ''وحشت ناک خبر'' دادا صاحب کو دے دی۔ میں اپنے چشم تصور سے اس منظر کو دیکھ سکتا ہوں جو اس وقت پیش آیا ہوگا۔ بہرحال آخر کار میرے دادا کو نرم ہونا پڑا اور وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ والد صاحب اپنی دینی تعلیم روک کر یونیورسٹی میں داخلہ کرالیں، لیکن خاندان کے اقتصادی حالات کی وجہ سے ان کو اس کا موقع نہ ملا۔ وہ اپنے محبوب موضوع طبیعیات کی تعلیم جاری رکھ سکتے، ان کو ایسے پیشہ کو اختیار کرنا پڑا جس میں آمدنی زیادہ ہو، مثلاً وکالت۔ آخر کار وہ وکیل ہو گئے اور لیوو میں باقاعدہ بود و باش اختیار کر لی۔ وہیں ان سے میری ماں کی شادی ہوئی جو ایک دولت مند بینکر کی لڑکی تھیں اور وہیں ۱۹۰۰ء میں میری پیدائش ہوئی۔ میں اپنے والدین کا دوسرا لڑکا تھا۔

میرے والد کی سائنس سے دلچسپی (جو دل ہی میں گھٹ کر رہ گئی تھی) ان کے وسیع سائنسی مطالعہ اور اپنے لڑکے کے لئے اس موضوع کے انتخاب ہی سے ظاہر تھی، جس کا خود بھی میلان ایسی چیزوں کی طرف زیادہ تھا جن سے معاشی نفع کی کوئی امید نہ تھی، لیکن جو توقعات انہوں نے مجھ سے قائم کی تھیں وہ کبھی پوری نہ ہو سکیں، اگرچہ میں کند ذہن اور غبی نہیں تھا، لیکن بس واجبی قسم کا اور بے پروا طالب علم تھا، ریاضی اور طبیعیات میں کبھی میرا دل نہیں لگا، البتہ سین کیوریتس (Sien kuirez) کے ہیجان پیدا کرنے والے تاریخی ناول Juleserne اور جیمز فینی مور کوپر (James Fenimore Cooper) کی لکھی ہوئی ریڈ انڈینز کی کہانیاں اور اس کے بعد رلکے (Rilke) وغیرہ کے اشعار مجھے زیادہ پسند تھے۔ بجلی اور کشش کے عجائبات میرے لئے لاطینی اور یونانی قواعد سے کسی طرح کم نہ تھے۔ جو میرے اندر کسی حس یا شعور پیدا کرنے سے قاصر تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ میں بڑی مشکلوں سے امتحان پاس کر پاتا تھا۔ یقیناً یہ میرے والد کے لئے بڑے صدمہ اور مایوسی کی بات تھی، لیکن شاید اس بات سے ان کو کچھ تسلی ہو جاتی تھی کہ جرمن اور پولستانی ادب، لٹریچر اور تاریخ سے میری دلچسپی پر میرے اساتذہ بہت مطمئن اور خوش ہیں۔

Marfat.com

تعلیم اور مطالعہ

خاندانی روایات کے مطابق پہلے میں نے نجی طور پر اساتذہ سے عبرانی علوم دینیہ کی وسیع طریقہ پر تعلیم حاصل کی۔اس کی وجہ میرے والد کی دینداری یا پرہیزگاری نہ تھی' بلکہ وہ اس نسل سے وابستہ تھے جو صرف زبانی ان دینی عقائد کی قائل تھی جو ایک زمانہ میں ان کے اسلاف کی زندگی پر بہت اثر انداز تھے۔اس نے ان عقائد کو اپنی عملی زندگی میں مداخلت کی کبھی اجازت نہیں دی' یہاں تک کہ اخلاقی فکر پر بھی اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ان نظریات اور رجحانات کے مطابق جو اس سوسائٹی میں رائج تھے دین کا مفہوم اپنے مقام سے نیچے اتر چکا تھا۔اب اس کے صرف دو مفہوم رہ گئے تھے' یا تو اس کی حیثیت بعض بے جان رسموں کی تھی' جس کو لوگ دینی ورثہ کے خیال سے اپنے سینے سے چمٹائے بیٹھے تھے یا حقارت آمیز لاپرواہی (Cynical Insouciance) جو آزاد خیال لوگوں کا شیوہ تھا' جن کے نزدیک دین ایک پرانی کہانی تھی جسے آدمی خارجی طور پر کبھی ضرورتاً یا مصلحتاً برت لیتا ہے' لیکن خلوت میں اس پر عمل پیرا ہونے سے وہ شرم محسوس کرتا ہے' اس لئے کہ اس کا کوئی عقلی ثبوت نہیں ملتا' نہ اس میں اس کو کوئی معقولیت ہی نظر آتی ہے۔

ظاہری اسباب تمام تر اس بات پر شاہد تھے کہ میرے والد پہلے ہی طبقہ سے وابستہ تھے' لیکن بعض اوقات میں سوچنے لگتا تھا کہ وہ دوسرے طبقہ کی طرف مائل تھے' لیکن اپنے والد اور اپنی بیوی کے والد کے خیال سے انہوں نے باصرار مجھے کتب مقدسہ پڑھوائیں' چنانچہ میں ابھی تیرہ سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ عبرانی بآسانی پڑھنے لگا اور پڑھنے ہی نہیں لگا بلکہ بڑی روانی کے ساتھ بولنے لگا۔اس کے علاوہ ارامی زبان سے بھی تھوڑی بہت واقفیت پیدا ہوئی۔آئندہ سالوں میں مجھے عربی پڑھنے میں جو آسانی ہوئی' شاید اس میں اس کو بھی دخل ہے۔میں نے عہد قدیم کی اصل کتاب کا مطالعہ کیا تھا اور طالمود کا متن و شرح دونوں میرے لئے مانوس تھے۔اس زمانہ میں خاصے اعتماد اور وثوق کے ساتھ طالمود بابئل اور طالمود قدس کے فرق پر بحث کرسکتا تھا۔اس کے بعد میں کتاب مقدس تارغوم'' کی شرح میں مشغول ہوگیا جو ربی ہونے کے لئے ایک ضروری شرط تھی۔

یہودی عقائد کے مقدمات سے اس ساری واقفیت اور ان تمام دینی معلومات کے باوجود بلکہ شاید اسی وجہ سے بہت جلد مجھ میں ایک قسم کا ترفع اور احساس برتری پیدا ہوگیا۔واضح رہے کہ میں اصلاح اخلاق کے اس اصول کا بہت قائل تھا جو یہودیوں کی مذہبی کتابوں میں بڑی شدت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔اسی طرح مجھے خدا کے بارے میں انبیاء یہود کے بلند تصور سے بھی اتفاق تھا جو وہ پیش کرتے ہیں' لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جس خدا کو عہد قدیم اور طالمود میں پیش کیا گیا ہے' اس کو رسمیات اور مذہبی تقریبات سے ضرورت سے زیادہ دلچسپی ہے۔مجھے خیال ہوا کہ یہ معبود غیر معمولی طور پر ایک ہی متعین اور خاص قوم (عبرانیوں) کے انجام اور مستقبل کی فکر میں رہا کرتا ہے۔خود عہد قدیم کی کتاب تکوین (کتاب پیدائش) احفاد ابراہیم کی تاریخ کی حیثیت سے یہ رجحان رکھتی ہے کہ خدا کو تمام انسانوں کے رب کی حیثیت سے نہیں' بلکہ ایک خاص سمت اور جہت کے رب کی حیثیت سے پیش کرے جو تمام اقوام کے ساتھ اپنی منتخب اور برگزیدہ قوم کی ضرورتوں کے لحاظ سے معاملہ کرتا ہے۔اگر وہ صالح ہوتے ہیں تو ان کو فتوحات عطا کرتا ہے' اگر

Marfat.com

گمراہ ہوتے ہیں تو کفار کے ہاتھ سے ان کو عذاب دیتا ہے۔ ان بنیادی نقائص کی بنا پر اور جرمیا جیسے متاخرین انبیاء کا روحانی جوش بھی مجھے کسی عالمی پیغام سے خالی نظر آتا ہے۔

اگرچہ اس ابتدائی درس و مطالعہ کا نتیجہ میرے مقصد اور نیت کے خلاف پڑا اور اس نے مجھے میرے آباؤاجداد کے دین سے قریب کرنے کے بجائے اور دور کر دیا' لیکن میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ آنے والے برسوں میں اس چیز نے مجھے دین کا مقصد اساسی سمجھنے میں (ایک دین کی حیثیت سے خواہ اس کی کوئی بھی شکل ہو) کافی مدد دی' لیکن یہودیت سے اس مایوسی کا مجھ پر یہ اثر نہیں ہوا کہ میں روحانی حقائق کو کسی اور جگہ تلاش کروں۔ لاادری (Agnostic) ماحول کے اثر سے میں بھی اسی راستہ پر پڑ گیا جس پر دوسرے ساتھی پڑ گئے تھے اور وہ یہ کہ عملی طور پر ہر ..... ایسے ''قانونی'' دین سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے جس میں صرف قوانین وضوابط اور اعمال ورسوم پر زور دیا جاتا ہے۔

اور چونکہ میرا دین میرے لیے پابندیوں اور احکامات کی ایک زنجیر تھی' اس لئے میں نے اس سے دور ہو جانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کی۔ دینی مسائل اور فلسفہ کے سوالات نے ابھی تک میرے دماغ کو اپنی طرف متوجہ نہیں کیا تھا۔ میرا مطمح نظر وہی تھا جو میرے ہم عمر نوجوانوں کا تھا' قوت عمل' جوش اور پیش قدمی اور جان پر کھیل جانا۔

۱۹۱۴ء کے اواخر میں جب جنگ چھڑ چکی تھی تو مجھے ایسا نظر آیا کہ میرے ان خوابوں کی تعبیر کا وقت آ گیا ہے میری عمر اس وقت چودہ سال کی تھی' میں نے مدرسہ سے راہ فرار اختیار کی اور اپنا نام بدل کر آسٹریا کی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ میرا قد میری عمر کے لحاظ سے زیادہ تھا' اس لئے مجھے اٹھارہ سال کا خیال کر کے بھرتی کر لیا گیا۔ اٹھارہ سال بھرتی کے لئے لازمی عمر تھی' لیکن ظاہر ہے میرے پاس ''سپاہی کا ڈنڈا'' نہ تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے والد پولیس کی مدد سے میرے تعاقب میں گئے اور مجھے حقارت وذلت کے ساتھ اپنے گھر ویانا لوٹا دیا گیا' جہاں کچھ عرصہ سے ہمارا خاندان آ کر مقیم ہو گیا تھا' لیکن تقریباً چار سال کے بعد میں دوبارہ باقاعدہ طور پر آسٹرین فوج میں شامل ہو گیا' البتہ اس زمانہ میں مَیں نے فوجی عروج اور شان وشوکت کے خواب دیکھنا بند کر دیئے اور اپنی خودارادیت کی تکمیل کے لئے کسی دوسری راہ کی تلاش میں رہا' بہرحال میرے بھرتی ہونے کے چند ہی ہفتے بعد انقلاب ہو گیا۔ آسٹرین شہنشاہی ختم ہو گئی اور اس کے ساتھ جنگ بھی ختم ہو گئی۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد تقریباً دو سال تک میں ویانا یونیورسٹی میں کسی خاص پابندی اور اہتمام کے بغیر فلسفہ اور آرٹ کی تعلیم حاصل کرتا رہا' لیکن کبھی بھی میرا دل ان علوم میں نہیں لگا' اس لیے کہ اس سنجیدہ' خشک اور خالص علمی مسلک میں میرے لئے کوئی کشش نہ تھی۔ مجھے اس کا شوق اور خواہش تھی کہ میں زیادہ واقفیت اور علیت کے ساتھ زندگی کا مطالعہ کروں اور ان مصنوعی قلعوں میں پناہ لئے بغیر زندگی کے قلب وجگر میں اتر جاؤں جوان لوگوں نے عافیت اور آرام طلبی کی خاطر اپنے اردگرد بنا لئے ہیں۔ میں واقعات اور کائنات کے اس روحانی نظام کی جستجو میں تھا جس کے متعلق میرا یقین تھا کہ وہ ہے ضرور' لیکن فی الحال میں اس کے ادراک سے قاصر ہوں۔

Marfat.com

یہ آسان نہیں کہ میں چند الفاظ میں آپ کو بتادوں کہ اس وقت روحانی نظام سے میری مراد کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں اس مسئلہ کو خالص اصطلاحی دینی نقطہ نظر سے سمجھنے کی کوشش کروں۔ میری یہ دماغی پریشانی اور ذہنی پراگندگی اگر میں انصاف سے کہوں' میرے ہاتھوں کی لائی ہوئی نہ تھی۔ درحقیقت یہ پوری نسل کی حیرانی و پریشانی تھی۔

روحانی بے چینی

بیسویں صدی کے ابتدائی سال اس لحاظ سے خاص امتیاز رکھتے ہیں کہ ان میں نمایاں طور پر ایک روحانی خلا (Vacuum) پایا جاتا تھا اور روحانی قدریں جن سے یورپ صدیوں سے نا آشنا تھا' اب کسی خاص اور متعین شکل پر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ یہ ان ہولناک واقعات کا نتیجہ تھا جو ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۵ء کے درمیان پیش آئے۔ بظاہر اس کی کوئی توقع بھی معلوم نہیں ہوتی تھی کہ اقدار کا کوئی نیا مجموعہ ان قدروں کی جگہ لے سکے گا۔ ہاں خطرہ اور خوف کا ایک احساس تھا' وہ احساس جو عقلی اور سماجی ابال سے پہلے پیدا ہوا کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان اس شبہ میں پڑ گیا تھا کہ آیا اس کی کوششیں اور افکار ایک مستقر پر رکیں گے یا نہیں؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز تنکے کی طرح ایک بے راہ سیلاب میں بہی چلی جا رہی ہو۔

اس روحانی بے چینی اور بے اطمینانی میں نوجوانوں کے لئے ایک قدم بھی ٹکانے کی جگہ نہ تھی۔ پھر معتبر اخلاقی قدروں اور معیاروں کے فقدان سے کسی کے اختیار میں نہیں رہا تھا کہ وہ ہمارے ان سوالات کا (جو ہمارے دماغ کو پریشان کر رہے تھے) تسلی بخش جواب دے سکتا۔ علم کا دعویٰ تھا کہ تحقیق ہی سب کچھ ہے۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ اگر علم اور معلومات کے ساتھ کوئی اخلاقی مقصد نہ ہو تو اس کا نتیجہ سوائے انتشار اور انارکی کے کچھ نہیں۔ مصلحین' اجتماع' انقلابی ذہن رکھنے والے لوگ' کیمونسٹ (اور یہ سب ایک بہتر اور صحت مند مستقبل کے لئے کوشاں تھے) صرف ظاہری حالات (اجتماعی اور اقتصادی ضروریات) کی روشنی میں سوچنے کے عادی تھے' اس لئے کیمونسٹوں نے ''مادی فلسفۂ تاریخ'' ایجاد کیا جو اگرچہ مابعد الطبیعیات کا دشمن تھا' لیکن خود اس نے بعد کو ماورائے طبیعیات (Metaphysics) کی شکل اختیار کر لی تھی۔ رہ گئے مذہبی پیشوا اور دینی رہنما تو ان کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ یہ تھا کہ وہ خود اپنے عادات اور اطوار و خیالات کو اپنے معبود پر منطبق کرتے رہیں اور بس' وہ عادات و اطوار جو عرصہ دراز سے بے وقعت اور بے جان ہو چکے تھے۔ جب ہم نوجوان یہ دیکھتے تھے کہ یہ نام نہاد الٰہی صفات دور تک واقعات اور مشاہدات سے ٹکراتی ہیں تو ہم سوچتے تھے کہ قضا و قدر کے پیچھے جو قوتیں کارفرما ہیں' وہ بہت واضح اور کھلے طریقہ پر ان صفات سے مختلف ہیں جن کو خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے' اس لئے خدا موجود نہیں ہے۔ وہ لوگ بہت ہی کم تھے جو یہ سمجھتے ہوں کہ موجودہ انارکی اور انتشار کا سبب دین کے ان دعویداروں اور محافظوں کا استبداد ہے جن کو یہ زعم تھا کہ وہ صالحین میں سے ہیں اور ان کو خدا کا تعارف کرانے اور اس کی صفات بیان کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ خدا جس کو انہوں نے اپنا لباس پہنا کر

Marfat.com

انسان اور اس کے انجام سے علیحدہ کر دیا ہے۔

فرد کی زندگی میں اس اخلاقی تغیر کے دو ہی نتیجے تھے' مکمل اخلاقی انارکی اور ''کلبیت'' یا پھر ایک مجتہدانہ اور تخلیقی کوشش جو ایک بہتر زندگی کی تشکیل کر سکے۔

فنون لطیفہ کی تاریخ کو بنیادی موضوع کی حیثیت سے انتخاب کرنے میں شاید میرے اندر یہی ادراک کارفرما تھا۔ آرٹ کا مقصد میرے نزدیک یہ تھا کہ وہ واقعات و حوادث کی (جو وقتاً فوقتاً ہمارے سامنے سے گزرتے ہیں اور ہم ان کو محسوس کرتے ہیں) ایک متعین اور دائمی تصویر ہمارے سامنے پیش کر سکے۔ یہ واقعات و حوادث جن کے متعلق میرا رجحان یہ ہے کہ مجرد فکر کے ذریعہ ہی ان کی ایک شکل بنائی جا سکتی ہے۔ یہ اور بات تھی کہ کلاس کے لکچر مجھے اپیل نہیں کر سکے۔ ایسا نظر آتا تھا کہ میرے بعض ممتاز پروفیسر تک قوانین جمال کے سلسلہ میں اس کے اصل روحانی اور اندرونی اسباب و محرکات کی طرف توجہ کرنے کے بجائے اس کی فنی تخلیق پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ فنون لطیفہ کے بارے میں ان کا نقطہ نظر ضرورت سے زیادہ تنگ تھا اور زیادہ تر اشکال میں الجھا رہتا تھا۔

اسی طرح تحلیل نفسی (Psychoanalysis) کے وہ نتائج جو دماغی انتشار اور حیرانی کے زمانہ میں میرے سامنے آئے' مجھے مطمئن نہ کر سکے اگرچہ اس کے اسباب مختلف تھے! اس میں کوئی شک نہیں کہ تحلیل نفسی اس زمانہ میں اپنی نوعیت کا ایک شاندار عقلی انقلاب تھا۔ انسان اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ سمجھنے لگا تھا کہ علم و حقیقت کے دروازے جو ابھی تک بند تھے اور اب جا کر کھلے ہیں' انسان کی فکر و خیالات پر بہت گہرا اثر ڈالے بغیر نہ رہیں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس کو یکسر بدل کر رکھ دیں' اس لئے کہ اس عمل کے انکشاف نے جو لاشعوری اور خفیہ عوامل انسان کی شخصیت کی تکمیل اور تعمیر میں کرتے ہیں' انسان کے اندرونی اسرار کو سمجھنے کے لئے بہ نسبت گذشتہ نفسیاتی نظریات کے بہت سی کھڑکیاں کھول دی ہیں' میں یہ سب باتیں قبول کرنے کے لئے تیار تھا اور حقیقت یہ ہے کہ فرائڈ کے افکار نے میرے دل و دماغ پر شراب کا اثر کیا تھا۔ کتنی راتیں میں نے کافی ہاؤس میں بسر کیں' جہاں میں تحلیل نفسی کے پرانے علمبرداروں آلفریڈ آڈلر (Alfred Adler)، ہرمان شٹیکل (Hermann Steckl) اور ہرمان اوٹو گروس (Hermann Otto Gross) کی گرما گرم بحثوں کو ہمہ تن گوش ہو کر سنا کرتا تھا' لیکن اس وقت بھی جبکہ تحلیل جدید کے اصول و نتائج میرے لئے شک و شبہ سے بالاتر تھے' میں اس ''عقلی غرور'' (Intellectual arrogance) پر مطمئن نہیں تھا جس کے ماتحت نفس انسانی کے سارے عجائبات کو صرف اعصابی اور تناسلی اجزاء کی صدائے بازگشت تصور کیا جاتا ہے۔ وہ فلسفیانہ نتائج جہاں تک اس علم و فن کے بانی اور مرتبین پہنچے تھے' بعض اوقات مجھے بہت بے قیمت اور حقیر معلوم ہونے لگتے تھے' اس لئے کہ آخری حقائق کے سامنے ان کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ علاوہ اس کے وہ کسی نئے راستے کی طرف رہنمائی بھی نہیں کرتے تھے جو انسان کو بہتر زندگی کی طرف لے جاتا ہو۔

اگرچہ یہ مسائل میرے دماغ پر بہت حاوی تھے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کبھی مجھے پریشان نہیں

Marfat.com

کیا۔ میں ماوراالطبیعیات کے بارہ میں فلسفیانہ غور وفکر یا مجرد حقائق کی بحث میں کبھی سرتاپا غرق نہیں ہوا' اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے ابتدا ہی سے ان چیزوں کی طرف میلان زیادہ تھا جن کو دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہو۔ مثلاً انسانی تعلقات' معاشرہ کی سرگرمیاں وغیرہ۔ اس زمانہ میں میں صنفی تعلقات کو سمجھنے کے لئے بھی کوشاں تھا۔

جنگ عظیم کے بعد جب اخلاقی قدروں کو ایک عام اور ہمہ گیر زوال ہوا تو قدرتی طور پر وہ حجابات بھی اٹھ گئے جو مرد اور عورت کے درمیان حائل تھے۔ اس واقعہ کو میری رائے میں انیسویں صدی کی رجعت پسندی کے خلاف محض ایک ردعمل قرار دینا صحیح نہیں۔ یہ بڑی حد تک اس حالت یا اس ماحول سے' جہاں معین اخلاقی قدریں ابدی' ازلی اور شبہ سے بالاتر سمجھی جاتی تھیں' اس حالت یا اس ماحول کی طرف بے مزاحمت ردعمل تھا جہاں ہر چیز مشکوک اور غیر یقینی تھی۔ وہ اس اعتقاد سے کہ انسان آگے بڑھ رہا ہے اور ترقی پذیر ہے' واپسی تھی۔ اس تلخ بیداری (Bitter disillusionment) کی طرف جس کی دعوت اشپنگلر (Spengler) نے دی تھی' اس اخلاقی اضافیت (Moral Relativism) کی طرف جس کا داعی نٹشے (Nietzsche) تھا' اس روحانی منکریت (Spiritual Annihilism) کی طرف جس کی پرورش نفسیات کے علماء تحلیل نے کی تھی' جب میں جنگ کے متصل بعد چند برسوں کو یاد کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جنہوں نے ''جسم کی آزادی'' پر بہت جوش اور گرمی کے ساتھ مضامین لکھے تھے اور مباحثے کئے تھے' وہ ان فطری جذبات محبت سے بہت دور تھے جس کا ان کو دعویٰ تھا۔ ان کے جنسی تعلقات عموماً سطحی ہوتے تھے جس میں ایک طرح کی لاپرواہی بھی شامل ہوتی تھی جو اکثر ان کو آوارگی تک لے جا کر چھوڑتی تھی۔

اگرچہ میں محسوس کرتا تھا کہ میں اخلاقی روایات اور تصوررات کا پابند ہوں' لیکن میرے لئے یہ بہت مشکل تھا کہ اپنے آپ کو اس طوفان بلاخیز سے بچا سکوں جو بہتوں کو بہا لے گیا۔ اپنے اور ساتھیوں اور دوستوں کی طرح میں بھی اس بات پر فخر کرتا تھا جس کو ہم فرسودہ روایات سے ''بغاوت'' کہتے تھے۔ بہرحال یہ چھیڑ چھاڑ محبت میں تبدیل ہو جاتی تھی اور کبھی کبھی تکلیف دہ نفسیاتی انفعالات اور تاثرات کا موجب بن جاتی تھی' ہاں البتہ اتنا میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں آوارہ وبداخلاق نہیں ہوا تھا' اس لئے کہ میرے تمام رومانوں میں جو جوانی میں پیش آئے تھے (خواہ ان کی مدت اور اثر مختصر ہو) ایک مبہم لیکن طاقتور خیال شامل رہتا تھا۔ یہ خیال کہ یہ احساس تنہائی جو ایک انسان کو دوسرے سے جدا کرتا ہے' عورت ومرد کے امتزاج سے ختم کیا جا سکتا ہے۔

صحافت کے میدان میں

میری بے اطمینانی میں برابر اضافہ ہوتا رہا' یہاں تک کہ یونیورسٹی میں تعلیم جاری رکھنا میرے لئے بہت مشکل ہو گیا اور آخرکار میں نے اس کو خیرباد کہنے اور صحافت کے میدان میں قسمت آزمائی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے والد نے اس کی بہت سختی سے مخالفت کی اور اپنی رائے کے حق میں خاصے وزنی اور معقول دلائل پیش کئے' جس کو میں اس

Marfat.com

وقت ماننے کے لئے تیار نہ ہوسکا۔ایک بات انہوں نے یہ کہی کہ"میدان صحافت میں آنے سے پہلے اس کا یقین کر لینا چاہیے کہ آیا میں تحریری کام کر بھی سکوں گا یا نہیں؟ پھر اپنی ایک گرم گفتگو کے بعد انہوں نے کہا"بہر حال ڈاکٹریٹ کی ڈگری نے کبھی بھی کسی شخص کو کامیاب انشاپرداز اور ادیب بننے سے نہیں روکا۔ان کی یہ بات بہت معقول تھی، لیکن میں جوان تھا' حوصلہ مند تھا اور بہت بے چین بھی تھا۔جب مجھے محسوس ہوا کہ وہ اپنی رائے بدلنے پر کسی طرح آمادہ نہیں تو پھر میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ خود اپنی سمجھ بوجھ سے اپنا زندگی کا سفر شروع کروں۔

چنانچہ یہی ہوا' کسی کو اطلاع دیئے بغیر ۱۹۲۰ء کی گرمیوں میں آخر کار میں نے ویانا چھوڑ دیا اور پراگ کے لئے ٹرین پر سوار ہو گیا۔

میری کل کائنات اس وقت (ذاتی اسباب کے علاوہ) ہیرے کی ایک انگوٹھی تھی جو میری والدہ سے (جن کے انتقال کو ایک سال کا عرصہ ہو رہا تھا) مجھے ورثہ میں ملی تھی۔میں نے اس انگوٹھی کو پراگ کے ممتاز ادبی قہوہ خانے کے ایک بیرے کے ذریعہ فروخت کر دیا۔اغلب گمان یہ ہے کہ سودا مجھے گراں تھا' لیکن جو قیمت اس کے عوض مجھے ملی تھی' وہ اس وقت میرے لئے بہت بڑی دولت تھی۔اس کے بعد میں برلین روانہ ہو گیا' جہاں مجھے ویانا کے بعض دوستوں نے ادباء اور فن کاروں کے اس سحری حلقہ میں پہنچا دیا جو ایک مشہور اور قدیم کافی ہاؤس Café des Westens میں قائم تھا۔

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ کسی سے تعاون کی امید رکھے بغیر' مجھے اپنا راستہ آپ بنانا ہے۔گھر والوں سے بھی مجھے کسی مالی امداد کی توقع نہ تھی۔چند ماہ بعد جب میرے والد کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو انہوں نے ایک خط میں مجھے لکھا کہ "مجھے نظر آتا ہے کہ تم اپنی اسی دشت نوردی میں راستہ کے کسی غار میں گر کر ختم ہو جاؤ گے۔"میں نے جواب میں انہیں لکھا کہ"میری منزل تو وہ چوٹی ہے جہاں مجھے پہنچنا ہے۔"میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس چوٹی کو کیسے سر کروں گا؟ لیکن میں لکھنا چاہتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ عالم ادب اپنے بازو پھیلائے ہوئے میرے انتظار میں ہے!

سر زنشہا گر کند....

چند ماہ کے بعد جب میرا بچا کھچا سرمایہ بھی ختم ہو گیا تو میں نے کوئی کام حاصل کرنے کا ارادہ کیا اور ایک نوجوان کی حیثیت سے جس کے سینہ میں صحافت کی بڑی امنگیں اور عزائم تھے' میں نے سب سے پہلے ایک بڑے روزنامہ سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی' لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔یہ انکشاف مجھ پر اچانک نہیں ہوا' اس سے پہلے ہفتوں میں نے برلین کی سڑکوں کے پیدل چکر کاٹے' اس لئے کہ تنگ دستی کی وجہ سٹریٹ کار یا سب وے سے سفر کرنا میرے لئے ناممکن تھا۔کتنی بار مجھے چیف ایڈیٹروں اور نیوز ایڈیٹروں کے توہین آمیز انٹرویو برداشت کرنے پڑے۔اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ مجھ جیسے آدمی کا جس کی ایک سطر بھی کبھی چھپی نہ ہو' کسی اخبار کے مقدس دربار میں داخلہ صرف معجزہ کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔معجزہ تو کوئی نہ ہوا' البتہ بھوک اور فاقہ سے اچھی راہ

138222

Marfat.com

ورسم پیدا ہوگئی۔ کئی ہفتے ایسے گزرے کہ صرف چائے پر گزارا کرنا پڑا۔ مکان کی مالکہ البتہ صبح کے وقت دوروٹی بھی مجھے دے دیتی تھی۔ میرے قہوہ خانے والے دوست ادباء بھی اس مدعی علم وفضل کے لئے کچھ نہ کر سکے۔ علاوہ بریں ان کے حالات بھی میرے حالات سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ وہ بھی دن بدن ہلاکت کے غار کی طرف بڑھ رہے تھے اور اپنی سفید پوشی برقرار رکھنے کے لئے اپنی کوئی تخلیق (مضمون یا تصویر) بیچ کر کسی پارٹی وغیرہ کا انتظام کرتے اور مجھے بھی اس ہنگامی دعوت میں شرکت کی دعوت دیتے۔ کبھی بھولے بھٹکے کوئی سیٹھ ہم ''اہل فکر'' کو اپنے فلیٹ میں مدعو کر لیتا اور جب ہم شمپین' ماہی اچار (Cavier Canapés) اپنے خالی معدوں میں انڈیل رہے ہوتے تو وہ حیرت اور مرعوبیت کے ساتھ ہمیں دیکھتا رہتا۔ اس دعوت کے صلہ میں ہم میزبان کے سامنے اپنی چرب زبانی اور قابلیت کا مظاہرہ کرتے اور ''آزاد مشربی'' کے حقائق ومعارف بیان کرتے۔

لیکن ایسی دعوتیں اور پارٹیاں شاذ واقعات تھے جو بہت کم پیش آتے تھے۔ عام طور پر فاقہ سے دوچار رہنا پڑتا تھا۔ رات کو جو خواب مجھے نظر آتے تھے' اس میں بھی مجھے بھنا گوشت' پراٹھے اور پسندے دکھائی پڑتے تھے۔ کئی مرتبہ مجھے خیال آیا کہ والد صاحب کو اس سلسلہ میں کچھ مدد کے لئے لکھوں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور تیار ہو جاتے' لیکن ہر بار میرا غرور آڑے آجاتا اور میں ان کو یہ لکھ دیتا کہ میں ایک معقول تنخواہ پر ایک جگہ ملازم ہو گیا ہوں۔

آخر کار تھوڑی سی قسمت جاگی' میں مُرناؤ (F.W.Murnau) سے ملنے گیا۔ یہ مُرناؤ وہ شخص ہے جو اس زمانہ میں فلم پروڈیوسر کی حیثیت سے شہرت وترقی کے زینے طے کر رہا تھا (یہ اس سے پہلے کا واقعہ ہے جب ہالی وڈ نے اس کی شہرت کو بہت آگے بڑھا دیا تھا اور پھر اس کے چند سال بعد ایک اچانک موت نے اس کا خاتمہ کر دیا تھا)۔ ہاں تو یہ مُرناؤ جو اپنی بے تکلفی' خوش مزاجی اور جذبات کی وجہ سے اپنے دوستوں میں بہت ہر دلعزیز تھا' اس نوجوان سے ملاقات کر کے بہت خوش ہوا جو بہت اشتیاق اور بے چینی کے ساتھ اپنے مستقبل پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں یہ پسند نہ کروں گا کہ اس کی نئی فلم میں جس کی شوٹنگ عنقریب شروع ہونے والی تھی' اس کی ماتحتی میں کام کروں۔ اگرچہ یہ کام بظاہر عارضی تھا' لیکن میں نے محسوس کیا کہ آسمان کے دروازے میرے لئے وا ہو گئے ہیں۔ میں نے کسی قدر رکتے ہوئے کہا' جی ہاں میں تیار ہوں'۔

دو شاندار مہینے میں نے معاشی افکار سے بے نیاز ہو کر اس کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے گزارے۔ میں ان نئے تجربات اور معلومات میں سرتاپا غرق تھا جس کا مجھے زندگی میں پہلی بار تجربہ ہو رہا تھا۔ میری خود اعتمادی میں اس وقت غیر معمولی اضافہ ہو گیا جب فلم کی ہیروئن نے جو ایک مشہور اداکارہ تھی اور خاصی حسین بھی تھی' نوجوان اسسٹنٹ کے فلرٹ کو انگیز کر لیا۔ جب فلم کا کام ختم ہو گیا اور مُرناؤ کو دوسرا کام کرنے کے لئے باہر جانا پڑا تو میں نے اس کو رخصت کرتے ہوئے اجازت طلب کی۔ اب مجھے اس کا اطمینان تھا کہ میرے منحوس دن ختم ہو چکے ہیں۔

اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد میرے ایک عزیز دوست انطون کوہ (Anton Kuh) نے (جو ویانا کے ایک اخبار نویس تھے اور حال ہی میں تھیٹر کے ناقد کی حیثیت سے برلین میں نمایاں ہوئے تھے) مجھے ایک فلم سینار یو

Marfat.com

لکھنے میں شرکت کی دعوت دی جوان کے سپرد کی گئی تھی۔ میں نے بہت گرم جوشی سے ان کی دعوت قبول کر لی اور سکرپٹ کی تیاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس کی اجرت قبول کر لی اور سکرپٹ کی تیاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس کی اجرت میں نے اور انطون کوہ نے برابر تقسیم کر لی۔ پھر فلم کی دنیا میں قدم رکھنے کی خوشی میں ہم نے برلین کے ایک انتہائی فیشن ایبل ہوٹل میں ایک زبردست پارٹی کا انتظام کیا' جب بل آیا تو معلوم ہوا کہ جتنی بھی رقم ملی تھی تقریباً وہ سب ہی فرانسیسی شرابوں' ماہی اچار اور جھینگا مچھلی کے سالن (Lobster) پر خرچ ہو گئی ہے' لیکن شاید میری قسمت اچھی تھی' ہم نے فوراً ہی ایک اور اسٹوری لکھنا شروع کر دی۔ اس کہانی کا ہیرو بالزک تھا۔ جس دن کہانی مکمل ہوئی' ٹھیک اسی دن اس کا خریدار بھی ہم کو مل گیا' لیکن ہم نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے اس کامیابی کی کوئی تقریب نہیں منائی بلکہ اس کے بجائے چھٹیاں منانے کی غرض سے میں بویریا کی جھیلوں میں چلا گیا' جہاں میں نے کئی ہفتے گزارے۔

پھر ایک سال کے بعد جو تمام متروسطی یورپ کے شہروں کی خاک چھاننے اور مختلف مہمات کو سر کرنے میں گزرا تھا اور جس میں مَیں نے ہر طرح کی عارضی ملازمتیں اور کاموں کا تجربہ کیا تھا' میں دنیائے صحافت میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

یونائیٹڈ ٹیلیگراف نیوز ایجنسی

یہ ۱۹۲۱ء کے موسم خزاں کا واقعہ ہے جو معاشی بدحالی کے ایک درمیانی وقفہ کے بعد پیش آیا۔

ایک شام کو جب میں (Café des Westens) میں تھکا ماندہ بیٹھا ہوا تھا۔ میرا ایک دوست میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ جب میں نے اس کو اپنے افکار اور پریشانیوں کی داستان سنائی تو اس نے ایک تجویز پیش کی۔ اس نے کہا تمہارے لئے ایک بہت اچھا چانس ہے۔ ڈامرٹ (Dammert) نے یونائیٹڈ پریس آف امریکہ کے تعاون سے اپنی ایک خاص خبر رساں ایجنسی قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اس ایجنسی کا نام یونائیٹڈ ٹیلیگراف ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں اسے خاصی تعداد میں سب ایڈیٹروں کی ضرورت پڑے گی۔ اگر تم پسند کرو تو میں اس سے تمہارا تعارف کرا دوں۔

ڈاکٹر ڈامرٹ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں برلین کے سیاسی حلقوں میں اچھی طرح معروف تھے۔ ساتھ ہی وہ کیتھولک فرقہ کی پارٹی کے سربرآوردہ ممبر اور خود اپنی ذات سے ایک دولت مند آدمی تھے جس کی وجہ سے ان کی شہرت دو چند ہو گئی تھی۔ ان تمام چیزوں نے مجھے کافی اپیل کیا' چنانچہ دوسرے ہی روز میرے دوست مجھے ان کے دفتر لے گئے۔ ان کا ہم لوگوں کو بیٹھنے کی دعوت کا انداز ہی بتا رہا تھا کہ یہ متوسط عمر کا شخص کافی خلیق اور مہذب ہے۔

مسٹر فنگال (Fingal) نے (یہ میرے دوست کا نام تھا) آپ کے بارہ میں مجھ سے گفتگو کی تھی۔ کیا آپ اس سے پہلے کبھی اخبار نویس کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں' انہوں نے سوال کیا۔

Marfat.com

میں نے کہا جی نہیں۔اس کا موقع تو کبھی مجھے نہیں ملا' البتہ دوسرے مختلف میدانوں میں مجھے کام کرنے کا اتفاق ضرور رہا ہے۔ میں ایک حیثیت سے مشرقی یورپ کے حالات سے بھی واقف ہوں۔اس کے علاوہ کئی زبانیں بھی جانتا ہوں' حالانکہ واقعہ صرف اتنا ہے کہ مشرقی یورپ کی جس زبان کو میں جانتا تھا وہ پولینڈ کی زبان تھی۔اس حصہ عالم میں جو واقعات پیش آ رہے تھے' اس کا بھی بس ایک دھندلا سا تصور میرے دماغ میں تھا' لیکن میں نے عزم کر لیا تھا کہ بیجا خاکساری کر کے اس موقع کو کسی حال میں نہیں کھونا ہے۔

اوہ.... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ مجھے سیاسی حالات کے ماہرین سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے' لیکن سردست مشرقی یورپ کے معاملات کے لئے کوئی ماہر رکھنے سے میں معذور ہوں۔ ڈاکٹر نے کچھ مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر نے ضرور میرے چہرہ پر مایوسی کو تاڑ لیا ہوگا' جب ہی انہوں نے اس کے معا بعد یہ جملہ کہا۔ ''لیکن بہر حال میں آپ کو ایک ابتدائی کام دوں گا اگرچہ شاید وہ آپ کے معیار سے پست ہو۔ ہاں تو یہ بتایئے کیا کام ہے وہ؟

میں نے مکان کے کرایہ کا خیال کرتے ہوئے جو کئی مہینے سے چڑھ گیا تھا' بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

ٹھیک ہے' مجھے دراصل ٹیلیفون کے لئے کچھ مزید آدمی درکار ہیں۔اوہ آپ فکر مند نہ ہوئیے' میری مراد سوئچ بورڈ پر کام کرنے والوں سے نہیں ہے۔ میں ٹیلیفون کے اس عملہ کے متعلق بات کر رہا ہوں جو صوبے کے اخبارات کو خبریں ارسال کرتا ہے۔

یقیناً یہ کام میری بڑھتی ہوئی توقعات سے پست تھا۔ میں نے ڈاکٹر ڈامرٹ کی طرف دیکھا اور انہوں نے میری طرف دیکھا۔ پھر ایک گہری سانس لیتے اور ہنستے ہوئے میں نے کہا۔ میں اس کے لئے تیار ہوں جناب!

دوسرے ہی ہفتہ میں نے اپنی ڈیوٹی سنبھال لی۔ یہ ایک اکتا دینے والا کام تھا اور صحافت سے جس کا میں خواب دیکھ رہا تھا' اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ بس میرا کام یہ تھا میموگرافڈ کاغذ کی شیٹ سے خبریں لے کر ٹیلیفون کے ذریعہ دن میں کئی کئی بار صوبہ کے متعدد بڑے اخبارات کو ارسال کرتا رہا ہوں' جو اس نیوز ایجنسی میں شریک تھے۔ یہ بات اور ہے کہ میں اپنے کام میں ممتاز تھا اور تنخواہ بھی کافی تھی۔

ایک ماہ اسی حال میں گزرا' البتہ مہینہ کے اختتام پر ایک بالکل خلاف توقع سنہرے موقع نے گویا خود میرے سامنے پیش کش کی۔

مادام گورکی

اسی سال ۱۹۲۱ء میں سویٹ روس میں ایسا زبردست قحط پڑا جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ بھوک نے لاکھوں آدمیوں کو اپنے پنجہ میں جکڑ لیا تھا اور لاکھوں فاقہ سے مر چکے تھے۔ یورپ کے اخبارات بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ اس ہولناک تباہی کے حالات شائع کر رہے تھے۔ روس کو غیر ملکی امداد دینے کے کئی غیر ملکی منصوبے بھی بنائے جا رہے

Marfat.com

تھے۔ایک منصوبہ کا محرک ہربرٹ ہُوور (Herbert Hoover) تھا جس نے جنگ عظیم کے بعد وسطی یورپ میں بہت سے نمایاں کام انجام دیئے تھے۔اسی طرح میکسم گورکی (Maxim Gorky) روس میں ایک بڑی تحریک چلا رہا تھا اور اس کے مؤثر بیانات پوری دنیا کو ہلا دے رہے تھے۔

اسی زمانہ میں یہ افواہیں اڑ رہی تھیں کہ اس کی بیوی رائے عامہ کو زیادہ سے زیادہ عملی امداد پر آمادہ کرنے کے لئے عنقریب مغربی اور وسطی یورپ کے دورہ پر آنے والی ہے۔

چونکہ میں محض ایک ٹیلیفونسٹ تھا' اس لئے بلا واسطہ طریقہ پر میں اس اندوہگیں واقعہ میں حصہ نہ لے سکا' لیکن ایک چلتے ہوئے جملہ نے مجھے اٹھا کر زبردستی اس منجدھار میں پھینک دیا جو میرے ایک ملاقاتی نے سرراہ مجھ سے رواداری میں کہہ دیا (میں یہ بتا تا چلوں کہ اکثر لوگوں سے میرا تعارف عجیب وغریب موقعوں پر ہوا ہے)۔میرا دوست Hotel Esplanade میں رات کا چوکیدار تھا۔یہ ہوٹل برلین کے بڑے ہوٹلوں میں شمار ہوتا تھا۔اس نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ ''یہ مادام گورکی بہت دلچسپ اور لطیف عورت ہے۔اس سے مل کر کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا کہ یہ بالشویک ہے۔''

مادام گورکی؟ تم نے اسے کہاں دیکھا؟

میرے دوست نے یکا یک اپنی آواز پست کر دی اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا' کل ہی شام کو تو وہ ہمارے ہوٹل میں آئی ہے اور نام بدل کر وہاں مقیم ہے۔صرف منیجر اس بات کو جانتا ہے۔وہ چاہتی ہے کہ اخبار کے رپورٹر اس کو پریشان نہ کریں۔تم کو یہ سب باتیں معلوم کیسے ہوئیں؟ میں نے پوچھا۔

ہم لوگ ہوٹل میں جو کچھ بھی ہوتا ہے' سب جانتے ہیں۔اس نے ہنستے ہوئے مجھ سے کہا۔اگر ہم یہ نہ کریں تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری ملازمت زیادہ دنوں تک باقی رہ سکتی ہے۔

اگر میں اس سے اس ملاقات میں کامیاب ہو جاؤں تو کتنی ہنگامہ خیز کہانی تیار ہو سکتی ہے۔میں نے اپنے دل میں سوچا' خصوصاً اس پوزیشن میں جبکہ پورے برلین میں اس کی موجودگی کے متعلق ایک لفظ بھی ابھی تک پریس میں نہیں آسکا ہے۔یہ خیال آتے ہی میں مجسم اشتیاق بن چکا تھا۔

میں نے اپنے دوست سے پوچھا، کیا کسی ترکیب سے تم اس سے میری ملاقات کروا سکتے ہو؟

ہاں مگر میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔بظاہر وہ اس پر مُصِر نظر آتی ہے کہ کسی سے ملاقات نہیں کرے گی' البتہ اتنا کر سکتا ہوں کہ جب وہ حسب معمول شام کے وقت لابی میں آ کر بیٹھے تو تم کو مطلع کر دوں۔

یہ سودا بہت اچھا تھا' میں عجلت کے ساتھ اپنے دفتر یونائیٹڈ ٹیلیگراف میں واپس آیا۔تقریباً پورا عملہ اس وقت گھر جا چکا تھا' لیکن میری خوش قسمتی کہ نیوز ایڈیٹر ابھی تک دفتر میں موجود تھا۔میں نے اس کا گریبان پکڑ کے ہلاتے ہوئے کہا۔

اگر میں تم سے ایک ہنگامہ خیز کہانی کا وعدہ کروں تو کیا تم مجھے اپنا پریس کارڈ دے سکتے ہو؟

Marfat.com

اور کس قسم کی کہانی ہوگی وہ؟ اس نے اس انداز میں پوچھا جیسے اس بات پر اس کو شبہ ہو۔

تم مجھے اپنا کارڈ دو گے اور میں تمہیں کہانی دوں گا۔ اگر میں وعدہ پورا نہ کروں تو اپنا کارڈ واپس لے لینا۔

آخر کار بوڑھے اور تجربہ کار نیوز ایڈیٹر نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی اور میں بہت فخر اور مسرت کے ساتھ اس کارڈ کو اپنے قبضہ میں کئے ہوئے (جس میں میں یونائیٹڈ ٹیلیگراف کا نمائندہ بن گیا تھا) دفتر سے باہر آ گیا۔

اس کے بعد کچھ گھنٹے مجھے Hotel Esplanade کی لابی میں گزارنے پڑے۔ نو بجے میرا دوست اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لئے آیا اور کنکھیوں سے دروازہ کی طرف اشارہ کیا۔ پھر استقبالیہ ہال کے پیچھے غائب ہو گیا' پھر فوراً ہی واپس آ کر مجھے بتایا کہ مادام گورکی نکل چکی ہیں اور اگر میں دیر تک یہاں بیٹھوں تو اس کو دیکھنے میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔

گیارہ بجے کے قریب پھر میں نے اپنے دوست کا اشارہ پایا' جو مجھے ایک عورت کی طرف متوجہ کر رہا تھا جو عین اسی وقت دروازہ سے نکل رہی تھی۔ وہ ایک مختصر سی عورت تھی۔ عمر اندازاً پینتالیس سال کی رہی ہوگی اور اس وقت سیاہ پوشاک میں ملبوس تھی جس کو بہت اچھے طریقہ پر زیب تن کیا گیا تھا۔ اس کے شانوں پر ایک ریشمی کپڑا پڑا ہوا تھا جو پیچھے زمین پر لوٹ رہا تھا۔ اپنی ظاہری زیبائش میں وہ خالص ارستقراطی قسم کی عورت معلوم ہوتی تھی' اتنی زیادہ ارستقراطی (Aristocrate) کہ میرے لئے تصور کرنا مشکل تھا کہ وہ ''محنت کش انسان کے شاعر'' کی بیوی ہے' نہ وہ سوویٹ یونین ہی کی باشندہ معلوم ہو رہی تھی۔ میں اس کے سامنے آ گیا اور قدرے جھکتے ہوئے انتہائی نرم اور مہذب لہجہ میں اس کو مخاطب کیا۔

مادام گورکی...

ایک لحہ کے لئے وہ مبہوت سی ہو گئی' لیکن پھر ایک دلفریب مسکراہٹ نے اس کی حسین سیاہ آنکھوں میں ایک چمک پیدا کر دی۔ اس نے جرمن زبان میں جس میں سلاو (Slav) زبان کا اثر شامل تھا' مجھے جواب دیا۔ میں مادام گورکی نہیں ہوں' آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام یہ ہے (پھر اس نے ایک روسی طرز کا نام لیا جواب مجھے یاد نہیں)۔

میں اپنی بات پر مُصر رہا' نہیں مادام گورکی! میں جانتا ہوں کہ مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی ہے اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ آپ اخبار نویسوں سے بچنا چاہتی ہیں' لیکن آپ کے چند منٹ میرے اعتبار سے بہت قیمتی ہیں۔ دنیائے صحافت میں مجھے اپنی جگہ بنانے کے لئے یہ پہلا موقع مل رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ یہ پسند نہ کریں گی کہ یہ موقع رائیگاں جائے۔ میں نے کارڈ اس کے سامنے بڑھا دیا اور گفتگو جاری رکھی۔ میں نے اسے آج ہی حاصل کیا ہے اور اگر مادام گورکی سے چند منٹ لینے میں ناکام ہو جاتا ہوں تو یہ مجھے آج ہی واپس کرنا ہوگا۔

وہ مسکراتی رہی اور کہنے لگی۔

اگر میں اپنی عزت کی قسم کھا کر کہوں کہ میں مادام گورکی نہیں ہوں تو آپ یقین کر لیں گے؟ اگر آپ کسی چیز

Marfat.com

کے لئے بھی اپنی عزت کی قسم کھائیں گی تو میں اسے مان لوں گا۔ میں نے کہا۔

وہ ایک دم سے ہنس پڑی۔ پھر بولی' آپ بالکل ایک چھوٹا سا بچہ معلوم ہوتے ہیں۔ اب میں زیادہ آپ سے جھوٹ نہ بولوں گی۔ آپ ہی جیتے' لیکن ہم اب زیادہ دیر تک صحن میں بات نہیں کر سکتے۔ کیا آپ مجھے میرے کمرہ میں ساتھ چائے پینے کی مسرت بخشیں گے؟

اور اس طرح مجھے مادام گورکی کے ساتھ چائے پینے کی مسرت کا موقع دیا گیا۔ اس نے میرے ساتھ وہاں ایک گھنٹہ صرف کیا۔ وہ قحط کے ہولناک واقعات اور روح فرسا مناظر بڑی گرمجوشی اور تفصیل سے بیان کرتی رہی۔ نصف شب کے بعد جب میں نے اس کو رخصت کیا تو میری جیب میں کاغذات کا ایک چھوٹا سا پلندہ موجود تھا۔

رات کے ڈیوٹی والے سب ایڈیٹروں نے اتنی دیر رات میں میری خلاف معمول آمد کو حیرت کے ساتھ نوٹ کیا' لیکن میں ان کو اس داستان سنانے کی زحمت مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے کہ یہ کام مجھے بہت فوری طور پر انجام دینا تھا۔ اپنے آفس میں بیٹھ کر ہر ممکن عجلت کے ساتھ میں نے اس کو مرتب کرنا شروع کیا اور ایڈیٹر کی منظوری لئے بغیر ارجنٹ طریقہ پر میں نے یہ ساری رپورٹ صوبے کے تمام اخبارات کو جو ہم سے متعلق تھے' بھجوادی۔

دوسرے روز صبح یہ خبر کسی طرح بم سے کم نہ تھی۔ اس وقت جبکہ برلین کے بڑے بڑے اخبارات میں مادام گورکی کی آمد کے متعلق ایک اشارہ بھی نہ تھا۔ صوبے کے وہ تمام اخبارات جو ہماری ایجنسی سے خبریں حاصل کرتے تھے' اپنے پہلے صفحہ پر مادام گورکی سے یونائیٹڈ ٹیلیگراف کے نمائندہ کا انٹرویو شائع کر رہے تھے۔

ایک ٹیلیفونسٹ نے اول درجہ کی زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔

اسی روز سہ پہر کو ڈاکٹر ڈامرٹ کے آفس میں سب ایڈیٹروں کا جلسہ ہوا اور مجھے اس میں مدعو کیا گیا۔ پہلے مکالمہ کے بعد جس میں ایڈیٹر کی منظوری کے بغیر کسی اہم اخباری بیان کو براہ راست بھیجنے کی ممانعت کی گئی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ میں رپورٹر کے عہدہ پر پہنچا دیا گیا ہوں۔

اور اس طرح آخر کار جرنلسٹ میں ہو ہی گیا!

وہ سال عجیب وغریب تھے!

وسطی یورپ کے لئے اس صدی کی تیسری دہائی کے یہ چند عجیب وغریب تھے۔ اجتماعی اور اخلاقی انتشار و بدامنی کی فضا ہر طرف چھائی ہوئی تھی اور اس نے انسان میں ایک خطرناک امید پرستی پیدا کر دی تھی جس کا اظہار وہ موسیقی' فوٹو گرافی' تھیٹر اور آرٹ نیز کلچر کے مزاج اور اس کے ارتقاء کے بارہ میں انقلابی سوالات اور تحقیقات کے ذریعہ کر رہا تھا' لیکن ایک روحانی خلا ان مجبور سوالات کے پس منظر میں ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ انسان کے مستقبل کی طرف سے بڑھتی ہوئی مایوسی کی وجہ سے اس میں ایک مبہم "کلبی" اضافیت پیدا ہو گئی تھی۔

نوعمری کے باوجود یہ بات مجھ سے پوشیدہ نہ تھی کہ جنگ کے بعد انتشار زدہ اور بے چین یورپ کے حالات قابل اطمینان نہیں تھے۔ اس دنیا کا معبود جیسا کہ میں نے مشاہدہ کیا' کوئی روحانی قسم کا معبود نہ تھا' بلکہ راحت و

Marfat.com

آسائش ہی اس کا معبود بن گئی تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہاں ایسے بھی لوگ تھے جو مذہبی فکر رکھتے تھے اور اپنے اخلاقی نظریات اور عصر جدید کی روح میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے بڑی حد تک مضطربانہ کوششوں میں مشغول تھے' لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک عام یوروپین آدمی خواہ وہ جمہوریت کا دعویدار ہو یا کمیونسٹ' مزدور ہو یا مفکر صرف ایک ایجابی مذہب سے واقف ہے اور وہ ہے مادی ترقی کی پرستش۔ یہ عقیدہ کہ دنیا میں اس زندگی کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ اور پُر لطف بنانے کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہے یا جیسا کہ اس زمانہ میں کہا جاتا تھا' فطرت سے آزاد زندگی کی تعمیر۔ اس مذہب کی عبادت گاہیں' زبردست کارخانے' شاندار سینما کے ستارے' اعداد و شمار کے ماہرین' صنعتکار اور ہوا باز تھے۔ اس روحانی ناکامی و بے چینی کا نتیجہ یہ تھا کہ خیر و شر کی تعریف پر کلّی اتفاق بالکل مفقود تھا۔ اجتماعی و اخلاقی مسائل مصلحت کے تابع بن کر رہ گئے تھے۔ شہر کی آراستہ و خوش لباس نوجوان عورت اپنے کو ہر شخص کے حوالے کرنے کے لئے تیار تھی جبکہ اس کو اس کی دعوت دی جائے۔ اقتدار و لذت کی یہ جوع البقران تمام چیزوں نے مغربی سوسائٹی کو کئی مسلح اور باہم دست و گریبان پارٹیوں میں تقسیم کر دیا تھا جہاں ہر ایک نے مفادات اور مصالح کے تصادم کے موقع پر ایک دوسرے کو کچل دینے کا عزم کر رکھا تھا۔

کلچر کے میدان میں ایک ایسا انسانی نمونہ تراشا گیا تھا جس کی ساری فضلیت اور برتری عملی منفعت میں تھی اور مادی کامیابی اس کے حق و باطل کی واحد معیار تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہماری زندگی کتنی مضطرب' بے کیف اور ناخوشگوار ہو گئی ہے۔ انسانوں کے باہمی تعاون اور اتحاد کا کس قدر فقدان ہے۔ ہماری دلچسپی اپنے فرقہ اور اپنی پارٹی سے رہ گئی ہے۔ فطری احساسات سے ہم کتنی دور جا پڑے ہیں۔

میں نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا' لیکن یہ خیال میرے دل میں نہیں آیا اور شاید میری طرح کسی اور کے دل میں بھی نہیں آیا ہو گا کہ ان سوالات کا جواب بھی ممکن ہے یا کم از کم جزئیات میں (یورپ کے ثقافتی تجربوں کا سہارا لئے بغیر) اس کے جوابات دیئے جا سکتے ہیں۔ یورپ ہی ہماری فکر کی ابتدا تھا اور وہی انتہا!

چین کا لاؤتسے (Lao-tse) فلسفہ بھی جس کا انکشاف مجھے سترہ سال کی عمر میں ہوا تھا' مستقبل کے بارہ میں میرے رائے میں کوئی تبدیلی نہ کر سکا۔

"لاؤتسے" فلسفہ سے تعارف

حقیقت میں وہ ایک انکشاف ہی تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی لاؤتسے کا نام بھی نہ سنا تھا اور نہ اس کے فلسفہ کے بارہ میں میرے دماغ میں کوئی تصور پہلے سے موجود تھا' لیکن ویانا کے ایک کتب خانہ میں مجھے اس کی ایک کتاب Tao-te-king کا جرمن ترجمہ محض اتفاق سے دستیاب ہو گیا۔ کتاب اور مصنف کے عجیب نام نے خواہ مخواہ مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ جب میں اس کو الٹ پلٹ رہا تھا تو میری نظر اس کی ایک مختصری فصل پر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ

Marfat.com

اس میں بہت سی حکمت کی باتیں ہیں۔ میں نے اپنے جسم میں ایک اچانک سنسنی سی محسوس کی اور مسرت وشادمانی کے احساس میں ڈوب کر اس کتاب میں اس طرح کھویا کہ مجھے اپنے دائیں بائیں کی بھی خبر نہ رہی۔ میں بالکل گنگ تھا اور کتاب میرے ہاتھ میں تھی۔

میں نے اس میں انسانی زندگی کو پورے سکون اور ٹھیراؤ کے ساتھ پایا۔ ایسی زندگی جو ہر قسم کے انتشار اور جھگڑوں بکھیڑوں سے پاک تھی' جس کی پرورش ایسی پُرسکون شادمانی میں ہوئی تھی جو ہر انسانی قلب کی دسترس میں ہے بشرطیکہ وہ اپنی اس خاص حریت کو حاصل کرنا چاہے۔

• یہ تھی حقیقت جس کو میں نے پہچان لیا تھا۔ حقیقت جو ازل سے حقیقت ہے باوجود اس کے کہ ہم اس کو بھول چکے ہیں۔ آج میں نے اس کو دیکھ لیا تھا۔ خوش نصیبی اور مسرت کے احساس کے ساتھ اس کو پالیا تھا' ایسی مسرت کا احساس جو آدمی کو ایک طویل جدائی کے بعد اپنا وطن دیکھ کر ہوتی ہے۔

اس دن سے برابر لاؤتسے (Lao-tse) میرے لئے ایک ایسا روشندان بن گیا جس سے میں اس زندگی کا مشاہدہ کر سکتا تھا جو کانچ کی طرح شفاف تھی اور تنگی اور خوف سے بہت دور تھی۔ جو اس طفلانہ بھول سے خالی تھی جس کا ہم وقتاً فوقتاً شکار ہوتے رہتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم کو ہر قیمت پر مادی ترقی کے ذریعہ اپنے وجود کی حفاظت کرنا ہے۔ اس بات سے یہ خیال ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ میں مادی ترقی کو گناہ سمجھتا تھا یا بے ضرورت خیال کرتا تھا۔ اس کے برخلاف میں اس کو صالح اور ضروری سمجھتا تھا' لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس بات پر مطمئن تھا کہ مادی ترقی انسان کی سعادت اور مسرت میں اضافہ کرنے میں مجموعی طور پر اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی' جب تک اس میں ہمارے روحانی رجحانات کی تنظیم بھی شامل نہ ہو اور ازلی وابدی حقائق پر ایمان نہ لایا جائے' لیکن ان رجحانات کی تنظیم کیسے ہو اور ان حقائق اور اقدار کی نوعیت کیا ہو؟ یہ بات پوری طرح مجھ پر واضح نہ ہوئی تھی۔

یہ بڑی ناسمجھی ہوتی اگر میں لوگوں سے اس بات کا متوقع ہوتا کہ وہ محض ایک شخص کے وعظ ونصیحت سے اپنا مقصد اور منزل بدل دیں گے اور اپنی کوشش اور جدوجہد کا رخ موڑ دیں گے' جیسا کہ لاؤتسے کا طرزِ عمل تھا جو یہ کہتا تھا کہ وہ زندگی کے لئے اپنے دل کے دروازے کھول دے' بجائے اس کے اس کو اچک لینے یا اس پر قبضہ کرنے کی کوشش میں اس کے لئے سختی اور زیادتی کا موجب بنے۔ صرف وعظ' صرف عقلی ادراک' قدرتی طور پر مغربی معاشرہ کے روحانی رجحان میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے سے قاصر تھا' اس کے لئے ایک نئے قلبی ایمان اور ان اقدار کے سامنے سپر ڈالنے کی ضرورت تھی' جس میں ''اگر'' اور ''لیکن'' کی گنجائش نہیں ہے' لیکن یہ ایمان دستیاب کہاں سے ہوتا'؟

مجھے یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ لاؤتسے کے طاقتور چیلنج کا مقصد صرف ایک عارضی اور قابل تغیر ذہنی رویہ نہیں تھا' بلکہ بعض جوہری اور بنیادی تصورات بھی تھے جن سے یہ رجحان یا رویہ پیدا ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مغرب کبھی اس روحانی سکون سے ہمکنار نہیں ہو سکتا جس کو لاؤتسے نے پیش کیا ہے۔ ہاں وہ دل پر پتھر رکھ کر اپنی تمام اخلاقی اور روحانی اقدار پر شبہ کرنے کے لئے تیار ہو تو ایسا ممکن ہے۔ اس وقت میرے بس میں نہیں تھا کہ کسی نتیجہ

Marfat.com

تک پہنچ سکوں اور چینی فلسفی کے چیلنج کو اس کے تمام معانی و مشتملات اور اس کی کامل عظمت کے ساتھ سمجھ سکوں۔ اتنی بات ضرور ہے کہ اس کے پیغام نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے میرے سامنے زندگی کا ایک نقشہ رکھا تھا جس کو اپنا کر انسان اپنے مستقبل اور انجام کو فتح کر سکتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اپنے نفس و روح کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتا ہے' لیکن چونکہ یہ بات صاف نہ تھی کہ یہ فلسفہ فکر اور تدبر کی منزلوں سے آگے بڑھ سکے گا اور مغربی طرز زندگی پر نافذ کیا جا سکے گا' اس لئے میں نے تدریجی طور پر اس پر شبہ کرنا شروع کیا کہ آیا عملی طور پر اس کا نفاذ ممکن بھی ہے یا نہیں؟ میں اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ یہ فیصلہ کر سکوں کہ کیا مغربی زندگی اپنی بنیادوں کے اعتبار سے واحد ممکن راستہ ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ اور لوگوں کی طرح میں بھی مغرب کے انانیتی تہذیبی نقطۂ نظر سے بالکل گھل مل گیا تھا۔

اور اسی طرح لاؤ تسے---اگر چہ اس کی صدا کبھی خاموش نہ ہوئی---آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا گیا اور آخر کار مفکرانہ اوہام و خیالات کے پیچھے بھی پڑ گیا اور مرور زمانہ کے ساتھ اس کی قیمت میرے لئے شاعری کی ایک لطیف کتاب سے زیادہ نہ رہ گئی۔ میں وقتاً فوقتاً اس کا مطالعہ کرتا اور ہر بار مجھے ایک خوشگوار امید کا احساس ہوتا' لیکن ہمیشہ میں کتاب کو ایک طرف رکھ دیتا۔ مجھے اس کا افسوس تھا کہ اس میں گنبد کے اندر رہ کر خواب دیکھنے کی دعوت تھی' اگر چہ میں ہمیشہ یہ محسوس کرتا رہا کہ میں اس تلخ و حریص اور کینہ توز دنیا سے پوری قوت کے ساتھ برسر پیکار ہوں' لیکن تخیلات کے گنبد میں زندگی گزارنے کے لئے بھی میں تیار نہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں ان مقاصد اور کوششوں کے لئے اپنے اندر کوئی گرم جوشی نہیں پاتا تھا جو یورپ کے ثقافتی اور تہذیبی شعبہ پر حاوی تھیں اور تند و تیز اختلافات کی جھنجھناہٹ کے ساتھ اس کے ادب اور آرٹ اور سیاست پر چھا گئی تھیں۔ ان مقاصد یا کوششوں کے سلسلہ میں جتنے بھی اختلافات اور رائیں ہوں' لیکن ایک بات پر سب متفق تھے اور وہ تھا یہ غلط مفروضہ کہ اگر زندگی کے ظاہری حالات (سیاسی اور اقتصادی) بہتر اور صحت مند ہوں' تو موجودہ انتشار اور انارکی کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ عین اسی زمانہ میں میرا یہ احساس بھی شدید تر ہو گیا تھا' محض مادی ترقی اس مسئلہ کو حل نہیں کر سکتی' اگر چہ میں بالکل نہیں جانتا تھا کہ اس کا حل کیا ہو سکتا ہے؟

اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ میں مسرت اور سعادت سے دور تھا۔ میں اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی قنوطی اور عزلت پسند نہیں رہا' بلکہ اس زمانہ میں معمول سے زیادہ تندہی اور کامیابی کے ساتھ اپنے عملی کاموں میں مشغول تھا اور اسی زمانہ میں یونائیٹڈ ٹیلیگراف کی ملازمت سے (جہاں میں کئی زبانوں سے واقفیت کی وجہ سے اسکنڈے نیوین نیوز سروس کا انچارج بنا دیا گیا تھا) یہ بات میرے سامنے آئی کہ اس نے میرے سامنے ایک وسیع دنیا کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ میرے زیادہ تر دوست ممتاز اہل قلم' فنکار' اخبار نویس' ایکٹر' پروڈیوسر تھے۔ اس کے علاوہ ایسے متعدد اصحاب سے میری ملاقات اور دوستی تھی' جو کافی شہرت کے مالک تھے اور میں اپنی رائے کو (ایک رائے کی حیثیت سے' شہرت کے اعتبار سے نہیں) کسی طرح ان کی رائے سے کمتر سمجھنے پر تیار نہیں تھا۔ اس کے ساتھ متعدد بار میری زندگی میں عارضی اور وقتی رومان کے مراحل بھی آئے۔ زندگی میری نگاہ میں بہت حسین اور دلفریب تھی۔ میں قطعاً مایوس اور دل شکستہ نہ

Marfat.com

تھا۔

لیکن ہاں اپنے دل کی گہرائیوں کے اعتبار سے بالکل غیر مطمئن تھا اور مجھے اپنی زندگی کا صحیح مقصد معلوم نہ تھا' البتہ جوانی کے زعم باطل میں مجھے اس کا یقین تھا کہ اپنے مقصد کو معلوم کرنے میں میں کسی دن ضرور کامیاب ہوں گا۔ الغرض اسی طرح میں اطمینان اور بے اطمینانی' سکون اور انتشار کے درمیان جھولا جھولتا رہا۔ ان عجیب وغریب برسوں میں یہی حال اور دوسرے نوجوانوں کا بھی تھا۔ ان میں سے کوئی بھی بدقسمت یا مصیبت زدہ نہ تھا' لیکن مشکل ہی سے کوئی ایسا ملتا تھا جو حقیقت میں مطمئن اور مسرور ہو' اور اس کی اپنی اس مسرت اور اطمینان کا احساس بھی ہو۔ ٹھیک ہے میں غیر مطمئن اور بے چین نہیں تھا' لیکن اپنے ساتھیوں اور رفیقوں کی اقتصادی وسیاسی امیدوں اور تمناؤں کا ساتھ نہ دے سکنے کی وجہ سے مجھ میں امتداد زمانہ کے ساتھ یہ احساس ترقی پاتا گیا کہ میں ان میں کا ایک فرد نہیں ہوں۔ اس کے ساتھ یہ مبہم خواہش بھی شامل تھی کہ کاش میں فرد ہوتا' لیکن کس جماعت کا؟ کس سوسائٹی کا؟

مشرق وسطی کا سفر

ایک روز ۱۹۲۲ء کے موسم بہار میں مجھے اپنے ماموں ڈوریان (Dorian) کا خط ملا۔ ڈوریان میرے ماموں تھے' لیکن ہمارے تعلقات ماموں بھانجہ کے رشتے سے زیادہ دوستی کے تھے۔ وہ فرائڈ کے ایک شاگرد اور نفسیاتی معالج تھے اور اس زمانہ میں بیت المقدس کے امراض عقلیہ کے اسپتال میں ایک ذمہ دار آفیسر تھے۔ وہ صیہونی (Zionist) نہ تھے اور نہ یہودیوں کے عزائم اور منصوبوں سے انہیں کوئی ہمدردی تھی' مگر چونکہ عربوں سے بھی ان کے کوئی خاص تعلقات نہ تھے' اس لئے ان کو اس ماحول میں جہاں آمدنی وخرچ کے علاوہ اور کوئی مشغلہ نہ تھا' تنہائی اور عزلت کا احساس ہونا لازمی تھا۔ ان کی شادی بھی ابھی نہیں ہوئی تھی' اس لئے انہوں نے سوچا کہ ممکن ہے میں کسی حد تک ان کی رفاقت کر سکوں۔ اپنے خط میں انہوں نے ویانا کے ان حسین ایام کا بھی ذکر کیا جس نے انہیں تحلیل نفسیات کی ایک نئی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ خط کے آخر میں انہوں نے یہ لکھا چند ماہ کے لئے یہاں آ جاؤ۔ کچھ دن ساتھ رہیں' تمہاری آمد اور واپسی کے تمام اخراجات میرے ذمہ ہوں گے۔ جب تمہارا دل چاہے برلین واپس چلے جانا۔ یہاں ہم پتھر کے ایک اچھے مکان میں جو گرمی میں ٹھنڈا رہتا ہے' رہیں گے۔ میرے یہاں کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ بھی ہے' اگر تم طبعی مناظر سے جو یہاں بکثرت ہیں اکتا جاؤ تو ان کتابوں سے دل بہلا سکتے ہو۔

میں نے غیر معمولی سرعت کے ساتھ روانگی کا فیصلہ کر لیا۔ میرا یہ مزاج تھا اور میرے اہم سے اہم فیصلے اسی سرعت کے ساتھ ہوتے تھے۔ دوسری صبح میں نے ڈاکٹر ڈامرٹ کو اطلاع دی کہ بعض بہت ضروری عملی مصالح کی بنا پر مجھے مشرق وسطی کا سفر کرنا پڑ رہا ہے اور اس مقصد سے مجھے ایجنسی کو ایک ہفتہ کے اندر چھوڑ دینا ہے۔

اگر کوئی شخص اس وقت مجھ سے کہتا کہ عالم اسلام سے میرا تعارف تعطیل گزارنے سے زیادہ آگے کی بات ہوگی اور وہ میری زندگی کا انقلابی موڑ ہوگا' تو میں اس بات کو ہنس کر اڑا دیتا اور اس کو بہت ہی غلط اندازہ قرار دیتا۔ اس

Marfat.com

کی وجہ یہ نہ تھی کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو ان ممالک کی دل فریب چیزوں سے جن کے ساتھ میرے دماغ میں (اور یوروپین لوگوں کی طرح) الف لیلہ کا تصور آ جاتا تھا' متاثر نہیں ہوتے۔ یہ بات نہ تھی' میں تبدیلیوں' نئے عادات اور اطوار اور خوشگوار ملاقاتوں کا ہمیشہ سے شائق رہا ہوں' لیکن جہاں تک روحانی دنیا کی سیروسیاحت کا تعلق ہے' یہ بات میرے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھی۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سفر میرے لئے ذاتی طور پر کوئی اہمیت رکھتا ہے۔

اس سے پہلے جو میرے افکار و تاثرات تھے' ان کو میں طبعی طور پر مغربی عالمی طرز فکر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ جس تہذیبی ماحول کے اندر میں زندگی گزار رہا ہوں' اسی کے اندر رہتے ہوئے مجھے زیادہ شعور اور زیادہ وسعت نظر حاصل ہو۔ میں اپنے شعور و خیال سے ہٹ کر کوئی بات سوچ ہی کیسے سکتا ہوں۔ میں بہر حال ایک مغربی نوجوان تھا جس کے رگ و ریشہ میں یہ عقیدہ پیوست ہوتا ہے کہ اسلام اور اس کی تمام تعلیمات کی حیثیت تاریخ انسانی کے ایک رنگین بغلی راستے سے زیادہ نہیں' جو روحانی اور اخلاقی کسی بھی نقطہ نگاہ سے کچھ زیادہ وقیع اور قابل احترام نہیں' اس لئے نہ صرف یہ کہ اس کو اس درجہ پر نہیں رکھا جاتا تھا جس کا وہ مستحق تھا' بلکہ اس کو دوسرے مذاہب عیسائیت اور یہودیت سے (جس کو مغربی سنجیدگی کے ساتھ قابل غور سمجھتا ہے) موازنہ کے قابل بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اسلامی امور و معاملات میں یورپ کی اس مبہم غلط نظری کو اپنے ساتھ لئے ہوئے (اگر چہ وہ قدرتی طور پر ان خارجی مظاہر کے خلاف نہ تھی جنہوں نے مسلمانوں کی زندگی میں ایک طرح کا رومان اور دلکشی پیدا کر دی ہے) میں نے ۱۹۲۲ء کی گرمیوں میں یہ سفر شروع کیا' اگر میں اپنے ساتھ انصاف کرتے ہوئے یہ کہنے سے گریز کروں کہ میں اپنے شخصی احساس میں مستغرق تھا تو اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں اس مغربی ثقافتی عقلیت کا شکار ضرور تھا جو خود پرستی کا شکار تھی اور یہ ہر زمانہ میں مغرب کا خاصہ رہا ہے۔

اب میں مشرق کے سفر کی نیت سے بحری جہاز پر سوار تھا۔ پہلے رومانیہ کے ایک مقام پہنچا کونس ٹانزا (Constanza) وہاں سے ایک کہر آلود صبح کو بحر اسود میں آ گیا۔ ایک سرخ بادبانی کشتی پانی کو چیرتی ہوئی ہمارے جہاز کے پاس سے گزری اور ہم اس کو دیکھ سکے' جو اس بات کی علامت تھی کہ سورج عنقریب کہر کے پیچھے سے نمودار ہونے والا ہے۔ اس کی چند اور نازک کرنیں سطح سمندر پر پڑنے لگیں۔ ان میں کسی قدر پیتل کی سی رزدی اور سختی نظر آ رہی تھی۔ اس کے دباؤ سے دودھ جیسے سفید کہر کے پرے سطح سمندر پر جم گئے۔ پھر وہ سورج کی شعاعوں کے دائیں بائیں اس طرح چھٹنے لگیں جس طرح پرند پر کھول رہے ہوں!

فادر فیلکس

صبح بخیر...... ایک بھاری آواز نے مجھے چونکا دیا۔ جب میں پیچھے مڑا تو میں نے اس سیاہ چیسٹر کو پہچان لیا

Marfat.com

جو گذشتہ رات میرے رفیق نے پہن رکھا تھا۔ وہ میٹھی مسکراہٹ بھی مجھے یاد آ گئی جس سے میں تعارف کے چند ہی گھنٹوں کے اندر مانوس ہو گیا تھا۔ یہ یسوعی پادری تھے' نصف فرانسیسی اور نصف پولستانی۔ وہ اسکندریہ کے ایک کالج میں تاریخ کے استاد تھے اور چھٹی گزار کر واپس ہو رہے تھے۔ جہاز پر سوار ہونے کے بعد دیر رات تک ان کے ساتھ دلچسپ مجلسیں رہی تھیں۔ اگرچہ یہ بات بہت جلد واضح ہو گئی تھی کہ ہم دونوں کے نقطۂ نظر میں بڑا فرق ہے' تاہم کچھ ایسے نکات بھی تھے جو ہم دونوں کے لئے یکساں دلچسپی کا باعث تھے۔ مجھے یہ جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ میں ایک ذہین اور خوش طبع انسان کے سامنے کھڑا ہوں۔

صبح بخیر..... فادر فیلکس (Felix) ذرا سمندر کو تو دیکھئے۔ میں نے جواب دیا۔

آفتاب نکلنے کی وجہ سے کافی روشنی پھیل ہو گئی تھی اور سمندر میں مختلف قسم کے رنگ نظر آ رہے تھے۔ ہم لوگ جہاز کے اگلے حصے میں کھڑے تھے' صبح کی خوشگوار ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی' بے ساختہ میرا دل چاہا کہ ان تمام چیزوں کو اپنے اندر سمولوں اور ڈوبتی ابھرتی لہروں میں رنگوں کے کھیل کا خود اپنے اندر مشاہدہ کروں۔ نیلی؟ سبز؟ خاکی؟ لیکن میں اس دلچسپ کھیل کو جو نہ جانے کب سے ایک خاص انداز کے ساتھ جاری ہے' قابو میں نہ لا سکنے کی وجہ سے جلد ہی جسمانی تکان محسوس کرنے لگا۔

جب میں سمندر کو اپنے اس زاویہ نگاہ سے دیکھ رہا تھا تو اس وقت چند لمحوں کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ ان تمام نیرنگیوں اور بوقلمونیوں کی ایک مکمل تصویر لینے کا امکان موجود ہے' لیکن خیال کو ایک نقطہ نظر پر مرکوز کرنے اور ایک مفہوم کو دوسرے مفہوم سے جوڑنے سے سوائے چند متفرق اور منتشر تصویروں کے کچھ ہاتھ نہ لگا' البتہ اس ذہنی انتشار کے نتیجہ میں ایک خیال بہت واضح طور پر میرے دل میں آیا (یا یہ کہنا چاہیے کہ محسوس ہوا) اور خود بخود یہ جملہ میری زبان پر آ گیا کہ جو شخص ان سب چیزوں کو اپنے احساس سے سمجھ سکتا ہے' وہ شاید اپنی تقدیر پر بھی قابو حاصل کر سکتا ہے۔

میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ فادر فیلکس نے جواب دیا' لیکن آدمی کو اپنی تقدیر یا قسمت پر قابو پانے کی فکر ہی کیوں کرنی چاہئے۔ کیا تکلیفوں سے فرار کے لئے؟ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آدمی اپنی تقدیر کی فکر سے آزاد ہی رہے؟

_____ اس وقت آپ ایک بودھ کے انداز میں بات کر رہے ہیں فادر فیلکس..... کیا آپ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ "فنا" ہر جاندار کی منزل ہے؟

_____ اوہ' کبھی نہیں' ہرگز نہیں' ہم مسیحی زندگی اور حس کے زوال یا فنا کے قائل نہیں ہیں۔ ہم تو فقط یہ چاہتے ہیں کہ اس زندگی کو مادیت کے دائرہ سے نکال کر روح کی آفاقیت کی طرف لے جائیں۔

_____ لیکن کیا یہ اس زندگی کا انکار نہیں ہے؟

_____ نہیں میرے نوجوان دوست! یہ زندگی کا انکار نہیں ہے' بلکہ یہی حقیقی زندگی اور سلامتی کا واحد راستہ ہے۔

میں نے نظر اٹھائی' آبنائے باسفورس ایسا لگ رہا تھا' جیسے پانی کا ایک چوڑا راستہ ہو اور اس کے دونوں

Marfat.com

جانب پتھریلے ٹیلے ہوں' بڑے بڑے محل' دلفریب باغات' بلند قامت اور سیاہ رنگ سرو اور قدیم انکشاری (Janissary) قلعے' چنے ہوئے پتھروں کے بڑے بڑے ڈھیر' جو پانی پر اس طرح لٹک رہے تھے جیسے شکاری چڑیوں کے گھونسلے!

میرے کان سے فادر فیلکس کی آواز ٹکرائی جو اپنی گفتگو جاری رکھے ہوئے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ آواز کافی فاصلہ سے آرہی ہے۔

ذرا تصور کرو انسان کے شوق اور تمنا کا سب سے بڑا رمز بہشت ہے۔ ہم ہر مذہب میں یہ تصور پائیں گے' خواہ اس کی صورتیں اور شکلیں مختلف ہوں' لیکن مطلب سب کا ایک ہی ہے اور وہ ہے وہی انجام سے فرار کی خواہش۔ بہشت میں انسان کا کوئی انجام نہ ہوگا۔ بہشت جس کو انہوں نے اس جسم کے تقاضوں کے سامنے جھک کر اور پہلا گناہ کر کے حاصل کیا ہے۔ روح جسمانی تقاضوں سے (جو درحقیقت فطرت انسانی میں حیوانیت کے بچے کھچے آثار کی ایک شکل ہے) ٹکراتی ہے۔ انسان میں اس کا جوہری جز صرف اس کی روح ہے۔ نفس نور کی طرف لپکتا ہے جو روح ہے' لیکن پہلے گناہ کی بدولت اس کی راہ میں جسم کے غیر الٰہی مادی تقاضوں اور خواہشات سے پیدا شدہ رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے مسیحی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اس کے عارضی حیوانی وجود سے آزاد کر کے روحانی میراث سے آشنا کیا جائے۔

دو جڑواں برجوں والا قلعہ ''رومَلی حصار'' ہماری نگاہ کے سامنے تھا۔ اس کی ایک دیوار اتنی جھک گئی تھی کہ قریب تھا کہ سطح سمندر سے چھو جائے۔ کنارے پر قلعوں کی دیواروں کا ایک دائرہ سا بنا ہوا تھا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا پُرسکون ترکی مقبرہ تھا۔ ہوسکتا ہے فادر فیلکس' لیکن میں محسوس کرتا ہوں اور نسل کے بہت سے لوگوں کا یہی احساس ہے کہ انسان میں جوہر اور عرض کی تعبیر کرنے میں یا زیادہ واضح الفاظ میں جسم اور روح کی تفریق میں کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ جسمانی تقاضے اور دنیاوی ترقی ہر بھلائی سے خالی ہے۔ میرا ذوق اس کے برعکس ہے۔ میں ایک ایسی زندگی کا خواب دیکھ رہا ہوں۔ اگرچہ مجھے اعتراف ہے کہ میں اسے اچھی طرح سے سمجھ نہیں سکا ہوں ___ جس میں انسان جسم اور روح سمیت ایک ایسی مکمل اور ٹھوس شخصیت کی تکمیل کے لئے کوشاں ہو جہاں روح اور جذبات میں کوئی آویزش نہ ہو اور وہ ایک دوسرے کے دشمن نہ ہوں جس کے ذریعہ وہ انسان اپنے وحدت واتحاد کو پا سکے اور اپنے انجام اور تقدیر سے واقف ہو اور اپنے عروج کے وقت یہ کہہ سکے:

''میں خود ہی اپنی تقدیر ہوں۔''

___ یونانیوں نے یہی خواب دیکھا تھا۔ فادر فیلکس نے جواب دیا' لیکن دیکھو تو یہ خواب ان کو کہاں کہاں بھٹکاتا رہا' آرفک (Orphic) اور دیونیزی (Dionysian) اسرار میں افلاطون اور فلاطینس (Plotinus) کے جھگڑوں میں' پھر آخران کو بھی اقرار کرنا پڑا کہ روح اور جسم دو متضاد چیزیں ہیں۔

روح کو جسم کی بندشوں سے آزاد کرانا' یہی مسیحی تصور نجات ہے۔ خود خدا کا سولی پر چڑھ جانے کا یہی مقصد

Marfat.com

تھا۔ پھر اچانک بات ختم کر کے وہ میرے طرف مڑے اور پلک جھپکا کر کہنے لگے۔ اوہ مجھے ہمیشہ پادری ہی نہیں بنے رہنا چاہئے' معاف کیجئے گا' میں آپ کو اس عقیدہ کی تبلیغ کرنے لگا جو آپ کے عقیدہ سے بالکل مختلف ہے۔

میں نے زور دیتے ہوئے کہا' لیکن میرا تو کوئی عقیدہ ہی نہیں ہے۔ فادر فیلکس نے جواب دیا کہ دین کا یہی فقدان یا زیادہ صاف الفاظ میں ایمان پر عدم قدرت ہمارے موجودہ زمانہ کی بنیادی کمزوری ہے۔ ہم اور تم جیسے بہت سے لوگ اس جھوٹے وہم میں پڑے ہوئے ہیں جو ہزاروں برس سے قائم ہے۔ یہ وہم کہ صرف عقل ہی انسان کی جدوجہد اور کوشش کا رخ متعین کر سکتی ہے' لیکن یہ جاننا چاہیے کہ عقل خود بھی روحانی معرفت تک نہیں پہنچ سکتی' اس لئے کہ اس کو اپنے مادی مقاصد کی تکمیل ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ ایمان اور صرف ایمان ہم کو اس استغراق سے نجات دے سکتا ہے۔

میں نے کہا۔ ایمان؟ آپ بار بار ایمان کا ذکر کرتے ہیں اور میں اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔ آپ کہتے ہیں کہ عقل کے ذریعہ معرفت کا حصول اور پاکیزہ زندگی کی تشکیل ناممکن ہے' اس کے لئے ایمان کی ضرورت ہے۔ یہاں تک میں آپ کی بات سے متفق ہوں' لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آدمی کے اندر ایمان سرے سے موجود ہی نہ ہو تو وہ کیا کرے۔ کیا اس کی کوئی سبیل ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کیا کوئی ایسا کھلا ہوا راستہ موجود ہے جس پر چل کر ہم جب چاہیں ایمان تک پہنچ سکتے ہیں۔

میرے عزیز دوست صرف عزم اور ارادہ ہی کافی نہیں ہے۔ یہ راستہ اللہ کے فضل اور ہدایت سے کھلتا ہے' لیکن جو شخص عبادت کرتے ہوئے خلوص و ہدایت کا طالب ہو گا' اس کے لیے یہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔

___ عبادت کرتے ہوئے؟ لیکن جب اس میں ایمان ہی نہ ہو گا تو وہ عبادت ہی کیوں کرے گا' فادر فیلکس!

اگر کوئی شخص عبادت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ خدا کے وجود پر جس کی وہ عبادت کر رہا ہے پہلے ہی ایمان لا چکا ہے۔ وہ اس ایمان تک پہنچا کیسے؟ کیا عقل کے راستے سے؟ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ایمان کو عقل کے ذریعہ حاصل کرنا بھی ممکن ہے۔ اس کے علاوہ لفظ ''ہدایت'' میں اس شخص کے لئے کیا کشش ہو سکتی ہے جس نے اس قسم کی چیز کا کبھی تجربہ ہی نہ کیا ہو!

فادر فیلکس نے کچھ افسوس اور کچھ مایوسی کے ساتھ اپنے شانوں کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ اگر آدمی اس پر قادر نہیں ہے کہ خود ہدایت خداوندی کا تجربہ کر سکے' تو پھر اسے دوسروں کے تجربات قبول کرنے پر راضی ہو جانا چاہئے جو ان چیزوں کا عملی تجربہ رکھتے ہیں!

عرب سوسائٹی کی پہلی جھلک

ہماری ٹرین صحرائے سینا سے گزر رہی تھی۔ میں اس وقت انتہا سے زیادہ تھکا ہوا تھا' رات کو صحرا کی ٹھنڈک

Marfat.com

اور ریتلے ٹیلوں پر ٹرین کی مسلسل حرکت اور گھڑگھڑاہٹ کی وجہ سے ایک لمحے کے لئے بھی میری آنکھ نہ لگ سکی۔ میرے سامنے والی سیٹ پر ایک بدو ایک بڑی سی عبا میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا۔ وہ بھی اپنے مفلر کے باوجود سردی سے کانپ رہا تھا۔ وہ پالتی مارے ہوئے سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس کے گھٹنے پر اس کی تلوار رکھی تھی' جس کی نیام پر سونے کا کام تھا۔ صبح ہونے لگی تھی اور میں باہر ٹیلوں کے آثار اور ناگ پھنی کی جھاڑیاں دیکھ سکتا تھا۔

مجھے اب تک یاد ہے کہ صبح کس طرح ہوئی' کس طرح ریت کے ٹیلے جو اندھیرے میں دبے ہوئے تھے ابھرنا شروع ہوئے اور ان کا ایک سلسلہ سا قائم ہو گیا۔ رنگ برنگ اور نغمہ ریز۔ اس روشنی میں سیاہ مکانات کا ایک سلسلہ نظر آیا اور تیزی سے غائب ہو گیا۔ دو بانسوں میں بندھے ہوئے شکار کے جال صبح کی ٹھنڈی ہوا میں بھورے چمک دار کہر کے پردوں کے مانند جھول رہے تھے۔ صحرا میں مچھلی کے حسین جال' شفاف اور خواب آلود۔

دائیں طرف صحرا تھا اور بائیں طرف سمندر۔ سمندر کے کنارے ایک سوار تنہا چلا جا رہا تھا' شاید اس کی پوری رات سفر ہی میں گزری تھی۔ اب وہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سو سا گیا ہو۔

خیمے پھر نظر آئے۔ اب کی اس میں سے عورتیں نکل رہی تھیں۔ ان کے سروں پر مٹی کے گھڑے تھے اور وہ کنویں کی طرف جا رہی تھیں۔ اس ہلکی سی روشنی سے جو ابھی تک مدھم تھی' ایک پاکیزہ اور شفاف دنیا ابھر رہی تھی' جس کے پیچھے غیر مرئی طاقتیں اور محرکات تھے۔ ایک معجزہ تھا سادگی کا' لامتناہی اور غیر محدود۔

آفتاب بلند ہو گیا تھا۔ ہم نخلستان عریش میں داخل ہوئے۔ اس کے چاروں طرف کھجور کے باغات تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک باغ کے اندر ایک عورت اپنے سر پر پانی کا گھڑا رکھے ہوئے واپس آ رہی ہے۔ وہ ایک رنگین پوشاک میں ملبوس تھی' نیلی اور سرخ' پیچھے اس کی لانبی چادر زمین پر لوٹ رہی تھی۔ اس وقت وہ بالکل کہانیوں کی شہزادی معلوم ہو رہی تھی۔

کھجور کے باغات جس طرح سامنے آئے تھے' اسی طرح اچانک نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اب ہم کھلے میدان میں تھے جہاں روشنی ہی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ٹرین کے شیشوں کے باہر ایک ایسا سکون تھا جس کا میں پہلے تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سارے اجسام اور حرکات آج اور کل سے بے نیاز ہیں۔ دو یا تین بار یہ منظر بھی دکھائی دیا کہ ننگے پاؤں بدو کھجور کے پتوں اور ٹہنیوں کو اونٹوں پر لدوا کر قافلے بنائے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ان حسین اور دل فریب مناظر نے مجھے اپنا اسیر بنا لیا ہے۔

ٹرین کئی بار چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر رکی جو عام طور پر ٹین اور لکڑی کے بیرک کی طرح ہوتے تھے۔ سانولی صورت والے لڑکے اور بچے جن کے جسم پر پھٹے ہوئے کپڑے تھے' ادھر اُدھر اچھل کود کر رہے تھے اور مسافروں کے ہاتھ انجیر' ابلے ہوئے انڈے اور روٹی فروخت کر رہے تھے۔ وہ بدو جو میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا' آہستہ آہستہ اٹھا اور اپنا مفلر کھولا۔ پھر کھڑکی کھولی۔ اس کا رنگ سانولا اور چہرہ ستواں تھا۔ ان عقابی چہروں میں سے ایک چہرہ جو آہنی عزم اور قوت ارادی کے ساتھ ہمیشہ آگے کی طرف دیکھتے ہیں۔ اس نے ایک روٹی خریدی اور واپس ہونے لگا۔ جب

Marfat.com

وہ بیٹھنے جا رہا تھا' اس وقت اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ کچھ کہے بغیر اس نے اس روٹی کے دو ٹکڑے کئے اور ایک مجھے دینے لگا۔ جب اس نے میرا تردد اور تعجب دیکھا تو مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ بھی اس کے چہرے پر اسی طرح موزوں تھی جس طرح عزم اور قوت ارادی۔ پھر اس نے ایک لفظ کہا جو اس وقت تو میں نہیں سمجھ سکا تھا' لیکن اب سمجھتا ہوں۔

تفضل' نوش فرمائیے۔ میں نے وہ ٹکڑا لے لیا اور سر کے اشارہ سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ایک مسافر نے جو ترکی ٹوپی کے علاوہ باقی تمام یورپین لباس میں تھا اور کوئی متوسط درجہ کا تاجر معلوم ہو رہا تھا' رضا کارانہ طور پر ترجمہ کی پیش کش کی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہنے لگا۔ یہ کہتے ہیں کہ آپ بھی مسافر اور میں بھی مسافر ہوں اور ہم دونوں کا راستہ ایک ہے۔

جب میں اس معمولی واقعہ پر غور کرتا ہوں تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ عربی اخلاق سے میری وابستگی اور محبت کی بنیاد اس سے پڑی تھی' اس بدو کے رویہ میں جس نے اجنبیت کی تمام دیواروں کے باوجود اپنے رفیق سفر کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی آدھی روٹی اس کو دے دی۔ انسانیت کی ایک ایسی تصویر اور جھلک تھی جو ہر تصنع اور تکلف سے پاک تھی۔

کچھ دیر بعد غزہ پہنچ گئے۔ وہ ایک قدیم قلعہ معلوم ہو رہا تھا جو ناگ پھنی کی قطاروں کے درمیان ایک ریتلے ٹیلے پر ایک بھولی بسری زندگی گذار رہا تھا۔ میرے بدو ساتھی نے اپنا سامان سمیٹا اور ایک باوقار مسکراہٹ کے ساتھ سر کے اشارہ سے مجھے سلام کیا اور باہر چلا گیا۔ دو بدو پلیٹ فارم کے باہر کھڑے تھے۔ ان دونوں نے اس سے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ پھر سب نے ایک دوسرے کے رخسار کا بوسہ لیا۔

اس مسافر نے جس نے ازراہ ہمدردی ترجمانی کا کام انجام دیا تھا' میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ آیئے باہر نکلیں' ابھی گاڑی چھوٹنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔

اسٹیشن کی عمارت کے پیچھے ایک خیمہ میں یہ قافلہ موجود تھا' یہ لوگ ___ جیسا کہ میرے ساتھی نے بتایا۔ شمالی حجاز کے بدوؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے چہرے سانولے گرد آلود تھے' جن سے درشتی ٹپکتی تھی۔ ہمارا یہ دوست (جو ابھی نکل کر گیا تھا) انہیں کا ایک فرد تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ان لوگوں میں اچھی پوزیشن رکھتا ہے' اس لئے کہ وہ سب حلقہ بنا کر اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے اور اس کے سوالات کا جواب دے رہے تھے۔

ہمارے ساتھی تاجر نے اس سے کچھ بات کی جس کے بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے چہروں پر محبت وخلوص کے آثار تھے۔ وہ بہت حقارت اور لاپرواہی کے ساتھ یہ دیکھ رہے تھے کہ ہمارا تمدن کس قسم کا ہے۔ وہاں میں نے حریت کی ایک فضا دیکھی اور میرے اندر ان کی زندگی کو سمجھنے کی شدید خواہش پیدا ہو گئی۔

ہوا بہت خنک تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ ہڈیوں میں گھسی جا رہی ہے۔ میں سوچنے لگا کہ صحرا کے ان باسیوں کا تصور زندگی اور احساس دوسرے علاقوں کے لوگوں سے بالکل مختلف ہوگا۔ یہ لوگ ضرور ان واہمانہ پابندیوں اور قیود اور بسا اوقات خواہشات کی زنجیروں سے آزاد ہوں گے جس میں مالدار اور ٹھنڈے علاقہ کے لوگ گرفتار ہیں اور چونکہ ان کو اپنے احساسات اور جذبات پر بھروسہ بھی کرنا پڑتا ہوگا' اس لئے ان کا اندازہ کرنے کا پیمانہ بھی جدا ہوگا' جس سے وہ

Marfat.com

دنیا کے معاملات کو جانچتے ہیں۔

شاید آنے والے انقلابات اور تغیرات کا ایک داخلی شعور اسی دن مجھ میں پیدا ہو گیا تھا۔ یہ پہلا دن جو کسی عربی سرزمین میں بدوؤں کے ساتھ گزرا۔ ایک ایسی دنیا کا داخلی شعور جس کے کوئی حدود نہیں' پھر بھی ایسی بات نہیں ہے کہ اس کی کوئی متعین شکل اور صورت ہی نہ ہو۔ ایسی دنیا جس کے متعلق قدرت کا فیصلہ تھا کہ وہ بہت جلد میری بننے والی ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ میں نے اسی وقت یہ محسوس کر لیا تھا کہ مستقبل میں میرے لئے کیا سامان ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے یہ بات نہ تھی' لیکن وہ اس قسم کا شعور وادراک تھا جو آپ کو کسی اجنبی مکان میں جا کر ہوتا ہے' جب وہاں کسی جگہ سے کچھ ایسی بو یا خوشبو آتی ہے جس کا تعین تو آپ نہیں کر سکتے کہ وہ کس چیز کی ہے' لیکن ایک دھندلا سا تصور آپ کے دماغ میں آ جاتا ہے کہ اس گھر میں آپ کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ اگر وہ خوش کن چیزیں ہوتی ہیں تو ایک زمانہ کے بعد آپ اس کو یاد کرتے ہیں اور اپنے دل میں کہتے ہیں کہ میں نے اس بات کو ٹھیک اسی جگہ بہت عرصہ پہلے محسوس کر لیا تھا۔

بیت المقدس میں

۱۹۲۲ء کے اسی موسم خزاں میں میں اپنے ماموں ڈوریان کے گھر میں تھا جو بیت المقدس کے قدیم شہر کے اندر واقع تھا۔ بارش تقریباً روزانہ ہی ہوتی تھی جس کی وجہ سے مجھے نکلنے کا موقع بہت کم ملتا تھا' چنانچہ میں اکثر کھڑکی کے پاس بیٹھ جایا کرتا اور اس سے مکان کی پشت پر اس صحن کا نظارہ کیا کرتا جو ایک ''حاجی'' نامی بوڑھے عرب کی ملکیت میں تھا۔ یہ عرب بار برداری کے لیے کرایہ پر گدھوں کا انتظام کرتے تھے' اس کی وجہ سے یہ جگہ ایک ایسا پڑاؤ بن گئی تھی جہاں رات کے قافلے مقیم ہوتے تھے۔

روزانہ صبح فجر سے کچھ قبل قریب کے گاؤں وغیرہ سے پھل اور ترکاریاں اونٹوں پر لدوا کر اس صحن میں لائی جاتیں' پھر یہاں سے گدھوں پر لدوا کر شہر کے بازاروں اور تنگ گلیوں میں سپلائی کی جاتیں۔ دن بھر بھاری بھرکم اونٹ وہاں پڑے رہتے تھے اور بہت لوگ ان کی خبر گیری میں مشغول اور منہمک رہتے تھے۔ ہاں موسلا دھار یا تیز بارش کے وقت سب لوگ اصطبل میں پناہ لینے کے لئے چلے جاتے تھے۔ وہ دیکھنے میں فقراء تھے' پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس' لیکن حقیقت میں آقاؤں کی طرح زندگی گزارتے تھے۔ جب وہ ایک ساتھ کھانے کے لئے زمین پر بیٹھتے اور تھوڑے سے پنیر یا زیتون کے دانوں کے ساتھ ساتھ روٹی کھاتے تو میں یہ منظر دیکھ کر ان کی عالی ہمتی' شرافت' قوت برداشت اور ان کے اعتماد وسکون سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

آپ ان کو دیکھتے تو یہ محسوس کرتے وہ اپنا احترام اور زندگی کی قدر خود کرتے ہیں' حاجی اپنی چھڑی لئے ہوئے اِدھر سے اُدھر آتے جاتے تھے (ان کو التہاب مفاصل اور گھٹنوں پر ورم کی شکایت تھی) ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کے سردار ہیں' اس لئے کہ وہ لوگ بے چون وچرا ان کی فرمانبرداری کرتے تھے۔ دن میں کئی بار وہ ان کو نماز کے

Marfat.com

لئے جمع کرتے۔ اگر ہلکی بارش ہوتی تو وہ باہر ہی نماز پڑھ لیتے۔ سب ایک لانبی صف بنا کر کھڑے ہوجاتے۔ ''حاجی'' ان کی امامت کرتے' اپنی حرکات وسکنات اور ڈسپلن میں وہ بالکل فوجی معلوم ہوتے تھے۔ سب مکہ کے رخ پر جھکتے تھے' پھر سیدھے کھڑے ہوجاتے تھے' پھر اتنا جھکتے کہ زمیں بوس ہوجاتے اور اپنے قائد کی ہلکی آواز پر یہ کان لگائے رہتے تھے جو ننگے پیر اپنی جانماز پر کھڑے تھے' آنکھیں بند' ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے' بغیر آواز کے ان کے ہونٹ ہلتے رہتے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کسی خیال میں بالکل مستغرق ہیں۔ آپ ان کو دیکھ کر پورا اندازہ کرسکتے تھے کہ وہ اپنی روح کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس گہری اور جاندار نماز میں مجھے ان حرکات وسکنات کی موجودگی کچھ سمجھ میں نہ آئی' چنانچہ میں نے ''حاجی'' سے جو تھوڑی بہت انگریزی سمجھتے تھے' ایک بار پوچھا:

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ خدا اس کا منتظر رہتا ہے کہ آپ بار بار اس کے سامنے رکوع وسجود کریں؟ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آدمی تنہائی میں بیٹھ کر سکون اور حضور قلب کے ساتھ نماز پڑھے اور دعا کرے۔ آخر یہ جسمانی حرکات کس غرض سے ہوتی ہیں؟

میں نے یہ بات کہنے کو تو کہہ دی' لیکن فوراً ہی مجھے ندامت ہوئی اور میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس بوڑھے مذہبی آدمی کے شعور واحساس کو کوئی اذیت پہنچے' لیکن حاجی کے چہرہ پر ناگواری کے مطلق آثار نہ تھے۔ وہ مسکرائے اور کہنے لگے۔

پھر آپ ہی بتایئے کس طریقہ پر ہم خدا کی عبادت کریں؟ کیا اس نے جسم اور روح کو ایک ساتھ پیدا نہیں کیا؟ اگر یہ بات ہے تو کیا یہ ضروری نہ ہوگا کہ آدمی جس طرح اپنی روح کے ساتھ نماز پڑھتا ہے' اسی طرح اپنے جسم کے ساتھ بھی پڑھے۔ دیکھئے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ہم مسلمان اس طرح کیوں نماز پڑھتے ہیں؟

ہم کعبہ کی طرف اس احساس کے ساتھ رخ کرتے ہیں کہ تمام دنیا کے مسلمان اسی طرف رخ کئے ہوئے ہیں اور یہ کہ مسلمان ایک جسم ہیں اور خدا ہی ہم سب کی فکر کا محور ومرکز ہے۔ ہم سیدھے کھڑے ہوتے ہیں اور یہ دھیان کرتے ہوئے قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام ہے جو اس نے انسان کو اس کی زندگی کی درستی اور کامیابی کے لئے عطا کیا ہے۔ پھر ہم اللہ اکبر کہتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ خدا کے سوا اور کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ پھر اس کے سامنے جھک جاتے ہیں' اس لئے کہ ہم اس کو سب سے بلند وبالاتر سمجھتے ہیں اور اس کی عزت وبلندی کی تسبیح کرتے ہیں۔

پھر ہم سجدہ کرتے ہوئے اپنی پیشانی زمین پر رکھ دیتے ہیں' اس احساس کے ساتھ کہ ہم اس کے سامنے مٹی اور خاک کے برابر ہیں' بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس نے ہم کو پیدا کیا ہے اور وہی ہمارا بلند وبرتر رب ہے۔ پھر پیشانی زمین سے اٹھا کر بیٹھ جاتے ہیں اور اس سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے گناہوں کو معاف کردے اور ہم کو اپنی آغوش رحمت میں لے لے اور سیدھے راستہ کی طرف ہماری رہنمائی کرے اور ہم کو صحت وعافیت اور سلامتی عطا

Marfat.com

کرے۔ پھر ہم دوبارہ سجدہ میں گر جاتے ہیں اور لاشریک بے نیاز پروردگار کی عزت وعظمت کے لئے اپنی پیشانی خاک آلود کرتے ہیں۔ پھر اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے نبی محمدؐ پر جنہوں نے ہم کو اسلام کا پیغام پہنچایا' اپنی رحمت نازل کرے' جس طرح اس نے گذشتہ انبیاء پر اپنی رحمت نازل کی اور ہم سب کو اور جو لوگ سیدھے راستہ پر ہیں' برکت دے۔ دنیا میں بھی اچھائی دے اور آخرت میں بھی۔ آخر میں دائیں اور بائیں اپنا منہ موڑتے ہوئے کہتے ہیں السلام علیکم ورحمۃ اللہ ۔ گویا اس طرح ہم دنیا کے تمام صالحین کو سلام بھیجتے ہیں' خواہ وہ کہیں ہوں اور کسی حالت میں ہوں۔

اسی طرح ہمارے نبیؐ نماز پڑھتے تھے۔ ہر زمانہ کے لئے انہوں نے اپنے پیروؤں کو یہی طریقہ بتایا ہے' تاکہ وہ اس کے ذریعہ مکمل سپردگی کا نمونہ بن جائیں ___ جو اسلام کے معنی ہیں ___ اور خدا کی طرف سے اور اپنے انجام و مستقبل کی طرف سے اطمینان اور سکون حاصل کرسکیں۔

بوڑھے آدمی نے ٹھیک یہی الفاظ تو نہیں کہے تھے' لیکن ان کا مفہوم یہی تھا اور آج تک مجھے یہ بات اسی طرح یاد ہے' اس واقعہ پر چند سال گزرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ حاجی کی اسی گفتگو نے میرے اسلام قبول کرنے کا پہلا دروازہ کھولا تھا' لیکن اس وقت بھی جب میں یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اسلام میرا دین بن سکتا ہے' میں اپنے اندر ایک غیر معمولی کشمکش اور جھکاؤ محسوس کرتا تھا۔ جب میں کسی کو (اور ایسا بہت ہوتا تھا) ننگے پیر اپنے مصلے یا چٹائی پر یا زمین پر محو نماز پاتا تھا' ہاتھ باندھے ہوئے' سر جھکائے ہوئے' اپنے کام میں بالکل مستغرق' اپنے ماحول سے بالکل بے نیاز' مسجد میں یا پلیٹ فارم پر یا کسی آباد و پر شور سڑک پر' ہر جگہ وہ ایک مطمئن انسان معلوم ہوتا۔

فرانکفورٹر اخبار میں

ایک شام کو جب میں اپنے کاغذات درست کر رہا تھا تو مجھے وہ پریس کارڈ ملا جو ایک سال قبل برلین میں مجھے یونائیٹڈ ٹیلیگراف کے نمائندہ کی حیثیت سے دیا گیا تھا۔ میں اس کو پھاڑنے ہی جا رہا تھا کہ ایک دم سے ڈوریان نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مذاق میں کہنے لگا۔

ہائیں .... اس کو پھاڑو نہیں۔ اگر ہائی کمشنر کے دفتر میں یہ کارڈ تم دکھا دو تو چند ہی روز کے اندر گورنمنٹ ہاؤس سے تم کو کھانے کا دعوت نامہ مل سکتا ہے۔ اس مخلوق (اخبار نویس) کی یہاں بہت قدر ہے!

اگرچہ میں نے اس بیکار کارڈ کو چاک تو کر دیا' لیکن ڈوریان کی بات مجھ پر اثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ ظاہر ہے کہ گورنمنٹ ہاؤس کی دعوت میں میرے لئے کیا کشش ہو سکتی تھی' لیکن میں سوچنے لگا کہ اس سنہرے موقع سے خصوصاً ان حالات میں مشرق میں میری موجودگی جب کہ وسطی یورپ کے بہت کم اخبار نویسوں کو یہاں آنے کا موقع ملا ہے' میں فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں۔ میں کیوں نہ اپنا صحافتی کام دوبارہ شروع کر دوں اور کسی ممتاز اور بڑے روزنامہ سے اپنا معاملہ کر لوں۔

Marfat.com

پھراسی سرعت کے ساتھ جس سرعت سے مجھے ہمیشہ فیصلہ کرنے کی عادت تھی' میں نے حقیقی صحافت کے میدان میں باقاعدہ اترنے کا عزم کرلیا۔

اگرچہ میں نے ایک سال یونائیٹڈ ٹیلیگراف میں کام کیا تھا' لیکن ابھی تک کسی ممتاز اخبار سے میرا بلاواسطہ تعارف نہیں تھا اور چونکہ میرے نام سے کوئی مضمون وغیرہ بھی پریس میں نہیں آیا تھا' اس لئے میں اخبارات کی دنیا میں بالکل غیر معروف تھا' لیکن ان چیزوں کی وجہ سے میرے عزم میں کوئی کمزوری نہیں آئی۔ میں نے فلسطین کے بارے میں اپنے تاثرات وخیالات پر مشتمل ایک مضمون لکھا اور اس کی نقلیں کم از کم دس اخبارات کو بھجوا دیں۔ اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا' جس میں مشرق کے سلسلہ میں مضامین کی پیش کش تھی۔

یہ ۱۹۲۲ء کے آخری مہینوں کی بات ہے جب جرمنی کے لئے افراط زر کا مسئلہ مصیبت بنا ہوا تھا۔ جرمن پریس بھی اپنی بقا کے لئے کفایت شعاری سے کام لے رہا تھا۔ صرف چند اخبار ایسے تھے جو اپنے غیر ملکی مراسلہ نگاروں کو نقد تنخواہیں ادا کر سکتے تھے' اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ یکے بعد دیگرے تمام خبارات سے انکار کے جواب آنے لگے' صرف ایک اخبار نے میری پیش کش قبول کر لی تھی اور جہاں تک میرا اندازہ ہے میرے اس مضمون سے متاثر ہو کر مشرق قریب میں مجھے اپنا گشتی نمائندہ مقرر کر لیا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی اس نے طے کر لی تھی کہ واپسی کے بعد مجھے اس کے لئے ایک کتاب بھی لکھنا ہوگی۔ یہ اخبار (Frankfurter Zeitung) تھا۔ جب میں ہر اخبار سے رابطہ قائم کرنے میں ناکام ہو رہا تھا اور ہر جگہ سے انکار کے جوابات آ رہے تھے' اس وقت مجھے خطرہ تھا کہ کہیں میں ہمت نہ چھوڑ دوں اور تھک ہار کر بیٹھ رہوں' لیکن اس اخبار کی وجہ سے میں اب اس پوزیشن میں آ گیا تھا جس کی تمنا پختہ کار سے پختہ کار اخبار نویس کر سکتا ہے۔ افراط زر کی وجہ سے یہ اخبار بھی مجھے نقد ادائیگی نہیں کر سکتا تھا' اس لئے اس نے جرمنی سکہ میں ادائیگی کی۔ میں جانتا تھا (اور اخبار والے بھی جانتے تھے) کہ یہ رقم اتنی بھی نہیں کہ میرے مضامین کے ڈاک خرچ کے لئے بھی کافی ہو' لیکن میرا فرانکفورٹ کا نمائندہ ہونا بجائے خود ایک ایسا امتیاز تھا جو ان وقتی مشکلات سے زیادہ وقیع اور وزنی تھا۔

بہرحال میں نے اس توقع پر فلسطین کے متعلق مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر دیا کہ دیر یا سویر قیمت میرا ساتھ دے گی اور مشرق کے تمام ممالک کی سیاحت کا مجھے موقع مل سکے گا۔

عربی اسلامی تہذیب کی روح

اس کی صلاحیتیں اور مغربی تہذیب کا اندرونی زوال

ان ابتدائی مہینوں نے جو میرے اس پہلے زمانہ قیام میں گزرے' میرے اندازِ افکار' توقعات اور تاثرات کا ایک طویل سلسلہ قائم کر دیا جس میں سے بعض توقعات جو شخصی طرز کی تھیں' میرے شعور کے اندر نفوذ کرنے کے لئے کوشاں تھیں۔

Marfat.com

میں نے اپنے روبروزندگی کا ایک ایسا مفہوم پایا جو میرے لئے یکسر نیا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے کوئی گرم اور حرارت انگیز روح ہے جو ان عربوں کے خون کے ساتھ ان کے افکار اور حرکات وسکنات تک میں سرایت کر گئی ہے۔ روحانی خراشوں اور اذیتوں سے نا آشنا' وہ اذیتیں جنہوں نے خوف' حرص اور گھٹن کا بھوت بن کر مغربی زندگی کو بے حد بھدی' بے ہنگم اور کریہہ المنظر بنا دیا تھا اور اس سے اب کوئی خاص امید باقی نہیں رہ گئی تھی۔

میں عربوں میں وہ چیز پانے لگا جس کی غیر شعوری طور پر مجھے عرصہ سے تلاش تھی' جس کو ہم زندگی کے تمام مسائل میں ایک خاص قسم کی جذباتی لطافت اور بلند شعوری احساس سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

زمانہ کے گزرنے کے ساتھ اب میرے سامنے سب سے مقدم کام یہ تھا کہ میں ان مسلمانوں کی اسپرٹ کو سمجھ سکوں' اس لئے نہیں کہ ان کے دین کی طرف میرا کچھ میلان تھا (میں اس کے متعلق بہت کم معلومات رکھتا تھا) بلکہ اس لئے کہ میں نے ان میں عقل اور احساسات کا وہ عضوی اور حیاتیاتی اتحاد (Organic Coherence) اور ہم آہنگی دیکھی تھی جس کو ہم اہل یورپ نے کھو دیا ہے۔ ہمیں شخصی ہم آہنگی کے فقدان سے جو کچھ بھگتنا پڑا ہے' کیا ہم عربوں کی زندگی کے صحیح مطالعہ سے اس کے اور اس کے اسباب کی درمیانی کڑی کا پتہ نہیں لگا سکتے؟ کیا ہم وہ چیز حاصل نہیں کر سکتے ہیں جس کی وجہ سے اہل یورپ اس مقدس زندگی کی حریت سے بھاگ رہے ہیں جو ابھی عربوں کے اندر ان کے اس انحطاط اور اجتماعی وسیاسی زوال کے باوجود موجود ہے اور جو گذشتہ ادوار میں ضرور ہم اہلِ یورپ کے یہاں بھی پائی جاتی تھی' ورنہ ہمارے شاندار ماضی کے فن اور آرٹ کے عظیم ورثہ کی توجیہ کیا ہوگی؟ قرون وسطیٰ میں گوتک کیتھڈرل کے نمونے' نشاۃ ثانیہ کا حد سے بڑھا ہوا انبساط' ریمبراں (Rembrandt) کے روشنی اور سائے کی کیفیت' باخ (Bach) کے سوالات اور تخیلات' موتسارٹ (Mozart) کے سنجیدہ خواب' بیتوون (Beethoven) کے ابھرتے ہوئے ابلتے ہوئے نغمے' دھندلی' انتہائی بلند اور ناقابل عبور چوٹیوں تک پہنچنے والے' جو عقل اور جذبات کی دسترس سے بہت دور ہیں اور جہاں پہنچ کر آدمی کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے ''میں اور میری تقدیر ایک ہی چیز ہے۔''

ہم یوروپین اگر ان کے اصلی مزاج کو سمجھنے سے قاصر رہے تو پھر ان کی روحانی طاقتوں اور صلاحیتوں سے بخوبی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ہم آج کے بعد سے بیتوون اور ریمبراں جیسے فنکاروں کو جنم دینے سے معذور ہو چکے ہیں اور اس کے بجائے اب ہمارا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ علوم وفنون' سیاست واجتماع کے پیش پا افتادہ اصولوں کو مختلف تعبیرات اور اسالیب سے ایک بے پناہ اور پُر جوش کوشش کے ساتھ دہراتے رہیں۔

جنگ اور پھر اس کے بعد بہت فنکارانہ طریقہ سے تراشے ہوئے نت نئے اصولوں کی مختلف اور متضاد آوازوں کی وجہ سے ضمیر ودماغ میں ایک زبردست کشمکش برپا ہے۔ ہماری مشینیں اور آلات اور آسمانوں سے سرگوشیاں کرنے والی عمارتیں ہماری پاش پاش اور ریزہ ریزہ روح کو پھر سے جوڑنے میں بالکل ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ اس کے باوجود میں اپنے دل میں کہتا تھا کہ کیا یورپ کی روحانی عظمت کی حقیقت ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ

Marfat.com

غلطی کا پتہ لگا کر تھوڑی بہت کھوئی ہوئی عظمت اور قیمت کو واپس لایا جا سکے؟

ابتدا میں تو یہ بات عربوں کے قومی و سیاسی مقاصد سے ہمدردی تک اور ظاہری معاشرہ کی ظاہری صورت اور قلبی طمانیت (Emotional Security) تک جس کو میں نے خاص طور پر محسوس کیا تھا' محدود رہی' لیکن اب مجھ میں اس قلبی طمانیت اور اندرونی سکون و اطمینان کا سبب اور سرچشمہ معلوم کرنے کی شدید خواہش پیدا ہو چلی تھی جس نے عربی تہذیب کو مغربی تہذیب سے اس قدر مختلف کر دیا ہے۔ یہ خواہش میرے نفسیاتی اور ذاتی و شخصی مسائل کے ساتھ بالکل گھل مل گئی تھی۔ مجھے ایسے مواقع اور ایسے میدانوں کی تلاش رہنے لگی تھی جہاں میں عربوں کے اخلاق اور کریکٹر کا زیادہ بہتر طریقہ سے مشاہدہ اور مطالعہ کر سکوں اور ان افکار و خیالات تک میری رسائی ہو سکے' جنہوں نے ان کی زندگی کو ایک خاص سانچہ میں ڈھال دیا ہے اور اس کو معنوی حیثیت سے مغربی تہذیب سے بالکل جدا کر دیا ہے۔

میں نے ان کی تاریخ' کلچر' مذہب سب کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور اس شے کی دریافت و طلب کے جذبہ کے ساتھ جوان کے جذبات و احساسات اور عقلیت کے پیچھے کارفرما تھا' ایک اور جذبہ میرے اندر ابھرنے لگا' وہ جذبہ تھا ان اسباب و محرکات کی دریافت کا جو میرے دل و دماغ کو ہلا رہے تھے اور میرے اوپر چھائے جا رہے تھے اور میری رہنمائی کے لئے آمادہ تھے۔

مشرق کے بارے میں مغرب کا نقطہ نظر اور رویہ

مشرق وسطیٰ کے اس پورے زمانہ قیام میں جس میں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک میں ایک غیر ملکی سیاح کی حیثیت سے وہاں بسنے والی قوموں سے ہمدردی رکھتا رہا یا اس کے بعد سے آج کے دن ایک مسلمان کی حیثیت سے اسلامی معاشرہ کے درد دکھ اور راحت و تکلیف کا شریک رہا۔ اس پوری مدت میں مَیں نے دیکھا کہ یورپ ان قوموں پر برابر سیاسی دباؤ ڈال رہا ہے اور مختلف طریقوں سے مظالم کرتا رہا ہے اور ساتھ ہی اس کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش میں بھی لگا رہا ہے۔ اگر کبھی مسلمان ان مظالم اور دست درازیوں کی مدافعت یا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے تو یوروپین رائے عامہ بڑے بھولے پن اور سادگی کے ساتھ اس کو مسلموں سے بے جا نفرت اور کراہیت پر محمول کر لیتی۔

مغربی ممالک کا معمول بن گیا تھا کہ وہ اس ترکیب سے مشرق وسطیٰ کی موجودہ تاریخ کو صرف مغربی مصلحت کے نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی تھے اور اس حالت میں جبکہ برطانیہ کے باہر سارے یورپ کی رائے عامہ آئر لینڈ کی جدوجہد آزادی کی حمایتی تھی یا (روس اور جرمنی کو مستثنیٰ کر کے) پولینڈ کی قومی تحریک سے دلچسپی رکھتی تھی' اس کو مسلمانوں کے مسائل اور تمناؤں سے مطلق کوئی دلچسپی اور ہمدردی نہ تھی۔ اس کی دلیل ہمیشہ یہ دی جاتی تھی کہ مشرق وسطیٰ سیاسی اور اقتصادی حیثیتوں سے بہت پسماندہ ہے۔ اسی طرح مغربی مداخلت کی تاویل یہ کی جاتی تھی کہ اس کا مقصد صرف جائز مغربی حقوق کی حفاظت نہیں' بلکہ وہاں کے باشندوں کی ترقی اور خوشحالی بھی ہے۔

مشرق وسطیٰ کے معاملات کے ماہرین اور سیاست داں یہ بھول گئے تھے کہ کسی قسم کی بھی مداخلت خواہ وہ

Marfat.com

کتنی ہی بے ضرر ہو' بجائے خود قوم کی ترقی کی راہ میں ایک زبردست رکاوٹ ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتے تھے کہ ریل کی پٹڑیوں کا کتنا جال بچھا دیا گیا ہے اور یہ نہ دیکھتے تھے کہ ملک کا اجتماعی ڈھانچہ کس طرح تباہ و برباد ہو رہا ہے۔ وہ اس کا شمار تو کرتے تھے کہ کتنے کلو واٹ بجلی لائی گئی ہے اور اس پر غور نہیں کرتے تھے کہ وہ اس محکوم قوم کی عزت و خودداری کو کیسے کیسے طمانچے لگاتے رہتے ہیں۔

وہی لوگ جنہوں نے آسٹریا کے ''تہذیبی وفد'' کو اس خیال سے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس سے جرمنی کو ریاستہائے بلقان میں مداخلت کرنے کا ایک قانونی عذر مل جائے گا' وہی آج بہت رواداری اور چشم پوشی کے ساتھ مصر میں انگریزوں کے' وسطی ایشیا میں روسیوں کے' مراکش میں فرانسیسیوں کے' لیبیا میں اٹلی کے' اس قسم کے دعووں کو بخوشی انگیز کر رہے ہیں اور ان کی مداخلت پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ بیشتر سماجی اور اقتصادی مشکلات اور کمزوریاں جن کا مشرق وسطیٰ ایک زمانہ سے شکار ہے' یورپ کی اسی بیجا دلچسپی اور مداخلت کا نتیجہ ہیں' بلکہ مغربی مداخلت کے پیچھے یہی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ داخلی انتشار کا دائرہ وہاں اتنا وسیع ہو کہ ان قوموں کے لئے بیداری اور آزادی ناممکن سی ہو جائے۔

مصر میں

میں نے اوّل اوّل اس بات کو ۱۹۲۲ء میں فلسطین میں محسوس کرنا شروع کیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے عربوں اور یہودیوں کے نزاع کے سلسلہ میں برطانوی گورنمنٹ کی دورخی پالیسی کا عملاً مشاہدہ کیا' جب ۱۹۲۳ء میں فلسطین کے تمام مقامات کا دورہ کرنے کے بعد میں مصر واپس ہوا تو یہ بات کھل کر میرے سامنے آ چکی تھی۔

مصر میں اس وقت برطانوی تسلط کے خلاف ایک ہیجان برپا تھا۔ برطانوی فوجیوں کی گزرگاہوں پر کثرت سے بم پھینکے جا رہے تھے۔ ان سرگرمیوں کو کچلنے کے لئے حکومت مختلف تدابیر اختیار کرتی تھی۔ کبھی مارشل لا لگا دیا جاتا' کبھی سیاسی گرفتاریاں عمل میں آتیں' اخبارات بند کر دیئے جاتے' لیڈروں اور رہنماؤں کو نکال دیا جاتا' لیکن ان میں سے کوئی بھی تدبیر خواہ وہ کتنی ہی سخت ہو' عوام کے جذبہ حریت کو کچلنے میں کامیاب نہ ہو رہی تھی۔ پوری مصری قوم میں اس سرے سے لے کر اس سرے تک ایک ایسی لہر پیدا ہو گئی تھی جس کو تیز جذباتی تشنج کی کیفیت سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ مایوسی اور ناامیدی کی کیفیت نہیں' حمیت' خودداری اور جوش کی کیفیت' جو اپنی قوت و طاقت کا اندازہ کرنے کے بعد اس میں پیدا ہو گئی تھی۔

بڑے بڑے پاشا اور زمیندار تو انگریزی حکومت سے وفاداری کا اظہار کر رہے تھے' لیکن ان کے علاوہ تمام لوگ جن کی تعداد بہت زیادہ تھی اور جس میں وہ مظلوم کسان بھی شامل تھے' جن کے پاس پورے خاندان کی کفالت کے لئے صرف ایک بیگہ زمین ہوتی تھی' تحریک آزادی کی حمایت کر رہے تھے۔ ہاکر صبح کو چیختے ہوئے نکلتے تھے کہ فوجی حاکم کے حکم سے وفد پارٹی کے تمام لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا ہے' لیکن دوسرے ہی روز یہ خبر آتی کہ ان کی جگہ دوسرے

Marfat.com

لیڈروں نے سنبھال لی ہے۔ آزادی کی پیاس بڑھتی جا رہی تھی اور ساتھ ہی انگریزوں سے نفرت اور کراہیت میں بھی روز افزوں اضافہ تھا' لیکن یورپ کے پاس ان سارے ہنگاموں کا بس ایک ہی جواب تھا ''غیر ملکیوں سے نفرت۔''

میرے مصر آنے کا مقصد یہ تھا کہ ''فرانکفورٹر'' کے لئے دائرۂ عمل کو اور زیادہ وسیع کیا جائے اور فلسطین کے باہر کی بھی دنیا دیکھی جائے۔ ڈوریان کی اقتصادی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ میرے لئے اس دورہ کے اخراجات برداشت کر سکتے' لیکن جب ان کو میری اس خواہش کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے اتنی رقم دے دی جو بیت المقدس سے قاہرہ تک ریل کے کرایہ کے علاوہ پندرہ روز قیام وطعام کے لیے بھی کافی تھی۔

قاہرہ میں مجھے ایک محلہ کی تنگ گلی میں جہاں کچھ عرب کاریگر اور چھوٹے یونانی دکاندار رہتے تھے' ایک مکان مل گیا۔ مکان کی مالکہ ٹریسٹا کی ایک سن رسیدہ عورت تھی۔ دراز قامت' بھرا ہوا جسم' چمکدار بال۔ وہ ایک تیز مزاج اور جلد متاثر ہونے والی عورت تھی۔ اس کے طرز عمل سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ابھی تک اپنے کو بھی نہیں پہچانا ہے' لیکن میرے ساتھ اس کا معاملہ بہت تعلق اور لگاؤ کا تھا' جس کی وجہ سے اس کے گھر میں مجھے خاصا آرام ملا۔

ایک ہفتہ گزرنے کے بعد میرا سب سرمایہ ختم ہو گیا اور چونکہ میں اتنی جلدی فلسطین واپس نہیں ہونا چاہتا تھا' اس لئے کسی ایسے کام کی تلاش میں نکلا جو یہاں قیام کے مصارف کے لئے کافی ہو۔

بیت المقدس میں میرے دوست کے ایک دوست ڈاکٹر ڈی ہان (de Haan) نے جن کا ذکر میں کر چکا ہوں' قاہرہ کے ایک تاجر کے نام مجھے تعارفی خط دیا تھا' چنانچہ اس سلسلہ میں مشورہ کے لئے پہلے میں انہیں کے پاس گیا۔ وہ ہالینڈ کے باشندے تھے' نیک طبیعت' لحیم شحیم اور خاص قسم کے عقلی رجحانات رکھنے والے۔ جو ان کے دائرہ اختصاص سے باہر تھے' ڈی ہان کے خط سے ان کو یہ معلوم ہوا کہ میں ''فرانکفورٹر'' کا نامہ نگار ہوں اور جب میں نے ان کی خواہش پر اپنے بعض مضامین ان کو دکھائے تو انہوں نے سر اٹھا کر انتہائی حیرت کے ساتھ مجھ سے پوچھا۔

ذرا یہ تو بتائیے کہ آپ کی عمر کیا ہو گی.....؟

میں نے کہا بائیس سال۔

کہنے لگے' اچھا ذرا برائے مہربانی یہ ہی بتا دیجئے کہ یہ مضامین آپ کس کی مدد سے تیار کرتے ہیں؟

میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا' اس کا کیا سوال ہے! یہ مضامین میں نے ہی لکھے ہیں' میں اپنے کام ہمیشہ خود ہی کرتا ہوں' لیکن آپ کو اس میں شبہ کیوں ہو رہا ہے۔

انہوں نے اپنے سر کو اس انداز سے جنبش دی جیسے انہیں اس پر حیرت ہوئی ہو۔ پھر کہنے لگے' بہر حال ہے یہ تعجب کی بات! اس عمر میں آپ میں اتنی پختگی کہاں سے پیدا ہو گئی کہ آپ اس قسم کا مواد فراہم کر سکیں اور انہیں چیزوں سے جو ہمارے لئے روزمرہ کی معمولی باتیں ہیں' ایک آدھ جملہ میں فلسفہ کا کوئی خاص مفہوم پیدا کر لیں۔

ان کی ان مدح سرائیوں اور قصیدہ خوانیوں سے میرے اندر کافی عجب پیدا ہو گیا اور میری نگاہ میں میری قدر بڑھ گئی۔ بہر حال ان کی گفتگو سے پتہ چلا کہ وہ خود مجھے کوئی کام نہیں دے سکتے' البتہ مجھے ایک مصری کمپنی میں جس

Marfat.com

سے ان کے تجارتی تعلقات تھے' کسی جگہ رکھوا سکتے ہیں۔

جس دفتر میں انہوں نے مجھے بھیجا' وہ قاہرہ کے ایک قدیم محلہ میں واقع تھا اور میرے گھر سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ یہ محلہ تنگ اور گندی گلیوں پر مشتمل تھا جس کے دونوں طرف کسی زمانہ میں اشراف اور اونچے طبقے کے لوگوں کے مکانات تھے۔ اب اس میں دفاتر وغیرہ قائم ہو گئے تھے۔ نیز قیام کے لئے سستے کمروں کی حیثیت سے استعمال ہو رہے تھے۔ اس کمپنی کا مالک ایک بوڑھا مصری تھا' جس کے سر کے سب بال گر چکے تھے۔ اس کو ایک ایسے منشی کی ضرورت تھی جو فرانسیسی زبان میں خطوط کا جواب دے سکے۔

میں اس کام کو انجام دینے پر تجارتی معاملات سے بالکلیہ ناواقفیت کے باوجود اچھی طرح قادر تھا۔ جلد ہی ہم لوگ اس بات پر متفق ہو گئے کہ ایک معمولی مشاہرہ پر میں روزانہ تین گھنٹے یہاں کام کروں گا۔ یہ مشاہرہ اتنا تھا کہ اس سے میرے مکان کا کرایہ ادا ہو سکتا تھا اور جب تک خدا کی مرضی ہو روٹی' دودھ اور زیتون پر گزارہ ہو سکتا تھا۔

میرے گھر کے سامنے ہی بلکہ اس سے اس قدر قریب کہ میں ہاتھ بڑھا کر اس کو چھو سکتا تھا' پتلے مینار کی ایک چھوٹی سی مسجد تھی' جہاں پنج وقتہ نماز کے لئے اذان ہوتی تھی۔ مینار پر سفید عمامہ باندھے ہوئے ایک شخص اللہ اکبر اللہ اکبر۔ اشہد ان لا الہٰ الا اللہ' اشہد ان لا الہٰ الا اللہ کی صدا بلند کرتا[1]۔ اس کی آواز طاقتور اور پُر سوز تھی۔ آپ یہ اذان سن کر یہ اندازہ کر سکتے تھے کہ وہ آرٹ یا فن نہیں تھا بلکہ غیرت ایمانی اور جوش تھا جس نے اذان میں اتنا حسن بھر دیا تھا[1]۔

موذن کی اذان کا طرز وہی تھا جس سے بیت المقدس اور اس کے بعد قاہرہ میں میرے کان اچھی طرح مانوس تھے۔ یہ بھی طے شدہ بات تھی کہ اسلامی ممالک میں ہر جگہ یہی لہجہ اور یہی آہنگ مجھے ملے گا۔ اس فرق کے باوجود جو مختلف مقامات کی مقامی زبانوں اور لہجوں میں ہوتا ہے' ایک ایسا صوتی اتحاد اور یگانگت جسے دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ہوا کہ مسلمانوں کا اندرونی اتحاد' یکسانیت اور ہم آہنگی کتنی گہری ہے اور ان کو تقسیم اور متفرق کرنے کی چیزیں کتنی مصنوعی' سطحی اور بے اثر ہیں۔

اپنے عقیدہ' طرز فکر' حق و باطل کی تمیز' بہتر اور صحیح زندگی کے مزاج اور بناوٹ کو سمجھنے میں وہ ایک انسان کی مانند تھے۔

مجھے ایسا لگا کہ میں نے پہلی بار ایک ایسی سوسائٹی میں قدم رکھا ہے جس میں انسان کے درمیان رشتہ اور تعلق کی بنیاد اقتصادی مصالح یا رنگ و نسل پر نہ تھی' بلکہ اس سے زیادہ گہری' مضبوط اور پائیدار چیز پر تھی' وہ زندگی کے متعلق اس مشترک نقطۂ نظر کا رشتہ تھا جس نے دو انسانوں کے درمیان سے علیحدگی اور بے تعلقی کی تمام دیواروں کو گرا دیا تھا۔

Marfat.com

دمشق میں

۱۹۲۳ء کی گرمیوں میں مشرق وسطیٰ کی زندگی اور سیاست کو خاصا سمجھ لینے کے بعد میں بیت المقدس واپس آ گیا۔

فلسطین میں میرا زیادہ عرصہ تک قیام کا ارادہ نہیں تھا۔ اس مرتبہ بھی یعقوب ڈی ہان نے میری مدد کی۔ چونکہ وہ ایک مشہور اخبار نویس تھے اور یورپ کے مختلف اخبارات سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے' اس لئے ان کی سفارش سے میں دو چھوٹے اخبارات سے معاملہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک اخبار ہالینڈ کا تھا اور دوسرا سوئٹزر لینڈ کا۔ مجھے مضامین کا ایک سلسلہ تیار کرنا تھا جس کی اجرت مجھے ہالینڈ اور سوئٹزر لینڈ کی کرنسی میں ملتی۔ چونکہ یہ اخبارات دیہاتی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی اشاعت بھی زیادہ نہ تھی' اس کے لئے وہ مجھے کچھ زیادہ معاوضہ نہیں دے سکتے تھے' لیکن جتنا بھی معاوضہ وہ دے رہے تھے' وہ میری سادہ زندگی کو دیکھتے ہوئے اس سفر کے لئے کافی معلوم ہوا جس کا پلان میں نے پہلے سے تیار کر رکھا تھا' چنانچہ سب سے پہلے میں نے دمشق کا قصد کیا۔

اس سے چند ماہ پیشتر بیت المقدس میں میری ملاقات دمشق کے ایک مدرس سے ہو گئی تھی اور انہوں نے مجھے دعوت دی تھی کہ اگر میرا دمشق آنا ہو تو میں انہیں کا مہمان رہوں' چنانچہ وہاں پہنچنے کے بعد سب سے پہلے میں نے ان کے مکان کا پتہ لگانے کی کوشش کی۔ ایک چھوٹا بچہ رضا کارانہ طور پر یہ خدمت انجام دینے کا آمادہ ہو گیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر ان کے مکان کی طرف چل دیا۔

رات بہت تاریک تھی اور ہم لوگ قدیم شہر کی تنگ و تاریک گلیوں سے گزر رہے تھے جو مکانات کی کھڑکیوں کی وجہ سے اور زیادہ تاریک معلوم رہی تھی' لیمپ کی روشنی میں کبھی کبھی کسی پھل فروش کی دوکان نظر آنے لگتی جس کے سامنے انگور کے ڈھیر سجے ہوئے رکھے تھے۔ آدمی ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے سائے ہوں۔ کبھی کبھی کھڑکیوں کے اندر کسی عورت کی آواز کانوں سے ٹکرا جاتی۔ ایک جگہ لڑکا رک گیا اور بتایا کہ یہ مکان ہے۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا' اندر سے جواب ملا اور میں سنکی کھول کر ایک پختہ صحن میں آ گیا۔ اندر انگور کے درخت لگے تھے جو انگور سے لدے ہوئے تھے۔ ایک پتھر کا حوض تھا جس کے وسط میں فوارہ لگا ہوا تھا۔ اوپر سے ایک آواز آئی۔

تفضّل یا سیّدی ۔ میں ایک تنگ زینہ سے ہوتا ہوا جو دیوار سے ملا ہوا تھا' اوپر ایک کھلی جگہ پہنچ گیا۔ میرے دوست نے مرحبا کہتے ہوئے مجھے اپنے سینہ سے چمٹا لیا۔

چونکہ میں بہت تھکا ہوا تھا' اس لئے فوراً ہی بستر پر دراز ہو گیا۔ ہوا بہت تیز چل رہی تھی اور اندر پائیں باغ میں درختوں کے پتے پھڑ پھڑا رہے تھے' دور سے بہت سی مدھم اور اونگھتی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک بڑے عربی شہر کی آوازیں' جو اب سونے کی تیاریوں میں مشغول تھا۔

Marfat.com

دمشق کی زندگی

دونوں آنکھیں کھول کر اور اس نئی زندگی کو سمجھنے کے ایک اندرونی اشتیاق کے ساتھ میں نے گرمیوں کی یہ ابتدا خاص خاص مقامات اور سڑکوں پر گھوم کر گذاری' جہاں مجھے ان عربوں کے اندرونی سکون واطمینان یا قلبی طمانیت کا سراغ مل گیا۔ یہ دراصل اس معاشرت اور برتاؤ کا نتیجہ تھا جو وہ ایک دوسرے کے ساتھ کرتے تھے۔ اس کی جھلک اس اعتماد میں دیکھی جا سکتی تھی جس طریقہ سے وہ بچوں کی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے چلتے تھے (اور جس کے پیچھے سوائے انس ومحبت کے کوئی اور جذبہ نہ ہوتا تھا)۔ یہ اندرونی سکون واطمینان اس طریقہ میں نظر آیا جس طریقہ سے دوکاندار اپنے گاہکوں سے برتاؤ کرتے تھے۔ یہ لوگ جن میں خوف اور حسد کا کوئی شائبہ ہی نہیں معلوم ہوتا تھا' اگر کسی دوکاندار کو اپنی کسی ضرورت سے غیر حاضر رہنا پڑتا تو وہ اپنے پڑوسی یا اپنے ہم پیشہ قریبی دوکاندار کی نگرانی میں بے تکلف اپنی دوکان چھوڑ کر چلا جاتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی گاہک آتا اور دوکان کو خالی پا کر سوچنے لگتا کہ لاؤ دوسری جگہ سے سودا خرید لیں۔ اس وقت وہ دوکاندار اپنی دوکان چھوڑ کر آجاتا اور سودا بیچتا' اپنا سودا نہیں' اپنے غیر حاضر ساتھی کی دکان کا سودا اور قیمت اس کے کاؤنٹر پر رکھ دیتا۔ کیا یورپ میں کبھی ایسی تجارت دیکھی گئی ہے؟

بعض سڑکیں بدوؤں سے بھری رہتی تھیں جو اپنے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس ہوتے تھے۔ ایسے آدمی جن کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا کہ وہ اپنے خاص راستہ پر گامزن ہیں۔ اپنی جانیں ہتھیلیوں پر لئے ہوئے' دراز قامت' تیز عقابی نگاہوں والے۔ ان کے پرے کے پرے دکانوں کے سامنے بیٹھے دکھائی دیتے۔ وہ آپس میں زیادہ بات نہیں کرتے تھے' (اس لئے کہ ایک جملہ اور ایک بات توجہ سے کہی جاتی تھی اور توجہ سے سنی جاتی تھی جس کی وجہ سے طویل گفتگو کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی)۔ یہ بدو بکواس اور بے مقصد گفتگو سے جو فرسودہ نفوس کا شیوہ ہے' بالکل ناآشنا تھے۔ اس منظر نے میری نظر قرآن کی اس آیت کی طرف منعطف کر دی' جس میں جنت کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے "لا تسمع فیھا لاغیة" (تم اس میں بیکار باتیں نہ سنو گے) خاموشی مجھے بدوؤں کی ایک فضیلت معلوم ہوئی۔ اپنی لانبی چوڑی عباؤں میں (جو عموماً سفید یا سیاہ ہوتی تھی) اپنے کو لپیٹے ہوئے' مہر بہ لب' وہ آپ کو ایک بچہ کی طرح بھولے پن کے ساتھ دیکھتے ہوئے گزر جائیں گے۔ خوددار' متواضع اور ذکی الحس۔ اگر آپ ان کی زبان میں ان سے بات کریں تو ایک اچانک مسکراہٹ کے ساتھ ان کی آنکھیں چمکنے لگیں گی' اس لئے کہ وہ خود پرست یا خود غرض نہ تھے جن کو صرف اپنی فکر ہو۔ وہ سردار تھے' ذی وجاہت اور عالی مرتبہ' اپنے کو لئے ہوئے اور اسی کے ساتھ زندگی کے اور دوسرے معاملات کو بھی اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے تیار اور مستعد۔

جمعہ کے دن دمشق میں زندگی کا نقشہ خاصا بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ خوشی اور مسرت اور رعب ووقار کی ایک ملی جلی فضا شہر پر چھا جاتی تھی' میں نے یورپ میں اپنے اتوار کو یاد کرنا شروع کیا۔ وہ خالی دکانیں اور تنگی اور انقباض مجھے یاد آ گیا جو تعطل کی وجہ سے وہاں پیدا ہو جاتا تھا' لیکن ایسا ہونا کیوں ضروری تھا۔ جب میں نے اس پر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ روزمرہ کی زندگی یورپ میں لوگوں کے لیے ایک بھاری بوجھ بن چکی ہے' جس سے چھٹکارا ان کو صرف اتوار کے

Marfat.com

روز حاصل ہوتا ہے۔ وہ ان کے لئے صرف راحت ہی کا دن نہیں ہے' بلکہ ایک مجہول شے کی طرف فرار کا بھی دن ہے۔ ایک پُر فریب بھول' جس کے پیچھے ہفتے کے اور دن مزید بوجھ لئے ہوئے ان کے انتظار میں موجود رہتے ہیں۔

جہاں تک عربوں کا تعلق ہے' ان کے لئے جمعہ کاموں سے فرار کا دن نہیں' اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کو زندگی کا پھل بلا کسی محنت ومشقت اور جدوجہد کے مل جاتا ہے' بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے مشکل سے مشکل کام بھی ان کے شخصی رجحانات اور خواہشات کے خلاف نہیں ہوتے' روٹین برائے روٹین کے فلسفہ کا ان کے یہاں کوئی وجود نہیں۔ یہاں کام اور کام کرنے والے کے درمیان ایک باطنی تعلق پایا جاتا ہے' جس نے راحت وآرام کو بشرطیکہ آدمی تھکا ہوا نہ ہو غیر ضروری سا بنا دیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اسلام نے بھی اس تعلق اور ہم آہنگی کو ایک فطری حالت قرار دیا ہوگا' یہی وجہ ہے کہ اس نے جمعہ کے روز کسی جبری چھٹی کا قانون نہیں بنایا۔ کاریگر اور چھوٹے دکاندار کچھ گھنٹے کے لئے اپنی دکانیں کھول لیتے تھے' پھر بند کر کے نماز کے لئے چلے جاتے تھے۔ نماز کے بعد قہوہ خانوں میں کچھ وقت گزاری کے بعد پھر کچھ گھنٹوں کے لئے دکانیں کھول لیتے۔ بہت کم دکانیں جمعہ کے روز بند نظر آتی تھیں۔ شہر کی سڑکیں ہفتہ کے اور دنوں کی طرح پُر شور اور آباد رہتی تھیں' صرف جمعہ کی نماز کے وقت یہ کیفیت نہ ہوتی تھی۔

زندگی کا نظام اور جسم وروح کا خوشگوار اجتماع

ایک جمعہ کو میں اپنے میزبان دوست کے ساتھ جامع اموی میں گیا۔ اس کے سنگ مرمر کے ستونوں پر چھت کے روشن دانوں سے سورج کی شعاعیں پڑ رہی تھیں۔ مسک کی خوشبو سے پوری مسجد معطر تھی' فرش پر نیلے اور سرخ رنگ کے قالین بچھے ہوئے تھے اور سیدھی طویل صف باندھے ہوئے سیکڑوں آدمی امام کے پیچھے کھڑے تھے۔ وہ رکوع کرتے تھے' پھر سجدہ کرتے ہوئے اپنی پیشانی اس پر رکھ دیتے تھے' پھر ایک ساتھ پورے ڈسپلن اور انتظام کے ساتھ کھڑے ہوتے تھے۔ بالکل فوجیوں کی طرح ہر چیز پُر سکون تھی۔ جب مجمع کھڑا تھا' اس وقت اندر کے بڑے ہال سے امام کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی جو قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ جیسے ہی وہ رکوع کرتے سب لوگ ان کے ساتھ فوراً جھک جاتے' وہ سجدہ کرتے تو ایک ساتھ پوری جماعت ان کے ساتھ سجدہ میں گر جاتی' وہ اس طرح سجدہ اور رکوع کر رہے تھے جیسے خدا ان کی نگاہوں کے سامنے ہو۔

اس وقت مجھے خدا سے اور دین سے ان لوگوں کی قربت اور تعلق کا احساس ہوا' بلکہ وہ اسی کا ایک حصہ تھی' وہ زندگی کو بھلانے کے لئے نہیں پڑھی جاتی تھی' بلکہ اس زندگی میں خدا کی یاد شامل کر کے اس کو اور زیادہ بہتر طریقہ پر یاد رکھنے کے لئے!

مسجد سے نکلتے ہوئے میں نے اپنے دوست سے کہا' کتنی حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ آپ لوگ خدا کو اس حد تک قریب سمجھتے ہیں' میری خواہش ہے کہ میں بھی اسی طرح سمجھ سکوں۔

Marfat.com

انہوں نے کہا' اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا ہو سکتا ہے میرے بھائی! کیا اللہ جیسا ہماری مقدس کتاب نے بتایا ہے' ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب نہیں ہے!

اس نئے احساس اور نئی دریافت کا میرے اوپر خاصا اثر تھا' چنانچہ میں نے دمشق میں اپنے بیشتر دن اسلامی کتابوں کے مطالعہ میں گزارے۔ عربی زبان سے میری واقفیت اتنی تو تھی کہ اس میں اپنا مافی الضمیر ادا کر لیتا تھا' لیکن اتنی نہ تھی کہ میں قرآن کا براہ راست مطالعہ کر سکتا۔ اس سلسلہ میں مجھے دو ترجموں کی مدد لینی پڑی' ایک فرانسیسی دوسرے جرمنی' جو مجھے ایک کتاب خانہ سے مستعار مل گئے۔ جہاں تک اور دوسری معلومات کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں مجھے یورپین مستشرقین کی کتابوں اور اپنے دوست کی باتوں پر اعتماد کرنا پڑا۔

ان مطالعوں یا گفتگوؤں کی جو بھی نوعیت رہی ہو' بہر حال ان کی وجہ سے میری نگاہوں سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ میں افکار کی ایک ایسی دنیا کا مشاہدہ کر رہا تھا جس سے اب تک میں مطلق ناواقف تھا۔

اسلام دین کے رواجی یا اصطلاحی مفہوم سے زیادہ زندگی کا نظام بن کر میرے سامنے آیا۔ وہ مجھے لاہوتی نظام سے زیادہ شخصی اور اجتماعی سلوک کا ایک پروگرام اور لائحہ عمل معلوم ہوا' جس کی بنیاد خدا کی یاد پر تھی۔ میں نے قرآن میں کسی جگہ ''چھٹکارے'' کا تصور نہیں دیکھا۔ وہاں کوئی پہلا موروثی گناہ بھی نہیں تھا جو انسان اور اس کی قسمت یا تقدیر کے درمیان حائل ہو گیا ہو۔ وہاں تو یہ تھا ''لیس للانسان الا ماسعیٰ'' (انسان جیسی کوشش کرے گا' ویسا پائے گا)۔ وہ کسی قسم کی رہبانیت یا فطرت کشی کا بھی طالب نہیں تھا جس کے ذریعہ طہارت کا کوئی خفیہ دروازہ کھل جاتا ہو' اس لئے کہ اس کے نزدیک طہارت اور پاکیزگی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے اور گناہ صرف انسان کی ایجابی فطرت کی صفات کی ایک لغزش ہے' جو خدا نے اس میں ودیعت کی ہے۔ وہاں فطرت انسانی کی کوئی تقسیم بھی نہیں ملتی' اس لئے کہ اس کے نزدیک روح اور جسم مل کر ایک صحیح اور مکمل وحدت تیار ہوتی ہے۔

ابتدا میں میں یہ دیکھ کر بہت گھبرایا کہ قرآن کو صرف روحانی معاملات ہی سے دلچسپی نہیں معلوم ہوتی' بلکہ وہ زندگی کے بعض ان شعبوں کا بھی بہت اہتمام کے ساتھ ذکر کرتا ہے جو مجھے بہت دنیاوی قسم کے اور حقیر معلوم ہوتے تھے' لیکن کچھ زمانہ گزرنے پر یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اگر انسان روح اور جسم کا مجموعہ ہے تو پھر اس کی زندگی کے کسی شعبہ اور کسی پہلو سے پہلو تہی نہیں برتی جا سکتی اور نہ اس کو دین کے دائرہ عمل یا دائرۂ اختصاص سے باہر تصور کر کے حقیر سمجھا جا سکتا ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں نے دیکھا کہ قرآن ایک لمحہ کے لئے بھی یہ فراموش کرنے کے لیے تیار نہیں کہ یہ دنیا بہر حال انسان کی ترقی کے راستہ کا ایک مرحلہ ہے۔ اس کا اصل مقصد روحانی ہی مزاج رکھتا ہے۔ مادی خوشحالی قرآن کے نزدیک مستحسن اور مستحب ہے' لیکن وہ بذات خود مقصد نہیں' اسی لئے انسان کی نفسانی خواہشات کو باوجود اس کی اہمیت وضرورت کے اخلاقی حس کے مقابلہ میں دبا دیا جائے گا۔ یہ اخلاقی حس صرف خدا اور بندہ کے مابین محدود نہ رہنی چاہئے بلکہ انسانوں کے آپس کے تعلقات تک وسیع ہونی چاہئے۔ اس کا مقصد صرف فرد کی زندگی کی روحانی تکمیل نہ ہو بلکہ سوسائٹی میں ایسے حالات بھی پیدا کرنا اس کا مقصد ہو جو دوسرے انسانوں کو روحانی ترقی اور نشو

Marfat.com

ونما کے لئے سازگار ماحول اور فضا پیدا کر سکے اور جس کے سایہ میں وہ مکمل زندگی گزار سکیں۔

یہ تمام چیزیں عقلی اور اخلاقی طور پر اسلام کے احترام پر ابھار رہی تھیں' وہ اسلام جس کے متعلق میں نے اس سے پہلے جو کچھ پڑھا یا سنا تھا' وہ ان چیزوں کے مقابلہ میں گویا بمنزلہ صفر کے تھا۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ روحانی مسائل کے سلسلہ میں قرآن کا طریقہ عہد قدیم کے طریقہ سے زیادہ گہرا ہے۔ وہاں مؤخر الذکر کی طرح کسی خاص قوم کی پاسداری بھی نہیں ہے۔ مادی مسائل میں اس کا طریقہ بخلاف عہد جدید کے بہت زیادہ ایجابی ہے۔ روح اور جسم اس کی زندگی کے دو رخ ہیں جن کو خدا نے پیدا کیا ہے۔

میں نے اپنے دل سے سوال کیا:

کیا یہی تعلقات اس قلبی طمانیت کا باعث تو نہیں ہیں جس کا میں نے عربوں میں رہ کر اس پوری مدت میں مشاہدہ کیا ہے؟

دوبارہ یورپ

یہ پہلا تأثر جب میں عالم عربی کے دورہ کے بعد یورپ واپس لوٹ رہا تھا' اس وقت پہلی بار کچھ ماند پڑ گیا' جب ۱۹۲۳ء کے موسم خزاں میں شام کے چھوڑنے کے بعد مجھے ترکی میں چند ماہ قیام کا موقع ملا' مصطفیٰ کمال کا ترکی اس وقت اپنے اصلاحی مرحلہ میں داخل نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی تک اپنی زندگی اور روایات میں خالص ترکی تھا اور اسلامی رشتہ کی وجہ سے عربی زندگی کے عام بہاؤ کے ساتھ بھی اس کا ربط قائم تھا' لیکن ترک مجھے عربوں کی بہ نسبت زیادہ ثقیل المزاج' اکھڑ اور خشک معلوم ہوئے۔ وہ اپنے احساس میں یورپ سے بہت قریب تھے۔ جب میں نے خشکی کے راستہ سے استنبول سے صوفیا اور وہاں سے بلغراد کا سفر کیا تو مجھے مشرق سے مغرب منتقل ہونے کا کوئی اچانک احساس نہیں ہوا۔ مناظر اور حالات تدریجی طور پر بدل رہے تھے۔ ایک ایک کر کے مناظر نظروں سے اوجھل ہو جاتے اور ان کی جگہ دوسری طرز کے مناظر لے لیتے۔ مساجد کے مینارے کم ہوتے جاتے اور ان کا فاصلہ بڑھ رہا تھا اور کوٹ اور جیسٹر کے بجائے اب کسانوں کے سادے کپڑے نظر آ رہے تھے۔

پھر میں نے اچانک اپنے آپ کو اٹلی کی سرحدوں کے قریب پایا' جب میں اس ٹرین پر سوار ہوا جو مجھے ٹریسٹ (Trieste) سے ویانا لے جا رہی تھی تو اس وقت ترکی کے متعلق میرے تأثرات تقریباً بالکل محو ہو چکے تھے' صرف ایک حقیقت باقی رہ گئی تھی اور وہ تھے اٹھارہ مہینے جو میں نے عرب ممالک میں گزارے تھے۔

اب میں پھر یورپ میں تھا۔ مجھے اس بات سے قدرے اذیت ہوئی کہ میں یورپ کے مناظر کو اس طرح دیکھ رہا تھا جس طرح اجنبی سیاح یا مسافر دیکھتا ہے۔ لوگ مجھے بہت مکروہ اور حقیر دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی حرکات وسکنات بڑی بھدی اور پھوہڑ معلوم ہوتی تھیں' جن کو ان کے ارادہ وشعور سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ وہ اس بات کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ وہ ہر کام سمجھ بوجھ کر کر رہے ہیں اور اپنے مقصد سے واقف ہیں' لیکن

Marfat.com

درحقیقت وہ اپنے مقصد کو سمجھے بغیر زعم وخودنمائی کی دنیا میں گم ہیں۔اب یہ بات واضح تھی کہ عربوں سے میرے تعلقات نے اس سلسلہ میں میرے نظریہ کو یکسر تبدیل کر دیا ہے جس کو میں زندگی کا جوہری جز سمجھتا ہوں۔ پھر میں نے کسی قدر حیرت کے ساتھ سوچا کہ میری طرح بہت سے یوروپین لوگوں نے عربوں کی معاشرت اور زندگی کا تجربہ کیا ہے۔کیا ممکن ہے کہ ان کو وہ دھچکا نہ لگا ہو جس نے مجھے مزید تحقیقات اور انکشافات پر مجبور کیا تھا؟ اگر ان کو اس کا تجربہ ہوا ہے تو کیا ان کے ساتھ وہی کچھ پیش آیا جو میرے ساتھ آیا تھا۔

اس کا جواب مجھے چند سال کے بعد جزیرہ عرب ہی میں ملا۔ فان ڈیئر میولن (Dr. Van der Meulen) جو اس زمانہ میں جدہ میں ہالینڈ کے سفیر تھے' میرے پاس آئے۔وہ کافی سلجھے ہوئے آدمی تھے اور متنوع ثقافت کے مالک تھے اور بہت شدت کے ساتھ (جو اس زمانہ میں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے) اپنی عیسائیت پر قائم تھے اور اسی وجہ سے وہ ایک مذہب کی حیثیت سے اسلام کے دوست نہیں تھے' لیکن باوجود اس کے انہوں نے یہ اعتراف کیا کہ انہیں اپنے وطن کو بھی مستثنیٰ کئے بغیر ہر ملک سے زیادہ جزیرہ عرب سے محبت ہے۔ حجاز میں ان کے کام کی مدت ختم ہوگئی تو ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے کہا۔''میں سمجھتا ہوں کہ کوئی حساس اور صاحب شعور آدمی عربوں میں قیام کرنے کے بعد عربی طرز معاشرت اور زندگی کے سحر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا' نہ اپنے دل کو اس جادو سے محفوظ کر سکتا ہے۔آدمی ان ممالک کو چھوڑ دیتا ہے' لیکن ان صحرائی مقامات کی فضا ہمیشہ اس کو یاد رہتی ہے اور وہ برابر اس کا مشتاق رہتا ہے خواہ خود اس کا ملک اس سے زیادہ حسین' دولت منداور سحر آگیں ہو۔''

ویانا میں چند ہفتے کے لئے میں ٹھہر گیا' جہاں میں نے اپنے والد سے مصالحت......... کی تقریب منائی۔ میرے یونیورسٹی کو خیر باد کہنے اور نامناسب طریقہ سے ان کا ساتھ چھوڑ دینے پر ان کی خفگی اور ناراضگی اب خاصی دھیمی پڑ چکی تھی۔ میں اب ''فرانکفورٹر'' کا مراسلہ نگار تھا (وہ اخبار جس کا نام وسط یورپ میں ان دنوں بہت رعب اور ہیبت کے ساتھ لیا جاتا تھا اور اس طرح میں نے اپنے اس دعوے کے لئے بنیاد فراہم کر لی تھی کہ ''میں چوٹی تک پہنچوں گا۔'')

ویانا سے میں سیدھا فرانکفورٹ آیا تا کہ شخصی طور پر میں اس اخبار سے اپنا تعارف کرا دوں' جس کے لئے میں نے ایک سال تک کام کیا ہے۔ یہ کام میں نے بہت اطمینان کے ساتھ کیا' اس لئے کہ فرانکفورٹ سے جو خطوط میرے پاس آئے تھے' ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ میری تحریروں کو وقیع نظروں سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ میں اخبار کے قدیم محل میں داخل ہوا اور اپنا کارڈ ڈاکٹر ہائنرخ سائمن (Dr. Heinrich Simon) کو بھجوا دیا جو اس وقت عالمی شہرت کے مالک تھے۔

جب میں ان کے آفس میں پہنچا تو ایک لمحہ کے لئے انہوں نے مجھے دیکھا۔ان پر اتنی حیرت طاری ہوئی کہ نہ ان کو اٹھنے کا خیال ہوا اور نہ بات کرنے کا' لیکن جلد ہی اطمینان کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ کھڑے ہوئے اور مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔

Marfat.com

بیٹھے بیٹھے مجھے خیال تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔ پھر اس کے بعد وہ خاموشی کے ساتھ ساتھ برابر مجھے گھورتے رہے۔

میں نے کچھ گھٹن اور بوجھ سا محسوس کرتے ہوئے اس سکوت کو توڑا۔ کیا اس معاملہ میں کچھ غلطی ہے ڈاکٹر سائمن؟

نہیں نہیں، غلطی کیا ہوگی! لیکن ایک لحاظ سے تو سب غلطی ہی غلطی ہے؟ پھر وہ ہنسے اور کہنے لگے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اچھی خاصی عمر کا کوئی آدمی ہوگا جو سنہرے فریم کی عینک لگائے ہوگا' لیکن اس کے برعکس میں اپنے سامنے ایک بچہ کو دیکھ رہا ہوں۔ آپ مجھے معاف فرمائیں' آپ کی عمر کیا ہوگی؟

دفعتاً مجھے ہالینڈ کا وہ تاجر یاد آیا جس نے مجھ سے ایک سال قبل یہی سوال کیا تھا۔ میں بے تحاشا ہنسنے لگا۔

میں اس وقت تئیس سال سے اوپر ہوں۔ تھوڑے ہی دنوں میں چوبیس سال کا ہو جاؤں گا۔ کیا آپ مجھے ''فرانکفورٹر'' کے کام کے لحاظ سے چھوٹا پا رہے ہیں؟

ڈاکٹر سائمن نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا ''نہیں ''فرانکفورٹر'' کے اعتبار سے نہیں' آپ کے مقالات کے اعتبار سے ضرور چھوٹا پا رہا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ کوئی شخص جب تک کہ وہ آپ سے زیادہ عمر رسیدہ نہ ہو' اپنی شخصیت کو منوانے کی طبعی خواہش پر قابو نہیں پا سکتا اور نہ اپنی شخصیت سے علیحدہ ہو کر لکھ سکتا ہے جیسا کہ آپ کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے۔ پختہ صحافت کا راز یہ ہے کہ آدمی بالکل موضوع سے متعلق لکھے اور اس میں اپنے ذاتی جذبات اور خیالات کی آمیزش نہ کرے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے جس کا خیال مجھے اسی وقت آیا' وہ یہ کہ اس زبردست جذبہ کے ساتھ اور اس خوش اسلوبی کے ساتھ وہی شخص لکھ سکتا ہے جو آپ کی طرح نوجوان ہو۔ پھر ایک گہری سانس لے کر انہوں نے کہا۔ حقیقت میں یہ میری آرزو ہے کہ آپ کا ستارہ اقبال بلند ہو اور آپ اور دوسروں کی طرح مغرور ہو کر اور دھوکہ میں پڑ کر ٹھوکریں نہ کھاتے پھریں۔''

میری نوعمری کی وجہ سے ڈاکٹر سائمن کو پختہ یقین ہو گیا کہ مجھ جیسے مراسلہ نگار سے انہیں مستقبل میں کافی فائدہ کی امید ہے' اس لئے انہوں نے فوراً ہی میری جلد از جلد مشرق وسطیٰ واپسی پر رضامندی ظاہر کر دی۔ مالی اعتبار سے بھی اب کوئی دشواری باقی نہیں رہ گئی تھی' اس لئے کہ جرمنی نے گذشتہ سال ۱۹۲۳ء میں افراط زر پر قابو حاصل کر لیا تھا اور سکہ کے توازن نے ملک میں خوش حالی کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ اس کے علاوہ ''فرانکفورٹر'' کی حیثیت بھی ایسی تھی کہ وہ اپنے غیر ملکی نامہ نگاروں کے اخراجات سفر برداشت کر سکتا تھا' مگر ڈاکٹر اس کے منتظر تھے کہ حسب وعدہ میں وہ کتاب بھی پیش کروں جس کے متعلق پہلے سے معاملہ طے ہو چکا تھا۔ بہر حال اخبار کے ادارہ نے فیصلہ کیا کہ میں چیف ایڈیٹر کے آفس سے متعلق رہوں تا کہ بڑے اخبارات کے معاملات اور کاموں سے مجھے اچھی طرح واقفیت حاصل ہو سکے۔

اگر چہ مجھے دوسری بار سفر کا بڑا اشتیاق تھا' لیکن پھر بھی یہ مہینے جو فرانکفورٹ میں گزرے' وہ میرے لئے بڑے فرحت بخش اور ہنگامہ خیز تھے۔ ''فرانکفورٹر'' صرف ایک اخبار نہیں تھا' بلکہ بحث و تحقیق اور اعداد و شمار کا ایک اچھا

Marfat.com

بڑا ادارہ تھا۔ یہاں پینتالیس تو صرف فرسٹ کلاس مدیران تھے' ثانوی محررین اسسٹنٹ اور رپورٹر اس کے علاوہ تھے۔ تحریری کام خاص طور پر بہت بلند معیار پر ہوتا تھا۔ دنیا کا ہر ملک اور ہر اہم سیاسی واقتصادی موضوع ایک خاص ماہر کے سپرد تھا جو اس کا متخصص ہوتا تھا۔ اس اخبار کی ایک قدیم روایت یہ تھی کہ اس کے مقالات صرف عارضی حالات اور واقعات کی وقتی عکاسی نہیں ہوتے تھے' بلکہ اس کی حیثیت سیاسی دستاویزات کی ہوتی تھی جس سے سیاستدان اور مورخین استفادہ کرتے۔ برلین میں یہ مشہور تھا کہ وزارت خارجہ کا دفتر ''فرانکفورٹر'' کے تحلیلی اور افتتاحی مقالات کو اسی احترام اور اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھتا ہے جس طرح سرکاری کاغذات اور فائلیں وغیرہ (یہاں تک کہ بسمارک کو اخبار کے برلین آفس کے انچارج کے بارہ میں یہ کہتے ہوئے سنایا گیا کہ ڈاکٹر اشٹائن (Stein) برلین میں فرانکفورٹ کے سفیر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اتنے بڑے ادارہ کی ممبری میری عمر والے نوجوان کے لئے بڑی دلفریب اور خوشگوار چیز تھی۔ خصوصاً اس حالت میں جبکہ مشرق وسطیٰ کے بارہ میں میرے افکار وخیالات نے اخبار میں کام کرنے والوں کو بڑی سنجیدگی سے میری طرف متوجہ کر دیا تھا اور اکثر ان کی روزانہ کانفرنسوں کا یہی موضوع سخن رہتا تھا۔ پھر فتح مکمل اس وقت ہوئی جب مشرق وسطیٰ کے ایک ایسے مسئلہ کے بارہ میں جو اسی وقت پیدا ہوا تھا' مجھ سے افتتاحی مقالہ لکھنے کو کہا گیا۔

مغربی تہذیب کا نیا مطالعہ

''فرانکفورٹر'' میں کام کرنے کی وجہ سے میرے افکار وخیالات میں ایک زبردست ابھارنے والی طاقت پیدا ہوگئی اور میں پہلے سے زیادہ صفائی اور وضاحت کے ساتھ اپنی مغربی دنیا کو جس کا میں دوبارہ جز بن گیا تھا' اپنے مشرقی دنیا کے تجربے اور معلومات سے باخبر کرتا رہا۔ یہ بات مجھ پر واضح ہونے لگی کہ ہوسکتا ہے کہ یورپ کی داخلی ہم آہنگی کی احتیاج اور اس کی مضطرب ادبی واخلاقی حالت اس قسم کے رشتہ کے فقدان سے پیدا ہوئی ہے جس قسم کا رشتہ میں نے عربوں کے اندرونی سکون واطمینان اور ان کے عقیدہ وایمان کے درمیان دریافت کیا تھا۔

یہاں ___ جیسا کہ میں نے دیکھا ___ ایک ایسی سوسائٹی تھی جو اگرچہ خدا سے اپنا رشتہ توڑ چکی تھی' لیکن پھر کسی جدید روحانی تنظیم کی جویا تھی' مگر بہت ہی کم یوروپین ہوں گے جو اس کا ادراک کر سکتے ہوں۔ ان کی اکثریت شعوری یا غیر شعوری طور پر جو سوچتی اور سمجھتی تھی' اس کو اس عبارت میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ ''ہمارا احساس ہماری ریاضی اور حساب زندگی کی اصل اور اس کے آغاز وانجام کے بارہ میں کسی متعین چیز کے انکشاف کرنے سے قاصر ہے' اس لئے ہم کو چاہیے کہ ساری طاقتیں اپنی مادی اور عقلی طاقتوں کے نشوونما میں لگادیں اور اس بات کا موقع نہ دیں کہ آداب اور اخلاق کے وہ ڈھکوسلے جو عقل سے ماوراء ہیں اور وہ ادبی واخلاقی دعوے یا غلط مفروضے جو صرف وہم گمان پر قائم ہیں اور ان کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہم کو زچ کریں اور ہماری راہ میں روڑے اٹکائیں۔'' اگرچہ مغربی سوسائٹی نے خدا کا کھلے

Marfat.com

بندوں انکار نہیں کیا' لیکن اس نے اس کو اپنے طرز فکر میں کوئی جگہ بھی نہیں دی۔

مسیحیت کا تصور زندگی

گذشتہ سالوں میں جب میں اپنے آباؤ اجداد کے دین سے مایوس ہوا تھا' اس وقت میں نے عیسائیت پر غور کرنا چاہا۔ عیسائیت میں خدا کا تصور عہد قدیم کے تصور سے کہیں زیادہ بہتر اور بلند تھا۔ اس نے خدا کی محبت اور رحمت کو کسی خاص جماعت کے ساتھ مخصوص نہیں کیا تھا بلکہ اس کو ساری انسانیت کا رب قرار دیا تھا' لیکن بایں ہمہ اس میں ایک چیز ایسی بھی تھی جس نے اس کی آفاقیت کو نقصان پہنچایا تھا' وہ تھی جسم اور روح' عقیدہ اور عمل کی تفریق۔

مسیحیت کی ان رجحانات اور جذبات کی گرفت ہی سے جو دنیاوی زندگی کی درستی اور مادی جدوجہد سے متعلق تھے' مجھے یہ احساس ہوگیا کہ اب عرصہ دراز سے وہ اس قابل نہیں رہی کہ مغربی تہذیب کو کوئی پُرجوش ادبی و اخلاقی طاقت عطا کر سکے۔ اس کے پیرو اس طرز فکر سے اچھی طرح مانوس ہو چکے تھے کہ دین کو عملی زندگی میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ اپنے مذہبی عقائد کو ایک خاص قسم کے مخدر زاویہ نگاہ سے دیکھنے پر قانع تھے' جس میں شخصی فضیلت اور نیکی' خصوصاً جنسی پاکیزگی اور طہارت کا ایک مبہم سا مفہوم ملتا تھا۔ کلیسا کا قدیم رجحان اس سلسلہ میں ان کا ممد و معاون تھا۔

''جو خدا کا ہے خدا کو دو اور جو قیصر کا ہے قیصر کو دو'' کا اصول بھی اجتماعی و اقتصادی ڈھانچوں میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی پیدا نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحی سیاست اور نجات حضرت مسیح کے بتائے ہوئے راستہ کے بالکل مخالف سمت چل پڑی اور آگے بڑھتی رہی۔ مغرب میں مذہب اس لئے ناکام ہوگیا کہ وہ اپنے پیروؤں کو دنیاوی معاملات کے لئے کوئی مضبوط بنیاد نہیں دے سکا جو کہ میری رائے میں حضرت مسیح کا پیغام تھا اور جو حقیقت میں ہر دین کا بنیادی کام ہے۔ سوسائٹی میں صالح شعور و احساس کی بیداری اور ایسے حالات پیدا کرنا جس میں وہ نیک زندگی گزار سکے۔ آخر کار اس غریزی احساس کے دین نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

چند صدیوں کے اندر مغربی انسان مسیحیت پر ایمان سے بالکل دست بردار ہوگیا اور اس ایمان کے فقدان سے اس کا یہ یقین و اطمینان بھی جاتا رہا کہ یہ کائنات ایک مسلمہ قوت کی کارفرمائی ہے اور وہ خود اس کُل کا ایک جز ہے۔ اس ایمان و اطمینان کے فقدان کے بعد اب وہ ایک روحانی اور اخلاقی خلا میں زندگی گزار رہا ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ مغرب کی مسیحیت سے کنارہ کشی اور بے رخی دراصل پال کے اس نقطہ نظر کے خلاف ایک ردعمل ہے جس میں زندگی کو بہت حقیر دکھایا گیا ہے اور جس نے مسیح کی تعلیمات کو بالکل مبہم اور ناقابل فہم بنا دیا ہے۔ ایسی صورت میں مغربی سوسائٹی کا یہ دعویٰ کیسے درست ہوسکتا ہے کہ وہ مسیحی سوسائٹی ہے۔ اسے اس بات کی توقع کیوں ہے کہ بغیر کسی مضبوط ایمان کے وہ اپنی موجود ادبی و اخلاقی انارکی پر قابو پا سکتا ہے۔

Marfat.com

مغرب کی بے چین اور محروم یقین دنیا

ایک دنیا جہان اضطراب اور ابال ہو' یہ تھی ہماری مغربی دنیا' حد درجہ تباہی اور خونریزی جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اجتماعی روایات میں رسہ کشی' فکری مذاہب میں تصادم' زندگی کے نئے نئے طریقوں اور فیشن کے لئے ہر جگہ ایک سخت کشمکش' یہ ہیں ہمارے دور کے خصائص اور اوصاف۔

جنگ عظیم کے دھوئیں کے ہولناک بادلوں اور تباہ کاریوں سے لے کر چھوٹی چھوٹی جنگوں تک جن کا کوئی شمار ہی نہیں' انقلابات اور جوابی انقلابات' اقتصادی اور معاشی پریشانیاں' جو اس زمانہ کی تمام دشواریوں اور پریشانیوں سے بڑھ چڑھ کر تھیں' ان تمام ہولناک واقعات نے یہ حقیقت ظاہر کر دی تھی۔ فنی' صنعتی اور مادی ترقیات پر مغرب کی ساری زور آزمائی موجودہ انتشار اور بے نظمی میں ذرا بھی کمی نہیں کر سکی۔ نوجوانی کا میرا یہ فطری رجحان کہ ''صرف روٹی سے انسان زندہ نہیں رہ سکتا'' ایک عقلی نظریہ بن چکا تھا کہ ترقی کی یہ کوشش قدیم ایمان کی جگہ پُر کرنے کے لئے تھی جو غیر مادی اقدار پر قائم تھا۔ اس خلا کو پُر کرنے کے ان لوگوں نے (جو اقدار مجردہ پر ایمان کی استطاعت نہیں رکھتے تھے) ایک جھوٹا ایمان ایجاد کیا تھا اور اپنے کو اس دھوکہ میں رکھنا چاہتے تھے کہ انسان کسی نہ کسی طریقہ سے صرف ترقی کے جذبہ کو ساتھ لے کر موجودہ مصائب پر قابو پا سکتا ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ ان جدید اقتصادی نظاموں میں سے کوئی بھی نظام جس کے پیچھے یہ گمراہ کن اور پُر فریب خیال کام کر رہا ہو' مغربی سوسائٹی کی مصیبتیں اور تکلیفیں دور کرنے کے لئے ایک عارضی اور مخدر دوا سے بھی زیادہ کوئی چیز ثابت ہو سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ وہ اس کے بعض امراض کو دور کر دے' لیکن ان امراض کے اسباب کو جڑ سے اکھاڑنے میں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

مشرق وسطیٰ کا دوسرا سفر

۱۹۲۴ء کے موسم بہار میں مجھے ''فرانکفورٹر'' نے مشرق وسطیٰ کے لئے روانہ کر دیا۔ اس سے پہلے میں نے حسب وعدہ کتاب اس کو مرتب کر کے دے دی جس میں میری گذشتہ اسفار کی روئداد تھی۔ وہ میری روانگی کے چند ماہ بعد شائع ہو گئی اور اگر چہ اس میں صیہونیت کے مخالف رجحان اور عربوں کی طرف غیر معمولی میلان کی وجہ سے جرمن صحافت میں ایک شور سا برپا ہو گیا' لیکن باوجود اس کے کتاب زیادہ تعداد میں فروخت نہ ہو سکی۔

میں بحرابیض متوسط کو عبور کر کے اب مصر کے کنارے تھا۔ پورٹ سعید سے قاہرہ تک میرا ریل کا سفر ایسا تھا جس طرح کسی پڑھی ہوئی کتاب کی دوبارہ ورق گردانی کی جائے۔ نہر سویز اور بحیرالمنزلہ کے درمیان بطیں پانی میں تیر رہی تھیں۔ ٹمرس (Tamarisk) کے پتے اور ڈالیاں جو پنکھے کی خوبصورت شکل کے تھے' ہل رہے تھے۔ میدانوں میں کچھ گاؤں نظر آئے جو کہیں سرسبز و شاداب ہو جاتے تھے اور کہیں خالی نظر آنے لگتے تھے۔

بھینسیں اور کبھی کبھی ان کے ساتھ اونٹ گیلی زمین پر ہل چلا رہے تھے۔ جب ہم سویز کنال سے مغرب کی

Marfat.com

طرف نظر ڈالتے تو سبزہ اور شادابی ہم کو اپنی طرف کھینچنے لگتی۔ جب دوسری مرتبہ میری نظر ان سبک اور سرو قامت عورتوں پر پڑی جو ناقابل بیان حسن نوازی کے ساتھ جھومتی ہوئی محو خرام تھیں اور اپنے سروں پر بھرے ہوئے گھڑے رکھے ہاتھ چھوڑے ہوئے ان کھیتوں میں آ جا رہی تھیں تو میں نے اپنے دل میں کہا۔

بہتر سے بہتر کار سے لے کر بڑے سے بڑے پل تک اور قیمتی سے قیمتی کتاب تک کوئی چیز بھی اس حسن کی جگہ کو پُر نہیں کر سکتی جو یورپ میں ضائع ہو چکا ہے اور جو مشرق میں بھی خطرات سے دوچار ہے۔ یہ حسن جو اس محیط کائنات اور نفس انسانی کے درمیان سحری ارتباط اور ہم آہنگی کی ایک تعبیر کے سوا کچھ نہیں۔

ٹرین کے تاثرات

اس بار میں فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا تھا۔ کمپارٹمنٹ میں میرے علاوہ صرف دو مسافر اور تھے۔ ایک اسکندریہ کا یونانی تاجر جو مجھ سے اہل مشرق کی عادت کے مطابق بہت جلد گھل مل گیا اور اُس سے بے تکلفی کے ساتھ گفتگو ہونے لگی اور دوسرا ایک مصری چودھری جو اپنے قیمتی ریشمی جبہ اور سنہری گھڑی سے بظاہر مالدار معلوم ہو رہا تھا' لیکن وہ اپنی عزلت پر قانع ایک طرف خاموش بیٹھا رہا اور واقعہ یہ ہے کہ جس وقت وہ گفتگو میں شریک ہوا' اسی وقت اس نے اعتراف کر لیا کہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا' مگر اس کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ ذوق سلیم اور ذہانت سے بہرہ ور ہے۔

ہم لوگ جیسا کہ مجھے یاد پڑتا ہے' اسلام کے بعض اجتماعی اصولوں پر گفتگو کر رہے تھے جو اس زمانے میں میرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ میرے رفیق یونانی مسافر نے اسلامی شریعت کے ''اجتماعی انصاف'' کے بارے میں میرے تأثر کی پوری طرح تائید نہیں کی۔

انہوں نے کہا۔

شریعت اسلامی اتنی عادلانہ نہیں ہے جتنی آپ سمجھ رہے ہیں' میرے دوست۔ پھر وہ فرانسیسی کے بجائے عربی میں گفتگو کرنے لگے تاکہ ہمارا مصری رفیق بھی سمجھ سکے۔ انہوں نے اس کی طرف رخ پھیرتے ہوئے کہا۔ آپ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کا دین بہت عادلانہ ہے انصاف پسند ہے' کیا آپ اس کا جواب دے سکتے ہیں کہ جب اسلام مسلمانوں کو عیسائی اور یہودی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت دیتا ہے تو آپ کی بہنوں اور بیٹیوں کو اس کی اجازت کیوں نہیں دیتا کہ وہ عیسائیوں اور یہودیوں سے شادی کر سکیں۔ کیا اس کو انصاف کہا جا سکتا ہے؟ اس کو انصاف ہی کہیں گے۔ باوقار چودھری نے ایک منٹ بھی تردد کے بغیر جواب دیا۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ شریعت اسلامی نے یہ قانون کیوں بنایا ہے۔ ہم مسلمانوں کا یہ عقیدہ نہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔ ہم ان کو حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاء کی طرح اللہ کا رسول سمجھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ سب وہی طریقہ لے کر آئے جو آخر میں خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے۔ اب اگر کوئی عیسائی لڑکی مسلمانوں سے شادی کرتی ہے تو وہ اس بات کا اطمینان کر سکتی ہے کہ اس کے لئے خاندان اور نئے گھرانے میں اس کی مقدس ہستیوں کا نام عزت و احترام کے ساتھ لیا جائے

Marfat.com

گا۔اس کے برخلاف اگر کوئی مسلمان لڑکی غیر مسلم سے شادی کرتی ہے تو اس کو بجا طور پر اس بات کا خطرہ رہتا ہے کہ جن کو وہ اللہ کا رسول سمجھتی ہے' ممکن ہے ان کو برے ناموں سے یاد کیا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ خود اپنی اولاد ہی سے اس کو ایسی باتیں سنی پڑیں۔ کیا لڑکے اپنے باپ کے دین کی پیروی نہ کریں گے؟ اس صورت میں کیا آپ اس کو انصاف قرار دیں گے کہ اس غریب عورت کو اس قسم کی مسلسل اذیت اور اہانت برداشت کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے؟ یونانی تاجر نے لاجواب ہو کر لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے شانے کو جھٹکا دیا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے محسوس ہوا کہ اس ناخواندہ چودھری نے اپنے ذوق سلیم سے جس میں وہ اپنے ساتھیوں سے ممتاز معلوم ہوتا ہے' ایک بہت اہم مسئلہ کے بارے میں بڑے پتہ کی بات کہہ دی ہے اور دوسری بار — جس طرح بوڑھے حاجی کے ساتھ بیت المقدس میں پہلی بار ہوا تھا — میں نے یہ محسوس کیا کہ میرے لئے اسلام کا ایک نیا دروازہ کھل رہا ہے۔

قاہرہ کا رمضان

اپنے بہتر اقتصادی حالات کی بنا پر میں قاہرہ میں اب اس طرح رہ سکتا تھا جس کا خواب دیکھنا بھی میرے لئے چند ماہ پیشتر مشکل تھا۔ اب مجھے ایک ایک پیسہ کا شمار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ زمانہ گزر چکا تھا جب میں یہاں اپنے پہلے زمانہ قیام میں صرف روٹی' زیتون اور دودھ پر گزارا کرتا تھا' لیکن میں نے ایک لحاظ سے اپنی گذشتہ روایات پر قائم رہنا ہی زیادہ مناسب سمجھا' چنانچہ نئے قاہرہ کے کسی محلہ میں مکان لینے کے بجائے' اپنی ضعیفہ میزبان کے مکان میں ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ ٹریسٹ کی اس بوڑھی عورت نے باہیں پھیلائے ہوئے اور شفقت مادری کے ساتھ میرے رخسار کا بوسہ لیتے ہوئے میرا استقبال کیا۔

میری آمد کے تیسرے روز مغرب کے وقت قلعہ کی جانب سے توپ کا گولہ چھوٹنے کی ایک ہلکی آواز آئی۔ ٹھیک اسی وقت مسجد قلعہ کے دونوں بلند مینارے روشنی میں نہا گئے۔ اس کی تقلید کرتے ہوئے شہر کی سب مساجد کے مینارے بھی روشن ہو گئے۔ ہر مینار پر ایک ہی قسم کی روشنی کا ہالہ سا بن گیا تھا۔ قدیم قاہرہ میں عجیب ہمہ ہمی پیدا ہو گئی تھی۔ لوگوں کے قدم تیز روی کے ساتھ اٹھ رہے تھے اور سڑکوں پر مختلف قسم کی ملی جلی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ آپ بخوبی اس کا احساس بلکہ لمس کر سکتے تھے کہ جوش و مسرت کی ایک نئی لہر ہر جگہ پھیل گئی ہے۔

یہ سب نئے چاند کی وجہ سے تھا جس نے نئے مہینہ کی آمد کا اعلان کیا تھا۔ رمضان کا مہینہ جو اسلامی سال کا سب سے زیادہ مقدس مہینہ ہے۔ وہ اس وقت کی یاد تازہ کرتا ہے جب آج سے تیرہ سو برس قبل پہلے پہل قرآن نازل ہوا تھا۔ ہر مسلمان پر پورے مہینہ کے روزے رکھنا فرض قرار دے دیا گیا اور بیماروں کو مستثنیٰ کر کے ہر مرد و عورت کے لئے کھانا پینا (یہاں تک کہ سگرٹ نوشی بھی) سحر سے لے کر غروب آفتاب تک ممنوع کر دی گئی۔ مسلسل تیس دن کے لئے۔ ان تیسوں دنوں میں لوگ اپنی چمکدار اور تیز نگاہوں کے ساتھ قاہرہ کی سڑکوں پر گھومتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پرواز کر کے کسی مقدس مقام پر پہنچ گئے ہوں۔ تیسوں راتوں میں گولہ دغنے اور گانے اور مسرت و انبساط کی مختلف

Marfat.com

آوازیں آتی رہتی تھیں اور مساجد صبح تک روشن رہتی تھیں۔

یہ مہینہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں' دوہرا مقصد رکھتا ہے'ایک تو یہ کہ آدمی کھانے پینے سے دست کش ہو کر اس حالت کا تجربہ کرے جس میں غریب اور مفلس لوگ رہتے ہیں اور انسانی شعور میں اجتماعی ذمہ داری کا احساس ایک دینی فرض کی حیثیت سے مستحکم ہو' دوسرا مقصد یہ ہے کہ آدمی میں ضبط نفس کی صفت پیدا ہو' جو فرد کے اخلاق کا وہ شعبہ ہے' جس پر تمام اسلامی تعلیمات بہت سختی سے زور دیتی ہیں' مثلاً مسکرات کی (جس کو اسلام ذمہ داری اور شعور و احساس سے فرار قرار دیتا ہے) کلی تحریم۔ غرضیکہ ان دو پہلوؤں انسانی اخوت اور ضبط نفس کو دیکھ کر اسلام کی اخلاقی بلندی اور برتری کے خاص خاص نکات میری سمجھ میں آنا شروع ہو گئے۔

شیخ المراغی

اسلام کی ان حکمتوں اور مقاصد کو اور زیادہ مکمل طریقہ پر سمجھنے کی کوشش میں میں نے ان گفتگوؤں اور تشریحات سے بہت فائدہ اٹھایا جس کا موقع مجھے قاہرہ کے مسلمان دوستوں سے ملا' ان میں سب سے ممتاز شخصیت شیخ مصطفیٰ المراغی کی تھی جو اس وقت بلاشبہ جامع ازہر کے علماء میں سب سے زیادہ مشہور تھے اور دنیائے اسلام کے علماء میں بھی ممتاز حیثیت رکھتے تھے (چند سال کے بعد وہ ازہر کے شیخ بھی ہو گئے تھے)۔ ان کی عمر اس وقت چالیس اور پچاس کے درمیان ہی ہوگی' لیکن ان کے بھرے ہوئے سڈول جسم میں بیس سال کے نوجوان کی سی پھرتی اور زندگی تھی۔ وہ اپنے تبحر علمی' وسعت معلومات اور وقار کے ساتھ ساتھ بہت ہنس مکھ اور خوش مزاج بھی تھے اور مشہور مصری مصلح محمد عبدہ' کی شاگردی اور جمال الدین افغانی جیسے شعلہ جوالہ سے بچپن اور نوجوانی میں قربت کی وجہ سے خود ایک مفکر' ناقد اور صاحب رائے شخص تھے۔

انہوں نے مجھے یہ بتانے میں کبھی تکلف یا سستی سے کام نہیں لیا کہ موجودہ مسلمانوں نے اعلیٰ تعلیمات اور اصولوں کے ساتھ بڑی کوتاہی برتی ہے اور اس سے بڑی کوئی غلطی نہ ہوگی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی قوتوں اور وسیع امکانات کو موجودہ مسلمانوں کی زندگی اور طرز فکر کے پیمانے سے جانچا جائے۔ انہوں نے کہا بالکل اسی طرح جس طرح یہ غلطی ہوگی کہ ہم عیسائیوں کے خلاف محبت اور خلاف رواداری کاموں کو دیکھ کر مسیحؑ کے پیغام محبت کو قصور وار قرار دینے لگیں۔

اس تنبیہ کے ساتھ شیخ المراغی نے ازہر سے میرا تعارف کرایا۔

ہم مسجد کے صحن میں داخل ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ طلبہ لانبی اور سیاہ عباؤں میں سفید عمامے اپنے سروں پر باندھے ہوئے چٹائی پر بیٹھے ہیں اور پست آواز سے کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ لیکچر مسجد کے بڑے دالان میں دیئے جاتے تھے جہاں کئی مدرسین چٹائیوں پر بیٹھے ہوتے' ہر مدرس کے اردگرد پالتی مارے بیٹھے ہوئے طلبہ کا ایک حلقہ ہوتا تھا۔ مدرس بھی بلند آواز سے نہیں پڑھاتا تھا' مجھے یہ احساس ہوا کہ توجہ اور اہتمام بات سمجھنے کے لئے ضروری چیز ہے اور

Marfat.com

یہ استغراق اور محویت حقیقی علم تک ضرور پہنچاتی ہوگی' لیکن شیخ مراغی نے جلد ہی میرے خیالات کو پاش پاش کر دیا۔ انہوں نے کہا۔

آپ ان علماء کو دیکھ رہے ہیں۔ ان کی مثال ہندوستان کی ان گایوں کی سی ہے جن کو لوگ وہاں بہت مقدس سمجھتے ہیں اور جن کے متعلق میں نے سنا ہے کہ سڑک پر جتنے بھی کاغذ اور ردی کے ٹکڑے ان کو نظر آتے ہیں' وہ سب چٹ کر جاتی ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ بھی سب کتابیں چاٹ جاتے ہیں جو صدیوں پہلے لکھی گئی ہیں' لیکن ان کو ہضم نہیں کر سکتے۔ وہ اس سلسلہ میں کچھ غور وفکر بھی نہیں کرنا چاہتے' پڑھتے رہتے ہیں اور دوہراتے رہتے ہیں۔ یہ شاگرد جو ہمہ تن گوش ہو کر ان کے درس میں شریک ہیں' ان کا بھی یہی کام ہے کہ وہ نسلاً بعد نسلٍ پڑھتے اور دوہراتے رہیں۔

عالم اسلام کا علمی جمود اور انحطاط

میں نے ان کی گفتگو ختم ہونے سے پہلے ہی کہا۔ لیکن شیخ مصطفیٰ! از ہر بہر حال اسلامی علوم کا مرکز ہے اور دنیا کی سب سے قدیم یونیورسٹی ہے۔ ثقافت اسلامی کی تاریخ کے تقریباً ہر صفحہ پر اس کا نام ثبت ہے۔ ان مفکرین، علمائے دین' مورخین' فلاسفہ اور ماہرین ریاضیات کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں جن کو از ہر نے دس صدیوں میں پیدا کیا ہے؟

انہوں نے تلخی اور افسوس کے ساتھ جواب دیا کہ اب کئی صدیوں سے ان کا پیدا ہونا بند ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ الفاظ ذرا مبالغہ آمیز ہوں' اس لئے کہ موجودہ دور میں کبھی کبھار کوئی ایک آزاد مفکر پیدا ہوا ہے' لیکن مجموعی طور پر اب از ہر بانجھ پن کا شکار ہے جس کا اثر پورے عالم اسلام پر پڑ رہا ہے۔ اس کی سلگتی ہوئی چنگاری بجھ چکی ہے۔ ان قدیم اسلامی مفکرین نے جن کا ابھی آپ نے ذکر کیا تھا' کبھی بھول کر یہ نہ سوچا ہوگا کہ ان کے افکار وخیالات صدیاں گزر جانے کے بعد بھی (بجائے اس کے کہ نئے افکار سامنے آئیں اور ترقی ونشوونما کا کام جاری رہے) اسی طرح برابر دوہرائے جاتے رہیں گے' جیسے کہ وہ آخری اور طے شدہ حقائق ہوں۔ اگر ہم کو اپنی حالت بدلنا منظور ہے تو پھر ہمیں قدیم افکار وخیالات کی تقلید کے بجائے نئی نظر اور نئے انداز فکر کی ہمت افزائی کرنا ہوگی۔

از ہر پر شیخ المراغی کی اس بے لاگ تنقید نے مجھے اس ثقافتی انحطاط کو سمجھنے میں کسی قدر مدد دی جس کا عالم اسلام کے ہر حصہ میں مشاہدہ کر کے آدمی حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ کیا عالم اسلام کا موجودہ اجتماعی جمود اس قدیم یونیورسٹی کے علمی جمود کا (مختلف درجات میں) عکس تو نہیں ہے؟ کیا قوائے عقلیہ کا شل ہونا اور مسلمانوں کی بیجا اور بے شعور قناعت تو نہیں ہے جس نے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو غیر ضروری فقر اور غربت کو انگیز کرنے اور مختلف قسم کی اجتماعی تکالیف اور امراض کو اندھے بہرے ہو کر برداشت کرتے رہنے پر آمادہ کر رکھا ہے؟

میں نے اپنے دل سے سوال کیا کہ اگر مسلمانوں کے تنزل کے یہ محسوس مناظر اور دلائل وشواہد دیکھ کر یورپ میں اسلام کے بارہ میں اتنی زیادہ غلط فہمیاں پھیل گئی ہیں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ ان غلط فہمیوں اور خیالات

Marfat.com

کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب ان کا یہی دین اسلام ہے جو علاوہ اس کے سخت ہے اور یہودیت کے مقابلہ پر لانے کے قابل نہیں ہے۔ صحرائی مبالغہ آرائیوں‘ خرافات اور کہانیوں اور اندھی تقدیر کے نظریات کا ایک غیر مقدس ملغوبہ ہے جو اپنے پیروؤں کو انسانیت کی ترقی اور خوشحالی کے لئے نئے نئے بلند‘ اجتماعی نظاموں میں شرکت سے باز رکھتا ہے اور بجائے اس کے کہ روح انسانی کو غموض اور ابہام کی بیڑیوں سے آزاد کرے‘ وہ ان بیڑیوں کو اور مضبوطی سے کس دیتا ہے۔ عام طور پر اہل مغرب کا خیال یہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے عقائد اور اسلام کی اجتماعی روایات سے جتنی جلد چھٹکارا ملے گا اور وہ مغربی طرز زندگی کو اختیار کر سکیں گے‘ اتنا ہی ان کے لئے اور ساری انسانیت کے لئے بہتر ہوگا۔

مسلمانوں کا زوال اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کرنے کا نتیجہ

جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے جس پر اب میں پورے طور پر مطمئن ہو چکا تھا‘ وہ یہ تھی کہ ایک یورپین کے دماغ میں اسلام کی جو تصویر ہے‘ وہ بالکل مسخ شدہ اور بگڑی ہوئی ہے۔ قرآن کے صفحات میں میں نے جو دیکھا تھا اس کو کوئی عالمی مادی غیر پختہ نظریہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ یہاں معبود کا ایک ٹھوس تصور تھا جو مظاہر فطرت کے عاقلانہ طور پر قبول کرنے کے حق میں ہے۔ یہاں حسی محرکات اور عقل روحانی تقاضوں اور اجتماعی تقاضوں کے درمیان ایک خوشگوار ہم آہنگی ملتی ہے۔ یہ بات میرے سامنے کھل کر آ گئی تھی کہ مسلمانوں کا زوال اسلام میں کسی قسم کے نقص کی وجہ سے نہیں‘ بلکہ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا نہ ہونے کی وجہ سے ہوا۔

درحقیقت وہ اسلام ہی تھا جس نے اولین مسلمانوں کو تہذیب و تمدن کی بلند سے بلند تر چوٹی پر پہنچا دیا تھا۔ اس نے ان کی ساری صلاحیتوں کو خدا کی مخلوق اور کائنات کو سمجھنے کی شعوری فکر اور اس کے ساتھ ہی اس کے ارادہ اور مشیت کو سمجھنے پر لگا دیا تھا۔ اسلام کبھی ان سے اس بات کا طالب نہیں ہوا کہ وہ مشکل اور نا قابل فہم عقائد کو قبول کریں اور نہ کسی ایسے غیر عقلی ادعا (Dogma) کا اس کے پیغام و دعوت میں کوئی وجود ہی ہے۔ اسی طرح علم و تحقیق جو مسلمانوں کی تاریخ کی خصوصیت تھی‘ ایمان کے خلاف نہیں تھی بلکہ ایمان کے لئے مددگار اور معاون ثابت ہوئی تھی۔

اسلام کی علم و تحقیق کی سرپرستی اور حقائق نوازی

نبی عربیؐ کے اس اعلان سے کہ ”علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے“ ان کے پیرو یہ سمجھنے پر مجبور ہوئے کہ اکتساب علم خدا کی مکمل عبادت ہے۔ پھر جب انہوں نے نبیؐ کے اس قول پر غور کیا کہ ”اللہ تعالیٰ نے کوئی مرض ایسا پیدا نہیں کیا جس کی دوا بھی نہ پیدا کی ہو“ تو انہیں اس کا احساس ہوا کہ نامعلوم ادویہ کی دریافت اور تحقیق بھی اس دنیا میں خدا کی مشیت اور ارادہ کی تکمیل ہے۔ اس بنیاد پر طبی ریسرچ کو ایک دینی فرض ہونے کی حیثیت سے ایک قسم کا تقدس حاصل ہو گیا۔

مسلمانوں نے قرآن کی اس آیت کو پڑھا ”وجعلنا من المآءِ کل شیءٍ حی“ (ہم نے پانی سے ہر

Marfat.com

چیز کو زندہ رکھا ہے) اور اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے انہوں نے کائنات حیوانی اور اس کے قوانین نمود ارتقا کا مطالعہ شروع کیا اور اس طرح بیالوجی کی بنیاد پڑی۔ قرآن نے ستاروں کی ہم آہنگی اور انتظام اور ان کی حرکات کی طرف اس کے خالق کی عظمت ثابت کرنے کے لئے اشارات کئے۔ چنانچہ مسلمانوں نے فلکیات وریاضیات کے مطالعہ وتحقیق میں اسی گرمجوشی وسرگرمی کا مظاہرہ کیا جو گرمجوشی وسرگرمی دوسرے مذاہب میں صرف نماز وعبادت میں نظر آتی ہے۔

کوپرنیکی نظریہ جس نے زمین کی مُحوریّت اور سورج کے گرد سیاروں کی گردش ثابت کی تھی وہ یورپ میں سولہویں صدی کی ابتدا میں رواج پایا تھا اور پادریوں نے کتاب مقدس کی تعلیمات کے خلاف سمجھتے ہوئے بڑی ناراضگی کے ساتھ اس کا استقبال کیا تھا' لیکن اس نظریہ کی بنیادیں اس واقعہ سے چھ سو برس پہلے اسلامی ممالک میں رکھی جا چکی تھیں۔ نویں اور دسویں صدی کے مسلمان ماہر فلکیات اس نتیجہ پر پہنچ گئے تھے کہ زمین گول ہے اور اپنے محور پر گردش کر رہی ہے۔ طول وعرض کی پیمائش کے لئے انہوں نے بڑے باریک حساب لگائے تھے۔ ان میں بہت سے لوگ (بغیر اس کے کہ ان کی تکفیر کی جائے) اس نظریہ کے حامی تھے کہ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ اسی طرح کیمیا' عضویات (فزیالوجی) اور دوسرے بہت سے علوم میں اسلامی عبقریت (Genius) اور ذہن بلند نے لافانی آثار چھوڑے ہیں اور یہ سب باتیں نبیؐ کے ان اقوال کا نتیجہ تھیں کہ ''علماء انبیاء کے وارث ہیں'' اور ''جو اللہ کے راستہ میں طلب علم کی خاطر نکلے گا' اللہ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کر دے گا'' اور ''عابد پر عالم کو ایسی فضیلت ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی تمام ستاروں پر'' اور ایک روایت میں ہے ''جیسے میری فضیلت تمہارے ایک ادنیٰ آدمی پر ہے۔''

تاریخ اسلامی کے پورے دور میں (یعنی نبیؐ کے بعد سے پانچ صدیوں تک) اسلامی تہذیب سے زیادہ علم اور تعلیم کا محافظ اور اس سرزمین سے زیادہ جہاں ــــــ اسلام کا کلمہ بلند تھا ــــــ پُرامن جگہ روئے زمین پر کوئی اور نہ تھی۔

قرونِ وسطیٰ میں عالم اسلام کی تہذیب

پوری اجتماعی زندگی اسلام کی ان تعلیمات سے متاثر تھی' اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اس زمانہ میں جب مسیحی یورپ میں وباؤں کو خدا کا انتقام سمجھا جاتا تھا' جس کے سامنے انسان کو پورے صبر وسکون کے ساتھ سر جھکا دینا چاہیے' اسی زمانہ میں بلکہ اس سے بھی بہت پہلے مسلمان نبیؐ کی اس وصیت پر کاربند تھے جس میں ان کو متاثرہ علاقوں کو دوسرے علاقوں سے منقطع کر کے ان وباؤں کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور اس زمانہ میں جب مسیحی بادشاہوں' سرداروں اور شرفاء کے نزدیک غسل ایک بہت قابل ملامت اور قابل مذمت فعل تھا' اس وقت ہر مسلمان کے گھر میں کم از کم ایک حمام ضرور موجود تھا۔

پبلک غسل خانے ہر اسلامی شہر میں بالعموم ہوتے تھے (مثلاً نویں صدی میں صرف قرطبہ میں تین سو غسل خانے تھے) یہ سب نبیؐ کے اس حکم کی تعمیل میں تھا کہ ''نظافت ایمان کا جز ہے۔'' جب مسلمان مادی زندگی کے حسن سے

Marfat.com

لطف اندوز ہوتا تھا تو وہ اس کو اپنے روحانی تقاضوں اور مطالبات سے متصادم نہیں سمجھتا تھا' اس لئے کہ نبیؐ نے فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ اپنے بندہ پر اپنی نعمت کے آثار دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔"

الغرض اسلام نے ثقافتی سرگرمیوں کی جتنی ہمت افزائی کی ہے' وہ تاریخ انسانی کے روشن ترین صفحات ہیں۔ جس دین نے عقل کے لئے "ہاں" کہا ہو' غموض اور جہالت کے لئے "نہیں" کہا ہو' عمل کے لئے "ہاں" کہا ہو' جمود کے لئے "نہیں" کہا ہو' زندگی کے لئے "ہاں" کہا ہو' نفس کشی کے لئے "نہیں" کہا ہو' اس کے لئے یہ کوئی چیز باعث تعجب نہیں کہ وہ جزیرہ عرب کی سرحدوں کو پار کرتے ہی نئے نئے پیرووں سے آشنا ہونے لگا اور جوق در جوق لوگ اس میں آ کر شامل ہونے لگے۔ شام' شمالی افریقہ اور اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد اسپین کے لوگ دفعتاً ایک ایسے دین کے روبرو تھے جو "پہلے گناہ" کا منکر تھا اور اس ارضی دنیاوی زندگی کے فطری پہلو کا پُر جوش حامی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بہت بڑی تعداد میں اس دین میں داخل ہونے لگے' جس نے انسان کو اس زمین پر خدا کا خلیفہ ہونے کا شرف بخشا تھا۔ یہ تھی اسلام کی ان حیرت انگیز فتوحات کی تفسیر جو اس کو اپنی عظیم تاریخ کے آغاز میں حاصل ہوئی۔

مسلمانوں کی وجہ سے اسلام ایک عظیم طاقت نہیں بنا' بلکہ اس نے خود مسلمانوں کو عزت اور سرفرازی عطا کی' مگر جب مسلمانوں کا ایمان عادت بن گیا اور ایک نظام اور طریقہ زندگی کی حیثیت سے باقی نہیں رہا جس کی پیروی احساس وشعور کے ساتھ کی جاتی ہو' تو ان کی یہ ابھارنے والی خلاق طاقت کی شمع جو ان کی تہذیب وتمدن کو فروزاں کئے ہوئے تھی' بجھ گئی اور سستی' مایوسی' جمود اور ثقافتی انحطاط کے لئے راستہ کھل گیا۔

اس نئے شعور اور عربی زبان میں ترقی کی وجہ سے (یہ واضح رہے کہ میں نے ایک ازہری طالب علم سے یہ معاملہ کر لیا تھا کہ وہ روزانہ مجھے عربی پڑھا دیا کرے) میں نے محسوس کیا کہ مجھے ایک ایسی چیز حاصل ہو گئی ہے جس کو میں اسلامی فکر کی کلید سے تعبیر کر سکتا ہوں۔ میرا یہ یقین اب کمزور پڑ گیا تھا کہ یورپ اسلام کی مکمل تصویر اخذ نہیں کر سکتا' جیسا کہ چند ماہ پیشتر میں نے اپنی کتاب میں اس خیال کا اظہار کیا تھا۔ عالم اسلام یورپ میں اس حد تک خلط ملط نہیں ہوا تھا کہ اس کو سمجھنا ہی دشوار ہو۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنے ماضی کی فکری عادات سے کسی قدر علیحدہ ہو سکے اور یہ سمجھ سکے کہ صرف اسی کا طرز فکر درست نہیں ہے تو اس وقت عالم اسلام اس کے لئے قابل فہم ہو سکتا ہے۔

کیا ایک منظم دین ضروری ہے؟

اگرچہ میں نے اسلام میں بہت ایسی چیزیں پائی تھیں جنہوں نے میری عقل وفکر کو بہت اپیل کیا تھا' لیکن پھر بھی مجھے یہ بات ایک عاقل اور ذہین آدمی کے معیار سے فروتر نظر آئی کہ وہ زندگی کے متعلق اپنے سارے افکار و نظریات محض ایک ایسے نظام کی پیروی کی خاطر یک لخت منسوخ کر دے' جس کو خود اس نے مرتب بھی نہیں کیا۔ میں نے اپنے فاضل دوست شیخ المراغی سے ایک موقع پر پوچھا۔

—— یہ بتایئے شیخ مصطفیٰ! کہ یہ کیا ضروری ہے کہ آدمی اپنے کو ایک ہی طرز کی تعلیمات اور مخصوص قسم کی

Marfat.com

ہدایت کا پابند بنا لے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ وہ ہر اخلاقی الہام کو اپنے وجدان یا باطن کی آواز پر چھوڑ دے؟

انہوں نے کہا:

''غالباً آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کسی با قاعدہ منظم دین کی ضرورت کیا ہے اور اس کا جواب بہت آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت ہی کم اشخاص (بلکہ انبیاء علیہم السلام) اس اندرونی آواز یا پکار کو صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ تقریباً سب ہی آدمی اپنے خاص شخصی رجحانات اور مصالح کے پابند ہیں۔ اگر ہر شخص کو یہ چھوٹ دے دی جاتی ہے کہ وہ اپنے وجدان اور ذوق کی بنیاد پر جس چیز کا چاہے اتباع کرے تو اس کا نتیجہ مکمل اخلاقی انتشار اور تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا اور لوگ کبھی بھی کسی ایک طرز معاشرت اور طریقہ زندگی پر متفق نہ ہوسکیں گے۔ اس موقع پر قدرتی طور پر آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ کیا اس قاعدہ سے کچھ لوگ مستثنیٰ نہیں ہیں۔ میرا اشارہ ان آزاد خیال لوگوں کی طرف ہے جن کا دعویٰ ہے کہ حق و باطل کی تمیز کے لئے انہیں کسی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے' لیکن میں ذاتی طور پر آپ سے پوچھتا ہوں کہ اس کی کیا ضمانت ہوسکتی ہے کہ اس اصول کے مطابق لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد اپنے لئے اس حق استثنائی کا مطالبہ نہ کرنے لگے گی؟

ایک انقلاب انگیز انکشاف واحساس

میں ہرات سے کابل جا رہا تھا۔ یہ ۱۹۲۵ء کے اواخر کی بات ہے۔ ایک نوکر اور ایک افغانی فوجی میرے ہمراہ تھا۔ وسط افغانستان کے برف پوش پہاڑوں کی وادیوں میں ہم لوگ رواں دواں تھے۔ موسم بہت سرد تھا اور برف چمک رہی تھی۔ اونچے اونچے پہاڑ ہر طرف نظر آ رہے تھے۔

میں اس روز رنجیدہ بھی تھا اور مسرور بھی۔ رنج اس بات کا تھا کہ میرے اور ان لوگوں کے درمیان جن میں مَیں نے کئی مہینے گزارے تھے اور اس روشنی' طاقت اور قوت نمو کے درمیان جو ان کا دین ان کو بہم پہنچاتا تھا' دبیز پردے حائل ہوتے جا رہے ہیں۔ مسرت اس بات کی تھی کہ اس دین کی روشنی' طاقت اور قوت نمو ان سر بفلک پہاڑوں کے نزدیک میرے قریب ہوتی جا رہی ہے' اتنی قریب کہ میری انگلیاں اس کو لمس کر سکتی ہیں۔

میرا گھوڑا لنگڑانے لگا اور اس کے کھروں کے رگڑنے کی آواز میرے کانوں میں پڑی' اس کی نعل ڈھیلی ہوگئی تھی اور صرف دو کیلوں کے سہارے لٹک رہی تھی۔ میں نے اپنے افغانی رفیق سے پوچھا کہ کیا یہاں قریب میں کوئی ایسا گاؤں ہے جہاں موچی یا لوہار مل سکتا ہو۔ اس نے کہا ہاں ایک گاؤں ''دہ زنگی'' ہے جو یہاں سے تین میل سے کم ہی فاصلہ پر ہوگا۔ وہاں موچی مل جائے گا۔ وہیں علاقہ ہزار جات کا حاکم بھی رہتا ہے۔ گھوڑے کی تھکن کے خیال سے اب ہم لوگ رفتار دھیمی کر کے ''دہ زنگی'' کی طرف بڑھ رہے تھے۔

وہاں کا حاکم ایک متوسط قد کا نوجوان آدمی تھا جس کے چہرے پر مسرت اور فارغ البالی کے آثار نمایاں تھے وہ ایک اجنبی مسافر کو دیکھ کر خوش ہوا جو اس معمولی قلعہ میں اس کی تنہائی ختم کر سکے۔ اگر چہ وہ شاہ امان اللہ کے کوئی

Marfat.com

قریبی رشتہ دار تھے' لیکن افغانستان میں جتنے آدمیوں سے میں ملا' میں نے ان کو سب سے زیادہ ملنسار اور متواضع پایا۔ انہوں نے زبردستی مجھے دو دن قیام پر مجبور کیا۔

دوسرے دن شام کو حسب معمول ایک شاندار ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد گاؤں کے ایک آدمی نے ہم لوگوں کو تین تاروں والے ستار پر کچھ گیت سنائے۔ وہ پشتو میں گا رہا تھا جس سے میں ناواقف تھا' لیکن بعض فارسی الفاظ کی آواز طاقت کے ساتھ گرم کمرے کے کنارے تک (جو قالینوں سے سجا ہوا تھا اور جس کی کھڑکیوں کے اندر برف کی ٹھنڈی چمک گھس رہی تھی) پہنچ رہی تھی۔

غالباً یہ گیت داؤد و جالوت کے معرکہ کے متعلق تھے ___ مادی قوت اور ایمانی قوت کا معرکہ ___ اگرچہ میں اس کو سمجھ نہیں سکا' لیکن اس کا خلاصہ میں نے اخذ کر لیا تھا۔ وہ سکون اور ٹھہراؤ کے ساتھ شروع ہوتا تھا' پھر آگے بڑھ کر انفعال اور الم کی کیفیت اختیار کر لیتا تھا اور فتح و نصرت کی صداؤں پر ختم ہو جاتا تھا۔

جب گانے ختم ہوئے تو حاکم نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ داؤد کمزور تھے' لیکن ان کا ایمان طاقتور تھا۔

میں اس جملہ میں اضافہ کئے بغیر نہ رہ سکا کہ آپ لوگ بہت ہیں' لیکن آپ کا ایمان کمزور ہے۔

میرا میزبان مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ میں بھی گھبرایا کہ غیر ارادی طور پر یہ بات میرے منہ سے نکل گئی۔ پھر میں نے اس کی تاویل یا تشریح میں سوالات کی بوچھاڑ کر دی ___ آپ مسلمانوں نے وہ خود اعتمادی کیونکر کھو دی جس کی وجہ سے ماضی میں آپ نے سو سال سے کم مدت میں جزیرہ عرب سے لے کر بحر اوقیانوس تک اور مشرق میں چین کے کناروں تک اپنے دین کو پھیلا دیا' لیکن آج مغرب کے سامنے آپ اتنی کمزوری اور آسانی کے ساتھ ہتھیار ڈال رہے ہیں۔ کیا یہ آپ نہیں کر سکتے (جبکہ آپ کے آباؤ اجداد نے دنیا کو اس وقت علم و فن سے روشن کر دیا تھا جب کہ یورپ جہل و بربریت میں غرق تھا) کہ ہمت سے کام لے کر پھر اس روشن اور ترقی پذیر دین کی طرف واپس لوٹ جائیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اتاترک جس کی نظر میں اسلام کی کوئی وقعت نہیں' آپ مسلمانوں کی نگاہ میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کا ہیرو بن گیا ہے۔

میرا میزبان خاموشی کے ساتھ یہ سب سنتا رہا۔ باہر برابر برف گر رہی تھی۔ میرے اندر ایک بار پھر رنج و مسرت کا ایک ملا جلا احساس بیدار ہو گیا جو میں نے وہ زنگی کے قریب محسوس کیا تھا۔ مجھے اس عزت و شوکت کا احساس ہوا جو اب قصہ پارینہ بن چکی ہے اور اس ذلت و پستی کا منظر نگاہوں کے سامنے پھر گیا جس نے اس عظیم تہذیب کے فرزندوں کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔

میں نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

مجھے یہ بتایئے کہ آپ کے نبی کا یہ دین جس کی ہر چیز بہت سادہ اور بہت واضح ہے' کیونکر آپ کی بے جان فلسفیانہ موشگافیوں اور خیال آرائیوں کی نذر ہو کر رہ گیا ہے۔ آپ کے امراء اور جاگیردار کس طرح داد عیش دیتے ہیں جبکہ ان کے بہت سے مسلمان بھائی فقر و گندگی کے اس درجہ پر ہیں جس کا بیان کرنا بھی مشکل ہے' حالانکہ آپ ہی کے

Marfat.com

نبیؐ نے آپ کو یہ وصیت کی تھی کہ (تم میں سے کسی کا ایمان پورا نہیں ہوگا' اگر وہ سیر ہو کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو) کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ نے عورتوں کو زندگی اور سوسائٹی کے بالکل پس پشت کیوں ڈال دیا ہے' جبکہ خود نبیؐ کے زمانہ میں صحابیات نے مردوں کی زندگی میں ایک پارٹ ادا کیا تھا۔آپ کی اکثریت جاہل کیوں ہے جب کہ آپ ہی کے نبی کا یہ اعلان ہے کہ (طلب علم ہر مسلمان پر فرض ہے)اور انہوں نے کہا ہے کہ (عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی چودھویں رات کے چاند کی تمام ستاروں پر)۔

میرا میزبان ایک لفظ زبان سے نکالے بغیر ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ میرے جوش نے اس کو غضبناک کر دیا ہو اور اذیت پہنچائی ہو۔سارنگی والا بھی مجھے بڑی حیرت کے ساتھ دیکھ رہا تھا' وہ فارسی اتنی نہیں جانتا تھا کہ میری بات سمجھ سکتا' لیکن اسے حیرت تھی کہ ایک اجنبی' حاکم کے سامنے تیز کلامی اور جوش کے ساتھ کیسے گفتگو کر رہا ہے۔آخر میں حاکم نے اپنی زرد رنگ کی عبا اچھی طرح سمیٹی جیسے ان کو سردی کا احساس ہوا اور سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہنے لگے۔

لیکن آپ مسلمان ہیں؟

میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

بالکل نہیں' میں قطعاً مسلمان نہیں ہوں' لیکن میں نے اسلام میں حسن ولطافت کا ایک بڑا حصہ پایا ہے۔ اور اسی لئے میں جب آپ حضرات کو اس کی ناقدری کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو کبھی کبھی مجھے غصہ سا آنے لگتا ہے۔ اگر اس وقت مجھ سے کچھ تلخ کلامی ہوگئی ہے تو معاف کیجئے۔ یہ سب میں نے کسی دشمنی کے جذبہ میں نہیں کہا تھا۔

میرے میزبان نے سر ہلاتے ہوئے کہا' نہیں نہیں' بات وہی ہے جو میں نے کہی تھی' آپ مسلمان ہیں' لیکن خود آپ کو اس کی خبر نہیں۔آپ اسی وقت اور اسی جگہ **لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کہہ کر باقاعدہ مسلمان کیوں نہیں ہوجاتے' جبکہ اپنے دل کی گہرائیوں سے آپ مسلمان ہو چکے ہیں۔میرے بھائی اسی وقت کلمہ پڑھیئے' میں کل آپ کے ساتھ کابل چلوں گا اور امیر سے ملاؤں گا جو بہت گرمجوشی کے ساتھ آپ کا استقبال کریں گے۔ مکانات' باغات' مویشی سب آپ کو دیں گے' ہم سب آپ سے محبت کریں گے' آپ کلمہ تو پڑھ لیجئے میرے بھائی!

اگر میں مسلمان ہوں گا تو اپنے ضمیر کے اطمینان کی وجہ سے' امیر کے مکانات و باغات کے لالچ میں نہیں۔

وہ اصرار کرتے ہوئے بولے۔آپ تو اسلام کو ہم سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔کونسی چیز ابھی آپ کی سمجھ میں نہیں آئی؟

_____ مسئلہ صرف سمجھنے کا نہیں' بلکہ اطمینان کا ہے' اس بات کا اطمینان کہ قرآن واقعی خدا کا کلام ہے ..... کسی عبقری انسان کی کاوش نہیں۔میں نے جواباً کہہ تو دیا' لیکن میرے افغانی دوست کے الفاظ کئی ماہ تک میرے کانوں میں گونجتے رہے" آپ مسلمان ہیں لیکن خود آپ کو اس کی خبر نہیں۔"

کابل کے کئی ہفتہ کے سفر کے بعد جنوبی افغانستان سے گزرتا ہوا غزنی کے قدیم شہر سے گزر اجہاں سے محمود

Marfat.com

غزنوی نے آج سے تقریباً ہزار برس پہلے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ پھر قندھار اور افغانستان کے جنوب مغربی صحراؤں سے ہوتا ہوا ہرات واپس آ گیا' جہاں سے میں نے یہ سفر شروع کیا تھا۔

۱۹۲۶ء کے موسم سرما کے اختتام پر میں نے ہرات کو خیر باد کہا اور اپنے وطن کے ایک طویل...... سفر کے پہلے مرحلہ کا آغاز کر دیا۔ مجھے افغانستان کی سرحد سے روسی ترکستان کے علاقہ مرو تک جانا تھا' پھر سمرقند' بخارا' تاشقند' پھر ترکمان کے وسیع میدان کو عبور کرتے ہوئے یورال تک اور وہاں سے ماسکو۔

سوویٹ روس کی ایک جھلک

سوویٹ روس کے بارہ میں میرا سب سے پہلا اور دیرپا تاثر وہ ہے جو مرو کے ریلوے اسٹیشن پر میرے ذہن میں مرتسم ہوا۔ یہ ایک بہت بڑا پوسٹر تھا جس میں مزدوروں کے یونیفارم میں ملبوس ایک نوجوان کی تصویر تھی' جو ایک سفید ریش اور عبا قبا میں ملبوس شخص کو (جس کو ابر آلود آسمان سے نکلتے دکھایا گیا تھا) ٹھوکریں مار رہا تھا۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا ''سوویت یونین کے مزدوروں نے اسی طرح خدا کو اس کی بلندی سے اتار پھینکا ہے۔'' یہ اشتہار سوویٹ یونین کی اشتراکی جمہوریتوں کی لادینی انجمن کی طرف سے لگایا گیا ہے۔

اس طرح کے اشتہارات' اعلانات (جو حکومت کی اجازت کے بعد ہی چھپ سکتے تھے) ہر جگہ نظر آتے تھے۔ پبلک مقامات پر' سڑکوں پر' حتیٰ کہ بسا اوقات عبادت گاہوں سے متصل چسپاں رہتے تھے۔ ترکستان میں مسجدیں زیادہ تھیں اور انہیں کے ساتھ یہ بے حرمتی ہوتی تھی۔ نماز اگرچہ باقاعدہ ممنوع نہیں تھی' لیکن لوگوں کو نماز سے باز رکھنے کے لیے ہر ممکن تدبیر عمل میں لائی جا رہی تھی۔ بخارا اور تاشقند میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ پولیس کے سی' آئی' ڈی مسجد میں ایسے ویسے ہر شخص کا نام بلیک لسٹ میں لکھتے تھے۔

ایک علمی اعزاز

مجھے مسرت ہوئی جب کئی ہفتے ایشیائی اور یورپی روس کا دورہ کرنے کے بعد میں نے پولینڈ کی سرحد کو پار کر لیا۔ سیدھا میں فرانکفورٹ پہنچا' جہاں مجھے اخبار کے اپنے سیکشن کا چارج لینا تھا۔ مجھے جلد ہی محسوس ہو گیا کہ میری غیر حاضری میں میرا نام یہاں خاصا مشہور ہو چکا ہے اور میرا شمار یورپ کے اخبارات کے ممتاز ترین غیر ملکی نامہ نگاروں میں ہونے لگا ہے۔ میرے بعض مضامین نے مشاہیر مستشرقین کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا تھا۔

برلین کی جغرافیائی سیاسی اکیڈمی نے لیکچرز کے ایک سلسلہ کے لئے مجھے دعوت دی' جہاں مجھے بتایا گیا کہ اس عمر میں (میری عمر اس وقت چھبیس سال کی تھی) کسی کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے اخبارات نے ''فرانکفورٹر'' سے ان مضامین کو جو زیادہ عمومی موضوعات پر ہوتے تھے' شائع کرنے کی اجازت لے رکھی تھی۔ مجھے لوگوں نے بتایا کہ بعض مقالات تیس تیس بار شائع کئے گئے ہیں۔ غرض کہ اس سفر کے نتائج بہت اچھے نکلے۔

Marfat.com

میری شادی

اس زمانہ میں "ایلسا" (Elsa) سے میری شادی ہوگئی۔ان دو سالوں نے جو میں نے یورپ کے دورہ میں گزارے تھے' میری محبت کو کم کرنے کی بجائے آتش شوق کو اور تیز کر دیا تھا۔مسرت کے ایک عجیب وغریب احساس کے ساتھ جس سے میں پہلے آشنا نہیں تھا' ہم دونوں کی عمر کے فرق کے سلسلہ میں اس کے سارے اوہام وشکوک یک لخت زائل ہوگئے۔

کہنے لگی۔آپ مجھ سے شادی کیسے کریں گے۔آپ اس وقت چھبیس سال کے ہیں' میں چالیس سال کی ہوں گی۔جب آپ چالیس سال کے ہوں گے تو میں بوڑھی ہو چکی ہوں گی۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔اس میں کیا بات ہے' میں تمہارے بغیر اپنے مستقبل کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

آخر کار وہ راضی ہوگئی۔

حقیقت یہ ہے کہ میں نے کسی مبالغہ سے کام لیا تھا' اس لئے کہ اس کے حسن وجمال اور فطری لطافت نے مجھے اس درجہ مسحور کر رکھا تھا کہ مجھے کسی عورت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔پھر میرے ذوق اور رجحانات سے اس کی حساس واقفیت نے میری آرزوؤں کو جگا دیا تھا اور اس کو مزید تقویت پہنچائی تھی۔

جب میں اسلام کے متعلق ایلسا سے گفتگو کرتا تو وہ سمجھتی تھی کہ میں کسی چیز کی تلاش میں ہوں' اگرچہ بعض اوقات اس کو اس شدید تقاضا اور جذبہ کا اندازہ نہیں ہو پایا تھا جو میرے اندر موجزن تھا' لیکن میری محبت کی وجہ سے اس جستجو وتلاش میں وہ میری رفیق ودمساز تھی۔

ہم دونوں اکثر ساتھ بیٹھ کر قرآن کا ترجمہ پڑھتے اور اس کی تعلیمات پر بحث کرتے۔میری طرح ایلسا بھی کچھ عرصہ بعد اس باطنی یکسانی اور ہم آہنگی سے متاثر ہو چکی تھی جو قرآن کی اخلاقی تعلیمات اور عملی ہدایات کے درمیان پائی جاتی ہے..... خدا انسان سے اندھی اطاعت کا طالب نہیں ہے' بلکہ اس نے اس کی عقل کو مخاطب کیا ہے..... وہ انسان کے انجام اور مستقبل سے بے تعلق ہو کر دور کھڑا نہیں رہتا' بلکہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔اس نے ایمان اور اجتماعی زندگی کے درمیاں کوئی حد فاصل نہیں قائم کی ہے۔

"فرانکفورٹر" سے علیحدگی

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسلام کا مسئلہ میری زندگی کے اس دور میں یعنی ۱۹۲۶ء کے نصف آخر میں واحد مسئلہ تھا جو میرے دل ودماغ پر قابض تھا۔اب میرا استغراق بہت بڑھ گیا تھا اور ان مراحل سے آگے نکل چکا تھا' جب اس سے میرا تعلق کسی اجنبی کلچر اور آئڈیالوجی سے نظری اور عقلی دلچسپی تک محدود تھا' اگرچہ اس وقت بھی وہ کلچر اور آئیڈیالوجی میرے لئے دلفریب اور پُرکشش تھی۔بہرحال اب یہ مسئلہ حقیقت کی ایک پرجوش جذباتی تلاش کر چکا تھا'

Marfat.com

یہاں تک کہ وہ ایڈونچر بھی جو گذشتہ دوسالوں میں میرے سفر وسیاحت کے درمیان پیش آئے تھے' اس تلاش وجستجو کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ یہ بات اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ میرے لئے اس کتاب پر توجہ مرکوز کرنا اور اس کو ترتیب دینا (جس کی توقع بجا طور پر ''فرانکفورٹر'' کے چیف ایڈیٹر کو تھی) بہت مشکل اور بار ہو گیا۔

ابتدا میں تو ڈاکٹر سائمن نے میری سستی اور تردد کو دیکھتے ہوئے کچھ چشم پوشی سے کام لیا' اس لئے کہ میں ایک طویل سفر سے واپس ہوا تھا اور مجھے ایک چھٹی کا استحقاق بھی تھا۔ اس کے علاوہ میری شادی کی وجہ سے بھی جو خاصی تاخیر سے ہوئی تھی' کسی قدر مجھے اپنے روٹین سے نجات پانے اور آرام کرنے کا جواز مل گیا تھا' لیکن جب اس چھٹی اور آرام کا وقفہ ڈاکٹر سائمن کے نزدیک معقول حد سے بڑھنے لگا تو انہوں نے یہ تجویز رکھی کہ مجھے (خواب وخیال کی دنیا سے) اب زمین پر اتر آنا چاہئے۔

جب میں ماضی کو یاد کرتا ہوں تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سائمن کتنے سمجھدار اور معاملہ فہم آدمی تھے' لیکن اس وقت کچھ ایسی بات معلوم نہ ہوتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ کتاب کے سلسلہ میں ان کے اصرار کا اثر مجھ پر الٹا پڑ رہا تھا۔ مجھے اس بات سے دلچسپی تھی جو مجھے ابھی حاصل کرنا تھا' بہ نسبت اس کے جو اس وقت تک میں پا چکا تھا۔

آخر کار ڈاکٹر سائمن نے ایک روز ناگواری کے ساتھ یہ کہہ ہی دیا کہ ''مجھے توقع نہیں کہ یہ کتاب آپ کبھی لکھ بھی سکیں گے!''

ان کے اس ریمارک پر مجھے کچھ چوٹ سی لگی اور میں نے جواب دیا کہ مجھے اس کتاب کی تالیف سے کوئی دلچسپی نہیں اور شاید میں.....

انہوں نے درشتی کے ساتھ کہا۔ اچھی بات ہے' اگر آپ کا یہی خیال ہے تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ''فرانکفورٹر'' اب بھی آپ کی صحیح جگہ ہے؟

غرض کہ بات سے بات نکلتی گئی اور ہمارا اختلاف اچھے خاصے جھگڑے میں تبدیل ہو گیا۔ اسی روز میں نے ''فرانکفورٹر'' سے استعفا دے دیا اور ایک ہفتہ کے بعد اپنی بیوی کو ساتھ لے کر برلین روانہ ہو گیا۔

قدرتی طور پر میں صحافت کو خیر باد کہنا نہیں چاہتا تھا کہ اس خوشحالی اور آسائش (جس کو وقتی طور پر کتاب نے غارت کر دیا تھا) کے علاوہ جو مجھے اس سے حاصل ہوئی تھی' وہ میرے عالم اسلام کے دوبارہ سفر کا واحد ذریعہ تھا' جہاں میں ہر قیمت پر واپس جانا چاہتا تھا۔ اس شہرت کی وجہ سے جو گذشتہ چار سالوں میں مجھے حاصل ہوئی تھی' مجھے نئے صحافتی تعلقات پیدا کرنے میں کچھ دشواری نہ ہوئی۔ ''فرانکفورٹر'' سے قطع تعلق کے بعد جلد ہی تین دوسرے اخبارات کے ساتھ میرا معاملہ ہو گیا جو تسیورچ (Zürich)، امسٹرڈیم اور کولون (Cologne) کے تھے۔ بہت زمانہ تک مشرق وسطیٰ سے متعلق میرے مضامین ان تینوں اخبارات کے لئے وقف رہے' جو یورپ کے اہم اخبارات میں شمار ہوتے تھے' مگر ''فرانکفورٹر'' سے ان کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔

Marfat.com

اسلام سے روز افزوں دلچسپی اور مغربی سوسائٹی

برلین میں مَیں اور میری بیوی عارضی طور پر مقیم رہے' جہاں میرا ارادہ تھا کہ سیاسی جغرافیائی اکیڈمی کے لیکچرز پورے کرلوں اور ساتھ ہی اسلامیات کا مطالعہ جاری رکھوں۔

میرے پرانے دوست اور رفیق دوبارہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے' مگر ہمارے لئے گذشتہ تعلقات کو اسی آن بان سے باقی رکھنا آسان نہ تھا۔ جس حال پر ہم نے مشرق وسطیٰ کے سفر کے وقت اسے چھوڑا تھا' حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے بہت دور ہو چکے تھے۔ ہماری عقلیت کی زبان بھی مختلف تھی۔ خاص طور پر میں اپنے کو اس بارہ میں قاصر پاتا تھا کہ اپنے دوستوں کو اسلام کے ساتھ اپنی فریفتگی اور مشغولیت کی وجہ سمجھا سکوں۔

جب میں اسلام کی عقلی اور اجتماعی شرح ان کے سامنے کرنے کی کوشش کرتا تو وہ حیرت سے سر ہلاتے۔ اگر چہ بعض اوقات وہ بعض اسلامی خیالات کی تائید بھی کرنے لگتے تھے' لیکن بیشتر لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ادیان قدیمہ زمانہ قدیم کے ساتھ مخصوص تھے۔ ہمارے زمانہ کو ایک نئے انسانی نظریہ کی ضرورت ہے' لیکن وہ لوگ بھی جو ایک باقاعدہ دین کی ہر صلاحیت کے منکر نہیں تھے' وہ بھی اس مغربی خیال سے متاثر تھے کہ اسلام کو (باوجود دنیاوی امور کی طرف توجہ کرنے کے) بہر حال ان چیستانوں اور پہیلیوں کے ناقابل فہم عقائد و مسائل کی ضرورت ہے جو ان کی نظر میں ایک دین میں ضرور پائی جانی چاہئیں اور جن کے بغیر کوئی دین' دین نہیں۔

مجھے سخت حیرت تھی کہ جس شعبہ نے شروع ہی سے مجھے اسلام سے متاثر کیا یعنی روح اور مادہ کی عدم تقسیم اور عقل کی افادیت اور ضرورت پر زور اس حیثیت سے کہ وہ ایمان کا ایک ذریعہ ہے' وہ مفکرین کی ایک بہت محدود تعداد کو متاثر کر سکا۔ وہ مفکرین جو عقل سے زندگی میں اس کی استعداد و صلاحیت سے زیادہ اور بڑا کام انجام دینے کا مطالبہ کرتے تھے' بات یہ ہے کہ وہ صرف دینی دائرہ کے اندر فوری طور پر اپنے عقلی اور عملی موقف سے پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ اس حیثیت سے میں اپنے ان قلیل التعداد دوستوں کے درمیان جو دینی رجحانات رکھتے تھے اور ان کثیر التعداد اشخاص کے درمیان' جن کے یہاں مذہب محض ایک جامد تقلید کا نام تھا' کوئی فرق نہ کر سکا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے' مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ میں اسلام کی طرف کھنچ رہا ہوں' لیکن ایک آخری تردد مجھے قطعی فیصلہ سے باز رکھتا تھا۔ اسلام قبول کرنا در حقیقت ایک ایسے پل پر سے گزرنا تھا جو ایک ایسے گڑھے پر قائم ہے جس کا ایک سرا ایک دنیا میں ہے اور دوسرا دوسری دنیا میں۔ یہ ایک اتنا طویل پل تھا جس کا دوسرا سرا اس وقت تک نظر آنا مشکل تھا جب تک کہ آدمی اتنی دور نہ پہنچ جائے' جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر میں مسلمان ہو گیا تو مجھے اس دنیا سے جس میں میں نے پرورش پائی تھی' ہر تعلق منقطع کر لینا ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا نتیجہ نہیں تھا' اس لئے کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک انسان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز پر لبیک بھی کہے اور اپنے ان داخلی روابط و تعلقات کو بھی برقرار رکھے جو اس کو ایسے معاشرہ سے وابستہ کرتے ہیں جس کے اصول و مبادی براہ راست اسلام سے متصادم ہیں۔

Marfat.com

لیکن کیا اسلام واقعی خدا کا پیغام ہے؟ یا وہ محض ایک بڑے آدمی کی دانائی اور نتیجہ فکر ہے جو غلطی سے پاک نہیں؟

خوشحال بے چینی

ستمبر ۱۹۲۶ء میں ایک مرتبہ اپنی بیوی کے ساتھ میں زمین دوز ٹرین پر سوار تھا کہ اچانک میری نظر ایک آدمی پر پڑی جو میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا' وہ کوئی دولت مند اور خوشحال تاجر معلوم ہوتا تھا۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت بیگ اس کی گود میں رکھا تھا اور ہیرے کی ایک بڑی سی انگوٹھی اس کی انگلی میں نظر آ رہی تھی۔ دفعتہً مجھے یہ خیال آیا کہ یہ دراصل اس خوشحال اور فارغ البالی کا عکس ہے جو ان دنوں وسط یورپ میں ہر شخص میں دیکھی جا سکتی تھی ۔اس خوشحالی سے پہلے افراط زر کے چند سال گزرے تھے' جنہوں نے اقتصادی زندگی کو بالکل درہم برہم کر دیا تھا اور بدحالی اور بری ہیئت میں رہنا ہی اصول بن گیا تھا' لیکن اب لوگوں کی اکثریت اچھا کھاتی اور اچھا پہنتی ہے' اس لحاظ سے یہ شخص جو میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا' لوگوں سے کچھ مختلف اور نیا نہ تھا' لیکن جب میں نے اس کے چہرہ پر نظر ڈالی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی مطمئن اور پر مسرت چہرہ کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ وہ مجھے بے چین اور غیر مطمئن نظر آیا' صرف بے چین ہی نہیں' بلکہ بہت زیادہ غمزدہ اور حرماں نصیب بھی۔ اس کی نظریں کھوئی ہوئی خلا کو گھور رہی تھیں اور اس کے ہونٹ کے دونوں کنارے کسی تکلیف سے بھنچے ہوئے تھے' ایک غیر جسمانی تکلیف!

اگر بداخلاقی اور بدتمیزی پر محمول نہ کیا جائے تو میں کہوں کہ میں نے اپنا چہرہ اس کی طرف سے پھیر لیا۔ اس کے پہلو میں ایک مہذب خاتون بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرہ پر بھی بے چینی اور بے اطمینانی کے آثار تھے جیسے وہ کسی ایسی چیز کے متعلق سوچ رہی ہوں جس کے سوچنے سے انہیں تکلیف ہو رہی ہو۔ ایک پھیکی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی تھی جس کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ اس کا تعلق عادت سے تھا۔ پھر میں نے کمپارٹمنٹ میں اور لوگوں کی طرف نظر دوڑائی اور ان سب کے چہروں کو نگاہوں سے ٹٹولنے لگا جو بلا استثناء خوش حال نظر آ رہے تھے اور خوش پوشاک تھے۔ ہر چہرہ پر میں نے ایک پوشیدہ الم کی جھلک دیکھی' اتنی پوشیدہ کہ خود ان سب کو بھی اس کا احساس نہ ہوگا۔

درحقیقت یہ ایک عجیب بات تھی' ایک جگہ پر اتنے بہت غمزدہ چہروں کو دیکھنے کا اتفاق مجھے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا یا یوں کہیے کہ اس سے پہلے میں نے اس کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس بات نے مجھ پر اتنا اثر کیا کہ میں نے اس کا ذکر اپنی بیوی سے کیا۔ وہ بھی ایک ماہر فنکار اور آرٹسٹ کی طرح تمام لوگوں کے چہروں کے دیکھنے لگی۔ پھر حیرت کے ساتھ میری طرف رخ کر کے کہنے لگی۔

آپ بالکل صحیح کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ سب جہنم کی تکلیفیں برداشت کر رہے ہوں۔ میں یہ سوچتی ہوں کہ ان پر جو گزر رہی ہے' ان کو اس کی خبر بھی ہے یا نہیں!

Marfat.com

میں جانتا تھا کہ ان کو اس کی خبر نہیں ہے۔ اگر خبر ہوتی تو وہ اس طرح اپنی زندگی اور طاقت وصلاحیت کو ضائع نہ کرتے۔ ان حقائق پر ایمان کے بغیر زندگی کے منتشر اجزاء میں ربط پیدا کرتے ہیں' معیار زندگی بلند کرنے اور زیادہ سے زیادہ مادی اسباب ووسائل فراہم کرنے اور زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنے کے علاوہ کسی اور مقصد کے بغیر!

معمہ کا جواب

جب میں گھر واپس آیا تو اتفاقاً میری نظر میز پر پڑی۔ اس پر قرآن کا ایک نسخہ رکھا ہوا تھا' جو میرے مطالعہ میں رہتا تھا۔ میں اس کو بند کر کے کسی دوسری جگہ رکھنا ہی چاہتا تھا کہ غیر شعوری طور پر اچانک میری نگاہ کھلے ہوئے صفحہ پر پڑ گئی۔ اس میں یہ آیت لکھی تھی:

الهکم التکاثر ۔ حتی زرتم المقابر ۔ کلاسوف تعلمون ۔ ثم کلا سوف تعلمون ۔ کلا لو تعلمون علم الیقین ۔ لترون الجحیم ۔ ثم لترونها عین الیقین ۔ ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم ۔ (۱۰۲:۱۔۸)

(غفلت میں رکھا تم کو بہتات کی حرص نے یہاں تک کہ جا دیکھیں تم نے قبریں' کوئی بات نہیں جلد جان لوگے۔ پھر کوئی نہیں جلد جان لوگے۔ کوئی نہیں اگر تم جانو یقین کر کے' بیشک تم کو دیکھنا ہے دوزخ' پھر دیکھنا ہے اس کو یقین کی آنکھ سے پھر پوچھیں گے تم سے اس دن آرام کی حقیقت۔)

میں ایک لمحہ کے لئے گم سم سا ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ کتاب میرے ہاتھ میں جنبش میں تھی۔ پھر میں نے اپنی بیوی سے کہا۔ دیکھو سنو' کیا یہ اس کا جواب نہیں ہے جو رات کو ہم نے ریل پر دیکھا تھا؟

ہاں وہ ایسا قطعی جواب تھا کہ سارے شکوک وشبہات ایک دم سے ختم ہو گئے۔ اب میں نے یقینی طور پر سمجھ لیا کہ یہ کتاب جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے' خدا ہی کی نازل کی ہوئی ہے۔ وہ اگرچہ آج سے تیرہ سو برس پہلے ایک انسان کو عطا کی گئی تھی' لیکن اس میں بہت وضاحت کے ساتھ ایک ایسی چیز کی پیشین گوئی تھی جو ہمارے اس پیچیدہ اور مشینی دور سے زیادہ واضح طور پر کسی اور دور میں سامنے نہ آئی تھی۔

تکاثر یعنی مال ودولت کی حرص وہوس اور مسابقت تاریخ کے ہر دور میں پائی جاتی رہی' لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ محض اشیاء کو جمع کرنے کا شوق بن جائے یا ایک ایسا کھلونا اور بہلاوا بن جائے جو کسی اور حقیقت کی طرف دیکھنے ہی نہ دیتا ہو۔ دولت اور اقتدار کا حصول' عمل ایجاد واختراع کا سلسلہ جس کا کوئی علاج نہیں' کل سے زیادہ آج اور آج سے زیادہ کل ایک بھوت ہے جو لوگوں کے سروں پر سوار ان کو چمکیلے مقاصد کی طرف کوڑے مار مار کر بھگا رہا ہے جو دور سے بہت شاندار معلوم ہوتے ہیں' لیکن ہاتھ میں آنے کے بعد حباب کی مانند غائب ہو جاتے ہیں' یہاں تک کہ وہ وقت آ جاتا ہے جس کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے (**کلا لو تعلمون علم الیقین۔ لترون الجحیم**)

Marfat.com

اب مجھے یقین ہو گیا کہ قرآن کسی انسان کی حکمت و دانائی کا نتیجہ نہیں ہے جو ایک دور دراز جزیرۃ العرب میں تاریخ کے کسی دور میں تھا' اس لئے کہ یہ انسان لاکھ سمجھدار' حکیم اور دانا سہی' مگر پھر بھی اس عذاب کی پیشین گوئی نہیں کر سکتا تھا' جو بیسویں صدی کی خصوصیت ہے۔ مجھے قرآن کے اندر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اونچی اور گہری آواز سنائی دے رہی تھی۔

اسلام کی آغوش میں

اس بات کا واضح اور کھلا ہوا نتیجہ یہ تھا کہ میں اپنے ایک مسلمان ہندوستانی دوست کے پاس گیا جو اس وقت برلین میں مسلمانوں کی انجمن کے صدر تھے اور ان سے اسلام قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے اپنا داہنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بھی اپنا داہنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا اور دو گواہوں کی موجودگی میں مَیں نے اشھد ان لاالٰہ الاالله و اشھد ان محمداً رسول الله پڑھا۔ میرے دوست نے کہا کہ آپ کا نام لیو پولڈ ہے' لیو کے معنی یونانی میں شیر کے ہوتے ہیں' اس لئے ہم آج سے آپ کو "محمد اسد" کہیں گے۔ چند ہفتے بعد میری بیوی نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

جب میں نے اپنے والد کو اپنے قبول اسلام کی اطلاع دی تو انہوں نے میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد میں نے ان کو دوسرا خط لکھا جس میں ان کو یہ لکھا کہ اسلام لانے کی وجہ سے ان کے ساتھ میرے رویہ یا محبت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے' اس کے برخلاف اسلام کی مجھے ہدایت ہے کہ میں والد کی سب سے زیادہ عزت اور محبت کروں' لیکن اس خط کا جواب بھی مجھے نہیں ملا۔

میرے والدین پر دین کا کوئی گہرا اثر نہ تھا اور میرا خیال ہے کہ جتنا وہ مجھے اپنے ماحول اور اپنے کلچر کا (جس میں انہوں نے پرورش پائی تھی اور جس سے ان کو محبت تھی) باغی یا مرتد سمجھتے تھے' اتنا وہ مجھے اپنے مذہب کا باغی نہیں سمجھتے تھے۔

اسلام لانے کے کچھ ہی عرصہ کے بعد میں نے اور میری بیوی نے یورپ کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا' اس لئے کہ وہاں رہنا اب ہمارے لئے بہت بار تھا۔

(ور: طوفان سے ساحل تک۔ ترجمہ محمد الحسن الحسنی' طبع عکسی، کراچی ۱۹۷۷ء ص ۵۲-۱۵۴' ۱۶۲-۱۷۱۔ مرتب نے متعدد اشخاص و اماکن کے ناموں کے تلفظ کی تصحیح اور بعض عبارتوں کو درست کر دیا ہے)۔

حاشیہ

۱۔ یہ ۱۹۲۳ء کی بات ہے، جب لاؤڈ اسپیکر سے اذان دینے کی اجازت نہیں تھی۔ لاؤڈ اسپیکر کی وجہ سے اب اذان میں وہ حسن و دلکشی باقی نہیں رہی، جو پہلے تھی۔

Marfat.com

ڈاکٹر ایچ۔بی۔خاں

محمد اسد صاحب
(سابق لیوپولڈ وائس)
کے حالاتِ زندگی

محمد اسد صاحب ایک یہودی (ربی) خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ قبل[1] اس کے کہ ہم آئندہ سطور میں ایک آسٹرین یہودی نژاد کا تعارف کرائیں' یہ بات ظاہر کرنا ضروری ہے کہ اس کتاب کی تخلیق کا سبب اور محرک موصوف کی کتاب ''دی روڈ ٹو مکہ'' تھی، جس کے بکھرے ہوئے موتیوں کو چن کر ایک گلدستہ بنانے کی کوشش میں تشنگی محسوس ہوئی۔ اس تشنگی کو رفع کرنے کے لئے بعض اجزاء کے حصول اور بعض کڑیوں کو منسلک کرنے کے لئے کوشش شروع کی تو اس پر اطمینان نہ ہو سکا' لہٰذا موصوف کی کتاب سے ہٹ کر اس کتاب کی تدوین و ترتیب کی گئی لیکن بنیادی طور پر اسد صاحب کی کتاب ہی کا خاکہ ہمارے اعصاب پر سوار رہا اور اسی بنیاد پر ہم موصوف کے حالات پیش کر رہے ہیں:

آپ کی پیدائش ۱۹۰۰ء میں پولینڈ کے ایک شہر لوو (Lwow) میں ہوئی۔ یہ شہر اس وقت آسٹرین (Austrian) حکومت میں تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنی خاندانی روایات اور معمول کے مطابق گھر پر ہی حاصل کی۔ تیرہ سال کی عمر میں اتنی استطاعت ہوگئی کہ عہد نامہ عتیق عبرانی زبان میں آسانی کے ساتھ پڑھ سکتے تھے۔[2] اسد صاحب کے والد (جن کا نام معلوم نہ ہو سکا)* ربی (یہودی) عقائد کے سختی سے پابند تھے اور ایک اچھے بیرسٹر تھے۔ اسد صاحب کا خاندان ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ مکان بھی بڑا خوبصورت تھا۔ اس کے اطراف میں صحت بخش اور فرحت بخش آب و ہوا اور خوشگوار ماحول تھا۔ موسم گرما میں اسد صاحب مع اپنے بہن بھائیوں اور والدین کے دیہات میں وقت گزارتے تھے۔ یہ مکان ان کے نانا کا تھا۔ ان کے نانا ایک دولتمند بینکر تھے۔ علاوہ ازیں ان کے پاس خاصی جائداد تھی جو ان کے بڑے خاندان کے لئے آرام و آسائش اور سیر و تفریح کا سامان مہیا کرنے کے لئے

Marfat.com

کافی تھی۔[۲۳] اسد صاحب نے اپنے والدین کے ساتھ ویانا' برلن' الپس (Alps) اور بوہیمین (Bohemian) بحر شمال اور بحر بالٹک جیسے دور دراز مقامات کے سفر بھی کیے۔ یہ سفر اسد صاحب کے لئے نئی دنیا کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان سفروں میں لڑکے اور لڑکیوں (ہم عمر) کے ساتھ اختلاط کا موقع ملا۔ یہ زمانہ (بچپن کا) بڑا ہی پُر مسرت اور اطمینان بخش تھا۔[۲۴] اسد صاحب کے والدین بظاہر خوشحال اور فارغ البال ہونے کی بنا پر بڑے مطمئن تھے' وہ اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی اولاد کے لئے جی رہے تھے۔ اسد صاحب کی والدہ بڑی نرم مزاج اور خاموش طبیعت خاتون تھیں۔ اسد صاحب نے چند برسوں میں اپنے کو نئے ماحول اور نئے (مگر بڑی حد تک منحوس) حالات کا خوگر بنا لیا اور ان پر ان کے والد کی اندرونی بے اطمینانی اور بے چینی کا عکس بھی پڑے بغیر نہ رہ سکا۔[۲۵] اسد صاحب کے ایک چچا تھا۔ انہوں نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جہاں دینداری کا خاصا اثر تھا۔ وہ نوجوانی ہی میں مکمل ربی بن گئے تھے' مگر ربی کے پیشہ میں کافی آمدنی نہ ہونے کی بناء پر انہوں نے سمور فروشی کی تجارت شروع کر دی تھی' اس لئے وہ یورپ کے سمور کے مرکز Leipzig میں بغرض کاروبار جایا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے اجداد کے عقائد سے سرکشی کی اور یہودیت کو ترک کر کے عیسائی مذہب اختیار کر لیا[۲۶]۔

جنگِ عظیم اول اور محمد اسد صاحب کا مستقبل

حسب تفصیل سابق اسد صاحب نے ۱۳ سال کی عمر میں عبرانی زبان پر اتنی قدرت حاصل کر لی تھی کہ وہ اسے آسانی کے ساتھ لکھ پڑھ اور بول سکتے تھے۔ عہدِ قدیم کی کتاب "طالمود" (Talmud) کا متن و شرح دونوں سے اچھی طرح مانوس تھے۔ اس کے بعد کتاب مقدس "ترگم" (Targum) کی شرح میں مشغول ہو گئے جو ربی ہونے کے لئے ایک ضروری شرط تھی۔

یہودی عقائد کے مقدمات سے اس ساری واقفیت اور ان تمام دینی معلومات کے باوجود بلکہ شاید اسی وجہ سے اسد صاحب میں ایک قسم کا ترفع اور احساس برتری پیدا ہو گیا۔ چونکہ اسد صاحب اصلاح اخلاق کے اس اصول کے بہت قائل تھے جو یہودیوں کی مذہبی کتابوں میں بڑی شدت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے' اس لئے اسد صاحب کو خدا کے بارے میں انبیائے یہود کے تصور سے بھی اتفاق تھا' جو وہ پیش کرتے ہیں۔ اسد صاحب نے محسوس کیا کہ یہودیوں کے پیش کردہ معبود غیر معمولی طور پر ایک ہی متعین اور خاص قوم (عبرانیوں) کے انجام اور مستقبل کی فکر میں رہا کرتے ہیں' خود عہد قدیم کی کتاب تکوین (کتاب پیدائش) احفاد ابراہیم کی تاریخ کی حیثیت سے یہ رجحان رکھتی ہے کہ خدا کو تمام انسانوں کے رب کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک خاص سمت اور جہت کے رب کی حیثیت سے پیش کرے' جو تمام اقوام کے ساتھ اپنی منتخب اور برگزیدہ قوم کی ضرورتوں کے لحاظ سے معاملہ کرتا ہے۔ اگر وہ (یہود) صالح ہوتے ہیں تو ان کو فتوحات سے نوازتا ہے اور اگر وہ گمراہ ہوتے ہیں تو کفار کے ہاتھوں سے ان کو عذاب دلواتا ہے۔ ان بنیادی نقائص کی بناء پر اسد صاحب کو ان مدعیان کے دعووں میں عالمی پیغام نظر نہیں آتا[۲۷]۔

Marfat.com

اسد صاحب بیان کرتے ہیں کہ اس ابتدائی درس و مطالعہ کا نتیجہ میرے مقصد اور نیت کے خلاف پڑا اور اسی مطالعہ نے مجھے میرے آباؤ اجداد کے دین سے قریب کرنے کے بجائے اور دور ہی کر دیا' لیکن یہودیت سے مایوسی نے مجھے روحانی حقائق کی تلاش سے نہیں روکا۔ چونکہ میرا دین میرے لئے پابندیوں اور احکامات کی ایک زنجیر تھی' اس لئے میں (اسد صاحب) نے اس سے دور ہو جانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کی۔ دینی مسائل اور فلسفہ کے سوالات نے ابھی تک اسد صاحب کو اپنی طرف متوجہ نہیں کیا تھا۔

۱۹۱۴ء کے اواخر میں جنگ عظیم اول کا آغاز ہوا تو اسد صاحب کی عمر ۱۴ سال کی تھی' لیکن قد آور ہونے کی بنا پر بظاہر ۱۸ سال کی عمر معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ مدرسہ سے راہ فرار اختیار کی اور اپنا نام بدل کر آسٹریا کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ لیکن جیسے ہی ان کے والد (اسد صاحب کے) کو اس بات کا علم ہوا تو وہ پولیس کی اعانت سے ان کو ملازمت سے نکال کر ویانا لے گئے۔ کچھ عرصہ سے ان کا خاندان ویانا میں آ کر مقیم ہو گیا تھا۔ لیکن اسد صاحب اپنے گھر کے حالات سے مطمئن نہ تھے اور چار سال بعد دوبارہ باقاعدہ طور پر آسٹرین فوج میں بھرتی ہو گئے۔ لیکن ان ایام میں فوجی عروج اور شان و شوکت کے خوابوں کی تعبیر بند کر دی تھی اور اپنی خود ارادیت کی تکمیل کے لئے کسی دوسری راہ کی تلاش رہی۔ سوءِ قسمت کہ بھرتی ہونے کے چند دن بعد ہی جنگ ختم ہو گئی[۸]۔

جنگ ختم ہونے کے بعد ویانا یونیورسٹی میں تقریباً دو سال تک' پابندی اور اہتمام کے بغیر فلسفہ اور آرٹ کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ لیکن اس سنجیدہ' خشک اور خالص علمی مسلک میں ان کے لئے (اسد صاحب) کوئی کشش نہ تھی۔ ان کو اس کا شوق اور خواہش تھی کہ وہ زیادہ واقفیت اور علمیت کے ساتھ زندگی کا گہرا مطالعہ کریں اور موجودہ مصنوعی (artificial) قلعوں میں پناہ لئے بغیر زندگی کے قلب و جگر میں اتر جائیں جو ان لوگوں نے عافیت اور آرام طلبی کی خاطر اپنے اردگرد بنا لئے ہیں۔ وہ واقعات اور کائنات کے اس روحانی نظام کی جستجو میں تھے جس کے متعلق ان کا یقین اور اعتماد تھا کہ وہ ضرور موجود ہے' لیکن فی الحال وہ اس کے ادراک سے قاصر ہیں۔ ان کی دماغی' ذہنی پراگندگی اور پریشانی اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی نہ تھی' دراصل یہ پوری نسل کی حیرانی و پریشانی تھی[۹]۔

بیسویں صدی کے اوائل میں نمایاں طور پر ایک روحانی خلا (vacuum) پایا جاتا تھا۔ روحانی اقدار جن سے یورپ صدیوں سے آشنا تھا' اب کسی خاص شکل یا متعین شکل پر باقی نہیں رہ گئی تھیں۔ یہ خلا جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) کے درمیان پیش آنے والے واقعات و حالات کا نتیجہ تھا۔ موجودہ حالات کے پیش نظر اس بات کی کوئی توقع (بظاہر) معلوم بھی نہیں ہوتی تھی کہ قدروں کا کوئی نیا مجموعہ ان اقدار کی جگہ لے سکے گا۔ وہاں خطرات اور خوف کا ایک احساس تھا' وہ احساس جو عقلی اور سماجی ابال سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان اس شبہ میں پڑ گیا تھا کہ آیا اس کی کوششیں اور افکار کسی ایک مستقر پر رکیں گی یا نہیں؟ حالات بتلا رہے تھے کہ ہر چیز تنکے کی طرح ایک بے راہ سیلاب میں بہی چلی جا رہی ہے۔

اس روحانی بے چینی اور بے اطمینانی میں موجودہ نسل کے نوجوانوں کو ایک قدم بھی جمانے کی جگہ نظر نہ آتی

Marfat.com

تھی۔ مزید برآں معتبر اخلاقی قدروں اور معیاروں کے فقدان کے نتیجہ میں کسی کے اختیار میں نہیں رہا تھا کہ وہ ہمارے ان سوالات کا (جو ہمارے ذہن وفکر کو پریشان کر رہے تھے) تسلی بخش جواب دے سکے۔ علم کا دعویٰ تھا کہ تحقیق (research) ہی سب کچھ ہے۔ اس نے یہ بات فراموش کردی تھی کہ اگر علم اور معلومات کے ساتھ کوئی اخلاقی مقصد نہ ہو تو اس کا نتیجہ سوائے انتشار اور انارکی کے کچھ بھی نہیں۔ مصلحین اخلاق' انقلابی ذہن رکھنے والے' کیمونسٹ (یہ سب ایک بہتر اور صحت مند مستقبل کے لئے کوشاں تھے) صرف ظاہری حالات (اجتماعی اور اقتصادی ضروریات) کی روشنی میں سوچنے کے عادی تھے' اس لئے کیمونسٹوں نے ''مادی فلسفہ'' ایجاد کیا جو اگرچہ مابعد الطبیعیات کا دشمن تھا لیکن خود اس نے بعد کو Metaphysics کی شکل اختیار کر لی تھی یعنی مابعد الطبیعیات کی طرف رجوع ہوا تھا۔ رہ گئے مذہبی پیشوا اور دینی رہنما تو ان کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ وہ خود اپنے عادات اور اطوار وخیالات کو اپنے معبود پر منطبق کرتے رہتے ہیں اور عادات واطوار بھی وہ تھے جو عرصہ دراز سے بے وقعت اور بے جان ہو چکے تھے۔ جب اسد صاحب جیسے نوجوان یہ دیکھتے تھے کہ یہ نام نہاد الٰہی صفات (مذہبی پیشوا اور دینی رہنماؤں کی خیالی تخلیق) دور تک واقعات اور مشاہدات سے ٹکراتی ہیں تو پھر یہ سوچنا ضروری ہو جاتا ہے کہ قضاوقدر کے پیچھے جو قوتیں کارفرما ہیں' وہ بہت واضح اور صاف طور پر ان صفات سے مختلف اور متضاد ہیں جن کو خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے' اس لئے کہ خدا موجود نہیں ہے۔ ایسے لوگ بہت کم یا برائے نام تھے جو یہ سمجھتے ہوں کہ موجودہ انارکی اور انتشار کا سبب مدعیان دین اور محافظین مذہب کا استبداد ہے جن کو یہ زعم تھا کہ وہ نیکوکاروں میں سے ہیں اور وہ بزعم خود یہ بھی سمجھتے تھے کہ ان کو خدا کی صفات بیان کرنے اور خدا سے متعارف کرانے کا حق دیا گیا ہے۔ ان خودساختہ مدعیان نے خدا کو اپنا لباس پہنا کر انسانوں کو عمل اور اس کے انجام سے علیحدہ کر دیا ہے[1]۔

فرد کی زندگی میں اس اخلاقی تغیر کے دو ہی نتیجے تھے۔ مکمل اخلاقی انارکی اور ''کلبیت'' یا پھر ایک بہتر زندگی کی تشکیل جو ایک مجتہدانہ اور تخلیقی کوششوں کا نتیجہ ہو سکتی تھی۔

اسی طرح تحلیل نفسی (Psychoanalysis) کے وہ نتائج (جو دماغی انتشار اور حیرانی کے زمانہ میں) اسد صاحب کے سامنے آئے' وہ بھی انہیں مطمئن نہ کر سکے۔ اگرچہ اس کے اسباب مختلف تھے۔ اس بات کے باور کرنے میں کوئی شبہ نہیں کہ تحلیل نفسی اس زمانہ میں اپنی نوعیت کا ایک عمدہ عقلی انقلاب تھا۔ اس انقلاب کی بدولت انسان اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ سمجھنے لگا تھا کہ علم وحقیقت کے دروازے (یا بھید) جو ابھی تک بند تھے اور اب کھلے ہیں' انسان کے فکروخیالات پر بہت گہرا اثر ڈالے بغیر نہ رہ سکیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کو یکسر بدل کر رکھ دیں' اس لئے کہ اس عمل کے انکشاف نے جو لاشعوری اور خفیہ عوامل انسان کی شخصیت کی تکمیل وتعمیر کرتے ہیں' انسان کے اندرونی اسرار (بھید) کو سمجھنے کے لئے بہ نسبت گذشتہ نفسیاتی نظریات کے بہت سے راستے اور کھڑکیاں کھول دی ہیں۔ اسد صاحب یہ سب باتیں قبول کرنے کے لئے تیار تھے لیکن اس وقت بھی جب کہ تحلیل نفسی کے جدید اصول ونتائج ان کے لئے شک وشبہ سے بالاتر تھے' وہ اس عقلی غرور (Intellectual arrogance) پر مطمئن نہ تھے جن کے

Marfat.com

ماتحت نفس انسانی کے سارے عجائبات کو صرف اعصابی اور تناسلی اجزاء کی صدائے بازگشت خیال کیا جاتا ہے۔ وہ فلسفیانہ نتائج جن پر اس علم وفن کے بانی اور مربین پہنچے تھے' بعض اوقات انہیں بہت بے قیمت اور حقیر معلوم ہونے لگتے تھے' اس لئے کہ ان کے نزدیک آخری حقائق کے سامنے ان کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ مزید برآں وہ نتائج کسی نئے راستے یا شاہراہ کی طرف رہنمائی بھی نہیں کرتے تھے' جن کی بناء پر انسان بہتر زندگی کی طرف جا سکے۔

اسد صاحب نے مزید لکھا ہے کہ اگرچہ یہ مسائل ان کے دماغ پر حاوی تھے' لیکن انہوں نے کبھی پریشان نہیں کیا۔ مادراء الطبیعیات کے بارے میں فلسفیانہ غور وفکر یا مجرد حقائق کی بحث میں کبھی سرتاپا غرق نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کو شروع سے ہی ان چیزوں کی طرف میلان زیادہ تھا' جن کو دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہو۔ جیسے انسانی تعلقات' معاشرہ کی سرگرمیاں' حصول معاشرت وغیرہ۔ ساتھ ہی ساتھ انہیں اس زمانے میں صنفی تعلقات کو سمجھنے کی بھی فکر تھی[11]۔

جنگ عظیم کے بعد اخلاقی اقدار کو ایک عام اور ہمہ گیر زوال سے دوچار ہونا پڑا تو قدرتی طور پر وہ حجابات بھی اٹھ گئے جو عورت اور مرد کے درمیان حائل تھے۔ اسد صاحب کی رائے میں یہ واقعہ انیسویں صدی کی رجعت پسندی کے خلاف محض ایک ردعمل قرار دینا صحیح نہیں۔ اصل میں یہ ردعمل اس حالت یا اس ماحول سے جہاں معین اخلاقی اقدار ابدی' ازلی اور شبہ سے بالاتر سمجھی جاتی ہیں' اس حالت یا اس ماحول کی طرف بے مزاحمت ردعمل تھا' جہاں ہر چیز مشکوک اور غیر یقینی تھی۔ وہ اس اعتقاد سے کہ انسان آگے بڑھ رہا ہے اور ترقی پذیر ہے' اس حالت یا اس مقام سے واپسی تھی' اس روحانی منکریت (Spiritual nihilism) کی طرف جس کی پرورش نفسیات کے علمائے تحلیل نے کی تھی[12]۔ مختصر یہ کہ اسد صاحب کے ذہن ودماغ میں حق وصداقت کی تلاش اور جستجو رہی اور ان کی دلچسپی اشیاء کے محسوس کرنے اور دیکھنے میں مضمر رہی تا کہ حقائق کی تلاش میں مدد ومعاون ہو۔

اسد صاحب نے پیش آمدہ حالات وواقعات پر غور وفکر کرنا شروع کیا' مگر ان کی بے چینی اور بے اطمینانی میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے والد کی خواہشات اور جذبات کے برعکس یونیورسٹی کی تعلیم ترک کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ بعدہٗ صحافت کے میدان میں طبع آزمائی کی اور ۱۹۲۰ء کی گرمیوں کے آخر میں کسی کو اطلاع دیئے بغیر ویانا سے پراگ پہنچ گئے[13]۔ ان کی والدہ ایک سال قبل فوت ہو گئی تھیں اور اس سفر میں ان کے پاس مرحومہ کی ڈائمنڈ کی ایک انگوٹھی تھی۔ انہوں نے اس انگوٹھی کو فروخت کر کے اپنا وقت گزارا' مگر یہ سہارا عارضی ہی تھا۔ گھر والوں سے مالی امداد کی توقع نہ تھی۔ ان کے والد سخت ناراض تھے مگر چند ماہ بعد جب ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو انہوں نے خط میں لکھا:

"I can already see you ending one day as a tramp in a roadside ditch; to which I replied: "No roadside ditch for me. I will come out on top. How I would come out was not in the least clear to me; but I knew that I wanted to write and was, of course, convinced

Marfat.com

that the world of letters was waiting for me with arms wide open."

ترجمہ: ''میں دیکھنا چاہتا ہوں تم ایک دن آوارہ گردی کرتے ہوئے سڑک کے کسی غار میں گر جاؤ۔ اس بات پر میں نے جواب دیا کہ میرے لئے سڑک کا غار یا گڑھا نہیں ہے بلکہ میں اعلیٰ مقام پر آؤں گا۔ لیکن میں کس طرح اعلیٰ مقام پر آؤں گا یہ میرے ذہن میں بالکل نہ تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ میں کتب یا اخبارات میں تحریری مضامین لکھوں گا اور مجھے یقین تھا کہ میری علمیت اور تحریری مضامین کے لئے دنیا میرے لئے بڑی خوش اسلوبی یا گرمجوشی کے ساتھ انتظار میں موجود ہے۔''[۱۴]

اسد صاحب نے اپنے والد کے خط کا جواب دے دیا تھا مگر ان کو خود بھی یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اپنی منزل (چوٹی پر پہنچنا) پر کیسے پہنچ سکیں گے؟ چوٹی کو کیسے سر کریں گے؟ یا اعلیٰ زندگی کیسے ملے گی؟ چند ماہ بعد جب ان کا سرمایہ ختم ہوا تو انہیں فکر معاش دامنگیر ہوئی۔ انہوں نے صحافت میں قدم بڑھانا چاہا مگر بڑے اخبار میں ان جیسے ناتجربہ کار کو کوئی لینے کے لئے آمادہ نہ تھا' بالآخر معاشی بدحالی نے ان کو ایک فلم میں کام کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد ایک تھیٹر میں فلمی منظر نامہ لکھنے میں شرکت کی اور پھر ایک اور کہانی لکھی۔

۱۹۲۱ء کے موسم خزاں میں ''یونائیٹڈ ٹیلیگراف نیوز ایجنسی'' میں ٹیلیفون پر اخبارات کی خبریں ارسال کرنے کی ملازمت مل گئی۔ اسی دوران میں ''مادام گورکی'' جو میکسم گورکی کی بیوی تھی، سے ملاقات ہوگئی۔ میکسم گورکی اس وقت روس میں ایک بڑی تحریک چلا رہا تھا اور اس کے بیانات نے دنیا کو ہلا دیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں روس میں زبردست قحط پڑا تھا اور لاکھوں آدمیوں کو اس قحط نے جکڑ لیا تھا اور لاکھوں افراد فاقے سے مر چکے تھے۔ ''مادام گورکی'' کے ذریعہ انہوں نے قحط کے متعلق سنسنی خیز خبریں تمام اخبارات میں شائع کرائیں جو ''مادام گورکی'' سے اسد کے انٹرویو کے بعد شائع ہوئیں۔ اس کے بعد ان کو رپورٹر کا عہدہ مل گیا اور صحافت کے پیشہ میں ان کا داخلہ ہو گیا[۱۵]

جنگ عظیم اول کے بعد یورپ کے حالات

اسد صاحب لکھتے ہیں کہ جنگ کے بعد اجتماعی اور اخلاقی انتشار و بدامنی کی فضا ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ نو عمری کے باوجود مجھ (اسد صاحب) سے یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ جنگ کے انتشار زدہ اور بے چین یورپ کے حالات اطمینان بخش نہ تھے۔ اس کا معبود (جیسا کہ مشاہدہ اور حالات نے بتلایا) کوئی روحانی قسم کا معبود نہ تھا بلکہ راحت و آسائش ہی اس کا معبود بن گئی تھی۔ خیر و شر کے معاملے میں کلی اتفاق مفقود تھا۔ اجتماعی اور اخلاقی مسائل مصلحت کے تابع بن کر رہ گئے تھے۔ چین کا لاؤتسے (Lao-tse) فلسفہ جس کا انکشاف مجھے ۱۷ سال کی عمر میں ہوا تھا' مستقبل کے بارے میں کوئی تبدیلی نہ کر سکا۔ ''لاؤتسے'' فلسفہ سے میرا تعارف اس طرح ہوا کہ ویانا کے کتب خانہ میں مجھے تاؤٹی کنگ (Tao-te-king) کی ایک کتاب کا جرمن ترجمہ محض اتفاق سے مل گیا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مجھے بہت سی حکمت کی باتیں معلوم ہوئیں۔ میں نے انسانی زندگی کے متعلق اس کتاب میں سکون اور ٹھہراؤ پایا۔ یہ کتاب ایسی

Marfat.com

زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جو ہر قسم کے انتشار اور جھگڑوں، بکھیڑوں سے پاک ہو۔ جس کی پرورش ایسی پُرسکون شادمانی میں ہوئی تھی جو ہر انسانی قلب کی دسترس میں ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنی اس خاص حریت کو حاصل کرنے کا متمنی ہو۔

یہ ایک حقیقت تھی جس کو میں نے پہچان لیا تھا۔ ایسی حقیقت جو ازل سے حقیقت ہے اور ابد تک حقیقت ہی رہے گی۔ باوجود اس کے کہ ہم اس کو بھول چکے ہیں۔ اس حقیقت کو پانے کے بعد مجھے ایسی مسرت حاصل ہوئی جیسے کوئی آدمی طویل عرصہ کی جدائی کے بعد اپنا وطن دیکھ کر محسوس کرتا ہے۔ اس کے بعد مجھے تلاش حق میں مزید جستجو اور لگن پیدا ہوئی[16]۔

اسد صاحب نے کہا کہ بعدہٗ میری زندگی میں متعدد بار عارضی اور وقتی رومان کے مراحل بھی آئے۔ زندگی میری نگاہ میں بہت حسین اور دلفریب تھی لیکن میں مایوس اور دل شکستہ نہ تھا۔ اس کے باوجود میں دل کی گہرائیوں کے اعتبار سے بالکل غیر مطمئن تھا اور مجھے اپنی زندگی کا صحیح مقصد معلوم نہ تھا۔ البتہ جوانی کے زعم باطل میں اس بات کا یقین تھا کہ اپنے مقصد کو معلوم کرنے میں کسی نہ کسی دن ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ الغرض میں اسی طرح اطمینان اور بے اطمینانی، سکون اور انتشار کے درمیان جھولا جھولتا رہا۔ میں اپنے ساتھیوں اور رفیقوں کی اقتصادی وسیاسی امیدوں اور تمناؤں کا ساتھ نہ دے سکا جن کی وجہ سے مجھ میں امتداد زمانہ کے ساتھ یہ احساس ترقی پاتا گیا کہ میں ان میں کا ایک فرد نہیں ہوں۔ اس کے ساتھ یہ مبہم خواہش بھی شامل تھی کہ کاش میں کسی جماعت یا کسی سوسائٹی کا فرد ہوتا[17]۔

مشرق وسطیٰ کا سفر

۱۹۲۲ء کے موسم بہار میں مجھے اپنے ماموں ڈوریان (Dorian) کا خط ملا۔ میرے تعلقات ڈوریان سے ماموں بھانجے جیسے نہ تھے بلکہ رشتہ سے زیادہ دوستانہ تھے۔ وہ صیہونی (Zionist) نہ تھے اور نہ صیہونی تحریک سے انہیں کوئی ہمدردی تھی[18]۔ وہ غیر شادی شدہ تھے، اس لئے انہوں نے مجھے اپنے پاس آنے کی دعوت دی تاکہ میں کسی حد تک ان کی رفاقت کر سکوں۔ میں نے بہ عجلت مشرق وسطیٰ جانے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے یہ سفر اس لئے اختیار نہیں کیا تھا کہ مجھے روحانی دنیا کی سیر میسر آئے گی اور یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ آئندہ چل کر میرا یہ سفر میری تمناؤں یا خواہشات کی تکمیل کا سبب بنے گا۔ اس سفر سے پہلے میں اپنے افکار و تاثرات کو فطری طور پر مغربی و عالمی طرز فکر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔ میں اپنے شعور و خیال سے ہٹ کر کوئی بات سوچ ہی کیسے سکتا تھا۔ میں بہر حال ایک مغربی نوجوان تھا جس کے رگ وریشہ میں یہ عقیدہ پیوست تھا کہ اسلام اور اس کی جملہ تعلیمات کی حیثیت تاریخ انسانی کے ایک رنگین بغلی راستہ سے زیادہ نہیں جو روحانی اور اخلاقی کسی بھی نقطہ نظر سے کچھ زیادہ وقیع اور قابل احترام نہیں اس لئے نہ صرف یہ کہ اس کو اس درجہ پر نہیں رکھا جاتا تھا جس کا وہ مستحق تھا بلکہ اس کو دوسرے دو مذاہب عیسائیت اور یہودیت (جس کو مغرب سنجیدگی کے ساتھ قابل غور سمجھتا ہے) سے موازنہ کے قابل بھی نہیں سمجھا جاتا تھا[19]۔

اسد صاحب نے اپنے سفر کا تفصیلی حال بیان کیا ہے اور اس میں ریل اور سمندر کے سفر کا حال، سورج اور

Marfat.com

اس سے پیدا ہونے والے بحری و بری مناظر کو اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ سفر کے درمیان فادر فلیکس سے ملاقات ہوئی اور ان سے تعارف بھی ہو گیا۔ یہ مسیحی پادری تھے۔ راستہ میں ان سے بڑی معلوماتی اور مذہبی گفتگو ہوتی رہی۔

عرب سوسائٹی کی پہلی جھلک

اسد صاحب کا سفر ٹرین میں جاری تھا۔ ٹرین صحرائے سینا سے گزر رہی تھی۔ رات کو صحرا کی ٹھنڈک اور ریتیلے ٹیلوں پر ٹرین کی مسلسل حرکت اور گھڑ گھڑاہٹ کی وجہ سے ایک لمحہ کے لئے بھی نہ سو سکا۔ میرے سامنے والی سیٹ پر ایک بدو بڑی سی عبا میں لپٹا ہوا اور مفلر پہننے کے باوجود سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس بدو کے گھٹنے پر تلوار رکھی تھی جس کے نیام پر سونے کا کام تھا۔ صبح ہونے لگی اور میں نے صبح کے منظر میں خوشگوار اور پُر مسرت فطری مناظر کو دیکھا۔ دائیں طرف صحرا اور بائیں طرف سمندر کا کنارہ تھا۔

ہماری ٹرین کئی بار چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر جا کر رکی جو عام طور پر ٹین اور لکڑی کے بیرکوں کی طرح معمولی تعمیر شدہ تھے۔ سانولی صورت والے لڑکے اور بچے جن کے جسم پر لباس پھٹا ہوا تھا' اچھل کود رہے تھے اور مسافروں کے ہاتھ انجیر' ابلے ہوئے انڈے اور روٹی فروخت کر رہے تھے۔ وہ بدو جو میرے (اسد صاحب) کے سامنے بیٹھا تھا' آہستہ آہستہ اٹھا اور اپنا مفلر کھولا' پھر کھڑکی کھولی۔ اس نے ایک روٹی خریدی اور واپس ہونے لگا۔ جب وہ بیٹھنے جا رہا تھا' اس وقت اس کی نگاہ اسد صاحب پر پڑی۔ کچھ کہے بغیر اس نے روٹی کے دو ٹکڑے کئے اور ایک ٹکڑا اسد صاحب کو دینے لگا۔ جب اس نے میرا تردد اور تعجب دیکھا تو مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ اس کے چہرہ سے اس کے عزم اور قوت ارادی کا پتہ دے رہی تھی۔ اس نے کہا تفضّل! نوش فرمایئے۔ میں نے روٹی کا وہ ٹکڑا لے لیا اور سر کے اشارہ سے بدو کا شکریہ ادا کیا۔ ایک اور مسافر نے جو ترکی ٹوپی کے علاوہ سارا لباس یورپین ملبوس کئے ہوئے تھا' اس نے رضا کارانہ طور پر ترجمہ (یعنی بدو کی گفتگو کی تشریح) کی پیشکش کی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہنے لگا کہ بدو کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ''آپ بھی مسافر ہیں' میں بھی مسافر ہوں اور ہم دونوں کا راستہ ایک ہے۔'' اسد صاحب نے اس بدو کی پیشکش اور واقعہ کا جو اثر لیا' وہ ان کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:

"When I now think of this little occurence, it seems to me that all my love for the Arab character must have been influenced by it. For in the gesture of this beduin, who, over all barriers of strangeness sensed a friend in an accidental travelling companion and broke bread with him, I must already have felt the breath and the step of a humanity free of burden."

ترجمہ: ''اب جب میں اس چھوٹے سے واقعے یا حادثے کا خیال کرتا ہوں کہ عربوں کے اخلاق سے بعد

Marfat.com

میں پیدا ہونے والی میری محبت اسی اثر کا نتیجہ تھی جو اس بدو نے مجھ پر مرتب کیا تھا۔ جس نے اجنبی اور اتفاقی مسافر ساتھی کے ساتھ تمام اجنبیت کو ختم کر کے اپنی نصف روٹی تقسیم کی۔ مجھے محسوس کرنا چاہیے تھا یا میں سوچنے کے لئے مجبور تھا کہ بھائی چارہ یا اخوت کا یہ انسانی برتاؤ بغیر کسی احسان یا لالچ و طمع کے تھا۔''[۲۰]

اسد صاحب پر بدو کی اس ملاقات اور روٹی کے ٹکڑے کی پیشکش ایسے زود اثر اور نہ مٹنے والے نتائج مرتب کر سکی جس کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ ''جب میں اس معمولی واقعہ پر غور کرتا ہوں تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ عربی اخلاق سے میری وابستگی اور محبت کی بنیاد اسی دن سے پڑی تھی۔ اس بدو کے رویہ میں جس نے اجنبیت کی تمام دیواروں کے باوجود اپنے رفیق سفر کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی آدھی روٹی اس کو دے دی' انسانیت کی ایک ایسی تصویر اور جھلک تھی جو ہر تصنع اور تکلف سے پاک تھی[۲۱]۔

کچھ دیر بعد غزہ پہنچ گئے۔ میرے بدو ساتھی نے سامان سمیٹا اور ایک باوقار مسکراہٹ کے ساتھ سر کے اشارہ سے مجھے سلام کیا اور باہر چلا گیا۔ دوسرے مسافر نے جس نے ترجمانی کا کام انجام دیا تھا' میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا' آیئے باہر چلیں' ابھی گاڑی چھوٹنے میں ۱۵ منٹ باقی ہیں۔

اسٹیشن کی عمارت کے پیچھے ایک خیمہ میں بدوؤں کا قافلہ موجود تھا جو میرے ہمسفر بدو کو لینے کے لئے آیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے بدو ساتھیوں میں اچھی پوزیشن کا مالک تھا' اس لئے کہ وہ سب لوگ حلقہ بنا کر اس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور اس کے سوالات کے جوابات دے رہے تھے۔ میرے ساتھی تاجر نے ان سے کچھ بات کی جس کے بعد وہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے چہروں پر محبت اور خلوص کے آثار تھے لیکن وہ ہمارے تمدن کو بہت حقارت اور لاپرواہی سے دیکھ رہے تھے۔

اسد صاحب کہتے ہیں کہ وہاں میں نے حریت کی ایک فضا دیکھی اور میرے اندر ان کی زندگی کو سمجھنے کی خواہش پیدا ہو گئی[۲۲]۔ اسد صاحب کہتے ہیں کہ آنے والے مستقبل کے انقلاب اور تغیر کا ایک داخلی شعور شاید اسی دن مجھ میں پیدا ہو گیا تھا۔ یہ پہلا دن جو کسی عرب سرزمین میں بدوؤں کے ساتھ گزارا' ایک ایسی دنیا کا داخلی شعور تھا جس کی کوئی حدود نہیں اور شاید قدرت نے میرے لئے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ وہ زندگی بہت جلد میری اپنی بننے والی ہے۔ اس وقت یہ بات بیان کرنے سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ میں نے اسی وقت محسوس کر لیا تھا کہ مستقبل میں میرے لئے کیا سامان ہو رہا ہے۔

بیت المقدس میں (۱۹۲۲ء)

اسد صاحب اپنے ماموں ڈوریان کی دعوت پر آئے تھے اور بیت المقدس کے قدیم شہر کے اندران کے مکان میں مقیم تھے۔ چونکہ موسم خزاں تھا' اس لئے بارش تقریباً روزانہ ہی ہوتی تھی اور مکان سے نکلنے کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ پاس ہی ایک ''حاجی'' نامی بوڑھے عرب کا مکان تھا۔ یہ حاجی عرب برادری کے لئے کرایہ پر گدھوں کا انتظام کرتا

Marfat.com

تھا' اس لئے یہ مقام قافلوں کے پڑاؤ کی جگہ یا سرائے بن گئی تھی۔ روزانہ فجر سے کچھ قبل قریب کے گاؤں وغیرہ سے پھل اور ترکاریاں اونٹوں کے ذریعہ یہاں لائی جاتیں اور پھر گدھوں پر لاد کر شہر کے بازاروں میں اور تنگ گلیوں میں سپلائی کی جاتیں۔ دن بھر بھاری اونٹ وہاں پڑے رہتے تھے اور بہت لوگ ان کی خبر گیری میں مشغول اور منہمک رہتے تھے۔ یہ لوگ (بدّو) دیکھنے میں فقراء تھے لیکن حقیقت میں وہ آقاؤں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ جب وہ ایک ساتھ کھانے کے لئے بیٹھتے اور تھوڑے سے پنیر یا زیتون کے دانوں کے ساتھ روٹی کھاتے تو میں (اسد صاحب) یہ منظر دیکھ کر ان کی عالی ہمتی' شرافت' قوت برداشت اور ان کے اعتماد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا[۲۳]۔

ان لوگوں کو دیکھنے والا شخص یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا کہ یہ لوگ اپنا احترام اور زندگی کی قدر خود کرتے ہیں۔ حاجی صاحب ان کے سردار معلوم ہوتے تھے' اس لئے کہ وہ سب لوگ بے چون و چرا حاجی صاحب کی فرمانبرداری کرتے تھے۔ دن میں کئی بار وہ لوگ نماز کے لئے جمع ہوتے' حاجی صاحب ان کی امامت کرتے' اپنی حرکات وسکنات میں وہ فوجی معلوم ہوتے۔ اسد صاحب نے نماز اور امامت کے متعلق پہلی دفعہ اپنے تاثرات مرتب کئے:

"The Haji, hobbling around on a stick, for he suffered from arthritis and had swollen knees, was a kind of chieftain among them. They appeared to obey him without question. Several times a day he assembled them for prayer. And, if it was not raining too hard, they prayed in the open. All the men in a single, long row and he as their imam in front of them. They were like soldiers in the precision of their movements. They would bow together in the direction of Mecca, rise again, and then kneel down and touch the ground with their foreheads; they seemed to follow the inaudible words of their leader, who between the prostrations stood barefoot on his prayer carpet, eyes closed, arms folded over his chest, soundlessly moving his lips and obviously lost in deep absorption; you could see that he was praying with his whole soul."

ترجمہ: اسد صاحب نے کہا کہ "حاجی صاحب جو گنٹھیا یا وجع المفاصل کے مریض تھے اور ان کے گھٹنے بھی متورم تھے' لنگڑا کر ایک چھڑی کے ذریعے چلتے پھرتے تھے۔ اپنے ساتھیوں یا مقتدیوں کے امام یا پیشوا تھے۔ وہ لوگ بغیر کسی تامل یا سوال کے حاجی صاحب کی اقتداء کرتے تھے۔ وہ دن میں کئی مرتبہ نماز (عبادت) کے لئے اکٹھا (جمع)

Marfat.com

ہوتے تھے اور اگر بارش شدید نہیں ہوتی تھی تو یہ لوگ کھلے مقام پر نماز ادا کرتے تھے۔ تمام لوگ ایک لمبی صف (قطار) میں کھڑے ہوتے تھے اور حاجی صاحب امامت کے لئے ان کے سامنے کھڑے ہوتے تھے۔ یہ لوگ اپنی حرکات و سکنات میں منظم فوجی سپاہی (عسکری) معلوم ہوتے تھے۔ یہ لوگ مکہ (کعبہ) کی سمت میں کھڑے ہوتے اور رکوع کرتے تھے یعنی اس سمت میں جھکتے تھے اور پھر کھڑے ہوتے تھے اور پھر سجدے میں جاتے تھے اور گھٹنے کے بل زمین پر بیٹھتے اور اپنے ماتھے سے زمین کو چھوتے۔ وہ اپنے امام کے بہت دھیمے یا نا قابل سماعت الفاظ بھی سنتے اور اس پر عمل کرتے تھے وہ زمین پر منہ کے بل (سجدہ سے) اٹھتا اور مصلے پر (قالین پر) ننگے پاؤں کھڑا ہوتا اس کی آنکھیں بند ہوتی تھیں اور ہاتھ سینے پر بندھے ہوتے تھے اور بغیر آواز کے اس کے ہونٹ ہلتے رہتے۔ وہ گہرے جذب میں مستغرق ہوتا تھا۔ وہ اپنی روح اور جسم کے ساتھ پورے انہماک کے ساتھ عبادت کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یعنی تمام نمازی اپنی روح اور جسم کے ساتھ کسی تصور میں مستغرق ہوتے تھے۔'' [۲۴]

اسد صاحب اس گہری جسمانی و روحانی عبادت (نماز) کی حرکات و سکنات کو کچھ نہ سمجھ سکے اور اپنی تشنگی رفع کرنے کے لئے حاجی صاحب (جو تھوڑی بہت انگریزی سمجھتے تھے) سے پوچھا کہ کیا آپ کا خیال ہے کہ خدا اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ آپ بار بار اس کے سامنے قیام' رکوع اور سجود کریں۔ کیا یہ بات بہتر نہیں کہ آپ تنہائی میں بیٹھ کر حضور قلب اور خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھیں۔ آخر یہ جسمانی حرکات کیوں ہوتی ہیں؟

اسد صاحب یہ بات کہہ تو گئے مگر ندامت ہوئی اور ان کے ضمیر نے ملامت بھی کی کہ شاید اس بوڑھے مذہبی آدمی کے شعور و احساس کو کوئی اذیت پہنچے لیکن حاجی صاحب کے چہرے پر ناگواری کے آثار نہ پائے۔ وہ مسکرائے اور کہنے لگے:

''پھر آپ ہی بتائیں کس طریقہ پر ہم خدا کی عبادت کریں؟ کیا اس نے جسم اور روح کو ایک ساتھ پیدا نہیں کیا؟ اگر یہ بات ہے تو کیا یہ ضروری نہ ہوگا کہ آدمی جس طرح اپنی روح کے ساتھ نماز پڑھتا ہے' اسی طرح اپنے جسم کے ساتھ بھی پڑھے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں ہم مسلمان اس طرح کیوں نماز پڑھتے ہیں؟'' [۲۵]

''ہم کعبہ کی طرف اس احساس کے ساتھ رخ کرتے ہیں کہ تمام دنیا کے مسلمان اسی طرف رخ کئے ہوئے ہیں اور تمام مسلمان ایک جسم ہیں اور خدا ہی ہم سب کی فکر کا محور و مرکز ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت اس لئے کرتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ پھر ہم اللہ اکبر کہتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ خدا کے سوا اور کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ اور پھر رکوع و سجود وغیرہ اس لئے اور اس احساس کے ساتھ کرتے ہیں کہ ہم اس (خدا) کے سامنے خاک کے برابر بھی نہیں اور اسی طرح تمام ارکان ادا کر کے سلام پھیرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ہمارے نبی محمدؐ پر جنہوں نے ہمیں اسلام پہنچایا' اپنی رحمت نازل کر' اسی طرح اور دیگر انبیاء اور دنیا کے تمام صالحین کو سلام بھیجتے ہیں' خواہ وہ کہیں اور کسی حالت میں ہوں۔'' [۲۶]

''اسی طرح ہمارے نبیؐ نماز پڑھتے تھے' ہر زمانہ کے لئے انہوں نے اپنے مقتدین کو نماز کا یہی طریقہ بتایا

Marfat.com

ہے جو اسلام کے معنی ہیں اور خدا کی طرف سے ہے تاکہ اپنے انجام و مستقبل کی طرف سے اطمینان اور سکون حاصل کر سکیں۔"

حاجی صاحب نے ٹھیک یہی الفاظ تو نہیں کہے تھے لیکن ان کا مفہوم یہی تھا۔ اس واقعے پر چند سال گزرنے کے بعد اسد صاحب نے محسوس کیا کہ حاجی صاحب کی اس گفتگو نے میرے لئے اسلام قبول کرنے کا پہلا دروازہ کھولا تھا۔

"The old man did not, of course, use exactly these words, but this was their meaning, and this is how I remember them years later, I realized that with this simple explanation the Hajji had opened to me the first door to Islam."

ترجمہ: "بوڑھے آدمی نے یقیناً یہ الفاظ نہیں کہے تھے لیکن ان الفاظ کے معنی یہی تھے اور یہی چیز ہے جسے میں نے دہرایا (یاد کیا) ہے' سالوں بعد مجھے محسوس ہوا کہ اس کی سادہ تشریح نے یعنی حاجی صاحب کی سادہ اور معمولی وضاحت نے مجھے یا میرے لئے پہلی مرتبہ اسلام کا دروازہ کھولا تھا۔ یعنی مجھے اسلام میں داخل ہونے کی ترغیب دی تھی۔"[27]

اسد صاحب کہتے ہیں کہ اس وقت میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسلام میرا دین بن سکتا ہے میں اپنے اندر ایک غیر معمولی کشش اور جھکاؤ محسوس کرتا تھا۔ جب میں کسی مسلمان کو (اور ایسا اکثر ہوتا تھا) ننگے پیر مصلے پر' چٹائی یا زمین پر محو نماز پاتا تھا' سر جھکائے ہوئے اپنے کام میں بالکل مستغرق' اپنے ماحول سے بالکل بے نیاز' وہ ہر جگہ (نماز کی حالت میں) ایک مطمئن انسان نظر آتا تھا۔ غرض یہ کہ میرا میلان طبع اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی طرف تھا۔

اسد صاحب کا صحافت سے تعلق

"ایک شام میں اپنے کاغذات درست کر رہا تھا کہ یکا یک مجھے وہ پریس کا کارڈ ملا جو ایک سال قبل برلن میں مجھے یونائیٹڈ ٹیلیگراف کے نمائندے کی حیثیت سے دیا گیا تھا۔ میں اس کو پھاڑنے جا رہا تھا کہ ڈوریان نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مذاق میں کہا...... اس کو پھاڑو نہیں' یہ بہت کام کی چیز ہے۔ اگر تم اسے ہائی کمشنر کے دفتر میں پیش کرو تو تمہیں گورنمنٹ ہاؤس سے دعوت نامہ مل سکتا ہے۔ اس مخلوق (اخبار نویس) کی یہاں بہت قدر ہے۔ اگرچہ میں نے اس کارڈ کو بے کار سمجھ کر چاک تو کر دیا لیکن ڈوریان کی بات مجھ پر اثر کر گئی۔ خصوصاً ان حالات میں جب کہ وسطی یورپ کے بہت کم لوگ (اخبار نویس) یہاں آتے تھے۔ اب میں نے دوبارہ صحافت میں قدم رکھنے کا ارادہ کیا۔

"اگرچہ میں نے ایک سال تک یونائیٹڈ ٹیلیگراف میں کام کیا تھا لیکن ابھی تک کسی ممتاز اخبار سے میرا

Marfat.com

تعارف نہیں تھا اور ابھی تک میرا کوئی مضمون بھی اخبار میں نہیں چھپا تھا' اس لئے میں اخباری دنیا میں غیر معروف تھا۔ لیکن ان چیزوں کی وجہ سے میرے عزم میں کوئی کمی یا کمزوری نہیں آئی۔ لہٰذا میں نے فلسطین کے بارے میں اپنے خیالات و تاثرات پر مشتمل ایک مضمون لکھا اور اس کی نقول جرمن کے کم از کم دس اخبارات کو بھجوا دیں۔ اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا جس میں مشرق وسطیٰ کے سلسلہ میں آئندہ مضامین کی پیشکش بھی تھی۔ ۱۹۲۲ء کے آخر میں جرمنی کے لئے افراط زر کا مسئلہ باعث تکلیف بنا ہوا تھا اور جرمن اخبارات بھی اپنی بقا کے لئے کفایت شعاری سے کام لے رہے تھے' اس لئے صرف چند اخبارات ایسے تھے جو اپنے غیر ملکی نامہ نگاروں کو hard currency میں تنخواہ دے سکتے تھے۔ تمام اخبارات نے یکے بعد دیگرے میری پیش کش کو مسترد کر دیا۔ صرف ایک اخبار نے میری ہمت افزائی کی اور میرے مضمون سے متاثر ہو کر مشرق وسطیٰ میں مجھے اپنا گشتی نمائندہ مقرر کر لیا۔ ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیا کہ مجھے واپسی کے بعد ایک کتاب بھی لکھنا ہوگی۔ یہ اخبار Frankfurter Zeitung تھا۔ اخبارات سے مایوس کن اور حوصلہ شکن جوابات نے میرے عزائم میں تزلزل پیدا کیا' لیکن اس کی پیشکش نے میری ڈھارس بندھائی۔ افراط زر کی وجہ سے یہ اخبار بھی hard currency میں مجھے ادائیگی نہیں کر سکتا تھا' اس لئے اس نے جرمن سکے میں ادائیگی کی۔ میں جانتا تھا اور اخبار کے منتظمین بھی جانتے تھے کہ یہ رقم اتنی بھی نہیں تھی کہ میرے مضامین کے ڈاک کے خرچ کی کفالت بھی کر سکے لیکن اس اخبار کا نمائندہ ہونا بجائے خود ایک امتیاز تھا جو ان وقتی مشکلات سے زیادہ وقیع اور وزنی تھا۔ میں نے اس توقع پر فلسطین کے متعلق مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر دیا کہ دیر یا سویر قسمت میرا ساتھ دے گی۔" [۲۸]

اسلامی تہذیب کی روح اور اسد صاحب کا متاثر ہونا

اسد صاحب لکھتے ہیں کہ ان ابتدائی مہینوں میں جو میرے اس پہلے زمانہ قیام میں گزرے' میرے اندر توقعات' تاثرات' افکار اور امید و بیم کا ایک طویل سلسلہ قائم ہو گیا جس میں سے بعض توقعات جو شخصی طرز کی تھیں' میرے شعور کے اندر نفوذ کرنے کے لئے کوشاں تھیں۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے کوئی گرم اور حرارت انگیز روح ہے جو ان عربوں کے خون کے ساتھ ان کے افکار اور حرکات و سکنات میں سرایت کر گئی ہے۔ روحانی خراشوں اور اذیتوں سے ناآشنا' وہ اذیتیں جنہوں نے خوف' حرص' طمع اور گھٹن کا دیوتا بن کر مغربی زندگی کو بے حد بھدی' بے ہنگم اور کریہہ المنظر بنا دیا تھا اور جس سے اب کوئی خاص امید باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اب حالات نے میرے لئے زندگی کا ایک ایسا مفہوم پیدا کیا جو میرے لئے یکسر نیا تھا۔ میں عربوں میں وہ چیز پانے لگا جس کی غیر شعوری طور پر مجھے عرصہ سے تلاش تھی؛ جس کو زندگی کے مسائل میں ایک خاص قسم کی جذباتی لطافت اور بلند شعوری احساس سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ اب میرے سامنے سب سے مقدم کام یہ تھا کہ میں مسلمانوں کی روح (spirit) کو سمجھ سکوں۔ اس لئے نہیں کہ ان کے دین کے متعلق میرا کچھ میلان طبع تھا (بلکہ اس لئے کہ میں اس کے متعلق بہت کم معلومات رکھتا تھا)۔ نیز یہ کہ میں نے ان میں عقل اور احساسات کا وہ عضوی اور حیاتی اتحاد و ہم آہنگی

Marfat.com

(Organic coherence) دیکھی جس کو اہل یورپ بھلا چکے تھے۔ہمیں (اہل یورپ کو) شخصی ہم آہنگی کے فقدان سے جو کچھ بھگتنا پڑا ہے' کیا ہم عربوں کی زندگی کے صحیح مطالعہ سے اس کے اور اس کے اسباب کی درمیانی کڑی کا پتہ نہیں لگا سکتے؟ کیا ہمیں وہ چیز (شے) میسر نہیں ہو سکتی جس کی وجہ سے اہل یورپ اس مقدس زندگی کی حریت و آزادی سے فرار کر رہے ہیں' جو ابھی عربوں کے اندر ان کے اس انحطاط اور سیاسی و اجتماعی زوال کے باوجود پائی جاتی ہے اور یہ شے گزشتہ ادوار (ایام ماضی) میں اہل یورپ میں بھی پائی جاتی تھی۔اہل یورپ اب بیتھوون (Beethoven) اور رمبرینٹ (Rembrandt) جیسے فنکاروں کو جنم دینے سے معذور ہو چکے ہیں اور اس کی بجائے مغربی اقوام کا صرف یہ کام رہ گیا ہے کہ علوم و فنون' سیاست و اجتماع کے پیش پا افتادہ اصولوں کو مختلف تعبیرات اور اسالیب سے ایک بے پناہ اور پُر جوش کوشش کے ساتھ دہراتے رہیں[۲۹]۔جنگ اور پھر اس کے بعد بہت سے فنکارانہ طریقہ سے تراشے ہوئے نت نئے اصولوں کی مختلف اور متضاد آوازوں کی وجہ سے ضمیر و دماغ میں ایک زبردست کشمکش اور کھینچ تان ہے۔ہم (اہل یورپ) اور ہماری ایجادات' مشینیں اور آلات اور آسمانوں سے سرگوشیاں کرنے والی عمارتیں ہماری پاش پاش اور ریزہ ریزہ روح کو پھر سے جوڑنے میں بالکل ناکام ثابت ہوئی ہیں۔اسد صاحب کے خیال میں یورپ کی روحانی عظمت کی حقیقت ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی ہے۔کیا اس صورت میں یہ ممکن نہیں کہ اصل مرض (غلطی) کا کھوج لگا کر تھوڑی بہت کھوئی ہوئی عظمت اور وقار کو واپس لایا جا سکے؟

اسد صاحب نے مزید لکھا ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپ کے اخلاقی' معاشرتی اور روحانی انحطاط نے گانے بجانے' مصوری اور تھیٹر کی طرف توجہ کی اور انہیں مصنوعی طریقوں سے اپنے غم کو فرحت و انبساط میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔اس کوشش میں وہ کسی حد تک کامیاب تو ہوئے مگر وہ روحانیت جو اصل میں انسان کے سکون و اطمینان کا سرچشمہ ہے' وہ اس کی جانب متوجہ نہ ہوئے۔اب اہل یورپ کا ایک ہی نصب العین تھا۔وہ یہ کہ کسی طرح (جا دبے جا) زیادہ سے زیادہ دنیاوی فوائد ولذائذ حاصل کئے جائیں۔اس بنیادی تبدیلی کی وجہ سے یورپ میں رہنے والا ہر فرد خود غرضی اور نفس پرستی کا پجاری بن گیا[۳۰]۔

اسد صاحب لکھتے ہیں کہ ابتدا میں تو عربوں سے میری ہمدردی اور لگاؤ عربی معاشرہ کی ظاہری صورت اور قلبی طمانیت (Emotional security) تک محدود رہی جس کو میں نے خاص طور پر محسوس کیا تھا' لیکن حالات و واقعات نے میرے اندرونی احساسات اور جذبات میں تلاطم پیدا کیا اور اب مجھ میں اس قلبی طمانیت اور اندرونی سکون و اطمینان کا سبب و سرچشمہ معلوم کرنے کی شدید خواہش پیدا ہونے لگی تھی۔یہ خواہش میرے نفسیاتی اور ذاتی و شخصی مسائل کے ساتھ بالکل گھل مل گئی تھی۔میں نے عربوں کی تاریخ' کلچر' مذہب اور دیگر رسم و روایات کا قریب سے مطالعہ کرنا شروع کیا اور میں نے اس شے کی دریافت وطلب میں زیادہ انہماک و تلاش شروع کر دی جو ان (عربوں) کے احساسات و جذبات اور عقلیت کے پیچھے کارفرما تھی۔میرے ایک اور جذبے نے مجھے ان حرکات و اسباب کی دریافت کے پیچھے لگا دیا جو میرے دل و دماغ کو ہلا رہا تھا اور میرے اوپر چھا رہا تھا اور ہمہ وقت میری رہنمائی کے لئے

Marfat.com

بھی آمادہ تھا[31]۔ اسد صاحب نے اسلامی عبادات پر بحث کرتے ہوئے یوم جمعہ پر اپنے خیالات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے: آپ نے جمعہ کے دن کا مقابلہ اتوار (Sunday) سے کرتے ہوئے کہا ہے کہ اتوار کو یورپ میں نہ صرف دکانیں بند رہتی ہیں بلکہ ایک عام تعطیل ہوتی ہے اور پورے ملک میں عام بے رونقی پائی جاتی ہے۔ آپ کے خیال کے مطابق اہل یورپ کے لئے ہفتہ کا ہر دن ایک بے جا بوجھ سمجھا جاتا ہے' جس سے صرف اتوار ہی نجات دلاتا ہے۔ ان کے لئے یہ دن آرام وسکون کا نہیں بلکہ زندگی سے فرار اختیار کر کے ایک قسم کا فریب کارانہ ''خود فراموشی'' میں پناہ لینے کا دن ہوتا ہے۔

اس کے برعکس عربوں کے لئے جمعہ اپنے کام کو بھول جانے کا دن ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جدوجہد سے جی چراتے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی محنت' خواہ کتنی ہی زیادہ ہو'ان کے ذاتی احساسات کے درمیان کوئی مغائرت پیدا نہیں کرتی۔ ان کے ہاں کام' کام کی غرض سے نہیں کیا جاتا' اس لئے مزدور اور کام کے درمیان ایک گہرا رابطہ ہے۔ یہاں ایک انسان صرف اسی وقت آرام کرتا ہے جب وہ تھک جاتا ہے' اس لئے جمعہ کو لازمی تعطیل کا دن قرار نہیں دیا'[32] بلکہ یوم جمعہ کے متعلق قرآن کریم کا فیصلہ مندرجہ ذیل ہے:

فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللّٰہ واذکروا اللّٰہ کثیراً لعلکم تفلحون٥ (۱۰:۶۲)

(ترجمہ: جب نماز (جمعہ) پوری ہو چکے تو اس وقت تم کو اجازت ہے کہ تم زمین پر چلو پھرو (پھیل جاؤ) اور خدا کی روزی تلاش کرو اور اس میں بھی اللّٰہ کو بکثرت یاد کرتے رہو' تاکہ تم کو فلاح ہو۔)

نماز اور نظم وضبط

اسد صاحب بیان کرتے ہیں کہ جب امام ارکان نماز ادا کرتا تو سارے مقتدی بھی اس کی اقتدا کرتے' یعنی جب امام رکوع' سجود' قیام اور قعدہ وغیرہ کرتا تو تمام مقتدی بھی ویسا ہی کرتے اور سجدے میں جا کر اللّٰہ کے حضور سر بہ سجود ہو کر اپنی بے بسی اور کم مائیگی کا عملی اظہار یا مظاہرہ کرتے۔ اس عمل کے نتیجہ میں اسد صاحب کو احساس ہوا کہ ان لوگوں کا مذہب اور ان کا خدا' ان سے کس قدر قریب ہے اور ان کی عبادت ان کے معمولات سے کوئی الگ تھلگ یا بے تعلق چیز نہیں ہے' بلکہ وہ اسی کا جزو لاینفک ہے۔ اسد صاحب نے اپنے دوست سے کہا کہ کاش میں بھی اسی طرح سمجھتا۔ اس نے کہا کہ میرے بھائی! اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ کیا ہمارا خدا ہماری شہ رگ سے زیادہ قریب نہیں ہے؟

و نحن اقرب الیہ من حبل الورید (القرآن۔ پ۲۶۔ س۔ق۔ ر۔۲۔ آیت ۱۶)

(ترجمہ: اور ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ۔)

مندرجہ بالا آیت کریمہ سے یہ بات صاف اور واضح ہو گئی کہ دیگر مذاہب کی طرح اسلام میں جمعہ کا دن کسی

Marfat.com

جبری چھٹی کا دن نہیں ہے بلکہ ادائیگی نماز کے بعد معمولاً کام کاج کرنے کا حکم ہے۔

دیگر سفروں کے حالات

سطور بالا میں اسد صاحب کے سفروں کے مختصر حالات بیان کئے گئے ہیں' اس جگہ یہ بات واضح کرنا مقصود ہے کہ اسلام لانے سے قبل محمد اسد صاحب نے مختلف مقامات اور شہروں کے سفر کئے اور ان سفروں میں انہوں نے عینی مشاہدات اور ذاتی تجربات بھی کئے مثلاً قیام ایران میں شیعیت اور رضا شاہ پہلوی کے سیاسی عروج وحصول اقتدار کا بہ غور مطالعہ کیا' مثلاً رضا شاہ' جرمن قونصل میں ایک معمولی پہرہ دار (چوکیدار) تھا۔ جنگ عظیم اول کے بعد بالشویک تحریک نے روس میں زور پکڑا اور کمیونسٹوں نے ایران کے صوبہ گیلان میں بغاوت کی۔ رضا شاہ نے اس موقع پر دلیری اور جوانمردی کا مظاہرہ کیا' جس کے نتیجے میں ایرانی سپاہ کامیاب ہوئی۔ اس کامیابی کے صلہ میں رضا شاہ کو ترقی دے کر کیپٹن بنا دیا گیا۔ مختصر یہ کہ رضا شاہ نے ۱۹۲۱ء سے ایران کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور ۱۹۲۴ء میں کچھ ساتھیوں کی سازش سے پہلے وزیر اعظم ہوا اور پھر بادشاہ ہوگیا۔ رضا شاہ خواندہ نہ ہونے کے باوجود قائدانہ صلاحیتوں کا حامل تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اسد صاحب نے ایرانیوں کے مذہبی عقائد' خلافت علیؓ حسنؓ اور بعدہ حسینؓ کی مظلومیت اور ان کی شہادت عظمیٰ کا بھی بغور مطالعہ کیا۔ شیعوں کے غالی فرقہ کو بھی دیکھا جنہوں نے واقعات کربلا اور دیگر حادثات کو رنگ دے کر اور بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے' مگر اس کے باوجود انہوں نے (اسد صاحب) اسلام کی اساس اور بنیاد یعنی تصور توحید ورسالت پر ایمان وایقان کو مضبوط ومستحکم بنایا۔ نیز غیر اسلامی عقائد' رسم ورواج' روایات وحکایات کا کوئی اثر نہ لیا[۳۲]۔ مزید برآں اسد صاحب نے روس کے مقامات بخارا' تاشقند' ترکمان' مرو (Merv) اور پھر ماسکو کی سیاحت کی۔ نیز سوشلسٹ ری پبلک کی بینر بوزھنگی (Godless Association) کا ایک اشتہار پڑھا جس میں تحریر تھا کہ (نعوذ باللہ) خدا کو آسمان سے نکال دیا یا مٹا دیا وغیرہ وغیرہ۔ یہی نہیں بلکہ اس خدا کی انکاری جماعت نے مقامات مقدسہ (مساجد' دینی درس گاہ ودرگاہ وغیرہ) کی بھی بے حرمتی کی اور خنزیر وغیرہ جیسے حرام جانوروں کو کاٹ کر ان کے اندر پھینکا۔ غرض یہ کہ اسد صاحب نے دور عصر کے تمام سیاسی' معاشی' مذہبی' مقامی اور نسلی عقائد وحالات کا کما حقہ' جائزہ لیا[۳۳]۔

مشرق وسطیٰ کی سیاسی زندگی اور مقامی حالات کو سمجھنے کے بعد اسد صاحب ۱۹۲۴ء کی گرمیوں میں بیت المقدس واپس آگئے۔ آپ کا ارادہ فلسطین میں زیادہ دیر تک قیام کرنے کا نہ تھا۔ اس مرتبہ بھی جیکب ڈی ہان (Jacob de Haan) نے ان کی مدد کی اور ڈی ہان کی مدد اور سفارش سے موصوف دو چھوٹے اخبارات سے معاملہ طے کرنے میں کامیاب ہوگئے جن میں ایک اخبار ہالینڈ کا اور دوسرا پولینڈ کا تھا۔ یہ اخبارات آپ کو معمولی معاوضہ دیتے تھے۔ اس سے چند ماہ پیشتر بیت المقدس میں دمشق کے ایک مدرس سے اسد صاحب کی ملاقات ہوئی تھی۔ مدرس نے آپ کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ دمشق پہنچ کر اسد صاحب نے مدرس موصوف کا پتہ لگایا

Marfat.com

اوران کے گھر پہنچے۔ مدرس نے اپنے روایتی انداز میں اسد صاحب کا خیر مقدم مرحبا کہتے ہوئے کیا اور بہت محبت و عقیدت سے بغلگیر ہوئے۔ دمشق پہنچ کر اسد صاحب کو عربوں کے اندرونی سکون و اطمینان قلبی کا سراغ مل گیا۔ دراصل یہ سکون عربوں کے برتاؤ اوران کے تمدن کا نتیجہ تھا' جو وہ ایک دوسرے کے ساتھ معاملات اوراخلاق سے پیش آتے تھے۔ نیز ان کے اس عمل کے پیچھے سوائے انس ومحبت کے کوئی اور جذبہ کارفرمانہ تھا۔ دمشق میں اسد صاحب نے بیشتر ایام اسلامی کتب کے مطالعہ میں گزارے۔ عربی سے ان کی واقفیت معمولی تھی' تکلف سے اپنا مافی الضمیر ادا کر لیتے تھے' لیکن قرآن وحدیث کا براہ راست مطالعہ نہیں کر سکتے تھے اوراس سلسلہ میں انہیں فرانسیسی اور جرمنی ترجموں سے مدد لینی پڑتی تھی' جوان کو ایک کتب خانہ سے مستعار مل گئے تھے۔ ان مطالعوں اور گفتگوؤں سے اسد صاحب پر جو بھی تاثرات یا نتائج مرتب ہوئے ہوں گے' وہ ان کا اپنا ذاتی تجربہ اور تجزیہ تھا۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ ان کی نگاہوں سے ایک پردہ ساہٹ گیا اورانہوں نے افکار کی ایک ایسی دنیا کا مشاہدہ کیا جس سے وہ اب تک مطلق ناواقف تھے۔

اسد صاحب کے سامنے' اسلام دین کی رواجی یا اصطلاحی مفہوم سے زیادہ زندگی کا مکمل نظام بن کر ان کے سامنے آیا اور یہ نظام لاہوتی نظام سے زیادہ شخصی اور اجتماعی سلوک (مسلک) کا ایک پروگرام اور لائحہ عمل معلوم ہوا جس کی بنیاد خدا پر تھی۔ انہوں نے اسلام میں (قرآن کے مطابق) کسی جگہ چھٹکارے کا تصور بھی نہیں پایا۔ یہاں کوئی پہلا موروثی گناہ بھی نہیں تھا جو انسان کی قسمت یا تقدیر کے درمیان حائل ہو گیا ہو۔ یہاں تو دین کا واضح اور صاف تصور قرآن تھا۔

و ان لیس للانسان الا ما سعی (القرآن۔پ۲۷۔س۔النجم۔آیت ۲۷)

(ترجمہ: اور یہ کہ ایمان (عمل) کے بارہ میں انسان کو اپنی ہی کمائی ملے گی۔)

قرآن صرف روحانی معاملات کے سلسلہ میں ہی راہ نمائی نہیں کرتا بلکہ زندگی کے بعض ان شعبوں میں بھی اہتمام کے ساتھ رہنمائی کرتا ہے جو لاعلم یا کم علم افراد کو بہت حقیر اور دنیاوی معلوم ہوتے ہیں۔ قرآن کا مزاج تو یقیناً روحانی ہے لیکن مادی خوشحالی و فارغ البالی قرآن کے نزدیک مستحسن اور مستحب ہے۔ اسد صاحب نے خود اپنے آپ سے سوال کیا کہ کیا یہی تعلیمات تو اس قلبی طمانیت (Emotional security) کا باعث تو نہیں جس کا انہوں نے عربوں میں رہ کر اس مدت میں مشاہدہ کیا ہے [۳۴]۔

غرض یہ کہ اسد صاحب نے مشرق وسطیٰ اور دیگر مقامات کے مخصوص شہروں اور ملکوں مثلاً عمان' شام' حیفہ' استنبول' میٹولا' بنیاس' مجدالاشمس' افغانستان وغیرہ کی سیاحت کی اوراس طرح تقریباً اٹھارہ ماہ عرب ممالک میں بسر کئے۔ اس درمیان میں آپ نے مغربی تمدن و معاشرت کا مقابلہ مشرقی تمدن و معاشرت سے کیا اوراس کے بعد ہی اسلام کے فلسفہ حیات کا مطالعہ بھی شروع کیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد دیگر اسلامی ممالک اور کمیونسٹ ممالک کے بھی سفر کئے۔ ان سفروں میں آپ کو مختلف مشاہدات اور واقعات پیش آئے۔ ان پیش آمدہ حالات و مشاہدات نے آپ کو اسلام قبول کرنے میں بڑی مدد کی۔

Marfat.com

محمد اسد صاحب کا مختصر تعارف ختم کرنے سے پہلے ہم ان کے متعلق یہ بات بتلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ محمد اسد صاحب نے اسلام قبول کرنے کے بعد نہ صرف اپنی زندگی اور معمولات کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی بلکہ آپ نے حتی المقدور اسلام کی خدمات کی بجا آوری کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل اور ایک مشن کی حیثیت سے انجام دینا اپنے لئے باعث راحت ونجات سمجھا۔آپ کے مختصر کارنامے اور علمی خدمات کا تذکرہ ہم نے زیر نظر کتاب کے مقدمہ میں اور دیگر جگہ موقع محل کی مناسبت سے کیا ہے۔تاہم یہ بات ابھی تشنہ اور وضاحت طلب ہے کہ آپ نے پاکستانی مندوب کی حیثیت سے سبکدوش ہونے کے بعد کیا کارنامے انجام دیئے۔ہمیں اس سلسلہ میں تفصیلات تو نہ مل سکیں، مگر یہ بات معتبر ذرائع سے معلوم ہوئی ہے کہ آپ جنیوا اور بیروت نیز دیگر ممالک میں اسلامی خدمات انجام دیتے رہے ہیں اور اس درمیان میں آپ کا رابطہ اہل علم اور علماء سے بھی قائم رہا ہے۔اس بات کی مزید تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ اپریل ۱۹۷۶ء کو لندن میں ہلٹن ہوٹل کے ٹیوٹر گارڈین روم میں اسلامک مندوبین کی جو کانفرنس ہوتی رہی ہے، اس کانفرنس میں ٦- اپریل ۱۹۷۶ء کو سوسائٹی ہال میں جناب محمد اسد صاحب نے ایک بصیرت افروز مقالہ بعنوان ''قرآن اور اس کا پیغام'' کے موضوع پر پڑھا[۳۵]۔اس مقالہ کے مضمون اور اس کے عنوان سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ موصوف اسلام اور دین کی خدمت کس عقیدت اور جذبے کے ساتھ انجام دے رہے ہیں اور ہماری رائے کے مطابق نومسلموں میں تو شاید و باید ہی کوئی فرد اسلام کی خدمت اس جوش ولگن کے ساتھ انجام دے جیسا کہ موصوف کی خدمات سے پتہ لگتا ہے، بلکہ اس کے برعکس پشتینی مسلمانوں میں بھی ایسے افراد شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں جو موصوف کی طرح اسلام اور دین کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیں۔اللہ تعالیٰ اس مرد جلیل کو عمر دراز اور صحت کلی کی دولت سے نوازے تاکہ موصوف اپنی خدمات جلیلہ کو قائم و دائم رکھ سکیں اور دوسرے لوگوں کے لئے درس عبرت بھی بنیں۔آمین۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

نبی کی دعوت

باب دوم میں اسلام کی ابتدا، عروج وترقی پر بحث کی گئی ہے۔اب ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور اس نظام کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں جہاں کہ سسکتی ہوئی اور بھٹکی ہوئی دکھی دنیا نے امن وآشتی کا دور دورہ دیکھا۔

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کی بعثت بیان کی جاتی ہے[۳۶]۔انسانوں کی تقسیم ان کے عقائد اور مذاہب کی پیروی کی بنیادوں پر قائم کی جائے تو دو گروہ بنتے ہیں:

(الف) وہ گروہ یا طبقہ جن پر الہامی کتب یا شریعت الٰہی کا اطلاق ہوتا ہے۔بہ الفاظ دیگر جن کا ذکر قرآن کریم میں بہ حیثیت امت موجود ہے اور ان گروہوں یا امتوں میں الہامی کتب کے ساتھ وقتاً فوقتاً انبیاء ورسل بھی نازل (پیدا)

Marfat.com

ہوتے رہے۔

(ب) تمام غیر مسلم یا وہ گروہ جن پر الہامی کتب نازل نہیں ہوئیں اور جن کا ذکر قرآن مجید میں بہ حیثیت امت کے نہیں ہے۔ نیز ان پر پیغمبر یا شریعت کے نازل ہونے کا ذکر بھی قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔ ۳۶

ہر نبی، پیغمبر، رسول یا ہادی نے اپنے پیغام میں انسانوں کو دعوت توحید (اللہ کی غلامی یا بندگی) دی اور اس دعوت کا مقصد یہ تھا کہ انسان اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں خواہ وہ مذہبی ہو، سیاسی ہو، اجتماعی ہو، انفرادی ہو، اقتصادی ہو، معاشی ہو، اخلاقی ہو یا کوئی اور ہو، تمام امور یا کسی امر میں بھی انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی شریعت پر عمل پیرا ہو کر اپنی اور معاشرہ کی زندگی کو فلاحی اور اصلاحی بنائے، تاکہ دنیا میں بسنے والا ہر انسان، امن و امان، عدل و انصاف اور بنیادی حقوق کو حاصل کرنے میں آسانی اور ہمسری پا سکے۔ چنانچہ ہر نبی یا پیغمبر نے دنیا والوں کے لئے اپنی دعوت میں پیغام الٰہی پہنچایا، وہ یہ کہ اللہ اور صرف اللہ کی بندگی کرو، نیکی کا حکم کرو، برائیوں سے خود بھی بچو اور دوسروں کو بھی بچاؤ۔ ہر نبی یا پیغمبر کی بعثت کے خاص مقاصد تین تھے: اول توحید، دوم رسالت اور سوم آخرت کے محاسبہ کا تصور۔ ان ہی بنیادوں پر تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی دعوت کو عام کرتے رہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جتنے بھی پیغمبر آتے رہے، ان کا پیغام مجملہ بنی نوع انسان کے لئے نہیں تھا۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی ہدایت و رہنمائی کے لئے بھیجے گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام نصاریٰ (عیسائیوں) کی فلاح و بہبود کے لئے آئے اور اسی طرح ہر پیغمبر نے اس زمانہ اور خاص مقام کے افراد کو خیر و شر سے آگاہ و متنبہ کیا، لیکن ان پیغمبروں اور دیگر پیغمبروں پر جو پیغام الٰہی نازل ہوا وہ من و عن یا اس کی اصل شکل میں محفوظ نہ رہ سکا اور ان کی امتوں یا پیروکاروں نے ان کی وفات کے بعد اس میں ترمیمات و تحریفات کر دیں۔ اس لئے وہ اصل شکل میں نہ رہ سکا۔

نبی آخر الزماں محمدؐ پر جو شریعت نازل کی گئی، وہ قرآن کریم ہے۔ اس الہامی کتاب کو محفوظ و مامون رکھنے کا وعدہ بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لیا، جیسا کہ خود قرآن نے کہا ہے کہ:

بل ھو قرآن مجید۔ فی لوح محفوظ (۸۶:۲۱-۲۲)

(ترجمہ: قرآن ایسی چیز نہیں جو جھٹلانے کے قابل ہو، بلکہ وہ ایک باعظمت قرآن ہے جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔) ۳۷

یہ وعدہ صرف وعدہ کی حیثیت کا حامل نہیں بلکہ قرآن کے دیگر معجزات میں سے ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ اس کے ہزاروں لاکھوں حفاظ دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، جن کو قرآن کریم لفظ بہ لفظ مع مخرج و اعراب صحیح صحیح یاد ہے اور اس کی سالانہ یاد دہانی باقاعدگی کے ساتھ ہر سال رمضان المبارک میں بغیر کسی کی تاکید و عمل کے خود بخود ہوتی ہے۔ اس کی تفصیلات میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ صرف یہ ایک ہی معجزہ ایسا ہے جو دانا و نادان پر روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ لہٰذا نبی صلعم کی دعوت کو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف دائمیت عطا کر دی ہے بلکہ اس دین کو مکمل و اکمل کر کے قیامت تک کے لئے پسند کر لیا گیا ہے اور روئے زمین پر بسنے والے ہر انسان کو اسے قبول کرنے کی دعوت عام ہے۔

Marfat.com

دین کی اس اکملیت کا اعلان بھی رسول صلعم نے اپنی زندگی میں ہی فرما دیا تھا۔ وہ یہ ہے کہ:

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناo

(ترجمہ: آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا۔)[۳۹]

اس آیت کریمہ سے تین چیزیں واضح ہوتی ہیں: (الف) دین کی اکملیت (ب) انعام کو تام (تمام) کرنا اور (ج) اسلام کا پسند کرنا۔

الف: دین کی اکملیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد کسی اور دین کی ضرورت باقی نہیں اور اب قیامت تک کوئی دوسرا دین نہیں آئے گا۔

ب: انعام کو تمام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ امت محمدیہ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے تمام انعام و اکرام سے نوازا جائے گا اور احکام الٰہی کی بجا آوری پر وہ دین و دنیا میں کامیاب و کامران ہوگی۔

ج: اسلام کو پسند کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو دوام اور ہمیشگی عطا کر دی۔

اسلام کے لفظی معنی سلامتی یا تسلیم کرنے کے ہیں۔ یعنی یہ دین سلامتی اور اطاعت کے راستہ پر گامزن کرتا ہے اور اس کے پیروؤں کو ہی مومن یا مسلمان کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ حلقہ اسلام میں آنے کے بعد دنیاوی ہر ایک حدود و قیود کٹ جاتی اور ٹوٹ جاتی ہے۔ اسلام کا رشتہ نہ صرف تمام رشتوں سے (رنگ و نسل، جغرافیائی، تاریخی) اعلیٰ و ارفع ہے بلکہ حقوق اور مساوات کے اعتبار سے کسی مسلمان کا دوسرے مسلمان پر تفوق یا بڑائی تسلیم نہیں کرتا ہے۔ اسلام کے نزدیک بادشاہ و رعایا، امیر و غریب، حاکم و محکوم سب ہی برابر ہیں اور ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک کرنے کا حکم نہیں ہے۔ اس امر کی زندہ مثال شاہ فیصل کے قاتل، شہزادہ فیصل بن سعود کے قصاص کی ہے۔ جسے ۱۸ جون ۱۹۷۵ء کو برسر عام اسلامی احکامات کے تحت قتل کر دیا گیا۔ اسلام کی تعلیم اور نبی صلعم کی دعوت ایک ہی چیز ہے۔ محترمہ مریم جمیلہ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس کا خلاصہ پیش کیا ہے:

"The most essential belief in Islam is the concept of man as the "slave of God". The Arabic word for slave of God is "Abdullah" which is among the commonest names in every Muslim country. "Islam" itself means literally "submission to will of Allah" and all who choose to do so are Muslims. Since God is the supreme and only sovereign of the universe, the Christian concept of "Division of Church and State" appears utterly illogical to the Muslim mind. The purpose of Islamic rule is to enforce the law of God in the Quran

Marfat.com

and Sunnah."

"The Islamic way of life is based upon transcendental values, morality and truth are absolute, eternal and universal. They are instituted by God and not by man. Therefore man has no right to tamper with them.

To the Muslim, the Quran is God's book, not Muhammad's book. He believes every word in the Quran is literally true and must be obeyed. The Hadith, or sayings of the Prophet, and the Sunnah or the practice of the Prophet, are essential for a correct interpretation of the Quran."

محترمہ مریم جمیلہ صاحبہ ایک نومسلمہ ہیں۔ ان کی کتاب ''اسلام ان تھیوری اینڈ پریکٹس'' کے صفحہ ۳۳ کی عبارت کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

''اسلام کا بنیادی عقیدہ اس تصور کا مظہر ہے کہ انسان اللہ کا غلام یا بندہ ہے۔ عربی میں بندہ کو ''عبداللہ'' کہتے ہیں۔ یہ نام (عبداللہ) مسلم ممالک میں عام پایا جاتا ہے۔ اسلام کے حقیقی معنی ہیں اللہ کی مرضی کے آگے جھک جانا۔ وہ سب لوگ جو اللہ کی اطاعت و رضا کی اس زندگی کو اختیار کرتے ہیں' مسلمان کہلاتے ہیں۔ چونکہ ہر شے سے اللہ کی ذات برتر و بالا ہے اور وہی ساری کائنات کا فرمانروا ہے' اس لئے مسلمان ذہن کو کلیسا اور ریاست کی تفریق کا مسیحی تصور بالکل غیر منطقی نظر آتا ہے۔ اسلامی حکومت کا مقصد اللہ کے قانون کا نفاذ ہے جو قرآن اور سنت میں محفوظ ہے۔''[۴۲]

''اسلام کا نظام حیات بدیہی اقدار پر مبنی ہے۔ اخلاق و صداقت مطلق ابدی اور عالمگیر ہیں۔ انہیں انسان نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے جاری کیا ہے۔ بنابریں انسان کو ان میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتاب ہے۔ محمد صلعم کی کتاب نہیں ہے۔ ان کا (مسلمانوں کا) ایمان ہے کہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ حقیقی معنوں میں سچا ہے اور اس کی اطاعت ہر مسلمان پر لازم ہے۔ قرآن کریم علم کل کا منبع ہے اور اس کے کسی جزو کے متعلق شک و ریب کا اظہار کرنا' اللہ تعالیٰ کی واضح ہدایت کو مسترد کر دینے کے مترادف ہے۔ محمد صلعم کا عمل' ارشادات اور سنت' قرآن کریم کی صحیح تعبیر و تشریح کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔''[۴۳]

نبی کی دعوت قرآن اور صرف قرآن ہے۔ احادیث یا سنت کا اصل مقصد و مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات اور اس کے منشاو مقصد کو صراحت کے ساتھ بیان کر دیا جائے تا کہ اس پر عمل اس کی صحیح سپرٹ اور منشاء کے مطابق ہو سکے' کیونکہ قرآن میں بہت سے احکامات اور معاملات کو مبہم اور اشارۃً و کنایۃً پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ امر بدیہی تھا کہ تمام احکامات اور معاملات کو امت کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے تا کہ حال اور مستقبل میں اس پہ قرآن کی

Marfat.com

منشاء کے مطابق عمل ہوتا رہے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ رسول صلعم پر سب سے پہلی وحی سورۃ علق کی پانچ یا چھ آیتیں نازل ہوئی تھیں اور اس کے بعد یہ پیغام بتدریج ۲۳ سال میں مکمل ہوا۔ آپ صلعم نے ۱۳ سالہ مکی زندگی میں اسلام کی دعوت اہل مکہ کو پیش کی' مگر معدودے چند صالح افراد کے سوا زیادہ تر لوگوں نے دشمنی اور عناد کا مظاہرہ کیا اور جب اہل مکہ کا ظلم و تشدد حد سے تجاوز کر گیا تو رسول صلعم کو بحکم خدا ہجرت کرنی پڑی اور آپ مدینہ طیبہ چلے گئے۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب رسول صلعم نے اپنی دعوت عام پیش کی اور توحید کا اعلان کیا اور برملا کہا کہ بت پرستی سب سے بڑا گناہ ہے تو اس اعلان کو اہل کفار نے نہ صرف اپنے دینی عقائد پر حملہ قرار دیا بلکہ پورے نظام اجتماعی کی تباہی سمجھی۔ اس اعتبار سے انہوں نے (کفار) خاص طور پر خالص دنیاوی معاملات میں اسلام کی مداخلت کو پسند نہیں کیا۔ مثلاً اقتصادی معاملات' اجتماعی انصاف کے مسائل اور مجموعی طور پر یہ لوگوں کا عام رویہ' اس لئے کہ یہ مداخلت ان کے تجارتی معاملات اور ان کے قبائلی مصالح کے خلاف پڑتی تھی۔ ان کی نگاہ میں دین ایک شخصی اور ذاتی مسئلہ تھا۔ طرز عمل اور رویہ کا اس میں کوئی دخل نہیں سمجھتے تھے[۴۴]۔

آغاز دعوت میں رسولؐ نے لوگوں سے کہا کہ عمل ایمان کا جزو ہے' اس لئے کہ اللہ کو صرف اس سے دلچسپی نہیں ہے کہ انسان کیا عقیدہ رکھتا ہے بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کا عمل کیسا ہے؟ اور اعمال میں بھی بالخصوص وہ اعمال جن کا اثر دوسروں پر پڑ سکتا ہے۔ محمد صلعم کے پیغام یا دعوت نے روح کو جسم سے علیحدہ جسم کے خلاف قرار نہیں دیا' بلکہ آپ کی دعوت کا سارا زور اس بات پر ہے کہ روح اور جسم تصویر کے دو رخ ہیں جن کے مجموعہ کو حیات انسانی سے تعبیر کر سکتے ہیں' اس لئے اسلام قدرتی طور پر صرف فرد یا انسان کے ادبی رجحان یا ادبی پہلو کی پرورش' تربیت اور نشو و نما کی ذمہ داری نہیں لیتا' بلکہ اس کے اس رجحان سے ایک ایسے متعین نظام اجتماعی کی شکل کا کام بھی لیتا ہے جس میں ہر فرد کے لئے آخری حدوں تک جسمانی اور مادی فلاح و بہبود کی ضمانت ہو اور ساتھ ہی ساتھ روحانی نشو و نما و ترقی کا پورا پورا موقع بھی فراہم کیا جائے[۴۵]۔

مختصراً یہ کہ نبیؐ کی دعوت' توحید اور بندگی ہی نہ تھی بلکہ آپؐ کی دعوتؐ کا اصل مقصد اجتماعی نظریات اور تصورات کی پوری طرح چھان بین تھی۔ وہ تصورات جو بالکل اٹل اور ناقابل تغیر سمجھے جاتے تھے۔ جس طرح آج بھی لاعلم طبقہ سیاست میں دین کی مداخلت بدعت سمجھتا ہے' اسی طرح اس زمانہ میں ان تصورات سے بغاوت بھی بدعت سمجھی جاتی تھی[۴۶]۔

اسد صاحب نے محمد صلعم کی دعوت اور قرآن کے احکامات کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"And yet he never claimed to be anything. But a moral man, and never has Muslims attributed divinity to Him, as so many followers of other prophets have done after the prophet's death.

Marfat.com

Indeed, the Koran itself abounds in statements which stress Muhammad's humanness; Muhammad is naught but a prophet; all prophets have passed away before him; if he dies or is slain, will ye then turn back upon your heels?"

اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے کہ:

''محمدؐ نے کبھی یہ دعویٰ یا اعلان نہیں کیا کہ میں ایک اخلاقی اور روحانی معلم سے زیادہ کچھ اور ہوں۔ نیز مسلمان بھی محمدؐ کو علم غیب یا پوشیدہ رازوں کا عالم نہیں سمجھتے۔ یعنی محمد صلعم کو خدائی طاقتوں کے برابر نہیں سمجھتے جیسا کہ دیگر امتوں نے اپنے پیغمبروں کی وفات کے بعد ان کو خدا کی ذات سے منسوب کیا تھا۔ قرآن نے واضح الفاظ میں کہا کہ محمد صلعم ایک انسان کامل تھے اور وہ ایک پیغمبر کے سوا کچھ نہ تھے۔ تمام انبیاء علیہ السلام محمدؐ سے پہلے وفات پا چکے۔ اگر محمدؐ وفات پا جائیں یا انہیں قتل کر دیا جائے تو کیا (اہل ایمان) پھر کفر کی طرف لوٹ جائیں گے؟''[47]

محمد اسد صاحب نے مندرجہ بالا عبارت قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت کی روشنی میں بیان کی ہے:

و ما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افاین مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم و من ینقلب علی عقبیه فلن یضر الله شیئا و سیجزی الله الشکرینo

(ترجمہ: محمدؐ فائز برسالت ہی تو ہیں (نہ کہ خدا ہیں) ان سے قبل بیشار رسول آئے اور چل بسے۔ اگر محمدؐ پر موت وارد ہو یا قتل کر دیئے جائیں تو اے لوگو! تم دین سے برگشتہ ہو جاؤ گے؟ اگر تم ایسا کرو گے تو خدا کو نقصان نہ دو گے! اور توحید پر شکر گزاروں کا معاوضہ یا جزا خدا کے ہاں موجود ہے۔)[48]

اس آیت کریمہ اور قرآن کی معجزانہ صداقت دائمی کے متعلق ایک واقعہ محمدؐ کی وصال پر یہ پیش آیا کہ حضرت عمرؓ تلوار لے کر مسجد میں کھڑے ہو گئے اور کہنا شروع کیا کہ جو شخص کہے گا کہ رسول اللہؐ فوت ہو گئے ہیں' میں اس تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا۔ حضرت عمرؓ کا کہنا تھا کہ رسول اللہؐ اپنے رب کے پاس گئے ہیں اور چالیس رات غیر حاضر رہنے کے بعد واپس آئیں گے' لیکن ابو بکرؓ کو جب یہ خبر ملی تو وہ فوراً مدینہ آئے۔ آپ نے حضرت عمرؓ کے ڈرانے دھمکانے پر کوئی التفات نہ فرمایا بلکہ رسول اللہؐ کے حجرے میں آپؐ کے جسد اطہر کو دیکھ کر حجرے سے باہر آئے اور منبر پر چڑھ کر قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیت کو پڑھنے کے بعد فرمایا: (اے لوگو!) جو شخص محمدؐ کو پوجتا تھا اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمدؐ فوت ہو گئے۔ جو شخص اللہ کی عبادت کرتا ہے تو اللہ یقیناً زندہ ہے اور اس پر کبھی موت وارد نہ ہو گی۔'' جب حضرت عمرؓ کے کانوں میں یہ آواز پڑی تو ان کے دماغ پر پڑا ہوا پردہ آہستہ آہستہ ہٹنے لگا اور حضرت عمرؓ کو محمد صلعم کی وفات کا یقین ہو گیا۔ اس یقین کا ان پر اتنا شدید اثر ہوا کہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ اس واقعہ سے ابو بکرؓ کی دینی عظمت اور عظیم شخصیت کا پہلو واضح ہوتا ہے اور تمام اہل اسلام کے لئے درس عبرت بھی ہے[49]۔

محمد اسد صاحب نے محمدؐ کی شخصیت اور ان کے فائز الرتبہ ہونے کے سلسلہ میں مزید صراحت کرتے ہوئے

Marfat.com

مندرجہ ذیل عبارت بیان کی ہے:

"His utter insignificance before the majesty of God has thus been expressed in the Koran: Say (O Muhammad): I do not possess any power to grant you evil or good. I do not even possess any power to convey benefit or harm to myself, except as God may please; and had I know the unknowable, I would have acquired much good, and no evil would ever have befallen me. I am nothing but a warner and the giver of glad tidings to those who have faith in God."

"قرآن کریم نے خدا کے سامنے محمدؐ کا عاجز ہونا واضح طور پر بیان کیا ہے نیز قرآن نے محمدؐ کو مخاطب کر کے آپ کی زبان سے ہی ان کلمات کا اعادہ کرایا ہے کہ "اے محمدؐ! کہہ دیجئے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لئے بھی سود و زیاں کا اختیار نہیں رکھتا مگر مجھے اتنا ہی اختیار یا قدرت ہے جتنا خدا نے چاہا ہے اور اگر مجھے علم غیب ہوتا تو بہت سے منافع اپنی ذات خاص کے لئے حاصل کر لیتا اور کوئی مضرت مجھ پر واقع نہ ہوتی۔" مزید صراحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں تو ایمان والوں کے لئے احکام شرعیہ بتلا کر ثواب کی بشارت دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔"[۵۰]

اس سلسلہ میں قرآن کریم کے مزید احکامات اور استفسارات موجود ہیں۔ ایک آیت کریمہ پیش نظر ہے جو مندرجہ بالا عبارت کی توثیق وتصدیق کے لئے وافر ثبوت ہے:[۴]

قل لا املک لنفسی نفعا و لا ضرا الا ماشاء الله ط و لو کنت اعلم الغیب لا ستکثرت من الخیرو ما مسنی السوء ان انا الا نذیر و بشیرلقوم یومنون۔ ط

ترجمہ: "آپ کہہ دیجئے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لئے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا مگر اتنا ہی جتنا خدا نے چاہا اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا تو بہت سے منافع حاصل کر لیتا اور کوئی مضرت ہی مجھ پر واقع نہ ہوتی۔ میں تو محض احکام شرعیہ بتلا کر ثواب کی بشارت دینے والا اور ایمان والوں کو عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔"[۵۱]

اس امر کی مزید صراحت اور تصدیق کے لئے ایک دوسری آیت کریمہ بھی پیش ہے:

قل انی لا املک لکم ضرا و لا رشدا o قل انی لن یجیرنی من الله احد و لن اجد من دونه ملتحداo الا بلغا من الله و رسلته ط ......الخ......

ترجمہ: "آپ (محمدؐ) کہہ دیجئے کہ میں تمہارے نہ کسی ضرر کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا اور اگر میں ایسا کروں یا کرنے کا ارادہ کروں تو مجھ کو خدا کے غضب سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ میں اس کے سوا کوئی جگہ پناہ کی پا سکتا ہوں۔ لیکن خدا کے احکامات یا پیغاموں کا پہنچانا اور ان کا ادا کرنا یا ان کی ادائیگی یہ میرا کام ہے۔"[۵۲]

قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیات اور عبارت کے ترجمے کے پیش نظر یہ بات ابہام اور شک وشبہ سے بالاتر

Marfat.com

ہے کہ اسلام کے بعد ابدی پیغام اور نبی کی دعوت کا مقصد خود بخود واضح اور متعین ہے۔اس دعوت پر شعوری طور پر عمل پیرا ہونے اور دوسروں کو بھی صراط مستقیم پر گامزن کرنے کی سعی بلیغ کرنے میں انسانی فلاح و کامیابی مضمر اور پوشیدہ ہے۔ بلاشبہ یہ صاف اور عیاں راستہ اختیار کرنے میں نہ صرف دین و دنیا کی فلاح پوشیدہ ہے' بلکہ یہ رستہ ابدی راحتوں اور مسرتوں کا سرچشمہ بھی ہے۔قرون اولیٰ اور کسی حد تک قرون وسطیٰ میں اس راستہ پر عمل پیرا ہو کر اس کی صداقت اور ابدیت کا عملاً ثبوت پیش کیا جا چکا ہے۔

نظام اسلام کا قیام

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش' بچپن' نو جوانی' جوانی اور عطائے نبوت کے بعد کی تیرہ (۱۳) سالہ زندگی' مکی زندگی ہے اور یہ ۵۳ سالہ زندگی آپ کی حیات طیبہ کا نچوڑ تھی۔ بوقت ہجرت آپ کی عمر عزیز ۵۳ سال تھی۔ تبلیغ اسلام اور اعلائے کلمۃ الحق کے سلسلہ میں کفار مکہ اور دشمنان اسلام کی ایذا رسانیوں اور ظلم و تشدد سے عاجز آ کر آپؐ نے بحکم خداوندی مدینہ طیبہ (یثرب) کو ہجرت فرمائی اور ہجرت کے بعد تقریباً دس سال تک آپؐ بقید حیات رہے۔اس مختصر سی مدت میں آپؐ نے مدینہ منورہ میں اسلامی حکومت قائم کی اور اسلامی نظام حیات کو کلی طور پر نافذ کیا' آپؐ کی وفات کے بعد یہی مقام آپؐ کے دائمی سکون (روضۂ اطہر) کی جگہ بنی۔آپ کی حیات طیبہ میں جو مکان آپؐ کی قیام گاہ تھا' وفات کے بعد وہی جگہ آپؐ کی قبر میں تبدیل کر دی گئی' اس لئے مدینہ منورہ کو نبی صلعم کے شہر سے منسوب کیا جاتا ہے۔

رحمۃ للعالمینؐ نے ہجرت کے بعد حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مکان پر قیام فرمایا۔آپؐ کی اونٹنی (ناقہ) نے جہاں قیام فرمایا تھا' وہ جگہ دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی اور اس جگہ پر کچھ مشرکین کی قبریں اور کھجوروں کے درخت تھے۔آپؐ نے اس جگہ کو دس دینار کے بدلے یتیموں سے قیمتاً خرید لیا اور کھجور کے درختوں' مشرکین کی قبروں کو اس مقام سے صاف کرایا اور پھر مسجد نبوی کی بنیاد رکھی[۵۲]۔

مدینہ منورہ کا سابق نام یثرب تھا۔رسول خداؐ کے قدم رنجہ فرمانے کی برکت سے اس کا نام مدینۃ النبی میں تبدیل ہوا اور پھر آہستہ آہستہ ''مدینہ'' کے نام سے معروف ہوا اور اب مدینہ منورہ یا نبی کا شہر کہلاتا ہے۔

محمد اسد صاحب نے مدینہ منورہ کا نقشہ پیش کرتے ہوئے وہاں کے بازاروں' عمارات' باغات' مسجد نبویؐ' جبل احد اور خرید و فروخت کے چند مناظر پیش کئے ہیں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ایام حج میں حجاج و زوار ارکان حج ادا کرنے کے بعد یا ارکان حج ادا کرنے سے پہلے مدینہ طیبہ بھی جاتے ہیں اور یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ خانہ کعبہ کے بعد مدینہ طیبہ میں ہی امن و عافیت میسر آتی ہے۔ دنیا کے ہر حصہ سے آئے ہوئے لاکھوں افراد جن میں روسی' چینی' ہندی' پاکستانی' عربی' افریقی' ملائیشیائی' انڈونیشی' ایرانی' افغانی' ترکی' مصری اور دیگر ممالک سے آئے ہوئے حجاج ہوتے ہیں' سب کے سب ہی مدینہ طیبہ کی زیارت کو جاتے ہیں۔مدینہ کی گلیاں اور سڑکیں' بازار اور عام گزرگاہ تنگ

Marfat.com

ہیں اور خرید و فروخت کی گہما گہمی اور مختلف ممالک کے انسانوں کا اجتماع اور اختلاط کے باوجود نہ کوئی تصادم اور نہ کسی قسم کا ٹکراؤ اور اس ہنگامہ کے باوجود ہر شخص امن و سکون کے ساتھ خرید و فروخت کرتا ہے' لیکن ان تمام باتوں کے باوجود سب سے زیادہ عجیب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہر ملک کے افراد کے عادات اور مزاج مختلف ہونے کے باوجود' جو مدینہ کی سڑکوں اور گلیوں پر پوری طرح ظاہر ہوتے ہیں اور ہر سال ایام حج میں یہ منظر دیکھا جاتا ہے۔ وہاں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس سے کسی غیر معمولی اختلاط یا تصادم کا اندازہ ہوتا ہو۔ غالباً اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نبیؐ کی ہجرت کے بعد اس مقام (شہر) میں مہاجر و انصار کے اختلاط کی بنا پر جو فضا پیدا ہوئی تھی اور نبیؐ کی شخصیت نے لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے سے محبت' ایثار اور قربانی کا جو لاثانی جذبہ پیدا کیا تھا' ویسی مثال تاریخ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے یعنی محبت اور اخلاص و ایثار و قربانی کا یہ عالم تھا کہ انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنی جائداد' زراعت اور اموال میں سے ہی حصہ نہیں دیا بلکہ اپنی زائد بیویوں میں سے ایک ایک بیوی بھی اپنے دینی بھائیوں کے لئے پیش کی تھی۔ یہ عظیم قربانی اسلام کے علاوہ کسی قوم کی تاریخ یا افراد پیش کرنے سے آج تک قاصر رہی ہے اور یہ بات بھی شبہ سے بالاتر ہے کہ چودہ سو برس گزر جانے کے بعد بھی ان کا روحانی وجود اسی طرح زندۂ جاوید ہے' جو نبی صلعم کی حیات میں تھا اور ایک خاص قسم کی یکسانیت اور ہم آہنگی اب بھی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ اسلام کا وہ روحانی شعور عالم اسلام کے اور حصوں کی طرح یہاں بھی مدھم اور کمزور پڑ چکا ہے' لیکن پھر بھی اپنے شاندار ماضی سے جذباتی لگاؤ جس کی تصویر کشی کسی کے بس یا اختیار میں نہیں' آج بھی زندہ ہے۔ نیز یہ بات بھی شبہ سے بالاتر ہے کہ مدینہ منور کے علاوہ (دنیا میں) کوئی شہر شاید ہی ایسا ہو (گمان اغلب یہی ہے کہ نہیں ہے) جس سے لوگوں نے کسی شخصیت کی بنا پر اتنی محبت کی ہو' جتنی مدینہ طیبہ سے کی جاتی ہے۔ نہ ہی دنیا میں کوئی ایسا شخص گزرا ہے جس نے اپنی وفات پر باوجود چودہ سو برس گزر جانے کے' اتنے انسانوں کے دلوں سے خراج محبت و عقیدت وصول کیا ہو۔ سوائے اس شخصیت کے جسے محمد صلعم عربی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے [۵۳]۔

مقام حیرت و استعجاب یہ ہے کہ محمد صلعم نے اور نہ ہی ان کی امت نے آپ کی زندگی میں اور نہ ہی وفات کے بعد ایک لمحے کے لئے بھی اپنے کو مافوق البشر سمجھا اور نہ ہی امت مسلمہ نے کبھی محمدؐ کی طرف الوہیت کو منسوب کیا' جس طرح کہ انبیاء سابقین کے بہت سے پیروؤں نے اپنے نبی کے ساتھ کیا' بلکہ قرآن حکیم نے جا بجا نبیؐ کی بشریت واضح کی ہے تاکہ جہلاء اور بعض نادان افراد عقائد میں اندھے ہو کر نبیؐ کے مرتبہ کو خدا سے نہ ملا دیں جو ایک کھلا شرک ہے۔ قرآن کا فرمان ہے کہ: و ما محمد الا رسول یعنی محمدؐ صرف رسول ہیں۔ پچھلے اوراق میں اس آیت کریمہ کی پوری تشریح گزر چکی ہے۔ اسد صاحب نے اس سلسلہ میں رسول اکرمؐ سے مسلمانوں کی عقیدت و احترام کا ذکر کرتے ہوئے مندرجہ ذیل عبارت پیش کی ہے:

"Although life in Medina today has only a formal distant relationship with what the Prophet aimed at; although the spiritual

Marfat.com

awareness of Islam has been cheapened here, as in many other parts of the Muslim world. An indescribed emotional link with its great spiritual past has remained alive. Never has any city been so loved for the sake of one single personality. Never has any man, dead for over thirteen hundred years, been loved so personally, and by so many, as he who lies buried beneath the great green dome."

ترجمہ: ''اگرچہ مدینہ کی موجودہ زندگی نبیؐ کے نقش سے ظاہری اور مبہم سا تعلق رکھتی ہے۔ حالانکہ اسلام کا روحانی شعور، عالم اسلام کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی کمزور اور مدھم پڑ چکا ہے، پھر بھی اپنے شاندار ماضی سے جذباتی لگاؤ باقی ہے۔ اس لگاؤ کی تصویر کشی کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہ لگاؤ تاہم آج بھی زندہ ہے۔ دنیا میں کوئی شہر ایسا نہیں جس سے لوگوں نے کسی شخصیت کی وجہ سے اتنی محبت کی ہو جتنی کہ مدینہ سے کی جاتی ہے، نہ ہی دنیا میں کوئی شخص ایسا گزرا ہے جس نے اپنی وفات کے بعد باوجود تیرہ سو برس (کذا: چودہ سو برس) گذر جانے کے اتنے انسانوں کے دلوں سے خراج عقیدت و محبت وصول کیا ہو، سوائے اس شخصیت کے جو اس عظیم سبز گنبد کے نیچے استراحت فرما ہے۔''[54]

قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیت اور اس طرح کی دیگر آیات نے یہ بات بالتشریح بیان کر دی ہے کہ محمدؐ ایک پیغمبر اور انسان کامل تھے۔ محمدؐ نے ایک دن کے لئے بھی اپنے کو مافوق البشر یا مافوق الفطرت نہیں سمجھا اور نہ ہی مسلمانوں نے ان کی طرف الوہیت کو منسوب کیا ہے۔ محمدؐ کا کام اللہ تعالیٰ کے احکامات اور ہدایات پر عمل پیرا ہو کر اپنے پیروؤں کو صراط مستقیم پر عمل کرانا اور فلاح و فوز کا راستہ بتانا تھا۔ آپؐ کے ساتھ رہنے والوں نے آپ سے والہانہ محبت اور عقیدت کا اظہار کیا اور یہ محبت اور عقیدت آنے والے مسلمانوں میں بھی قائم و دائم ہے، جیسا کہ اسد صاحب کی مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اصل میں اس محبت اور عقیدت کا سبب یہ تھا کہ آپؐ انسانوں میں ایک کامل ترین انسان تھے، گو کہ دوسرے انسانوں کی طرح سے ہی زندگی گزارتے تھے۔ نیز زندگی کے درد و دکھ اور راحت و آرام دونوں سے ہی آپ کو بھی دیگر انسانوں کی طرح سابقہ پڑتا تھا[55]۔

مومن کی نماز۔

نماز کا ذکر (بیان) کرنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ اسلام کا روحانی نظام کیا ہے؟ اور پھر یہ بات بھی سمجھنا ضروری ہے کہ زندگی کے پورے نظام سے اس کا کیا واسطہ یا کیا تعلق ہے؟ اس سوال کو سمجھنے کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ ہم اجمالی طور پر اس فرق کو سمجھ لیں جو روحانیت کے اسلامی تصور اور دیگر مذہبی فلسفیانہ نظاموں کے تصورات میں پایا جاتا ہے۔ یہ فرق ذہن نشین نہ ہونے کی بنا پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اسلام کے روحانی نظام

Marfat.com

پر گفتگو یا بحث کرتے ہوئے آدمی کے دماغ میں بلا ارادہ اور بعض اوقات بالا رادہ بہت سے وہ تصورات سامنے آجاتے ہیں جو عموماً روحانیت کے لفظ سے وابستہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ پھر اس الجھن میں پڑ کر آدمی یا آدمیوں کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ آخر یہ روحانی نظام کس قسم کا ہے جو روح کے دائرے سے گزر کر مادہ وجسم کے دائرے میں دخل دیتا ہے اور نہ صرف دخل دینے پر اکتفا کرتا ہے بلکہ اس پر حکمرانی بھی کرتا ہے[56]۔

فلسفہ اور مذہب کی دنیا میں عام طور پر جو تخیل (یا تاثر) قائم ہے وہ یہ ہے کہ روح اور جسم ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں اور ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دونوں کے تقاضے الگ ہیں بلکہ باہم مخالف بھی ہیں۔ ان دونوں کی نشو و نما (ترقی) ایک ساتھ ممکن نہیں۔ روح کے لئے جسم اور مادے کی دنیا ایک حبس بیجا یا جیل خانہ کی حیثیت ہے کیونکہ زندگی کے تعلقات اور دلچسپیاں وہ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ہیں جن میں روح جکڑ جاتی ہے۔ دنیا کے کاروبار اور معاملات و مشاغل وہ دلدل ہیں جس میں پھنس کر روح کی پرواز ختم ہو جاتی ہے۔ اس تخیل اور سوچ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ روحانیت اور دنیا داری کے راستے ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور جدا ہو گئے ہیں۔ جن لوگوں نے دنیا داری اختیار کر لی وہ خشت اول پر ہی مایوس ہو گئے کہ روحانیت ان کے ساتھ یعنی دنیا داری کے ساتھ نہ چل سکے گی۔ اس غلط سوچ نے ایسے لوگوں کو مادہ پرستی میں غرق کر دیا۔ معاشرت، تمدن، سیاست، معیشت، تجارت، زراعت، صنعت وحرفت غرض دنیوی زندگی کے سارے شعبے روحانیت کے نور سے خالی ہوتے چلے گئے اور اس کے نتیجے میں دنیا ظلم وتاریکی سے معمور ہوتی چلی گئی۔ اس کے برعکس جو لوگ روحانیت کے طالب ہوئے انہوں نے اپنی روح اور روحانیت کی ترقی کے لئے ایسے راستے تلاش کئے جو دنیا کے باہر ہی باہر نکل جاتے ہیں کیونکہ ایسے تخیل اور اس سوچ بچار کرنے والوں کے نقطہ نگاہ سے روحانی ترقی کا کوئی ایسا راستہ ممکن نہ تھا جو دنیا کے اندر سے (یا دنیاوی معاملات میں رہ کر) ہو کر گزرتا۔ ان کے نزدیک روح کو پروان چڑھانے کے لئے جسم کو مضمحل کرنا ضروری تھا اس لئے انہوں نے ایسی ریاضتیں یا مشقتیں ایجاد کیں جو نفس کش یا نفس کو مارنے والی اور جسم کو بے حس یا بیکار کر دینے والی ہوں۔ روحانی تربیت اور ارتقا کے لئے جنگلوں، پہاڑوں اور عزلت کے گوشوں کو ان لوگوں نے مناسب اور موزوں ترین مقامات سمجھا۔ ان کے خیال کے مطابق گیان دھیان اور ریاضت وعبادت میں تمدن کا ہنگامہ مخل یا خلل انداز نہ ہو۔ ان لوگوں کو روح کے ارتقاء (نشو ونما) کے لئے عزلت نشینی کے علاوہ اور کوئی صورت ممکن نظر نہ آئی۔

پھر جسم وروح کے اس تضاد نے انسان کے لئے کمال (عروج وانتہا) کے بھی دو مختلف مفہوم اور نصب العین پیدا کر دیئے۔ ایک طرف دنیوی زندگی کا کمال (یا کامیابی) جس کا مفہوم ان کے نزدیک یہ ہے کہ انسان صرف مادی نعمتوں سے مالا مال ہو کر عیش وعشرت کی زندگی بسر کرے اور اس کمال کی انتہا یہ مقرر کی کہ آدمی ایک پرندہ، ایک بہترین نگر مچھ، ایک عمدہ گھوڑا اور ایک کامیاب بھیڑیا بن جائے تاکہ اپنی نفسانی زندگی کی تکمیل کے لئے جس کو چاہے اور جیسا چاہے غصب کرے اور ہضم کر جائے یا جسے چاہے روند ڈالے۔

دوسری طرف روحانی زندگی کا کمال اس بات میں پوشیدہ یا مضمر سمجھا کہ انسان کو کچھ مافوق الفطرت طاقتوں

Marfat.com

کا مالک ہونا چاہیے اور اس کی انتہا یہ قرار پائی کہ آدمی ایک اچھا ریڈیو سیٹ' ایک طاقتور دوربین اور ایک نازک خردبین بن جائے۔ یا اس کی نگاہ اور اس کے الفاظ ایک پورے دواخانہ کا کام انجام دینے لگیں اور اس طرح وہ اپنی مافوق الفطرت طاقتوں کا مظاہرہ کرے تا کہ لوگ اسے روحانی طاقتوں کا مالک سمجھنے لگیں۔

اسلام کا نظریہ اس سلسلہ میں دنیا کے دیگر مذاہب اور فلسفیانہ نظاموں سے مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی روح کو خدا نے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے:

انی جاعل فی الارض خلیفةo

(ترجمہ: کہ میں ضرور بناؤں گا زمین میں ایک نائب)

اس آیت کریمہ کی غرض و غایت یہ ہے کہ کچھ اختیارات' کچھ فرائض اور کچھ ذمہ داریاں اس کے سپرد کی ہیں اور انہیں ادا کرنے کے لئے ایک بہترین اور مناسب ترین ساخت کا جسم بھی اسے عطا کیا ہے۔ اس جسم کے عطا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے تفویض شدہ اختیارات کے استعمال اور اپنی متعلقہ خدمات انجام دینے میں اس سے (جسم) کام لیں۔ لہٰذا ہم اسے روح کا قید خانہ نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ اس کا کارخانہ ہے اور کارخانہ کے لئے کوئی ترقی اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے' جب کہ وہ اس کارخانہ سے متعلق آلات اور طاقتوں کو اس کی ضرورت اور مناسبت کے مطابق استعمال کر کے اپنی استعداد اور قابلیتوں کا اظہار کرے۔ پھر یہ جسم کوئی دارالعذاب نہیں ہے جس میں انسانی روح کسی طرح آ کر پھنس گئی ہو' بلکہ یہ تو وہ کارگاہ ہے' جس میں کام کرنے کے لئے اس کو خدا نے زمین پر نائب بنا کر بھیجا ہے۔[۵۷]

اس طرح زندگی کا ہر شعبہ اور کارخانہ ہائے قدرت کا ہر ایک نظام ایک دوسرے سے وابستہ اور منسلک ہے۔ اس کارگاہ عالم میں زندگی کا ہر پہلو اور ہر شعبہ گویا امتحان کا ایک پرچہ ہے مثلاً گھر' محلہ' دفتر' بازار' کارخانے' مدرسے' کچہریاں' تھانے' چھاؤنیاں' پارلیمنٹس' صلح اور میدان جنگ کی کانفرنسیں۔ یہ اور دیگر مقامات سب مختلف مضامین کے پرچے ہیں جو اسے (انسان کو) حل کرنے کے لئے دیئے گئے ہیں۔ وہ اگر ان میں سے کوئی پرچہ بھی نہ کرے یا کچھ کرے اور کچھ نہ کرے تو اس کا نتیجہ صفر (zero) یا ناکامیابی ہی ہوگا۔ کامیابی اور ترقی کے امکانات اگر ہو سکتے ہیں تو وہ اسی صورت میں ممکن ہیں کہ وہ اپنا سارا وقت اور ساری توجہ یا کم از کم مطلوبہ وقت اور خاطر خواہ توجہ امتحانات کے پرچوں کو حل کرنے میں صرف کرے اور جتنے پرچے بھی اسے حل کرنے کے لئے دیئے جائیں' ان سب پر کچھ نہ کچھ جوابات کر کے دکھائے۔

اس طرح اسلام زندگی کے راہبانہ تصور کو دور کر دیتا ہے اور انسان کے لئے روحانی غذا یا روحانی ترقی کا راستہ دنیا سے باہر رہ کر نہیں بلکہ دنیا میں رہ کر ہی نکلتا ہے۔ روح کی نشوونما اور بالیدگی اور فلاح و کامرانی کی اصل جگہ اس کے نزدیک کارگاہ حیات کے عین منجدھار میں واقع ہے۔ نہ کنارے پر ہے اور نہ اس سے فرار پر۔

مندرجہ بالا مختصر تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے دیندار اور دنیادار دونوں کا دائرہ

Marfat.com

عمل ایک ہی ہے اور دونوں کو ایک ہی کارگاہ میں کام کرنا ہے مثلاً گھر کی چار دیواری سے لے کر بین الاقوامی امور تک زندگی کے جتنے بھی معاملات ہیں' ان کی ذمہ داریاں دین دار اور دنیادار یعنی دونوں کو انجام دینی ہیں۔ ان امور کی انجام دہی میں دیندار اور دنیادار کا ایک فرق یہ ہوگا کہ دین دار اس احساس اور ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے گا کہ وہ خدا کے سامنے جوابدہ ہے اور اسے خدا کی خوشنودی حاصل ہو جائے اور ان قوانین وضوابط کے تحت پورا کرنے کی کوشش کرے گا جو خدا نے اس کے لئے مقرر کئے ہیں۔ اس کے برعکس دنیادار جو کچھ کرے گا' وہ خدا کے سامنے جواب دہی کے تصور سے بے نیاز ہو کر کرے گا اور من مانے طریقوں سے کرے گا۔ یہی معمولی سا فرق (بظاہر معمولی) دیندار کی پوری زندگی کو سراسر روحانی اور نورانی بنا دیتا ہے اور دنیادار کی ساری زندگی کو مادی بنا کر روحانیت کے نور سے محروم اور ناآشنا کر دیتا ہے [۵۸]۔

مندرجہ بالا مختصر تشریح کے بعد یہ بات سمجھ لیجئے کہ اسلام دنیوی زندگی کے اس منجدھار میں انسان کی روحانی ارتقا و بالیدگی کا راستہ کس طرح معین کرتا ہے یا اسے اس راستہ پر گامزن کرنے کے لئے کیا نشاندہی کرتا ہے۔

اس منزل کا سب سے پہلا اور بنیادی قدم ایمان باللہ ہے یعنی انسان کے دل و دماغ میں اس خیال کا راسخ اور پختہ ہو جانا کہ بس خدا ہی اس کا مالک و خالق' حاکم اور معبود ہے۔ خدا کی رضا اس کی تمام کوششوں کا مقصود ہے اور خدا ہی کا حکم اس کی زندگی کا قانون وضابطہ ہے' اس خیال میں جتنی پختگی اور راسخ العقیدگی ہوگی' اتنی ہی زیادہ مکمل اسلامی ذہنیت بنے گی اور وہ زیادہ ثابت قدمی کے ساتھ روحانی ترقی کے راستہ پر گامزن ہوگا۔

اس منزل کی دوسری راہ اطاعت و بندگی ہے اور بندگی کا مطلب ہے بالفعل اپنی خودمختاری سے دست بردار ہو جانا' اور عملاً اس خدا کی پوجا کرنا ہے جسے وہ عقیدتاً اپنا معبود تسلیم کر چکا ہے۔ اسی اطاعت کو قرآن کی اصطلاح میں اسلام کہتے ہیں۔

اس منزل کی تیسری راہ تقویٰ یا پرہیزگاری ہے اور اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ہر اس کام سے رک جائے جسے خدا نے نہ کرنے کا حکم دیا ہے اور ہر اس کام کو انجام دے جسے کرنے کا حکم ہے اور حلال و حرام اور صحیح و غلط اور خیر و شر کے درمیان تمیز کرتے ہوئے اس سے اجتناب کرے اور اس پر عمل کرے۔

منزل مقصود کی آخری اور سب سے اونچی راہ احسان کی ہے۔ احسان کے لفظی معنی ہیں نیکی کرنا' اسلام کے نزدیک احسان کے معنی ہیں اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے ساتھ متحد کرنا یعنی جو کچھ خدا کو پسند ہے' وہی بندے کی اپنی پسند ہو اور جو کچھ خدا کو ناپسند ہو' بندہ بھی اسے ناپسند کرے۔

مختصر یہ کہ روحانی نظام اور اس کی ترقی کا یہ راستہ صرف فرد یا افراد ہی کے لئے نہیں' بلکہ جماعتوں اور قوموں کے لئے بھی ایمان' اطاعت اور تقویٰ کی منازل سے گزر کر احسان کی انتہائی منزل تک پہنچنا ضروری ہے۔ حقیقتاً اسلام کا منشاء پورا ہی جب ہوتا ہے' تب کہ پوری کی پوری قوم متقی اور محسن بن جائے [۵۹]۔

اسلام نے اس روحانی تربیت اور ترقی و بلندی کے لئے جو نظام یا طریقہ مختص کیا ہے' وہ مندرجہ ذیل ہے:

Marfat.com

(الف) نماز (ب) روزہ (ج) زکوٰۃ اور (د) حج۔ ہم اپنے موضوع کی مناسبت سے صرف رکن اول یعنی نماز کے متعلق ہی مختصر بحث کریں گے' تاکہ مومن کی نماز اور اس کا مقصد اور اہمیت سامنے آ جائے۔

نماز کے متعلق قرآن کریم میں کم و بیش سات سو مقامات پر ہدایات و تاکید ہے اور مختلف مقامات پر مختلف پہلوؤں سے اس کی اہمیت' افادیت اور فرضیت کو واضح اور کھول کر بیان کیا گیا ہے اور اسی طرح احادیث میں تقریباً تین ہزار مقامات پر اس کا ذکر اور تاکید آئی ہے[60]۔

مومن کی نماز کے متعلق قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ:

ان الصلوۃ تنھی عن الفحشاء والمنکرo

(ترجمہ: بے شک! نماز روک دیتی ہے بے حیائی اور ناپسندیدہ باتوں سے۔)[61]

مندرجہ بالا آیت کریمہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ فحشاء اور منکر سے بچ جانا نماز کی سب سے بڑی خاصیت اور خوبی ہے۔ فحشاء سے مراد عام بے حیائی' مثلاً حرام کاری وغیرہ ہے اور شریعت کے نزدیک منکر سے مراد وہ باتیں ہیں جو ناپسندیدہ اور بری ہیں' مثلاً نبی کریم کا ارشاد ہے کہ جس کی نماز نیکی کرنے اور برائی سے روکنے کا حکم نہ کرتی ہو وہ نماز خدا سے دوری اور بُعد پیدا کرتی ہے[62]۔ علامہ ابن کثیر نے نماز کو نماز بنانے کے سلسلہ میں ایک مختصر سا نسخہ تجویز کیا ہے وہ یہ کہ: ''(الف) خلوص' کہ اس سے نیک کام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے (ب) خوف خدا کہ اس سے بدی کرنے کا جذبہ فوت ہوتا ہے (ج) یاد الٰہی (تلاوت قرآن) کہ اس سے امر اور نہی دونوں پر مطلع ہوتا ہے۔''

مختصر یہ کہ ان تمام روایات سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے' وہ یہ ہے کہ نماز میں اعلیٰ درجہ کا اخلاق اور بلند تر کردار مخفی ہے۔ اور نماز کی غرض و غایت بھی یہی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا ہر باطل کی بندگی اور پرستش سے باز آ جائے۔ چونکہ بندگی کے لائق سوائے خدا کی ذات کے اور کوئی ذات نہیں ہے' خواہ وہ نبی ہو امام ہو یا پیر و مرشد ہو[63]۔ روح کی نماز یہی ہے کہ انسان اپنے تئیں اعلیٰ کردار و اخلاق کا حامل ہو جائے اور تمام باطل بندگیوں سے اپنے کو باز رکھے۔ چونکہ مومن کے لئے خدا کا ایک ادنیٰ حکم بھی واجب العمل ہے' چہ جائیکہ نماز جو توحید کے بعد سب سے پہلا اور بنیادی رکن یا ستون ہے[64]۔

یہاں ایک بات واضح کرنا ضروری ہے کہ بہت کم چیزیں ایسی ہیں جو لوگوں کو خدا سے اتنا قریب کرتی ہیں جتنی کہ نماز' جس کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اور خدا (خالق) کے درمیان کوئی رابطہ ضروری نہیں ہے یا زیادہ موزوں الفاظ میں ناممکن ہے۔ چونکہ اسلام میں ''مقدس اسرار'' کی بھی کوئی داستان نہیں ہے' اس لئے ہر عاقل مسلمان مرد یا عورت ہر دینی کام کو (اس کی جو بھی نوعیت ہو) انجام دے سکتا ہے۔ خواہ وہ نماز کی امامت ہو یا تدفین وغیرہ کا مسئلہ۔ اس خدمت کے لئے کوئی باضابطہ اجارہ داری یا ٹھیکیداری نہیں ہے۔ دینی معلمین اور اسلامی معاشرہ کے قائدین یا رہنماؤں کی حیثیت بس اتنی ہے کہ وہ اپنی وسعت علمی اور علوم دینیہ میں مہارت کی وجہ سے مشہور ہو جاتے ہیں اور ان کی یہ شہرت کبھی صحیح طور پر ہوتی ہے اور کبھی غلط طور پر بھی ہو جاتی ہے[65]۔ مختصر یہ کہ مومن کی نماز اس کو خدا سے قریب کرتی ہے۔

Marfat.com

خواہشات اور منکرات سے باز رکھتی ہے۔ نیز دل میں خدا کا خوف اور انسانوں سے محبت پیدا کرتی ہے۔

نومسلم بھائی سے اخوت

قبل اس کے کہ ہم اس بات پر روشنی ڈالیں کہ نئے مسلمان بھائی سے اخوت اور محبت کیوں اور کس طرح ہو جاتی ہے۔ اسلام کے معاشرتی نظام کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے' تا کہ قارئین کی سمجھ میں یہ بات آسانی سے آسکے کہ نئے مسلمان بھائی یا نومسلم سے اخوت و محبت فطری ہے۔ چونکہ قرآن نے فرمایا ہے کہ:

انما المومنون اخوة○

(ترجمہ: بیشک تمام مسلمان بھائی ہیں۔)[۲۶]

اسلام کے معاشرتی نظام کا سنگ بنیاد ایک نظریہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان ایک نسل سے پیدا ہوئے ہیں۔ خدا نے سب سے پہلے حضرت آدمؑ و حوا کو پیدا کیا تھا۔ پھر اسی جوڑے کی بدولت دنیا کے وہ سارے لوگ پیدا ہوتے رہے جو دنیا کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ابتدا میں ایک مدت مدید تک اس جوڑے کی اولاد ایک ہی امت بنی رہی اور اس امت کا دین بھی ایک تھا' زبان بھی ایک تھی اور آپس میں کوئی اختلاف نہ تھا مگر جیسے جیسے ان کی تعداد بڑھتی گئی وہ زمین پر پھیلتے چلے گئے۔ اس پھیلاؤ کے نتیجے میں قدرتی طور پر مختلف نسلوں' قبیلوں اور قوموں میں منقسم ہوتے گئے اور ان کی زبانیں' لباس اور رہن سہن کے طور طریقے بھی بدلتے گئے۔ جغرافیائی اعتبار سے اور آب و ہوا کے اختلاف نے ان کے رنگ و روپ اور خدو خال تک میں تبدیلی کر دی۔ مثلاً سرد ممالک کے لوگ خوبصورت' لحیم شحیم اور ذہین ہوتے گئے' جبکہ گرم خطوں کے رہنے والے کالے' پست قد اور غبی ہوتے گئے۔ یہ سب اختلافات فطری ہیں اور واقعات کی دنیا میں نہ صرف موجود ہیں بلکہ اسلام ان اختلافات کو بطور ایک واقعہ کے تسلیم بھی کرتا ہے' لیکن ان اختلافات کی بنا پر انسانوں میں نسل' رنگ' زبان' قومیت اور وطنیت کے تعصبات اور باطل دیوی دیوتاؤں کی پرستش کو غلط قرار دیتا ہے۔ انسان نے اپنے خود کار نظریات سے انسان کے درمیان اونچ نیچ' شریف' رذیل' اپنے اور غیر کے جتنے فرق پیدائش کی بنیاد پر قائم کر لئے ہیں' اسلام کے نزدیک یہ سب جاہلیت اور لاعلمی کی بنا پر ہیں۔ وہ تمام دنیا کے انسانوں سے کہتا ہے کہ تم سب ایک ماں اور ایک باپ کی نسل سے ہو' لہٰذا ایک دوسرے کے بھائی ہو اور انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہو۔

اسلام انسان کے درمیان اگر کوئی امتیازی حد قائم کرتا ہے تو وہ نسل' رنگ' زبان اور وطن کی نہیں ہے بلکہ وہ سیرت و کردار اور اصولوں کی ہو سکتی ہے۔ مثلاً مشرق و مغرب یا شمال و جنوب کے انتہائی فاصلے پر رہنے والے دو انسان یا بہت سے انسان اگرچہ ظاہر میں ایک دوسرے سے کتنے ہی دور ہوں' لیکن اگر ان کے خیالات متفق ہیں اور ان کے اندر اخلاقی اقدار بھی یکساں ہیں تو ان کی زندگی کا راستہ بھی ایک ہوگا۔ اس نظریئے کے تحت اسلام دنیا کے تمام نسلی' وطنی اور قومی معاشروں کے برعکس ایک فطری' اخلاقی اور اصولی معاشرہ کی تعمیر کرتا ہے اور اسلام کے نزدیک ہر وہ شخص جو ایک

Marfat.com

خدا کو اپنا معبود، مالک وخالق مانے اور پیغمبروں کی لائی ہوئی ہدایت یا شریعت کو اپنی زندگی کا قانون یا قانون حیات سمجھے، اس معاشرہ میں نہ صرف شامل ہو سکتا ہے بلکہ وہ معاشرے کا ایک اہم فرد ہے اور بلا امتیاز رنگ ونسل، وطن اور قوم اس کو اسلامی معاشرے میں ہر فرد کے برابر حقوق حاصل ہیں۔ قطع نظر اس بات سے کہ وہ افریقی ہے، امریکی ہے، ہندی ہے، یورپی، روسی، چینی یا جاپانی یا کوئی اور[67]۔

جناب محمد اسد صاحب (سابق لیو پولڈ وائس) کو اس انمٹ حقیقت کا عملی تجربہ ہوا، جب کہ وہ بحری سفر پر تھے اور ان کے جہاز پر ایک یمنی مسافر (مسلمان) بھی مع اپنے دیگر احباب کے سفر کر رہا تھا۔ یمنی مسافر چہرہ مہرہ سے سخت مزاج اور باوقار نظر آ رہا تھا لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں (اسد صاحب) نے حال ہی میں اسلام قبول کیا ہے تو انہوں نے خصوصی محبت کا برتاؤ کیا اور قرآن مجید کے مندرجہ بالا فرمان کے مطابق یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ مسلمان تو سب بھائی بھائی ہیں۔ یمنی مسافر نے اس روایت کا پورا پورا ثبوت اور عملی مظاہرہ پیش کیا اور ان کے ساتھ جہاز پر بیٹھے ہوئے گھنٹوں اپنے گاؤں کے متعلق تفصیلی گفتگو کرتا رہا۔ اس یمنی مسافر کا نام محمد صالح تھا۔ اسد صاحب کہتے ہیں کہ:

"When he learned that I was a new comer to Islam, he showed a special affection for me; his name was Muhammad Salih."

ترجمہ: ''محمد صالح یمنی مسافر کو جب یہ علم ہوا کہ میں (محمد اسد) ایک نو مسلم ہوں تو اس نے مجھ سے غایت درجہ محبت کا اظہار کیا''[68]

مختصر یہ کہ اسلام کے نزدیک کوئی فرد یا افراد اشرف واسفل یا اعلیٰ وادنیٰ نہیں اور نہ ہی کسی کو ایک دوسرے پر رنگ، نسل، وطن، زبان اور کسی دیگر وجوہ کی بنا پر تفوق یا بڑائی حاصل ہے، بلکہ اسلام کے نزدیک انسان کی بزرگی وعظمت کا معیار اس کے تقویٰ یا پرہیزگاری کی بنیاد پر ہے، جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے:

ان اکرمکم عنداللہ اتقکم ٥ (القرآن۔پ ٢٦۔س۔الحجرات۔٢۔آیت ١٣ کا حصہ)

(ترجمہ: بے شک اللہ کے نزدیک مکرم وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔)

لہٰذا اللہ کے نزدیک بڑائی یا بزرگی انسان کے انسان ہونے کی حیثیت سے نہیں، اس کے سیرت وکردار کی اعلیٰ تعمیر کی بنا پر ہوتی ہے اور اسلامی فلسفہ حیات کے تحت سارے مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور نو مسلم کے ساتھ خصوصی التفات اور محبت کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اسلام کو عقل وشعور اور نشیب وفراز پر غور کرنے کے بعد قبول کیا ہے۔ نیز اعتقادی اور ایمانی طور پر وہ ان مسلمانوں سے بدرجہا بہتر اور مستقل مزاج ہوتا ہے جو جدی طور پر مسلمان چلے آ رہے ہیں۔

ہم نے اب تک سطور بالا میں اسلامی نظریہ حیات کو پیش کیا ہے۔ اس فکر ونظر کی بنیاد پر رسولؐ نے جس اسلامی نظام کو برپا کیا تھا، اس میں خلفائے کبار کے بعد ملوکیت در آئی تھی جس نے خلافت کا جامہ ضرور زیب تن کیا ہوا

Marfat.com

تھا مگر روح نہ تھی۔ یہی ملوکیت بنی امیہ، بنی عباس، بنو فاطمہ اور بعدہ ترکان عثمان نے بھی اختیار کی اور اس خلافت کو ملوکیت کے جامہ میں پہن لیا اور سیادت و قیادت کا ڈنکا بجاتے رہے، لیکن اسلامی نظریہ حیات کو اس کے پورے جزو و کل کے ساتھ نافذ نہیں کیا اور نہ ہی اس کی روح کے مطابق برپا کرنے میں کوئی تکلیف گوارا کی۔ بعد کے ایام میں کچھ پاکباز اور صالح نفوس نے اسلامی نظام برپا کرنے کے لئے خواب دیکھنا شروع کئے۔ اس سلسلہ میں تحریکات نے جنم لینا شروع کیا جن کے آئینہ میں حق و باطل کی کشمکش کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

(در: شاہراہ مکہ۔ ترجمہ و تشریح از ایچ۔ بی۔ خان، کراچی ۱۹۷۶ء، باب چہارم، ص ۱۰۲-۱۴۹)

حواشی

1. The Shorter Oxford English Dictionary. Vol. II. p. 1645, col. 3. N. B. Rabbi: A title of respect given by the Jews to doctor of the laws.
2. The Road to Mecca. pp. 50, 54.

(نوٹ: جناب عبدالحمید صدیقی صاحب نے اسد صاحب کے شہر لوو کو Lvow لکھا ہے جو اصل میں Lwow ہے۔ دوسری غلطی اسد صاحب کے شہر کو آسٹریا کے بجائے آسٹریلیا لکھا ہے۔ آسٹریلیا ایک براعظم ہے جبکہ آسٹریا یورپ کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔) ترجمان القرآن ج ۴۸، ع ۲، ۳۔ ماہ شعبان و رمضان ۱۳۷۶ھ از عبدالحمید صدیقی (مضمون شاہراہ مکہ) ص ۱۴۹۔

3. The Road to Mecca. p. 52.
4. Ibid. pp. 51, 52.
5. Ibid. pp. 50, 51.
6. Ibid. pp. 52, 53.

۷۔ طوفان سے ساحل تک۔ ص ۶۶-۶۴۔

8. The Road to Mecca. pp. 56-57.
9. Ibid. pp. 57-58.

۱۰۔ طوفان سے ساحل تک۔ ص ۶۹-۶۸

۱۱۔ ایضاً۔ ص ۷۱-۶۸۔ (نوٹ: اس حصہ میں زیادہ تر عبارت مترجم "طوفان سے ساحل تک" کی کتاب سے اخذ ہے۔)

12. The Road to Mecca. pp. 58, 59.

Marfat.com

13. Ibid. p. 60.

14. Ibid. pp. 60-61.

15. Ibid. pp. 61-66.

16. Ibid. pp. 71, 73.

۱۷۔ ''طوفان سے ساحل تک'' ص۹۴-۹۷ (صیہونی یہودیوں کے اس متعصب گروہ کا نام ہے جو اپنا ایک قومی وطن بنانے کے علمبردار ہیں اور بہت کٹر خیالات کے حامل ہیں۔)

18. The Road to Mecca. p. 47.

۱۹۔ طوفان سے ساحل تک۔ص۹۵-۹۶

20. The Road to Mecca. p. 83.

۲۱۔ طوفان سے ساحل تک۔ص۱۰۵-۱۰۶

۲۲۔ ایضاً۔ص۱۰۶-۱۰۷

۲۳۔ ایضاً۔ص۱۰۸-۱۰۹

24. The Road to Mecca. p. 87.

۲۵۔ طوفان سے ساحل تک۔ص۱۰۹-۱۱۰

۲۶۔ ایضاً۔ص۱۱۰-۱۱۱

27. The Road to Mecca. p. 89.

۲۸۔ طوفان سے ساحل تک۔ص۱۱۲-۱۱۴

29. The Road to Mecca. pp. 99-100.

۳۰۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ ترجمان القرآن۔ ج۔ ۴۸۔ عدد۔ ۲،۳، ماہ شعبان و رمضان ۱۳۷۶ھ (مضمون عبدالحمید صدیقی) ص۱۵۴-۱۵۵

31. The Road to Mecca. pp. 100-101.

۳۲۔ ترجمان القرآن' لاہور۔ ج۔۴۸۔ عدد۵ ماہ ذیقعدہ ۱۳۷۶ھ از عبدالحمید صدیقی' ص۲۹۷-۲۹۸۔

33. The Road to Mecca. pp. 263-80.

34. Ibid. pp. 299-310.

۳۵۔ طوفان سے ساحل تک۔ص۱۳۲-۱۳۳

۳۶۔ ہفت روزہ طاہر' لاہور۔ ایڈیٹر مجیب الرحمٰن شامی۔ ج۔۵۔ شمارہ: ۲۰' ۳-۹ مئی ۱۹۷۶ء' ص۶

۳۷۔ ایضاً۔ص۱

Marfat.com

۳۸۔ القرآن۔پ۳۰۔س۔البروج۔ر۔ا۔آیت۲۲۔ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی

۳۹۔ القرآن۔پ۶۔س۔المائدہ۔ر۔ا۔آیت۳ کا حصہ۔ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی

40. Maryam Jamila: Islam in Theory and Practice, publ. Mohd. Yusuf Khan, Sant Nagar-Lahore, 2nd edition, 1973, p. 33.

41. Ibid. p. 41.

(نوٹ: محترمہ مریم جمیلہ صاحبہ محمد اسد صاحب کی طرح نومسلم ہیں اور آپ کا سابق نام مارگریٹ مارکس تھا اور امریکہ نیویارک کی مکین تھیں۔اسلام لانے کے بعد لاہور میں مقیم ہیں۔)

۴۲۔ طوفان سے ساحل تک۔ص۲۳۲-۲۳۴

۴۳۔ ایضاً۔ص۲۳۴-۲۳۵

۴۴۔ ایضاً۔ص۳۳۹

45. The Road to Mecca. p. 251.

۴۶۔ القرآن۔پ۴۔س۔آل عمران۔ر۔۵۔آیت۱۴۴

۴۷۔ ابوبکر صدیق اکبرؓ۔ترجمہ شیخ محمد احمد پانی پتی۔لاہور۔ص۶۲-۶۳

48. The Road to Mecca. pp. 251-2.

۴۹۔ القرآن۔پ۸۔س۔اعراف۔۱۳/۲۳ آیت ۸۸ف

۵۰۔ القرآن۔س۔جن۔ر۔۲۔آیت ۲۱ تا ۲۸

۵۱۔ آئینہ حجاز۔محمد شریف۔زاہد اکیڈمی۔جوہر آباد۔اشاعت اول ۱۹۷۰ء۔ص۵۵۸-۵۶۳

۵۲۔ طوفان سے ساحل تک۔ص۴۰-۲۲۷

53. The Road to Mecca. p. 251.

۵۴۔ طوفان سے ساحل تک۔ص۲۴۰-۲۴۱

۵۵۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔اسلام کا نظام حیات۔اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور دسویں اشاعت جون ۱۹۶۸ء۔ص۴۱

۵۶۔ القرآن۔پ۔ا۔س۔البقرہ۔ر۔۴۔آیت ۳۰ کا حصہ۔ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی

۵۷۔ اسلام کا نظام حیات۔ص۴۱-۴۴

۵۸۔ ایضاً۔ص۴۳-۴۶

۵۹۔ ایضاً۔ص۴۶-۴۸

۶۰۔ مولانا محمد عبدالقیوم ندوی "اسلام کیا سکھاتا ہے" تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور وغیرہ س۔ن۔ص۵۳-۴۶

۶۱۔ القرآن۔پ۔۳۱۔س۔عنکبوت۔ر۔۵/ا آیت ۴۵ کا حصہ: ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی

Marfat.com

۶۲۔ اسلام کیا سکھاتا ہے۔ص۴۶-۴۷

۶۳۔ ایضاً۔ص۴۸-۹۰

۶۴۔ ایضاً۔ص ۴۸-۵۳

۶۵۔ طوفان سے ساحل تک۔ص۲۲۹

۶۶۔ القرآن پ۔۲۶۔س۔حجرات۔ر۔۱۳۔آیت۱۰کا جزو

۶۷۔ اسلام کا نظام حیات۔ص۲۲-۲۴

68. The Road to Mecca. p. 349.

Marfat.com

عبدالحمید صدیقی

شاہ راہِ مکّہ

(تلخیص و تبصرہ)

یورپ میں عام طور پر اسلام اور دنیائے اسلام کے متعلق جس قدر کتب شائع ہوئی ہیں' وہ مواد کے اعتبار سے گھٹیا اور استدلال کے نقطہ نظر سے انتہائی خام ہیں۔ ان کا مطالعہ بالعموم طبیعت پر گراں گزرتا ہے' مگر کبھی کبھی ان میں ایسی تالیفات بھی دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے جو اگرچہ فکر کے اعتبار سے اسلام کی صحیح ترجمانی نہ کرتی ہوں' لیکن لکھنے والے کی طبع سلیم کی غمازی ضرور کرتی ہیں۔ اس قسم کی ایک کتاب پچھلے سے پچھلے سال لندن سے ''روڈ ٹو مکہ'' (Road to Mecca) کے نام سے نہایت ہی اونچے طباعتی معیار کے ساتھ شائع ہوئی۔ اب تک اس کتاب کے تراجم دنیا کی متعدد زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

اس کتاب کے مصنف اسلامی دنیا کی ایک نامور شخصیت جناب محمد اسد ہیں۔ اس سے پیشتر ان کی تالیف ''اسلام دوراہے پر''، صحیح بخاری کے پہلے چار پاروں کا مشرح انگریزی ترجمہ اور مشہور مجلّہ ''عرفات'' اصحاب فکر سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں انہوں نے نہایت ہی ہلکے پھلکے انداز میں' جو ایک سفر نامہ کی صورت میں ہے' اہل یورپ کو اسلامی تعلیمات اور اسلامی دنیا اور اس کے مسائل سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے' جس میں سفر کی دلچسپیوں اور کلفتوں کے ساتھ ساتھ بہت سی کام کی باتیں بھی کہی گئی ہیں اور ان سب کو اس خوبی سے ادا کیا گیا ہے کہ قاری اپنے ذہن پر کوئی بوجھ محسوس نہیں کرتا۔ غالباً ''طبع مغرب'' کے لئے اسلام کو پیش کرنے کا یہی طرز سب سے زیادہ موزوں ہے۔ تصنیف کا ڈھانچہ ناول کا رنگ لئے ہوئے ہے' جس کے دلچسپ واقعاتی پلاٹ میں نظریہ اسلامی کی دعوت جا بجا تھوڑی تھوڑی مقدار میں ڈال دی گئی ہے۔ زبان کی ادبیت بہت ہی اونچے معیار کی ہے۔

آغاز میں علامہ اسد نے مسلم قوم کی نفسیاتی کیفیات کا بڑے اچھوتے انداز سے جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے

Marfat.com

ہیں:

''اس کتاب میں جو سرگذشت بیان کر رہا ہوں' وہ کسی ایسے شخص کی سوانح حیات نہیں جو سیاسی معاملات میں بڑی اہمیت رکھتا ہے' نہ ہی یہ کسی مہم کی داستان ہے۔ یہ کسی ایسے شخص کی آپ بیتی بھی نہیں جس نے بطور خود کوشش کر کے کسی مذہب کی تلاش کی ہو' کیوں کہ اس مذہب کو اس نے از خود نہیں ڈھونڈا بلکہ وہ خود بخود بغیر اس کی جدوجہد کے اس کو مل گیا۔ یہ داستان صرف اس حد تک محدود ہے کہ کس طرح وہ مسلم اقوام کے اندر جذب ہو گیا۔''

اہل یورپ کے لئے شاید سب سے زیادہ حیران کن چیز یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم کے فرد کو محض چند کلمات پر ایمان لانے کی بنا پر قبول کرے' صرف قبول ہی نہ کرے بلکہ اس کے لئے اپنے دائرے کے اندر ممکن حد تک ترقی کی ساری راہیں کھول دے اور اسے اپنا مقتدا اور رہبر تک تسلیم کرنے سے گریز نہ کرے۔ اس معاملہ میں نہ تو وطنی تعصبات حائل ہوں' نہ ہی لسانی اختلافات اور نہ ہی رنگ و نسل کے امتیازات۔ قریب قریب یہی صورت اسد صاحب کے معاملہ میں اہل مغرب کو پیش آئی۔ وہ اس بات پر سخت حیران تھے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک ایشیائی قوم کسی غیر ایشیائی کو اور خصوصاً ایک یورپین کو اتنے اہم منصب پر فائز کر دے کہ وہ یو این او میں اس کی نمائندگی کرے اور وہ بھی ان حالات میں جب کہ سارا عالم اسلام یورپین اقوام کی جارحانہ ملوکیت کی وجہ سے ان سے سخت بدظن ہو چکا ہو۔

انہوں نے ابتدا میں خیال کیا کہ پاکستان نے شاید مغربی قوموں کے اندر کام کرنے کی مخصوص ضرورت کے لحاظ سے ایک یورپین کی خدمات حاصل کی ہیں' مگر جب انہوں نے دیکھا کہ یہ شخص شعور اور جذبہ دونوں کے اعتبار سے مسلم قوم سے ہم آہنگ ہو چکا ہے تو وہ اور بھی ششدر ہوئے۔ یہ بات وہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ کس طرح ایک ایسا شخص جو مغرب میں پیدا ہوا ہو' جس نے مغربی ماحول میں تربیت پائی ہو' وہ پوری طرح بغیر کسی ذہنی تحفظ کے' اپنے آپ کو ملت اسلامیہ میں گم کر دے۔ وہ کیوں اپنے تہذیب و تمدن کو جوان کے نزدیک اسلامی تہذیب و تمدن سے بدرجہا بہتر ہے' ترک کر دے اور بالکل ایک دوسرے رنگ میں رنگ جائے۔ یہ بات جہاں ایک طرف اہل مغرب کے لئے حیرانی کا باعث تھی' وہاں دوسری طرف اس نے فاضل مصنف کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اس بات پر پوری سنجیدگی سے غور کرنے لگے کہ آخر کن وجوہ کی بنا پر اہل یورپ نے یہ فرض کر لیا ہے کہ ان کا تمدن مسلم قوم کے تمدن سے بہتر ہے۔ کیا یہ فیصلہ ان کے غور و فکر کا نتیجہ ہے یا یہ اس تعصب کی کرشمہ سازی ہے جس نے ہر یورپین کے دل میں یہ بات بٹھلا دی ہے کہ جن اقوام کا تہذیبی شجرہ نسب یونانیوں اور رومیوں سے نہیں مل سکتا' وہ سب جاہل اور گھٹیا قومیں ہیں۔ یہ طرز فکر یقیناً حالات کے صحیح مطالعہ میں مانع ہے۔ اسی بناء پر یورپ والوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ دنیا کی اصل تاریخ صرف مغربی تہذیب و تمدن کی ہی تاریخ ہے۔ لہٰذا انہیں صرف اسی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ اور جو کچھ ہے وہ بالکل ناقص اور بیکار ہے۔ اس کا مطالعہ اگر کبھی کیا بھی جائے تو صرف اسی حد تک جہاں تک وہ مغربی تہذیب پر اثر

Marfat.com

انداز ہو۔ ان کے نزدیک یورپ ہی دراصل "معیارِ خوب و ناخوب ہے۔" جو چیز یورپ کے بطن سے پیدا نہیں ہوئی، وہ غلط ہے اور جسے یورپ نے جنم دیا ہے، وہ سراپا خیر ہے۔

پچھلے چند سالوں میں انسان نے زمان و مکاں کی تسخیر میں جو حیرت انگیز ترقی کی ہے، اس سے دنیا کے دور دراز گوشے سمٹ کر ایک دوسرے کے بالکل قریب آ گئے ہیں۔ اب مشرق و مغرب میں وہ پہلا سا حجاب نہیں رہا، جو کبھی تھا۔ اسی بنا پر یورپ نے مشرق اور اس کے مسائل کو سمجھنا بھی شروع کیا ہے اور اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً مشرقی فلسفہ، مشرقی آرٹ اور مشرقی تہذیب عتیق پر کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں، مگر فکر و نظر کی یہ تبدیلی صرف ان تہذیبوں کے بارے میں ہے جن کا مغربی اقدار سے براہ راست کوئی ٹکراؤ نہیں۔ باقی رہا وہ تمدن جسے اسلامی کہا جاتا ہے۔ اس کے متعلق یورپ کا رویہ اب بھی بالکل وہی ہے جو آج سے کئی سو سال پہلے تھا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ آج کا یورپ انتہائی مادیت پرست ہے۔ اس یک رخی ترقی نے اہل یورپ کے سامنے ان گنت نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ وہ اپنے اندر ایک زبردست "روحانی خلا" محسوس کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ انہیں کہیں سے چند ایسی روحانی اقدار مل جائیں جو ان کی بنیادی اور دل پسند اقدار سے متصادم ہوئے بغیر ان کی مضطرب روح کو قدرے سکون بخش سکیں۔ اسی لئے وہ ہندو تہذیب کی روحانیت خصوصاً بدھ مت سے بے حد متاثر ہیں اور اس کے بارے میں وہ نہایت ہی ہمدردانہ جذبات بھی رکھتے ہیں۔

اس کے برعکس جب وہ اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام بذات خود ایک مکمل ضابطہ حیات اور پورا نظام فکر و عمل ہے، جس میں اگر ایک طرف خدا اور بندے کے رشتے سے بحث کی گئی ہے تو دوسری طرف انسان اور انسان کے تعلقات پر بھی پوری شرح و بسط سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے متعلق اسلام نے جامع و مانع احکام نہ دیئے ہوں۔ ایک ہی نقطہ نظر اور ایک ہی طرز فکر سے حیات انسانی کے سارے پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اسلام کی روحانیت کوئی ایسی چیز نہیں جسے اس کے باقی شعبوں سے الگ کر کے اپنایا جا سکے۔ اس دنیا کی زندگی کو ایک خاص طرز سے بسر کرنے کا نام ہی دراصل اسلام ہے۔ یہی روحانیت ہے اور یہی مادیت، یہی دنیا ہے اور یہی دین۔ ان دونوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں۔ اسلام میں جو چیز عقیدہ کی شکل میں روحانیت کہلاتی ہے، وہی جب معرض وجود میں آتی ہے تو دین نام پاتی ہے۔ اس بنا پر اسلام کے کسی جزو کا کسی دوسرے نظام فکر سے پیوند نہیں لگایا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ دین کسی دوسرے کو گوارا کرتا ہے۔

اہل یورپ اگر کبھی اسے قبول کر سکتے ہیں تو صرف اپنا پورا نظام حیات بدل دینے کے بعد، ورنہ مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کے ملاپ کی کوئی دوسری صورت ممکن نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے یورپ نے اسلام کو ہمیشہ سے نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ ابھی تک یورپین اقوام کے دل و دماغ میں صلیبی جنگوں کی یاد پوری طرح تازہ ہے۔ ان جنگوں نے اگر یورپ کو ایک طرف یک جہتی عطا کی تو دوسری طرف انہیں اسلام سے پوری طرح بدظن بھی کر دیا۔ فاضل مصنف اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

Marfat.com

"صلیبی جنگوں کے تجربات نے یورپ کو ایک تہذیبی شعور اور اتحاد عطا کیا' لیکن اسی تجربہ نے اسلام کے معاملہ میں ان کے دل میں بے حد تعصب بھی پیدا کیا۔ صلیبی جنگوں سے مراد محض کشت وخون نہیں۔ قوموں کے درمیان کتنی ہی لڑائیاں لڑی گئیں اور پھر ان کی یاد دلوں سے محو ہو گئی۔ صلیبی جنگوں سے جو نقصان ہوا' وہ صرف اسلحہ کی حد تک ہی محدود نہ رہا' بلکہ یہ زیادہ تر ایک علمی نقصان ثابت ہوا یعنی ایک سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق اسلامی تعلیمات کو توڑ موڑ کر اس طرح پیش کیا گیا کہ اہل یورپ اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے متنفر ہو گئے۔ اب اگر صلیبی جنگوں کی یاد باقی رکھنا یورپین مفادات کے لئے بے حد ضروری ہے تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ "مسلمانوں کے ہادی" کو عیسائیت کا دشمن کہا جائے اور آپ کی پیش کردہ تعلیمات کو بداخلاقی کا سرچشمہ منوایا جائے۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں اس خیال کو یورپین دل و دماغ میں پیوست کیا گیا کہ اسلام کشت وخون کی تعلیم دیتا ہے۔ اس میں سارا زور چند رسومات کی ادائیگی پر ہے اور حقیقی تزکیہ نفس کی اس میں سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اسی دور میں خدا کے رسولؐ کا نام تک مسخ کر کے سامنے لایا گیا۔ وہ رسولؐ جس نے اپنے پیروؤں کو سارے انبیاء کی تعظیم کرنے کی تعلیم دی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ آزادیٔ فکر سے بالکل ناآشنا تھا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر وہاں کے بااختیار لوگوں نے دین اسلام اور تہذیب اسلامی کے خلاف نفرت کے بیج بو دیے...... تاریخ کی یہ ستم ظریفی ہے کہ اسلام کے خلاف یورپ کی نفرت جو سراسر مذہبی تھی' آج بھی اس کے ذہن میں محفوظ ہے۔ اگرچہ اب یورپ مذہب سے تو بہت حد تک آزاد ہو گیا ہے' مگر اسلام کے معاملہ میں اس کے تعصبات اسی طرح قائم ہیں۔ اس میں کوئی چیز بھی حیران کن نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی ان سارے مذہبی افکار کو جو بچپن میں اس پر ٹھونسے گئے تھے' ترک کر سکتا ہے' مگر تازیست اس کے ذہن کے دور دراز گوشوں میں ان افکار سے متعلق چند جذبات ضرور باقی رہتے ہیں۔
اسی وجہ سے آج بھی یورپ کے تحت الشعور میں ان صلیبی جنگوں کے اثرات بدستور موجود ہیں۔"

انہیں اثرات کو دور کرنے کی فاضل مصنف نے اس کتاب میں کوشش کی ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے سفر کی داستان بیان کرتے ہوئے دنیائے اسلام اور تعلیمات اسلامی کے متعلق یورپ کو آشنا کیا ہے۔

جناب محمد اسد پولینڈ کے ایک شہر لو (Luow) جو اس وقت آسٹریلیا [آسٹریا] کے قبضہ میں تھا' ۱۹۰۰ء میں ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم خاندانی روایات کے مطابق گھر پر ہی حاصل کی۔ وہ تیرہ سال کی عمر میں عہد نامہ عتیق عبرانی زبان میں بڑی آسانی کے ساتھ پڑھ سکتے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب انہوں نے اپنے آبائی مذہب یہودیت کے متعلق غور وفکر کرنا شروع کیا۔ چنانچہ اس کے متعلق وہ اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہ بات یقینی ہے کہ مجھے ان اخلاقی اصول وضوابط سے کوئی اختلاف نہ تھا' جن پر یہودی مقدس کتب

Marfat.com

میں زور دیا گیا ہے' نہ مجھے انبیائے یہود کی خدا شناسی کو قبول کرنے میں کوئی تامل تھا' لیکن میں نے دیکھا کہ عہد نامہ عتیق اور تالمود کا خدا ان رسومات پر غیر معمولی حد تک زور دیتا ہے' جس کے ذریعہ انہیں اس کی پرستش کرنی چاہیے۔ میں نے اس پر بھی غور کیا کہ اس خدا کا صرف ایک عبرانی قوم سے ہی تعلق کیوں ہے اور وہ صرف اسی کی قسمت کے بارے میں کیوں سوچتا ہے۔ وہ کوئی پوری نوع انسانی کا رب نہ تھا' بلکہ صرف ایک قبائلی دیوتا تھا جس کا مقصد ساری انسانیت کو اپنے ان ''چہیتوں'' کی ضروریات کے تابع کرنا تھا۔ یہ چہیتے جب نیک راہ پر چلتے' وہ انہیں فتوحات سے نوازتا اور اگر غلط راہ اختیار کرتے تو انہیں کافروں کے ہاتھ سے سزا دلواتا۔ تعلیمات میں ان اصولی خامیوں کے پیش نظر مجھے بعد کے انبیاء کے اخلاقی ضابطوں میں وہ ہمہ گیری نظر نہ آئی جو دراصل ہونی چاہیے تھی۔''

مذہب کے اس تنگ تصور نے انہیں مذہب سے متنفر کر دیا اور اس معاملہ میں ان کی بچپن کی تعلیم ذرا کام نہ آئی۔ وہ برابر مذہب اور اس کے ''تکلفات'' سے دور ہوتے چلے گئے۔ اسی اثناء میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی اور جناب اسد صاحب فوج میں ایک فرضی نام کے ساتھ بھرتی ہو گئے۔ جنگ کے خاتمے پر انہوں نے آرٹ' ادب اور اسی طرز کے دوسرے موضوعات پر مطالعہ شروع کیا' مگر اس مطالعہ میں کوئی ترتیب نہ تھی' جس کی وجہ سے ان کے ذہن کو سکون نصیب نہ ہو سکا۔

جنگ کے بعد یورپ جس زبردست قسم کے روحانی بحران سے دوچار ہوا' اس کے بارے میں فاضل مصنف نے اپنا مطالعہ و تاثر تفصیل سے ہمارے سامنے رکھا ہے۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ مدعا یہ ہے:

''جنگ اگرچہ ختم ہو چکی تھی مگر لوگوں میں طمانیت قلبی نہ تھی۔ وہ ہراساں اور انتہائی پریشان تھے۔ ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں نفرت اور حسد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ پرانی اقدار جن پر ابھی تک یورپین معاشرت قائم تھی' ایک ایک کر کے ختم ہو رہی تھیں اور ان کی جگہ نئی اقدار جنم لے رہی تھیں۔ اس وقت یورپ کے پاس کوئی اخلاقی معیار ایسا نہ تھا جسے سب کے سامنے پیش کیا جا سکے اور وہ اسے قبول کرے۔ سائنس کا نعرہ تھا ''ادراک ہی سب کچھ ہے'' مگر اسے معلوم نہ تھا کہ ادراک بغیر اخلاقی نصب العین کے بالکل بیکار ہے اور وہ تباہی اور بربادی کی طرف لے جانے والا ہے۔ معاشرتی مصلحین' انقلاب کے شیدائی اور اشتراکی سب کے سب خارجی تبدیلیوں میں ہی انسانی فلاح ڈھونڈ رہے تھے۔ دوسری طرف خدا کے پرستار اصلی مشن کو فراموش کر چکے تھے۔ ان کا کام اب صرف اسی قدر رہ گیا تھا کہ وہ اپنے ذہن میں من مانے خیال گھڑ گھڑ کر انہیں خالق کائنات کی طرف منسوب کرتے رہیں۔ مذہب کوئی حیات آفریں اور زندہ جاوید تحریک نہ تھی' بلکہ یہ چند بے جان رسومات کا مجموعہ بن چکا تھا۔ ذہین لوگ جب یہ دیکھتے کہ خدا کی جو صفات یہ مذہبی لوگ بیان کر رہے ہیں۔ دنیا کے واقعات ان کی برابر تردید کرتے جا رہے ہیں' تو وہ مذاہب کو ہی خیر باد کہہ دیتے۔ اس وقت مجھے اس بات کا شدید احساس

Marfat.com

ہوا کہ کسی ایسے طرز زندگی کی تلاش کی جائے جو حیات انسانی کو شاد کام بنا دے۔ چنانچہ اس کی جستجو میں میں پہلے آرٹ کی طرف متوجہ ہوا۔ میرا خیال تھا کہ آرٹ کا اصل مقصد یہ ہے کہ خارجی زندگی کے مختلف شعبوں میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں' ان کی علت ہمیں سمجھائے اور یہ بتائے کہ ظاہری سطح کے نیچے ایک پلان کام کر رہا ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے' وہ ظاہر میں ہے' باطن میں نہیں اور زندگی کے سارے سرچشمے ایک ہی مرکز سے پھوٹتے ہیں۔ زندگی حقیقت میں ہم آہنگ ہے' خواہ وہ ہم رنگ نہ ہو۔ بدقسمتی سے جو نصاب مجھے پڑھایا جا رہا تھا' وہ مجھے مطمئن نہ کر سکا۔ میرے اساتذہ بھی میری تشفی نہ کر سکے' چنانچہ میں آرٹ کے مطالعہ کو چھوڑ کر نفسیات کی طرف متوجہ ہوا۔

علم نفسیات میں مجھے بے حد دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس میدان میں وقت کی ایک عظیم الشان علمی تحریک کام کر رہی تھی۔ اس نے لوگوں کے فکر کے زاویوں کی لکیر کو بدل دیا۔ انسان نے ظاہری اعمال کے پس پردہ جھانک کر ان محرکات کا کھوج لگانا شروع کیا جن کی وجہ سے وہ معرض وجود میں آتے ہیں۔ اس سے انسان کی توجہ خارج سے ہٹ کر داخلی کیفیات کی طرف مبذول ہوئی۔ مجھے خاص طور پر فرائڈ کے نظریات نے بے حد متاثر کیا اور میں کئی شامیں وائنا کے مشہور ہوٹل میں الفرڈ' اڈلر اور ہرمان کے ساتھ گذارتا اور ان کی دلچسپ گفتگو سے محظوظ ہوتا۔ اگرچہ مجھے اس سائنس کے اصول ومبادی اور اس کے طرز تحقیق سے کوئی زیادہ اختلاف نہ تھا' مگر مجھے اس علم کی بے جا خود اعتمادی پسند نہ آئی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسانی اعمال جن کے محرکات انتہائی پیچیدہ اور الجھے ہوئے ہیں' انہیں علم کیمیا کی طرح سادہ اجزا میں تحلیل کیا جا سکے اور ان کے بارے میں قطعیت سے یہ کہا جا سکے کہ ان کا محرک شہوانی یا اسی قسم کا کوئی اور سفلی جذبہ ہی ہے۔''

اسد صاحب کی تائید میں ہم یہ کہیں گے کہ جس طرح انسان کا جسم بے حد پیچیدہ ہے اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدگی اس کے احساسات میں پائی جاتی ہے۔ شاید کسی گہرے سے گہرے سمندر میں اس قدر گہرائی نہ ہو جتنی کہ انسان میں ہے' اس لئے اس کی سطح پر تیرتی ہوئی چند سیپیوں کو' جو اوپر کی لہروں میں گم تھیں' دریافت کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یہ ماہرین نفسیات سمندر کی تہہ سے موتی ڈھونڈھ لائے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان چونکہ نرا حیوان ہے' اس لئے انہوں نے اس کے اعمال کے محرکات کو بھی سراسر اس کے حیوانی پہلو میں تلاش کیا ہے۔ کاش اسد صاحب تحلیل نفسی پر اس نقطہ نظر سے بحث کرتے۔

مغربی ذہن چونکہ انسانیت کے بارے میں ایک انتہائی مایوس کن اور تاریک تصور رکھتا ہے' اس لئے اس نے تحلیل نفسی میں انسان کے تاریک ترین پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی ہی کوشش کی ہے۔ اس کا ادعا یہ ہے کہ وہ اعمال جو بظاہر نہایت ہی پاک اور شریفانہ معلوم ہوتے ہیں' ان کے محرکات بھی انتہائی ذلیل اور گھناؤنے ہیں۔ نیکی' تقویٰ' شرافت' دیانت' صداقت ایسے انسانی اخلاق جن کو دنیا نے ہمیشہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور جن کی ہمیشہ انسانوں

Marfat.com

نے قدر کی، وہ بھی اپنے اصل کے اعتبار سے نہایت گھٹیا اور پست ہیں۔ تبصرہ نگاہ کا خیال ہے کہ شرافت کی اقدار کی جس قدر مٹی تحلیل نفسی نے پلید کی ہے، وہ شاید کسی اور نے نہیں کی۔ پھر انسانی اعمال کو اس طریقہ پر تحلیل کرتے ہوئے اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ یہ تجزیہ سراسر ایک سلبی یا منفی حیثیت رکھتا ہے۔ چلیے ایک لحہ کے لئے ہم یہ فرض کر لیتے ہیں۔ تحلیل نفسی سے ہم ان ذہنی الجھنوں کا کھوج لگا لیتے ہیں جو انسان میں بعض خارجی وجوہات کی بنا پر پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہم یہ بھی مان لیتے ہیں کہ علم نفسیات ان الجھنوں کو دور کرنے میں بالکل کامیاب بھی ہو جاتا ہے اور اس وجہ سے اس کی زندگی بالکل متوازن ہو جاتی ہے، مگر اصل سوال اپنی جگہ پر موجود رہتا ہے کہ اس متوازن زندگی کو کس کام میں لگایا جائے، اسے کس مقصد میں کھپایا اور صرف کیا جائے۔ نفسیات زیادہ سے زیادہ ہمیں نقطہ صفر (Zero point) پر لا کر چھوڑ دیتی ہے، لیکن انسان جب تک انسان ہے کبھی بھی اس نقطہ پر قانع نہیں ہو سکتا۔ اسے بہر حال زندگی گزارنے کے لیے ایجابی طور پر کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ زندگی بغیر چند ایجابی اقدار کے کبھی گزاری نہیں جا سکتی۔ تحلیل نفسی کے ماہرین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کی بے شمار الجھنیں ایسی ہیں جن کو بعض زبردست قسم کے ایجابی محرکات ہی دور کر سکتے ہیں۔ اس معاملہ میں رضاء الٰہی کا حصول فکر آخرت اور چند پاک باز انسانوں کی پیروی کا جذبہ میرے نزدیک چند ایسے طاقتور محرکات ہیں جو ہماری بہت سی نفسیاتی الجھنوں کو دور کرنے میں بہت زیادہ ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

فاضل مصنف کا حساس دل صنفی انارکی کے اس سیلاب سے بھی بے حد متاثر ہوا جو یورپ میں خطرناک تیز رفتاری کے ساتھ پھیل رہا تھا۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ خیال کہ سائنس کی ترقیاں اسے معاشرتی اعتبار سے بھی ترقی کی راہ پر لے جا رہی ہیں، بالکل خام ہے۔ آزادی جس شے کے لئے لوگوں میں بے حد تڑپ تھی اور جس کے حاصل کرنے کے لئے انہوں نے نہ صرف جسمانی قربانیاں دیں بلکہ اپنی ان اقدار کو بھی قربان کر دیا، جن پر کہ ان کا معاشرہ قائم تھا، وہ اپنے چاہنے والوں کے لئے وبال جان بنتی جا رہی ہے۔

اس مضطرب کیفیت میں زندگی اس قلب سلیم پر گراں ہو رہی تھی، چنانچہ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ زندگی کو اب کسی دوسرے کی مستعار عینک سے نہیں دیکھیں گے بلکہ وہ زندگی کے تلخ و شیریں حقائق سے خود دوچار ہو کر اس کے تجربات حاصل کریں گے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اخبار نویسی کا پیشہ اختیار کرنے کا عزم کیا۔ اس کا حصول کوئی آسان کام نہ تھا، مگر وہ اپنی خداداد ذہانت، تندہی اور محنت شاقہ سے اس مقصد میں کامیاب ہوئے اور یونائیٹڈ ٹیلیگراف کے نمائندے کی حیثیت سے انہوں نے اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ اس سفر کے دوران ہی میں انہوں نے اسلام ایسی نعمت عظمیٰ کو پایا۔ وہ سب سے زیادہ مسلمانوں سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ لوگ اپنی گئی گزری حالت میں بھی مغرب کے مقابلہ میں زیادہ قانع ہیں۔ قناعت کی یہ اندرونی کیفیات جن کے پرتو ان کی خارجی زندگی پر بھی پڑ رہے تھے، اسد صاحب کے لئے جاذبیت کا باعث بنے اور اس سے انہوں نے اس عظیم فرق کی علت معلوم کرنے کی کوشش کی جو مسلمانوں اور یورپین کے درمیان پایا جاتا ہے۔ یہی تلاش و جستجو انہیں اسلام کے قریب لے آئی اور بالآخر

Marfat.com

انہوں نے اسے پورے شعور اور جذبات کے ساتھ قبول کرلیا۔

اسلام کے سرچشمہ تک پہنچنے کے لئے انہیں جن راہوں پر سے گزرنا پڑا' ان کی تفصیلات بڑی ہی دلچسپ ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے انسانی فطرت کے چند بنیادی سوالات پر سوچنا شروع کیا مثلاً خیر وشر کیا ہے؟ تقدیر کیا ہے؟ ایک فرد اپنی زندگی کو کس طریق پر ڈھالے جس سے اس کی زندگی اور تقدیر ایک ہو جائیں؟ اس قسم کے سوالات ان کے ذہن میں ہمیشہ ہجوم کرتے۔ وہ ان کے جوابات کے ہر وقت آرزومند تھے۔ ذہن کا یہ اضطراب انہیں کبھی سکون واطمینان سے بیٹھنے نہ دیتا۔

یہ تھی ان کی داخلی کیفیت۔ خارجی زندگی بھی پریشان کن تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپ کے اخلاقی و معاشرتی انحطاط نے اہل یورپ کو سخت مایوس کر دیا تھا۔ اس یاس وقنوطیت کے اثرات کو کم کرنے کے لئے انہوں نے گانے بجانے' مصوری اور تھیٹر کی طرف توجہ کی اور ان مصنوعی طریقوں سے اپنے غم کو فرحت وانبساط میں تبدیل کرنے کی سعی کی۔ اس میں کسی حد تک وہ کامیاب تو ہوئے مگر وہ روحانی کمی جو درحقیقت کسی انسان سے اس کا سکون واطمینان چھین لیتی ہے' وہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ اہل یورپ کا اب ایک ہی نصب العین تھا کہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ دنیاوی فوائد ولذائذ سمیٹے جائیں۔ نقطہ نظر کی اس بنیادی تبدیلی کی وجہ سے یورپ میں رہنے والا ہر فرد خود غرضی کا پتلا بن گیا۔

اپنے ان تاثرات کو انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

''میں اگرچہ جوان تھا' مگر یہ امر مجھ سے پوشیدہ نہ تھا کہ پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے بعد بھی یورپ نے اپنی زندگی کے زاویے کو درست نہیں کیا۔ اہل یورپ کا حقیقی خدا کوئی روحانی قسم کا نہ تھا۔ ان کا معبود صرف مادی آسائش تھی اور اس کو حاصل کرنے کے لئے وہ ہمیشہ سرگرم رہتے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ میں اس وقت بھی ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جو دینی طریقہ پر سوچتے ہیں اور مذہبی احساس رکھتے ہیں اور اپنے عقائد کو اپنی تہذیبی روح کے ساتھ منطبق کرنے میں امکانی کوشش بھی کرتے ہیں' مگر یہ مستثنیٰ مثالیں ہیں۔ یورپ کا عام اور متوسط آدمی خواہ وہ جمہوریت پر ایمان رکھتا ہو یا فاشزم پر۔ سرمایہ دار ہو یا اشتراکی' جسمانی مشقت کرنے والا ہو یا دماغی محنت کرنے والا' وہ ایک ہی مذہب رکھتا ہے اور وہ مادی ترقی کی پرستش ہے اور اس کی غایت حیات یہ ہے کہ وہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ آسان' پُر راحت اور عام محاورے کے مطابق قدرت سے آزاد بنائے۔ اس مذہب کے معابد بڑے بڑے کارخانے' کیمیاوی دارالصنعت' ناچ گھر اور بجلی کے مراکز ہیں۔ اس مذہب کے پیشوا بنکوں کے افسر' انجینئر' اداکار اور بڑی بڑی صنعتوں کے ناظمین اور ریکارڈ قائم کرنے والے ہوا باز ہیں۔ یہاں اخلاقی انحطاط کا اندازہ اس ایک امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ لوگ ابھی تک اس بات پر متفق نہیں ہوسکے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے۔ انہوں نے اپنے سارے معاشی اور معاشرتی مسائل کو ایک ہی

Marfat.com

اصول سے حل کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ ہے ''عملی افادیت'' اور یہ وہ حسینہ ہے جو اپنے آپ کو ہر وقت اس شخص کے سپرد کرنے کے لئے تیار رہتی ہے جو اسے حاصل کرنے کی ذرا بھی آرزو رکھتا ہو۔ قوت اور مسرت کے اس چٹور پن کا لازمی اثر یہ ہے کہ مغربی سوسائٹی ایسے متحارب گروہوں اور جماعتوں میں بٹ گئی ہے جو ہمیشہ کیل کانٹے سے لیس اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ جب کبھی ان کے مفادات ٹکرائیں تو وہ ایک دوسرے کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیں۔ تمدنی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں انسانوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جس کا اخلاق اس کے دنیاوی فوائد کا تابع ہے اور جس کے نزدیک خیر و شر کا بلند ترین معیار مادی کامیابی ہے۔

میں نے دیکھا کہ ہماری زندگی کتنی پریشان کن اور دکھی ہے۔ ہم ہر وقت اجتماعیت' قوم اور ملت پکارتے رہتے ہیں' مگر اس کے باوجود انسان اور انسان کا باہمی رشتہ کمزور ہو گیا ہے۔ ہمارے احساسات نے ایک نہایت غلط صورت اختیار کر لی ہے۔ میں یہ حالات خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا' لیکن مجھے دوسرے اہل مغرب کی طرح کبھی اس بات کا گمان تک نہ ہوتا کہ ہم ان پیچیدگیوں کے حل تلاش کرنے کے لئے یورپ سے باہر والی دنیا کی طرف بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے فکر کا رقاص اپنی تہذیب کے اردگرد ہی گھومتا تھا۔''

فاضل مصنف کے دل میں ابھی اس قسم کے احساسات پرورش پا رہے تھے کہ انہیں ایک چینی حکیم Lao-tse کی کتاب ہاتھ لگی۔ اس کتاب کے ذریعہ جناب اسد صاحب پہلی بار ایک ایسے سماج سے متعارف ہوئے جو ہر قسم کی رقابتوں' ریشہ دوانیوں' زبردست آزاریوں سے پاک تھا۔ اس کتاب نے انہیں اس حقیقت کی طرف بھی رہنمائی دی کہ مادی ترقی خواہ انسانی زندگی کے لئے کتنی ضروری اور فائدہ مند ہو' مگر اسے کبھی بھی منتہائے مقصود نہیں ٹھہرایا جا سکتا' اس لئے جو لوگ صرف خارجی ماحول یعنی معاشی' سیاسی اور معاشرتی حالات میں تبدیلی کر دینے سے انسانیت کو آرام و سکون میسر کرنے کے آرزومند ہیں' وہ جنت الحمقا میں بستے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''مجھے یہ تو علم نہ تھا کہ اس پریشانی کا حل مجھے کہاں ملے گا' مگر میرے ہمعصروں نے مادی ترقی سے جو امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں' مجھے ان پر کوئی بھروسہ نہ رہا۔''

جناب اسد صاحب اس قسم کی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے کہ انہیں اپنے ایک ماموں کے ہاں سے جو فلسطین میں رہتا تھا' آنے کی دعوت موصول ہوئی' جس کو انہوں نے بخوشی قبول کیا اور اخبار کی ملازمت ترک کر کے وہاں روانہ ہو گئے۔ انہوں نے اس سرزمین کے حسن کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اور یہی چیز ان کے لئے باعث کشش تھی اور یہ علم نہ تھا کہ تقدیر ان کے لئے کچھ دوسرے فیصلے کر چکی ہے۔ اسلام کے متعلق ان کی معلومات صرف اسی قدر تھیں کہ یہ بھی زندگی کے دوسرے حادثات کی طرح ایک تاریخی حادثہ ہے اور اخلاقی اور روحانی اعتبار سے یہ مسیحیت اور یہودیت سے کسی صورت بھی بہتر نہیں' بلکہ ان سے کہیں کم تر ہے۔

Marfat.com

دوران سفر میں وہ عربوں کی زندگی سے متعارف ہوئے۔اس زندگی میں بے شمار خامیاں تھیں' مگر اسد صاحب کو جس چیز نے بے حد متاثر کیا' وہ ان کی فراخدلی اور اطمینان قلب تھا۔وہ اس بات پر سخت حیران تھے کہ یہ لوگ کیوں کر ہر شخص کی مہمان نوازی میں اس قدر مسرت محسوس کرتے ہیں۔وہ غریب اور نادار ہیں مگر اس کے باوجود طمانیت قلب کی دولت سے مالا مال ہیں۔ان کے ذہنوں میں مال و دولت سمیٹنے کا ہسٹیریا نہیں۔وہ ہر حال میں اپنی تقدیر پر قانع ہیں۔

اسد صاحب نے اپنے ماموں کے ساتھ یروشلم کے شہر میں رہنا شروع کر دیا۔ان کا مکان برلب سڑک تھا اور وہ ہر وقت آتے جاتے قافلوں کو دیکھتے رہتے۔اس منظر نے ان کے ذہن کو جس طرح متاثر کیا' وہ پڑھنے کے قابل ہے۔وہ فرماتے ہیں:

''یہ لوگ غریب اور چیتھڑوں میں ملبوس تھے' مگر ان کی حرکات وسکنات سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ بہت بڑے نواب ہیں۔جب وہ اکٹھے زمین پر کھانے کے لئے بیٹھتے اور روکھی سوکھی روٹی پنیر یا زیتون کے ساتھ کھانا شروع کرتے تو مجھے ان کی زندگی کا یہ بے ساختہ پن اور ذہنی اور قلبی اطمینان بے حد متاثر کرتا۔

دن میں کئی مرتبہ نماز کے لئے جمع ہوتے۔تمام لوگ' ایک امام کے پیچھے ایک لمبی قطار میں کھڑے ہو جاتے۔وہ اکٹھے ہی مکہ کی طرف منہ کر کے اپنے امام کی پیروی میں قیام' رکوع اور سجود کرتے۔

مسلمانوں کی اس نماز کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک سول پیدا ہوا اور وہ یہ تھا کہ حقیقی عبادت کے ساتھ جسمانی حرکات کس طرح ہو سکتی ہیں۔اپنی اس خلش کا اظہار میں نے ان کے امام سے کیا اور اس سے پوچھا۔

'کیا تمہارا واقعی اس بات پر ایمان ہے کہ خدا تم سے عبادت کے وقت قیام' رکوع اور سجود ایسی جسمانی حرکات کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم خاموشی کے ساتھ دل کی گہرائیوں سے یاد الٰہی میں مصروف ہو۔آخر ان جسمانی حرکات کا کیا فائدہ ہے۔'

امام میرے اس سوال سے بالکل رنجیدہ نہ ہوا' وہ ذرا مسکرایا اور پھر کہا۔

'ہم اس طریقہ کو چھوڑ کر عبادت کا کونسا دوسرا طریقہ اختیار کریں۔کیا ہمارے رب نے ہماری روح کے ساتھ ہمارا جسم پیدا نہیں کیا اور اگر حقیقت یہی ہے' تو کیا ہم پر لازم نہیں آتا کہ ہم اپنے روح کے ساتھ اپنے جسم کو عبادت کا بھی ثبوت دیں۔سنئے کہ ہم مسلمان اس طرح کیوں عبادت کرتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم اپنے چہروں کو خانہ کعبہ کی طرف پھیرتے ہیں۔مسلمان جہاں کہیں ہوں گے' نماز کے وقت اسی طرف متوجہ ہوں گے۔یہ اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ پوری مسلم قوم ایک جسم ہے اور ہمارے خیالات کا مرکز صرف خدا ہے۔اس کے بعد ہم سیدھے کھڑے ہوتے ہیں اور اس ایمان

Marfat.com

کے ساتھ قرآن پاک کی آیات تلاوت کرتے ہیں کہ یہ اس کا اپنا کلام ہے اور ہمیں اس سے اس لئے نوازا گیا ہے کہ ہم نیکی اور پرہیزگاری کی راہ پر گامزن ہوں۔ پھر ہم اللہ اکبر کہتے ہیں اور یہ کلمہ ہمارے اندر یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ کوئی بھی اللہ کے علاوہ معبود نہیں' اس لئے صرف وہی اکیلا ہی پرستش کے لائق ہے۔ اس کے بعد ہم رکوع میں جاتے ہیں اور اس کی بزرگی بیان کرتے ہیں۔ پھر پیشانیاں زمین پر رکھ دی جاتی ہیں اور یہ حرکت اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ اس بزرگ و برتر ہستی کے سامنے ہماری حیثیت مشت خاک سے زیادہ کچھ بھی نہیں' وہی ہمارا رب اور کارساز ہے۔ اس کے بعد ہم اپنے چہروں کو اٹھا لیتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی اور رحمتوں کے نزول کے لئے دعائیں مانگتے ہیں۔ پھر سجدہ میں چلے جاتے ہیں اور دوبارہ اٹھ کر کچھ وقفہ کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس اثنا میں ہم خدا تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ محمد رسول اللہ کو (جن کے ذریعہ ہمیں یہ پیغام ملا) اپنے پیشرو انبیا کی طرح اپنی خاص رحمتوں سے نوازے۔ وہ ہم پر بھی اور ان لوگوں پر بھی جو حق کے راستے پر گامزن ہوئے' اپنا کرم کرے۔ وہ ہمیں اس دنیا میں بھی بھلائی عطا فرمائے اور آخرت میں بھی۔ آخر میں ہم اپنے چہروں کو دائیں اور بائیں پھیرتے ہوئے کہتے ہیں 'تم پر اللہ کی رحمت اور سلامتی ہو' یہی وہ طریقہ ہے جس کے مطابق ہمیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کرنا سکھائی ہے تاکہ ہم ازخود اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیں۔ یہی دراصل اسلام ہے اور اسی طرح ہم اپنے خالق اور مقدر کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکتے ہیں۔'

''کافی مدت گزر جانے کے بعد مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ حاجی کی اس سادہ تشریح نے میرے لئے اسلام کے پہلے دروازے کو کھول دیا ہے۔ اسلام لانے کے بہت پہلے' جب مجھے کبھی اس بات کا گمان تک نہ تھا کہ میں اس دین پر ایمان لے آؤں گا۔ میں جب کبھی بھی کسی شخص کو ننگے پاؤں کسی کپڑے یا چٹائی یا زمین پر سر جھکائے ہاتھ سینے پر رکھے اور اپنے آپ میں غرق پاتا تو میرا اپنا دل ایک خاص قسم کے عجز سے لبریز ہو جاتا۔''

کچھ مدت کے بعد اسد صاحب کو فلسطین کی سیاست سے بھی دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ اس سے پیشتر ان کے دل میں یہ خیال تھا کہ فلسطین میں عربوں کی آبادی یہودیت کی نسبت بہت کم ہے' مگر جب حقیقت حال کا مطالعہ شروع کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ ملک تو دراصل عربوں کا ہے اور اس میں ان کی تعداد یہودیوں سے پانچ گنا زیادہ تھی۔ جب انہوں نے اس مسئلہ کے متعلق صیہونی تحریک کے صدر سے گفتگو کرنا چاہی تو اس نے نہایت نفرت بھرے لہجے میں کہا:

''ہمارے خلاف عربوں کی کوئی تحریک نہیں۔ ایک ایسی تحریک جس کی جڑیں عوام کے دلوں میں گہری نصب ہوں۔ جسے عام طور پر مخالفت سمجھا جا رہا ہے وہ چند شر پسند لوگوں کی محض نعرہ بازی ہے۔ یہ لوگ چند مہینوں یا سالوں کے بعد خود بخود ہی ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔''

Marfat.com

علامہ اسد صاحب اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صیہونی تحریک کے صدر کا یہ جواب مجھے کسی صورت میں بھی مطمئن نہ کر سکا۔ مجھے آغاز ہی سے اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ یہودیوں کی فلسطین کی سرزمین میں آبادکاری بالکل مصنوعی ہے اور اس کا سب سے برا پہلو یہ ہے کہ اس طریق سے اہل یورپ مغربی زندگی کی ساری پیچیدگیوں اور پریشانیوں کو ایک ایسی سرزمین میں منتقل کر دینے کا ارادہ کر چکے ہیں جو اس سے پیشتر اس قسم کی الجھنوں سے بالکل پاک تھی۔ یہودی وہاں اس طرح نہیں آ رہے تھے جس طرح کہ کوئی بن باس سے واپس آتا ہے۔ اس کے برعکس وہ یورپین طرز پر یورپین مقاصد کے ساتھ ایک ملک تعمیر کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے گھر ہی میں بالکل اجنبی تھے۔ جب بھی عرب یہودیوں کے ان عزائم کے خلاف جدوجہد کرتے تو مجھے کوئی حیرت نہ ہوتی' بلکہ اس کے برعکس مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ اس وقت دراصل عرب ہی ستم کا تختہ مشق بنے ہوئے ہیں اور وہ اس قسم کے غاصبانہ رویہ کے خلاف اپنی مدافعت کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں۔ اگرچہ میں اپنے نسب کے اعتبار سے یہودی ہوں' لیکن مجھے صیہونیت سے ایک طرح کی نفرت تھی۔ مجھے نہ صرف عربوں سے ہمدردی تھی بلکہ مجھے یہ بات اخلاق کے بالکل منافی نظر آتی کہ کچھ لوگ بیرونی طاقت کے سہارے باہر سے لا کر ایک ملک میں اس نیت سے آباد کئے جائیں کہ انہیں چند سالوں میں وہاں کی اکثریت بنانا ہے۔ جب کبھی بھی یہ مسئلہ سامنے آتا تو میں ہمیشہ عربوں کی حمایت کرتا۔ میرا یہ طرزِ عمل سارے یہودیوں کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ ہمیشہ اس حقیقت تک پہنچنے سے قاصر رہے کہ میں کیوں عربوں کی حمایت کرتا ہوں۔ عرب ان کے نزدیک پس ماندہ افراد کا ایک گروہ تھا اور وہ انہیں اس سے بھی زیادہ نفرت و حقارت سے دیکھتے جتنے کہ یورپین آبادکار وسطی افریقہ میں وہاں کے اصلی باشندوں کو دیکھا کرتے۔ عربوں کے خیالات و تصورات سے انہیں قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کے ذہن میں یہ خیال اچھی طرح راسخ ہو چکا تھا کہ فلسطین یہودیوں کا ملک ہے۔''

اس سلسلہ کی ایک بحث جو فاضل مصنف نے صیہونی تحریک کے سب سے بڑے رہنما ڈاکٹر ویزمین (Weizmann) سے کی' نہایت دلچسپ ہے۔

جناب اسد صاحب نے اس سے سوال کیا:

'تم اس سرزمین کو اپنا ملک کس طرح بنا سکتے ہو' جب کہ عرب' جو اکثریت میں ہیں' تمہارے اس عزم کے سخت مخالف ہیں۔'

اس نے کہا' ہمیں یقین ہے کہ چند سالوں کے بعد عرب اکثریت میں نہیں رہیں گے۔'

اسد صاحب نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

''ممکن ہے ایسا ہی ہو چونکہ تم اس مسئلہ سے کئی سالوں سے متعلق ہو' اس لئے تم اسے مجھ سے بہتر طور پر

Marfat.com

سمجھتے ہو لیکن سیاسی دقتوں کے علاوہ اس مسئلہ کا ایک اخلاقی پہلو بھی تو ہے۔ کیا یہ غلط نہیں کہ تم اس ملک سے ان لوگوں کو نکالنے کا ارادہ رکھتے ہو جو اس سرزمین پر ہمیشہ سے رہ رہے ہیں۔''

ڈاکٹر نے فوراً کہا:

''یہ ہمارا اپنا ملک ہے۔ ہم صرف اسی چیز کو واپس لینا چاہتے ہیں جو ہم سے ناانصافی کے ساتھ چھینی گئی تھی۔''

اسد صاحب نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

''تمہارا اس ملک سے دو ہزار سال سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ اس سے پیشتر تم نے اس کے ایک حصہ پر پانچ سو سال حکومت کی۔ اگر تمہارے استحقاق کی صرف یہی ایک بنیاد ہے تو پھر مسلمان بھی تو اسی بنا پر سپین کی واپسی کا جائز طور پر مطالبہ کر سکتے ہیں۔ وہاں وہ سات سو سال تک حکمران رہے اور اس کو چھوڑے ہوئے ابھی پانچ سو سال سے زیادہ مدت نہیں گزری۔''

ڈاکٹر میرے اس جواب سے کچھ برہم ہوا اور کہنے لگا:

''مسلمانوں نے سپین کو فتح کیا تھا۔ یہ ان کا اپنا وطن نہ تھا اور یہ بالکل درست ہوا کہ ملک کے باشندوں نے انہیں یہاں سے نکال دیا۔''

اسد صاحب نے اس کے جواب میں نہایت ہی نرم لہجے میں کہا:

''حضور معاف کیجئے! اس استدلال میں ایک بنیادی لغزش ہے۔ عبرانی بھی تو یہاں فاتح کی حیثیت سے آئے تھے۔ اس سے پیشتر یہاں پر بے شمار قبائل آباد تھے۔ یہ سب اسرائیل کے عہد میں بھی اس ملک میں رہتے رہے۔ وہ عرب جو شام اور فلسطین کو فتح کر کے یہاں آباد ہوئے ان کی تعداد مختصر تھی۔ آج ہم جن لوگوں کو شامی عرب یا فلسطینی عرب کہتے ہیں ان میں بیشتر یہاں کے اصل باشندے ہیں۔ ان میں سے بعض وقت کے گزرنے کے ساتھ مسلمان ہو گئے۔ عرب فاتحین نے ان کے ساتھ شادیاں کیں۔ کیا آپ اس حقیقت سے انکار کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ فلسطین کی عربی بولنے والی بیشتر آبادی خواہ وہ عیسائی ہو یا مسلمان یہاں کے اصلی باشندوں کی نسل میں سے نہیں۔ اصلی ان معنوں میں کہ وہ عبرانیوں سے کئی صدیاں پیشتر بھی اس ملک میں رہا کرتے تھے۔''

ڈاکٹر یہ بات سن کر کھسیانی ہنسی ہنسا اور موضوع کو بدل دینے کی کوشش کی۔

اس کے بعد فاضل مصنف اس مسئلہ کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میرے لیے یہ بات حیرت کا باعث ہے کہ یہودی قوم جس میں کافی تخلیقی صلاحیتیں موجود ہیں اس کشمکش کو صرف ایک ہی نقطہ نظر سے کیوں دیکھتی ہے؟ کیا انہیں اس امر کا احساس نہیں ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کا مسئلہ صرف عربوں کے تعاون سے ہی حل ہو سکتا ہے؟ کیا یہودیوں کے اس موجودہ طرز عمل

Marfat.com

سے ان کا مستقبل تاریک نہ ہوگا؟ اگر یہودی یہاں کچھ عرصہ کے لئے کامیاب ہو بھی جائیں' پھر بھی کبھی چین سے نہ بیٹھ سکیں گے اور ایک معاند قوم سے انہیں ہمیشہ خطرہ لاحق رہے گا۔ میں نے سوچا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ ایک قوم جس نے تاریخ میں بے شمار چرکے کھائے ہیں اور مظالم برداشت کیے ہیں وہ اپنی مطلب براری کے لئے ایک دوسری قوم کو تباہ و برباد کر رہی ہے اور یہ قوم بھی وہ ہے جو یہودیوں کے معاملے میں بالکل بے گناہ ہے۔ اس قسم کے تاریخی حادثات انسانیت کے لئے نئے نہیں' لیکن میں جب انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوتے دیکھتا تو میرا دل سخت اضطراب و کرب محسوس کرتا۔"

یہودیوں کے بارے میں اس طرز فکر کے اور بھی بے شمار لوگ حامی ہیں۔ جناب اسد صاحب نے اس سلسلہ میں جیکب ڈی ہان (Jacob de Haan) کے احساسات کو بھی درج کیا ہے۔ اس کا خیال ہے:

"ہم یہودی اپنے مقدس وطن سے نکالے گئے تھے کہ ہم نے اس فرض کی ادائیگی نہیں کی جو خداوند تعالیٰ نے ہم پر عائد کیا تھا۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس بات کے لئے منتخب کر رکھا تھا کہ ہم اس کے پیغام کو اس دنیا کے اندر پھیلائیں مگر بدقسمتی سے ہم نے یہ سمجھ لیا کہ خدا کو ہم سے صرف ہماری خاطر محبت ہے' اس لئے ہمارے اندر ایک غلط قسم کا پندار پیدا ہو گیا۔ ہمارے لیے اس کے علاوہ اب کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ ہم توبہ واستغفار کریں' اپنے دل کو تمام آلائشوں سے پاک کریں اور جب ہم اس کا پیغام پہنچانے کے قابل ہوں گے تو وہ ہم میں ایک ایسا مسیحا پیدا کرے گا جو ہمیں اپنے ملک میں پھر واپس لے آئے گا۔

"(مسٹر اسد) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تاریخ چند بے ربط اور بے مقصد واقعات کا ایک مجموعہ ہے۔ خداوند تعالیٰ نے ہم سے یونہی کسی ترنگ میں آ کر ہمارا وطن تو نہیں چھینا اور اس لئے ہمیں در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں' مگر افسوس کہ یہودی اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے' وہ ابھی تک اسی تعصب و تنگ نظری کا شکار ہیں جو ہماری ہلاکت کا باعث بنی۔ دو ہزار سال کی تکالیف اور صحرانوردی سے ہم نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ یہ لوگ بجائے اپنے مصائب کے حقیقی اسباب معلوم کرنے کے' انہیں چھپاتے ہیں۔ وہ مغربی سیاست کے مطابق اپنے گھر کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اس طرح وہ ایک قوم کو اپنے وطن سے محروم کرنے کا گناہ اپنے سر لے رہے ہیں۔"

(۲)

جناب اسد صاحب غم و افسوس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اہل مغرب کی اسلامی تہذیب و تمدن پر دست درازی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ انہوں نے مغربی استعمار کے ان ناپاک ارادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

Marfat.com

''ہزاروں غیر ملکی قوتیں-سیاسی' معاشرتی اور معاشی- اس وقت دنیائے اسلام میں کارفرما ہیں۔ ان حالات میں ہمارے لیے سوچنے کی بات یہی ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ کیا مسلم اقوام ان کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گی اور اس طرح نہ صرف اپنی روایات کو تباہ کریں گی بلکہ اپنی روحانی بنیادوں کو بھی خود اپنے ہاتھوں سے مسمار کر دیں گی۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۶ء تک چار سال جو میں نے مشرق وسطیٰ میں گزارے' ان میں مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح اہل یورپ مسلمانوں کے تمدن اور ان کی ہیئت اجتماعیہ کو نقصان پہنچا رہے ہیں اور جب کبھی مسلمان اس کے خلاف کوئی آواز اٹھاتے ہیں یا جدوجہد کرتے ہیں تو یہ لوگ نہایت ہی حقارت سے' مسلمانوں کی ان مساعی کو جو دراصل ان کے احساس کا ایک قدرتی تقاضا ہے' اجانب بیزاری (Xenophobia) سے تعبیر کرتے ہوئے اسے یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔''

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ غیر ملکی آقا اپنے اس ظالمانہ رویہ پر نادم ہونے کے بجائے اس پر بڑا فخر محسوس کرتے ہیں اور مسلمانوں پر اپنا یہ احسان عظیم جتلاتے ہیں کہ وہ ان جاہل اور پسماندہ لوگوں کو تہذیب و شائستگی سے سرفراز فرما رہے ہیں۔ مسلمانوں کے اندر جب کبھی احساس آزادی نے کروٹ لی' اسے ان ''محسنین'' نے مسلم قوم کی روایتی احسان فراموشی اور ناشکری سمجھا اور فوراً قوت کے ذریعے اسے ''راہ راست'' پر لانے کی کوشش کی۔ یورپ نے ''اصلاح'' کی ساری کوششیں صرف مسلمانوں ہی پر صرف کرنی پسند کیں اور اپنے گھر کو قریب قریب اس سے محروم رکھا۔ پچھلے چند سالوں کی تاریخ پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ جب بھی دنیائے مغرب کی کسی قوم نے آزادی کے لیے جدوجہد کی تو سوائے اس ایک قوم کے جس کے چنگل سے آزاد ہونے کے لئے وہ کوشاں تھی' باقی سب قوموں نے اس کی تائید کی۔ مثال کے طور پر جب آئرلینڈ والوں نے جنگ آزادی لڑی تو سوائے انگریزوں کے باقی سب لوگوں نے ان کی کوشش کو سراہا۔ اسی طرح جب پولینڈ نے آزادی کا علم بلند کیا تو روس اور جرمنی کو چھوڑ کر سب نے اس کی دل و جان سے معاونت کی' مگر مسلمانوں کے معاملہ میں یورپ کا رویہ بالکل مختلف ہے۔ ان بیچاروں کے اندر جب کبھی یہ احساس پیدا ہوا تو سب نے متحد ہو کر ان کے اس احساس کو بہ جبر دبانے کی کوشش کی اور اپنے اس غیر منصفانہ اور ظالمانہ فعل کو برحق ثابت کرنے کے لئے یہ احمقانہ بات کہی گئی کہ چونکہ مسلم ممالک سیاسی اور معاشی طور پر مضبوط نہیں' اس لیے ان کے معاملات میں مغربی اقوام کی دخل اندازی نہ صرف بالکل جائز اور درست ہے بلکہ مسلم قوم کے لئے بھی بے حد مفید ہے۔ اس قسم کی لغو منطق پر بحث کرتے ہوئے اسد صاحب فرماتے ہیں:

''اس طرز خیال کے حاملین غالباً اس بڑی حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ جب باہر سے کوئی چیز کسی قوم پر بہ جبر مسلط کی جائے' خواہ وہ اچھی ہی کیوں نہ ہو تو اس سے قوم کا ارتقا رک جاتا ہے۔ یہ لوگ صرف ریلوں کے اس جال کو دیکھتے ہیں جو کہ استعماری طاقتوں نے ان ''شکار گاہوں'' میں پھیلا رکھا ہے' لیکن

Marfat.com

وہ اس عظیم نقصان پر غور نہیں کرتے جوان ظالم اقوام نے کمزوروں کی تہذیب و معاشرت کو پہنچایا ہے۔ اگر آسٹریا مہذب بنانے کے ''پاک ارادے'' سے بلقان کے معاملات میں دخل دے تو اس کو کبھی برداشت نہیں کیا جاتا' لیکن اگر یہی حرکت انگریز مصر میں' روس وسطی ایشیا میں' فرانس مراکو میں اور اٹلی لیبیا میں کرے تو اس کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اسے ان اقوام پر ایک ایسا احسان سمجھا جاتا ہے جس کے بارے سے یہ کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتیں۔ ان کے ذہن میں ایک ثانیہ کے لیے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ بہت سی وہ معاشی اور سماجی برائیاں جن کو بہانہ بنا کر مسلم اقوام کو محکوم بنایا گیا ہے' وہ تو خود مغربی استیلاء کا نتیجہ ہیں اور یہ مغرب کی استعماری طاقتیں اس لیے ان کے معاملات میں دخل دیتی ہیں تا کہ کسی طرح ان کے اندر خلفشار پیدا کیا جائے اور پھر اسے برقرار رکھا جائے اور یہ بے بس قومیں خود اپنے پاؤں پر کبھی بھی کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوسکیں۔''

اسد صاحب کو مغربی سامراج کی ریشہ دوانیوں اور مسلم ممالک کی مظلومیت کا صحیح احساس ۱۹۲۲ء میں ہوا جب وہ فلسطین میں سیر و سیاحت کے بعد مصر تشریف لے گئے۔ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے ان روح فرسا مناظر کو دیکھا کہ کس طرح انگریزی فوج نہتے مصریوں پر پہلے تو بم گراتی ہے اور جب لوگوں میں کچھ بھی اضطراب پیدا ہوتا' جو اس قسم کے ظلم و ستم کا قدرتی نتیجہ ہے تو فوراً ''خوئے بدرا بہانہ بسیار'' کے مصداق امن و امان قائم کرنے کے بہانے لوگوں پر نہایت خوفناک قسم کا تشدد ڈھایا جاتا۔ لوگوں نے شاعری میں تو بلاشبہ یہ پڑھا تھا:

وہی قاتل' وہی شاہد' وہی منصف ٹھہرے
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

لیکن مغربی استعمار نے اس قسم کے خیالی ظلم کو جو صرف ایک فرد کا تھا' ایک پوری ملت پر بالفعل کر کے دکھا دیا۔ اس استعمار نے سب سے پہلے مسلم ممالک کو تاخت و تاراج کیا۔ پھر جب اس کے برخلاف ان کے طرف سے بالکل ''مظلومانہ مدافعت'' کی کوشش کی گئی تو اس کے چہرے پر شکن آئے۔ اس نے غضبناک ہوکر ان ''خودسروں'' کو درس عبرت دینے کے لیے ان پر بم برسائے' زہریلی ہواؤں سے ان کی بصارت زائل کی گئی اور یہ سب کچھ اقوام عالم کے سامنے ہوا۔ تہذیب کے علمبرداروں نے' تمدن و شائستگی کے مدعیوں نے یہ خونیں تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھا مگر ان کے دل پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا' بلکہ انہوں نے حق و انصاف کا ساتھ دینے کی بجائے اس ظالم استعمار کا ساتھ دیا جس کے خلاف ان کی زبانیں ہمیشہ احتجاج کرتی ہیں۔ کسی نے مظلوم کی حمایت میں اپنا دست مدد آگے نہ بڑھایا۔ کسی دردمند نے مظلوم کی چارہ گری نہ کی۔ مظلوموں کی دلخراش صدائیں اور بے کسوں کی پُر درد آہیں بھی کسی قوم کے احساس شرافت کو جگا نہ سکیں۔ انگریزی استعمار کے سارے ظالمانہ ہتھکنڈے اس چنگاری کو بجھا نہ سکے جو مصری قوم کے دل میں سلگ رہی تھی۔ مصر کی اس جنگ آزادی میں پوری مصری قوم کا سوائے ایک محدود گروہ کے جس کا مفاد غیر ملکی آقاؤں سے وابستہ تھا' شریک تھی۔ اسی لیے یہ تحریک کسی وقت بھی دبنے نہ پائی۔ جس طرح دریا میں جب ایک لہر گزر جاتی ہے تو

Marfat.com

دوسری فوراً اس کی جگہ لینے کے لئے آ پہنچتی ہے اسی طرح وفد پارٹی کا جب ایک جتھہ گرفتار ہوتا تو فوراً دوسرا اس کی جگہ لے لیتا اور اس میں کبھی خلا نہ پیدا ہوتا۔ تشدد کا ہر وار لوگوں میں آزادی کی تڑپ کو اور تیز کر دیتا' مگر یورپ اس جدوجہد کو سمجھنے سے قاصر تھا اور وہ بڑی سادگی سے اسے ''اجانب بیزاری'' سمجھ رہا تھا۔ اس ''ریا کارانہ سادہ لوحی'' کا سبق بھی دنیا کو اہل مغرب نے ہی سکھایا ہے۔

مصر میں اسد صاحب جس مکان میں رہ رہے تھے' وہ مسجد کے بالکل قریب تھا۔ اس ''خانہ خدا'' میں پانچوں وقت خدا کا نام بلند ہوتا۔ اسد صاحب نے اس اذان سے بھی ایک نہایت ہی گہرا تاثر لیا۔ وہ اسی کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میرے گھر کے بالکل قریب ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس سے ہر روز پانچ مرتبہ اذان کی آواز بلند ہوتی۔ ایک شخص سفید پگڑی باندھے گیلری میں آتا' اپنے ہاتھ کانوں تک اٹھاتا اور زور سے پکارتا ''اللہ سب سے بڑا ہے اور میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔'' جب وہ آہستہ آہستہ اس محیط کے چاروں کونوں کی طرف رخ کرتا تو اس کی آواز سبک سیر ہوا کے دوش پر سوار ہو کر بلند ہو جاتی۔ اس آواز میں نرم و گرم الفاظ سموئے ہوئے تھے۔ اس میں جو کچھ حسن اور جاذبیت تھی وہ کسی فن کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اس جذبہ کی وجہ سے تھی جو پکارنے والے کے دل میں موجزن تھا۔

اس موذن کی صدا ہر روز ایک ہی تھی اور میں جن جن مسلم ممالک میں گھوما پھرا' ان میں بھی اسے طرز ادا کے اختلاف کے باوجود ایک ہی پایا۔ آواز کی اس یک جہتی سے مجھے اس امر کا گہرا احساس ہوا کہ مسلمانوں کی اندرونی وحدت کتنی گہری اور پائیدار ہے اور ان کے درمیان اگر اختلافات کے پردے کچھ حائل بھی ہیں تو وہ کتنے باریک اور مصنوعی ہیں۔ ان کی فکر و نظر کا زاویہ ایک ہے۔ ان کے خیر و شر کا معیار بھی ایک ہے اور اس وجہ سے ایک اچھی زندگی کے بارے میں ان کے احساسات بھی ایک ہیں۔

''میں نے پوری زندگی میں پہلی بار ایک ایسی قوم کو دیکھا جس کے ایک فرد کا دوسرے فرد سے رشتہ نسلی اور معاشی ایسی اتفاقی اور کمزور بنیادوں پر قائم نہ تھا بلکہ ایک ایسی بنیاد پر استوار تھا جو بہت زیادہ مضبوط ہے یعنی طرز فکر کی ہم آہنگی یہ ایک ایسی چیز ہے جو انسان اور انسان کے درمیان اجنبیت کے سارے حجابات کو اٹھا دیتی ہے۔''

اسی طرح فاضل مصنف نے جمعہ کے دن پر بحث کرتے ہوئے بھی بعض نہایت اہم باتیں کہی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''جمعہ کے دن- جو مسلمانوں کا سبت ہے- تم دمشق کی روزمرہ زندگی میں ایک تبدیلی محسوس کرو گے۔ اس تبدیلی میں ایک قسم کا ولولہ اور سنجیدگی ہے۔ اس دن سے مجھے اتوار کا دن یاد آتا ہے جب یورپ میں دکانیں بند ہوتی ہیں اور گلیاں بے رونق۔ یہ دن بیکاری میں گزرتا اور مجھے اس سے وحشت ہوتی۔ میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر ایسا کیوں ہے۔ اب مجھے اس کی علت معلوم ہوئی۔ اہل یورپ

Marfat.com

کے لیے ہفتہ کا ہر دن ان کے لیے ایک بیجا بوجھ کا دن ہوتا ہے جس سے صرف اتوار ہی انہیں نجات دلاتا ہے۔ یہ دن ان کے لیے آرام اور سکون کا دن نہیں بلکہ ایک ایسا دن ہے جس میں وہ زندگی سے فرار اختیار کر کے ایک قسم کی فریب کارانہ ''خود فراموشی'' میں پناہ لیتے ہیں۔

''عربوں کے لیے جمعہ اپنے کام کے ایام کو بھول جانے کا دن نہ تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی کے پھل ان لوگوں کی جھولی میں بغیر کسی جدوجہد کے خود بخود گرتے ہیں' بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی محنت' خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو' ان کے ذاتی احساسات کے درمیان کوئی مغائرت نہیں ہے۔ ان کے ہاں کام' کام کی غرض سے نہیں کیا جاتا' اس لئے مزدور اور اس کے کام کے درمیان ایک گہرا رابطہ ہے۔ یہاں ایک انسان صرف اسی وقت آرام کرتا ہے' جب وہ تھک جاتا ہے۔ اسلام نے اسی لیے جمع کو لازمی تعطیل کا دن قرار نہیں دیا۔ مزدور اور دکاندار دمشق کے بازاروں میں چند گھنٹے کام کرتے اور پھر کچھ وقت اپنے کام اور دکانوں کو چھوڑ کر مسجد میں نماز جمعہ کے لیے چلے جاتے اور اس کے بعد اپنے دوستوں کو کسی کیفے میں مل لیتے۔ پھر وہ اپنے کام کاج پر واپس آ جاتے۔ صرف چند دکانیں بند ہوتیں اور وہ بھی اس وقت جب لوگ مساجد میں نماز کے لیے جمع ہوتے۔ اس کے علاوہ بازاروں میں تمام دن رونق اور گہما گہمی رہتی۔

''جمعہ کے روز میرا میزبان مجھے اموی مسجد میں لے گیا...... اس کی فضا عطر بیز تھی۔ سرخ اور نیلی دریاں فرش پر بچھی ہوئی تھیں۔ ہزاروں آدمی بہت لمبی لمبی قطاروں میں امام کے پیچھے کھڑے تھے۔ وہ سپاہیوں کی طرح ایک نظم کے تحت امام کی پیروی میں رکوع وسجود کرتے۔ وہاں بڑی خاموشی تھی۔ جب وہ لوگ قیام کی حالت میں تھے تو بوڑھے امام کی آواز دور سے سنائی دیتی جو قرآن پاک تلاوت کر رہا تھا۔ جب امام سجدے میں جاتا تو سارے مقتدی بھی خدا کے حضور میں اس طرح سربسجود ہو جاتے جیسا کہ وہ ذات بالکل ان کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

''اس وقت مجھے اس بات کا صحیح طور پر احساس ہوا کہ ان لوگوں کا مذہب اور ان کا خدا ان سے کس قدر قریب ہے۔ ان کی عبادت' ان کے معمولات سے کوئی الگ تھلگ اور بے تعلق چیز نہ تھی' بلکہ وہ انہیں کا ایک جزو لاینفک تھی۔ اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ زندگی اور اس کے معاملات کو بھول جائیں بلکہ اس کی غرض یہ تھی کہ یاد الٰہی کے ذریعہ سے وہ زیادہ بہتر طریقے پر زندگی کی طرف توجہ کریں۔ جب میں اور میرا دوست مسجد کو چھوڑ رہے تھے تو میں نے اس سے کہا کہ تم لوگ اپنے خدا کو اپنے آپ سے کتنا قریب سمجھتے ہو۔ کاش میں بھی اسے اسی طرح سمجھتا۔ اس نے کہا: میرے بھائی اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ کیا ہمارا خدا ہم سے ہماری شہ رگ سے زیادہ قریب نہیں ہے۔''

یہ تاثرات بالکل ابتدائی تھے اور جن کے پیدا کرنے میں زیادہ تر دخل جذبات کو تھا' اسد صاحب کو اسلام

Marfat.com

کے بہت قریب لے آئے۔ انہوں نے دین حق کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا۔ وہ اگرچہ عربی زبان بول لیا کرتے تھے لیکن ابھی تک انہوں نے اس پر اتنی قدرت حاصل نہ کی تھی کہ وہ قرآن پاک اور احادیث نبوی کو براہ راست سمجھ سکیں۔ چنانچہ اس معاملہ میں تراجم پر انحصار کیا گیا۔ یہ تراجم بلاشبہ ناقص تھے اور پیغام الٰہی کی صحیح طور پر ترجمانی نہ کر سکتے تھے لیکن ایک سلیم الطبع شخص کی، جو حق کا پوری دیانت داری سے طالب تھا' اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی اور انہیں کی مدد سے اس نے راہ راست پالی۔ اس کا اظہار انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

''میرا یہ مطالعہ خواہ کتنا ہی سرسری اور منتشر تھا' لیکن اس سے ایک طرح کا حجاب دور ہوا۔ میں اب ایسے خیالات سے آشنا ہوا' جن سے میں اب تک بالکل ناواقف تھا۔ اسلام میری نظر میں عام اصطلاح کے مطابق مذہب نہ تھا' بلکہ یہ ایک دین تھا' ایک طرز زندگی' ایک اسلوب حیات۔ یہ ایک دینیات کا مجموعہ نہ تھا بلکہ انفرادی اور اجتماعی اصلاح کا ایک ایسا ہمہ گیر پروگرام تھا جس کی بنیاد ''شعور حق یا شعور ذات باری'' پر رکھی گئی تھی۔ قرآن میں کفارہ کے مسیحی عقیدہ کی طرف کہیں خفیف سے خفیف اشارہ بھی نہ تھا۔ نہ ہی اس میں اس بات کا تذکرہ تھا کہ انسان اور اس کی قسمت کے درمیان پیدائشی گناہ حائل ہے۔ قرآن پاک میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے: لھا ما کسبت و علیھا ما اکتسبت (۲:۲۸۶)۔ یہاں تقویٰ اور پرہیزگاری حاصل کرنے کے لیے کسی قسم کی رہبانیت اختیار نہیں کرنی پڑتی۔ پاکبازی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ گناہ کی حالت اس کی فطری حالت نہیں بلکہ یہ درحقیقت انسان کی ان پیدائشی خصوصیات سے بغاوت ہے جو خداوند تعالیٰ نے اس میں اول روز ہی سے ودیعت کر رکھی ہیں۔ یہاں انسانی فطرت کے بارے میں کسی قسم کی دوعملی نہیں' جسم اور روح دونوں سے ایک ہی طرح بحث کی گئی ہے۔

مجھے پہلے پہل قرآن کے اس طرز فکر نے بڑا مضطرب کیا کہ اس میں نہ صرف روحانی امور پر بحث کی گئی ہے بلکہ دنیا کے معمولی معاملات پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے' لیکن آہستہ آہستہ مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ جب ایک انسان جسم اور روح کا حسین امتزاج ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس دین کامل میں انسانی زندگی کے سارے پہلوؤں کا احاطہ نہ کیا گیا ہو۔ قرآن حکیم نے اپنے پیروؤں سے اس چیز کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس بات کو کبھی بھی فراموش نہ کریں کہ یہ مادی زندگی ایک ارفع اور اعلیٰ زندگی کے لیے ایک ضروری منزل ہے اور انسان کا حقیقی مقصد یا غایت الغایات روحانی ہی ہے۔ مادی خوشحالی اگرچہ کوئی بری چیز نہیں' لیکن یہ مقصود بالذات نہیں۔ اس بنا پر انسانی خواہشات کو اخلاق کے تابع ہونا چاہیے۔ اس اخلاق کا مقصد صرف یہی ہیں کہ خدا اور بندے کے تعلق کو استوار کرے' بلکہ اس کا فرض یہ بھی ہے کہ انسان اور انسان کے تعلق میں بھی انسان کی رہنمائی کرے۔ وہ نہ صرف ایک فرد کی روحانی ترقی کا ضامن ہو بلکہ وہ ایک ایسا ماحول پیدا کرے جو انسانوں کے روحانی ارتقاء کے لئے ممد و معاون

Marfat.com

ثابت ہو تا کہ پوری انسانی زندگی بہتر اور شاد کام بن سکے۔"

اسلام کے دوسرے معجزات کی طرح ایک بڑا معجزہ یہ بھی ہے کہ اس نے جسم اور روح کی دوئی کو مٹا کر اسے ایک وحدت بنا دیا ہے۔ اسی سے دین اور دنیا کی تفریق مٹی ہے اور حیات انسانی کے مختلف شعبوں کے درمیان بُعد ختم ہوا ہے۔ اگر ہم عیسائیوں کی طرح روح اور مادہ کی ثنویت کو مان لیں اور اسے مختلف اجزا میں بانٹ لیں تو اس سے زندگی کی اصل حقیقت بھی مسخ ہو جائے گی۔ ہم اپنے ہر دنیاوی معاملہ میں بھی ایک روحانی نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ اگر نیت کا روحانی سرچشمہ گدلا ہو جائے تو اعمال کے اندر خلوص ختم ہو جائے گا اور یہ مادی زندگی بذات خود منتہائے مقصود بن جائے گی۔ سیاست و اخلاق' معیشت و روحانیت کی اسی تفریق کے باعث جدید تمدن اپنی روحانی قدر و قیمت کھو بیٹھا ہے اور اس کے جو تلخ نتائج برآمد ہوئے ہیں' وہ ہمارے سامنے ہیں:

دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی

دوئی جسم تہذیب کی نابصیری

عرب ممالک کی سیر و سیاحت کے بعد اسد صاحب واپس جرمنی تشریف لے گئے۔ وہاں انہیں ایک مشہور اخبار (Frankfurter Zeitung) کے ادارۂ تحریر میں شامل کر لیا گیا۔ یہ ایک اتنا بڑا اعزاز تھا' جس کی اسد صاحب کی عمر کا آدمی کبھی توقع نہ کر سکتا تھا' چنانچہ انہوں نے اس پرچہ کے صفحات میں مشرقی ممالک کے متعلق نہایت ہمدردانہ خیالات کا اظہار شروع کیا۔ شام کے وقت انہیں جب کبھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گفتگو کا اتفاق ہوتا تو وہ ان کے سامنے عربوں کی خود اعتمادی کا تذکرہ ضرور کرتے۔ انہیں آہستہ آہستہ اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ یورپ کی اندرونی وحدت جو پارہ پارہ ہو رہی ہے' ان کا اخلاق اس سرعت سے بگڑ رہا ہے' اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی تہذیب کا مذہب سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اس وقت کی سوسائٹی کا نقشہ انہوں نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"یہاں میں نے ایک ایسا سماج دیکھا جو خدا کو اپنے ہاں سے خارج کر دینے کے بعد پھر سے اس کی طرف متوجہ ہو رہا تھا' لیکن بدقسمتی سے بہت تھوڑے لوگ ایسے تھے جو اس اضطراب و بے چینی کی علت جانتے تھے۔ ان کی اکثریت شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی نہج پر سوچ رہی تھی۔ چونکہ ہماری عقل' ہماری سائنس کے تجربات' ہمارے اعداد و شمار' ہمیں زندگی' اس کے آغاز اور انتہا کے متعلق کوئی حتمی اور یقینی چیز بتانے سے قاصر ہیں' اس لیے' ہمیں اپنی ساری توجہ مادی اور عقلی ترقی پر صرف کرنی چاہیے اور اپنا وقت اس قسم کے اخلاقی اصول اپنانے میں ضائع نہ کرنا چاہیے جو مافوق الطبعی بنیادوں پر قائم ہوں اور جن کا کوئی سائنٹفک ثبوت ہم مہیا کرنے سے قاصر ہوں۔"

مغربی سوسائٹی نے اگرچہ خدا سے واضح طور پر انکار تو نہیں کیا' لیکن اس کے نظام حیات میں کسی "اَن دیکھے" خالق پر ایمان لانے کی گنجائش بھی موجود نہیں ہے۔"

اس کے بعد اسد صاحب نے عیسائیت کے تصور "دین و دنیا کی ثنویت" پر بحث کی ہے۔ اس سلسلہ میں

Marfat.com

انہوں نے فرمایا ہے:

''زندگی کے آغاز میں جب میں اپنے آباؤ اجداد کے مذہب (یہودیت) سے کسی حد تک مایوس ہو چکا تھا تو میرا مسیحیت کی طرف میلان ہوا۔ میرے خیال میں عیسائیت کا تصور خدا عہد نامہ عتیق سے کہیں بہتر تھا کیونکہ اس میں خداوند تعالیٰ صرف ایک گروہ کا خدا نہ تھا بلکہ ساری نوع انسانی کا باپ تھا' لیکن عیسائیت کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس نے اس کی ہمہ گیری کو سخت مجروح کیا ہے اور وہ ہے جسم وروح کی دوئی یا مذہب وسیاست کی تفریق۔

''چونکہ عیسائیت نے شروع ہی سے اپنے آپ کو دنیا اور اس کے سارے معاملات سے الگ کر لیا تھا' اس لیے وہ اس قابل نہ تھی کہ مغربی تہذیب کو وہ کوئی اخلاقی تہذیب بنا سکتی۔ اس کے پیروؤں کے ذہن میں یہ خیال بالکل راسخ ہو چکا تھا کہ مذہب کو انسان کی عملی زندگی سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک مذہب کا فرض اسی قدر تھا کہ وہ انسانوں کے اندر ایک انفرادی اخلاق پیدا کر دیں اور وہ بھی صرف شہوت رانی پر پابندی کی حد تک۔ ان کے اس طرز فکر کو کلیسا کے پرانے طرز عمل سے غذا ملی جس نے خدا اور قیصر کے حصوں کو الگ الگ کر کے' صرف خدا کے متعلق بحث کی تھی اور سیاست اور معیشت کو قیصر کا حصہ سمجھتے ہوئے اس سے اپنے آپ کو بالکل بے تعلق کر رکھا تھا۔ چونکہ عیسائیت نے اپنے ماننے والوں کو ''امور دنیا'' کے بارے میں کوئی راہنمائی نہ دی' اس لیے عیسائیت اپنے اس اصل مشن میں ناکام رہی۔ میرے نزدیک اس کا حقیقی مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف لوگوں میں نیکی کا شعور پیدا کرے بلکہ انہیں نیکی پر چلنے کا راستہ بھی بتائے۔ یورپ کے رہنے والوں میں اب چونکہ یہ عام احساس پیدا ہو رہا ہے کہ ان کا مذہب ان کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتا' اس لیے عیسائیت پر سے ان کا اعتماد قریب قریب اٹھ گیا ہے اور اس کے ختم ہونے کے ساتھ ان کا اس چیز پر بھی ایمان نہیں رہا کہ یہ کائنات کسی بہت بڑے مدبر کی تدبیر کا نتیجہ ہے۔ ایمان وایقان کے اس زیاں کی وجہ سے وہ اب ایک قسم کے مکمل اخلاقی وروحانی خلا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

''ہماری دنیا شورشوں اور بغاوتوں کی دنیا ہے۔ خونریزی' تباہی اور زبردست آزادی جن کی کوئی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی' وہ ہماری تہذیب کے نوامیسِ عالیہ ہیں۔ روایات کے بندھن اب ٹوٹ رہے ہیں' مقاصد حیات ایک دوسرے سے برسر پیکار ہیں' زندگی کے لیے نئے نئے راستوں کی بڑی سرگرمی سے تلاش ہو رہی ہے۔ عالم گیر جنگ کے بطن سے بہت سی چھوٹی چھوٹی جنگوں نے جنم لیا' بہت سے انقلابات نے سر اٹھایا' بہت سی معاشی تباہ کاریاں دیکھنے میں آئیں۔ یہ سب ناکامیاں اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ مغرب کا مادی اور صنعتی ترقی پر بے جا اعتماد اس انتشار اور انارکی کی کیفیت کو نظم میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ میرے بچپن کے اس احساس کو کہ ایک انسان کو زندگی گزارنے کے لیے صرف روٹی ہی

Marfat.com

درکار نہیں، تقویت حاصل ہوئی اور مجھے اس بات کا یقین ہوگیا کہ موجودہ دور میں ''ترقی'' کی جو پرستش کی جارہی ہے، وہ دراصل ''معروضی اقدار'' پر ایمان کا ایک نہایت ہی غلط طریقہ ہے، جسے بیوقوفی سے اس کا نعم البدل سمجھا جارہا ہے۔ یہ لوگ ابھی تک اس غلط فہمی کے شکار ہیں کہ انسان آہستہ آہستہ اپنی مشکلات پر قابو پالینے میں کامیاب ہوجائے گا۔ میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ صرف معاشی نظام کس طرح ہماری سماجی برائیوں کو درست کرسکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ عوارض کی چند ظاہری علامتوں کو تو دور کردیں، لیکن ان کے حقیقی اسباب کو مٹانا ان کے بس سے باہر ہے۔''

اسد صاحب نے ترکوں کا نفسیاتی جائزہ بھی بڑی عمدگی سے لیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی حرکات وسکنات میں ایک قسم کا تکلف اور تصنع ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لکھا ہے:

''یہ لوگ حسین وجمیل ہونے کے باوجود بڑے بدصورت ہیں اور ان کی حرکات تیز مگر بڑی بھونڈی ہیں۔ یوں دکھائی دیتا ہے جیسا کہ ان کے مقصد اور احساس کے درمیان کوئی تعلق باقی نہیں رہا اور میں جانتا ہوں کہ اگرچہ وہ اپنے آپ کو ایک بامقصد قوم ظاہر کررہے ہیں، لیکن یہ ان کی خودفریبی ہے۔''

فاضل مصنف کا یہ تجزیہ بڑا ہی صحیح اور درست ہے۔ جب ایک قوم غیروں کی نقالی میں اپنی کامیابی سمجھنے لگتی ہے تو اس کے اندر تخلیق کی ساری قوتیں خود بخود ختم ہوجاتی ہیں۔ یہ قوم خود اپنے ہاتھ سے قائدانہ صلاحیتوں کو تباہ کرتی ہے اور بڑی خوشی کے ساتھ دنیا میں دوسروں کی خیمہ بردار کی حیثیت سے جینا سیکھتی ہے۔ ترک قوم کا حال اس نادان بچے کا سا ہے جو اپنے ہاتھ سے اپنے مکان کو آگ لگا کر تماشا دیکھنے میں گوناگوں لذت محسوس کرتا ہے۔

کتاب کے اس حصے میں جناب اسد صاحب نے اس فکر انگیز بحث کو بھی اٹھایا ہے کہ کیا خدا کا تصور بھی جغرافیائی ماحول کی کرشمہ سازی ہے۔ یورپ کے بعض بڑے بڑے فلاسفہ نے یہ گمراہ کن نظریہ پیش کیا ہے کہ توحید کا نعرہ صرف صحرا کی پہنائیوں ہی میں بلند ہوا۔ اسد صاحب نے اگرچہ ایک لطیف انداز میں اس کی تردید کی ہے، لیکن یہ مسئلہ ان کی توجہ کا زیادہ محتاج ہے۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ صحرا کی وسعتوں نے انسان کے اندر ایک خدا کے تصور کو پیدا کیا تو ہمیں لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ یہ تصور بھی ہمارے مادی ماحول کی پیداوار ہے۔ معاملہ پھر یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ مذہب کی ساری عمارت پیوند خاک ہوجاتی ہے۔ اس کو تسلیم کرلینے سے پھر ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سارے مذاہب صحیح اور درست ہیں کیونکہ سب کو ان کے جغرافیائی حالات نے جنم دیا ہے۔ اس سے حق اور باطل کی تفریق بالکل مٹ جاتی ہے اور مارکسی تعلیمات کو درست ماننا پڑتا ہے۔

بالفرض اگر یہ کہا جائے کہ صحرا کی وسعتوں اور پہنائیوں نے انسان کو ایک خدا کا احساس بخشا تو یہ بھی غلط ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی صحرا میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگ ایسے بھی آباد ہیں جو ان گنت خداؤں کی پرستش کرتے ہیں اور ان میں جب ایک انسان توحید کا نعرہ بلند کرتا ہے تو یہ سارے اس کے دشمن بن جاتے ہیں، حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ ماحول کی وجہ سے وہ سارے کے سارے موحد ہوتے۔ جب کوئی شخص شرک کی دعوت دیتا تو وہ اس کے خلاف صف

Marfat.com

آرا ہو جاتے، کیونکہ ایسے ماحول میں توحید ان کی فطرت سے اقرب تھی اور شرک اس سے کوسوں دور' لیکن تاریخ ان لوگوں کے اس نظریہ کی تردید کرتی ہے۔

پھر جب ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ الٰہیات ہمارے ماحول کی پیداوار ہیں تو ہم قدرتی طور پر یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ خارجی ماحول نے ہمارے اندر بعض ایسی داخلی کیفیات پیدا کیں' جنہوں نے ایک انسان کے قلب و دماغ میں اس قسم کے احساسات پیدا کیے۔ اس نظریہ پر دو بڑے اعتراضات ہوتے ہیں۔

اگر اس قسم کی کیفیات کی صورت گری صرف جغرافیائی ماحول ہی کرتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ یہ صرف حضرت موسیٰ' عیسیٰ' ابراہیمؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تو پیدا ہو جاتی ہیں لیکن فرعون' نمرود اور ابوجہل میں پیدا نہیں ہوتیں' حالانکہ ان سب کا جغرافیائی ماحول ایک تھا۔

اس سلسلہ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ انسان کی اندرونی کیفیات اور احساسات کی نوعیتیں اتنی پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ ان کے بارے میں وثوق اور یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاثرات قلب کتنے ہی شدید ہوں' اتنے واضح اور قطعی نہیں ہوتے کہ ان کو کفر و ایمان کا مدار بنایا جا سکے۔

دراصل ہمارے ہاں صدیوں سے یہ غلط تصور چلا آ رہا ہے کہ الہام' کشف ہی کی کوئی ترقی یافتہ شکل ہے' حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ عقلی تجربات' مراقبہ و تفکر اور وحی و الہام تین الگ الگ انواع ہیں اور ان تینوں کے میدان بالکل جدا جدا ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کے پاس ایک ایسی باطنی طاقت اور اندرونی حاسہ ہے' جس کو اگر وہ بیدار کرے اور ترقی دے تو مادیات سے ماوراء بہت سے عجائبات اور موجودات کا ادراک کر سکتا ہے' جن کا ادراک کسی حاسۂ ظاہری سے ممکن نہیں' لیکن یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک انسان کے ظاہری حواس کے ساتھ ایک حاسۂ باطنی بھی ہے اور ممکن ہے کہ دوسرے حاسے بھی ہوں' لیکن اس سے یہ اخذ کر لینا کہ یہ حاسہ بالکل صحیح ہے اور اس راستہ سے جو علم انسان کو حاصل ہوتا ہے' وہ بالکل درست اور قطعی ہے' ٹھیک نہیں۔ انسان کے دیگر حواس کی طرح یہ بھی ایک حاسہ ہے۔ اسی طرح کمزور اور محدود جس طرح دوسرے' اسی طرح خطا پذیر اور متاثر ہونے والا جس طرح انسان کی ساری طاقتیں اور انکشاف علم کے سارے ذرائع۔ اس وجہ سے جو علم ہمیں اس ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے' اس میں صحت اور قطعیت نہیں ہوتی اور اس بنا پر اس پر کفر و ایمان کا انحصار نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر ہم اہل کشف کے باطنی تجربات کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں بڑا تعارض اور تناقض پایا جاتا ہے' جس کی نظیر شاید فلسفہ میں بھی نہ مل سکے۔

جو چیز کفر و ایمان کے لیے ایک کسوٹی کے طور پر انسانیت کو دی گئی ہے' وہ نہ تو انسانی عقل کی رہین منت ہے اور نہ ہی اندرونی کیفیات کی کرشمہ سازی۔ وہ نہایت واضح طور پر ہر آلائش سے پاک اور منزہ' خارج سے بعض پاکباز انسانوں کے دلوں میں ڈال دی جاتی ہے۔ اس میں نہ اس شخص کی عقل کو دخل ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے باطنی تجربات کو۔ پھر یہ کسی محنت سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جتنے انبیاء گزرے ہیں' انہوں نے اپنے دعوائے نبوت کو بڑے یقین اور وثوق سے پیش کیا۔ اس کے اقرار کو نجات اور انکار کو کفر قرار دیا۔ اپنے بارے میں انہوں

Marfat.com

نے کبھی کسی شک اور تذبذب کا اظہار نہ کیا۔ دعویٰ کرنے سے پہلے ان کے متعلق کبھی کسی کو یہ گمان تک نہ ہوا کہ وہ کوئی غیر معمولی دعویٰ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں' لیکن جب اللہ نے پیغام نازل فرما دیا تو پھر بڑے وثوق اور یقین سے انہوں نے اپنے دعویٰ کو پیش کیا اور اپنے موقف کو لوگوں سے منوایا۔ اب جو شخص یہ سمجھ لیتا ہے کہ خارجی ماحول انسان کے اندر بعض ایسی داخلی کیفیات پیدا کرتا ہے جن کے ذریعہ وہ اپنے خالق کی صورت گری کر سکتا ہے تو وہ سخت غلطی پر ہے' کیونکہ اس قسم کی واردات خواہ کتنی ہی روح پرور اور مسحور کن ہوں' ایک دین کی تخلیق نہیں کر سکتیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک فرد کی روحانی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہیں' لیکن کسی انقلاب انگیز اور باطل شکن تحریک کو جنم نہیں دے سکتیں' کیونکہ ان میں وہ قوت' وہ وثوق اور یقین نہیں ہوتا جو کسی نظام حیات کے لیے ضروری ہے۔ اس قسم کے کشف صرف ایک فرد تک محدود رہتے ہیں اور وہ کسی صورت میں بھی دوسروں کے لیے حجت نہیں بن سکتے۔ جب ایک چیز کو حجت' برہان یا الفرقان کے طور پر پیش کیا جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہایت واضح اور غیر مبہم ہو۔

کتاب کے اس حصے میں دو تین مقامات ایسے آتے ہیں جو اگر نہ ہوتے تو اچھا تھا۔ فاضل مصنف نے جہاں جہاں عورتوں کی تصویر کشی کی ہے' وہ ان جیسے سنجیدہ آدمی کے شایان شان معلوم نہیں ہوتی۔ انہوں نے الفاظ کے بالکل بے جا اسراف سے اس قسم کی تصاویر کھینچی ہیں' جن میں لذتیت صاف طور پر جھلکتی ہے۔

(۳)

مغربی تہذیب سے انسانیت کو جو عظیم نقصانات پہنچے ہیں' ان میں ایک بڑا نقصان خاندانی نظام کی بربادی بھی ہے۔ اس نظام کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے اب نہ تو والدین کو اپنی اولاد سے محبت رہی ہے اور نہ ہی اولاد کو اپنے ماں باپ اور دوسرے اعزّہ سے کوئی انس باقی رہا ہے۔ چونکہ اب زندگی کے ہر معاملہ کو جیب اور پیٹ کے نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے' اس لیے زندگی کے وہ سارے تعلقات اور روابط جن کی بنیاد محبت' مودت اور ایثار پر ہے' وہ قریب قریب ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اب عزت و توقیر اسی شخص کی ہے جو مادی اعتبار سے زیادہ خوشحال ہے۔ باپ اگر کماتا ہے تو وہ تعظیم کے لائق ہے' لیکن اگر وہ کمانا چھوڑ دیتا ہے تو پھر وہ ایک بوجھ ہے اور یہ جتنی جلدی ہلکا ہو' اولاد کے حق میں اتنا ہی بہتر ہے۔ وہ اولاد جو والدین کو بار محسوس کرے' اس کا جو تعلق اپنے بزرگوں سے ہوگا' اس کا ہر شخص بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔

اس کے برعکس جس تہذیب نے اپنی رفیع الشان عمارت مادی بنیادوں پر نہیں بلکہ خالص روحانی بنیادوں پر تعمیر کی ہے' اس میں باہمی تعلقات کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ یہاں کسی شخص کا عزت و احترام اس وجہ سے نہیں کیا جاتا کہ وہ مادی لحاظ سے ہمارے لیے فائدہ مند ہے بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس سے ہمارا جذباتی اور روحانی رشتہ کس قسم کا ہے اور اس سے ہماری روح کو کس طرح بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اس تعلق کو "احسان" پر استوار کرنے کی ہدایت کی ہے۔ قرآن حکیم نے جہاں جہاں اس تعلق پر بحث کی ہے' اس کا انداز

Marfat.com

یہی ہے:

و اذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لا تعبدون الا اللہ وبالوالدین احسانا و ذی القربیٰ والیتٰمیٰ والمساکین و قولوا للناس حسنا. (۲:۸۳)

(یاد کرو اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا' ماں باپ کے ساتھ' عزیز و اقارب کے ساتھ' یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا اور لوگوں سے بھلی بات کہنا۔)

واعبدوا اللہ و لا تشرکوا بہ شیئا و بالوالدین احسانا وبذی القربیٰ والیتٰمیٰ والمسٰکین والجار ذی القربیٰ والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبیل و ما ملکت ایمانکم. ان اللہ لا یحب من کان مختالا فخورا. (۴:۳۶)

(اور تم سب اللہ کی عبادت کرو' اس کے ساتھ شریک نہ بناؤ' ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو' قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اور پڑوسی رشتہ دار سے' اجنبی ہمسایہ سے' ہم نشین دوست سے اور مسافر سے اور ان لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضہ میں ہیں' احسان کرو۔ یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔)

و قضٰی ربک الا تعبدوا الا ایاہ و بالوالدین احسانا. اما یبلغن عندک الکبر احدھما او کلھما فلا تقل لھما اف و لا تنھر ھما و قل لھما قولا کریما. واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ و قل رب ارحمھما کما ربینی صغیرا۔(۱۷:۲۳-۲۴)

(تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں' بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف نہ کہو' نہ انہیں جھڑک کر جواب دو' بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما' جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔)

یہ اور اسی قسم کی دوسری بے شمار آیات اس حقیقت کی غمازی کرتی ہیں کہ ایک مسلمان کا اپنے والدین اور دوسرے اقربا سے تعلق خالص روحانی نوعیت کا ہے۔ اس کی تہ میں کوئی مادی حرص یا کوئی معاشی نفع کارفرما نہیں بلکہ اس میں جذبہ اور خلوص بطور اساس کے کام دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ ان آیات میں جو دوسری چیز قابل غور ہے' وہ یہ ہے کہ اسلام میں والدین کی خدمت ان کی عزت و توقیر اور خویش و اقارب سے حسن سلوک اتنی بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کا جب بھی ذکر کیا گیا ہے' وہ شرک سے مخالفت کے بعد شروع ہوا ہے' یعنی انسان اور خدا کے تعلقات میں سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرے' اس کی ذات و صفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے اور پھر انسان اور انسان کے تعلق میں جو چیز سب

Marfat.com

سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے' وہ یہ کہ ایک شخص اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے' خصوصاً ان حالات میں جب کہ وہ بوڑھے ہو چکے ہوں اور کچھ کمانے کے قابل نہ ہوں۔ بڑھاپا زندگی کا وہ دور ہے جس میں ایک شخص عام طور پر دوسروں کے لیے بوجھ بنتا ہے' جس میں اس کی طبیعت میں بچوں کی سی عادات پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ بچوں کی طرح ضد کرنے لگتا ہے' ذرا ذرا سی بات پر چڑ جاتا ہے۔ اس کی قوت برداشت کم ہو جاتی ہے اور طبیعت پر غصہ غالب رہتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں وہ دوسروں کے حسن سلوک کا نسبتاً زیادہ محتاج ہوتا ہے' اس لیے قرآن حکیم نے اس عہد کے لیے خصوصاً تاکید فرمائی ہے۔

ایک مغربی تہذیب میں سرشار انسان کے لیے یہ چیز بڑی حیرت انگیز ہے کہ کوئی شخص اپنے ''ناکارہ'' اور ''غیر مفید'' والدین کی خدمت کرے اور اپنی ضروریات کو قربان کر کے' اپنے عزیز و اقارب کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرے۔ مغرب کا انداز فکر تو انسان کی رہنمائی اس طریق پر کرتا ہے جس سے سماج کو زیادہ سے زیادہ مادی نفع حاصل ہو۔ اولاد اور والدین کے پاکیزہ تعلقات اہل مغرب کے نزدیک محض اعتباری باتیں ہیں اور یہ سب ''دور جاہلیت'' کی یادگار ہیں۔ اب جدید روشنی میں انسان کو نہایت ہی ''حقیقت پسندانہ'' انداز پر سوچنا چاہیے۔ انسان کی حیثیت ایک جانور کی سی ہے۔ وہ جب چارہ کم کھائے اور کما کر زیادہ لائے تو اسے اس دنیا میں رہنے کا حق حاصل ہے اور ہمارے لیے بھی اس کے بقا کے لیے فکر مند ہونا اشد ضروری ہے' لیکن جب اس کے چارے کا پلڑا' اس کی آمدنی کے مقابلے میں جھک جائے تو پھر سماجی ''فلاح و بہبود'' کے لیے ناگزیر ہے کہ اسے ''قصاب'' کے حوالہ کر دیا جائے جو اس مہذب سوسائٹی کو اس ''ناگوار بوجھ'' سے نجات دلائے' چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ میں ایک طبقہ اسی طرز پر سوچنے لگا ہے۔ بوڑھے والدین کی زندگیاں اتنی تلخ کر دی گئیں کہ انہوں نے خود اپنے ہاتھوں زندگی کی ٹمٹماتی شمع کو گل کر دیا۔ بعض ''روشن خیال فرزندوں'' نے بھی اس جوئے کو اتار پھینکنے کے لیے اسکیمیں بنانا شروع کیں اور اعلانیہ اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا جانے لگا۔ ''اگر بوڑھے والدین کو نہایت آرام و سکون کے ساتھ موت کی نیند سلا دیا جائے تو آخر اس میں کیا حرج ہے۔ اس طرح ایک طرف تو بوڑھے لوگ بڑھاپے کے عذاب اور تکلیف سے بچ جائیں گے اور دوسری طرف سوسائٹی پر سے یہ ناجائز بوجھ اتر جائے گا۔'' بوڑھے آدمیوں میں سے بعض نے حالات کے یہ تیور دیکھ کر خود ہی اپنے آپ کو سماج کے قدموں میں ڈال دیا۔ کسی نے کہا میری نعش کو مرنے کے بعد ہسپتال کو دے دینا' کسی نے اسے جانوروں کو کھلا دینے کی وصیت کی۔ الغرض اس معاملہ پر بڑی سنجیدگی سے غور ہونے لگا۔ ان میں سے بعض لوگ جو زیادہ جدید اور روشن خیال تھے' انہوں نے ایک قدم اور بڑھایا اور کہا کہ جس طرح جانوروں کی ہڈیاں اور ان کا خون کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے' کیوں نہ انسان کے جسم کو بھی اس کام میں لایا جائے۔ جو شخص ساری عمر سماج کے لئے زندہ رہا ہے' اسے مرنے کے بعد بھی سماج ہی کی خدمت کرنی چاہیے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرز فکر کو زیادہ قبول عام نہیں ہوا۔ یہ بات منطقی طور پر تو درست ہے اور مادی تہذیب کے مزاج سے بالکل ہم آہنگ ہے' لیکن اس معاملہ میں جذبات نے اس نظریہ کو پروان نہ چڑھنے دیا اور وہ

Marfat.com

اس کی ترقی میں رکاوٹ کا باعث بنے۔

اسد صاحب' جنہوں نے مغربی تہذیب وتمدن کی آغوش میں پرورش پائی ہے' انہیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ ایک بادشاہ جس کی عمر پچاس کے قریب ہے اور جس نے خود اپنی محنت اور ذہانت سے سلطنت حاصل کی ہو' وہ باپ کا اس قدر تابع فرمان ہو کہ وہ اس بالائی منزل میں بیٹھنا تک پسند نہ کرے جس کے نیچے اس کا باپ رہتا ہے۔ اپنے اس استعجاب کو انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

''شاہ ابن سعود اپنے باپ سے اس قدر زیادہ محبت کرتے تھے جس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ ان کے والد عبدالرحمٰن اگرچہ ایک پرہیزگار اور شفیق انسان تھے' لیکن اپنے بیٹے کی طرح کسی نمایاں خصوصیت کے حامل نہ تھے۔ اس دور کے بعد بھی جبکہ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے ساتھ سلطنت حاصل کی تھی' وہ اپنے باپ سے یہاں تک ادب سے پیش آتے کہ جب عبدالرحمٰن' ان کے والد' کسی کمرے میں ہوتے تو وہ اس کی چھت پر قدم تک رکھنا گوارا نہ کرتے اور کہتے کہ میں اپنے والد محترم کے سر پر چلنے کی کس طرح جرأت کرسکتا ہوں۔ مجھے ان کے باپ کے سامنے اسی انکساری نے ایک مرتبہ ایک عجیب و غریب مخمصے میں ڈال دیا۔ میں ایک دن حسب معمول بادشاہ کے والد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم دونوں فرش پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ملازم نے آکر اطلاع دی کہ شیخ تشریف لا رہے ہیں۔ کچھ لمحات کے بعد بادشاہ دروازہ پر آ پہنچا۔ میں نے تعظیم کی غرض سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن عبدالرحمٰن نے مجھے کلائی سے پکڑ کر بٹھا دیا اور کہا آپ میرے مہمان ہیں۔ میں اس بات سے سخت پریشان ہوا کہ بادشاہ تو اجازت کے انتظار میں باہر کھڑے رہیں اور میں اپنی جگہ بیٹھا رہوں۔ اس اثنا میں عبدالرحمٰن نے اپنی گفتگو اس اطمینان سے جاری رکھی جیسے کہ کوئی دخل اندازی نہیں ہوئی۔ چند منٹوں کے بعد بادشاہ کے والد نے سر اٹھایا اور کہا ''اے لڑکے نزدیک آکر بیٹھ جاؤ' اس وقت بادشاہ کی عمر سینتالیس سال کی تھی۔''

اس باب میں فاضل مصنف نے ایک بڑی فکر انگیز بحث یہ بھی چھیڑی ہے کہ ہم کسی شخص کو جب پہلے پہل اپنے آگے لگاتے ہیں تو اس مفروضہ پر کہ اس کی پیروی کرنا شروع کرتے ہیں کہ وہ شخص منزہ عن الخطا ہے' دنیا کے ہر عیب سے خالی ہے اور دنیا کی ہر صفت سے متصف ہے' لیکن جب اس میں ذرا سی خامی بھی دیکھ پاتے ہیں تو پھر اس کے خلاف جدوجہد کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں اور اس وقت تک چین سے بیٹھنا پسند نہیں کرتے جب تک کہ اس کے سب کیے کرائے پر پانی نہ پھیر دیا جائے۔ ہماری یہ کیفیت انتہائی افسوسناک ہے۔ ہم میں اعتدال نہیں۔ ہمارے فیصلے حقیقت پسندی پر مبنی نہیں ہوتے۔ اس معاملہ میں ہم ہمیشہ سے انتہا پسند واقع ہوئے ہیں۔ ہماری عقیدت ونفرت دونوں ہی اندھی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری کوئی تحریک بھی کامیاب نہیں ہوتی۔ ہمارے نزدیک افضل واکمل اگر کوئی ذات ہے تو وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ وہ ہر خطا سے پاک اور کمزوری سے منزہ ہیں۔ وہی ہمارے سامنے اصل

Marfat.com

معیار ہیں' وہی ہمارے لیے ایک آئیڈیل ہیں۔ ہر دوسرا شخص جو کچھ بھی کہے یا کرے' اسے ہمیں اسی ایک معیار کے مطابق جانچنا اور پرکھنا چاہیے اور اس نسبت سے وہ جس مرتبہ میں ہو' اسے اسی مرتبہ اور مقام پر رکھنا چاہیے' لیکن تاریخ کے ہر دور میں ہم نے اس بڑی حقیقت کو جو ہمارے ایمان کا ایک ضروری جزو ہے' بھلا دینے کی حماقت کی ہے اور اسی وجہ سے ہم مختلف قسم کی گمراہیوں میں مبتلا ہوئے ہیں۔ قریب قریب یہی سلوک اہل نجد نے شاہ ابن سعود سے کیا۔ اس نے جب شریف حسین کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو لوگوں نے اسے انسانیت کا واحد نجات دہندہ خیال کیا' لیکن جب اس نے سلطنت حاصل کر چکنے کے بعد عیش و تنعم کی زندگی بسر کرنا شروع کی تو پھر اسے فرعون کا لقب دیا گیا۔ اس کے متعلق جس طرح پہلی رائے مبالغہ آمیز ہے اسی طرح دوسری میں بھی غلو اور شدت ہے۔

مسلمانوں کی قومی تاریخ میں کتنی شخصیتیں ابھریں' انہوں نے عوام کے قلوب کو مسخر کر کے بڑی بڑی زوردار تحریکیں چلائیں لیکن جلد ہی وہ ختم بھی ہو گئیں۔ جس مبالغہ آمیزانہ عقیدت نے انہیں جنم دیا' وہی پھر ان کی مدفن بھی بنی۔ جس طرح کسی فرد یا تحریک میں ذرا سی خوبی' ہمیں فوراً اس پر فریفتہ کر دیتی ہے اور ہم دل و جان سے اس پر فدا ہونے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں' بالکل اسی طرح اس میں ذرا سی لغزش یا کمزوری بھی ہمیں نفرت کی آخری انتہا تک لے جاتی ہے۔ اس انداز فکر سے ہماری ملت کو بے حد صدمہ پہنچا ہے۔

اس سلسلہ میں دوسری چیز یہ ہے۔ ہم نے تحریک اسلامی کو ہمیشہ شعوری یا غیر شعوری طور پر افراد سے وابستہ کیا ہے۔ کسی تحریک کے اٹھانے اور اسے لے کر آگے بڑھنے میں اشخاص کا بلاشبہ بڑا دخل ہے' لیکن وہ تحریکات جو اصولوں پر قائم ہوتی ہیں' ان میں اشخاص' خواہ کتنی بڑی اہمیت کے حامل ہوں بہر حال ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں اصولوں پر کبھی بھی برتری اور تفوق نہیں دیا جا سکتا' لیکن اسے اس قوم کی بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اصولوں سے محبت کی بجائے ہمیشہ افراد کو اپنا محور عقیدت بنایا ہے اور اس میں اتنی زیادتی کی کہ اصولوں کو بڑی بے تکلفی کے ساتھ اشخاص کی بھینٹ چڑھا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک اسلامی کے دھارے میں اگرچہ تسلسل اور روانی تو موجود ہے' لیکن اس کی موجوں میں وہ یکسانیت دکھائی نہیں دیتی جس کا اس کی فطرت تقاضا کرتی ہے۔ ہمارے ہاں جب بھی کوئی تحریک احیائے اسلام کے لیے اٹھی تو وہ چند افراد کی ہر دلعزیزی پر اٹھی' لوگوں کو بھی محبت تحریک سے کہیں زیادہ افراد سے پیدا ہوئی اور جب ان افراد میں کوئی کمزوری دکھائی دی تو فوراً دل شکستہ ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ طرز عمل اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے کہ ان حضرات کا تعلق صرف چند افراد سے تھا اور انہیں کی وجہ سے وہ تحریک سے وابستہ تھے۔

مسلم قوم کی اس ذہنی کیفیت کو اسد صاحب نے ایک دوست کی زبان سے بڑی عمدگی سے ادا کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ابن سعود نے ان بہت سی توقعات کو جو جوانی میں اس سے وابستہ کی جاتی تھیں' اپنے طرز عمل سے غلط ثابت کیا ہے...... لوگ کس طرح آسانی کے ساتھ اس ناامیدی کو برداشت کر سکتے ہیں' جو انہیں اس سے ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نجد کے اب بہت سے نوجوان شاہ کے خلاف نہایت تلخ باتیں کہتے ہیں

Marfat.com

اور وہ سمجھتے ہیں کہ بادشاہ نے ان کے اعتماد کو نقصان پہنچایا ہے۔ میں اپنے ایک نجدی دوست کے یاس و قنوطیت کے ان جذبات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جو کبھی ابن سعود کی قیادت کا پُرجوش حامی تھا اور جس نے زندگی کے تاریک ترین لمحات میں اس کا ساتھ دیا۔ اس نے شاہ کے متعلق ایک دفعہ گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

'جب ہم ابن سعود کے جھنڈے تلے-- وہ جھنڈا جس پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا-- شریف حسین کی مخالفت میں آگے بڑھ رہے تھے تو ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ ابن سعود وہ موسیٰ ہے جو ہمیں جہالت اور تباہی کی تاریک وادیوں سے نکال کر اسلام کی آزاد اور امن پسندانہ سرزمین میں لے جائے گا۔ لیکن اس نے جب آرام و آسائش میں کھو کر اپنی رعایا اور اس کے مستقبل کو فراموش کر دیا تو پھر ہمارے نزدیک اس کی حیثیت ایک فرعون کی سی تھی۔'''

اس کے اس تاثر پر اسد صاحب تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میرے رفیق نے ابن سعود کے خلاف جس غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے اس میں بڑی تلخی ہے اور اس کی رائے غیر محتاط اور غیر منصفانہ ہے۔ شاہ نہ تو فرعون ہے اور نہ ہی ظالم۔ وہ ایک شفیق انسان ہے اور اپنی رعایا سے محبت کرتا ہے لیکن وہ موسیٰ بھی نہیں۔ اس کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اس ارفع اور اعلیٰ معیار پر پہنچ نہ سکا جس پر لوگ اسے دیکھنے کے آرزومند تھے...... وہ زیادہ سے زیادہ ایک وسیع پیمانے پر رحم دل قبائلی سردار ہے۔''

اس کے بعد فاضل مصنف نے ایران کے ذہنی پس منظر کا جائزہ لے کر یہ بتایا ہے کہ یہاں شیعیت کو کیوں زیادہ عروج ہوا۔ وہ فرماتے ہیں:

''قریباً ڈیڑھ سال جو میں ایران میں رہا میں نے محسوس کیا کہ اس ملک میں یاس و قنوطیت چھائی ہوئی ہے اور یہ چیز دیہات اور شہروں میں لوگوں کے باہمی تعلقات میں حتیٰ کہ ان کے مذہبی تہواروں میں الغرض ہر جگہ نمایاں ہے۔ ایرانیوں کے مذہبی احساسات میں عربوں کے برعکس غم و افسوس کا عنصر غالب ہے۔ ان کے نزدیک حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کے نامور بیٹوں حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی وفات پر آہ و فغاں کرنا اس سے کہیں زیادہ اہم ہے کہ وہ دیکھیں کہ اسلام ہم سے کس چیز کا مطالبہ کرتا ہے اور ہمارے سیرت و کردار کو کس سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔''

اسد صاحب نے دجال کے ذیل میں بحث کرتے ہوئے مغربی تہذیب پر بڑی سخت چوٹیں کی ہیں۔ یہ ساری بحث بڑی ہی دلچسپ ہے۔ اس کے کچھ حصے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

''تہذیب جدید دجال کی طرح کانی اور یک رخی ہے۔ وہ صرف انسان کے ایک پہلو یعنی مادی ترقی کی طرف دیکھتی ہے اور اس کے روحانی پہلو کو بالکل نظر انداز کرتی ہے۔ اس نے اپنے صنعتی کمالات کی وجہ

Marfat.com

سے انسانوں کو ان کی طبعی استعداد سے کہیں زیادہ بڑھ کر دیکھنے اور سننے کے قابل بنا دیا ہے۔ وہ اب زیادہ سے زیادہ فاصلے تھوڑے سے تھوڑے عرصے میں طے کر سکتے ہیں...... اس کی مادی ترقی نظر کو اس قدر خیرہ کرنے والی ہے کہ جن لوگوں کا ایمان کمزور ہے انہوں نے اسی کو خدا تسلیم کر لیا ہے۔

''انہیں اس امر کا پورا یقین ہے کہ یہ تہذیب انہیں راحت اور حقیقت سے ہم کنار کر دے گی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں انہوں نے دنیا کے اطراف و اکناف میں عیسائیت کو پھیلانے کے منصوبے بنائے' لیکن اب ان کا مذہبی جوش اور ولولہ اتنا سرد پڑ گیا ہے کہ اس کی حیثیت پس پردہ ساز کی سی ہے' جو ہمیشہ بجتا تو رہتا ہے لیکن ان کی زندگی کو متاثر نہیں کرتا۔ ان لوگوں نے اب زندگی کے مادی نظریہ کی اشاعت شروع کی ہے۔ ان کا عقیدہ اب یہ ہے کہ دنیا کے سارے مسائل کارخانوں' تجربہ گاہوں' ماہرین شماریات کی میزوں پر حل کیے جا سکتے ہیں۔

''مغربی انسان نے حقیقت میں دجال کی پرستش شروع کر دی ہے۔ عرصہ ہوا وہ شرافت کو چھوڑ بیٹھا ہے۔ اس کا اب فطرت سے بھی تعلق باقی نہیں رہا۔ زندگی اس کے لیے ایک معمہ ہے۔ وہ شک کی بیماری میں مبتلا ہے۔ وہ اپنے عزیز و اقارب حتیٰ کہ اپنے آپ سے بیگانہ ہے' اپنی اس تنہائی کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کو خارجی ذرائع سے مفتوح کرے۔ اس کا محض زندہ رہنا اسے اندرونی طور پر اطمینان اور تسکین عطا نہیں کر سکتا۔ چونکہ اس کا اپنے خدا سے رشتہ منقطع ہو گیا ہے' اس لیے اس نے اپنی رفاقت کے لیے مشین کو منتخب کیا ہے۔ وہ اب اپنی ساری توجہ اسی پر صرف کر رہا ہے لیکن اس نے اس کے لیے نئی ضروریات اور نئے خطرات پیدا کر دیے ہیں۔ مشین کا پہیہ اب اس کا خدا ہے' لیکن اس نئے مذہب کے پروہت اور پادری غالباً اس حقیقت سے واقف نہیں کہ یہ حیرت انگیز صنعتی ترقی علم کے اضافہ اور وسعت کا نتیجہ نہیں بلکہ روحانی ناکامی اور مایوسی کا اثر ہے اور یہ حیرت انگیز مادی کمالات جن کی موجودگی میں انسان یہ گمان کر بیٹھا ہے کہ وہ فطرت کو مسخر کر لے گا' درحقیقت ایک مدافعانہ انداز فکر کے ترجمان ہیں...... اس کے چمکتے ہوئے ''ظاہر'' کے پیچھے ایک ''نامعلوم'' کے وجود کا احساس انگڑائیاں لے رہا ہے۔''

کتاب کے مصنف بسا اوقات جذبات کی رو میں بہہ کر بڑے جوش سے سوالات کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی پستی اور بدحالی پر سخت مضطرب اور پریشان ہیں۔ وہ اس بات پر حیران ہیں کہ اس قوم نے آخر اسلام ایسی متاع گراں مایہ کو کیوں چھوڑ دیا ہے۔ وہ جب اس موضوع پر آتے ہیں تو جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ ان کی اس جھنجھلاہٹ کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں:

''اے مسلمانو! آخر اس کا سبب کیا ہے کہ تمہارا اپنے آپ سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔ وہ اعتماد جس کی مدد سے تم نے کبھی عرب سے مغرب کی طرف بحراوقیانوس تک اور مشرق میں چین تک کا علاقہ ایک صدی

Marfat.com

کے اندر اندر ہی فتح کر لیا اور اب تم شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ مغربی رسم ورواج کو بڑی آسانی سے قبول کرتے جا رہے ہو۔ تم وہ لوگ ہو جن کے آباؤ اجداد نے عقل اور علم کو چار چاند لگائے' تہذیب کے گیسو سنوارے۔ تم کیوں اپنے درخشاں ماضی کی طرف نہیں پلٹتے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ ادنیٰ سا فوجی اتاترک جو اسلام کی ساری اقدار کا انکار کرتا ہے' وہ تمہارے لیے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا ایک نشان بن چکا ہے۔ تم مجھے بتاؤ کہ کس طرح تمہارے پیغمبر کی سادہ تعلیمات بے مقصد قیاس آرائیوں اور بحث ومناظرہ میں دب کر رہ گئی ہیں۔ تمہارے شہزادے اور تمہارے جاگیردار عیش وعشرت کی زندگی ان حالات میں بسر کر رہے ہیں جبکہ ان کے لاتعداد بھائی انتہائی غربت اور افلاس میں مبتلا ہیں۔''

''تمہارے اسلام نے ایک ایسی تہذیب کو جنم دیا جس میں نہ تو نیشنلزم ہے اور نہ ہی طبقہ واریت' اس میں نہ تو کوئی چرچ ہے اور نہ ہی کوئی مذہبی گروہ۔ اس میں شرافت ایک نسل سے دوسری نسل سے منتقل نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک فرد کے اعمال پر موقوف ہے۔ اس تہذیب کا مقصد انسان اور خدا کے درمیان تھیا کریسی کا قیام تھا اور انسانوں میں جمہوریت کا نشوونما۔''

اسد صاحب کا جوش جب کچھ دیر کے بعد ٹھنڈا ہوتا ہے تو وہ پھر اسلام کے متعلق نہایت ہی صحیح نتیجے پر خود بخود پہنچ جاتے ہیں۔

''مسلم ممالک میں مسلمانوں کے جو حالات میں نے دیکھے' انہوں نے مجھے اسلام سے کسی طرح بھی بدظن نہ کیا۔ چار سال جو میں نے وہاں گزارے' ان میں مَیں اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو گیا کہ اسلام اب بھی ایک زندہ و جاوید قوت ہے۔ میرے لیے صرف اسی قدر جاننا باعث اطمینان تھا کہ تاریخ کے ایک دور میں اسلامی تعلیمات کو عملی زندگی میں نافذ کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی جا چکی ہے اور جو چیز ماضی میں ممکن تھی' وہ آج کیونکر ناممکن ہو سکتی ہے؟ آخر کیا ہوا اگر مسلمانوں نے اسلام کی اصل تعلیم کو ترک کر کے جہالت کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی ہے۔ اس میں آخر حیران کن کونسی چیز ہے کہ یہ قوم اس معیار پر زندہ نہیں رہی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے تیرہ سو سال پہلے پیش کیا تھا۔ یہ معیار آج بھی دنیا کے ہر انسان کو اپنانے کی دعوت دیتا ہے اور اس معیار کو قبول کرنے میں کوئی چیز بھی مانع نہیں۔

''مجھے اس امر کا پورا یقین ہے کہ آج صرف ایک فرد ہی نجات کا طالب نہیں بلکہ موجودہ سوسائٹی اس کی زیادہ ضرورت مند ہے۔ شاید آج سے پہلے کبھی بھی انسانیت نے عمرانی معاہدہ کے لیے ایک نظریاتی بنیاد کی اس قدر احتیاج محسوس نہیں کی جتنی کہ وہ ہمارے اس دور میں محسوس کر رہی ہے۔ آج ہمیں ایک عقیدہ اور ایمان کی ضرورت ہے جو ہم پر مادی ترقی کا کھوکھلا پن واضح کر سکے اور اس کے ساتھ اس فانی زندگی کا جو حق ہم پر عائد ہوتا ہے' اسے بھی نظر انداز نہ کرے' جو ہماری روحانی اور مادی

Marfat.com

احتیاجات کے درمیان حسن اعتدال کا مظہر ہو اور اس طرح ہمیں اس تباہی سے بچائے جس کی طرف ہم بگٹٹ دوڑے جا رہے ہیں۔''

یہ پوری کتاب اسی قسم کے صحیح احساسات و افکار سے بھری پڑی ہے۔ فاضل مصنف کی نظر گہری اور اس کا تجزیہ بہت حد تک درست ہے، لیکن یہ سخت ناانصافی ہوگی اگر اس سلسلے میں چند ضروری باتیں عرض نہ کر دیں۔

اس کتاب کو پڑھنے سے ایک انسان جو عام تاثر لیتا ہے، وہ یہ ہے کہ فاضل مصنف اپنے جذبہ خلوص اور جوش کے باوجود ابھی تک اپنے دل و دماغ سے مغربی اثرات کو زائل نہیں کر سکے۔ وہ جب بھی اسلامی تحریکات کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے بارے میں بعض اس قسم کے جملے لکھ جاتے ہیں جن سے دل کو تکلیف ہوتی ہے مثلاً یہ کہ اخوان حق پرستی کے زعم میں مبتلا تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے جہاں جہاں علما کا ذکر کیا ہے، انہیں ایک تنگ نظر اور تاریک خیال گروہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ تبصرہ نگار کے نزدیک حالات کی یہ تصویر صحیح نہیں۔

دوسری چیز جو ذہن کو کھٹکتی ہے، وہ یہ کہ عورت کے معاملہ میں اسلام کا جو نقطہ نظر ہے، وہ اس کی صحیح طور پر ترجمانی نہیں کر سکے۔ اسلام نے بے شک عورت کو بہت زیادہ حقوق دیئے ہیں، لیکن اس نے ان پر وہ ذمہ داریاں نہیں ڈالیں جو مرد پر عائد کی گئی ہیں۔ ہم یہ بات قدرے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ عورت کے بارے میں فاضل مصنف پر ''جدت'' غالب ہے۔ پھر جس اہتمام کے ساتھ انہوں نے اپنی بیگمات کی تصاویر سے کتاب کو مزین کیا ہے وہ تو ان جیسے مسلمان کے وقار کے بالکل منافی ہے۔ ہم ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان تصاویر نے آخر کتاب کی افادیت میں کس حد تک اضافہ کیا ہے۔

تیسرے اسد صاحب کے تعلقات زیادہ تر بادشاہوں اور امرا سے رہے اور اس وجہ سے انہوں نے اپنی سیر و سیاحت کا بیشتر حصہ محلات میں گزارا۔ ان کی دلچسپیاں اسلام سے زیادہ مسلم سوسائٹی کے اونچے طبقہ سے رہیں۔ اسی بنا پر وہ مسلم قوم کے عوامی مسائل اچھی طرح سمجھنے سے قاصر رہے۔

تبصرہ نگار کو یہ دیکھ کر بھی حیرت ہوئی کہ وہ کتاب جو مغرب میں ایک نہایت ہی اونچے معیار پر ایک باذوق انسان کی زیر نگرانی شائع ہوئی ہے، اس میں کتابت کی غلطیاں موجود ہیں۔ صفحہ ۲۵۶ پر Dromedaries کو Dromederies لکھ دیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسری جگہوں پر چند حروف اور اوقاف درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے لیکن یہ ہیں ضرور۔ ان سب خامیوں کے باوجود کتاب نہایت اچھی اور مفید ہے، خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لیے اس میں دلچسپی کے علاوہ غور و فکر کے لیے بھی اچھا خاصا مواد موجود ہے۔

(ترجمان القرآن (لاہور)، جون ۱۹۵۷ء، ص ۱۴۴-۱۶۴۔ اگست ۱۹۵۷ء، ص ۲۹۳-۳۰۶۔ ستمبر ۱۹۵۷ء، ص ۳۵۱-۳۶۰ و ۳۸۱)

Marfat.com

ڈاکٹر ایچ۔بی۔خاں

شاہراہِ مکہ

راقم الحروف نے پی۔ایچ ڈی کے مقالہ کے لئے جب مواد کی تلاش و جستجو شروع کی تو بہت سی کتابیں، دستاویز، نادر اور اہم جرائد ورسائل نیز معروف وغیر معروف اشخاص سے بالواسطہ اور بلاواسطہ تعارف ہوا۔ اسی درمیان میں ایک کتاب ''اوراق گم گشتہ'' بھی نظر سے گزری۔ اس کتاب میں علامہ اقبال کے بارے میں غیر مدون تحریروں کا مجموعہ جناب رحیم بخش شاہین صاحب نے اکٹھا کیا ہے۔ اس کتاب میں دیگر باتوں کے علاوہ جو چیز جاذب نظر ہوئی' وہ چودھری نیاز علی صاحب اور محمد اسد صاحب (سابق لیوپولڈ ویس) کی علامہ اقبال کے ساتھ ملاقات تھی۔ اس ملاقات میں چودھری نیاز علی صاحب نے دارالسلام کے سلسلہ میں علامہ اقبال کی رائے اور تعاون طلب کی تھی۔ علامہ اقبال نے چودھری صاحب کو مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو اس کام کی تکمیل کے لئے حیدر آباد دکن سے بلایا جائے۔ چودھری نیاز علی صاحب کی یہ ملاقات 1937ء میں بہ ہمراہ محمد اسد صاحب' علامہ اقبال سے ہوئی تھی۔ ملاقات کا مقصد یہ بیان کیا گیا تھا کہ چودھری نیاز علی صاحب نے قلعہ جمال پور متصل پٹھان کوٹ میں ایک وقف دارالسلام کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس وقف کے ذریعہ مسلمانوں کی اصلاح و تربیت اور دینی تعلیم کا مناسب بندوبست کرنا تھا۔ نیز فقہ کی تشکیل جدید بھی مقصود تھی۔ عصر ذکر میں اور آج بھی ہم (مسلمان) بحالت موجودہ روز بروز اسلام سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ان میں سے کچھ تو یہ ہیں کہ سیاسی واجتماعی مسائل جنہوں نے موجودہ زمانہ میں ایک خاص شکل اختیار کر لی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء انہیں سمجھیں اور ان کا تجزیہ کریں اور موجودہ حالات کو اسلامی شرائع یعنی قرآن وسنت کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ اصل میں دارالسلام کا قیام مندرجہ بالا حالات کو اسلامی شعائر کی روشنی میں حل کرنے کی ایک اہم کوشش تھی۔ چودھری نیاز علی نے علامہ اقبال سے درخواست کی تھی کہ آپ اس کام میں میری رہنمائی کریں۔ علامہ اقبال نے مشورہ دیا تھا کہ مولانا مودودی کو حیدر آباد دکن سے بلائیں۔ وہ اس کام کے لئے مناسب نظر آتے ہیں۔ چنانچہ چودھری نیاز علی نے مولانا مودودی کو حیدر آباد دکن سے پٹھان کوٹ بلایا۔ موصوف 23 جنوری 1937ء کو پٹھان کوٹ پہنچے تھے۔ علامہ اقبال کی دوررس نگاہوں نے برصغیر میں جس فرد کا انتخاب کیا' وہ مولانا مودودی تھے حالانکہ موصوف اس زمانہ میں زیادہ معروف نہ تھے۔ تاہم وہ اس

Marfat.com

کام کے لئے موزوں ترین تھے۔ چوہدری نیاز علی صاحب کے ساتھ علامہ محمد اسد کی موجودگی اور علامہ اقبال سے ملاقات اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ علامہ محمد اسد صاحب بھی ایک اہم شخصیت ہیں۔ مزید برآں دوران مطالعہ پی۔ ایچ ڈی محمد اسد صاحب کی ایک تصنیف بنام The Road to Mecca نظر سے گزری۔ اس کتاب کی دستیابی بھی اس سلسلہ کا اہم جزو اور معنی خیز ہے۔ یہ کتاب جناب محمد سعیدالدین فاروقی صاحب لائبریرین لیاقت ہال (فریئر ہال) لائبریری کے ایم سی نے عاریتاً فراہم کی۔ موصوف کے ایم سی کی چودہ لائبریریوں کے نگران و مہتمم ہیں۔ موصوف علم دوست اور عالم نواز ہیں۔

کتاب ہٰذا کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ محمد اسد صاحب ایک نومسلم ہیں اور ماضی میں یہودی نژاد تھے۔ آپ کے مسلمان ہونے کے واقعہ اور مغربی تہذیب وتمدن کی داستاں آپ کے اسفار کے حالات، مسلمانوں کی ترقی وعروج اور زوال وانحطاط، سعودی عرب اور آل سعود کے حالات، تحریک سنیوسی، جنگ عظیم اول، شریف حسین مکہ کی ترکی سے بغاوت، برطانیہ کی مسلمانوں کے خلاف سازش اور دیگر حالات اس کتاب میں مذکور ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ موصوف نے حالات وواقعات کو قلمبند کرتے وقت تسلسل، ربط اور کڑیوں کا خیال نہیں رکھا جو ایک معیاری کتاب کے لئے لازم ہیں حالانکہ اسلوب نگارش، زبان وبیان کے اعتبار سے یہ کتاب بڑی پُرمغز اور بیش قیمت ہے۔ مصنف مذکور کے لئے اسلام کی طرف کشش کا جو سبب بنی تھی' وہ موصوف کی طلب صادق تھی جو عزم راسخ سے ہی میسر آتی ہے۔ محمد اسد صاحب نے دیگر کتب ورسائل بھی لکھے ہیں۔ ان کتابوں میں ایک معروف کتاب ''اسلام ایٹ دی کراس روڈز'' (Islam at the Crossroads) بھی شامل ہے۔ موصوف نے اس کتاب میں قانون اسلام کے مآخذ اور خصوصاً کتاب وسنت پر روشنی ڈالنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ نیز مغربی تہذیب وتمدن اور معاشرت کے اہم پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد اسلامی تہذیب وتمدن کے خدوخال اور ان کے حسن وقبح کو تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کے لئے زور آزمائی کی ہے۔ علاوہ ازیں موصوف نے ایک ماہانہ رسالہ بنام ''عرفات'' (Arafat) ستمبر 1946ء میں ڈلہوزی پنجاب سے شائع کیا۔ اس رسالے کے اس شمارے یعنی ستمبر 1946ء سے لے کر جولائی 1947ء تک کی ایک جلد رباط العلوم الاسلامیہ لائبریری کراچی سے حاصل ہوسکی۔ اس جلد میں مارچ اور جون 1947ء کے شمارے نہیں ہیں۔ رسالہ مذکورہ کے شمارہ نمبر 1 تا 4 اور مابعد کے شماروں میں موصوف نے اسلام کے دائمی نظام اور فقہ کے اصل ماخذوں یعنی قرآن وسنت، اجماع اور قیاس وغیرہ پر خاطر خواہ بحث کی ہے۔ ان تمام امور کے علاوہ موصوف کا جو خاص کارنامہ ہے' وہ یہ کہ برصغیر کی تقسیم کے وقت پاکستان کی جغرافیائی، تاریخی، لسانی، ثقافتی اور تمدنی حیثیت کو مدنظر رکھ کر موصوف نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کو نہ صرف پاکستان کے حق میں ضرر رساں بتایا ہے بلکہ اسے عدل وانصاف کے خلاف قرار دیا ہے۔ یہ بات حیرت اور استعجاب سے کم نہیں کہ محمد اسد صاحب نہ تو برصغیر کی سیاست میں دخیل تھے اور نہ ہی برصغیر کے باشندہ تھے۔ مگر ان کی دوررس نگاہوں نے اس بات کو بدرجہ اتم سمجھ لیا تھا کہ برطانیہ کا یہ فیصلہ برصغیر کے مسلمانوں کے لئے سم قاتل ہوگا۔ نیز آپ نے اسی شمارے میں

Marfat.com

پاکستان کے لئے اسلامی قانون کی افادیت اور اہمیت پر بھی زور دیا ہے اور اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اسلامی آئین کو نہ صرف پاکستانی مسلمانوں کے لئے بلکہ عالم اسلام کے لئے ناگزیر قرار دیا۔ اسد صاحب کی اس ادائے خاص نے راقم کو ان کی سوانح اور حالات لکھنے کی طرف راغب و متوجہ کیا۔ مزید برآں موصوف کی شخصیت اس لئے بھی جاذب نظر ہے کہ موصوف نے 1934ء کے بعد برصغیر کا سفر کیا اور تحریک اسلام یعنی اسلامی اتحاد اور یکجہتی کے لئے عملی کوشش کرنے اور اسلام کی شیرازہ بندی کے لئے عملی جہاد کرنے والے فلسفی شاعر علامہ اقبال سے ملاقات کی۔ علامہ اقبال نیل کے ساحل سے لے کر کاشغر تک مسلم اتحاد و یکجہتی کے خواہاں تھے۔ نیز جمال الدین افغانی مرحوم کے خوابوں کی تعبیر یعنی پین اسلامزم کو زندہ جاوید دیکھنا چاہتے تھے۔ حالانکہ موصوف کا یہ خواب تاہنوز شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ علاوہ ازیں علامہ محمد اسد صاحب کی شخصیت اور ان کے کارنامے اس بات سے اور بھی زیادہ نمایاں اور معروف ہوئے کہ آپ نے تشکیل پاکستان کے فوراً بعد حکومت مغربی پنجاب میں محکمہ اسلامی تعمیر نو کے سربراہ کی حیثیت سے کام کیا اور بعدہ وزارت خارجہ نے آپ کی خدمات حاصل کر لیں۔ موصوف نے وزارت خارجہ میں اپنی خدمات پہلے مشرق وسطیٰ میں اور پھر اقوام متحدہ کے دفتر نیویارک یعنی امریکہ (اقوام متحدہ) میں بہ حیثیت پاکستانی مندوب 1952ء تک انجام دیں۔ آپ کی اس نمائندگی سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ مسلمان اپنے نومسلم برادر پر بھی بڑے سے بڑا قومی اعتماد اور بلند سے بلند قومی اعزاز و منصب دینے میں گریز نہیں کرتے اور یہ واضح اور مسلم حقیقت' اسلام کی اس دائمی صداقت کی بولتی بالتی اور جیتی جاگتی تصویر ہے کہ "کل مومن اخوۃ" یعنی سب مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور اس اخوۃ اور بھائی چارگی میں زبان، مقام، رنگ و نسل، اعلیٰ و ادنیٰ، شرقی و غربی یا کسی قسم کی دیگر تفریق و امتیاز کا کوئی عمل دخل نہیں ہے جبکہ اس کے برعکس دیگر اقوام، کسی نووارد سے ریاست یا ملک کے خفیہ سے خفیہ تر راز و انکشافات کے سلسلہ میں سفیر یا مندوب مقرر کرنا تو کجا، ریاست و امارت کے معمولی راز اور خفیہ سکیموں کو ظاہر کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ مختصر یہ کہ قبول اسلام کے بعد ہر شخص بڑے سے بڑے قومی و ملکی اعتماد اور کلیدی مناصب پر فائز ہونے کا استحقاق رکھتا ہے اور قوم و ملک ایسے شخص یا اشخاص پر بلا جھجک ہمہ قسم کا اعتماد اور بھروسہ کرتی ہے۔ قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ میں اس قسم کی صدہا مثالیں موجود ہیں۔

محمد اسد صاحب کی کتاب "دی روڈ ٹو مکہ" کا ترجمہ بنام "طوفان سے ساحل تک" 1961ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے مترجم محمد الحسنی صاحب مدیر "البعث الاسلامی" ہیں۔ یہ ترجمہ تنویر پریس ایمن آباد لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ محمد الحسنی صاحب علمی دنیا میں معروف و مقبول ہیں اور کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ جہاں تک ترجمہ اور تلخیص کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ قائم اور درست ہیں مگر ترجمہ ہذا میں دیگر خامیوں کے علاوہ اصل کتاب کے کئی اہم ابواب بھی ترجمہ نہ ہو سکے اور کئی موضوعات مثلاً "سنوسی تحریک" اور اس سے متعلق دیگر امور پر بھی ترجمہ سے رہ گئے۔ عبارت میں ٹائپ اور انگریزی کے بعض الفاظ میں بھی اغلاط پائی جاتی ہیں اور ان تمام باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ بات بلاشک و تردد کہی جا سکتی ہے کہ مترجم نے معیاری، شستہ اور ادبی زبان استعمال کی ہے اور اصل کتاب کو پیش کرنے کی امکانی کوشش

Marfat.com

کی ہے۔

''شاہراہ مکہ'' لکھنے سے راقم کی غرض و غایت اور مدعا یہ ہے کہ اس نام کی مناسبت سے اسد صاحب کی کتاب ''دی روڈ ٹو مکہ'' کے ان اہم پہلوؤں کو سامنے لایا جائے جو اس کتاب میں بے ترتیب بکھرے پڑے ہیں۔ تسلسل، تنظیم اور ترتیب کے اعتبار سے تسبیح کے ان بکھرے ہوئے دانوں کو ایک لڑی میں پرونے کی امکانی کوشش کی گئی ہے۔ مزید برآں ساتھ ہی ساتھ نظام کے اساسی اور بنیادی تصور حاکمیت اور انبیاء و رسل کی آمد و بعثت کا مقصد بھی اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے تاکہ قاری کی نظر میں اسلامی نظام کا فلسفہ اور حیات بعد ممات کا صحیح اور عملی تصور بھی سامنے آسکے۔ شاہراہ مکہ کا نام محمد اسد صاحب کی کتاب ''دی رڈ ٹو مکہ'' لکھنے سے اس کی دو حیثیتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ محمد اسد صاحب کا انداز تحریر اور اسلوب نگارش مخصوص اور اہم ہے۔ دوم موصوف نے ادبی، تاریخی اور فلسفیانہ انداز بیان اختیار کیا ہے اور اپنی بساط بھر علم و قلم کا جوہر دکھایا ہے۔ مندرجہ بالا دو حیثیتوں کے علاوہ ایک اور اہم خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ محمد اسد صاحب نے اپنے وجود اور دلچسپیوں کو امت مسلمہ کے وجود اور دلچسپیوں سے اس طرح پیوست کیا ہے گویا کہ وہ ایک خاندان کے فرد ہیں۔ ان کی کتاب کے بکھرے ہوئے جواہر ریزوں کو یکجا کرنے سے تاریخ کے طلبہ کو اچھا خاصا مواد مل جائے گا۔ نیز تاریخی اعتبار سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام ایک زندہ جاوید اور متحرک قوت ہے اور اسلام کی قوت جو ماضی میں عملاً ممکن اور ثابت ہو چکی ہے، وہ عصر حاضر میں کیونکر ناممکن ہو سکتی ہے؟ اس نکتہ کی عقدہ کشائی کے لئے راقم نے یہ کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے علل و اسباب کو پیش کرے تاکہ یہ بات حقائق اور واقعات و حالات کی روشنی میں خود بخود ثابت ہو سکے کہ مسلمانوں کا زوال و انحطاط اسلامی تعلیمات یا اسلام کے فلسفہ حیات میں نقص و خرابی کی بنا پر نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی تیرگی ان کی اپنی بے عملی اور انجماد کا نتیجہ ہے۔

قبل اس کے کہ میں اپنے معاونین و رفقا کا شکریہ ادا کروں یہ بات بیان کرنا بڑی ناسپاسی اور ناشکری ہے اگر میں اپنے شفیق مکرم و محترم استاد ڈاکٹر ریاض الاسلام صاحب، پروفیسر جنرل ہسٹری، یونیورسٹی کراچی کا ذکر نہ کروں۔ موصوف سے میرا تعارف 1967ء کے آخر میں ہوا جب کہ میں نے پی۔ ایچ ڈی میں داخلہ لینے کا ارادہ کیا۔ یہ تعارف محترم علی محسن صدیقی صاحب استاد شعبہ تاریخ اسلام، یونیورسٹی کراچی کے ایماء پر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نہ صرف پروفیسر اور کہنہ مشق استاذ ہیں بلکہ ماہر نفسیات بھی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ موصوف نے پہلی ہی ملاقات میں احقر کو اپنی شفقت اور نوازشات سے بہرہ ور فرما کر پی۔ ایچ ڈی کے طالب علم کی حیثیت سے قبول فرما لیا تھا او۔ یہ بات بھی بلاتردد کہی جاسکتی ہے کہ موصوف نے احقر کو نہ صرف قلم پکڑ کر لکھنا سکھایا بلکہ ابجد تا آخر رہبری کی۔ میرے استاذ اپنی سیرت و کردار کے اعتبار سے نہ صرف اپنے شعبہ کے ملازمین میں مقبول محترم ہیں بلکہ وہ اپنی خوش خلقی کے اعتبار سے یونیورسٹی میں بہت مکرم و محترم سمجھے جاتے ہیں۔ احقر کے ساتھ موصوف کا رویہ اور برتاؤ ایک طالب علم کی حیثیت سے نہیں تھا بلکہ ایک رفیق و رہبر جیسا تھا۔ موصوف کے اکرام و انعام کا صلہ یا ستائش تو مجھ جیسے بے بضاعت انسان کے احاطہ میں نہیں ہے مگر مجھے اس بات کے کہنے میں کوئی دریغ یا باک نہیں کہ موصوف نے ایک ناتواں قطرہ کو گوہر بنا دیا۔

Marfat.com

خداوند کریم سے احقر کی یہ التجا اور استدعا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی عمر عزیز میں خیر و برکت عطا کرے تا کہ موصوف اپنی مزید علمی تحقیق و جستجو سے قوم و ملک کو مستفیض و مستفید فرماتے رہیں اور ہم جیسے کم مایہ لوگوں کے لئے رحمت و راحت کا باعث بنے رہیں۔ آمین۔

یہ بات بھی قابل اعتنا اور باعث مسرت ہے کہ اس کتاب کی تدوین و ترتیب میں جناب محمد سعید الدین صاحب فاروقی لائبریری فریئر ہال (لیاقت ہال) لائبریری کے ایم سی کراچی نے بڑی مدد و تعاون سے کام کیا ہے۔ فاروقی صاحب نے نہ صرف مواد فراہم کرنے پر اکتفا کیا ہے بلکہ کتاب ہذا کو منضبط و مرتب کرنے میں بھی خاطر خواہ حصہ لیا ہے۔ فاروقی صاحب کی یہ ودیعت ہے کہ وہ علم نواز، علم دوست اور مخلص انسان ہیں اور علمی ذوق کی تکمیل کے سلسلہ میں یہ فعل ان کی فطرت ثانیہ کی غمازی کرتا ہے۔ موصوف نہ صرف اپنے رفقا و احباب کی علمی خدمت اخلاص اور للٰہیت کے جذبہ کے تحت کرتے ہیں بلکہ اس سلسلہ میں حائل ہونے والی تکالیف و پریشانیوں کا امکانی سدباب بھی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں دار المطالعہ جماعت اسلامی سی اور سی ون ایریا کے ناظم محمد اشفاق صاحب صدیقی بھی قابل تحسین ہیں کہ انہوں نے اپنے دار المطالعہ سے ممکنہ اور موجود مواد (کتب) فراہم کرنے میں بڑی فراخدلی کا مظاہرہ کیا ہے اور اس طرح کتاب ہذا کی تکمیل میں مدد و معاونت کی ہے۔

آخر میں جناب شمیم احمد صاحب، پروپرائٹر (مالک) نورسی پبلیکیشنز لیاقت آباد، کراچی کا بھی ممنون ہوں کہ موصوف نے کتاب ہذا کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں خلوص اور للٰہیت کے ساتھ اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ ان کے تعاون و تناصر سے راقم کی نہ صرف ہمت افزائی ہوئی ہے بلکہ کتاب ہذا کی اشاعت کا اہم مرحلہ بھی بغیر جدوجہد کے حل ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب معاونین کو ان کے خلوص اور للٰہیت کے صلہ میں اجر جزیل عطا فرمائے اور علمی خدمات کے سلسلہ میں مزید ایثار اور قربانی کا جذبہ بھی عطا کرے۔ آمین۔

(در: شاہراہ مکہ، مترجم ایچ۔ بی۔ خاں، کراچی ۱۹۷۶ء مقدمہ)

Marfat.com

مولانا ابوالحسن علی ندوی

[سفرنامۂ اسد]

پیش نظر کتاب [یعنی" طوفان سے ساحل تک"] ایک "سفرنامہ" ہے۔ایک بے چین، ذہین اور حساس مغربی فاضل کے سفرمشرق وسیاحت بلادعربیہ کی داستان۔

"سفرنامہ" اپنی گوناگوں دلچسپیوں، بوقلموں مرقعوں، رنگارنگ مناظر، بےتکلف تصویر کشی، بے ساختہ اظہار خیال اور زندگی اور زندہ دلی کے ساتھ جو ایک اچھے اور کامیاب "سفرنامہ" کی خصوصیات ہیں۔

بلاشبہ یہ ایک "سفرنامہ" ہے۔اس کتاب کے عنوان کے لئے اس سے بہتر اور مختصر لفظ ملنا مشکل ہے۔اس میں پڑھنے والے کو وہ سب کچھ ملے گا جس کی ایک سفرنامہ میں تلاش اور توقع ہوتی ہے۔ایک طویل بحری سفر کے تجربات و تاثرات، شام وفلسطین ومصر کی زندگی کے مناظر، عربوں کی معاشرت اور تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر، فرنگی نژاد زائرحرم کے مشاہدات وجذبات، حج کے بین الاقوامی اجتماع کا تاثر، مدینہ کے پُرسکینت شہر کی کیفیات، ربع الخالی اور صحرائے عرب کی ہوش ربا داستانِ سفر، حوصلہ مند ونوعمر سیاح کی ناعاقبت اندیشیاں، خوش نصیب مسافر کی سخت جانی وسخت کوشی، عربوں کی مہمان نوازی اور مساوات، ہرات وغزنی کی مہمانداری ومسافرنوازی، یورپ کی مشینی اور بے جان زندگی کی کرختگی اور افسردگی، عرب ممالک کے باشندوں کی گرم جوشی اور زندہ دلی سب کچھ آپ کو اس سفرنامہ میں نظر آئے گا اور ایک ایسے شخص کو جس کو سفرنامے اور روزنامچے اور مختلف ممالک کے حالات پڑھنے کا چسکہ پڑ گیا ہے' اس کتاب کو پڑھ کر ہرگز مایوسی نہ ہوگی۔

لیکن قدیم وجدید سفرناموں کی اس طویل قطار میں جس میں برابر اضافہ ہورہا ہے' یہ کتاب اپنی "منفرد شخصیت" رکھتی ہے۔وہ اگر سفرنامہ ہے اور یقیناً ہے تو ایک بہت طویل، بہت نازک اور بہت پُرپیچ سفر کی روداد ہے۔اس سفر میں جو مسافت طے کی گئی ہے اور جن سرحدوں کو عبور کیا گیا ہے' ان کا نشان نہ ابن بطوطہ وابن جبیر کے دلچسپ سفرناموں میں ملتا ہے، نہ کولمبس اور واسکوڈے گاما کی اولوالعزمانہ مہموں اور انقلاب انگیز اکتشافات میں۔

گذشتہ سیاحوں نے قدیم وجدید دنیا کے ایک بعید گوشہ سے دوسرے بعید گوشہ کا سفر کیا۔دریاؤں اور پہاڑوں کو عبور کیا۔صحراؤں اور وادیوں کو قطع کیا، نئے نئے ممالک اور اپنی دنیا کے متعلق نئے نئے حقائق دریافت کیے، بڑے

Marfat.com

بڑے خطرات کو دعوت دی اوران کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اپنی قوت ارادی، بلند ہمتی، انسان دوستی اور ذوق و جستجو کا نقش قائم کر دیا۔ وسائل سفر کی کمی، سفر کی صعوبت، راستے کے خطرات ان کے ان کارناموں میں مزید عظمت و رفعت پیدا کرتے ہیں۔

لیکن محمد اسد کا کارنامہ اوران کے سفر کی داستان ان سب سے مختلف ہے۔ انہوں نے جو مسافت طے کی ہے اور جن سرحدوں کو عبور کیا ہے' وہ جغرافیائی سیاحوں اور اولوالعزم کوہ پیماؤں کی طے کی ہوئی مسافت اور عبور کی ہوئی سرحدوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ قدیم سیاحوں نے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کیا تھا لیکن محمد اسد نے ایک دنیا سے دوسری دنیا کا سفر کیا ہے۔ دونوں دنیائیں اسی کرہ پر واقع ہیں، ایک دوسرے کی معاصر، ایک دوسرے کی ہمسایہ، لیکن دونوں ایک دوسرے سے بیگانہ، ایک دوسرے سے ناآشنا، ایک دوسرے سے متضاد، ایک دوسرے سے بے نیاز، ایک دوسرے سے روٹھی ہوئی، چھوٹی ہوئی، ہر ایک دوسرے سے اتنی مختلف کہ ایک انسان کی دو بستیاں نہیں معلوم ہوتیں۔ الگ الگ انسانوں کے مسکن اور دو جداگانہ تہذیبوں کے مرکز معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے جسموں کا باہمی فاصلہ بہت مختصر' لیکن ان کے ذہنوں اور ان کی روحوں کا فاصلہ نا قابل قیاس اور نا قابل پیمائش، ایک میں ایمان و عقیدہ، امن و سکون، اطمینان و اعتماد، قناعت و استغنا، محبت و الفت، انسانیت کی لطافت، زندگی کی حرارت، قلب کا گداز، روح کا سوز و ساز، زندگی کے کارواں کی نرم روی و سبک گامی، جرسِ حیات کی شیریں نوائی و سامعہ نوازی، فطرت کی سادگی اور اس کا حسن، خالق ومخلوق دونوں سے مخلصانہ ارتباط، جسم و روح کا صحیح اتحاد۔

دوسری جگہ بے یقینی و ناامیدی، معاشرہ کا اضطراب و انتشار، اغراض و مفادات کا تصادم، سیاسی جماعتوں کی رقابتیں، طبقات کی کشمکش، جنگ کے مہیب بادل، بے اعتمادی و بدگمانی کی تاریک فضا، حصول دولت اور ترقی و توسیع تجارت کا جنون، ایک نہ بجھنے والی پیاس، ایک نہ مٹنے والی بھوک، جمادات کی بے حسی و بے ضمیری، مشینوں کی بے دردی و بے نوری، قلب و روح کی موت، انسانیت کا زوال، قافلہ حیات کی تیز رفتاری و ہنگامہ خیزی، صور زندگی کی بلند آہنگی اور قیامت خیزی، زندگی کی اصل لذت اور انسانیت کی حقیقی لطافت کا فقدان، خالق ومخلوق دونوں سے غرض مندانہ اور سطحی تعلق، روح و جسم کی کشمکش۔ خود محمد اسد کے بلیغ و مصور قلم سے اس دنیا کی تصویر ملاحظہ ہو۔

> ''ایک دنیا جہاں اضطراب اور ابال ہو، یہ بھی ہماری دنیا، حد درجہ تباہی و خوں ریزی جس کی مثال ملنی مشکل ہے، اجتماعی روایات میں رسہ کشی فکری مذاہب میں تصادم، زندگی کے نئے نئے طریقوں اور فیشن کے لئے ہر جگہ ایک سخت کش مکش، یہ ہیں ہمارے دور کے خصائص اور اوصاف۔
>
> جنگ عظیم کے دھویں کے ہولناک بادلوں اور تباہ کاریوں سے لے کر چھوٹی چھوٹی جنگوں تک جن کا کوئی شمار نہیں، انقلابات اور جوابی انقلابات، اقتصادی اور معاشی پریشانیاں جو اس زمانے کی تمام دشواریوں اور پریشانیوں سے بڑھ چڑھ کر تھیں، ان

Marfat.com

تمام ہولناک واقعات نے یہ حقیقت ظاہر کر دی تھی کہ فنی، صنعتی اور مادی ترقیات پر مغرب کی ساری زور آزمائی موجودہ انتشار اور بدنظمی میں ذرا بھی کمی نہیں کر سکی۔''

دوسری جگہ مغرب کے روحانی خلا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''بیسویں صدی کے ابتدائی سال اس لحاظ سے خاص امتیاز رکھتے ہیں کہ ان میں نمایاں طور پر ایک روحانی خلا (Spiritual Vacuum) پایا جاتا تھا۔ وہ ساری اخلاقی اور روحانی قدریں جن سے یورپ صدیوں سے آشنا تھا، اب کسی خاص اور متعین شکل پر باقی نہیں رہ گئی تھیں۔ یہ ان ہولناک واقعات کا نتیجہ تھا جو ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان پیش آئے۔ بظاہر اس کی کوئی توقع بھی نہیں معلوم ہوتی تھی کہ اقدار کا کوئی نیا مجموعہ ان قدروں کی جگہ لے سکے گا۔ ہاں خطرہ اور خوف کا ایک احساس تھا' وہ احساس جو عقلی اور سماجی ابال سے پہلے پیدا ہوا کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان اس شبہ میں پڑ گیا تھا کہ آیا اس کی کوشش اور افکار کسی ایک مستقر پر رکیں گے یا نہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہر چیز تنکے کی طرح ایک بے راہ سیلاب میں بہی چلی جا رہی ہو۔

اس روحانی بے چینی اور بے اطمینانی میں نوجوانوں کے لئے ایک قدم بھی ٹکانے کی جگہ نہ تھی۔ پھر معتبر اخلاقی قدروں اور معیاروں کے فقدان سے کسی کے اختیار میں نہیں رہا تھا کہ وہ ہمارے ان سوالات کا جو ہمارے دماغ کو پریشان کر رہے تھے، تسلی بخش جواب دے سکتا۔''

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

''وسطی یورپ کے لئے اس صدی کی تیسری دہائی کے یہ چند سال عجیب وغریب تھے۔ اجتماعی اور اخلاقی انتشار و بدامنی کی فضا ہر طرف چھائی ہوئی تھی اور اس نے انسان میں ایک خطرناک امید پرستی پیدا کر دی تھی جس کا اظہار وہ موسیقی، فوٹو گرافی، تھیٹر اور آرٹ نیز کلچر کے مزاج اور ان کے ارتقا کے بارے میں انقلابی سوالات اور تحقیقات کے ذریعہ کر رہا تھا لیکن ایک روحانی خلا ان مجبور سوالات کے پس منظر میں ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ انسان کے مستقبل کی طرف سے بڑھتی ہوئی مایوسی کی وجہ سے اس میں ایک مبہم قلبی اضافیت پیدا ہو گئی تھی۔''

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

یہ تھی وہ دنیا جس میں محمد اسد نے لیو پولڈ ویس (Leopold Weiss) کے نام سے اور ایک یہودی ربی خاندان کے چشم و چراغ کی حیثیت سے آنکھ کھولی اور جسمانی و ذہنی نشو ونما حاصل کیا۔ یہودی عالموں اور دینی پیشواؤں

Marfat.com

کے خاندان کا ماحول جہاں نسلی غرور اور احساس برتری بچہ بچے کی گھٹی میں پڑا ہوا ہوتا ہے، فلسفہ اور تاریخ وادبیات کا وسیع اور گہرا مطالعہ 'فنون لطیفہ کا فطری ذوق، جرمنی کی بحرانی اور رواں زندگی، یورپ کا صنعتی وسائنسی عروج، صحافت کی مشغولیت، ہر چیز اس نوجوان کو اس سمندر میں گم ہو جانے اور اپنے آپ کو زمانہ کے بہتے ہوئے دھارے کے حوالہ کر دینے کی دعوت دیتی تھی۔ اس کا موروثی منصب پیشوائی، اس کی غیر معمولی صلاحیتیں، اس کی صحافتی کامیابی، اس کا ادبی ذوق، ہر چیز اس کے کامیاب وشاندار مستقبل کی ضامن تھی اور تہذیب جدید کے اس ''شاہراہ عام'' سے اس کے ہٹنے اور اس نظام فکر وعمل سے اس کے باغی ہونے کے کوئی آثار نہ تھے۔

مگر اللہ تعالیٰ نے لیوپولڈویس کو ایک بڑی دولت سے نوازا تھا۔ وہ دولت جوان خوش نصیب افراد کو ملا کرتی ہے جو اپنے زمانہ کے ''ظلمات'' میں ''چشمہ حیواں'' دریافت کرتے ہیں اور رسم ورواج کے آذر کدہ میں ابراہیمی فطرت لے کر پیدا ہوا کرتے ہیں۔ یعنی بے چینی و بے اطمینانی، نئی چیز کی تلاش۔ انہوں نے اپنی نوعمری اور نوجوانی کے دور کے جو تاثرات قلمبند کیے ہیں ان سے ان کے عقلی بلوغ، سلامت فطرت، ذہانت اور اس مبارک بے چینی کا اظہار ہوتا ہے۔

> ''نوعمری کے باوجود یہ بات مجھ سے پوشیدہ نہ تھی کہ جنگ کے بعد انتشار اور بے چین یورپ کے حالات قابل اطمینان نہیں تھے۔ اس دنیا کا معبود جیسا کہ میں نے مشاہدہ کیا کوئی روحانی قسم کا معبود نہ تھا بلکہ راحت وآسائش ہی اس کا معبود بن گئی تھی۔
>
> اس میں شبہ نہیں کہ وہاں ایسے بھی لوگ تھے جو مذہبی حس اور مذہبی طرز فکر رکھتے تھے اور اپنے اخلاقی نظریات اور عصر جدید کی روح میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے بڑی حد تک مضطربانہ کوششوں میں مشغول تھے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک عام یورپین آدمی خواہ جمہوریت کا دعویدار ہو یا کمیونسٹ، مزدور ہو یا مفکر، صرف ایک مثبت و معین مذہب سے واقف ہے اور وہ ہے مادی ترقی کی پرستش۔''

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

> 'نوجوانی کا میرا یہ فطری رجحان کہ (صرف روٹی سے انسان زندہ نہیں رہ سکتا) اب ایک عقلی نظریہ بن چکا تھا کہ ترقی کی یہ کوشش قدیم ایمان کی جگہ پُر کرنے کے لئے تھی جو غیر مادی اقدار پر قائم تھا۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے ان لوگوں نے (جو اقدار مجردہ پر ایمان رکھنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے) ایک جھوٹا ایمان ایجاد کیا تھا اور اپنے کو اس دھوکہ میں رکھنا چاہتے تھے کہ انسان کسی نہ کسی طریقہ سے صرف ترقی کے جذبہ کو ساتھ لے کر موجودہ مصائب پر قابو پا سکتا ہے۔
>
> میں نہیں سمجھتا کہ ان جدید اقتصادی نظاموں میں سے کوئی بھی نظام جس کے پیچھے یہ

Marfat.com

گمراہ کن اور پُر فریب خیال کام کر رہا ہو' مغربی سوسائٹی کی مصیبتیں اور تکلیفیں دور کرنے کے لئے ایک عارضی اور مخدر دوا سے زیادہ کوئی چیز ثابت ہو سکتا ہے۔''

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

''جنگ اور پھر اس کے بعد بہت فنکارانہ طریقہ سے تراشے ہوئے نت نئے اصولوں کی مختلف اور متضاد آوازوں کی وجہ سے ضمیر و دماغ میں ایک زبردست کشمکش برپا ہے۔ ہماری مشینیں اور آلات اور آسمان سے سرگوشیاں کرنے والی عمارتیں، ہماری پاش پاش اور ریزہ ریزہ روح کو پھر سے جوڑنے میں بالکل ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ اس کے باوجود میں اپنے دل میں کہتا تھا کہ کیا یورپ کی روحانی عظمت کی حقیقت ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی ہے، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ غلطی کا پتہ لگا کر تھوڑی بہت کھوئی ہوئی عظمت اور قیمت کو واپس لایا جا سکے؟''

لیوپولڈ ویس اور ان جیسے خال خال سوچنے والے مغربی فضلاء کے لئے سب سے بڑی ذہنی آزمائش یہ تھی کہ وہ روح اور قلب کی گہرائیوں سے اٹھنے والے ان سوالات کا جواب یورپ کے تجربہ اور ذہانت سے مانگتے تھے۔ وہ اس مشکل لفظ ''یقین واطمینان'' کے معنی یورپ کے قاموس (Dictionary) میں تلاش کرتے تھے مگر وہ اس میں اسی طرح نہیں ملتا تھا جیسے ایک زبان کا لفظ دوسری زبان کے لغت میں نہیں ملتا۔ لیوپولڈ ویس صاف گوئی کے ساتھ اپنی اس طرز فکر اور ذہنی ساخت کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے معاصر طبقہ کی تھی:

''میں نے دیکھا کہ ہماری زندگی کتنی مضطرب، بے کیف اور ناخوشگوار ہو گئی ہے۔ انسانوں کے باہمی تعاون اور اتحاد کا کس قدر فقدان ہے۔ ہماری زیادہ تر دلچسپی اپنے فرقہ اور اپنی پارٹی سے رہ گئی ہے۔ فطری احساسات سے ہم کتنی دور جا پڑے ہیں۔''

''میں نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن یہ خیال میرے دل میں کبھی نہیں آیا اور شاید میری طرح کسی اور کے دل میں بھی نہیں آیا ہو گا کہ ان سوالات کا جواب بھی ممکن ہے یا کم از کم جزئیات میں (یورپ کے ثقافتی تجربات کا سہارا لئے بغیر) اس کے جوابات دیئے جا سکتے ہیں۔ یورپ ہی ہماری فکر کی ابتدا تھا اور وہی انتہا۔''

شاید وہ یورپ کے اسی عقلی اور اجتماعی دائرہ میں (جو وسیع ہونے کے باوجود بہت مختصر و محدود تھا) گھومتے رہتے اور ان سوالات ہی سے دست بردار ہو جاتے جو ان کی فطرت سلیم نے ان کے سامنے ایک نہ مٹنے والی علامت استفہام کی طرح کھڑے کر دیئے تھے کہ اچانک ہادیٔ مطلق نے ان کی دست گیری کی اور ان کو اس سرزمین میں پہنچا دیا جہاں دنیا کو آخری طور پر ان سوالات کا متعین و متیقن جواب ملا تھا اور جہاں اس ''ایمان و یقین'' نے اپنی بہت کچھ تازگی کھو دینے کے باوجود زندگی کی بہت سی نعمتیں اور لذتیں بخش رکھی تھیں اور وہاں وہ انسان۔ زندگی کی حرارت اور لطافت کے

Marfat.com

ساتھ-نظر آتا تھا جس کو لیوپولڈ ویس اور بیسویں صدی کے بہت سے دوسرے مفکرین یورپ کی شب ظلمت میں دیوجانس کلبی کی مشعل یا شیخ رومی کا چراغ لے کر ڈھونڈ چکے تھے۔انہوں نے ۱۹۲۲ء میں بیت المقدس کا سفر کیا اور پہلی مرتبہ صحرائے سینا میں ٹرین میں سفر کرتے ہوئے اس عرب قوم اور عربی تہذیب کی جھلک دیکھی جس کو اسلام نے تہذیب واخلاق کے ایک نئے سانچے میں ڈھالا تھا اور جو اس کے عقیدہ کی بدولت اب بھی اعلیٰ اخلاق اور زندگی کی حرارت ولطافت کی مالک تھی۔انہوں نے اس ذہین وحساس نوجوان کی حیثیت سے جس کو قدرت نے اعلیٰ درجہ کی قوت مشاہدہ عطا کی ہو،اور وہ ایک نئی سرزمین اور ایک نئی دنیا میں قدم رکھ رہا ہو، ہر چیز کو غور سے دیکھا اور اپنی قدیم مغربی دنیا سے اس کا مقابلہ کیا۔ان کو ایک بدوی کا اپنی روٹی کے دوٹکڑے کر کے یہ کہتے ہوئے ان کی طرف پیش کرنا بھی ایک انوکھا واقعہ معلوم ہوا کہ ''آپ بھی مسافر ہیں اور میں بھی مسافر ہوں اور ہم دونوں کا راستہ ایک ہے۔''

وہ بے اختیار لکھنے پر مجبور ہوئے:

''اس بدوی کے رویہ میں جس نے اجنبیت کی تمام دیواروں کے باوجود اپنے رفیق سفر کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی آدھی روٹی اس کو دے دی' انسانیت کی ایک ایسی تصویر اور جھلک تھی جو ہر تصنع اور تکلف سے پاک تھی۔''

انہوں نے بیت المقدس میں کئی مہینے گزارے اور عرب مسلمانوں کو ان کی زندگی کے مختلف و بے تکلف مظاہرے کے ساتھ دیکھا۔ان کی عبادت، معاشرت ہر چیز کا قریب سے مطالعہ کیا۔پھر قاہرہ اور دمشق میں خالص عربی اسلامی ماحول میں وقت گزارا۔اس سب کے بعد ان کو محسوس ہوا کہ انہوں نے اپنی اور یورپ کی کھوئی ہوئی چیز پالی یعنی خودفطری زندگی اور ''معصوم انسانیت''۔

خود ان کی زبان سے سنئے:

''میں نے اپنے روبروزندگی کا ایک ایسا مفہوم پایا جو میرے لئے یکسر نیا تھا۔مجھے ایسا لگا جیسے کوئی گرم حرارت انگیز روح ہے جو ان عربوں کے خون کے ساتھ ان کے افکار اور حرکات وسکنات تک میں سرایت کر گئی ہے۔روحانی خراشوں اور اذیتوں سے نا آشنا، وہ اذیتیں جنہوں نے خوف، حرص اور گھٹن کا بھوت بن کر مغربی زندگی کو بے حد بھدا، بے ہنگم اور کریہہ المنظر بنادیا تھا جس سے اب کوئی خاص امید باقی نہیں رہ گئی تھی......

''ابتدا میں تو یہ بات عربوں کے قومی وسیاسی مقاصد سے ہمدردی تک اور عربی معاشرہ کی ظاہری صورت اور قلبی طمانیت (Emotional Security) تک جس کو میں نے خاص طور پر محسوس کیا تھا، محدود رہی۔لیکن اب مجھ میں اس باطنی اطمینان یا ''طمانیت قلبی'' کا سبب اور سرچشمہ معلوم کرنے کی شدید خواہش پیدا ہو چلی تھی جس

Marfat.com

نے عربی تہذیب کو مغربی تہذیب سے اس قدر مختلف کر دیا ہے۔ یہ خواہش میرے نفسیاتی اور ذاتی و شخصی مسائل کے ساتھ بالکل گھل مل گئی تھی۔ مجھے ایسے مواقع اور ایسے میدانوں کی تلاش رہنے لگی تھی جہاں میں عربوں کے اخلاق اور کیرکٹر کا زیادہ بہتر طریقہ سے مشاہدہ اور مطالعہ کر سکوں اور ان افکار و خیالات تک میری رسائی ہو سکے جنہوں نے ان کی زندگی کو ایک خاص سانچہ میں ڈھال دیا ہے اور اس کو معنوی حیثیت سے مغربی تہذیب سے بالکل جدا کر دیا ہے۔ میں نے ان کی تاریخ، کلچر، مذہب، سب کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور اس شے کی دریافت وطلب کے جذبہ کے ساتھ جوان کے جذبات واحساسات اور عقلیت کے پیچھے کارفرما تھا، ایک اور جذبہ میرے اندر ابھرنے لگا، وہ جذبہ تھا ان اسباب ومحرکات کی دریافت کا جو میرے دل و دماغ کو ہلا رہے تھے اور میرے اوپر چھائے چلے جا رہے تھے اور میری رہنمائی کے لئے آمادہ تھے۔''

انہوں نے اس ''باطنی اطمینان'' ویقین کا حقیقی سبب اور اس بلند ولطیف تر انسانیت کا سرچشمہ معلوم کرنے کے لئے اس قوم کے دین وعقیدہ اور اس کی تہذیب کی ذہنی و روحانی بنیادوں کا مطالعہ کرنا ضروری سمجھا جو اس باطنی اضطراب اور ذہنی لطافت اور بلند تر حسی شعور سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

قاہرہ میں موذن کی اذان اور جماعت کی نماز کے منظر نے ان کے دل و دماغ پر جو اثر ڈالا اس کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے اندازہ ہوا کہ مسلمانوں کا اندرونی اتحاد، یکسانی اور ہم آہنگی کتنی گہری ہے اور ان کو تقسیم اور متفرق کرنے والی چیزیں کتنی مصنوعی، سطحی اور بے اثر ہیں۔ اپنے عقیدہ، طرز فکر، حق و باطل کی تمیز، بہتر اور صحیح زندگی کے مزاج اور بناوٹ کو سمجھنے میں وہ ''ایک انسان'' کی مانند تھے۔

مجھے ایسا لگا کہ میں نے پہلی بار ایک ایسی سوسائٹی میں قدم رکھا ہے جس میں انسانوں کے درمیان رشتہ اور تعلق کی بنیاد اقتصادی مصالح یا رنگ ونسل پر نہ تھی بلکہ اس سے زیادہ گہری مضبوط اور پائیدار چیز پر تھی، وہ زندگی کے متعلق اس مشترک نقطہ نظر کا رشتہ تھا جس نے انسانوں کے درمیان سے علیحدگی اور بے تعلقی کی تمام دیواروں کو گرا دیا تھا۔''

ممکن تھا کہ وہ بعض دوسرے ''عرب دوست'' مغربی سیاحوں اور سیاسیوں کی طرح اس عقیدہ اور نتیجہ پر قانع ہو جاتے کہ یہ عربی تہذیب کی فطری صلاحیت اور اس کا پیدائشی جوہر ہے یا اس کا سبب مغربی تمدن اور صنعتی ترقی سے دوری اور بے تعلقی ہے اور وہ عربی تہذیب اور قوم کو خراج تحسین ادا کرنے پر بس کرتے، جیسا کہ بعض معاصر مؤرخوں اور مفکروں نے کیا ہے لیکن ان کی متجسس فطرت اور بے چین طبیعت نے اس سے انکار کیا اور رفتہ رفتہ ان کے اندر اس کا

Marfat.com

حقیقی سبب اور اندرونی سرچشمہ دریافت کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی......''

قرآن مجید اور دینیات کی کتابوں کے مطالعہ سے بالآخر وہ اس سرچشمہ کے دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ اپنے اس اکتشاف اور ''یافت'' کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ان مطالعوں یا گفتگوؤں کی جو بھی نوعیت رہی ہو' بہر حال ان کی وجہ سے میری نگاہوں سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ میں افکار کی ایک ایسی دنیا کا مشاہدہ کر رہا تھا جس سے میں اس وقت تک مطلق ناواقف تھا۔ اسلام دین کے رواجی یا اصطلاحی مفہوم سے زیادہ زندگی کا نظام بن کر میرے سامنے آیا۔ وہ مجھے لاہوتی نظام سے زیادہ شخصی اور اجتماعی سلوک کا ایک پروگرام اور لائحہ عمل معلوم ہوا جس کی بنیاد خدا کی یاد پر تھی۔ میں نے قرآن میں کسی جگہ ''مکتی'' (Salvation) کا تصور نہیں دیکھا۔ وہاں کوئی پہلا موروثی گناہ نہیں تھا جو انسان اور اس کی قسمت یا تقدیر کے درمیان حائل ہو گیا ہو۔ وہاں تو یہ تھا:

لیس للانسان الا ما سعیٰ (انسان جیسی کوشش کرے گا ویسا پائے گا)

وہ کسی قسم کی رہبانیت یا فطرت کشی کا بھی طالب نہیں تھا جس کے ذریعے طہارت کا کوئی خفیہ دروازہ کھل جاتا ہو۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک طہارت اور پاکیزگی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے اور گناہ صرف انسان کی ایجابی فطرت کی صفات کی ایک لغزش ہے جو خدا نے اس میں ودیعت کی ہو۔ وہاں فطرت کی کوئی تقسیم بھی نہیں ملتی اس لئے کہ اس کے نزدیک روح اور جسم مل کر ایک صحیح اور مکمل یونٹ تیار ہوتا ہے۔ ابتدا میں یہ دیکھ کر بہت گھبرایا کہ قرآن کو صرف روحانی معاملات ہی سے دلچسپی نہیں معلوم ہوتی بلکہ وہ زندگی کے بعض ان شعبوں کا بھی بہت اہتمام کے ساتھ ذکر کرتا ہے جو مجھے بہت دنیاوی قسم کے اور حقیر معلوم ہوتے تھے لیکن کچھ زمانہ گزر جانے پر یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ اگر انسان روح اور جسم کا مجموعہ ہے تو پھر اس کی زندگی کے کسی شعبہ اور کسی پہلو سے پہلو تہی نہیں برتی جا سکتی اور نہ اس کو دین کے دائرہ عمل یا دائرہ اختصاص سے باہر تصور کر کے حقیر سمجھا جا سکتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں نے دیکھا کہ قرآن ایک لمحہ کے لئے بھی یہ فراموش کرنے کے لئے تیار نہیں کہ یہ دنیا بہر حال انسان کی ترقی کے راستہ کا ایک مرحلہ ہے۔ اس کا اصل مقصد روحانی مزاج ہی رکھتا ہے۔ مادی خوشحالی قرآن کے نزدیک مستحسن اور مستحب ہے لیکن وہ بذات خود مقصد نہیں۔ اسی لئے انسان کی نفسانی خواہشات کو باوجود

Marfat.com

ان کی اہمیت اور ضرورت کے اخلاقی حس کے مقابلہ میں دبا دیا جائے گا۔ یہ اخلاقی حس صرف خدا اور بندہ کے مابین محدود نہ رہنا چاہیے بلکہ انسانوں کے آپس کے تعلقات تک توسیع ہونا چاہیے۔ اس کا مقصد صرف فرد کی زندگی کی روحانی تکمیل نہ ہو بلکہ سوسائٹی میں ایسے حالات بھی پیدا کرنا اس کا مقصد ہو جو دوسرے انسانوں کی ترقی اور نشو ونما کے لئے سازگار ماحول اور فضا پیدا کر سکے اور جس کے سایہ میں وہ مکمل زندگی گزار سکیں۔

یہ تمام چیزیں عقلی اور اخلاقی طور پر مجھے اسلام پر ابھار رہی تھیں، وہ اسلام جس کے متعلق میں نے اس سے پہلے جو کچھ پڑھا یا سنا تھا' وہ ان چیزوں کے مقابلہ میں گویا بمنزلہ صفر کے تھا۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ روحانی تسکین کے سلسلہ میں قرآن کا طریقہ ''عہد قدیم'' کے طریقہ سے زیادہ گہرا ہے۔ وہ آخرالذکر کی طرح کسی خاص قوم کی پاسداری بھی نہیں ہے۔ مادی مسائل میں اس کا طریقہ باختلاف عہد، عہد جدید سے بہت زیادہ ایجابی ہے۔ روح اور جسم اس کی نظر میں انسانی زندگی کے دو رخ ہیں جس کو خدا نے پیدا کیا ہے۔

میں نے اپنے دل سے سوال کیا کہ کیا یہی تعلیمات اس قلبی طمانیت کا باعث تو نہیں ہیں جس کا میں نے عربوں میں رہ کر اس پوری مدت میں مشاہدہ کیا ہے؟''

اس دریافت اور یافت کے بعد جب لیو پولڈ ویس دوبارہ یورپ گئے تو ان کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک فطری دنیا سے ایک مصنوعی دنیا میں آ گئے ہیں جہاں ہر چیز ان کو زندگی کی حرارت اور لطافت سے محروم نظر آتی تھی اور اس حسن و جمال اور بے ساختگی سے عاری تھی جو ان کو اسلامی زندگی میں نظر آئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''اب میں پھر یورپ میں تھا، مجھے اس بات سے قدرے اذیت ہوئی کہ میں یورپ کے مناظر کو اس طرح دیکھ رہا تھا جس طرح کوئی اجنبی سیاح یا مسافر دیکھتا ہے۔ لوگ مجھے بہت مکروہ اور حقیر دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی حرکات و سکنات بڑی بھدی اور پھوہڑ معلوم ہوتی تھیں جن کو ان کے ارادہ و شعور سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ وہ اس بات کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ وہ ہر کام سمجھ بوجھ کر کر رہے ہیں اور اپنے مقصد سے واقف ہیں لیکن درحقیقت وہ اپنے مقصد کو سمجھے بغیر زعم و خودنمائی کی دنیا میں گم ہیں۔ اب یہ بات واضح تھی کہ عربوں سے میرے تعلقات نے اسی سلسلہ میں میرے نظریہ کو یکسر تبدیل کر دیا ہے، جس کو میں زندگی کا جوہری جز سمجھتا ہوں۔''

کچھ مزید و طویل قیام اور مغربی زندگی کی گہرائیوں اور اس کے بھنور میں پڑنے کے بعد ان پر مغربی زندگی کے

Marfat.com

اصل خلا اور مغربی تہذیب کے افلاس (دیوالیہ پن) کا راز زیادہ وضاحت کے ساتھ منکشف ہوا۔وہ لکھتے ہیں:

''یہ بات مجھ پر واضح ہونے لگی کہ ہوسکتا ہے کہ یورپ کی داخلی ہم آہنگی کی احتیاج اور اس کی مضطرب ادبی واخلاقی حالت اس قسم کے رشتہ کے فقدان سے پیدا ہوئی ہو جس قسم کا رشتہ میں نے عربوں کے اندرونی سکون واطمینان اوران کے عقیدہ وایمان کے درمیان دریافت کیا تھا۔''

اس کے بعد سے جب تک وہ یورپ میں رہے اور جب انہوں نے مشرق میں عرب ممالک اور ایران و افغانستان کا سفر کیا' وہ غیر شعوری طور پر ایک مسلمان کے نہ صرف دماغ سے بلکہ اس کے جذبات کے ساتھ سوچتے رہے۔انہوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا مگر اس کی توانائی وقوت حیات اور اس کے دوبارہ عروج وارتقا کی صلاحیتوں پر ان کو بہت سے نسلی مسلمانوں سے زیادہ یقین تھا۔سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہ یورپ کے عام مفکرین و فضلاء کے (جو مسلمانوں کے زوال کو اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے کا نتیجہ قرار دیتے ہیں) برخلاف مسلمانوں کے تنزل اور پستی کو اسلامی تعلیمات وشریعت سے انحراف وغفلت کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے جس پر اب میں پورے طور پر مطمئن ہو چکا تھا' وہ یہ تھی کہ ایک یورپین کے دماغ میں اسلام کی جو تصویر ہے' وہ بالکل مسخ شدہ اور بگڑی ہوئی ہے۔قرآن کے صفحات میں میں نے جو دیکھا تھا' اس کو کوئی عامی مادی غیر پختہ نظریہ نہیں کہا جاسکتا ہے۔یہاں معبود کا ایک ٹھوس تصور تھا جو مظاہر فطرت کو عاقلانہ طور پر قبول کرنے کے حق میں ہے۔یہاں حسی محرکات اور عقل، روحانی تقاضوں اور اجتماعی تقاضوں کے درمیان ایک ایک خوشگوار امتزاج اور ہم آہنگی ملتی ہے۔یہ بات میرے سامنے کھل کر آ گئی تھی کہ مسلمانوں کا زوال اسلام میں کسی نقص کی وجہ سے نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات پر ان کے عمل پیرا نہ ہونے کی وجہ سے ہوا۔''

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کی وجہ سے اسلام ایک عظیم طاقت نہیں بنا بلکہ اس نے خود مسلمانوں کو عزت وسرفرازی عطا کی مگر جب مسلمانوں کا ایمان عادت بن گیا اور ایک نظام وطریقہ زندگی کی حیثیت سے باقی نہیں رہا جس کی پیروی احساس وشعور کے ساتھ کی جاتی ہو' تو ان کی یہ ابھارنے والی خلاق طاقت کی شمع جو ان کی تہذیب وتمدن کو فروزاں کیے ہوئے تھی' بجھ گئی اور سستی، مایوسی، جمود اور ثقافتی انحطاط کے لئے راستہ کھل گیا۔''

بالآخر وہ وقت آ گیا کہ ان کو اس تضاد کا احساس ہوا جو ان کی ذہنی کیفیت اوران کی زندگی کے رویہ میں تھا اور ان کو یہ انکشاف ہوا کہ اسلام ان کے دل ودماغ میں گھر کر چکا ہے۔اس کا احساس ان کو اس وقت ہوا جب ۱۹۲۵ء کے

Marfat.com

اواخر میں ہرات سے کابل جاتے ہوئے کچھ دیر کے لئے ''دہ زنگی' میں ٹھہرے اور ان کے ایک سوال پر جو مسلمانوں کی موجودہ پستی کے متعلق انہوں نے وہاں کے حاکم سے بڑے جوش وخروش کے ساتھ کیا تھا' نوجوان افغان حاکم نے (جو شاہ امان اللہ خاں کے قریبی عزیزوں میں تھا) بڑے اعتماد اور قوت کے ساتھ کہا:

''آپ مسلمان ہیں لیکن خود آپ کو اس کی خبر نہیں۔ آپ اسی وقت **لا اله الا الله محمد رسول الله** کہہ کر باقاعدہ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے جب کہ اپنے دل کی گہرائیوں سے آپ مسلمان ہو چکے ہیں۔''

لیوپولڈ کے کانوں میں اس افغان حاکم کے الفاظ برابر جاری رہے۔ ان کا اسلام کا مطالعہ جاری رہا اور ان کا قلبی لگاؤ اور دماغی اطمینان بڑھتا رہا اور اسلام کے ساتھ ان کی گرویدگی میں اضافہ واستحکام ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ان کو اسلام ایک ایسی صحیح التناسب عمارت کی طرح نظر آنے لگا جس کو کسی کامل الفن معمار اور مہندس نے تعمیر کیا تھا اور جس کی ہر اینٹ اور ہر پتھر اپنی صحیح جگہ پر تھا اور جس میں نہ کوئی چیز کم تھی نہ زائد نہ بے محل:

''اسلام کی ایک مکمل تصویر رفتہ رفتہ آخری طور پر میرے سامنے آ رہی تھی۔ ایسی تصویر جو کبھی کبھی مجھے حیرت زدہ اور مدہوش سا کر دیتی تھی۔ وہ اس طریقہ پر مرتب اور مکمل ہو رہی تھی جس کو عقلی اور ذہنی نفوذ (Mental Osmosis) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی میری طرف سے کسی شعوری کوشش کے بغیر میں نے وہ تمام جھلکیاں اور متفرق واقعات جو گذشتہ چار سال کے اندر میرے ساتھ پیش آئے' ایک جگہ مرتب کر لئے' میں نے اپنے سامنے ایک ایسی مکمل عمارت دیکھی جس کو بہت وقت نظر اور مہارت فن سے بنایا گیا ہو' جس کے سارے اجزا ہم آہنگ اور باہم پیوست ہوں' نہ اس میں کوئی چیز زائد ہو نہ کم۔ ایک توازن وتناسب جس کو دیکھ کر آدمی میں یہ شعور پیدا ہو کہ اسلام کی تعلیمات میں جو کچھ بھی ہے' وہ برمحل ہے۔''

لیکن کسی نئے دین کے قبول کرنے کے لئے محض دماغی اطمینان اور استدلال کافی نہیں ہوا کرتا۔ اس کے لئے قلبی اطمینان اور جان پر کھیل جانے اور جست لگانے کی ضرورت ہے۔ یہ زندگی کا سب سے بڑا اقدام ہے اور سب سے وسیع انقلاب ہے۔ آدمی اپنی پرانی دنیا سے ناطہ توڑ کر ایک نئی دنیا میں قدم رکھتا ہے' پھر اسلام جیسے آسمانی مذہب کے قبول کرنے کے لئے اتنا مان لینا کافی نہیں ہے کہ وہ عقل وحکمت پر مبنی اور ایک حکیمانہ نظام حیات ہے بلکہ اس بات کے بھی دل میں اتر جانے کی ضرورت ہے کہ وہ نہ صرف منزل من اللہ ہے بلکہ وہ خدا کا آخری پیغام بھی ہے۔ اپنے اس ذہنی تردد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جہاں تک میرا تعلق ہے' مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ میں اسلام کی طرف کھنچ رہا ہوں لیکن ایک آخری تردد مجھے قطعی فیصلہ سے باز رکھتا تھا۔ اسلام قبول کرنا درحقیقت ایک ایسے

Marfat.com

پل پر سے گزرنا تھا جو ایک ایسے گڑھے پر قائم ہے جس کا ایک سرا دنیا میں ہے، دوسرا دوسری دنیا میں۔ یہ ایک اتنا طویل پل تھا جس کا دوسرا سرا اس وقت تک نظر آنا مشکل تھا جب تک کہ آدمی اتنی دور نہ پہنچ جائے جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر میں مسلمان ہو گیا تو مجھے اس دنیا سے جس میں میں نے پرورش پائی تھی، ہر تعلق منقطع کر لینا ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا نتیجہ نہیں تھا' اس لئے کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک انسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر لبیک بھی کہے اور اپنے داخلی روابط و تعلقات کو بھی برقرار رکھے جو اس کو ایسے معاشرہ سے وابستہ رکھتے ہیں جس کے اصول و مبادی اسلام سے متصادم ہیں۔''

''لیکن کیا اسلام واقعی خدا کا پیغام ہے' یا وہ محض ایک بڑے آدمی کی دانائی اور نتیجہ فکر ہے جو غلطی سے پاک نہیں؟''

دماغ کی اس گرہ کو جو فلسفیانہ و کلامی طریقہ پر سلجھانے کی کوششوں سے شاید اور الجھ جاتی' ایک تجربہ اور واقعہ نے جو محض ہدایت الٰہی اور تربیت ربانی کی کرشمہ سازی تھی' کھول دیا اور قرآن مجید کا کلام الٰہی اور معجزۂ آسمانی ہونا لیوپولڈ ویس کے لئے ایک بدیہی حقیقت بن گیا جس کے لئے مزید دلیل اور بحث کی ضرورت نہ تھی۔ یہ ایک نفسیاتی انقلاب تھا جو اچانک پیش آیا۔

لیوپولڈ ویس نے ٹرین کے ایک سفر میں جرمنی کے مرفہ الحال طبقہ اور کامیاب تاجروں اور خوش باش اور تندرست آدمیوں کی ایک جماعت دیکھی جن کا لباس اور سامان ان کی خوشحالی، معاشی بلندی اور خوش قسمتی کی شہادت دیتا تھا لیکن ان کے اترے ہوئے مغموم چہرے، ان کی اداس صورتیں، ان کی پھیکی اور بناوٹی مسکراہٹ اس کا پتہ دیتی تھی کہ ان کو اندر سے کوئی غم کھائے جا رہا ہے اور وہ کسی ایسے روحانی کرب میں مبتلا ہیں جس کا ان کی مرفہ الحالی، تجارت کی ترقی اور سامان عشرت کی فراوانی کے پاس بھی کوئی علاج نہیں۔ آخر ان کے پاس کس بات کی کمی ہے؟ اس روحانی کرب اور دل کے ناسور کا سرچشمہ کیا ہے؟ ان کی زندگی میں یہ تضاد کیوں ہے؟ وہ جنت ارضی میں رہنے کے باوجود جہنم کی اذیتوں سے کیوں دوچار ہیں؟ ان کا اصل مرض کیا ہے جو گھن کی طرح ان کو کھا رہا ہے؟ لیوپولڈ ویس کے دل میں اس معمے کو حل کرنے اور ''پہیلی بوجھنے'' کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔

گھر واپس آ کر ان کی نظر قرآن مجید پر پڑتی ہے۔ وہ اس کو بلا ارادہ کہیں سے کھول کر پڑھنے لگتے ہیں۔ قرآن تشخیص کرتا ہے کہ اس ''خوشحال بے چینی'' کا سبب اس طبقہ اور اس دور کا مرض ''تکاثر'' زیادہ دولتمند اور کامیاب بننے کی ہوس اور ''ھل من مزید'' کی ذہنیت اور نعرہ ہے۔ اس انقلاب انگیز انکشاف پر انہوں نے جو حیرت و مسرت محسوس کی اس کو خود ان کی زبان سے سنیے:

''میں ایک لمحہ کے لئے گم سم سا ہو گیا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ یہ کتاب میرے ہاتھ میں جنبش

Marfat.com

میں تھی' پھر میں نے اپنی بیوی سے کہا دیکھو، سنو! کیا یہ اس کا جواب نہیں ہے جو رات کو ہم نے ریل پر دیکھا تھا۔

ہاں وہ ایسا قطعی جواب تھا کہ سارے شکوک وشبہات ایک دم سے ختم ہو گئے۔

اب میں نے یقینی طور پر سمجھ لیا کہ یہ کتاب جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے' خدا ہی کی نازل کی ہوئی ہے۔ وہ اگر چہ آج سے تیرہ سو برس پہلے ایک انسان کو عطا کی گئی تھی لیکن اس میں بہت وضاحت کے ساتھ ایک ایسی چیز کی پیشگوئی تھی جو ہمارے اس پیچیدہ اور مشینی دور سے زیادہ واضح طور پر کسی اور دور میں سامنے نہ آئی تھی۔ ''تکاثر'' یعنی مال و دولت کی حرص و ہوس اور مسابقت، تاریخ کے ہر دور میں پائی جاتی رہی ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ محض اشیاء کو جمع کرنے کا شوق بن جائے یا ایک ایسا کھلونا اور بہلاوا بن جائے جو کسی اور حقیقت کی طرف دیکھنے ہی نہ دیتا ہو۔ دولت اور اقتدار کا حصول، ایجادات کا ایسا روز افزوں عشق جس کا کوئی علاج نہیں۔ کل سے زیادہ آج اور آج سے زیادہ کل، ایک بھوت ہے جو لوگوں کے سروں پر سوار ان کو ایسے چمکیلے مقاصد کی طرف کوڑے مار مار کر بھگا رہا ہے جو دور سے بہت شاندار معلوم ہوتے ہیں لیکن ہاتھ میں آنے کے بعد حباب کی مانند غائب ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت آ جاتا ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے

کلا لو تعلمون علم الیقینo لترون الجحیمo (۱۰۲:۵)

اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ قرآن کسی انسان کی حکمت و دانائی کا نتیجہ نہیں ہے جو ایک دور دراز جزیرۃ العرب میں تاریخ کے کسی دور میں تھا۔ اس لئے کہ یہ انسان لاکھ سمجھدار حکیم اور دانا سہی مگر پھر بھی وہ اس عذاب کی پیش گوئی نہیں کر سکتا تھا جو بیسویں صدی کی خصوصیت ہے۔ مجھے قرآن کے اندر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے زیادہ اونچی اور گہری آواز سنائی دے رہی تھی۔''

گرہ کھل گئی تھی...... اور اب کسی اور چیز کا انتظار باقی نہ تھا۔ لیوپولڈ ویس نے برلین میں اپنے ایک ہندوستانی مسلمان دوست کے پاس جا کر کلمہ شہادت پڑھا اور اب وہ ''محمد اسد'' کے نام سے اس امت اور اس عالم کا ایک جزء بن گئے جس کی اس معجز نظام کلام اور محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری نبوت اور تعلیم نے بنیاد ڈالی تھی اور جو ان کو پہلے سے عزیز اور مانوس تھا۔

محمد اسد نے اپنے وجود اور دلچسپیوں کو اس امت کے وجود اور دلچسپیوں اور اس عالم کے مسائل وافکار میں اسی طرح ضم کر دیا جیسے ایک خاندان کا فرد اپنے وجود اور شخصیت اور صلاحیتوں کو اس خاندان کے وجود، دلچسپیوں اور مسائل

Marfat.com

میں ضم کر دیتا ہے۔ انہوں نے ذوق وشوق کے ساتھ حج وزیارت کا سفر کر کے اس دین کے ساتھ اپنا روحانی ارتباط اور وابستگی مستحکم کی، جزیرۃ العرب میں ایک مسلمان کی حیثیت سے قیام کر کے عربی زبان اور دینیات اور اسلامی معاشرہ سے اپنی واقفیت اور تعلق کو بڑھایا اور اس کو معاشرہ اور اس کے ذمہ دار افراد سے اتنا گہرا تعلق اور ان کا ایسا اعتماد حاصل کیا کہ سلطان ابن مسعود کے معتمد اور امام سنوسی کے قاصد کی حیثیت سے نازک مہمیں انجام دیں، ہندوستان کے قیام میں انہوں نے Islam at the Crossroads کے نام سے ایک ایسی معرز اور فاضلانہ کتاب لکھی جس سے ہندوستان اور عالم اسلامی کے علمی و دینی حلقوں میں ایک ذہنی جنبش پیدا ہوگئی۔ انہوں نے پہلی مرتبہ معذرت آمیز اور نیاز مندانہ طرز تحریر چھوڑ کر مغربی تہذیب پر پُر اعتماد طریقہ پر بھرپور تنقید کی اور ثابت کیا کہ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کی بنیادوں اور نقطۂ آغاز میں اختلاف ہے اور ان دونوں کا اتحاد ممکن نہیں۔ اسی کے ساتھ انہوں نے ''سنت و حدیث'' کی طرف سے طاقتور وکالت کی اور اسلامی نظام زندگی میں ان کی اہمیت اور ضرورت ثابت کی، پھر جیسا کہ انہوں نے پیش نظر کتاب کے مقدمہ میں اظہار کیا ہے، علامہ اقبال کی رفاقت ورہنمائی میں فکر اسلامی کی تعمیر نو کا کام بھی کیا۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ''عرفات'' (Arafat) کے نام سے ایک انگریزی رسالہ اور ''صحیح بخاری'' کے انگریزی ترجمہ کا عظیم الشان کام بھی شروع کیا جو بدقسمتی سے ناتمام رہ گیا۔

راقم سطور کی ملاقات ان سے پہلی مرتبہ مکہ معظمہ اور دوسری بار دمشق اور لبنان میں ہوئی جہاں وہ اپنی شہرہ آفاق کتاب The Road to Mecca کا عربی ترجمہ اپنی نگرانی میں کرا رہے تھے۔ جب یہ ترجمہ شائع ہوا تو انہوں نے از راہ کرم اس کا ایک نسخہ مجھے بھی بھیجا۔ میں اس کتاب کو پڑھ کر بہت متاثر ہوا۔ انہوں نے اپنے ذہنی سفر، ہجرت کی داستان اور قبول اسلام کی کہانی بڑے نفسیاتی اور ادبی انداز سے سنائی تھی۔ انہوں نے اس موضوع کو توڑ کر اس کے اجزا کو صحرائے عرب کے پُرخطر سفروں، عرب کی اجتماعی ومعاشرتی زندگی کے تجربات، عرب قبائل اور ان کے سرداروں اور سلطان ابن سعود اور ان کے خاندان کے امراء کے دلچسپ حالات میں اس طرح تقسیم اور پیوست کر دیا تھا کہ ایک مغربی ان کو اسی شوق و دلچسپی اور لذت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے جس شوق و دلچسپی اور لذت کے ساتھ وہ سندباد جہازی کے سفرنامے یا مشرق کے کسی دلچسپ اور پُراز معلومات روداد سفر کو پڑھتا ہے۔ گویا انہوں نے ایک خشک اور شاید تلخ موضوع کو شکر کے غلافوں میں لپیٹ کر پیش کیا ہے۔ جہاں یہ چیز ایک امریکن یا یورپین ناظر کے لئے کشش اور دلچسپی کا باعث ہے، وہاں مشرقی مذاق رکھنے والوں کے لئے ایک رکاوٹ اور اغماض کا سبب بن سکتی ہے، چنانچہ ہندوستان کے ایک بڑے صاحب نظر ناقد وتبصرہ نگار نے اس کتاب کے متعلق اپنی اس رائے کا اظہار کیا کہ وہ ''مغربی ذوق رکھنے والوں کے لئے لکھی گئی ہے اور ہم مشرقیوں اور مسلمانوں کے زیادہ کام کی نہیں۔'' اسی بنا پر عرصہ تک میرے اندر اس کتاب کے مطالعہ کا تقاضا اور شوق پیدا نہیں ہوا۔

لیکن جب مجھے ایک سفر کی فرصت میں کتاب کے عربی ترجمہ ''الطریق الی مکۃ''[3] کو بالاستیعاب پڑھنے کا موقع ملا تو میں مصنف کی نفسیات شناسی، بالغ نظری اور حکمت ودعوت کا قائل ہوگیا کہ انہوں نے اسلام کی دعوت ایسے حکیمانہ

Marfat.com

انداز میں دی ہے کہ یہ کتاب مغرب کے باشندوں اور ہندوستان کے غیر مسلموں کے لئے اسلام اور اسلامی تہذیب کے سمجھنے کے لئے ایک اچھی تقریب اور تمہید بن گئی ہے۔اس میں ناول کا لطف اور کہانی کی دل آویزی بھی ہے اور علم و فلسفہ کی سنجیدگی اور معلومات کا ذخیرہ بھی، سادگی بھی ہے پُرکاری بھی، تفریح کا سامان بھی ہے اور زندگی کی رہبری اور انقلاب انگیزی کی صلاحیت بھی۔اسی بنا پر اس نے امریکہ اور یورپ میں بڑی مقبولیت حاصل کی اور انگریزی کے علاوہ (جس میں اصل کتاب ہے) یورپ کی چار زبانوں جرمن، سویدی (Swedish)، ولندیزی (Dutch) اور فرنچ میں کتاب کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

مجھے اس سفر میں خیال آیا کہ اگر اس کتاب میں سے مصنف کے حالات و مشاہدات و تاثرات اور واقعات زندگی (جو کتاب میں نہایت غیر مرتب اور منتشر طریقہ پر بیان کیے گئے ہیں) انتخاب کر کے ان کو ترتیب کے ساتھ پیش کیا جائے تو وہ محمد اسد صاحب کی مرتب سوانح اور سفر نامہ اور ان کے قبول اسلام کی ایک مکمل تاریخ بن جائے گی اور افادیت کے اضافہ کے ساتھ اس کی دل آویزی و دلچسپی بھی قائم رہے گی۔میں نے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی جانب سے اس کے ترجمہ اور انتخاب کی اجازت مانگی جو انہوں نے ازراہ کرم خود بھی منظور فرمائی اور ناشر کی طرف سے بھی اجازت بھیج دی اور اس کے اردو ترجمہ و طباعت کے حقوق مجلس کو عطا کیے۔

مجلس نے ترجمہ کا کام برادر زادہ عزیز مولوی محمد الحسنی (مدیر البعث الاسلامی) کے سپرد کیا جنہوں نے بڑی محنت اور سلیقہ کے ساتھ یہ فرض انجام دیا۔ترجمہ میں انہوں نے عربی اور انگریزی کتابوں کو سامنے رکھا۔کتاب میں جا بجا فلسفہ اور نفسیات کی دقیق اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں جن کا اردو ترجمہ بڑی ذمہ داری کا کام تھا۔اس مشکل میں انہوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ کے مشورہ سے فلسفہ کے مشہور فاضل و مصنف جناب ظفر حسین خاں صاحب مصنف ''مال و معیشت'' و سابق پرنسپل شیعہ کالج لکھنؤ سے رجوع کیا اور موصوف نے بڑی فراخدلی کے ساتھ اس میں رہبری و معاونت فرمائی۔کتاب کے فاضلانہ مقدمہ کے لئے جو اپنی خاص ادبی حیثیت رکھتا ہے' میں نے اپنے فاضل دوست جناب عبیدالرحمٰن صاحب ایم، ایل اے سے جو انگریزی کے ممتاز ادیب و انشاپرداز ہیں' ترجمہ کی درخواست کی جو انہوں نے ازراہ کرم منظور فرمائی۔مجلس کے خادم کی حیثیت سے راقم سطور ان سب حضرات کی عنایات کا ممنون ہے۔

''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' کے کارکنوں کو مسرت ہے کہ اس پُرمغز اور بیش قیمت کتاب کا پہلی بار اردو ترجمہ و انتخاب پیش کر رہے ہیں۔حالات کی تبدیلی کے باوجود اس کتاب کی علمی و دینی قدر و قیمت اور طاقت باقی ہے۔مشرق و مغرب کی دیرینہ کش مکش میں اگرچہ فاتح و اقبال مند مغرب نے مشرق کی ان خصوصیات کو بہت حد تک مغلوب کر لیا ہے جن کی بنا پر وہ مغرب کی بے چین ''مادیت بیزار'' روحوں کا مامن اور صدیوں تک امن و اطمینان کا نشیمن رہا ہے۔عرب کی ایمانی حرارت اور زندگی کی سادگی اور لطافت اور بقول مصنف کتاب ''اس کی خلوت پسندی اور پاکیزگی کو تیل کے سنہرے دھارے بہا کر لے گئے۔'' مصنف کتاب نے جس ''حسین و معصوم'' دنیا کی دلکش تصویر پیش کی ہے اور جس نے ان کو ''دین فطرت'' کی طرف متوجہ اور پھر اس کا حلقہ بگوش بنایا' اب محدود سے محدود تر ہو گئی ہے لیکن

Marfat.com

اطمینان ومسرت کی بات یہ ہے کہ اس "حرارت ولطافت" کا سرچشمہ محفوظ ہے۔اسلام خود اپنی ایک دنیا ہے جس میں مشرق ومغرب، عرب وعجم، قریب وبعید اور قدیم وجدید کی کوئی تقسیم نہیں۔مشرق ومغرب کی سرحدیں اور عرب وعجم کے امتیازات کبھی صفات الٰہی کی طرح ازلی وابدی نہ تھے جو کوئی تغیر قبول نہ کرسکیں۔خدا کا بے لاگ قانون فطرت ایک کو دوسرے پر اثر انداز اور غالب کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔خدا کے آسمانی پیغام اور دین انسانیت کا انحصار کسی ملک اور تہذیب پر نہیں ہے۔اسلام مشرق کے واسطہ اور عرب کی احتیاج کے بغیر بھی اپنا سایہ مغرب پر ڈال سکتا ہے' دین حق کی منزل کے لئے ایک راستہ نہیں' صرف طلب صادق اور عزم راسخ کی ضرورت ہے۔اگر آج مشرق کی وہ آسودگی اور سادگی اور عرب کی وہ سادگی خواب وخیال ہوگئی ہے جو محمد اسد کے لئے اسلام کی طرف کشش کا باعث بنی تھی تو غم کی کوئی بات نہیں۔اس سکینت واطمینان اور اس یقین وایمان کا منبع اور مرکز موجود اور محفوظ ہے۔مشرق بھی فانی ہے اور مغرب بھی فانی۔یہاں جو کچھ ہے زمانی اور مکانی، عارضی اور فانی۔ابدی اور ازلی صرف ایک ذات ہے۔اس کے فیض کا چشمہ ہر زمانہ میں جاری اور اس کی ہدایت کا سلسلہ ہمیشہ باقی ہے۔اس نے انسانوں کی ہدایت کے لئے جو کتاب بھیجی تھی اور انسانیت کے لئے جس ذات (روحی فداہ) اور جس زندگی کو انتخاب کیا تھا' ان کی رہنمائی اب بھی موجود ہے۔سچی پیاس رکھنے والوں کے لئے خواہ وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے، عرب کے ہوں یا عجم کے، چین کے ہوں یا ہندوستان کے، اب بھی یہی صدائے غیب آرہی ہے کہ:

ہنوز آں ابر رحمت دُرفشاں است
خم و خم خانہ بامہر و نشان است

(در: طوفان سے ساحل تک از محمد اسد۔ترجمہ محمد الحسنی ندوی۔کراچی ۱۹۷۷ء، مقدمہ، صفحہ ۸-۳۴)

حواشی

۱۔ مسیحی تخیل نجات جس کے لیے کفارہ وصلیب کا عقیدہ ضروری ہے۔

۲۔ سورۃ تکاثر، پارۂ اخیر۔

۳۔ ترجمہ عفیف البعلبکی، مطبوعہ دار العلم للملامین، بیروت ۱۹۵۶ء

Marfat.com

مائیکل وُلف/ترجمہ:ڈاکٹر تصدق حسین راجا

محمد اسد.....شمال مغربی اسپین
(1927ء)

محمد اسد ایک ایسے سیاح تھے جن میں روحانی توانائی بہت زیادہ تھی۔ان کے سفرنامے، کتابیں اور سفارتی خدمات 70 برس کے طویل عرصے میں پھیلی ہوئی تھیں۔وہ 1900ء میں لوو میں پیدا ہوئے تھے۔ان کے آباؤ اجداد فقیہہ اور قانون دان تھے،لیکن اسد نے تاریخ اور فلسفے کا مطالعہ کیا۔پھر برلن میں وہ فنکاروں اور دانشوروں کے ایک حلقے میں شامل ہو گئے تھے۔1921ء میں انہوں نے یونائیٹڈ ٹیلی گراف نیوز ایجنسی کی ملازمت چھوڑ دی تھی اور یروشلم چلے گئے تھے جہاں وہ ''فرینکفرٹر زیتنگ'' کے خصوصی نامہ نگار رہے۔وہ بے حد مقبول خبری کہانیاں اپنے وطن بھیجتے رہے جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔کتاب کا نام تھا ''غیر رومانویت بھرا مشرق''۔اسد شام، عراق، ایران، افغانستان اور ایشیا کے طویل سفر کے بعد 1926ء میں جرمنی واپس چلے گئے تھے۔اس وقت ان کی عمر 26 برس تھی اور وہ ایک معروف صحافی کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔

جو اقتباسات ہم اس کتاب میں شامل کرنے والے ہیں، یہ ان کی 1954ء کی یادداشتوں میں سے منتخب کیے گئے ہیں جو ''دی روڈ ٹو مکہ'' کے نام سے شائع ہوئی تھیں۔ان میں ایسے تین مرکزی واقعات شامل ہیں جو انہیں واپسی کے بعد پیش آئے تھے۔ان کی شادی ایک جرمن مصورہ ایلسا ویس سے ہوئی اور یہ دونوں برلن میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔پھر یہ میاں بیوی دونوں حج کی ادائیگی کے لیے مکہ گئے تھے۔قاری دیکھے گا کہ حجاز میں اپنی پہلی بیوی کی جواں مرگی نے اسد کے خط پرواز کو ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیا تھا۔وہ کئی برس تک مغرب کو واپس نہ آ سکے تھے۔

''دی روڈ ٹو مکہ'' کا شمار اچھے سفرناموں میں ہوتا ہے مگر یہ اپنے اصطلاحی معنوں میں سفرنامہ نہیں ہے۔یہ ایک یورپی یہودی کے اسلام لانے کی داستان ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ وہ کس طرح رفتہ رفتہ اور دُبدھی سے زیادہ تر ایک نفسیاتی منطقی عمل کے ذریعے دائرۂ اسلام اور اسلامی کلچر میں داخل ہو گیا تھا۔جیسا کہ اس کتاب کا عنوان بتاتا ہے۔یہ کتاب حج کو اس کے سفر کی علامت کے طور پر لیتی ہے۔گو کہیں کہیں اس کتاب کی تمثیل انگیزی خطیبانہ رنگ اختیار کر لیتی ہے مگر مجموعی طور پر یہ کتاب کامیاب ہو جاتی ہے مگر اس کے چند ایک اقتباسات اسے قارئین تک مطلوبہ حد

Marfat.com

تک نہ پہنچ سکیں گے۔ پوری اسلامی دنیا میں یہ کتاب پسندیدگی سے پڑھی جاتی ہے۔

اسد کے اسلام لانے کا ایک سبب مغرب کے لیے اس کا عدم اطمینان تھا۔ وہ ایک جویا، متلاشی اور فرائڈ کا طالب علم تھا اور زندگی کو عقلی اور روحانی طور پر یکجا دیکھنے کا جدیدیت پسند انسان تھا۔ اسلام نے اسے ایک نظریاتی مرکز فراہم کیا تھا اور اس کے پاس اب سفر کرنے کا معقول جواز بھی موجود تھا۔ یہ اسے مطلق العنانی اور بڑھی ہوئی اس عدم صیہونیت کے مقابلے میں ایک متبادل نظریہ فراہم کرتا تھا جو اس وقت یورپ کو بہائے لے جا رہی تھی۔ عرب بطور خاص اسد کو اچھا لگتا تھا اور عربی اسے پسند کرتے تھے۔ ابن سعود نے خود اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ بلاشبہ بادشاہ وقت کو ایک ایسے انسان میں افادیت نظر آئی تھی جو عربی بھی بولتا تھا اور یورپ کی دوسری زبانیں بھی، ایک ایسا شخص بادشاہ کے دوستوں میں تھا۔ اسد نے بعد میں ابن سعود پر مضامین بھی لکھے جو جرمن پریس کو بھیجے جاتے تھے۔ وہ ایک بار ایک خفیہ سعودی مشن پر کویت بھی گیا تھا۔ مگر ابن سعود کی نظر میں وہ معتبر اور محترم اس لیے تھا کہ یہ بادشاہ کے معتقدین میں شامل تھا۔ جیسا کہ فلبی (اور بہت سے دوسروں) کے ساتھ بعد میں ہوا ہمیں یہاں ایک ایسا حکمران ملتا ہے جس کے گرد کم عقل و شعور والے لوگ جمع تھے اور وہ اپنی تنہائی سے نکل کر اجنبیوں میں پہنچ گیا تھا۔ اگر اسد کی بادشاہ کے لیے کوئی سیاسی قدر و قیمت تھی تو یہ ہمیشہ ایک راز رہی۔

اسد سعودی عرب میں چھ برس تک مقیم رہا۔ وہ سلطنت کے کونے کونے میں جاتا تھا اور صحرا سے اپنی محبت کے جذبے کی تسکین حاصل کرتا تھا۔ وہاں سے اس نے مشرق کا سفر جاری رکھا۔ اسلامی دنیا کے بارے میں جو یہ تصور تھا کہ یہ ایک باہمی رابطے کا خطہ ہے اور مکہ اس میں ایک چوراہے کی حیثیت رکھتا ہے وہ چودھویں صدی میں مرا نہیں ہے۔ اسد کی کتاب کے اوراق میں شروع سے آخر تک سفر اور پیشہ وارانہ زندگی کو اس طرح باہم جوڑ دیا گیا ہے جس سے ابن بطوطہ کی یاد بطور سیاح کے تازہ ہو جاتی ہے۔ چین جاتے ہوئے اسد ہندوستان میں ٹھہرے تھے جہاں اس کی آسٹریائی شہریت کی وجہ سے اسے دوسری جنگ عظیم کے قیدیوں کے ایک کیمپ میں حکومت ہندوستان کے ایک ایسے مہمان کے طور پر لے گئے تھے جو اپنی مرضی سے وہاں نہیں جانا چاہتا تھا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد [آغاز سے پہلے] اسد کو فلسفی محمد اقبال نے پاکستانی قوم کے لیے بنیادی کام کرنے میں مدد کے لیے دعوت دی تھی۔ پھر 1947ء میں قیام پاکستان کے بعد وہ نئی حکومت کی خدمت کے لیے مشرق وسطیٰ ڈویژن کے سربراہ کی حیثیت سے چلے گئے تھے۔ انہوں نے دوسری شادی 1952ء میں بوسٹن کی پولا اسد سے کی تھی۔ اس خاتون نے بہت سی کتابیں لکھنے اور شائع کرانے میں اپنے شوہر کی مدد کی۔ ان ساری باتوں کا تذکرہ "دی روڈ ٹو مکہ" میں ہے جو انگریزی میں لکھی گئی اور 1954ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر قارئین تک پہنچی تھی۔

ایک آپ بیتی کے علاوہ اسد نے اسلامی حکومت کے اصول اور اسلامی قانون پر کتب لکھیں۔ اس کے نظریات کٹر مذہبی عقائد سے آزاد روایت کے گہرے علم پر مبنی تھے۔ وہ مسلم خواتین کے حقوق کے علمبردار تھے (ان کے اصرار پر پاکستان کا آئین ایک عورت کو وزیراعظم کا انتخاب لڑنے کی اجازت دیتا ہے) انہوں نے اپنے مضامین میں

Marfat.com

جو شرعی نظام قانون پر تھے، عدل وانصاف میں تاخیر کو سمجھنے کے لیے دلائل پیش کیے تھے۔1980ء کی دہائی میں چند انتہا پسندوں سے اَن بن کی وجہ سے اور ایرانی انقلاب کے پھیلتے ہوئے اثرات پر تشویش کی بنا پر انہیں یہ ملک چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ وہ پہلے پرتگال پھر اسپین چلے گئے جہاں اسد خود ساختہ جلا وطنی میں جو اسلامی دنیا سے تھی، زندگی گزارتے رہے اور 22 فروری 1992ء کو انتقال فرما گئے تھے۔ انہیں غرناطہ کے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

مکے کا راستہ (دی روڈ ٹو مکہ)......از محمد اسد
(اقتباسات)

ایک کہانی کی کہانی: اس کتاب میں جو کہانی میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں، وہ کسی ایسے انسان کی آپ بیتی نہیں جو سرکاری امور میں اپنے کردار کی وجہ سے مشہور ہوا۔ یہ کسی مہم کی روداد بھی نہیں، اس لیے کہ میں نے بہت سی مہمات کی تفصیلات بھی پڑھی ہیں، جو وہی کچھ بتاتی تھیں جو میرے اندر وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ یہ دین وایمان کی تلاش میں کی گئی کسی شعوری کوشش کی کہانی بھی نہیں ہے...... اس لیے کہ یہ عقیدہ وایمان تو کئی برس تک اس تلاش کرنے کی میری کوشش کے بغیر میرے ساتھ ساتھ رہا۔ میری کہانی تو صرف ایک یورپی کے اسلام کی دریافت کی کہانی ہے۔ یہ ایک کہانی ہے اس کے مسلم برادری کا حصہ بن جانے کی اور بس۔

مجھے یہ خیال کبھی نہ آیا تھا کہ میں اسے لکھ ڈالوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ میری زندگی سے سوائے میرے کسی دوسرے کو بھی کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے، لیکن جب مغرب سے 25 برس دور رہنے کے بعد میں پیرس آیا، پھر 1952ء میں نیویارک گیا تو مجھے اپنا یہ خیال تبدیل کرنا پڑا۔ میں جن دنوں اقوام متحدہ میں پاکستان کے وزیر اختیارات کل کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، ان دنوں میں لوگوں کی نظر میں تھا اور میرے بہت سے یورپی اور امریکی دوستوں کے علاوہ کئی شناساؤں کو میرے بارے میں بڑا تجسس تھا۔ پہلے تو لوگ یہ سمجھے کہ ایک ''یورپی ماہر'' کو ایک مشرقی حکومت نے ایک خاص مقصد کے لیے ملازمت دے رکھی ہے اور میں نے اپنے آپ کو اس قوم کے طور طریقوں کے مطابق ڈھال لیا ہے جس نے مجھے ملازمت دے رکھی تھی مگر جب اقوام متحدہ میں میری کارکردگی نے ان کے تمام اندازے غلط ثابت کر دیئے اور انہوں نے دیکھا کہ میں مسلم دنیا کے سیاسی اور ثقافتی مقاصد کو پورا کرنے کا فریضہ انجام نہیں دے رہا تو یہ بہت حیران وپریشان ہو گئے تھے۔ اب لوگوں نے مجھ سے میرے سابقہ تجربات کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا تھا۔ انہیں معلوم ہوا کہ میں نے ابتدائی زندگی میں یورپی اخبارات میں ایک غیر ملکی نامہ نگار کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ پھر میں نے مشرق وسطیٰ کے تمام ملکوں کا سفر کیا اور 1926ء میں حلقہ

Marfat.com

بگوش اسلام ہو گیا تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد میں 6 برس تک سعودی عرب میں مقیم رہا اور ابن سعود سے میری دوستی رہی۔ اس کے بعد میں ہندوستان گیا جہاں میری ملاقات عظیم مسلم شاعر اور فلسفی اور تصور پاکستان کے روحانی باپ محمد اقبال سے ہوئی۔ انہوں نے ہی مجھے مشرقی ترکستان، چین اور انڈونیشیا کے سفر کے ارادوں سے باز رکھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ہندوستان میں رہ کر مستقبل کی اسلامی ریاست کے قیام کی کوششوں میں مددگار ثابت ہوں جو اس وقت صرف ایک خواب کی صورت میں اقبال کے دل ودماغ کا حصہ تھی۔ مجھے اور محمد اقبال کو یہ یقین تھا کہ ہندوستان میں ایک نوزائیدہ آزاد اسلامی ریاست کا قیام ہی اسلام کے مستقبل کی توقعات کو پورا کر سکتا ہے۔ اس اسلامی ریاست کا ایک نظریاتی ریاست کی حیثیت سے نقشہ عالم پر ابھرنا لازمی تھا...... میں نے کئی برس تک اپنے آپ کو اس کام میں مصروف رکھا۔ مطالعہ کرتا رہا، لکھتا رہا، لیکچر دیتا رہا اور پھر ایک وقت ایسا آیا جب میں اسلامی قانون اور ثقافت کے ترجمان کے طور پر شہرت حاصل کر چکا تھا۔ جب 1947ء میں پاکستان وجود میں آ گیا تو مجھے حکومت پاکستان کی طرف سے بلا بھیجا گیا کہ میں پاکستان جا کر اسلامی تعمیر نو کا محکمہ تشکیل دے کر اس ضمن میں مزید کام کروں۔ مجھے ریاست کے نظریاتی، اسلامی تصورات کی تفصیلات فراہم کر کے ایک نوزائیدہ سیاسی سلطنت کی مدد کرنی تھی۔ اس سرگرمی میں مجھے دو سال لگ گئے تھے اور میں نے ایک خاکہ تیار کر کے حکومت پاکستان کے حوالے کر دیا تھا۔ اب میرا تقرر مشرق وسطیٰ ڈویژن کے سربراہ کی حیثیت سے کر دیا گیا تھا جو وزارت امور خارجہ کے ماتحت تھا۔ میں نے اپنی اس حیثیت میں پاکستان اور اسلامی دنیا کے درمیان تعلقات کو مضبوط بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس دوران مجھے نیویارک میں اقوام متحدہ کے لیے پاکستان مشن میں تعینات کر کے بھیج دیا گیا تھا۔

مجھے ایک خاص ثقافتی ماحول سے ایک دوسرے ماحول میں بھیج دیا گیا تھا جو اس سے بالکل مختلف تھا۔ میرے بہت سے مغربی دوستوں کو یہ بہت عجیب محسوس ہوا تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ایک ایسا انسان جس کی پیدائش مغرب میں ہوئی جو مغرب ہی میں پلا بڑھا، وہ بغیر ذہنی تحفظات کے کس طرح مسلم دنیا میں اپنی شناخت کرا چکا تھا۔ اس نے اپنے مغربی ثقافتی ورثے کو اسلام کے ثقافتی ورثے کے ساتھ کیسے بدل لیا تھا۔ کس بات نے اسے ایک مذہبی اور سماجی نظریے کو قبول کرنے پر آمادہ کیا ہو گا جسے ان کے خیال میں تمام یورپی نظریات کے مقابلے میں وسیع پیمانے پر کمتر سمجھا جاتا تھا۔

مغرب کو واپسی۔ 1926ء: یہ 1926ء کی بات ہے۔ موسم سرما ختم ہو رہا تھا اور میں وطن واپسی کے لیے سفر پر ہرات (افغانستان) سے روانہ ہو رہا تھا۔ مجھے افغانستان کی سرحد سے بذریعہ ریل مرو جانا تھا جو روسی ترکستان میں واقع تھا۔ پھر مجھے سمرقند، بخارا اور تاشقند سے گزر کر ترکمان کے دشت سے یورالز اور ماسکو پہنچنا تھا۔

میں نے مرو کے ریلوے اسٹیشن پر جو کچھ دیکھا، یہ روس کے بارے میں میرا پہلا اور آخری تصور تھا...... میں نے دیکھا ایک بہت بڑی خوبصورت تصویر پوسٹر کی شکل میں آویزاں ہے جس میں ایک نوجوان پرولتاری کو

Marfat.com

نیلے اوورکوٹ میں، سفید داڑھی والے ایک مضحکہ خیز شخص کے جوتے پالش کرتے دکھایا گیا تھا۔ یہ باریش شخص سفید چغہ پہنے ہوئے تھا۔ اس پوسٹر کے نیچے یہ روسی روایت لکھی ہوئی تھی: خدا کو روس کے مزدوروں نے یوں اس کی جنت سے ٹھوکر مار کر نکال دیا ہے! جاری کردہ بزبوزنکی (بے دین) ایسوسی ایشن آف دی یونین آف سوویٹ سوشلسٹ ری پبلک۔

یہاں آپ جس طرف بھی جائیں اسی قسم کا سرکاری پروپیگنڈا مذہب کے خلاف آپ کو دیکھنے کو ملے گا۔ عوامی عمارتوں، گلی کوچوں اور بطور خاص ایسے گھروں پر مشتمل علاقے میں جہاں عبادت خانے ہیں، اس قسم کا پروپیگنڈا زیادہ کیا جاتا ہے۔ ترکستان میں قدرتی بات تھی کہ ایسا اس حصے میں کیا جاتا تھا جہاں مساجد تھیں۔ ابھی نماز پر پابندی کھل کر نہیں لگائی گئی تھی، مگر لوگوں کو مسجدوں میں جانے سے روکا جاتا تھا۔ مجھے بخارا اور تاشقند میں یہ بات بطور خاص معلوم ہوئی کہ مسجد میں داخل ہونے والے ہر نمازی کا نام خفیہ پولیس نوٹ کر لیتی تھی۔ قرآن حکیم کے نسخے ضبط کر کے ضائع کر دیئے جاتے تھے۔ بزبوزں کی ملحد ایسوسی ایشن کا من پسند مشغلہ یہ تھا کہ وہ سور کے سر مساجد میں پھینک دیتی تھی اور اپنی اس حرکت پر اسے بڑی خوشی ہوتی تھی۔

میں ایشیائی اور یورپی روس سے گزرتا ہوا کئی ہفتوں بعد پولینڈ کی سرحد عبور کر گیا تھا۔ میں سیدھا فرینکفرٹ گیا اور اپنے اخبار کے دفتر حاضری دی۔ مجھے جلد ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ چلے جانے کے بعد میری عدم موجودگی میں میرا نام بہت مشہور ہو گیا تھا۔ مجھے اب وسطی یورپ کا ممتاز غیر ملکی نامہ نگار سمجھا جاتا تھا۔ میرے چند مضامین جو ایرانیوں کی پیچیدہ مذہبی نفسیات پر لکھے گئے تھے، مشہور مشرقی سکالرز نے بے حد پسند کیے تھے۔ مجھے اپنی اس کامیابی پر برلن کی اکادمی برائے جیو پالیٹکس میں کئی لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ یہاں مجھے بتایا گیا تھا کہ اس سے قبل ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میری عمر (میں ابھی 26 برس کا ہوا تھا) کے کسی مقرر کو اس قدر امتیازی حیثیت حاصل ہوئی ہو۔ میرے دوسرے مضامین جو عام دلچسپی کے تھے، کئی اخبارات میں دوبارہ شائع کیے جا رہے تھے۔ میرا ایک مضمون میری اطلاع کے مطابق تیس بار شائع کیا گیا تھا۔ مجھے ایران کی سیر و سیاحت نے بہت فائدہ پہنچایا تھا۔

برلن۔ 1926ء: یہ وہ زمانہ تھا جب میری شادی ایلسا سے ہوئی تھی۔ میری یورپ سے دو سال کی دوری نے ہماری محبت میں کمی نہیں آنے دی تھی بلکہ اس میں تو اس دوری نے اضافہ کر دیا تھا اور مجھے یہ محسوس کر کے خوشی ہو رہی تھی کہ میں نے اپنی اور ایلسا کی عمر میں تفاوت کے خیال کو ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دیا تھا۔

ایلسا نے مجھ سے پوچھا: ''آپ مجھ سے کیسے شادی کریں گے۔ آپ ابھی بمشکل 26 برس کے ہوئے ہیں اور میری عمر چالیس سے کچھ اوپر ہو گئی ہے۔ میں تو ایک بوڑھی عورت ہوں؟''

میں نے ہنس کر جواب دیا: ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں آنے والے وقت میں تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' وہ بالآخر رضامند ہو گئی تھی۔

میں نے قطعاً مبالغہ سے کام نہیں لیا تھا جب میں نے ایلسا سے یہ کہا تھا کہ میں مستقبل میں اس کے بغیر

Marfat.com

زندگی کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہ جسمانی طور پر تو خوبصورت تھی ہی، اس کی وجدانی اور فطری دلکشی نے اسے اس قدر حسین بنا دیا تھا کہ میں کسی اور عورت کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں زندگی میں کس شے کا خواہاں تھا، اسے کیسے بسر کرنا چاہتا تھا، وہ اس سے باخبر تھی۔ اس نے میری امیدوں اور توقعات کو اور روشن کر دیا تھا اور مجھے ان کے حصول میں تقویت بخشی تھی۔ میں اکیلا شاید اپنی توقعات کو پورا کرنے میں کامیاب نہ ہوتا اگر ایلسا میری زندگی میں داخل نہ ہو گئی ہوتی۔

ہماری شادی کو تقریباً ایک ہفتہ گزرا تھا کہ ایک دن اس نے کہا: ''یہ کتنی عجیب بات لگتی ہے کہ آپ مذہب میں تصوف کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے حالانکہ آپ خود ایک صوفی ہیں، ایک ایسا صوفی جو اپنے اردگرد کی زندگی تک سرِ انگشت سے پہنچ رہا ہے، جسے روزمرہ کی چیزوں میں متصوفانہ نمونے ملتے ہیں۔ یہ وہ باتیں جنہیں لوگ آپ کی طرح محسوس نہیں کرتے مگر جس لمحے آپ مذہب کی جانب مڑتے ہیں، آپ سراپا عقل بن جاتے ہیں۔ بہت سے دوسرے لوگ اس کے بالکل برعکس کرتے ہیں۔''

ہم قرآن پاک کی تلاوت اکثر ایک ساتھ بیٹھ کر کرتے تھے۔ اس میں دی گئی تعلیمات پر تبادلہ خیالات ہوتا تھا۔ ایلسا میری طرح قرآن کی اخلاقی تعلیم اور اس کی عملی رہنمائی کے درمیان ایک اندرونی ربط سے بہت متاثر تھی۔ قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے تو اللہ نے انسان کو اندھی تقلید کا حکم نہیں دیا بلکہ سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی تلقین کی ہے۔ وہ انسان کی تقدیر سے دور نہیں کھڑا ہوا بلکہ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے۔ اس نے عقیدے اور سماجی رویے میں کوئی خط فاصل نہیں کھینچ دیا۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ اس مسلمہ حقیقت سے بات شروع نہیں کرتا کہ زندگی مادہ و روح کے درمیان پائے جانے والے تصادم کے بوجھ تلے دب گئی ہے۔ روشنی تک جانے والا راستہ روح کو جسم کی زنجیروں سے آزاد کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے نفس کشی کو ناپسند فرمایا ہے۔ آپؐ نے واضح کر دیا تھا کہ اسلام میں ترک دنیا کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ انسان کی زندہ رہنے کی خواہش کے ساتھ ساتھ کچھ اخلاقی پابندیاں بھی اس پر عائد کر دی گئی ہیں۔ زندگی کس طرح گزارنی ہے، اس طرح نہیں جیسے کوئی انسان خود چاہے بلکہ اس طرح جیسے اسے گزارنی چاہیے اور وہ رہنما اصول حیات قرآن اور قرآن ناطق کے اسوۂ حسنہ سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

اسلام کی ایک حتمی شکل میرے سامنے آ رہی تھی اور اب ایک فیصلہ کن مرحلہ کبھی کبھی مجھے دم بخود کر دیتا تھا۔ ایک طرح کا ذہنی انجذاب تھا جو ایک خاص عمل سے گزر کر میرے اندر سرایت کر رہا تھا۔ اس میں میری کوئی شعوری کوشش شامل نہ تھی۔ پچھلے چار برسوں میں جو کچھ دوران مطالعہ مجھ تک پہنچا تھا اب وہ ایک خاص شکل میں ڈھل چکا تھا۔ مجھے اپنے سامنے فن تعمیر کا ایک شاہکار دکھائی دیا جس کے تمام حصے بڑی مہارت سے یکجا کیے گئے تھے اور یہ ایک دوسرے کو سہارا دیئے ہوئے تھے۔ نہ اس میں کسی شے کی زیادتی تھی نہ کمی...... ایک توازن کے ساتھ ہر شے اپنی اپنی جگہ موجود تھی اور یہی میری نظر میں اسلام کی ایک جامع اور حسین شکل تھی۔

Marfat.com

مدینہ طیبہ۔1932ء: مسجد نبوی میں اس وقت روشنی کے لیے چراغ جلا دیئے گئے تھے۔ یہ محرابوں کے ستونوں پر رکھے ہوئے ہیں۔ شیخ عبداللہ ابن بُولحد سر سینے پر جھکائے، آنکھیں بند کیے بیٹھا ہے۔ جو اسے نہیں جانتا یہی سمجھتا ہے کہ وہ سویا ہوا ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ پورے انہماک سے مجھے سن رہا ہے اور اس کی کوشش یہ ہے کہ وہ اسے اپنے وسیع تجربے میں کہیں فٹ کر لے جو انسانوں اور انسانی قلوب سے متعلق اسے حاصل ہے۔ کافی دیر بعد وہ اپنی آنکھیں کھول دیتا ہے اور سر اوپر اٹھاتا ہے۔ اس نے مجھ سے سوال کیا: ''اور پھر کیا ہوا؟ تم نے پھر کیا کیا؟''

''یا شیخ! میں نے اپنے ایک مسلمان دوست کو تلاش کیا جو ہندوستان سے تھا اور برلن میں مسلم برادری کا سربراہ تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ اس نے اپنا سیدھا ہاتھ میری طرف پھیلایا تو میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ دو گواہوں کی موجودگی میں میں نے یہ اعلان کیا کہ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔'' چند ہفتوں بعد میری بیوی نے بھی اسی طرح کیا۔''

''اور تمہارے لوگوں نے اس بارے میں کیا کیا۔''

''انہوں نے اسے پسند نہیں کیا تھا۔ میں نے جب اپنے والد کو بذریعہ خط بتایا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں تو انہوں نے میرے خط کا جواب دینا بھی گوارا نہ کیا۔ کچھ دنوں بعد میری بہن کا مجھے خط آیا جس میں لکھا تھا کہ میرے والد نے کہا ہے کہ میں ان کے لیے مر گیا ہوں۔ میں نے ایک دوسرا خط انہیں ارسال کیا کہ میرے اسلام لانے کے باوجود میرے لیے ان کا احترام اور ان کی محبت اتنی ہی رہے گی جتنی پہلے تھی۔ میں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے انہیں لکھا کہ اسلام میں تو والدین کے احترام اور ان سے محبت کی تلقین زیادہ کی گئی ہے مگر اس بار بھی کوئی جواب نہ آیا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے والد اپنے مذہب کے معاملے میں بہت پختہ عقیدہ رکھتے ہیں۔''

''نہیں یا شیخ! یہ بات نہیں ہے۔ یہی تو اس کہانی کا عجیب ترین حصہ ہے۔ وہ مجھے خارج از مذہب تصور کرتے ہیں اور یہ اس وجہ سے نہیں کہ یہ ان کے نزدیک کوئی اہم مذہبی معاملہ ہے (اس لیے کہ وہ خود بھی کبھی کٹر مذہب پرست نہیں رہے) بلکہ وہ مجھے اس برادری کا غدار سمجھتے ہیں جس میں میری پرورش ہوئی، اس کلچر سے ان کے نزدیک میری غداری ہے جس سے میں اتنا عرصہ منسلک رہا۔''

''کیا اس وقت سے آج تک تم ان سے نہیں ملے؟''

''جی نہیں ملا کیونکہ حلقہ بگوش اسلام ہونے کے فوراً بعد میں اور میری بیوی یورپ سے چلے آئے تھے۔ اب ہمارا وہاں رہنا ہمارے لیے ممکن نہیں رہا تھا اور پھر میں اس کے بعد وہاں کبھی واپس گیا بھی نہیں ہوں۔'' (میرے اپنے والد کے ساتھ تعلقات 1935ء میں بحال ہو گئے تھے جب انہیں یقین ہو گیا تھا کہ میں مسلمان کیوں ہوا تھا مگر ہم ایک دوسرے سے ملے کبھی نہیں تھے صرف خط وکتابت کا سلسلہ ہمارے درمیان جاری رہا۔ پھر 1942ء میں انہیں اور میری بہن کو نازیوں نے ویانا سے نکال دیا تھا اور بعد میں وہ قیدیوں کے کیمپ میں وفات پا گئے تھے)۔

Marfat.com

لبیک اللھم لبیک: میں نے اپنے پانچ حجوں کے درمیان یہ آواز بہت دفعہ سنی۔ لگتا ہے جیسے میں اسے آج بھی سن رہا ہوں۔ یہ آواز ان سمندری لہروں کی مانند، جو جہاز سے ٹکراتی رہتی ہیں، میرے دل کی گہرائیوں میں ٹکراتی رہتی ہے۔ یہ آواز انجن سے نکلنے والی آواز سے ملتی جلتی ہے اور میں ان دونوں آوازوں سے خوب مانوس ہوں۔ میں جب ''لبیک اللھم لبیک'' کی آواز سنتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے سینکڑوں جہازوں سے یہ آواز گونج رہی ہے بالکل اسی طرح جیسے یہ اس وقت اس جہاز میں گونجی تھی جس سے میں پہلی بار حج کے لیے بحیرہ احمر کے ذریعے مصر سے مکہ آرہا تھا۔ ایسا کیوں ہے اس کا جواب شاید کسی کے پاس بھی نہ ہو۔ جب ہم خلیج سوئز سے چلے تھے تو پانی کا رنگ بھورا تھا۔ دائیں جانب براعظم افریقہ کے پہاڑ تھے اور بائیں طرف جزیرہ نما سنائی کے...... دونوں درختوں اور سبزے سے محروم چٹیل...... جوں جوں ہم فاصلہ طے کر رہے تھے یہ دور سے دور تر ہوتے جا رہے تھے۔ پھر یہ دھند میں ایسے چھپے تھے کہ دوبارہ نظر نہ آئے۔ بعد دوپہر ہم جب کھلے بحیرۂ احمر میں نکلے تو تند ہواؤں اور بحیرۂ روم کے نیلے پانی جیسے سمندر میں سفر کر رہے تھے۔

اس جہاز میں صرف حجاج کرام تھے۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ جہاز بمشکل ان کا وزن اٹھائے جا رہا تھا۔ دراصل بحری جہازوں کی کمپنیاں موسم حج میں حجاج کو زیادہ سے زیادہ ان جہازوں میں لاد کر روپیہ کمانے کے لالچ کا شکار رہتی تھیں۔ مسافروں کے آرام کا خیال کیے بغیر ان جہازوں میں حجاج کو اس طرح سوار کرایا جاتا تھا جیسے یہ انسان نہیں بے جان سامان ہو۔ عرشوں پر، کیبنوں کے اندر، غلام گردشوں میں، سامان کے رکھے جانے والے حصوں میں غرض ہر خالی جگہ میں مسافروں کو ٹھونس دیا گیا تھا۔ ان مسافروں میں زیادہ تعداد ان حجاج کی تھی جو مصر اور شمالی افریقہ سے تھے۔ سفر بے حد تکلیف دہ تھا مگر منزل کو نظروں کے سامنے رکھ کر یہ لوگ ساری تکلیفیں برداشت کر رہے تھے اور زبان پر حرف شکایت بھی نہ لاتے تھے۔ عورتوں، مردوں اور بچوں کے گروپ مختصر سی جگہ میں سمائے ہوئے تھے۔ کھانا کمپنی مہیا کرتی تھی۔ کھانا رکھنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ پانی ٹین کے کنستروں میں ملتا تھا۔ پانی کے نلوں کے گرد دن میں پانچ بار بہت ہجوم رہتا تھا۔ نل کم تھے اور لوگوں کی تعداد ان گنت۔ یہ لوگ یہاں نماز کے لیے وضو کرنے جمع ہوتے تھے۔ عرشے سے دو منزلیں نیچے مسافر اس جگہ رکھے جاتے تھے جو جگہ مسافروں کے سامان کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔ ایمان وعقیدہ کی گرمی تھی کہ مسافروں نے یہ ساری صعوبتیں برداشت کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔ مکہ مکرمہ کا تصور ان کی ساری مشکلات، تمام تکالیف سفر پر حاوی تھا۔ ذکر کرتے تو صرف حج کا اور بات کرتے تو مکہ مکرمہ کی جس سے ان کے چہرے خوشی ومسرت سے دمک اٹھتے تھے۔ عورتیں مل کر اکثر مکے کے گیت گاتی تھیں...... بار بار ''لبیک اللھم لبیک'' کے الفاظ دہرائے جا رہے تھے۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت جہاز کا سائرن بجا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ ہم جدہ کے شمال میں ایک چھوٹی سی بندرگاہ کے قریب پہنچ گئے تھے۔ یہ وہ مقام تھا جہاں قدیم روایت کے مطابق شمال سے آنے والے حجاج روزمرہ کے لباس اتار کر احرام باندھ لیتے ہیں جو دو اَن سلی چادروں کو اس طرح جسم کے گرد لپیٹا جاتا ہے کہ اوپر والے

Marfat.com

حصے کی چادر میں کندھے ننگے رہیں۔اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ آنحضورؐ کا فرمان تھا کہ یہ حج کا لباس اس لیے ضروری ہے تا کہ دنیا کے مختلف ممالک سے آنے والے مختلف طبقوں کے لوگوں کے لباس میں یکسانیت ہو تا کہ وہ یہ محسوس کریں کہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں اور اللہ کی نظر میں ایک جیسے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے جہاز کے اندر مردوں کے رنگ برنگے لباس کی جگہ سفید ایک جیسے لباس نے لے لی تھی۔ تیونس، مراکش، مصر سبھی جگہ کے حجاج نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ آپ کو اپنے اردگرد سوائے سفید سوتی احرام کے کوئی دوسرا رنگ نظر نہیں آتا تھا۔ مگر اس سادگی لباس میں ایک وقار تھا۔ ایک شان تھی جسے حجاج ہی محسوس کر سکتے تھے۔ عورتوں کے لیے البتہ یہ احرام ضروری نہیں کیونکہ انہیں پورا جسم ڈھانپ کر رکھنے کا حکم ملا ہے۔ وہ اپنے سادہ سے زنانہ لباس میں ہی مناسک حج ادا کرتی ہیں۔

تیسرے روز صبح کے وقت ہمارے جہاز نے عرب کے ساحل پر لنگر ڈال دیا تھا۔ ہم میں سے زیادہ لوگ عرشے پر کھڑے اس سرزمین کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے جو صبح کے دھندلکوں میں سے آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی۔

چاروں طرف دوسرے حج جہازوں کے ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ دور مشرقی سمت کوئی شے پہاڑی جیسی نظر آئی جو رفتہ رفتہ سمندر کے کنارے ایک شہر میں بدل گئی تھی۔ اونچے اونچے مکانات تھے...... یہ جدہ تھا۔ لکڑی کی بالکونیوں والے گھر اب قریب آتے جا رہے تھے۔ ہوا میں نمی تھی۔ ہر طرف ایک جیسا بھورا سبز رنگ چھایا ہوا تھا۔ کھڑی ہوئی انگلی کی مانند ایک سفید مینار دکھائی دے رہا تھا۔

ایک بار پھر "لبیک اللھم لبیک" کی صدا بلند ہوئی۔ سر تسلیم خم ہے، کی خوشی و مسرت بھری صدا۔ حجاج ایک ہی جذبے سے سرشار تھے کہ ان کی امیدوں کی سرزمین آ گئی ہے۔

میری اور دوسرے حجاج کی امیدیں تو یکساں تھیں مگر میرے لیے تو عرب کے ساحل کا نظر آ جانا میری برسوں کی تلاش کی معراج تھی۔ میں نے مڑ کر ایلسا کی طرف دیکھا جو اس حج کے موقعہ پر میرے ہمراہ تھی۔ اس کی نظروں میں وہی جذبات بزبان خود بول رہے تھے۔

اب ہمیں بہت سے سفید پر نظر آئے جو ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ عربی ساحلی کشتیاں تھیں جن کے سفید بادبان ہوا میں لہرا رہے تھے۔ یہ بغیر آواز پیدا کیے لہروں کے درمیان سے اپنا راستہ بناتی ہوئیں ہماری جانب آ رہی تھیں۔ یہ عرب کی پہلی سفیر تھیں جو ہمارا استقبال کرنے والی تھیں۔ بہت جلد یہ ہمارے جہاز کے گرد جمع ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ایک ایک کر کے اپنے بادبان لپیٹ لیے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے مرغابیوں کا ایک غول خوراک کی تلاش میں اتر آیا تھا۔ چند لمحے پہلے جو سکوت تھا وہ ان کی آوازوں سے ٹوٹ گیا تھا۔ وہ ملاح بھی شور مچا رہے تھے جو ایک کشتی سے دوسری کشتی پر چھلانگ لگا کر جا رہے تھے۔ اب وہ زینے پر کھڑے ہو کر حجاج کو اترنے میں مدد دے رہے تھے اور ان کا سامان اتار رہے تھے۔ حجاج کا تو سرزمین مقدس کو دیکھ کر خوشی سے برا حال تھا۔ انہیں تو کسی چیز کا جیسے ہوش ہی نہ تھا۔

کشتیاں کشادہ اور بڑی تھیں جن پر اونچے اونچے مستول اور بادبان تھے۔ بہادر سندباد بھی ایسی ہی کسی

Marfat.com

کشتی میں سوار ہو کر مہم پر نکلا ہوگا اور بجائے کسی ساحل پر اترنے کے ایک وہیل مچھلی کی پیٹھ پر اتر گیا تھا۔ سند باد سے قبل بھی مہم جو اسی قسم کی کشتیوں میں جنوبی سمت میں بحیرۂ احمر کے راستے بحیرۂ عرب میں داخل ہوئے ہوں گے جنہیں مصالحہ جات اور لوبان اور اوپیر کی تلاش تھی۔ (اوپیر عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ عہد نامہ عتیق میں مذکور مقام جہاں سے سونا حاصل ہوتا تھا) اور آج ہم ان عظیم مہم جو انسانوں کے حقیر سے جانشین ایک مختلف قسم کا سفر طے کر کے آئے تھے...... اس مرتبہ مسافر حجاج تھے سفید احرام میں ملبوس، ضروری اشیائے سامان سے لدے ہوئے، بہت سی توقعات سے کانپتے ہوئے حجاج۔

مجھے بھی بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ مگر میں کیسے مستقبل میں جھانک کر دیکھتا جب میں ایک کشتی میں اپنی بیوی کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا کہ محض ایک حج کی ادائیگی کے بعد ہم اندر باہر سے تبدیل ہو جائیں گے؟ مجھے ایک بار اور سند باد کی یاد آئی۔ اس نے جب اپنے وطن کے ساحل کو چھوڑا ہوگا، میری طرح، اسے تو یہ توقع نہ ہوگی کہ مستقبل اسے کیا دے گا۔ نہ اس نے آنے والے زمانے میں جھانکنے کی کوشش کی ہوگی نہ کوئی خواہش...... وہ تو صرف تجارت کے لیے نکلا تھا اور تجارت سے پیسہ کمانے کا خواہش مند تھا...... اور میں' میں تو سوائے حج ادا کرنے کے کچھ اور نہ مانگتا تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس نے دنیا کو اپنی پرانی نظروں سے دیکھا ہو۔

یہ بالکل سچ ہے کہ میری زندگی میں جنوں جیسی مخلوق اور سحر زدہ کر دینے والی دوشیزائیں اور قوی ہیکل راک جیسے پرندے، جو بصرہ سے چلنے والے ملاح کو نظر آتے تھے، مجھے بھی نظر نہیں آئے۔ میں ان سب سے محروم ہی رہا۔ مگر سند باد کے سارے سفر ایک طرف اور میرا یہ سفر حج دوسری طرف۔ میرے اس پہلے حج کے سفر نے تو میری زندگی کے اندر کاٹ کر ایک راستہ پیدا کر دیا تھا۔ جہاں تک میری شریک حیات ایلسا کا تعلق ہے، موت اس کی منتظر تھی...... ہم دونوں میں سے کسی کو بھی یہ پیش آگاہی نہ تھی کہ موت کی یہ گھڑی کس قدر قریب تھی۔ میں یہ ضرور جانتا تھا کہ میں نے مغرب کو چھوڑ دیا ہے اور اب مجھے مسلمانوں کے درمیان زندگی گزارنی ہے مگر بخدا یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اپنا سارا ماضی پیچھے چھوڑ دینے والا ہوں۔ میری پرانی دنیا بغیر کسی انتباہ کے ختم ہو رہی تھی۔ وہ دنیا جو مغربی تصورات، جذبات، تگ و دو اور محاکات کی دنیا تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک دروازہ خاموشی سے میرے پیچھے بند ہو رہا تھا۔ اس قدر خاموشی کے ساتھ کہ اس کی مجھے خبر ہی نہ ہو۔ میں سمجھ رہا تھا یہ سفر بھی میرے سابقہ سفروں جیسا ہی ہوگا جب ایک شخص ممالک غیر میں گھومتا پھرتا ہے اور ہمیشہ ماضی میں لوٹ لوٹ جاتا ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ میرے ایام زندگی بالکل تبدیل ہو رہے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ میری تمام تر خواہش کی سمت تبدیل ہو رہی تھی۔

میں اب تک مشرق کے بہت سے ملکوں کی سیر کر چکا تھا۔ میں ایران اور مصر سے یورپ کے کسی بھی ملک کی نسبت زیادہ جانتا تھا۔ کابل میرے لیے عرصہ ہوا اجنبی نہ رہا تھا۔ دمشق اور اصفہان کے بازاروں سے میں بہت مانوس تھا۔ اسی لیے میں آج محسوس کر رہا تھا کہ جدہ کا بازار پہلی بار مجھے کیسا لگے گا۔ ہو سکتا ہے یہ مشرق کے کسی بھی ملک سے تھوڑا بہت مختلف ہو مگر جب میں جدہ کے بازار سے گزرا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ ان کی نسبت کئی لحاظ سے بہت بہتر

Marfat.com

اور جامع تھا۔ سخت گرمی سے بچنے کے لیے بازار میں موجود دکانوں کو تختوں اور بوری کے کپڑوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ سوراخوں اور چھوٹی چھوٹی دراڑوں سے سورج کی شعاعیں چھن چھن کر اندر آ رہی تھیں۔ کھلے باورچی خانے نظر آئے جن کے سامنے حبشی لڑکے کوئلوں پر گوشت کے ٹکڑے بھون رہے تھے۔ کافی پینے کے رسیا یورپی اور مشرقی کافی کی دکانوں میں جمع تھے۔ بیشمار حجاج سفید اور رنگین کپڑوں میں تھے۔ جدہ کے مستقل رہائشی حجاج کے چہروں، کپڑوں اور طور طریقوں میں پوری اسلامی دنیا کے تمام ممالک سمٹ آئے تھے۔ باپ کا تعلق اگر ہندوستان سے تھا تو ماں کا باپ ملایا اور عرب دونوں کا مخلوط باشندہ تھا۔ ممکن ہے اس کے ددھیال ازبکستان اور ننھیال مالیہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہ حج کے صدیوں پرانے زندہ نشانات تھے۔ یہ وہ اسلامی ماحول تھا جس میں رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ جدہ 1927ء میں حجاز کا وہ واحد شہر تھا جس میں غیر مسلموں کو رہنے کی اجازت تھی۔ اسی لیے اس وقت بعض دکانوں کے سائن بورڈ یورپی تحریر میں نظر آتے ہیں۔ لوگ سفید گرم خطوں کے لباس میں ملتے ہیں جن کے سروں پر دھوپ سے بچنے کے لیے ٹوپیاں تھیں۔ قونصل خانوں پر غیر ملکی پرچم لہرا رہے تھے۔

بندرگاہ سے آوازیں اور بُو آ رہی تھی۔ سمندر میں لنگر انداز جہاز اور مچھلیاں پکڑنے میں استعمال ہونے والی کشتیاں نظر آ رہی تھیں جن پر سفید تکونے بادبان تھے۔ یہ دنیا بحیرۂ روم کی زندگی سے کچھ زیادہ مختلف بھی نہ تھی۔ مکانات قدرے مختلف ضرور تھے مگر ان میں سمندر سے چلنے والی ٹھنڈی ہواؤں کا گزر تھا اور نقشہ کچھ تبدیل کر کے انہیں تعمیر کیا گیا تھا کہ مکینوں کے لیے بلا رکاوٹ باہر دیکھنا آسان تھا لیکن راستہ گزرنے والے اندر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ سب کچھ نہ تو بحیرۂ روم کے ملکوں جیسا تھا نہ بالکل سعودی عرب جیسا۔ یہ دراصل بحیرۂ احمر کی ساحلی دنیا تھی جہاں ایسے ہی فن تعمیر پر مشتمل اس کے دونوں جانب عمارات کھڑی تھیں۔

عرب میں اوپر کھلا آسمان، زمین پر پہاڑی سلسلے اور مشرق کی سمت ریت کے تودے تھے۔ یہ سارے منظر عرب کی تصویر میں جمع ہو گئے تھے۔

جدہ سے مکہ مکرمہ تک 1927ء: اگلے روز بعد از دوپہر ہمارا قافلہ مکہ کو جانے والی سڑک پر جا رہا تھا۔ حجاج کے ہجوم، بدوؤں اور ان اونٹوں کے درمیان میں سے ہمیں راستہ بنانا پڑتا تھا جن اونٹوں میں سے کچھ پر تو سائبان دار پلنگ تھے کچھ پر نہیں۔ اونٹوں پر لوگ سوار تھے۔ گدھوں پر سامان لدا ہوا تھا جو شہر کے مشرقی دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی اکا دکا موٹر کار ہمارے قریب سے فراٹے بھرتی گزر جاتی تھی۔ یہ وہ موٹر کاریں تھیں جو سعودی عرب میں پہلی بار آئی تھیں۔ ان میں بھی حجاج سوار تھے اور یہ اپنے ہارن بجا بجا کر شور کر رہی تھیں۔ اونٹوں کو یہ پتا چل گیا تھا کہ یہ نئے عفریت ان کے دشمن تھے۔ یہ دشمن پاس سے گزرتے تو اونٹ اپنی لمبی گردنیں ادھر اُدھر موڑ لیتے تھے، گھبرائے ہوئے مگر بے بس۔ ایک نیا دور خوفناک انداز میں ان لمبے اور صابر جانوروں کے لیے قریب آ رہا تھا جو انہیں خوفزدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

Marfat.com

تھوڑی دیر بعد ہم نے شہر کی سفید دیواروں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا اور اب ہم صحرا میں داخل ہو چکے تھے۔ایک کھلا ریتیلا میدان ہمارے سامنے تھا جس میں خاردار جھاڑیاں تھیں۔کہیں کہیں گھاس بھی تھی اور ایک دوسرے سے دور پہاڑیاں تھیں جو یوں لگتی تھیں جیسے سمندر میں جزیرے نمودار ہو گئے ہوں۔مشرقی سمت ان کی بلندی میں اضافہ ہو گیا تھا۔یہ نیلی بھوری تھیں جن پر نہ درخت تھے نہ سبزہ اور نہ زندگی کے آثار ہی۔قافلے ایک دوسرے کے پیچھے رواں دواں تھے۔ان کے ساتھ سینکڑوں ہزاروں اونٹ تھے۔ایک کے پیچھے ایک جانور۔ایک واحد قطار بن گئی تھی۔ان پر سائبان دار پلنگ تھے، حجاج تھے اور سامان تھا۔کبھی کبھی یہ پہاڑیوں کے پیچھے چھپ جاتے پھر دوبارہ سامنے آ جاتے تھے۔رفتہ رفتہ ان کے بہت سے راستے مڑ کر ایک ریتیلی سڑک میں آ ملے تھے۔یہ وہی راستہ تھا جسے ایسے ہی قافلوں نے صدیوں پر محیط سفر کے دوران تخلیق کیا تھا۔

کہیں صحرا کی مکمل خاموشی اونٹوں کے قدموں کی آواز سے ٹوٹ جاتی تھی تو کہیں بدو شتر بانوں کی آوازوں سے اور کہیں کہیں کسی دھیمی سُروں میں گاتے ہوئے کسی حاجی کے گیت سے۔مجھے اچانک ایک ڈراؤنے جوش وجذبے نے گھیر لیا تھا، ایک ایسا جذبہ جسے کشف کا نام دیا جا سکتا ہے۔میں نے اپنے آپ کو ایک ایسے پل پر دیکھا جس کی لمبائی ایک ان دیکھی خلیج پر محیط تھی۔یہ اتنا لمبا پل تھا کہ اس کے جس سرے سے میں اس پر آیا تھا وہ دور دھندلے فاصلے پر کھو گیا تھا اور اس کا دوسرا حصہ جو نظروں کے سامنے تھا اس کا آخری کنارہ ابھی تک نظروں سے اوجھل تھا۔میں اس کے درمیان تھا اور میرا مارے خوف کے برا حال تھا کیونکہ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ مجھے اسی مقام پر ہمیشہ معلق رہنا ہو گا۔اسی لمحے ایک مصری خاتون نے جو میرے اونٹ سے آگے والے اونٹ پر سوار تھی، اچانک ''لبیک اللھم لبیک'' کی آواز نکالی۔اس آواز نے میرے خواب کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔

ہر طرف سے لوگوں کی مختلف زبانوں میں باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔کبھی کبھی چند حجاج بیک وقت پکار اٹھتے تھے: ''لبیک اللھم لبیک''۔یا کوئی مصری عورت آنحضورؐ کی مدح میں چند اشعار پڑھنا شروع کر دیتی تھی۔کہیں کہیں سے ایسی آواز بھی آ جاتی تھی جو شادی بیاہ، بچے کی پیدائش، ختنے کے موقعہ پر، کسی مذہبی تہوار پر یا حج کے موقعہ پر عورت کے منہ سے نکلتی ہے۔ابتدائی زمانے میں جنگجو عربوں میں یہ رواج تھا کہ سرداروں کی بیٹیاں اپنے قبیلے کے مردوں کے ساتھ میدان جنگ میں جا کر بہادری وشجاعت سے لڑنے کے لیے ان کی ہمت وحوصلہ بڑھاتی تھیں (ان دوشیزاؤں میں سے کسی کو قتل کرنا انتہائی بے عزتی کی بات سمجھی جاتی تھی اور دشمن کے ہاتھوں گرفتار کر لیا جانا اس سے بھی زیادہ بری بات تصور ہوتی تھی)۔

زیادہ تر حجاج اونٹوں پر رکھے ہوئے سائبان والے پلنگوں میں سفر کرتے تھے۔ایک میں دو افراد سوار ہوتے تھے۔ہچکولے بہت لگتے تھے جس سے نیند بھی آتی تھی اور جسم بھی ٹوٹنے لگتا تھا۔ابھی کوئی مسافر سونے ہی لگتا تھا کہ جھٹکے سے جاگ جاتا تھا، وہ پھر سونے کی کوشش کرتا تو پہلے کی طرح دوبارہ جگا دیا جاتا تھا۔شتربان جو اپنے اونٹوں کے ساتھ ساتھ پیدل چلتے تھے، کبھی کبھی اونٹوں سے باتیں بھی کرنے لگتے تھے۔ان شتربانوں کی حدی خوانی بھی

Marfat.com

اونٹوں کے بڑا کام آتی تھی۔

صبح کے وقت ہم بحرہ پہنچے تھے جہاں ہمارا قافلہ دن بھر کے لیے رک گیا تھا۔اس لیے کہ گرمی صرف رات کو سفر کرنے کی اجازت دیتی تھی۔

یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، گنے چنے گھر، کافی شاپس، کھجور کے پتوں سے بنے ہوئے کچھ جھونپڑے اور ایک بہت ہی چھوٹی سی مسجد۔ یہ جدہ اور مکہ کے بیچ میں تھا اور ہر قافلہ یہاں ضرور رکتا تھا۔ خشکی پر منظر وہی تھا جو ساحل سے روانگی کے وقت پہلی بار آنکھوں نے دیکھا تھا۔صحرا اور اونچی نیچی پہاڑیاں اِدھر اُدھر بکھری ہوئیں۔ مشرق میں نیلگوں پہاڑ تھے جو ساحلی علاقے کو وسطی عرب کی سطح مرتفع سے جدا کر رہے تھے۔مگر اب یہ سارا صحرا جو ہمارے اردگرد تھا ایک بہت بڑا فوجی کیمپ دکھائی دیتا تھا جس میں ان گنت خیمے نصب تھے۔ اونٹ تھے، ان پر سائبان والے پلنگ تھے، بندھا ہوا سامان تھا۔ بہت سی زبانیں بولی جا رہی تھیں......عربی، ہندوستانی، ملائی، فارسی، صومالی، ترکی، پشتو، ایتھوپیا کی امہاری اور نہ جانے اور کون کون سی۔ یہ اقوام کا صحیح معنوں میں اجتماع تھا مگر سفید احرام میں ملبوس ہونے کی وجہ سے سارے امتیازات مٹ گئے تھے۔ یوں تمام اقوام ایک ہی قوم بن گئی تھیں۔

رات بھر سفر کرنے کے بعد حجاج تھک گئے تھے مگر چند ایک کو علم تھا کہ اس آرام کے وقت کا بہتر مصرف کیا ہو سکتا ہے۔ بہت سوں کے نزدیک سفر ایک معمول کے کام سے مختلف تھا اور بہت سے حجاج ایسے تھے جنھوں نے زندگی میں پہلی بار سفر کیا تھا اور سفر بھی کیسا تھا منزل پر پہنچانے والا سفر، جس کے سامنے دنیا بھر کے سفر ہیچ نظر آئیں۔ انہیں بے چینی تھی، انہیں لازمی طور پر اِدھر اُدھر پھرنا تھا، ان کے ہاتھوں کو واقعی کوئی کام تلاش کرنے کی ضرورت پیش آ رہی ہو گی خواہ اپنے تھیلوں کو کھولنا پھر بند کرنا ہی کیوں نہ ہو ورنہ تو ہر شخص یوں گم ہو جاتا جس طرح اس دنیا سے ماورا کی خوشی و مسرت سمندر میں گم ہو جائے۔

یہ سب کچھ اس خاندان کے ساتھ بیت چکا تھا جو میرے خیمے سے آگے والے خیمے میں مقیم تھا۔ یہ بنگال کے حجاج تھے۔ وہ خاموش، زمین پر پاؤں پھیلائے بیٹھے تھے۔ ان کی نگاہیں مشرق میں لگی ہوئی تھیں، مکہ مکرمہ کی سمت۔ وہ صحرا کو دیکھے جا رہے تھے جو گرمی سے جھلس رہا تھا! ان کے چہروں پر اس قدر اطمینان تھا جیسے وہ بیت اللہ کے روبرو کھڑے ہوں، مالک و خالق کے حضور میں۔ مرد بے حد خوبصورت تھے، دبلے پتلے، لمبے بالوں اور چمکتی ہوئی سیاہ داڑھیوں والے۔ ان میں سے ایک جو بیمار تھا وہ قالین پر لیٹا ہوا تھا، اس کے نزدیک دو نوجوان خواتین بیٹھی تھیں۔ اپنے سرخ اور نیلے پائجاموں میں یہ چھوٹے چھوٹے رنگین پرندے لگ رہی تھیں۔ ان کے گھنے سیاہ بال زمین کو چھو رہے تھے۔ ان دو میں سے جو چھوٹی تھی اس کی ناک میں سونے کی نتھ تھی۔

اسی روز بعد دوپہر بیمار چل بسا تھا۔ ان عورتوں نے کوئی نوحہ بلند نہیں کیا تھا جس طرح کہ مشرق میں عموماً عورتیں کرتی ہیں۔ یہ اس لیے کہ مرنے والا حج کے سفر کے دوران مرا تھا۔ مقدس سرزمین پر اس نے جان دی تھی اور بخش دیا گیا تھا۔ اسے نہلا کر اسی چادر میں کفنایا گیا تھا جو اس کا آخری لباس تھا۔ اس کے بعد ان میں سے ایک شخص خیمے

Marfat.com

کے سامنے کھڑا ہو کر اعلان کر رہا تھا کہ متوفی کا جنازہ رکھا ہوا ہے، سب بھائی آئیں اور نماز جنازہ میں شامل ہو جائیں۔ احرام میں ملبوس حجاج ہر چہار جانب سے پلک جھپکنے میں اُمڈ آئے تھے اور ایک امام کے پیچھے صف آرا ہو گئے تھے جیسے کسی عظیم فوج کے سپاہی اپنے کمانڈر کے پیچھے صف آرا ہوتے ہیں۔ نماز جنازہ پڑھائی جا چکی تھی...... متوفی کے لیے قبر تیار تھی۔ ایک بوڑھے شخص نے قرآن پاک کی چند آیات تلاوت کیں اور اس مرنے والے حاجی کو لحد میں اتار دیا گیا تھا۔ اسے اس طرح کروٹ کے بل لٹایا گیا تھا تاکہ اس کا چہرہ مکہ کی طرف رہے۔

مکہ مکرمہ: دوسری صبح سورج نکلنے سے قبل صحرائی میدان تنگ ہو گیا تھا۔ پہاڑیاں ایک دوسرے کے قریب آ گئی تھیں۔ اب ہم ایک گھاٹی میں سے گزر رہے تھے۔ ہمیں صبح کے دھندلکے میں مکہ کی عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ طلوع آفتاب کے ساتھ ہم اس شہر مقدس کی گلیوں میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں کے مکانات جدہ کے مکانوں سے ملتے جلتے تھے جن میں کھڑکیاں اور بالکونیاں تھیں۔ البتہ جس پتھر سے یہ تعمیر کیے گئے تھے وہ پتھر زیادہ بھاری تھے۔ ابھی سورج نکلا ہی تھا مگر گرمی کی شدت ابھی سے محسوس ہو رہی تھی۔ بہت سے گھروں کے سامنے بنچ رکھے ہوئے تھے جن پر تھکے ماندے لوگ سو رہے تھے۔ کچی گلیاں تنگ سے تنگ ہوتی جا رہی تھیں اور ہمارا قافلہ شہر مقدس کے مرکز کی جانب بڑھ رہا تھا۔ حج کا مبارک موقعہ چند دنوں کے فاصلے پر تھا۔ گلیوں میں لوگوں کے ہجوم بڑھتے جا رہے تھے۔ بیشمار حجاج تو احرام میں تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے عارضی طور پر روزمرہ کا لباس پہن رکھا تھا۔ اسلامی دنیا کے مختلف ملکوں سے آئے ہوئے حجاج کا اپنا اپنا لباس تھا۔ سقے پانی کے بھاری مشکیزوں تلے دبے جا رہے تھے۔ کچھ نے پرانے پٹرول کے دو دو کنستر اٹھا رکھے تھے۔ گدھوں پر بھی پانی کے کنستر لدے ہوئے تھے۔ گدھوں کے گلے میں گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور مخالف سمت سے اونٹ آ رہے تھے جن کی پیٹھ پر سائبان دار خالی پلنگ تھے، کیونکہ حجاج ان میں سے اتر آئے تھے۔ گلیوں میں ہجوم دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے صدیوں بعد یہ حج آیا ہو جہاں لوگ دنیا بھر سے طویل عرصے بعد حاضر ہوئے ہیں۔ ہمارا قافلہ اب بکھر گیا تھا۔ اونٹ کہیں، حجاج کہیں اور سامان کسی اور جگہ اور شتربان ہر نظم اور ترتیب سے آزاد۔ شور وغل اتنا کہ قریب کھڑے ہوئے ساتھی کی آواز سنائی نہ دے۔

میں نے جدہ ہی میں یہ انتظام کر لیا تھا کہ ہم ایک مشہور مطوف کے گھر پر رہیں گے جو حجاج کا گائیڈ بھی تھا اور حسن عابد کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ میں حیران تھا کہ اس افراتفری میں اس کو ہم کہاں تلاش کریں گے، اس کا گھر کیسے ڈھونڈ پائیں گے۔ پھر اچانک ایک آواز آئی:

''حسن عابد! آپ کے حجاج کہاں ہیں؟''...... میں نے دیکھا کہ جس طرح ایک جن بوتل میں سے برآمد ہوتا ہے ایک نوجوان ہمارے سامنے تھا۔ اس نے ہمیں جھک کر السلام علیکم کہا اور اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کر کے چل پڑا تھا۔ حسن عابد نے اسے بھیجا تھا کہ وہ ہمیں اس کے گھر پر پہنچا دے۔

ہمارے مطوف نے نہایت عمدہ ناشتہ کرایا جس کے بعد میں اس نوجوان کے ہمراہ باہر چلا گیا تھا، جس نے ہمیں اس گھر تک پہنچایا تھا۔ ہماری اس وقت منزل مسجد حرام تھی۔ ہم بارونق گلیوں میں سے گزر رہے تھے۔ لوگوں کا

Marfat.com

ایک ہجوم تھا۔ قصابوں کی دکانوں پر بھیڑ کا گوشت لٹک رہا تھا۔ سبزی فروشوں نے زمین پر چٹائیاں بچھا کر سبزیاں چن رکھی تھیں۔ مٹی اڑ رہی تھی۔ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ پسینے سے ہر شخص کا برا حال تھا۔ پھر ہم ایک بہت تنگ بازار میں سے گزرے جو چھتا ہوا تھا اور جہاں صرف کپڑوں کی دکانیں تھیں۔ مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے بازاروں کی مانند یہاں بھی دکانیں زمین سے ایک گز اونچی تھیں۔ دکاندار خود تو آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے تھے جبکہ ان سے اوپر اسلامی دنیا کے مختلف ممالک کے لوگوں کے لباس لٹکے ہوئے تھے۔

تمام نسلوں اور قوموں کے لوگ یہاں جمع تھے۔ کچھ کے سروں پر پگڑیاں تھیں، کچھ ننگے سر تھے، کچھ کی داڑھیاں تھیں، کچھ نے شیو کرا رکھی تھی۔ چند ایک کے ہاتھوں میں تسبیح تھی باقی خالی ہاتھ تھے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کسی سمت جا رہے تھے۔ صومالیہ کے باشندوں کا جسم ان کے لباس کے اندر سے تانبے کی طرح چمک رہا تھا۔ عربی جوان درون عرب سے آئے تھے، دبلے پتلے تھے مگر بخارا کے ازبک بھاری جثوں والے تھے جنہوں نے مکہ کی سخت گرمی میں بھاری چوغے اور گھٹنوں تک اونچے چمڑے کے بوٹ پہن رکھے تھے۔ جاوا کی جوان لڑکیوں کے کشادہ چہرے اور بادامی آنکھیں تھیں۔ مراکشی آہستہ آہستہ چلتے تھے اور سفید لبادوں میں بڑے پُر وقار معلوم ہوتے تھے۔ ان کے سروں پر عجیب سی چھوٹی چھوٹی ٹوپیاں ہوتی تھیں جو وہ سر کے بالکل وسط میں اوڑھتے تھے۔ مصریوں کے چہرے ہشاش بشاش تھے۔ سفید لباس پہنے ہوئے ہندوستانی اپنی آر پار ہو جانے والی سیاہ آنکھوں سمیت، سفید پگڑیوں میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے اور ہندوستانی عورتیں اپنے خاص قسم کے سفید برقعوں میں یوں لگتی تھیں جیسے چلنے والے خیمے ہوں۔ ٹمبکٹو کے حبشی نیلے لباسوں میں سروں پر سرخ ٹوپیاں لیے پھرتے تھے اور چینی عورتیں ایسی تتلیاں لگتی تھیں جن پر کشیدہ کاری کی گئی ہو۔ وہ چلتی اس طرح تھیں جس طرح غزالاں۔ ہر سمت آوازوں کی گونج تھی۔ بیشمار زبانیں بولی جا رہی تھیں۔ خوشی و مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ پھر ہم نے دیکھا کہ ہم حرم پاک کے ایک دروازے پر کھڑے ہیں۔ یہ تین محرابوں والا دروازہ تھا جس میں پتھر کی سیڑھیاں اس تک پہنچ رہی تھیں۔ ایک طرف ایک ہندوستانی بھکاری بیٹھا ہوا تھا، لباس سے آزاد، نیم برہنہ۔ اس نے بھیک مانگنے کے لیے ہاتھ ہماری طرف پھیلایا۔ مجھے اب خانہ کعبہ کی عمارت صاف نظر آ رہی تھی۔ ایک چوکور میدان ہے جس کے چاروں طرف بیشمار ستونوں والے حجرے اور نیم دائرے کی شکل میں بنی ہوئی محرابیں تھیں۔ مرکز میں ایک مخروطی شکل کی چالیس فٹ اونچی عمارت تھی جو سیاہ غلاف میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس غلاف کے نصف بالائی حصے پر سنہری حروف میں قرآن پاک کی آیات کاڑھی گئی تھیں   یہ کعبہ تھا

یہ کعبہ تھا، وہی کعبہ جو کروڑوں مسلمانوں کی آرزوؤں کا صدیوں سے مرکز رہا تھا۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے بے شمار حجاج نے ایک زمانے سے بڑی بڑی قربانیاں دی تھیں۔ بہت سے راستے میں انتقال کر گئے تھے۔ بہت سے یہاں پہنچ تو گئے تھے مگر بڑی محرومیوں کے بعد۔ یہ چوکور عمارت ان کی آرزوؤں کا مرکز رہی تھی جہاں تک پہنچ جانا ان آرزوؤں کی تکمیل تھی۔

یہ مکعب شکل میں ہے (جیسا کہ اس کے عربی نام سے ظاہر ہے) جس پر سیاہ غلاف چڑھا ہوا ہے۔ ایک

Marfat.com

خاموش جزیرہ ہے جو مسجد کے ایک مربع میدان کے اندر کھڑا ہے اور دنیا بھر میں شاید ہی اس قدر خاموش کوئی اور عمارت ہوگی۔ یوں لگتا ہے جیسے جس کسی نے سب سے پہلے کعبہ تعمیر کیا تھا، حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے لے کر اب تک اس کا بنیادی ڈھانچہ اسی شکل میں بار بار تعمیر ہوتا رہا ہے۔ بنانے والے نے اسے انسان کی اپنے خالق کے سامنے عجز و انکساری کی مثال کے طور پر بنایا تھا اور معمار ضرور یہ جانتا تھا کہ فن تعمیر کی خوبصورتی کی کوئی مثال بھی اپنی جامعیت میں، خواہ وہ عمارت کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو، اس مکعب نما عمارت کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

میں نے کئی اسلامی ممالک میں ایسی مساجد دیکھی ہیں جن میں عظیم صناعوں کے ہاتھوں نے فن تعمیر کے شاہکار تخلیق کر دیئے ہیں۔ میں نے شمالی افریقہ میں بھی مساجد دیکھی تھیں، سنگ مرمر کی بنی ہوئیں، استنبول کی عالیشان عمارات بھی دیکھیں اور ایشیائے کوچک میں بصرہ کی عمارتیں بھی، ایران کی مسجد صفوی بھی دیکھی، سنگ مرمر، کئی رنگوں کی ٹائلیں، پچی کاری سے مزین، چاندی کی گل کاری والے دروازے، اونچے اونچے مینار، سنگ مرمر سے ڈھکی ہوئی مربع عمارتیں جن میں پانی کے چشمے بھی تھے اور برسوں پرانے کیلے کے درخت بھی۔ میں نے سمرقند میں تیمور لنگ کی مساجد کے کھنڈرات بھی دیکھے جو اس حالت میں بھی شاندار نظر آتے تھے۔

یہ ساری عمارتیں اور مساجد دیکھنے کے باوجود میں نے اپنے آپ کو کسی عمارت کے سامنے اس قدر مضبوط محسوس نہیں کیا تھا جس قدر مضبوط میں خانہ کعبہ کے سامنے کھڑا محسوس کر رہا تھا۔ معمار کا ہاتھ اس کے مذہبی تصور کے اس قدر قریب آ گیا تھا۔ ایک مکعب نما عمارت کی مکمل سادگی اور ہیئت کی تمام خوبصورتی اس خیال کی ترجمانی کر رہی تھی: ''انسان اپنے ہاتھوں سے جس قدر خوبصورتی تخلیق کرنا چاہے کر ڈالے۔ یہ محض ایک تصور ہوگا جو خدا کا عطا کردہ ہے، اس لیے انسان جس قدر بھی سادگی کے ساتھ تصور کر سکتا ہے اسی قدر زیادہ وہ خدا کی عظمت کا اظہار کر سکتا ہے۔'' ایسا ہی ایک احساس اہرام مصر کی ریاضیاتی سادگی کا اظہار کرنے کا ذمہ دار تھا۔ حالانکہ وہاں انسان کے تصور نے حیرت انگیز جہتوں میں ایک ایسا اظہار تلاش کر لیا ہوگا جو اس نے اپنی عمارت کو دیا۔ مگر یہاں کعبہ میں، عمارت کا سائز بھی انسانی لاتعلقی اور سر تسلیم خم کر دینے کا اظہار کر رہا تھا۔ اس عمارت کی قابل ناز عجز و انکساری کا روئے زمین پر ثانی نہیں تھا۔

کعبہ میں داخلہ کا ایک ہی راستہ ہے، شمال مشرقی سمت ایک دروازہ جس پر چاندی کا غلاف چڑھا ہوا ہے جو زمین سے سات فٹ کی اونچائی پر ہے تاکہ اس کے اندر داخل ہونے کے لیے لکڑی کی سیڑھی استعمال کی جا سکے۔ سال کے کچھ دنوں میں یہ دروازہ کھلتا ہے۔ کعبہ کے اندر کا حصہ جو اکثر بند ہی ہوتا ہے (جسے میں نے بعد میں ایک موقعہ پر دیکھا تھا) بہت سادہ سا ہے۔ فرش اس کا سنگ مرمر کا ہے جس پر چند قالین بچھے ہوئے ہیں اور چھت سے چراغ لٹک رہے ہیں۔ لکڑی کے شہتیر اس چھت کو سہارا دیئے ہوئے ہیں۔ دراصل کعبہ کے اس اندرونی حصے کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں اس لیے کہ جہاں تک تقدس کا تعلق ہے وہ تو پوری عمارت کو حاصل ہے جو ''قبلہ'' ہے۔ وہ سمت جس طرف منہ کر کے دنیا بھر کے مسلمان نماز ادا کرتے ہیں۔ اللہ کی وحدانیت کی یہ ایک علامت ہے جس جانب منہ کر کے اسلامی دنیا کے کروڑوں مسلمان دن میں پانچ وقت کی نماز ادا کرتے ہیں۔

Marfat.com

خانہ کعبہ کے مشرقی کونے میں ایک سیاہ پتھر نصب ہے جسے حجر اسود کہتے ہیں۔اس پر کوئی شے ڈھانپنے والی نہیں اور یہ چاندی کے ایک فریم میں گھرا ہوا ہے۔اس سیاہ پتھر کو صدیوں سے حجاج کی بہت سی نسلیں بوسہ دیتی چلی آ رہی ہیں۔غیر مسلموں میں اس پتھر سے متعلق بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں جن کے خیال میں یہ کوئی طلسماتی شے تھی جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے کے کفار سے ایک رعایت کے طور پر حاصل کی تھی۔مگر اس میں کوئی صداقت نہیں۔ کعبہ ایک عزت واحترام والی عمارت ہے، پرستش والی نہیں۔اسی طرح حجر اسود بھی کوئی ایسی چیز نہیں جس کی پوجا کی جائے۔یہ قابل احترام اس لیے ہے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کے کعبہ کی اصل عمارت کی یہ ایک یادگار ہے اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر اسے بوسہ دیا تھا اس لیے آج تک حجاج اسے آنحضورؐ کی تقلید میں بوسہ دیتے چلے آ رہے ہیں۔وہ جانتے تھے کہ ان کے بعد مومنین کی نسلیں ان کی چھوڑی ہوئی اس مثال کی تقلید کریں گی۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ حجر اسود پر جہاں آپؐ نے اپنے ہونٹ مبارک رکھے تھے، وہاں آنے والے تمام حجاج اپنے ہونٹ رکھ کر علامتی طور پر ان ہونٹوں کو بھی حجر اسود کے ساتھ بوسہ دیا کریں گے۔حجاج جب حجر اسود کو بوسہ دیتے ہیں تو آنحضورؐ کا اسے دیا ہوا بوسہ انہیں یاد ہوتا ہے۔

کسی بھی مسلمان کو اس حقیقت سے انکار نہیں کہ کعبہ آنحضورؐ سے بہت پہلے بھی یہاں موجود تھا۔بیشک اس کی اہمیت اس حقیقت میں مضمر ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ کسی نئے مذہب کے بانی ہیں۔اس کے برعکس اسلام، قرآن کے مطابق ''انسان کا فطری میلان ہے۔خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا نام ہے'' اور یہ انسانی آگہی کی ابتدا سے چلا آ رہا ہے۔یہ وہی مذہب تھا جس کی تعلیم حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور خدا کے تمام پیغمبر دے رہے تھے...... قرآن کا پیغام البتہ آخری وحی الٰہی تھی۔ایک مسلمان کو اس سے بھی انکار نہیں کہ کعبہ بتوں سے بھرا ہوا تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل پُراسرار قوتوں نے انہیں توڑ دیا تھا جس طرح موسیٰ نے سنائی (Sinai) پر سونے کے بچھڑے کو توڑ دیا تھا۔جس وقت یہ بت کعبے میں ابھی نہیں لائے گئے تھے اس سے بہت پہلے حقیقی خدا کی یہاں عبادت ہوتی تھی۔چنانچہ آنحضورؐ نے حضرت ابراہیمؑ کے معبد کو اس کے اصل مقصد کی جانب لوٹا دیا تھا۔

اور میں اسی حضرت ابراہیمؑ کے معبد کے سامنے کھڑا تھا۔میں اس کی شاندار عمارت کی جانب بغیر کچھ سوچے سمجھے (اس لیے کہ خیالات اور تصورات بہت بعد میں آئے تھے) دیکھے جا رہا تھا۔پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی چھپی ہوئی، مسکراتی ہوئی گٹھلی میں سے جو میرے اندر موجود تھی، ایک فرحت وشادمانی کسی گیت کی مانند ابھر آئی تھی۔

صاف وشفاف سنگ مرمر کی سلوں میں سے سورج کی روشنی منعکس ہو رہی تھی جس نے کعبہ کے گرد ایک وسیع دائرے میں زمین کو ڈھانپ لیا تھا۔ان سنگ مرمر کی سلوں پر بہت سے لوگ، مرد، عورتیں سیاہ غلاف میں ڈھکے ہوئے خانہ خدا کے گرد چکر لگاتے رہتے تھے۔ان میں وہ بھی تھے جو رو رہے تھے اور وہ بھی جنہوں نے اللہ سے گڑگڑا کر

Marfat.com

دعائیں مانگی تھیں...... بہت سے ان میں ایسے بھی تھے جن کے پاس الفاظ نہیں تھے، اشک نہیں تھے مگر یہ سر جھکائے خاموش چلتے رہتے تھے۔

یہ حج کا حصہ ہے کہ کعبے کے گرد طواف کرتے ہوئے سات چکر لگانے ہوتے ہیں۔ صرف اسلام کی اس جائے حرمت کے لیے عزت واحترام دکھانے کے لیے نہیں بلکہ اسلامی زندگی کے بنیادی تقاضے کو یاد کرتے ہوئے۔ کعبہ خدا کی وحدانیت کی علامت ہے اور حجاج کا جسمانی طور پر اس کے گرد چکر لگانا انسانی سرگرمی کا علامتی اظہار ہے جس سے مراد یہ ہے کہ نہ صرف ہمارے خیالات اور جذبات بلکہ وہ تمام جو''داخلی زندگی'' کی اصطلاح میں شامل ہے وہ بھی اور ہماری خارجی، سرگرم زندگی، ہمارے اعمال اور عملی تگ ودو میں خدا کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔

اور میں بھی آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور کعبہ کے گرد جاری طواف کا حصہ بن گیا تھا۔ کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا کہ کوئی مرد یا عورت میرے قریب ہے۔ الگ الگ تصاویر میری نظروں کے سامنے گھومتی دکھائی دیں اور پھر غائب ہوگئیں۔ ایک دیوقامت حبشی سفید احرام میں ملبوس جس کی مضبوط سیاہ کلائی کے گرد ایک چوبی تسبیح ایک زنجیر کی مانند لٹک رہی تھی، ایک بوڑھا جس کا تعلق ملایا سے تھا تھوڑی دیر کے لیے میرے قریب آیا۔ اس نے اپنے دو بازو پیچھے باندھ رکھے تھے۔ ایک بھوری آنکھوں والا جس کی بھنویں بہت گھنی تھیں دکھائی دیا۔ معلوم نہیں یہ کس ملک سے تھا۔ بہت جلد ہجوم میں گم ہوگیا تھا۔ حجر اسود کے سامنے حجاج کا ہجوم تھا جن کے درمیان ایک ہندوستانی عورت بھی تھی۔ وہ بیمار دکھائی دیتی تھی۔ اس کا چہرہ نازک سا تھا اور کوئی عجیب سی آرزو اس کے دل میں مچل رہی تھی، جو دیکھنے والوں کو نظر آتی تھی، اسی طرح جیسے مچھلی میں زندگی نظر آتی ہے۔ اس کے ہاتھ، زرد ہتھیلیوں سمیت کعبہ کی جانب پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا یہ بے لفظ اور خاموش دعاؤں میں اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔

میں چلتا ہی گیا، کئی منٹ گزر گئے تھے اور میرے دل میں سے ہر وہ شے جو تلخ اور چھوٹی تھی، نکل چکی تھی۔ میں طواف کعبہ میں مصروف ٹیم کا حصہ بن گیا تھا۔ کیا یہ اس کا مطلب تھا جو ہم کر رہے تھے: اس بات سے باخبر ہونا کہ ہر کوئی محوری حرکت کا حصہ ہے یا یہ ہماری ساری پریشانی کا اختتام تھا؟ اور اب منٹ تحلیل ہو رہے تھے: وقت ٹھہر گیا تھا اور یہ کائنات کا مرکز تھا......

9 دن بعد ایلسا وفات پا گئی تھی۔ وہ گرمی کی وجہ سے ایک ہفتے سے بھی کم بیمار رہی اور جب میں اسے ہسپتال لے گیا تو شامی ڈاکٹر جو اس ہسپتال میں کام کرتے تھے بے بس کھڑے تھے۔ میرے گرد اندھیرا اور مکمل مایوسی مزید قریب ہوگئے تھے۔

اسے مکہ مکرمہ کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا۔ اس کی قبر پر ایک لوح قبر لگا دی گئی تھی۔ میں اس پر کچھ بھی کندہ نہیں کروانا چاہتا تھا۔ اس بارے سوچنے کا مطلب تھا مستقبل کے بارے میں سوچنا اور میں اب کسی مستقبل کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔

ایلسا کا چھوٹا بیٹا احمد میرے ساتھ ایک سال سے زیادہ عرصے تک رہا اور اس نے اندرون عرب میرے

Marfat.com

ساتھ سفر بھی کیا تھا۔اس کی عمر دس برس تھی۔ کچھ عرصے بعد مجھے اس سے بھی جدا ہونا پڑا کیونکہ اس کے ننھیال کا خیال تھا کہ اسے یورپ میں تعلیم کے لیے بھیج دیا جائے۔اب میرے ساتھ ایلسا کی یاد کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔اور اگر مزید کچھ تھا تو وہ مکہ کے قبرستان میں اس کی قبر پر لگا ہوا پتھر تھا۔ایک اندھیرا تھا جس نے کافی عرصے تک میرا ساتھ نہ چھوڑا حالانکہ میں نے وقت کی قید سے آزاد اپنے آپ کو عرب کی آغوش میں ڈال دیا تھا۔

عرفات کی یاد: یہاں سے زیادہ دور نہیں جہاں وادیوں اور پہاڑیوں کے زندگی سے خالی اس ویرانے میں عرفات کا میدان واقع ہے۔یہ وہ مقام ہے جہاں سال میں ایک روز وہ تمام حجاج جو مکہ آتے ہیں، جمع ہوتے ہیں۔یہ اس اجتماع کی یاد تازہ کرتا ہے جب روز محشر انسان اپنے خالق کے سامنے ان تمام اعمال کا حساب دے گا جو اس نے دنیا کی اس زندگی میں کیے تھے۔میں خود بھی سفید احرام میں ملبوس ان حجاج کے اجتماع کے درمیان، احرام پہنے، ننگے سر یہیں کئی بار کھڑا ہوا تھا جن کا تعلق دنیا کے تین براعظموں سے تھا۔ہمارے چہرے جبل رحمت کی سمت تھے۔ہم دوپہر کو یہاں اس انتظار میں کھڑے رہتے تھے کہ ہم پر قیامت کا وہ دن منعکس ہو جائے گا جس سے کسی بھی بشر کو مفر نہ تھا۔جس روز ہر کسی کا پوری زندگی کا اعمال نامہ اس کے سامنے آجانا ہے اور ہمارا کوئی راز چھپا ہوا نہ رہے گا۔

میں جس وقت پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا تھا اس وقت میں نیچے میدان کی طرف دیکھ رہا تھا جو وہاں نظر نہیں آرہا تھا تاہم چاندنی میں ڈوبا ہوا ایک خوبصورت منظر میرے سامنے تھا۔وہی سرزمین جہاں ایک لمحہ پہلے مردنی چھائی ہوئی تھی اچانک انسانوں کے اجتماع سے زندہ ہوگئی تھی۔مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تیرہ سو سال کے دوران مکہ اور عرفات کے درمیان سفر کرنے والے کروڑوں انسانوں، مردوں اور عورتوں کی آوازوں سے فضا گونج اٹھی ہو۔انسانی آوازیں، ان کے قدموں اور ان کے جانوروں کے قدموں کی آوازیں جاگ اٹھی تھیں اور ازسرنو کانوں میں آنی شروع ہوگئی تھیں۔ میں تصور ہی تصور میں انہیں چلتا پھرتا، اونٹوں پر سوار اور جمع ہوتا دیکھ رہا تھا۔تیرہ سو سال کے دوران آنے والے حجاج کا جم غفیر تھا۔مجھے ان کے گزرے دنوں کی چاپ بھی سنائی دے رہی تھی۔ایک ہی دین کے پروں پر اڑ کر یہ لوگ یہاں جمع ہوتے رہے۔صدیوں بعد زندگی کا گرم لمس محسوس ہو رہا تھا۔ان کے مضبوط پروں کے پھڑ پھڑانے نے مجھے بھی ان کے محور میں کھینچ لیا تھا اور میرے اپنے گزرے دن ماضی سے حال میں داخل ہوگئے تھے اور میں ایک بار پھر اس میدان میں سوار پھر رہا تھا۔

سفید احرام میں ملبوس ہزاروں بدوؤں کے درمیان جو عرفات سے مکہ لوٹ رہے تھے، میں بھی اس میدان میں سرپٹ دوڑتے جانور پر سوار تھا۔ساندنیاں دوڑ رہی تھیں، ان پر حجاج سوار تھے، رنگ برنگے پرچم بانسوں پر بندھے ہوئے فضا میں لہرا رہے تھے۔یہ پھڑ پھڑ کرتے تو لگتا جیسے نقارے بج رہے ہوں۔قبائلی جنگوں کے درمیان گائے جانے والے گیت ہوا میں بلند ہو رہے تھے۔ہم اونٹوں پر سوار تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے بلکہ میدان عرفات میں اڑ رہے تھے۔مجھے تو یوں لگتا تھا جیسے ہم ہوا کے سنگ اڑے جا رہے ہیں اس ہوا کے سنگ جس میں ایسی خوشی و

Marfat.com

مسرت شامل ہوگئی ہیں جس کا نہ کوئی کنارہ ہے نہ حد...... اتنے میں ہوا نے میرے کانوں میں خوشی کے کسی نغمے کے یہ الفاظ ڈال دیئے تھے: ''کبھی نہیں، دوبارہ کبھی نہیں، تم آئندہ کبھی ایک اجنبی نہیں رہو گے!''

میں دائیں اور میرے بائیں میرے بھائی تھے۔ میں انہیں جانتا نہیں تھا مگر پھر بھی وہ میرے لیے اجنبی نہ تھے...... ہماری تلاش ایک ہی تھی، ایک ہی مسرت و شادمانی کی تلاش۔ ہم سب ایک ہی منزل کی تلاش میں تھے۔ وسیع دنیا ہمارے سامنے پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے دلوں میں وہی چنگاری روشن ہے جو آنحضورؐ کے صحابہ کرامؓ کے دلوں میں جلتی تھی۔ وہ میرے دائیں اور بائیں کے سب بھائیوں کو جانتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان میرے بھائیوں سے جس کی توقع تھی، وہ پوری نہیں ہو رہی اور صدیوں کے گزر جانے کے بعد ان کے دل چھوٹے پڑ گئے ہیں مگر تکمیل کا جو وعدہ ان سے کیا گیا تھا، نہ ان سے لیا گیا ہے نہ ہم سے......

پھر جم غفیر کے درمیان میں سے کوئی اپنے قبیلے کی چیخ ترک کر کے عقیدہ ایمان کی چیخ مارتا ہے: ''ہم اس کے بھائی ہیں جو اپنے اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر لیتا ہے۔'' ایک دوسرا اس آواز میں ایک اور آواز شامل کرتا ہے: ''اللہ اکبر''۔ اللہ عظیم ہے، صرف اللہ عظیم ہے۔

اور پھر تمام قبیلے یہی ایک آواز نکالتے ہیں۔ وہ اب نجدی بدو نہیں رہ جاتے جنہیں اپنے قبیلے پر کبھی بڑا غرور تھا۔ اب وہ ایسے انسان ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ اللہ کے اسرار ان کے منتظر ہیں...... ہمارے منتظر ہیں...... ہزاروں اونٹوں کے قدموں کی آواز اور سینکڑوں پرچموں کے پھڑ پھڑانے کی آواز کے درمیان ایک ہی آواز بلند ہوتی ہے: ''اللہ اکبر!'' یہ لوگ اپنی چھوٹی زندگیوں سے کہیں بڑے ہو گئے ہیں اور ان کی قوت ایمانی انہیں بہا کر آگے لے جاتی ہے۔ وہ ایک واحد جسد کی شکل اختیار کر چکے ہیں...... اب ان کی آرزو نہ چھوٹی رہتی ہے نہ پوشیدہ۔ تکمیل کی گھڑی آن پہنچی ہے اور انسان اللہ کی عطا کردہ خوشی و مسرت، علم جو آزادی ہے، کے سہارے آگے بڑھتا ہے ایک ایسے کرۂ ارض میں جس کی کوئی حد نہیں ہیں۔

سانڈنیوں کے جسموں کی بو، تھکن سے ان کے منہ سے نکلنے والی آواز، ان کے قدموں کی آواز کا شور، انسانوں کے چلانے کی صدائیں، زینوں کی کھونٹیوں سے لٹکتی ہوئی بندوقیں، گرد و غبار کا پسینہ اور میرے اردگرد کے انسانوں کے خوشی سے دمکتے چہرے اور ایک اچانک پیدا ہونے والی خوشی کا سکوت جو میرے اندر تھا...... میں ان سب کو ساتھ لیے چلا جا رہا تھا۔

میں اپنی کاٹھی میں بیٹھے بیٹھے پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے ہزاروں حجاج سفید احرام میں ملبوس، اونٹوں پر سوار ہاتھ ہلاتے نظر آتے ہیں اور ان سب سے آگے وہ پل ہے جس پر سے گزر کر میں آیا ہوں: اس کا آخری کنارہ تو بالکل میرے پیچھے ہے مگر اس کا شروع کا کنارہ فاصلوں کی دھند میں گم ہو چکا ہے۔

(در: مکہ مکرمہ کے ہزار راستے، ۱۰۵۰ء-۱۹۹۰ء۔ تدوین و تعارف مائیکل وُلف۔ مترجم ڈاکٹر تصدق حسین راجا، لاہور ۲۰۰۴ء، ص ۴۴۹-۴۷۴)۔

Marfat.com

محمد اسد/مترجم: محمد حنیف ندوی

روحِ سُنّت

(علامہ محمد اسد مغربی نومسلم ہیں۔آپ ۱۹۰۰ء میں بمقام لواؤ (جو پہلے آسٹریا میں تھا اور اب پولینڈ میں ہے) ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوئے۔بائیس برس کی عمر میں شرق الاوسط کی سیر وسیاحت کا شوق چرایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انہیں مشرقی ممالک اور بالخصوص اسلامی حکومتوں کی سیر کا اتفاق ہوا۔ بعدازاں مختلف اخبارات اور خبر رساں اداروں میں نامہ نگار صحافی کی حیثیت سے عرصہ تک کام کیا۔ اس سلسلے میں دوبارہ شرق الاوسط کی سیاحت کی --اور اسلامی حکمرانوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔اس اثناء میں اسلام کا مطالعہ کیا تو اسلام کی خوبیاں دیکھ کر اس مقدس مذہب کی آغوش میں پناہ لی۔سلطان عبدالعزیز بن سعود' شاہ ایران رضا شاہ پہلوی اور سنوسی سے خاصے مراسم پیدا ہو گئے تھے۔
حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد قرآن وحدیث کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔ایک عرب خاتون منیرہ سے شادی کی۔ برصغیر ہندوپاک میں عرصہ تک قیام کیا۔عرصہ ہوا ''صحیح بخاری'' کا انگریزی میں ترجمہ شروع کیا تھا' جس کے چند پارے زیور طباعت سے آراستہ بھی ہو چکے ہیں۔ان کی تصنیفات میں ایک معرکۃ لآرا کتاب ''اسلام ایٹ دی کراس روڈز'' (Islam at the Crossroads) اہل علم میں مشہور ومتداول کتاب ہے۔اس میں سنت کی اہمیت اور ضرورت پر نہایت عمدہ اور جچی تلی بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب اپنے مندرجات کے اعتبار سے اس لائق ہے کہ ہر پڑھا لکھا شخص اس کو اپنے مطالعہ میں رکھے۔حال ہی میں یہ عرفات پبلیکیشنز' ۵۱۰-عمر دین روڈ' وسن پورہ لاہور نے بڑی محنت سے شائع کی ہے۔ یہ مضمون اسی کتاب کا ایک حصہ ہے اور اس کا ترجمہ مولانا محمد حنیف ندوی نے کیا ہے۔مولانا اور اسد صاحب کئی سال اکٹھے ادارہ افکار اسلامی کی تعمیر نو میں کام کرتے رہے ہیں اور اسد صاحب کے اسلوب وانداز کی خوبیوں سے مولانا خوب واقف ہیں۔اسد صاحب کے اس

Marfat.com

مضمون کی افادیت مولانا کے ترجمہ سے دوچند ہوگئی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد اسد صاحب یو این او میں پاکستان کے ثانوی نمائندہ مقرر ہوئے۔ قیام امریکہ کے دوران میں پولہ حمیدہ سے شادی کی اور ایک نئی کتاب ''روڈ ٹو مکہ'' (Road to Mecca) ۱۹۵۴ء میں امریکہ سے شائع کی۔ آج کل لبنان میں قیام فرما ہیں اور بفضل خدا دامن اسلام مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔ بڑے پُر جوش اور مخلص مسلمان ہیں۔ کتاب و سنت کے دلدادہ ہیں اور عاشق ہیں۔)

سنت اپنے باطنی اور روحانی پہلو کے نقطہ نظر سے بھی اسی درجہ اہمیت رکھتی ہے جس درجہ کو اپنے ظاہری پہلو کے لحاظ سے۔ ظاہری پہلو سے ہماری مراد اس کے اسناد کی تاریخی استواری ہے اور یہ وہ شے ہے جسے ہم شرعی یا اس کی آئینی وفقہی حیثیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ سنت کی پیروی واطاعت کو اتنا ضروری کیوں سمجھا جاتا ہے کہ اس کے بغیر اسلامی زندگی کا صحیح مفہوم ہی متعین نہ ہو سکے۔ کیا اسلام تک رسائی حاصل کرنے کا اس کے سوا اور کوئی طریق نہیں کہ ہم اعمال و عادات اور اوامر ونواہی کے ایک وسیع وعریض سلسلہ کو ماننے پر مجبور ہوں جبکہ اس میں بعض نہایت معمولی باتیں بھی ہوسکتی ہیں جو سنت سے ماخوذ و مستفاد ہوں۔ یہ مانا کہ آنحضرت صلعم بہت بڑے انسان تھے' لیکن ان کی زندگی کے ہر ہر گوشہ کی تقلید واطاعت کے کہیں یہ معنی تو نہیں کہ اس سے فرد کی شخصی آزادی بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

اعتراض کی یہ نوعیت بہت پرانی ہے۔ ہمیشہ اسلام دشمن عناصر نے اس کو دہرایا ہے اور کہا ہے کہ مسلمانوں کے اسباب زوال میں سب سے بڑا سبب یہی تھا کہ انہوں نے سنت کی اطاعت اور پیروی کے معاملہ میں تشدد اختیار کیا۔ ان کی یہ رائے پر بہت بڑی قدغن ثابت ہوسکتا ہے' لیکن ہم یہ کہے دیتے ہیں کہ اس ضمن میں یہ حقیقت جان لینی ہے کہ چاہے ہم اس سوال کا تسلی بخش جواب دے سکیں یا نہ دے سکیں۔ اسلام کا مستقبل بہر حال سنت کے صحیح صحیح موقف کی تعیین کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر سنت کا مقام و موقف سمجھ میں آ گیا تو اسلام کی روح کو اپنا لینے میں کوئی دشواری حائل نہیں اور اگر سنت کے مقام و موقف کی تعیین میں غلطی ہوئی تو اسی نسبت سے ہم اسلام کے مستقبل کو تاریک بنا دینے کے ذمہ دار قرار پائیں گے۔

ہمیں بجا طور پر ناز ہے کہ اسلام دوسرے ادیان کی طرح متصوفانہ اذعان کے قائل نہیں' بلکہ اس کے دروازے ہمیشہ معقول بحث وتمحیص کے لئے کھلے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہم صرف یہ معلوم کرنے پر اکتفا نہیں کرتے کہ سنت نے کن چیزوں کو ہمارے لیے ضروری ٹھہرایا ہے' بلکہ ہم اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی معلوم کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ اس کی تہہ میں کیا اسباب وعلل کارفرما ہیں۔

اسلام کا مزاج ایسا ہے کہ توحید کو صرف عقیدہ تک نہیں رکھتا ہے' بلکہ چاہتا ہے کہ زندگی کے تمام گوشے اسی

Marfat.com

رنگ میں رنگے جائیں اور عقیدہ وفکر کے دائروں سے نکل کر اس کے تسلط واقتدار کے دائرے عمل وحرکت کے ایک ایک حصہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔ پھر چونکہ اس مقصد جلیل تک پہنچنے کا تنہا یہی راستہ ہے اس لئے قدرتاً اس کے آغوش میں تمام مدرکات آ گئے ہیں اور اس جامعیت کے ساتھ کہ نہ تو ان پر رتی بھر اضافہ ممکن ہے۔ اور نہ یہی ہو سکتا ہے کہ ان میں ذرہ برابر بھی کمی کر دی جائے۔ انتخابیت (Electionism) اور پسند کو اس میں دخل نہیں۔ جب ہم نے ان تعلیمات کو تسلیم کر لیا جن کو قرآن حکیم نے ہم تک پہنچایا ہے یا آنحضرتؐ کی وساطت تک ہماری ان تک رسائی ہوئی ہے تو ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کو پورا پورا مانیں اور بغیر کسی استثناء کے سب کی حقانیت پر ایمان لائیں۔ ورنہ یہ اندیشہ ہے کہ یہ اپنی اصلی قدر و قیمت اور افادیت کھو دیں گی۔

اسلام کے بارہ میں یہ اصولی اور بنیادی غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ یہ چونکہ عقل و دانش کی اہمیتوں کو مانتا ہے اس لئے اس کی تعلیمات کے رد و قبول میں ہر شخص مختار ہے کہ جس جس حصہ کو معقول سمجھے مان لے اور جس کو عقل و دانش کی کسوٹیوں پر پورا اترتا ہوا نہ دیکھے ترک کر دے۔ یہ غلط فہمی اس بنا پر ابھری کہ لوگ موجودہ عقلیت کے مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ موجودہ عقلیت اور چیز ہے اور نفس عقل شے دیگر۔ عقل کا کام ایک طرح کی نگرانی ہے۔ جہاں تک دینی تعلیمات کا تعلق ہے اس کے دائرہ فرائض میں صرف یہ بات داخل ہے کہ یہ دیکھے کہ جو کچھ اس مذہب کی طرف سے عائد کیا جا رہا ہے آیا اس کو بہ آسانی برداشت کر سکتی ہے۔ بغیر اس کے کہ یہ فلسفہ کے چکروں میں پڑے اور اس کی سحر طرازیوں سے متاثر ہو۔

اسلام سے متعلق عقل و دانش کا بے لاگ فیصلہ یہی ہے کہ جس کا اظہار کئی مرتبہ ہو چکا ہے کہ یہ اس کے تقاضوں کے عین مطابق ہے لیکن اس کا ہرگز یہ معنی نہیں کہ جو شخص اسلام سے لگاؤ رکھتا ہے وہ اس کی تعلیمات کو ماننے پر خواہ مخواہ مجبور رہی ہے۔ یہ تو اسی شخص کے مزاج وطبیعت پر موقوف ہے اور یا بالآخر روح و باطن کی بیداری اور قلب وضمیر کی روشنی و ہدایت کا قصہ ہے کہ وہ اس کو تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔

اتنا البتہ صحیح ہے کہ جس شخص کا بھی دامن تعصبات سے پاک ہے وہ اس کی تعلیمات کو عقل وحکمت کے تقاضوں کے خلاف نہیں ٹھہرا سکتا۔ رہی یہ بات کہ اسلام کی بعض حقیقتیں اس کو فہم وادراک کی معمولی سطحوں سے اونچی نظر آتی ہیں تو یہ ممکن ہے مگر اس کو تناقض نہیں کہیں گے۔

عقل اور فلسفہ عقلیت کے فرق کو زیادہ وضاحت سے سمجھنے کے لئے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ ان کے حدود فرائض کیا ہیں؟ مذہبی امور میں عقل کا فریضہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ آلہ تسجیل کی طرح ہر ہر معاملہ میں جو پیش آئے ہاں (یا نہ) ثبت کر دے اور بس۔ جب کہ عقلیت اس حیثیت پر قانع نہیں۔ یہ اس سے آگے بڑھ کر خیال آرائی کے میدانوں میں قدم زن ہوتی ہے۔ پھر صرف عقل کی طرح اس کی حیثیت ایک مستقل بالذات اور منفرد وظہور کی بھی نہیں بلکہ یہ سراسر موضوعی اور مزاج سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ عقل تو اپنے حدود کو پہچانتی ہے مگر عقلیت کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اس کا یہ ادعا ہے کہ تمام عالم اور اس کے اسرار و رموز اس کی انفرادی جھپٹ میں آتے ہیں۔ اگرچہ فی

Marfat.com

الواقع اس کا دائرہ حد درجہ تنگ ہے۔ ایک بیّن تضاد عقلیت میں یہ بھی ہے کہ یہ امور دین میں تو ایسے حقائق کو مان لینے پر آمادہ نہیں' جو فکر و اندیشہ کی گرفت میں آنے والے نہ ہوں' لیکن جب معاملہ علم کا ہو تو پھر اس کی رائے یہ ہوتی ہے کہ یہ بحر ناپیدا کنار ہے' اور کوئی ضروری نہیں کہ اس کی تمام پہنائیاں انسان معلوم کر ہی لے۔

عقلیت یا فلسفہ عقلی پر ضرورت سے زیادہ اعتماد ہی ایک بڑا سبب ہے' الحاد و انکار کا۔ اسی سبب سے بہت سے عصری مسلمانوں نے آنحضرتؐ پر ایمان لانا غیر ضروری سمجھا' لیکن ہم یہ کہے دیتے ہیں کہ یہ حد سے بڑھا ہوا اعتماد صحیح نہیں۔ بات اتنی واضح اور عقلیت کی بے چارگی اس درجہ مسلّم ہے کہ اس کی قطعی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ کانٹ عقلیت کے قلعہ پر یہ کہہ کر پھر ایک دفعہ حملہ کرے کہ عقل کی پرواز محدود فضاؤں ہی میں ہو سکتی ہے' کیوں کہ جہاں تک دماغ و فکر کی افتاد و مزاج کا تعلق ہے' یہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کارخانہ ہست و بود میں جو ایک طرح کی کلیت جاری و ساری ہے' اس کی حقیقت و کنہ کو معلوم کر سکے۔ ہم جو کچھ معلوم کر سکتے ہیں وہ صرف تفصیلات و عوارض ہیں' ازلیت و لانہایت تک ہماری رسائی نہیں ہو سکتی۔ مزید برآں ہمارے علم کی نارسائی کا یہ حال ہے کہ ہم اب تک یہ بھی نہیں جان پائے کہ خود یہ طلسم زندگی کیا ہے؟

دینی عقائد کے معاملہ میں جو کہ فوق الادراک بنیادوں پر قائم ہیں' ہمیں ایک ایسی رہنمائی کی ضرورت ہے جس کی عقلی صلاحیتیں فلسفہ مادی کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کہیں زیادہ ہوں اور عمومی و موضوعی عقل سے کہیں بڑھ کر اس کی خوبیاں ہوں جس سے کہ ہم سب بہرہ مند ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ ہمیں ایک پیغمبر کی ضرورت ہے۔

اگر ہمیں قرآن کے بارے میں یہ یقین ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور آنحضرتؐ کی رسالت پر ہمارا ایمان ہے تو نہ صرف اخلاقی نقطہ نظر سے بلکہ عقلاً بھی ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ آپ کی رہنمائی پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کریں۔ آنکھیں بند کر کے بھروسہ کرنے کے معنے یہ نہیں کہ ہم غور و فکر کی صلاحیتوں سے دست بردار ہو جائیں' بلکہ اس کے برعکس اس کے معنے یہ ہیں کہ ان کا بہترین استعمال کریں اور آنحضرتؐ کے اوامر و نواہی کے پیچھے جو معانی و حکمت پنہاں ہیں' ان کا کھوج لگانے کی پوری پوری کوشش کریں۔ چاہے ہم اس کھوج اور تفحص میں کامیاب ہو سکیں یا نہ ہو سکیں۔ اس ناکامی کے بعد بھی اطاعت بہرحال ضروری ہے۔ اس کو ایک سپاہی اور فوجی ...... کی مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ فرض کیجئے کہ سپہ سالار عسکر نے اسے ایک خاص اہمیت کی جگہ پر قبضہ کر لینے کا حکم دیا ہے۔ اس صورت میں اس فوجی کا یہ فرض ہے کہ فی الفور اس جگہ کو گھیر لے۔ پھر اگر حکم کی اس تعمیل کے ساتھ ساتھ اپنے افسر کے اس حکم کی جنگی اہمیت کو بھی سمجھتا ہے تو یہ اس کے لئے اور فوج کے لئے بلاشبہ خوش آئند ہے۔ لیکن اگر اس کی جنگی قدر و قیمت اس کی سمجھ میں نہیں آتی' تب بھی تعمیل حکم اس پر لازم ہے اور اس کو یہ اختیار ہرگز حاصل نہیں ہے کہ اس میں رد و قدح کرے یا اس کو ٹال جائے۔ ہم مسلمانوں کا آنحضرتؐ کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا عقیدہ ہے کہ آپ اس عسکر اسلام اور سپاہ ایمان کے بہترین اور کامیاب ترین سالار و قائد ہیں اور امور دین کے اجتماعی و روحانی پہلوؤں کو اس سے کہیں اچھی

Marfat.com

طرح سمجھتے ہیں جتنا کہ ہم سمجھ سکتے ہیں۔ لہٰذا جب آپ ہمیں کوئی حکم دیں گے یا کسی مصیبت سے روکیں گے تو ہم لامحالہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ انسانی اصلاح کے لئے بہر حال ایسا حکم دینا ناگزیر ہے اور اس میں روحانی و اجتماعی پہلوؤں کو ملحوظ و مرعی رکھا گیا ہے۔

یہ ممکن ہے کہ یہ پہلو کبھی تو بالکل واضح ہوں اور کبھی ان میں وضوح کی مقدار بالکل کم ہو اور اس شخص کی گرفت میں نہ آسکیں، جن کو کہ دینی امور میں زیادہ مہارت نہیں۔ اسی طرح کبھی کبھی تو آنحضرتؐ کے احکام و اوامر میں جو گہری حکمت پوشیدہ ہے، وہاں تک انسانی فہم کی رسائی ہو جاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صرف سطحی اور اتھلے اسباب و حکم تک ہی نظر و بصر کے دائرے پھیل کے رہ جاتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں اطاعت و فرمانبرداری کے سوا چارہ نہیں۔ بشرطیکہ ان احکام کا ثبوت مستند ہو۔ پھر ان احکام و اوامر کی ایک تقسیم اہم اور نسبتاً کم اہم کی بھی ہے۔ اس صورت میں ہمارے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اہم کو ترجیح دی جائے، لیکن کسی حکم کو بھی اس گمان فاسد کی بنا پر چھوڑ دینا روا نہیں کہ اس میں کوئی بنیادی اہمیت دکھائی نہیں دیتی، کیونکہ آنحضرتؐ سے متعلق قرآن میں صراحتاً آیا ہے:

وما ینطق عن الھویٰ (نجم-۸) ''وہ کوئی بات بھی اپنی طرف سے کہنے کے مجاز نہیں۔'' اس کے صاف صاف معنی یہ ہیں کہ آنحضرتؐ اس وقت تک کوئی کلمہ نہیں کہتے ہیں جب تک کہ اس کی کوئی مثبت وجہ سامنے نہ آئے اور یہ کہ...... جب تک کہ اللہ تعالیٰ اس پر آپ کو مامور نہ فرمائے۔ یہ ہے وہ سبب جس کی وجہ سے قالب و قلب دونوں لحاظ سے ہم سنت کی پیروی پر مجبور ہیں، بشرطیکہ ہمارا نقطہ نظر اسلام کے بارہ میں مختلف نہ ہو۔

پھر جب پیروی سنت کے ایجابی تقاضے ابھر کر سامنے آ گئے تو یہ ہر مسلمان کے لئے ضروری ہو گیا کہ سنت نے اسلام کی جس اجتماعیت کی تشکیل کی ہے، اس کے حکم و اسرار پر غور کرے اور یہ بتائے کہ اس تفصیلی نظام حیات کے اندر کیا روح کارفرما ہے، جس کو مسلمان ولادت سے لے کر موت تک کے تمام لمحوں میں ملحوظ رکھتا ہے اور جس پر کہ عمل پیرا ہونا اس کے لئے ضروری ہے۔ اس نظام حیات میں وہ مسائل بھی داخل ہیں جو خاص اہمیت رکھتے ہیں اور وہ بھی جنہیں بظاہر کوئی اہمیت نظر نہیں آتی۔ مسلمان کو اس حقیقت کا کھوج لگانا ہوگا کہ آنحضرتؐ نے یہ ہر بات میں اپنے اسوہ کی پیروی و اطاعت پر کیوں زور دیا ہے؟ مثلاً اگر میرے دونوں ہاتھ صاف ہیں تو بائیں ہاتھ سے کھا لینے میں کیا مضائقہ ہے؟ داڑھی رکھ لینے اور منڈا ڈالنے میں کیا فرق ہے؟ اور یہ اور کیا اس طرح کے دوسرے مسائل ایسے نہیں کہ جن کا تعلق سراسر صورت و قالب (form) سے ہے۔ کیا ان مسائل کا تعلق انسانی ترقی سے ہے اور اس سے معاشرہ کی فلاح و بہبود میں کوئی اضافہ ہوتا ہے؟ اس مرحلہ پر ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ان سوالات کا متعین جواب دیں۔ کیونکہ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام کی ترقی و انحطاط کا دار و مدار آنحضرت کی پیروی پر ہے۔ اگر پیروی و اطاعت موجود ہے تو ترقی پائے گی اور اگر بدقسمتی سے اطاعت و فرمانبرداری کا داعیہ کمزور ہے تو اسی نسبت سے انحطاط و تنزل کا پیش آنا لازمی ہے۔ ہمارے نزدیک ہر ہر معاملہ میں سنت کی پیروی کی اہمیت کئی وجوہ سے ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس طرح انسان کی عادات و اطوار کے لئے ایک سانچہ مہیا ہو جاتا ہے اور ہر ہر شخص

Marfat.com

ایسی زندگی بسر کرتا ہے جس میں شعور کارفرما ہے۔ بیداری جلوہ گر ہے اور ضبط نفس نمایاں ہے۔ وہ کام اور وہ اعمال و افعال' جن کی تہہ میں کوئی قاعدہ اور ترتیب نہ پایا جائے۔ فکر و روح کی ترقی میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایسے تمام اعمال و افعال کی مقدار انسانی زندگی میں ممکن حد تک کم ہونا چاہئے کیونکہ ان سے فکر و روح کا ارتکاز تباہ ہو جاتا ہے اور وہ اس لائق نہیں رہتی کہ اپنی صلاحیتوں کو کسی ایک مرکز پر مجتمع کر سکے' اس لئے ہم جو قدم بھی اٹھائیں اور جو کام بھی کریں' اس کو ہمارے شعور وارادہ کے مطابق ہونا چاہئے اور اس پر اخلاقی نگرانی جاری رہنا چاہئے۔ مگر یہ اس وقت تک ہونے والا نہیں جب تک کہ ہم اپنے فکر و شعور کی جنبشوں کا محاسبہ کرنا نہ سیکھیں۔ حضرت عمرؓ نے اعمال کی اسی حقیقت کو اس جامع و مانع جملے میں نہایت کامیابی سے ادا فرمایا ہے:

حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا : (اس سے پہلے اپنے محاسبہ نفس سے فارغ ہو جاؤ کہ عنداللہ تمہارا محاسبہ ہو۔)

اس سے پہلے ہم اشارۃً بتا چکے ہیں کہ اسلامی نظریہ عبادت صرف عبادات ہی کو اپنے آغوش میں نہیں لیتا ہے بلکہ اس میں ہماری پوری زندگی کا انعکاس ہوتا ہے اور اس سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ ہماری ذات کے روحانی و مادی دونوں پہلوؤں میں ایک طرح کی وحدت پیدا ہو جائے۔ اگر یہ صحیح ہے تو حیات انسانی میں ان تمام عوامل کو حتی المقدور کم ہونا چاہئے جن میں شعور وضبط نفس کے عناصر کا فقدان ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ محاسبہ' نگرانی کے اس عمل کو ہم جاری رکھیں۔ یہ اس سلسلہ کا پہلا قدم ہے اور وہ یقینی راستہ ہے کہ جس سے ہم ضبط نفس کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں اور اگر ہم روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں سنت کی پیروی کا خیال رکھتے ہیں اور عادۃً ہمارے قدم بھی اسی سمت اٹھتے ہیں' تو یہ چھوٹے چھوٹے کام بھی بڑی ہی اہمیت کے ثابت ہوتے ہیں' کیونکہ ان سے محاسبہ نفس اور ضبط و نگرانی کے ذریعے ہمیشہ بیدار رہتے ہیں۔ رہے بڑے بڑے کام تو ان کے متعلق تو شعور کی بیداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' اس لئے کہ یہ تو شعور کے بغیر صادر ہو ہی نہیں سکتے۔ شعور و ادراک کا دامن تو اس وقت چھوٹتا ہے جب چھوٹے چھوٹے ناقابل التفات کاموں کا سامنا ہو۔ اس وقت یہ عموماً دھوکہ دیتے ہیں اور ذہن و فکر کو غافل رکھتے ہیں۔ ہاں اگر ان حقیر اور کم درجہ کے اعمال میں بھی مراقبہ وضبط کی عادت قائم رہتی ہے تو پھر ان کی منفعت دو چند ہو جانے میں کیا شبہ ہے؟

بظاہر واقعی اس بات میں کوئی اہمیت محسوس نہیں ہوتی کہ ہم کس ہاتھ سے کھاتے ہیں۔ دائیں ہاتھ سے یا بائیں ہاتھ سے۔ ہم نے داڑھی بڑھا رکھی ہے یا منڈا رکھی ہے' لیکن اگر ہمارے اعمال میں ایک تنظیم رونما ہے' ہم ایک خاص سانچہ میں اپنی عادات کو ڈھالنے کے عادی ہیں' تب انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے کیونکہ مسلسل ضابطہ و ترتیب کا خیال رکھنا اور اپنے کو قواعد و پابندیوں میں بندھا ہوا محسوس کرنا آسان نہیں' اگرچہ انسان اس طرح کی خاص تربیت پائے ہوئے ہو۔ وجہ ظاہر ہے ذہن انسانی بھی اسی طرح کسل و تساہل کا عادی ہے جس طرح کہ انسانی جسم و عضلات۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ اگر آپ کسی ایسے آدمی کو پیدل چلنے کی زحمت دیں گے جو اپنے گوشہ عافیت ہی میں بیٹھے رہنے کا عادی ہے جو کبھی چلا پھرا نہیں' تو وہ چند ہی قدم چل کر تھک جائے گا اور ایک قدم آگے نہیں

Marfat.com

بڑھا پائے گا۔ بخلاف اس کے کہ جو میلوں چلنے کا عادی ہے۔ اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ طویل سے طویل سفر کو بغیر کسی زحمت کے جاری رکھ سکے گا---- یہ بھی اگرچہ سفر کی کوفت محسوس کرے گا' لیکن گھبرائے گا نہیں' بلکہ ایسا معلوم ہوگا کہ اس کوفت میں بھی لذت کا ایک پہلو پایا جاتا ہے اور یہ اس سے مانوس ہے۔ یہ ہے فلسفہ سنت کی ہمہ گیریوں کا اور یہ دوسری تعلیل ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے کہ کیوں سنت زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی ہے۔

جب ہم اسی طرح مسلسل مشق و تمرین سے اپنے تمام اعمال و متروکات کو امر و نہی کے دو خانوں میں تقسیم کر دیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نفس و شعور میں ضبط و انضباط کے دواعی راسخ ہو جائیں گے اور زندگی کی یہ نہج طبیعت ثانیہ بن جائے گی۔ یہی نہیں۔ اس کا یہ فائدہ بھی ہوگا کہ جس نسبت و مقدار سے محاسبہ کی مشق و تمرین کا یہ سلسلہ دراز ہوتا جائے گا' اسی نسبت سے اخلاقی و ذہنی کسل مندیاں کم ہوتی چلی جائیں گی اور ہم اخلاق و ادب کی منزلوں سے زیادہ قریب ہوتے جائیں گے۔

مشق و تمرین کا لفظ یہ چاہتا ہے کہ اس کی تہہ میں شعور و احساس کا جذبہ ہمیشہ کارفرما رہے' کیونکہ اگر عمل بالسنۃ کی سطح سے اس حد تک آ گرے کہ ہماری تمام زندگی میکانکی ہو کر رہ جائے اور بے جان مشینری کی طرح التزامات و منہیات کا عملیہ جاری رہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ سنت نے اپنی قدر و قیمت کھو دی اور وہ روح ختم ہو گئی جو مقصود اصلی تھی۔ آنحضرتؐ کے بعد آخری دور میں کیا ہوا؟ یہی نا کہ ظواہر سنت تو قائم ہے اور ان کا چرچا بھی ہوا' مگر ان کے ساتھ جو احساس محاسبہ اور جذبہ نگرانی وابستہ تھا' وہ جاتا رہا۔ صحابہؓ کی زندگیاں اس انداز کی نہ تھیں۔ ان کی پیروی سنت کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے اپنے آپ کو جان بوجھ کر شعور و ادراک سے مالا مال ہو کر ایک ہادی اور رہنما کے سپرد کر دیا تھا تاکہ وہ ان کے اعمال کی سمتوں کو قرآن کی ڈھال کی طرف پھیر دے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سنت کی پیروی سے وہ فوائد حاصل کئے جو دوسرے نہیں حاصل کر سکے اور اس میں خطا اس نظام سنت کی نہیں' ان مسلمانوں کی ہے جو ان طریقوں کی کماحقہ' پیروی نہ کر سکے' جو ان کے لئے وضع کئے گئے تھے۔

عمل بالسنۃ کی اہمیت کو ختم کرنے والے عوامل میں پہلا نمبر تصوف کا ہے۔ اس نے ان قوتوں کو کمزور کیا جن کا تعلق انسانی فعالیت سے ہے اور ان صلاحیتوں کو چمکایا جن کا تعلق انسان کی داخلی تاثر پذیریوں سے ہے۔ عمل بالسنۃ کو عملی زندگی میں ختم کر دینا تو تصوف کے لئے اس بنا پر ممکن نہ تھا کہ ابتدا ہی سے اس کو اسلامی زندگی میں ایک بنیادی عنصر کی حیثیت حاصل رہی ہے' لیکن صوفیائے عظام کی کوششوں سے اتنا ضرور ہوا کہ اس کا مزاج اور رخ یکسر بدل دیا اور یہ بجائے ایک فعالی قوت و حرکت ہونے کے محض افلاطونی رمزیت ہو کر رہ گیا۔ فقہاء اور عامۃ الناس کے نقطہ نظر سے بھی اس کو گزند پہنچا ہے' کیونکہ فقہاء نے سنت سے یہ مراد لیا کہ یہ محض ایک قانون ہے اور سلسلہ ضوابط سے تعبیر ہے اور عوام نے یہ خیال کیا کہ ایک خوبصورت صدف ہے جو معنی کے در شہوار سے بالکل تہی ہے' لیکن تعجب اس پر ہے کہ مسلمانوں کے تمام گروہوں نے اگرچہ قرآن اور اس کی ان تعبیرات و تشریحات سے کماحقہ' استفادہ نہیں کیا جو سنت میں مذکور ہیں۔ تاہم اسلامی تعلیمات کا وہ سرچشمہ جو سنت سے فیضیاب ہوتا ہے جوں کا توں قائم رکھتا ہے اور اس میں کوئی عملی

Marfat.com

دشواری حائل نہیں کہ اس کی طرف دوبارہ رجوع کیا جا سکے۔ پھر سنت' جیسا کہ مغرب زدہ معاندین اسلام سمجھتے ہیں' ایسے لوگوں کی کوششوں سے ہم تک نہیں پہنچی ہے جو فرانسیسیوں کی طرح الفاظ پرست اور جامد ہوں' بلکہ یہ ان لوگوں کی مساعی جمیلہ کا نسخہ ہے جو بلا کا شعور رکھتے تھے۔ جن میں غضب کی عزیمت اور گہری بصیرت و عمل کے دواعی موجزن تھے۔ اس کا صحیح صحیح اندازہ کرنا ہو تو صحابہؓ کو دیکھو۔ ان میں یہی صفات تھیں جو ان کا طرۂ امتیاز ہیں۔ ان کو تاریخ میں حیرت انگیز کامیابی کیوں نصیب ہوئی۔ اسی بناء پر کہ ان میں ہمیشہ ذہنی شعور زندہ رہا۔ یہ سنت کی ایک ایک جزئی میں جو حکمت عمل پوشیدہ ہے' اس سے باخبر رہے اور ان ذمہ داریوں سے آگاہ رہے جو مذہب نے ان کے کندھوں پر ڈالیں۔ سنت کی اہمیت کا یہ ہے انفرادی پہلو۔

دوسری وجہ جس سے کہ عمل بالسنۃ کا فلسفہ واضح ہوتا ہے' یہ ہے کہ اس کی برکت سے اجتماعی زندگی کا تصور پیدا ہوتا ہے اور اجتماعی خیر و فلاح کا ایک نقشہ ترتیب پاتا ہے۔

کبھی آپ نے غور کیا' عام انسانوں میں اختلافات کا کیا سبب ہے اور یہ کیونکر بڑھتا اور فروغ پاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ چونکہ ہر ہر شخص کے دل میں دوسروں کے اعمال و مقاصد کے بارہ میں ایک طرح کی غلط فہمی پائی جاتی ہے' اس لئے کوئی بھی ایک دوسرے کو سمجھنے کی سعی نہیں کرتا اور یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوتی ہے؟ اس لئے کہ ہر ہر شخص کے مزاج و طبیعت کا یہ قدرتی اختلاف صرف معمولی اختلافات میں پیدا نہیں کرتا' بلکہ اس سے ہر ہر قوم کی عادات و اطوار کے مطابق زندگی بسر کرتے کسی قوم پر ایک عرصہ گذر جاتا ہے تو یہی عادات و اطوار کا اختلاف' تہذیب و تمدن کا اختلاف بن جاتا ہے اور باہمی اتفاق و اتحاد کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔ پھر اگر کوئی قوم یہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ اس کی زندگی میں ایک ہم آہنگی پیدا ہو جائے اور اس کی عادات و اطوار اور تہذیب و ثقافت کا ایک متعین قالب تیار ہو جائے تو ان میں باہمی اختلاف ختم ہو جاتا ہے اور یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ ایک دوسرے کے اعمال و مقاصد کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

اسی بناء پر اسلام نے جو انفرادی بہبود کے ساتھ ساتھ اجتماعی فلاح کا بھی ضامن ہے' اپنی تعلیمات میں اس نکتہ کو بنیادی ٹھہرایا کہ معاشرہ کے تمام افراد میں عادات و اطوار کی یکسانی پائی جائے اور ان میں سنت کے التزام سے ایسے کوائف بیدار ہو جائیں جو ہر حال میں ان کے تہذیبی و دینی اتحاد کو برقرار رکھیں' چاہے ان کے اجتماعی و اقتصادی حالات ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف اور جدا کیوں نہ ہوں۔

یہ سچ ہے کہ بعض لوگ سنت کے اس نظام میں ایک گونہ سختی اور تشدد محسوس کریں گے' لیکن اس کی اس خدمت کو کون بھلا سکتا ہے کہ اس نے اسلامی معاشرہ کو استحکام بخشا ہے۔ اس کو ایک متعین شکل اور صورت میں ڈھالا ہے اور ہر ہر نزاع و اختلاف کی مضرتوں سے بچایا ہے۔ اس کی اس افادت کو سمجھنے کے لئے ان انقلابات پر غور کیجئے جو مغرب میں معاشرتی اصلاحات کے نام سے وقوع پذیر ہوئے اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا کیونکہ اس طرح کے مسائل کسی قوم میں اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب لوگ یہ محسوس کرنے لگیں کہ ہمارے بعض قوانین اور رسم و رواج مکمل نہیں

Marfat.com

ہیں' اس لئے ان میں کچھ تبدیلیاں ہونی چاہئیں۔ اہل مغرب نے چونکہ اپنے ہاں ان نقائص کو پالیا' اس لئے اصلاح کے درپے ہوئے۔ مسلمان اس صورت حالات پر اس بنا پر محفوظ رہے کہ یہ اپنے آپ کو قرآن کا پابند ٹھہراتے ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے تمام اعمال آنحضرتؐ کے اسوہ حسنہ کے مطابق ہونے چاہئیں۔ یہ اصول اپنی جگہ ایسا مستحکم اور استوار ہے کہ اس کو اپنانے کے بعد تبدیلی وتغیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ الا یہ کہ خود یہ اصول ہی شک و ریب کا نشانہ بنیں اور ان کی صداقت ہی محل نظر قرار پائے۔ اس سے ہم مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کے اس امکان کو عملاً نافذ ہوتے دیکھ سکتے ہیں جس کو 'بنیان مرصوص' کے الفاظ سے ظاہر کیا گیا ہے اور اگر ہم اس اصول کو پوری طرح حرزِ جاں بنالیں تو معاشرہ ان تمام بیکار اور لاطائل کوششوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے جو فروعی مسائل کے لئے کی جاتی ہیں۔ پھر اگر معاشرہ ان اختلافات سے باز آجائے جس کو جدل و بحث کے تقاضوں نے پیدا کیا ہے اور اس پریشانی خاطر سے دستکش ہو جائے جس کو کہ کلامی موشگافیوں نے جنم دیا ہے اور اس کے بعد اس کی بنیاد کتاب اللہ اور سنت کی پیروی پر رکھی جائے تو ایسے مواقع نکل آئیں گے کہ معاشرہ اپنی تمام صلاحیتوں کو افراد کی اجتماعی وانفرادی فلاح و بہبود کے لئے استعمال میں لائیں۔ یہی نہیں بلکہ معاشرہ کے لئے یہ بھی ممکن ہو جائے گا کہ تمام افراد کے روحانی ارتقاء کے لئے مؤثر جدوجہد کر سکے۔ انسانی معاشرہ کی تنظیم واصلاح کا یہی وہ نصب العین ہے جو اسلام کی اصلی غرض و غایت ہے۔

آیئے اب عمل بالسنۃ میں جو تیسری بڑی مصلحت ہے' اس پر غور کریں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہم جب عمل بالسنۃ کی ذمہ داری قبول کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی آنحضرتؐ کی اقتداء کو پیش نظر رکھیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم عمل کی ہر ہر صورت میں چاہے وہ اختیار پر مبنی ہو چاہے تحرک پر' آنحضرتؐ کی عملی زندگی پر غور و فکر کرنے کی عادت ڈالیں گے' کیونکہ ہمیں اپنے تمام اعمال کا جائزہ لینا ہے اور اپنی پوری زندگی میں یہ دیکھنا ہے کہ آنحضرتؐ کی اطاعت و پیروی کا مقصد پورا ہو رہا ہے یا نہیں۔ اس طرح گویا ایک عظیم ترین انسانی شخصیت کے اثر و نفوذ کو ہمارے روزمرہ کے مشاغل میں منعکس ہونے کا موقع میسر آئے گا' بلکہ یہی وہ روحانی اثر و نفوذ ہوگا جو ہماری زندگی کی مشینری کو متحرک رکھے گا۔ اس کا یہ فائدہ بھی ہوگا کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہم یہ رائے رکھنے پر مجبور ہوں گے کہ علاوہ اس کے کہ آنحضرتؐ اللہ کے محبوب ترین اخلاقی پیغمبر ہیں' آپ ایک مکمل زندگی بخشنے والے بھی ہیں۔ اس مرحلہ پر جبکہ عمل بالسنۃ کی یہ فصل اختتام کو پہنچ رہی ہے' ہمیں اس بات کا فیصلہ بھی کر لینا چاہئے کہ ہم آنحضرتؐ کے منصب و موقف کے بارہ میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ کیا ہم انہیں دوسرے مصلحین وحکماء کی طرح صرف ایک حکیم' مصلح اور فلسفی ہی سمجھتے ہیں یا اللہ کا ایسا فرستادہ خیال کرتے ہیں جو ہر آن وحی والہام کی روشنی میں اس کی اطاعت و پیروی میں مصروف ہے۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے' اس کا نقطہ نظر اس سلسلہ میں بالکل واضح ہے اور کہ اس میں کسی غلط فہمی کے ابھرنے کا امکان ہی نہیں کہ اللہ کا یہ بندہ جس کو نبی آخرالزمان قرار دیا گیا ہے اور جس کو تمام دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے' اس کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا کہ صبح و شام زندگی کے ہر ہر عمل میں اللہ کی وحی اس کے قلب و فکر کو روشنی بخشے اور یہ وحی و

Marfat.com

ہدایت کے ان انوار سے اس کے بندوں کے لئے اجالوں کا بندوبست کرے۔ اگر آنحضرتؐ سے متعلق یہ وضاحت صحیح ہے تو اس کا انکار یا اس کی تعلیمات کے بعض حصوں کا انکار بعینہ اللہ تعالیٰ کا انکار ہوا یا کم از کم اس کا یہ مطلب ہوا کہ اس کی عطا کردہ ہدایت کی قدر و قیمت گھٹا دی گئی ہے اور اگر یہ وضاحت درست نہیں ہے۔ (ہم اس خیال کو منطقی طور پر آگے بڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں) کہ اسلامی تعلیمات کوئی ''آخری فیصلہ'' نہیں ہیں اور موجودہ مسائل و مشکلات کا کوئی دوسرا معقول حل بھی سوچا جا سکتا ہے۔ تو یہ خیال اور جن نتائج کی طرف بھی لے جائے، ممکن ہے اسلام کی روح بہر حال اس سے متفق نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ قرآن نے اس معاملہ میں دوٹوک رائے کا اظہار فرما دیا ہے:

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا ۔ (آج میں نے تمہارے لئے دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتیں اتمام تک پہنچا دیں اور تمہارے لئے ادیان میں اسلام کو پیروی و اطاعت کے لئے چن لیا۔ ۵:۲)

ہم اسلام کو تمام تمدنی تنظیمات سے بلند اور اونچا مانتے ہیں' کیونکہ یہ پوری زندگی سے تعرض کرتا ہے۔ اس میں دنیا کی گتھیوں کو بھی سلجھایا گیا ہے اور عقبیٰ کی پیچیدگیوں کو بھی۔ نفس روح کے مسائل بھی اس کی لپیٹ میں آتے ہیں اور جسم کے تقاضے بھی۔ فرد کی زندگی کا نقشہ بھی یہ کھینچتا ہے اور اجتماعی زندگی کی تشکیل بھی اس کے فرائض میں داخل ہے۔ یہ صرف اس سے بحث نہیں کرتا کہ انسان کو مادی و طبعی قیود سے آزادی دلائے' بلکہ ان مادی و طبعی قیود کا خیال بھی رکھتا ہے۔ یہ انسان سے محالات کا مطالبہ نہیں کرتا' بلکہ اس کا تقاضا صرف اس حد تک محدود ہے کہ انسان میں جس قدر صلاحیتیں مضمر ہیں' ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے اور ایسی سطح تک پہنچنے کی جدوجہد کی جائے جو حق سے قریب تر ہے۔ جس میں رائے اور عمل میں کامل ترین توافق ہے۔ اسلام صرف ایک راہ نہیں بلکہ تنہا یہی راہ ہے جو حق و صواب کی طرف لے جانے والی ہے اور جو شخص اس دعوت کو لایا ہے' وہ صرف ہادی نہیں بلکہ تنہا وہی ہادی ہے۔ پس اس کی اطاعت عین اسلام کی اطاعت ہے اور اس کی اطاعت سے روگردانی حقیقت اسلام سے روگردانی کے مترادف ہے۔

(در: الاعتصام (لاہور)' بابت ۱۷ فروری ۱۹۵۷ء، ص ۲۷-۳۰)

Marfat.com

عبدالعزیز خالد

اسلام-دوراہے پر

ملت بیضا کی بہار وخزاں کے بارے میں جو ارباب فکر ونظر غور وخوض کرتے ہیں، ان میں سے بیشتر کا امت مرحومہ کے لیے نسخہ احیا یہ ہے کہ اسے نشاۃ ثانیہ کے لئے یورپ کو مشعل راہ بنانا چاہیے اور مغرب کے علوم و معارف کو الہٰ دین کے چراغ اور اس کے تابع جن کی طرح اپنے قبضہ قدرت میں لانے کے لیے اہل مغرب کے سامنے انکسار وادب سے زانوئے تلمذ تہہ کرنا چاہئے۔ مگر علامہ محمد اسد اس اخذ واستفادے کی حدود ومحدودات کی نشاندہی کرنے اور ملی تشخص کو دریابرد ہونے سے بچانے کے لیے چند در چند ذہنی تحفظات پر زور دیتے ہیں۔

علامہ کا پیدائشی نام لیو پولڈ وائس (Leopold Weiss) تھا۔ وہ پولینڈ میں ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ ربی کے پوتے اور ایک وکیل کے بیٹے تھے۔ عرب اور شمالی افریقہ کے ملکوں کی سیاحت کے دوران وہ اسلام میں دلچسپی لینے لگے۔ انہوں نے عربی سیکھی۔ پھر ایران، افغانستان اور دوسرے ممالک بھی گئے اور فارسی پر عبور حاصل کیا۔ بعد میں انہوں نے حلقہ بگوش اسلام ہو کر اپنا نام محمد اسد رکھ لیا۔ قبول اسلام کے بعد وہ چند سال سعودی عرب میں بھی قیام پذیر رہے۔ ۱۹۳۲ء میں وہ ہندوستان آئے اور لاہور میں مقیم ہو گئے۔ یہاں انہوں نے اپنی کتاب Islam at the Crossroads......اسلام دوراہے پر...... لکھی (حالانکہ اس کا درست تر نام ہوتا ''مسلم امہ دوراہے پر'')۔

علامہ اقبال سے ان کی ملاقاتیں رہیں۔ علامہ اس نومسلم کے درد ملی، جوش ایمانی اور تبحر علمی سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے اس سے صحیح البخاری کے انگریزی ترجمے کی فرمائش کی۔ علامہ اسد یہاں سے ایک انگریزی رسالہ ''عرفات'' بھی نکالتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں وہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے سفیر کبیر مقرر ہوئے۔ ایک سال بعد انہوں نے یہ منصب چھوڑ دیا اور اپنی کتاب ......Road to Mecca راہ مکہ لکھی۔ بعد میں وہ سوئٹزرلینڈ چلے گئے اور وہاں انہوں نے قرآن حکیم کا انگریزی ترجمہ شروع کیا۔ یہ ترجمہ مکمل ہو کر ۱۹۸۰ء میں جبل الطارق کے دارالاندلس سے The Message of the Quran......پیغام قرآن...... کے نام سے شائع ہوا۔ علامہ بہت سال پہلے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ (۸۹:۲۷-۳۰) ''اے نفس مطمئنہ! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل

Marfat.com

اسے پسند کرتا ہوا اس کا پسندیدہ! تو میرے بندوں میں شامل میری جنت میں داخل ہو جا'' کے مطابق اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں حاضر ہو گئے...... **لبیک اللھم لبیک** ...... میں حاضر ہوں میرے اللہ! میں حاضر ہوں' کا ورد عاشقانہ کرتے!

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را!

ہم یہاں ان کی پہلی کتاب ''اسلام دوراہے پر'' کی تلخیص پیش کر رہے ہیں تاکہ قارئین کرام ان کے عالم اسلام کے مغربی تہذیب و ثقافت سے افادہ و انتفاع کے امکان و امتناع پر اور ملت بیضا کے فرنگی علوم و رسوم سے اثر پذیری کے مثبت و منفی پہلوؤں پر خیالات سے آگاہ و مستفید ہو سکیں۔ ان کی اس کے بعد کی کتاب ''راہِ مکہ'' ایک بڑی طاقتور تحریر کی جگرتاب کتاب ہے، جسے پڑھ کر بے اختیار ماننا پڑتا ہے کہ

سخن کہ شورِ قیامت نہ جس سے دل میں اٹھے
نہیں حساب سخن میں بہ کیش خوش سخناں

اس میں وہ ایک ''اعرابی والا گہر'' ایک مہم جو' جویائے حق کے رنگ میں سامنے آتے ہیں۔ اس آیت کی عملی تصویر: **وجدک ضالاً فھدی** (۹۳:۷) ''اور اس نے تجھے تلاش حق میں سرگرداں پایا تو تیری رہنمائی کی!'' اس میں انہوں نے جس عزیمت و صمیمیت سے اپنے ماضی' اپنے زاد بوم' اپنے اس مانوس و مالوف ماحول سے جس میں انہوں نے عہد طفولیت سے عنفوان شباب تک کی منزلیں طے کیں' برات و بغاوت کا اظہار کیا ہے' بڑا دل کو چھونے والا ہے۔ اپنی جڑوں سے کٹنا' اپنے سرشتوں کو جھٹکنا' اپنے آپ کو یکسر ایک نئے قالب میں ڈھالنا ہے۔ اپنے پرانے کلبوت کو پھینک کر ایک نئی کایا دھارن کرنا' ایک نیا جنم لینا ہے۔

رشتہ پیوند یاراں را بریدن سہل نیست
چہرہ برگ خزاں زرد از جدائی می شود

(دوستوں سے تعلق کے دھاگے کو توڑنا آسان نہیں' پت جھڑ کے پتے کا چہرہ جدائی کے باعث پیلا پڑ جاتا ہے)۔

اس کتاب میں انہوں نے یہودیت و صیہونیت اور پورے یورپی طرز معاشرت سے اپنی لاتعلقی کا بڑے جذبات انگیز اور ایمان افروز پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ ان کی اس ذہنی و جسمانی ہجرت سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کی دستگیری سے وہ اول ہی سے سلیم الفطرت' توحید پرست اور خجستہ سرشت تھے۔

اس میں انہوں نے اپنے قبول اسلام کی مرحلہ بہ مرحلہ سرگزشت بیان کی ہے اور پھر سعودی عرب' اس کی صحرائی بود و باش' اس کے ریگزاروں' نخلستانوں' ناقوں اور مہمان نواز' فراخ دل' گرمجوش بادیہ نشینوں کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں' بڑے عاشقانہ لہجے میں' بڑی فریفتگی و وارفتگی سے کیا ہے۔ وہ جا بجا اس میں اسلامی اور مغربی تہذیب و تمدن کا موازنہ کرتے ہیں اور ان بہت سے خیالات کا بسط و ایجاز سے اعادہ کرتے ہیں جس کا انہوں نے اپنی پہلی کتاب میں

Marfat.com

ذکر کیا ہے۔ وہ اہل اسلام کو ان خطرات سے آگاہ کرتے ہیں جو 'پیروئ مغربی' کے دام ہمرنگ زمیں میں ان کے لئے پوشیدہ ہیں۔

اس مرد مجاہد میں...... حلم و تمکین و شرف جس کی جبیں سے آشکار...... اسلام کی کتنی پیاس، کتنی لگن ہے۔ اہل اسلام کے لیے اس کے دل میں کتنی تڑپ ہے۔ بدویانہ زندگی اس کے لئے کتنی بے پناہ مقناطیسی کشش رکھتی ہے۔ اس کا کچھ اندازہ قادر الکلامی کی اس عہد آفریں کتاب کی ورق گردانی ہی سے ہوتا ہے۔ وہ طبعاً ایک سیلانی آدمی ہے۔ ایک جنون جولاں، جہاں گرد، ایک رمتا جوگی، جو ہر چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا، اپنے ہاتھوں سے چھونا، اپنے انگ انگ سے محسوس کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایک کرد کہاوت کا حوالہ دیتا ہے کہ پانی اگر جوہڑ میں بند ہو کر رہ جائے تو باسی، گدلا اور متعفن ہو جاتا ہے۔ مگر جب چلتا اور بہتا ہے تو اجلا، نرل اور پاک رہتا ہے۔

درویش رواں رہے تو بہتر
آب دریا بہے تو بہتر

کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی سے۔

اس کا فلسفہ حیات یہ ہے:

بہار عمر ملاقات دوستداران است
چہ خط برد خضر از عمر جاوداں تنہا

(زندگی کی بہار دوستوں سے میل ملاقات، ان کی دید و باز دید ہے۔ خضرا کیلے پن میں عمر جاوداں کا کیا مزہ اٹھاتا ہوگا؟)

وہ کہتا ہے: جب سے میں عرب آیا ہوں ایک عرب ہی کی طرح رہا ہوں۔ میں نے صرف عربی لباس پہنا ہے۔ صرف عربی بولی ہے۔ اپنے خواب عربی میں دیکھے ہیں۔ عربی عادات و روایات نے میرے خیالات کو ان کی موجودہ شکل و صورت دی ہے۔ انہیں اپنے بدوی، سامی رنگ میں رنگا ہے۔ مجھے عربی دنیا کو اپنانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ یوں لگتا ہے جیسے میرا خمیر اس خاک پاک سے اٹھا ہے!

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اب ہم واپس ان کی پہلی کتاب کی طرف آتے ہیں۔ علامہ سلسلہ کلام اس طرح آغاز کرتے ہیں۔ جب تک مسلمان مغربی تہذیب کی طرف اس نگاہ سے دیکھتے رہیں گے کہ وہی ایک واحد طاقت ہے، جو ان کی جامد و خامد تہذیب میں ایک نئی روح پھونک کر اسے ایک ولولۂ تازہ عطا کر سکتی ہے، وہ خود اعتمادی سے محروم رہ کر مغرب کے ہی پادر ہوا ادعا کی توثیق کرتے رہیں گے کہ اسلام ایک خود سوختہ، ایک چراغ کشتہ، ایک صرف شدہ قوت ہے۔

اسلام اور مغربی تہذیب باہم دگر اتنے متعارض و متخاصم ہیں کہ ان میں اتفاق و توافق کی کوئی صورت نہیں۔

Marfat.com

اس تناظر میں ہم یہ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ مسلم نوجوانوں کی مغربی منہاج پر تعلیم' وہ تعلیم جو کاملاً فرنگی ثقافتی آثار و اقدار پر مبنی ہو' اسلام مخالف اثرات کی آمیزش سے پاک ہوگی۔ ایسی توقع سراسر خود فریبی ہے۔ استثنائی صورتوں کے سوا مسلم نوجوانوں کی مغربی تعلیم ان کی قوت ارادی کو کمزور اور آخر میں وحی سماوی کی حقانیت پر ان کے یقین محکم کو مضمحل کرے گی اور ان کے اپنے آپ کو شھداء علی الناس (۱۴۳:۲) لوگوں پر گواہ سمجھنے سے پس و پیش پر منتج ہوگی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے کہ مغربی خطوط پر جن نام نہاد روشن خیال طبقے کی تعلیم ہوئی ہے' اس میں مذہبی معتقدات تیزی سے رو بہ تنزل ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ مغربی سائنس جس نے ان کی ذہنی پرورش کی ہے' نے ہماری مذہبی تعلیمات کے خلاف انہیں کوئی دلیل قاطع مہیا کر دی ہے۔ صرف یہ ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب کی فضا اس قدر شدید مذہب مخالف ہے کہ وہ نوخیز مسلم نسل کے دینی امکانات و رجحانات کے لیے ایک مردہ بوجھ ثابت ہوتی ہے اور اس کی روحانی نشوونما کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ مذہبی اعتقاد یا نا اعتقاد صرف استدلالی معاملہ نہیں۔ اکثر یہ وجدانی ہوتا ہے مگر عموماً ثقافتی ماحول کے زیر اثر یہ آدمی کے اندر سرایت کرتا ہے۔ جس طرح ایسے لوگ ہیں جو بالکل کن رس نہیں ہوتے۔ جن میں موسیقی کا کوئی ذوق نہیں ہوتا۔ ایسے ہی وہ بھی ہیں جو مذہبی آواز کے لیے گوش استماع نہیں رکھتے۔

مگر اکثر و بیشتر عام آدمیوں کے لیے مذہبی اعتقاد اور بے اعتقادی کے درمیان خیار و اختیار وہ فضا تیار کرتی ہے جس میں وہ پرورش پاتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ اس لئے رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے' ہر بچہ سلیم الفطرت پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اسے یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ والدین کا لفظ یہاں وسیع اطلاق میں استعمال ہوا ہے۔ اس میں خاندان' مدرسہ' سماج سب شامل ہیں' جو بچے کی ابتدائی ذہنی و جذباتی تشکیل میں اہم اور فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ اکثر مسلمان گھرانوں کا ماحول بھی ایسا نہیں کہ بچے کی صحیح دینی تربیت کے لئے سازگار ہو' مگر یہ بات طے ہے کہ مغربی خطوط پر مسلمان نوجوانوں کی تعلیم نہ صرف قیاساً بلکہ یقیناً بعد کی زندگی میں ان میں ایک مذہب مخالف رویہ پیدا کرنے کا باعث ہوگی۔ یہاں ایک بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جدید تعلیم کے بارے میں ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے' مسلمانوں کے مغربی تعلیم کے احتجاج کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ اسلام ایسی تعلیم کا مخالف ہے۔ ہمارے مخالفوں کے اس الزام و اتہام کی تعلیم کا مخالف ہے۔ ہمارے مخالفوں کے اس الزام و اتہام کی نہ کوئی دینی اساس ہے نہ تاریخی۔ قرآن کریم ایسی آیات سے بھرا ہوا ہے'' تاکہ تم سمجھو' تاکہ تم میں عقل و فہمید پیدا ہو' تاکہ تم سوچو' تاکہ تم جانو۔''

مقدس کتاب کے آغاز میں ہے (۳۱:۲) اور اس نے آدم کو سارے نام سکھائے اور اس کے بعد یہ ذکر ہے کہ اس علم اسماء کی بدولت انسان فرشتوں سے بڑھ گیا۔ ان کا مسجود بن گیا۔ اسماء ایک علامتی لفظ ہے۔ اصطلاح سازی کی قوت اور منطق فکر کی طاقت کے لیے جو انسان سے خاص ہے اور جو اسے قرآن کے الفاظ میں فی الارض خلیفہ (۳۰:۲) بناتی ہے۔ تعقل و تفکر کے باقاعدہ اور ثمر آور استعمال کے لئے انسان کو سیکھنا چاہیے۔ اس لئے رسولؐ نے فرمایا جو کوئی تلاش علم میں جادہ پیما ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ سہل کر دیتا ہے۔ عالم کو عابد پر وہی فضیلت حاصل ہے جو چودھویں کے چاند کو سارے ستاروں پر ہوتی ہے' لیکن تعلیم و تعلم کے بارے میں اسلام کے

Marfat.com

دفاع کے لئے قرآن وحدیث کے حوالوں کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

تاریخ شاہد ہے اور وہ شاہد صادق ہے کہ کوئی مذہب کبھی بھی سائنسی ترقی کا ایسا محرک و مربی، ایسا حامی اور داعی نہیں تھا جتنا کہ اسلام ہے اور تھا۔ سائنسی تفتیش وتحقیق کی تحریک اسلامی نے جو حوصلہ افزائی کی، اس کا کھلا ثبوت عباسیوں، امویوں اور اندلس کے عرب اقتدار کے شاندار ثقافتی کارنامے ہیں۔ یورپ کو تو اس کا بخوبی علم ہونا چاہیے چونکہ اس کی اپنی ثقافت کی صدیوں کی تاریکی کے بعد نشاۃ ثانیہ...... تحریک احیائے علوم...... اسلام ہی کی مرہون منت ہے۔ میں یہ اس لئے نہیں کہہ رہا کہ اس دور میں جب دنیائے اسلام اپنی روایات سے منہ موڑ چکی ہے، اہل اسلام عقلی افلاس اور فکری اندھے پن کا شکار ہو چکے ہیں۔ ہم اپنے ماضی کی تابناک یادوں پر ناکردہ کاروں کی طرح اترائیں۔ اپنی موجودہ زبونی ومسکنت میں ہمیں اس کا کوئی حق نہیں کہ ہم اپنی رفتہ وگذشتہ شان وشوکت پر ڈینگیں ماریں، لیکن ہمیں اس امر کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہماری اپنی کوتاہ ہمتی وغفلت کوشی ہے۔

اسلام کبھی بھی ترقی اور سائنس کی راہ میں رکاوٹ نہیں تھا۔ وہ تو بلکہ آدم خاکی کی ذہنی سرگرمیوں کی اس قدر قدر کرتا ہے۔ انہیں اس قدر وقار وافتخار کا مقام دیتا ہے کہ اسے ان کی بدولت مسجودِ ملائک ہونے کا مژدہ سناتا ہے۔ کوئی اور مذہب فکر کی فرماں روائی اور علم کی دارائی پر اصرار میں اس حد تک نہیں گیا۔ اگر ہم اس دین مبین کے اصولوں کی پابندی کرتے ہیں، تو جدید علوم کو اپنی زندگی سے خارج نہیں کر سکتے۔ ہم میں سیکھنے اور آگے بڑھنے کی خواہش و خواستگاری ہونی چاہیے اور سائنسی اور اقتصادی طور پر ہمیں اتنا ہی کاردان وکارکشا بننا چاہیے جتنا کہ مغربی اقوام ہیں۔ لیکن ایک چیز جس کا مسلمانوں کو آرزومند نہیں ہونا چاہیے، وہ ہے مغربی آنکھوں سے دیکھنا، مغربی ذہنوں سے سوچنا۔ اگر وہ مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو انہیں اسلام کی ثقافت کا مغرب کے مادی تجربات سے تبادلہ نہیں کرنا چاہیے۔

''مغربی لوگ اولوالعزمی اور ہمت کے لحاظ سے جن ہیں، جو دن رات نئے نئے تجربات کی کھوج اور تحقیق میں لگے رہتے ہیں اور عجیب وغریب کارہائے نمایاں سرانجام دینے کے لئے مشکل اور جان جوکھوں کی مہمات سے ذرا نہیں گھبراتے۔ اسلامی نظام خالی باتوں سے قائم نہیں ہو سکتا۔ اگر ہمیں دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کے دوش بدوش کھڑا ہونا ہے تو ان لوگوں کے علوم وفنون سیکھنا ہوں گے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہم ان کے علوم کو سیکھتے سیکھتے اپنے دین ومذہب کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ جب تک کوئی ملک اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو، اس زمانے میں دین اور دنیا کا کوئی کام نہیں رہ سکتا۔''

(قطب الارشاد حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری (۱۸۷۸ء-۱۹۶۲ء))

علم اپنی ذات میں غربی ہے نہ شرقی، یہ عالمگیر ہے بالکل ایسے جیسے قدرتی حقائق عالمگیر ہیں۔ مگر وہ زاویہ نگاہ جس سے حقائق دیکھے اور پیش کئے جاتے ہیں، وہ قوموں کی تہذیبی افتاد ونہاد اور ان کے ثقافتی منہاج ومزاج کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ حیاتیات، طبیعیات، نباتات اپنے مقدور دائرہ کار میں نہ مادی ہیں نہ روحانی۔ ان کا تعلق مشاہدے

Marfat.com

حقائق کی فراہمی، ان کی تعریف اوران سے قوانین عامہ کے استخراج سے ہے مگر وہ استقرائی فلسفیانہ نتائج جو ہم ان سائنسوں سے مستنبط کرتے ہیں، محض معروضی حقائق اور بے میل مشاہدات پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ زیادہ تر ہماری زندگی اوراس کے مسائل کے بارے میں پہلے سے قائم طبعی، وجدانی اور ذوقی طریق فکر سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ عظیم جرمن فلاسفر کانٹ کہتا ہے:

''گو پہلے پہل یہ حیران کن معلوم ہوتا ہے مگر تاہم یہ طے ہے کہ ہمارا شعور فطرت سے اپنے نتائج لیتا نہیں بلکہ انہیں اس پر منڈھتا ہے۔''

مختصراً یہ کہ تنہا موضوعی نقطہ نگاہ ہی اس تناظر میں اہم ہے' کیونکہ وہ عموماً معروض کے بارے میں ہماری تعبیر کو یکسر بدل سکتا اور اکثر و بیشتر بدل دیتا ہے۔ لہٰذا سائنس جو بذات خود مادی ہے نہ روحانی، ہمیں کائنات کے بارے میں انتہائی متضاد و متغائر تعبیرات کی طرف لے جاسکتی ہے۔ وہ تعبیرات جو ہمارے اپنے طبعی رجحان اور میلان خاطر کے مطابق مادی یا روحانی ہوسکتی ہیں۔ مغرب اپنی نہایت شستہ و رفتہ عقلیت کے باوجود مادیت کی طرف مائل ہے اور اس لئے اپنے بنیادی ظن و قیاس اور تصور و ادراک میں مذہب مخالف ہے اور ایسے ہی لا محالہ مغربی نظام تعلیم بحیثیت مجموعی ہے۔ بالفاظ دیگر جدید تجربی سائنسوں کی مجرد تعلیم تو اسلام کی ثقافتی حیثیت کے لئے ضرر رساں نہیں، لیکن مغربی تہذیب کی روح جس کے توسط سے مسلمان ان سائنسوں تک رسائی حاصل کرتے اور ان سے کسب فتوح و فیضان کرتے ہیں، وہ خطرے کی علامت ہے۔ یہ نہایت بدقسمتی کی بات ہے کہ سائنسی تحقیق و تدقیق کے میدان میں ہماری صدیوں کی بے اعتنائی اور غفلت نے ہمیں سرتاسر مغربی علمی مصادر و مآخذ کا دامن گیر و دست نگر بنا دیا ہے۔ اگر ہم نے اسلام کے اس موکد و محکم حکم پر عمل کیا ہوتا جو ہر مسلمان پر حصول علم و دانش کو فرض ٹھہراتا ہے تو آج ہمیں جدید علوم کے لئے مغرب کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اسی طرح جیسے صحرا میں ایک پیاس سے تڑپتا شخص دور افق پر سراب کی لہریں لیتی نظر فریب جوئے آب کو آس بھری دھندلائی نظروں سے دیکھتا ہے مگر چونکہ مسلمانوں نے اپنی ذمہ داریوں سے ایک طویل عرصے سے کوتاہی و پہلو تہی برتی' وہ افلاس اور جہالت کے گڑھے میں گر گئے جب کہ یورپ نے اس اثنا میں آگے کی طرف مضبوط و توانا قدم اٹھا کر پے در پے کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیئے۔

اس فاصلے کو پاٹنے کے لئے ایک لمبا عرصہ درکار ہے اور اس وقت تک قدرتاً ہم جدید سائنسوں کو مغرب کے تعلیمی ذرائع حاصل کرنے پر مجبور رہیں گے۔ لیکن اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم سائنسی مواد اور منہاج اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ دوسرے لفظوں میں اگرچہ ہمیں علوم قطعی کا مغربی خطوط پر مطالعہ کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے مگر مسلم نوجوانوں کی تعلیم کے کسی بھی حصے میں ہمیں ان کے فلسفے کے آگے سر تسلیم و رضا خم نہیں کرنا چاہیے۔ اس کی سطوت و صولت کے سامنے شکست خوردگی سے سپر انداز نہیں ہونا چاہیے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فی زمانہ متعدد قطعی سائنسز خالص تجربی انکشاف و اکتشاف سے آگے نکل کر فلسفیانہ

Marfat.com

قلمرو میں داخل ہو چکی ہیں اور یہ کہ بیشتر صورتوں میں یہ انتہائی دشوار ہے کہ نظری فلسفے اور تجربی سائنس میں خط امتیاز کھینچا جا سکے' لیکن دوسری طرف یہی وہ نقطہ خاص ہے جہاں اسلامی ثقافت کو دوبارہ اپنے آپ کو منوانا' اپنی جھکی ہوئی گردن کو اٹھانا' اپنے پورے قد سے کھڑے ہونا اور اپنی انفرادیت پہ اصرار وابرام کرنا ہوگا۔ یہ مسلمان سائنس دانوں کا فریضہ بھی ہے اور ان کے لئے مناسب و سازگار موقع محل بھی کہ وہ ایک بار پھر سائنسی تحقیق و تفتیش کی اس سرحدی لکیر تک پہنچ جائیں اور نظری استدلال و تعقل کی طاقتوں کو مغربی فلسفیانہ نظریات کو پس پشت ڈالتے اور نظر انداز کرتے ہوئے بروئے کار لا سکیں۔ یعنی دونوں میں قرار واقعی برزخ و حد فاصل قائم کر سکیں اور یوں امید بندھ سکتی ہے کہ اسلامی موقف کو فعال و متحرک بنانے سے وہ موجودہ مغربی سائنس دونوں سے مختلف نتائج مرتب کر سکیں مگر مستقبل جو کچھ بھی لائے یہ آج بھی ممکن ہے کہ سائنس کی درس و تدریس میں مغربی علمی رویے کی غلامانہ پابندی اور فدویانہ پیروی کے بغیر کی جا سکے۔ وہ چیز جس کی آج اسلامی دنیا کو فوری اور اشد ضرورت ہے وہ ایک نیا بلکہ سائنسی تکنیکی ساز و سامان سائنسی فلسفیانہ نقطہ گاہ نہیں بلکہ صرف تازہ ترین ہے۔

اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں یہ مشورہ دوں گا کہ مغرب کی تمام علمی یافتوں اور دریافتوں میں سے صرف طبعی علوم محولہ بالا تحفظات کے ساتھ اور ریاضیات کو مسلم درسگاہوں میں پڑھایا جائے اور یورپی فلسفے' ادب اور تاریخ کو ان کی بالادستی کے اس مقام سے ہٹا دیا جائے' جو آج انہیں نصاب میں حاصل ہے' کیونکہ ان کا بے پناہ اقدار میں غلو و علو فطرتاً ناکتد، نارس اور ناپختہ ذہنوں کو مغربی تہذیب کی روح کو کلیتہً جذب و ہضم کرنے کی ترغیب و تشویق دیتا ہے۔ قبل ازیں کہ وہ اس کے منفی اور مضر پہلوؤں کا خاطر خواہ ادراک کر سکیں۔

مسلم درسگاہوں میں یورپی ادب کی موجودہ حیثیت کو اسلامی ادب کی معقول بصیرت افروز اور زندگی آموز تدریس و تعلیم سے بدلنا چاہیے۔ تاکہ طالب علموں کو اسلامی ثقافت و حضارت کے عمق اور ان کی وسعت و ثروت کی محرومیت سے بہرہ ور کیا جا سکے۔ ان کے پژمردہ دلوں میں اپنے مستقبل کے لئے نئی امید پھونکی جا سکے۔ اپنے مبہم فرد پر ان افتادگان خاک کے متزلزل اعتماد کو بحال کیا جا سکے۔ اگر مغربی ادب کی مسلم اداروں میں موجودہ تدریس مسلم نوجوانوں کو اسلام سے بیگانہ بناتی ہے تو یہی بات کہیں بڑے پیمانے پر مغرب کی تاریخ عالم کی تعبیر و تشریح کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جس میں وہی پرانا فرسودہ رویہ رومی مقابل بربری نئے انداز سے از سر نو زندہ ہو کر سامنے آتا ہے۔ ان کا تاریخ کی پیش کش کا مقصد (بغیر اس کے برملا اعتراف کے) یہ ثابت کرنا ہے کہ مغربی نسلیں اور ان کی تہذیبیں دنیا میں جو کچھ پیدا ہوا ہے یا ہو سکتا ہے' اس سے بدر جہا برتر و بالا ہیں۔ اور اس فریب آمیز اور مغالطہ آمیز دعوے سے باقی دنیا پر تان تروز چھینکنے اور اس پر تسلط و تمکن کی مغربی تگ و تاز کے لئے ایک خانہ ساز جواز مہیا کرتا ہے۔

رومیوں کے عہد سے یورپی اقوام مشرق و مغرب کے تمام اختلافات کو ایک مذعومہ یورپی معیار سے دیکھنے کی خوگر ہیں۔ ان کا استدلال اس مفروضے پر چلتا ہے کہ انسانیت کا عروج وارتقا صرف یورپی ثقافتی تجربوں کی بنیاد پر ہی جانچا اور آنکا جا سکتا ہے۔ ایسا محدود زاویہ نگہ علیل اور کج مج تناظر کو جنم دیتا ہے۔ یورپیوں کے اس خود کام و خود بین

Marfat.com

رویے کے باعث ان کی عالمی بیانیہ تاریخ ابھی حال تک سوائے مغرب کی مطول تاریخ کے کچھ نہ تھی۔غیر یورپی اقوام کا ذکر صرف اس وقت اور اس حد تک کیا جا سکتا تھا جس حد تک ان کے وجود اور ارتقا کی یورپ کی کرم ریکھا پر کوئی راست چھوٹ پڑتی تھی۔اور اس سے یہ تاثر ابھرتا تھا کہ یورپی کامرانیاں اور مغربی کامگاریاں معاشرتی اور عقلی جہات میں باقی دنیا سے لگا ہی نہیں کھاتیں۔کوئی نسبت ہی نہیں رکھتیں۔گویا کہ باقی دنیا صرف یورپ اور اس کی تہذیب کی خدمت گزاری وحاشیہ برداری کے لئے پیدا کی گئی ہے اور اس کی تمام تہذیبیں مغربی نقش ونگار کے لئے صرف ایک تہ بندی' ایک حاشیے کا کام دیتی ہیں۔اس بلند بانگ دعوے کا ناگزیر اثر جو غیر یورپی افراد کے اذہان پر ہوسکتا ہے' یہ ہے کہ وہ اپنی ثقافت کے تاریخی ماضی اور ممکنہ مستقبل کے بارے میں احساس کمتری کا شکار ہو جائیں۔

سو جب ہم اپنے تدریس تاریخ کے طریق پر نظر ثانی نہیں کریں گے' ہماری نوخیز نسل اسلامی تہذیب کی ثمر باری وبرومندی کے بارے میں استحقار واستخفاف کی زیریں لہروں کے تموج پر ہچکولے کھاتی رہے گی' اور نتیجتاً اس کا احساس کہتری وہیچ میرزی گہرا ہوتا رہے گا۔یہ احساس یقیناً رفع ہوسکتا ہے مگر صرف اس صورت میں جب مسلمان یعنی زندگی سے اسلام کو بے دخل کرنے اور مغربی ثقافت کے بے چوں وچرا مکمل جذب وانجذاب پر آمادہ ہوں۔مگر کیا وہ اس اقدام کے لئے تیار ہیں؟ نہیں۔ہمیں یقین ہے کہ اسلام کا علم الاخلاق' اس کا انفرادی اور عمرانی انصاف' حریت اور مساوات کا تصور مغربی تہذیب کے مماثل نظریات وتصورات سے کہیں جامع' کہیں ہمہ گیر اور کہیں بلند وبرتر ہے۔ اسلام نے نسلی تنافر کو ختم کر کے انسانی اخوت اور مساوات کا راستہ کھول دیا۔مگر مغربی تہذیب ابھی تک نسلی منافرتوں اور قومی عداوتوں کے پیچاک میں گرفتار ہے۔اسلام نے اپنے معاشرے میں کبھی طبقات اور طبقاتی جنگ نہیں دیکھی۔ لیکن پوری یورپی تاریخ یونان اور روما کے دور سے لے کر آج تک طبقاتی پیکار وآویزش اور عمرانی عناد وکشاکش سے بھری پڑی ہے۔ایک مسلمان مغرب سے صرف اور صرف ایک ہی چیز حاصل کر سکتا ہے اور وہ ہے علوم قطعیہ اپنی اصولی اور عملی صورتوں میں۔لیکن اسے یہ وہم ووسوسہ نہیں ہونا چاہیے کہ مغربی تہذیب اس کی اپنی تہذیب سے افضل وارفع ہے۔اگر وہ یہ سمجھتا ہے تو اس کا مطلب محض یہ ہے کہ وہ اسلام کے موقف ومقام سے بالکل بے بہرہ ہے۔ایک تہذیب کی دوسری پر برتری اس چیز میں نہیں کہ اس کے پاس مادی علم کا زیادہ ذخیرہ ہے (اگرچہ یہ ایک دلخواہ شے ہے) بلکہ اخلاقی قوت میں اور انسانی زندگی کے تمام تر پہلوؤں کے باہمی امتزاج واختلاط اور ان کے عظیم تر امکانات میں' اور اس میدان میں اسلام بلاشبہ ہر ثقافت سے گوئے سبقت لے جاتا ہے۔اگر مسلمان ماضی میں سائنسی تحقیق سے غفلت کے مرتکب ہوئے تو وہ آج اس غفلت کا تدارک مغربی تعلیم کی بے محابا قبولیت سے نہیں کر سکتے۔ہماری سائنسی پس ماندگی اور بے ثروتی اس مہلک اثر کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو مغربی نظام تعلیم کی اندھی تقلید سے عالم اسلام کے مذہبی امکانات پر مرتب ہوگا۔اگر ہم اسلام کو ایک ثقافتی مظہر کے طور پر برقرار واستوار رکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں مغربی تہذیب کے اس علمی استیلا کے خلاف چوکنا رہنا چاہیے جو ہماری معاشرت اور ہمارے امیال وعواطف کو مفتوح ومغلوب کرنے ہی والا ہے۔مغرب کے اوضاع واطوار کے اتباع سے مسلمان آہستہ آہستہ مغربی نقطہ نگاہ کو قبول کرنے

Marfat.com

پر مجبور کئے جا رہے ہیں۔ کیونکہ ظاہری شکل وصورت کی تقلید رفتہ رفتہ اور درجہ بدرجہ اس عالمی نقطہ نگاہ (World view) کومن وعن قبول کرنے پر منتج ہوتی ہے' جو اس شکل وصورت کا ذمہ دار اور اس کا رچنا کار اور پڑما تا ہے۔

مسلمانوں کی مغربی طرز زندگی کی انفرادی واجتماعی پیروی ان کی ہستی' ان کی بقا کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس ثقافتی خرابی کا آغاز کئی دہائیاں قبل ہوا۔ جب مسلمانوں نے مغرب کی مادی طاقت وترقی اور اپنی مسکنت و زبوں حالی دیکھی اور اسلامی تعلیمات سے اپنی عمومی ناواقفیت (یا سطحی واقفیت) کی بنا پر اور طبقہ علماء کی تنگ نظری کے باعث یہ گمان کیا کہ وہ ترقی کی دوڑ میں باقی دنیا کا ساتھ اس وقت تک نہیں دے سکتے' جب تک وہ مغرب کے اقتصادی اور سماجی اصولوں کو بہ تمام وکمال نہ اپنائیں۔ انہیں اپنا اوڑھنا بچھونا نہ بنائیں۔ عالم اسلام پر جمود طاری تھا اور معتد بہ سطح بیں اہل اسلام اس بے تہ نتیجے پر پہنچے کہ اسلام کا معاشرتی اور معاشی نظام ترقی کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں اور اس لئے ضروری ہے کہ اسے مغربی خطوط پر ڈھالا جائے۔ ان ''عجلت پسند' روشن فکر'' حضرات نے یہ کھوجنے اور سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ اسلام ایک نظام علم وتمدن کے طور پر کس حد تک مسلمانوں کے زوال وانحطاط کا ذمہ دار تھا۔ انہوں نے صرف یہ عندیہ دیا کہ ان کے ہم عصر عالمان دین کی اکثر وبیشتر تعلیمات وتفہیمات ترقی اور مادی کامرانی کی راہ میں حائل تھیں۔ بجائے اسلام کے حقیقی سوتوں کی طرف متوجہ ہونے اور ان سے کسب فیض کرنے کے انہوں نے شریعت کو زمانہ حال کی مروج فقہ کے مرادف سمجھا اور آخر الذکر کو جب متعدد لحاظ سے ناقص وناکافی پایا' تو اس مایوس کن انکشاف نے ان کی شریعت میں عملی دلچسپی ہی ختم کر دی اور انہوں نے اسے تبرک کے طور پر تاریخ اور کتابی علم کے عجائب گھر کے طاق نسیاں پر سجا دیا اور یوں انہیں کوتاہی ہمت اور کج اندیشی سے مغربی تہذیب کی ہو بہو نقالی ہی میں مسلم انحطاط کی دلدل سے نکلنے کا راستہ نظر آیا......

(در: روزنامہ ''نوائے وقت'' (لاہور) ۱۲۰ اکتوبر' ۳ نومبر' ۱۰ نومبر' ۲۴ نومبر ۲۰۰۰ء)

Marfat.com

محمد اسد/مترجم: ڈاکٹر محبوب سبحانی

مغرب کی روح

پچھلے باب میں اسلام کی اخلاقی بنیاد کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تہذیب تاریخ میں مذہبی ریاست کی مکمل ترین شکل تھی۔[1]

اسلام میں روحانی معاملات سب پر فوقیت رکھتے ہیں' باقی تمام چیزیں انہی کے تحت ہوتی ہیں۔ اگر ہم اس کا مغربی تہذیب سے موازنہ کریں تو ان میں بہت بڑا فرق نظر آئے گا۔

جدید مغرب کی تمام سرگرمیوں اور کاوشوں کا محور عملی افادیت اور حرکی ارتقاء ہے۔ ان کا اصلی مقصد زندگی کی صلاحیتوں کو دریافت کرنے کے لیے تجربات کرنا ہے۔ اس معاملہ میں وہ کسی اخلاقیات کو نہیں جانتے۔ جدید یورپیوں یا امریکیوں کے نزدیک اس کی عملاً کوئی حیثیت نہیں ہے کہ زندگی کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ ان کے نزدیک اہمیت اس سوال کی ہے کہ زندگی کیا کیا شکلیں اختیار کر سکتی ہے اور کیا نسل انسانی اس کائنات کا آقا بننے کی طرف پیش رفت کر رہی ہے؟ جدید یورپی و امریکی اس آخری سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں لیکن مسلمان اس پر یقین نہیں رکھتے۔

قرآن مجید میں آدمؑ اور اس کی نسل کے متعلق بتایا گیا ہے:

انی جاعل فی الارض خلیفة (۲:۳۰)

''میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔''[2]

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے لیے زمین پر حکومت کرنا اور ترقی کرنا مقدر کر دیا گیا ہے' لیکن ترقی کی نوعیت کیا ہو؟ اس پر اسلام اور مغربی نقطہ نظر میں بڑا فرق ہے۔ جدید مغرب کا کہنا ہے کہ اخلاقی اور سماجی ترقی اجتماعی ہونی چاہیے جو عملی کامیابیوں اور سائنسی انداز فکر سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر مغرب کے مادہ پرستانہ حرکی تصور کے بالکل برعکس ہے۔ اسلام اجتماعی ''انسانیت'' کے روحانی امکانات کو سکونی مقدار قرار دیتا ہے جو انسان کی فطرت کے اندر ودیعت کر دی گئی ہے۔ اسلام مغرب کی طرح اس کو طے شدہ امر نہیں سمجھتا کہ انسانی فطرت اجتماعی طور پر تبدیلی یا ارتقاء کی طرف بڑھ رہی ہے' جیسا کہ درخت پروان چڑھتا ہے۔ اسلام کا کہنا ہے کہ انسانی فطرت کوئی حیاتیاتی چیز نہیں ہے۔ جدید مغربی فکر کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ مادی علوم اور عیش و تنعم کو اخلاقی ترقی کا ہم معنی سمجھتا

Marfat.com

ہے۔ یہ وہی غلطی ہے کہ حیاتیاتی اصولوں کو غیر حیاتیاتی حقائق پر منطبق کیا جائے۔ دراصل جدید مغرب روح کی موجودگی پر یقین نہیں رکھتا۔ اسلام آسمانی مذہب ہے' وہ روح کو ایک حقیقت کے طور پر بیان کرتا ہے جس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ اگرچہ مادی ترقی اور روحانی ترقی آپس میں متصادم نہیں ہیں' لیکن یہ دونوں ایک چیز بھی نہیں ہیں۔ یہ انسانی زندگی کے واضح طور پر دو مختلف پہلو ہیں اور ان کی ترقی کے لئے ایک دوسرے پر انحصار ضروری نہیں۔ یہ الگ الگ بھی' اگرچہ ہمیشہ نہیں' ترقی کر سکتے ہیں۔

اسلام اگرچہ انسانیت کی اجتماعی مادی ترقی کو پسند کرتا ہے' لیکن اسلام کے نزدیک انسانیت کی روحانی ترقی اجتماعی معاملہ نہیں جو اجتماعی کامیابیوں کا ذریعہ بن سکے بلکہ یہ انسان کا انفرادی معاملہ ہے اور ہر فرد کی روحانی اور اخلاقی ترقی کا خم دار خط اس کی پیدائش سے موت تک ممکنہ طور پر اونچا یا نیچا ہوتا رہتا ہے۔ ہم اجتماعی طور پر تکمیل کی طرف نہیں بڑھ سکتے لہٰذا ہر شخص کو انفرادی طور پر روحانی نصب العین کے حصول کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔ اس کی ابتدا اور انتہا کا وہ خود ہی ذمہ دار ہے۔

انسان کی روحانی تقادیر کے انفرادی نقطہ نظر کو معاشرہ اور سماجی تعلقات کے طاقتور اسلامی نظریے نے متوازن بنا دیا ہے اور بالواسطہ طور پر اس کی توثیق بھی کر دی ہے۔ اسلامی معاشرہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ افراد کی خارجی زندگی کے لیے سازگار ماحول مہیا کرے جس میں روحانی ترقی کی راہ میں کم سے کم رکاوٹیں ہوں اور حوصلہ افزائی کے زیادہ سے زیادہ مواقع ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی شریعت انسان کی مادی زندگی اور روحانی زندگی دونوں کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہے' مزید برآں اس کی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں کے لئے بھی رہنمائی دیتی ہے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں' یہ تصور اس پختہ یقین پر قائم رہ سکتا ہے کہ انسان کے اندر روح موجود ہے اور اس کی زندگی میں ایک روحانی مقصد کارفرما ہے' لیکن یورپ اور امریکہ کے موجودہ نظریہ کے مطابق روح نام کی کوئی چیز نہیں ہے' البتہ وہ بعض صورتوں میں روح کو نیم دلی سے تسلیم کرتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق انسانی زندگی کا عملاً کوئی مقصد نہیں رہ جاتا' اس لیے مغرب نے تمام ماورائے عقل قیاسات اور تصورات سے پیچھا چھڑا لیا ہے۔

ہم جس کو ''مذہبی رویہ'' کہتے ہیں' اس کی بنیاد ہمارا یہ ازلی یقین ہے کہ ایک جامع آسمانی اخلاقی قانون موجود ہے اور انسانوں کو اس قانون کی لازماً پابندی کرنی چاہیے لیکن جدید مغربی تہذیب اس کو تسلیم نہیں کرتی کہ انسان اقتصادی' سماجی اور قومی مفادات کے سوا کسی اور کو معبود بنا لے۔ مغرب کا حقیقی معبود روحانی نوعیت کا نہیں بلکہ عیش و تنعم ہے اور اس کی زندگی کا حقیقی فلسفہ طاقت کی خاطر طاقت کا حصول ہے۔ یہ دونوں نظریے قدیم رومی تہذیب سے ورثہ میں ملے ہیں۔

رومی تہذیب کو کسی حد تک جدید مغرب کی مادہ پرستی کی فلسفیانہ بنیاد قرار دینا ان لوگوں کو عجیب لگے گا جنہوں نے قدیم رومی سلطنت اور قدیم اسلامی سلطنت کے موازنہ کی بات بارہا سنی ہوگی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر

Marfat.com

اسلام اور جدید مغرب کے بنیادی تصورات میں اتنا بڑا فرق کیوں ہے جبکہ ماضی میں دونوں کے سیاسی انداز ایک جیسے تھے؟ صاف جواب یہ ہے کہ یہ دونوں ایک جیسے نہیں تھے۔ جدید مغربی نسل کے ذہنوں میں اس قسم کی تاریخی غلط بیانیاں اور سطحی نیم معلومات بھر دی گئی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلامی اور رومی سلطنتوں کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں ہے سوائے اس کے کہ وسیع علاقوں میں جن میں مختلف قسم کے لوگ بستے تھے' ان کی حکومت تھی لیکن یہ دونوں حکومتیں دو مختلف قوت محرکہ رکھتی تھیں اور ان کے تاریخی مقاصد بھی مختلف تھے۔ ارتقائی پہلو سے بھی دیکھیں تو دونوں میں بڑا فرق نظر آئے گا۔ رومی سلطنت کو جغرافیائی طور پر پروان چڑھنے اور سیاسی بلوغت تک پہنچنے کے لیے ایک ہزار سال لگے جبکہ اسلامی سلطنت صرف اسی برس میں اپنے شباب پر آ گئی۔ ان کے زوال کو دیکھا جائے تو فرق اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ رومی سلطنت کا زوال جس پر ہنوں اور گوتھوں نے آخری مہریں ثبت کیں' صرف ایک صدی میں مکمل ہو گیا۔ یہ زوال اتنا مکمل تھا کہ ادب اور تعمیرات کے سوا اس کا نام ونشان تک نہ رہا۔ بازنطینی سلطنت جو عام طور پر روم کی براہ راست وارث سمجھی جاتی ہے' رومی سلطنت کے کچھ علاقوں پر ضرور حکومت کرتی رہی لیکن اس کے سماجی اور سیاسی ڈھانچوں کا رومی سیاست کے تصورات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے برعکس اسلامی سلطنت جو خلافت کہلاتی ہے' اس کے طویل دور میں بلاشبہ بعض تبدیلیاں ہوئیں اور مختلف خاندانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں لیکن اس کے ریاستی ڈھانچہ میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ جہاں تک بیرونی حملوں کا تعلق ہے منگول بھی' جو رومی سلطنت کو ملیا میٹ کرنے والے ہنوں اور گوتھوں سے زیادہ خونخوار تھے' خلافت کے سماجی ڈھانچہ کو ہلا نہ سکے اور نہ اس کے سیاسی وجود کو ختم کر سکے' البتہ وہ بعد کے زمانہ میں اس کے اقتصادی اور علمی زوال کا باعث ضرور ہوئے۔ اس کے برعکس رومی سلطنت ایک صدی میں تباہ ہو گئی۔ خلافت آہستہ آہستہ زوال پذیر ہوئی جس میں ایک ہزار سال لگے' یہاں تک کہ عثمانی خلافت کے خاتمے کے ساتھ ہی اس کا سیاسی ڈھانچہ تباہ ہو گیا جس کے بعد سماجی ڈھانچے کی تباہی کے آثار نظر آئے جس کا مشاہدہ ہم آج کر رہے ہیں۔

اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ عالم اسلام کی اندرونی طاقت اور اس کا سماجی ڈھانچہ اتنا طاقتور تھا کہ انسانی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ چینی تہذیب کا بھی اس سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا جس نے کئی صدیوں تک جارحیت کی مزاحمت کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ چین ایک براعظم کے سرے پر واقع ہے۔ وہ نصف صدی پہلے یعنی جدید جاپان کے ابھرنے تک کسی مخالف طاقت کی دسترس میں نہیں تھا۔ چنگیز خان اور اس کے جانشین منگولوں کے زمانہ میں جنگیں چینی سلطنت کے حاشیے پر لڑی گئیں' لیکن اسلامی سلطنت جو تین براعظموں تک پھیلی ہوئی تھی' ہر وقت خاصے طاقتور دشمنوں سے گھری رہی۔ مشرق وسطیٰ اور مشرق قریب کی سرزمین نسلی اور ثقافتی تہذیبوں کے تصادم کا اکھاڑہ بنی رہی لیکن اسلامی سماجی ڈھانچہ ناقابل تسخیر رہا' البتہ حالیہ زمانہ میں اس کو نقصان پہنچا ہے۔ ہمیں اس حیرت انگیز واقعہ کا جواز تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ قرآنی تعلیمات نے ایک عظیم سماجی ڈھانچہ کے لیے ٹھوس بنیاد فراہم کی اور پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے گرد بنیان مرصوص استوار کر دی۔ رومی سلطنت میں اس قسم کا کوئی روحانی عنصر

Marfat.com

موجود نہیں تھا جو سلطنت کو جوڑے رکھتا' اس لیے وہ اتنی جلدی مٹ گئی۔

ان دو قدیم سلطنتوں کے درمیان ایک اور فرق بھی ہے۔ اسلامی سلطنت میں کوئی مراعات یافتہ قوم نہیں تھی اور اقتدار کا مقصد دین کی ترویج و اشاعت تھا۔ یہ ارفع مقصد اس دین کے لانے والے اور اس کے علمبرداروں نے واضح کیا تھا جبکہ رومی سلطنت کا مقصد ملکوں پر فتح حاصل کرنا اور اپنے ملک کے فائدہ کے لیے دوسری قوموں کا استحصال کرنا تھا۔ مراعات یافتہ لوگوں کی پرُتعیش زندگی کے لیے رومیوں کے نزدیک بڑے سے بڑا ظلم اور بڑی سے بڑی ناانصافی بھی روا تھی۔ رومی انصاف جس کا بڑا شہرہ ہے' صرف رومیوں کے لیے تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا رویہ زندگی اور تہذیب کے صرف مادی تصورات ہی پر مبنی ہوسکتا ہے۔ اس مادہ پرستی کو علمی اور جمالیاتی ذوق نے یقیناً بہتر بنا دیا تھا' لیکن اس میں روحانی اقدار کا کوئی دخل نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ رومیوں کو مذہب کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ ان کے روایتی دیوتا یونانی دیومالا کی بھونڈی نقل تھے جن کو خاموشی سے سماجی روایات کے مطابق ڈھال لیا گیا تھا۔ کسی بھی صورت میں ان دیوتاؤں کو ''حقیقی'' زندگی میں مداخلت کی اجازت نہیں تھی۔ جب ان سے رجوع کیا جاتا تو پروہتوں کے ذریعہ سے ان کو غیبی آواز ملتی تھی' لیکن ان سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ انسانوں پر اخلاقی قوانین نافذ کریں گے اور ان کی رہنمائی کریں گے۔

یہ وہ مٹی ہے جس سے جدید مغربی تہذیب نے جنم لیا۔ بلاشبہ اس تہذیب نے اپنی ترقی کے دور میں مختلف اثرات قبول کیے اور اس نے رومیوں کے ثقافتی ورثے میں ایک سے زائد طریقوں سے تبدیلیاں کیں' لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ مغربی اخلاقیات میں آج جو کچھ صحیح سمجھا جاتا ہے' وہ براہ راست رومی تہذیب کا اثر ہے۔ قدیم روم کا علمی اور سماجی ماحول محض مادہ پرستی اور مذہب دشمنی پر مبنی تھا۔ یہی ماحول آج بھی جدید مغرب میں موجود ہے خواہ اس کا سرعام اعتراف نہ بھی کیا جائے۔ آسمانی مذہب کے خلاف کوئی ثبوت نہ رکھتے ہوئے اور ایسے ثبوت کی ضرورت تسلیم نہ کرتے ہوئے بھی جدید مغربی فکر اگرچہ مذہب کو سماجی روایت کے طور پر تو برداشت کرتی ہے لیکن وہ آسمانی اخلاقیات کا عملی زندگی سے کوئی تعلق روا نہیں رکھتی۔ مغربی تہذیب صاف طور پر ''الٰہ'' کا انکار تو نہیں کرتی' لیکن اس کے یہاں موجودہ ذہنی و عقلی ماحول میں ''الٰہ'' کی جگہ نہیں اور نہ اس تہذیب کو ''الٰہ'' کو ماننے کا کوئی فائدہ نظر آتا ہے۔ انسان زندگی کا مجموعی طور پر احاطہ نہیں کرسکتا اور مغربی تہذیب نے اس کی عقلی مشکل میں سے خیر کا ایک پہلو دریافت کر لیا ہے لہٰذا جدید مغرب میں صرف اس تصور کی عملی اہمیت ہے جو تجرباتی سائنس کے دائرہ میں آتا ہے یا وہ اس تصور کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے جو انسان کے سماجی تعلقات کو عملی طور پر متاثر کرتا ہو۔ چونکہ بادی النظر میں ان دونوں صورتوں میں ''الٰہ'' کے وجود کا سوال پیدا نہیں ہوتا' اس لیے اصولی طور پر مغربی ذہن عملی زندگی سے ''الٰہ'' کو خارج کرنے پر راغب ہے۔

سوال یہ ہے کہ عیسائیت کے طرز فکر سے یہ رویہ کیسے مطابقت رکھتا ہے۔ کیا عیسائیت جو مغربی تہذیب کا روحانی سرچشمہ سمجھی جاتی ہے' آسمانی اخلاقیات پر مبنی نہیں؟ یقیناً یہ آسمانی اخلاقیات پر مبنی ہے تو پھر اس سے بڑی اور کوئی غلطی نہیں ہوسکتی کہ یہ کہا جائے کہ مغربی تہذیب نے عیسائیت سے جنم لیا ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے'

Marfat.com

جدید مغرب کی عقلی بنیاد قدیم روم کے اس تصور پر ہے کہ زندگی صرف مادی ہے' اس کا کسی آسمانی ہدایت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے "چونکہ ہم یقین سے کچھ نہیں جانتے کہ انسانی زندگی کی ابتدا کیسے ہوئی اور مرنے کے بعد کیا ہوگا' سائنسی تجربات اور ریاضیات سے بھی اس کو معلوم نہیں کیا جا سکتا' اس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنی تمام توانائیاں مادی اور عقلی ترقی پر صرف کی جائیں اور اس معاملہ میں آسمانی اخلاقیات یا اخلاقی مفروضوں کو مزاحم ہونے نہ دیا جائے کیونکہ ان اخلاقیات کا کوئی سائنسی ثبوت نہیں ہے۔" اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ عذر جو جدید مغربی تہذیب کی اساس ہے' عیسائیت' اسلام یا کسی اور مذہب کے لیے نا قابل قبول ہے کیونکہ یہ اپنی اصل میں لامذہبیت ہے۔ اس لیے یہ کہنا مضحکہ خیز ہے کہ جدید مغربی تہذیب کی عملی کامیابیاں عیسائی تعلیمات کا ثمر ہیں۔ عیسائیت نے سائنسی اور مادی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا جس میں مغرب کی موجودہ تہذیب نے کمال حاصل کر لیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کامیابیاں عیسائی کلیسا اور اس کے نظریہ زندگی کے خلاف یورپ کی صدیوں کی جنگ کے نتیجہ میں حاصل ہوئیں۔

کئی صدیوں تک یورپ کی روح کو مذہبی نظام کے ذریعہ سے کچلا جاتا رہا۔ اس نظام میں انسانی فطرت کو حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔ عیسائیت میں رہبانیت' باطل کے سامنے سر جھکا دینا' ایک گال پر کوئی طمانچہ مارے تو دوسرا گال پیش کر دینا' جنس کو شجر ممنوعہ قرار دینا' یہ تمام تصورات جنت سے آدمؑ وحواؑ کے نکلنے سے وابستہ ہیں' یعنی باپ کا پہلا گناہ اور کفارہ کے لیے حضرت عیسیٰؑ کا سولی پر چڑھنا۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کی تعبیر مثبت نہیں ہے بلکہ اس کو ناگزیر برائی سمجھا جاتا ہے اور روحانی ترقی کے لیے سخت ترین ریاضتوں کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ مادی علوم اور دنیوی زندگی کو بہتر بنانے کی کوششوں میں مزاحم ہے۔ بلاشبہ طویل عرصہ تک یورپ کی عقل و دانش زندگی کے اسی تاریک تصور کی غلام رہی ہے۔ قرون وسطیٰ میں کلیسا مختار کل تھا اور یورپ کا سائنسی ریسرچ میں کوئی کردار نہیں تھا۔ اس کا روم اور یونان کے فلسفیانہ خیالات سے بھی کوئی واسطہ نہیں رہ گیا تھا جس سے یورپی ثقافت نے جنم لیا ہے۔ کلیسا نے عقل کے دیو کو زنجیروں سے باندھ رکھا تھا جس کے خلاف انسانی عقل نے بار بار بغاوت کی' لیکن کلیسا نے اس کو مار مار کر اپنا تابع مہمل بنائے رکھا۔ قرون وسطیٰ کی تاریخ یورپ کی عقل و خرد اور کلیسا کی جکڑ بندیوں کے درمیان کشمکش سے بھری ہوئی ہے۔

عیسائی کلیسا کی فکری زنجیروں سے یورپی خرد کو نشاۃ ثانیہ کے موقع پر آزادی نصیب ہوئی۔ اس کی وجہ بڑی حد تک عربوں کی ثقافت اور ان کے افکار کے اثرات تھے جو کئی صدیوں سے مغرب پر پڑ رہے تھے۔

قدیم یونان اور اس کے بعد کی یونانی ثقافت کے اچھے پہلوؤں کو عربوں نے اختیار کر لیا تھا اور ابتدائی اسلامی سلطنت کے قیام کے بعد صدیوں میں ان کو ترقی دی۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یونانی افکار کو قبول کرنے کا عربوں اور مسلمانوں کو فائدہ ہوا۔ میرے نزدیک اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اسلامی افکار اور قانون کو ارسطا طالیسی اور نوفلاطونی تصورات کے احیاء سے متعارف کرانے میں مسلمانوں کو جو بھی مشکلات پیش آئیں' لیکن اس کا یہ فائدہ ضرور

Marfat.com

ہوا کہ اس نے یورپی افکار کو زبردست تحریک دی۔ قرون وسطیٰ میں یورپ میں پیداواری قوتوں کو استعمال نہیں کیا گیا' اس دور میں علوم جامد رہے' توہم پرستی کا رواج رہا۔ سماجی زندگی اتنی خام تھی کہ اس کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس مرحلہ پر عالم اسلام کی ثقافتی یلغار شروع ہوئی۔ سب سے پہلے مشرق میں صلیبیوں کی جنگی مہمات کے اثرات' مغرب میں مسلم اسپین اور سسلی میں شاندار علمی کامیابیوں اور بعد ازاں مشرق قریب سے جنیوا اور وینس کی جمہوریاؤں کے بڑھتے ہوئے تجارتی تعلقات نے یورپی تہذیب کے بند دروازوں پر دستک دینی شروع کر دی۔ یورپی دانشوروں اور مفکروں کے سامنے ایک اور تہذیب نمودار ہوئی جس نے ان کی نگاہیں خیرہ کر دیں' جو بڑی مہذب' ترقی کی راہ پر رواں دواں' پُر جوش زندگی سے بھرپور اور ثقافتی دولت سے مالا مال تھی اور جس کو یورپ بہت پہلے کھو چکا تھا اور بھول بھی چکا تھا۔ عربوں نے جو کچھ کیا' وہ یہ تھا کہ انہوں نے قدیم یونانی علوم کو زندہ کر دیا' اپنی نئی سائنسی دنیا پیدا کی اور تحقیق اور فلسفہ کی نئی راہیں دریافت کیں اور انہیں مختلف راستوں سے مغربی دنیا میں منتقل کیا۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ ہم آج جس سائنسی دنیا میں رہ رہے ہیں' اس نے عیسائی یورپ میں آنکھ نہیں کھولی بلکہ وہ دمشق' بغداد' قاہرہ' قرطبہ' نیشاپور اور سمرقند کے اسلامی مراکز میں پیدا ہوئی۔

اسلامی تہذیب کے یورپ پر بڑے گہرے اثرات پڑے۔ اس سے مغرب کے آسمانوں پر نئی روشنی ہویدا ہوئی جس نے مغرب میں نئی روح پھونک دی اور ترقی کی تڑپ پیدا کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ یورپی مورخین نے اس کو احیائے علوم یا نشاۃ ثانیہ (Renaissance) یعنی نیا جنم قرار دیا۔ دراصل یہ یورپ کا نیا جنم ہی تھا۔

اسلامی ثقافت سے کئی طاقتور اور جاندار لہریں پیدا ہوئیں جنہوں نے یورپ کے بہترین دماغوں کو عیسائی کلیسا کے تباہ کن غلبے کی مضبوط زنجیروں کو توڑنے کے لیے نئی قوت فراہم کی۔ اس کشمکش کا آغاز اصلاحی تحریکوں کی صورت میں ہوا جو بیک وقت مختلف یورپی ملکوں میں شروع ہوئیں جن کا مقصد یہ تھا کہ عیسائی طرز فکر کو زندگی کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے۔ یہ تحریکیں بڑی جاندار تھیں۔ اگر انہیں صحیح معنوں میں روحانی کامیابی حاصل ہو جاتی تو یہ پورے یورپ میں سائنس اور مذہبی فکر کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کا باعث بن جاتیں' لیکن قرون وسطیٰ میں کلیسا نے جو نقصان پہنچا دیا تھا' وہ اتنا گہرا اور ہمہ گیر تھا کہ اس کو محض اصلاح سے پورا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مزید برآں ان تحریکوں کے اندر بہت جلد مفاد پرست گروہوں کے مابین سیاسی کشمکش شروع ہو گئی۔ بجائے اس کے کہ ان سے عیسائیت کی اصلاح ہوتی' یہ جلد ہی دفاعی رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئیں اور رفتہ رفتہ ان کا رویہ معذرت خواہانہ ہو گیا۔ کلیسا نے' خواہ کیتھولک ہو یا پروٹسٹنٹ' اپنی ذہنی شعبدہ بازی' اپنے ناقابل فہم عقائد' دنیا سے اپنی نفرت اور مظلوم عوام کے کندھوں پر سوار ہو کر اقتدار حاصل کرنے والوں کی بے جا حمایت ترک نہیں کی بلکہ اس نے اپنے کھوکھلے دلائل کے ساتھ ان برائیوں کی وکالت کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے کہ عشرے اور صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ یورپ میں مذہبی افکار کی گرفت کمزور سے کمزور ہوتی چلی گئی' یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی کے انقلاب فرانس کا سیلاب کلیسا کی برتری کو بہا کر لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی کلیسا کے سماجی اور سیاسی تصورات بھی یورپ کے

Marfat.com

مختلف ملکوں میں انقلاب کی نذر ہو گئے۔

اس وقت ایک مرتبہ پھر یہ ظاہر ہوا کہ قرون وسطٰی کی کلامی دینیات کے مردہ ہاتھوں سے نجات حاصل کر کے ایک نئی احیاء یافتہ تہذیب ابھر رہی ہے جس کا یورپ منتظر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کی ابتدا میں فلسفہ' آرٹ' ادب اور سائنس کے شعبوں میں یورپ میں بعض بہترین اور روحانی طور پر بڑی طاقتور شخصیات پیدا ہوئیں' لیکن روحانی زندگی کا حقیقی مذہبی تصور صرف چند افراد تک ہی محدود رہا۔ یورپ کے عوام جو طویل عرصہ سے مذہبی عقائد کے اسیر تھے اور جن کا انسان کی فطری کاوشوں سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا' اپنی رہائی کے بعد بھی مذہب کے صحیح تصور سے آشنا نہیں ہو سکے۔

یورپ میں مذہب کے احیاء کی راہ میں رکاوٹ بننے والا سب سے اہم عقلی عنصر یہ تصور تھا کہ حضرت عیسیٰؑ ''خدا'' کے بیٹے ہیں۔ فلسفیانہ ذہن رکھنے والے عیسائیوں نے اس تصور کو بھی اس کے لغوی معنی میں نہیں لیا۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت انسانی شکل میں ظاہر ہوئی تھی' لیکن بدقسمتی سے ہر شخص فلسفیانہ ذہن نہیں رکھتا' اس لیے عیسائیوں کے سوادِ اعظم نے ''بیٹا'' کے معنی بیٹا ہی لیے' اگرچہ ہمیشہ اس کو صوفیانہ رنگ بھی دیا گیا اور کہا گیا کہ عیسیٰؑ کو ''خدا'' کا بیٹا کہنے کے معنی خود ''خدا'' کے ہیں جس نے سفید داڑھی والے ایک مہربان بوڑھے شخص کی صورت اختیار کر لی تھی۔ انتہائی فنکارانہ مہارت سے بنائی گئیں اس کی بے شمار پینٹنگز موجود ہیں جو یورپ کے لاشعوری ذہن پر منقش ہو گئی ہیں۔ جس زمانہ میں یورپ میں عیسائی عقیدہ کا راج تھا' اس وقت اس عجیب و غریب تصور کو چیلنج کرنے کا کوئی امکان نہیں تھا' لیکن ایک مرتبہ جب قرون وسطیٰ کی عقلی زنجیریں ٹوٹ گئیں تو غور و فکر کرنے والے یورپی انسانی شکل میں ''خدا'' کے زمین پر آنے کے تصور کو ہضم نہیں کر سکے۔ دوسری طرف ''بشریت سے خدائی تک'' کا عقیدہ خدا کے مقبول عام تصور کا نمایاں جزو بن چکا تھا۔ کلیسا کی تعلیمات میں ''خدا'' کا جو تصور پیش کیا گیا ہے' نیا یورپی فکر اس کو ماننے سے انکاری ہو گیا۔ چونکہ وہ ''خدا'' کے کسی اور تصور سے واقف نہ تھا' اس لیے اس نے ''خدا'' ہی کی نفی کر دی اور ساتھ ہی مذہب کا بھی منکر ہو گیا۔

دیار مغرب کے رہنے والوں میں صنعتی اور دیگر شاندار مادی ترقیوں نے نئی دلچسپیاں پیدا کر دیں جس سے مغرب میں مذہبی خلا پیدا ہو گیا۔ اس خلا میں مغربی تہذیب نے خطرناک موڑ اختیار کر لیا۔ یہ ہر اس شخص کے نقطہ نظر سے المیہ تھا جو مذہب کو انسانی زندگی کی مضبوط ترین حقیقت مانتا ہے۔ عیسائیت کی تثلیث کے اسیری سے رہائی حاصل کرنے کے بعد یورپی ذہن تمام حدود پھلانگ گیا اور رفتہ رفتہ انسان کی روحانی زندگی کی سوچی سمجھی مخالفت کے گرداب میں پھنس گیا۔ روحانی اتھارٹی کی مدعی طاقتوں کا جو خوف لاشعور میں بیٹھ گیا تھا' اس کے ردعمل کی وجہ سے یورپ اصولی اور عملی طور پر مذہب کی مخالف قوتوں کا چمپئن بن گیا۔ اس طرح وہ اپنے اصل رومی ورثہ کی طرف لوٹ گیا۔

کسی کو اس موقف پر موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ یہ دوسرے مذاہب پر عیسائی عقیدہ کی امکانی برتری نہیں تھی جس نے مغرب کو شاندار مادی کامیابیاں حاصل کرنے کے قابل بنایا کیونکہ ان کامیابیوں کا تصور بھی نہیں کیا جا

Marfat.com

سکتا تھا۔اگر یورپ کی عقلی طاقتوں نے عیسائی کلیسا کے بنیادی اصولوں کے خلاف تاریخی جدوجہد نہ کی ہوتی۔ یورپ کا موجود مادہ پرستانہ تصور زندگی عیسائیت کی ''روحانیت'' کے خلاف ایک انتقام ہے' کیونکہ عیسائیت کی روحانیت کا انسانی زندگی کی فطری سچائیوں سے کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔

یہ ہمارے دائرہ میں نہیں آتا کہ عیسائیت اور جدید مغربی تہذیب کے تعلقات کا گہرائی میں جا کر جائزہ لیا جائے۔ میں نے صرف تین بڑے غالباً بنیادی اسباب کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے کہ جدید مغربی تہذیب اپنے تصورات اور طور طریقوں سے مکمل طور پر مذہب کے خلاف کیوں ہے۔ پہلا سبب یہ ہے کہ یہ تہذیب رومی تہذیب کا ورثہ ہے جس کا انسانی زندگی اور اس کی فطری اقدار کے متعلق رویہ خالص مادہ پرستانہ تھا۔ دوسرا سبب عیسائیت کے خلاف انسانی فطرت کی بغاوت ہے جبکہ عیسائیت انسان کی فطری خواہشات سے نفرت کرتی اور ان کے حصول کی جائز کوششوں کو کچلتی رہی ہے (اس مقصد کے لیے سیاسی اور اقتصادی قوتوں کے لیڈروں کے ساتھ عیسائیت کا روایتی گٹھ جوڑ رہا ہے اور وہ صاحبان اقتدار کے استحصالی اور ظالمانہ ہتھکنڈوں کی حمایت کرتی رہی ہے)۔ تیسرا سبب یہ تصور ہے کہ ''خدا'' انسان کی شکل میں دنیا میں آیا۔

مذہب کے خلاف بغاوت کامیاب رہی۔ یہ اتنی کامیاب ہوئی کہ عیسائیوں کے مختلف فرقے اور کلیسا مجبور ہو گئے کہ وہ یورپ کے سماجی اور ذہنی حالات کے مطابق اپنے اصولوں میں بتدریج تبدیلیاں کریں۔ مذہب کا بنیادی کام اپنے ماننے والوں کی اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہونا اور اس کو تبدیل کرنا ہوتا ہے' لیکن عیسائیت نے سیاست کا نقاب اوڑھ کر نئی روایات کو برداشت کرنا شروع کر دیا۔ اس لیے عوام کے نزدیک مذہب کے معنی فقط ظاہری رسوم و رواج رہ گئے جیسا کہ قدیم روم کے دیوتاؤں کے ساتھ ہوا تھا جن کو معاشرہ پر کسی قسم کا اثر ڈالنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اب بھی مغرب میں بہت سے ایسے افراد موجود ہیں جو صحیح مذہبی انداز فکر رکھتے ہیں۔ وہ لوگ یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کے عقائد ان کی تہذیب کی روح کے مطابق ہیں لیکن ایسے لوگ استثناء کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کا ایک عام آدمی' خواہ وہ جمہوری ہو یا فاشسٹ' سرمایہ دار ہو یا کمیونسٹ' مزدور ہو یا دانشور' صرف ایک مثبت ''مذہب'' یعنی مادی ترقی کو مانتا ہے۔ اب یہ عقیدہ بن چکا ہے کہ انسان کا نصب العین زندگی کو آسان تر اور زیادہ آرام دہ بنانا ہے جس کو ''قدرت سے آزادی'' کے نام سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس مذہب کے مندر بڑے بڑے کارخانے' سینما' کیمیاوی لیبارٹریاں' رقص گاہیں اور ہائیڈرو الیکٹرک ورکس ہیں اور اس کے پادری موسیقار' انجینئر' فلم اسٹار' صنعت کار اور بڑے بڑے کھلاڑی ہیں۔ اقتدار اور لذت کے حصول کی اس شدید خواہش کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ باہم حریف گروہ بھی پیدا ہو گئے ہیں جو پوری طرح مسلح ہیں اور اس پر تلے بیٹھے ہیں کہ جب ان کے مفادات کا ٹکراؤ ہو تو وہ ایک دوسرے کو نیست و نابود کر دیں۔ ثقافتی اعتبار سے اس کے نتیجہ میں ایک ایسا انسان وجود میں آ گیا ہے جس کی اخلاقیات صرف عملی افادیت تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور اس کا خیر و شر کا اعلیٰ ترین معیار مادی کامیابی ہے۔

Marfat.com

اس وقت مغرب کی سماجی زندگی میں جو زبردست تبدیلی ہو رہی ہے' اس میں یہ اخلاقیات جڑ پکڑتی جا رہی ہے کہ جو کچھ مفاد عامہ میں ہے وہی ٹھیک ہے' اس لیے معاشرہ کی مادی خوشحالی پر براہ راست اثر انداز ہونے والی اقدار مثلاً فنی مہارت' حب الوطنی اور قوم پرستی کو مبالغہ آمیز طور پر فروغ دیا جا رہا ہے جبکہ وہ تمام اقدار جن کی خالص اخلاقی بنیاد تھی' مثلاً اولاد کی محبت یا جنسی وفاداری' تیزی سے اپنی اہمیت کھو رہی ہیں' کیونکہ ان سے معاشرہ کو کوئی مادی فائدہ تک نہیں پہنچتا۔ کسی دور میں گروہ یا قبیلہ کی فلاح و بہبود کے لیے مضبوط خاندانی رشتوں کو فیصلہ کن حیثیت حاصل تھی' اب ان کی جگہ اجتماعی ادارے لے رہے ہیں جن کی بہت سی شاخیں ہیں اور معاشرہ بنیادی طور پر فنی معاشرہ بن چکا ہے اور اس کو تیزی سے مشینی خطوط پر استوار کیا جا رہا ہے۔ اس میں بیٹے کے باپ کے ساتھ رویہ کی کوئی خاص سماجی اہمیت نہیں ہے۔ جب تک کہ باپ بیٹا معاشرہ کی معروف حدود کو نہ پھلانگیں اور اس معروف کے اندر رہتے ہوئے آپس میں ملیں برتیں' اس وقت تک معاشرہ ان سے تعرض نہیں کرتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغربی باپ کا روز بروز اپنے بیٹے پر اختیار کمزور پڑتا جا تا رہا ہے اور بیٹا باپ کو عزت و احترام سے محروم کرتا جا رہا ہے۔ اس طرح باپ بیٹے کے روایتی تعلقات آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں جنہیں عملاً مشینی معاشرہ کے تصورات نے دوراز کار بنا دیا ہے کیونکہ اس معاشرہ میں فرد پر فرد کے اختیارات ختم کرنے کا رجحان ہے۔ اس تصور کا منطقی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ خاندان کے افراد اپنی خاندانی ذمہ داریوں سے آزاد ہو رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ''قدیم'' جنسی اخلاقیات بھی رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے۔ جدید مغرب میں جنسی وفاداری اور جنسی ضبط قصہ ماضی بن رہا ہے کیونکہ ان کی بنیاد زیادہ تر اخلاقیات پر تھی اور اخلاقی تصورات کا معاشرے کی مادی فلاح پر کوئی قابل محسوس فوری اثر نہیں پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ جنسی ضبط تیزی سے اپنی اہمیت کھو رہا ہے۔ اس کی جگہ ''نئی'' اخلاقیات لے رہی ہے جس کے مطابق ہر فرد کو اپنے جسم پر مکمل اختیار اور آزادی حاصل ہے۔ مستقبل قریب میں جنسی پابندیوں کی بنیاد آبادی پر کنٹرول اور اچھی نسل پیدا کرنے پر ہوگی۔ (یہ خدشات اب عملی اور خوفناک شکل میں ہمارے سامنے آرہے ہیں۔)

یہ مشاہدہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ جس مذہب دشمنی کے ارتقاء کا اوپر ذکر کیا گیا ہے' وہ کس طرح سوویت یونین میں اپنے منطقی کمال تک پہنچا جو ثقافتی اعتبار سے بقیہ مغربی دنیا سے مختلف نہیں ہے۔ کمیونسٹ تجربہ جدید مغربی تہذیب کی مذہب دشمنی بلکہ روحانی رجحانات کی دشمنی کی بھی تکمیل ہے۔ سامراجی مغرب اور کمیونزم کے مابین مخالفت صرف اس بنا پر نظر آتی ہے کہ مشترکہ نصب العین کی طرف ان کی پیش قدمی کی رفتار مختلف ہے۔ مستقبل میں ان دونوں کی داخلی مماثلت زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوتی چلی جائے گی۔ اس کے آثار اب بھی ان دونوں میں نظر آرہے ہیں۔ ان کا مشترکہ رجحان یہی ہے کہ انسان ایک اجتماعی مشینری' جس کو معاشرہ کہا جاتا ہے' کی خالص مادی ضروریات کے آگے دستبردار ہو جائے' لہٰذا اس معاشرہ میں انسان پہیے کے صرف ایک کیل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کا صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس قسم کی تہذیب مذہبی اقدار پر مبنی ثقافت کے لیے زہر ہلاہل کی

Marfat.com

حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارا بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی انداز فکر کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنا ممکن ہے۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔ اسلام میں انسان کا پہلا اور بنیادی مقصد اس کا اخلاقی ارتقاء ہے اور اخلاقیات کو خالص مادہ پرستانہ نظریہ پر فوقیت حاصل ہے جبکہ جدید مغربی تہذیب میں یہ معاملہ بالکل الٹ ہے۔ اس میں مادی فوائد انسان کی تمام سرگرمیوں پر حاوی ہیں۔ اس تہذیب نے اخلاقیات کو قعر گمنامی میں پھینک دیا ہے۔ اب اس کی صرف نظری حیثیت باقی رہ گئی ہے جس کا معاشرے پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں۔ ان حالات میں وہاں اخلاقیات کی بات کرنا منافقت کے سوا کچھ نہیں۔ جدید مغربی مفکرین کے نزدیک معقولیت یہی ہے جس کا داخلی جواز بھی موجود ہے کہ مغربی تہذیب کی سماجی قدروں پر قیاس آرائیاں کرتے ہوئے وہ آسمانی اخلاقیات کا ذکر تک نہ کریں اور جو مفکر اپنے اخلاقی رویوں کا واضح تصور نہیں رکھتے' ان کے نزدیک آسمانی اخلاقیات کا تصور غیر عقلی یا غیر ناطق بات ہے' جیسے ریاضی دان بعض غیر ناطق اعداد استعمال کرتا ہے جو کسی حسی یا مادی شے کی نمائندگی نہیں کرتے' تاہم وہ انسانی ذہن کی ساختی حدود کے باعث تصور کے خلاپُر کرنے کے لئے درکار ہوتے ہیں۔

اخلاقیات سے گریز کا رویہ مذہب سے مطابقت نہیں رکھتا' اس لیے جدید مغربی تہذیب کی اخلاقی بنیاد اسلام سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مسلمان مغرب سے طبعی سائنس اور اطلاقی سائنسوں کا علم حاصل نہ کریں' لیکن اس کے معنی یہ ضرور ہیں کہ ثقافتی تعلقات قائم نہ کریں۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغربی تہذیب کی روح' طرز زندگی اور سماجی اداروں کی نقل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہم اسلامی نظریہ پر کاری ضرب نہ لگا دیں۔

حواشی

۱۔ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں تھیوکریسی (مذہبی ریاست) کا لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں کر رہا ہوں جن معنوں میں مغرب میں عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اپنے تاریخی تجربات کی روشنی میں مغرب مذہبی ریاست سے مراد کلیسا کے سیاسی اختیارات لیتا ہے یعنی قرون وسطیٰ کے کرسچن چرچ اور پادریوں کے سیاسی اختیارات۔ اس کے مقابلہ میں اسلام پاپائیت کو تسلیم نہیں کرتا اور نہ اسلام میں کرسچن چرچ کا کوئی ادارہ ہو سکتا ہے' چنانچہ جب ہم مسلمان تھیوکریسی کی بات کرتے ہیں تو وہ اس کا سماجی اور سیاسی ڈھانچہ ہے جس میں قوانین شریعت کے مطابق بنائے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں میری کتاب ''اسلام میں ریاست اور حکومت کے اصول'' (The Principles of State and Government in Islam) کے باب ''اصطلاحات اور تاریخی نظیر'' کا مطالعہ کیا جائے۔

۲۔ قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح کے لیے محمد اسد کے ترجمہ تفسیر The Message of the Qur'an کے صفحہ ۸ پر نوٹ نمبر ۲۲ دیکھئے۔

(از: ملت اسلامیہ دوراہے پر۔ محمد اسد، مترجم ڈاکٹر محبوب سبحانی، لاہور، ۲۰۰۴ء)

Marfat.com

محمد اسد/مترجم: طاہر منصور فاروقی

صلیبی جنگوں کا سایہ

روحانی عدم مطابقت کے علاوہ ایک اور وجہ بھی ہے کہ آخر کیوں مسلمانوں کو مغربی تہذیب کی تقلید سے گریز کرنا چاہیے۔ یہ وجہ اس کے تاریخی تجربے ہیں جو اسلام کے خلاف عجیب قسم کی دشمنی کا گہرا رنگ لیے ہوئے ہیں۔

یہ سبب بھی کسی حد تک یورپ کے قدیم یونانی اور رومن دور کی میراث ہے۔ یونانی اور رومن صرف خود کو ''مہذب'' سمجھتے تھے۔ بقیہ سب انسان بالخصوص بحر روم کے مشرق میں رہنے والے ''وحشی'' کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ تب سے تمام یورپی بقیہ تمام مخلوق پر اپنی نسلی برتری کو ایک حقیقت سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یورپیوں کی اعلانیہ تذلیل مغربی تہذیب کا وطیرہ بن چکی ہے۔

یہ اکیلا سبب بہرحال اسلام کے بارے میں یورپ کے جذبات جاننے کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہاں بھی اس کا رویہ معمولی قسم کی ناپسندیدگی پر مبنی نہیں جیسا کہ دوسرے غیر علاقائی مذاہب اور ثقافتوں کے بارے میں ہے۔ اسلام کے لیے تو اس کا رویہ انتہائی گہرا اور شدید تعصب کا حامل ہے۔ اس کی بنیاد عقل و شعور پہ نہیں بلکہ جذباتیت پر استوار ہے۔ یورپ کو بدھ مت یا ہندومت کی سوچ بھی یقیناً قابل قبول نہیں' لیکن یہ ان کے لیے ایک متوازن ذہنی رویہ محفوظ رکھتا ہے' لیکن جوں ہی یہ اسلام کی طرف مڑتا ہے تو اس کا توازن درہم برہم ہو جاتا ہے اور ایک جذباتی جانبداری چھلک پڑتی ہے۔ یہاں تک کہ انتہائی معروف یورپی مستشرق بھی اسلام کے متعلق اپنی تحریروں میں غیر سائنسی جانبداری کے مجرم بن جاتے ہیں۔ ان کی تحقیق سے ایسا لگتا ہے جیسے اسلام کو محض سائنسی تحقیق کی کوئی چیز نہیں سمجھا جا سکتا ہے' بلکہ وہ کوئی مجرم ہے جو منصفین کے سامنے کھڑا ہے۔ کئی یورپی مستشرق تو کوئی ایک نکتہ پکڑ کر پبلک پراسیکیوٹر کا کردار ادا کر چکے ہیں۔ کچھ دوسروں نے ایک ایسے وکیل صفائی کا انداز اپنایا جو ذاتی طور پر یقین کر چکے ہوتے ہیں کہ ان کا موکل مجرم ہے۔ چنانچہ وہ نیم دلی کے ساتھ محض ''واقعات کی شدت'' کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زیادہ تر یورپی مستشرقین نے نتائج مرتب کرنے کے لیے جو تکنیک اپنائی' اس سے مشہور مذہبی عدالتوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو قرون وسطیٰ میں کیتھولک چرچ اپنے مخالفین کو سزا دینے کے لیے قائم کیا کرتے تھے۔ وہ غیر جانبداری کے ساتھ حقائق کا تجزیہ کرنے کی بجائے ہر دفعہ کسی ایسے متروک نتیجہ کو سامنے رکھ لیتے ہیں جو تعصب نے پیش کیا ہوتا ہے۔ وہ

Marfat.com

ایسے شواہد اکٹھے کرتے ہیں جو ان کے پسندیدہ نتائج کے مطابق ہوں۔ جب من مانے شواہد ملنا ممکن نہ ہوں تو وہ ان کو توڑ مروڑ کر سیاق وسباق سے الگ کر کے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کے نقطہ نظر کی توثیق ہو۔ اپنی کینہ پروری میں وہ دوسرے فریق (مسلمانوں) کے دلائل کو کوئی وزن نہیں دیتے۔

اس طرح کے طرز عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ کے مستشرقین کے لٹریچر میں ہمیں اسلام اور اسلامی امور کی مسخ شدہ تصویر ملتی ہے۔ یہ رویہ کسی ایک یورپی ملک تک محدود نہیں۔ جرمنی' انگلستان' روس' فرانس' اٹلی اور ہالینڈ غرض یہ کہ جہاں بھی مستشرقین نے اسلام کے بارے میں کچھ لکھا' وہ یہی کچھ پیش کرتے ہیں۔ جب بھی اسلام کے بارے میں منفی تنقید وتبصرہ کا کوئی حقیقی یا تصوراتی موقع بنتا ہے' ان کی کینہ پرور خوشی چھلک پڑتی ہے۔ چونکہ یہ یورپی مستشرقین بذات خود کوئی خصوصی نسل نہیں ہیں' بلکہ اپنی تہذیب اور سماجی ماحول کے شارح ہیں' چنانچہ ہم ناگزیر طور پر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مجموعی طور پر یورپی ذہن ایک مذہب یا ثقافت کی حیثیت سے اسلام کے خلاف تعصب میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس تعصب کا ایک سبب شاید وہ میراث ہے جو دنیا کو یورپی اور وحشی قوموں میں تقسیم کرنے کی عادی ہے۔ دوسرا سبب جو براہ راست اسلام سے تعلق رکھتا ہے' اس کا سراغ ماضی پر نظر ڈالنے سے اور خصوصاً قرون وسطیٰ کی تاریخ کو سامنے رکھنے پر نظر آ جاتا ہے۔

پہلا سب سے بڑا تصادم جس میں ایک طرف متحدہ یورپ اور دوسری طرف اسلام تھا' صلیبی جنگوں کی صورت میں ہوا۔ اتفاق سے یہ جنگیں اس وقت ہوئیں جب یورپی تہذیب کی ابتدا تھی۔ اس وقت یہ تہذیب ابھی چرچ سے وابستہ تھی اور روم کے زوال کے بعد آنے والی تاریک صدیوں کے آخری مرحلہ میں اپنے نئے راستے کی تلاش میں تھی۔ پھر اس کا لٹریچر نئے شباب سے گزرا۔ فنون لطیفہ گوتھوں' ہنوں اور آواریوں کی جنگ نما نقل مکانی کے اثرات سے مضمحل رہنے کے بعد بتدریج بیدا ہو رہے تھے۔ یورپ ابتدائی قرون وسطیٰ کی خام حالت سے بمشکل ابھرا ہی تھا۔ اسے ابھی ایک نیا ثقافتی شعور ملا تھا اور اسی کے ذریعے وہ کچھ زیادہ حساس ہو چکا تھا۔ اسی نازک وقت میں صلیبی جنگیں یورپ کو اسلام کے سامنے لائی تھیں۔ یقیناً صلیبی جنگوں سے پہلے بھی مسلمانوں اور یورپیوں کے درمیان جنگیں ہوتی ہیں۔ ان میں سسلی اور سپین پر مسلمانوں کا قبضہ اور جنوبی فرانس پر ان کے حملے قابل ذکر ہیں' لیکن یہ سب کچھ یورپ کے ثقافتی شعور کی بیداری سے پہلے ہوا تھا۔ چنانچہ ان کے ذہنوں میں یورپی نقطہ نظر یہ بات بٹھا چکی ہے کہ یہ سب کچھ مقامی مسائل کا شاخسانہ تھا جنہیں اپنی پوری اہمیت کے ساتھ نہیں سمجھا گیا تھا۔ بہر طور یہ صلیبی جنگیں ہی تھیں جنہوں نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فیصلہ کن انداز میں اسلام کے خلاف یورپ کا رویہ متعین کیا' جو آنے والی صدیوں میں برقرار رہا۔ صلیبی جنگیں اس لیے فیصلہ کن تھیں کہ یورپ کی نوخیزی کے دور میں رونما ہوئیں۔ ایک ایسا دور جس میں اس کی عجیب وغریب ثقافتی خصوصیات پہلی دفعہ خود کو مسلط کر رہی تھیں اور ابھی حتمی شکل اختیار کرنے کے مرحلہ میں تھیں۔ جس طرح افراد میں ہوتا ہے' اسی طرح اقوام میں بھی ان کے بچپن کا شوریدہ سر انداز شعوری یا غیر شعوری سطح پر بعد کی زندگی میں بھی برقرار رہتا ہے۔ ان کے ذہنوں میں نقش ہو چکا ہے کہ وہ اسلام کے شعوری تجربات کے ہاتھوں مشکلات

Marfat.com

سے دوچار ہوسکتے ہیں۔ یہی کچھ ان کے ساتھ صلیبی جنگوں میں ہو چکا ہے۔ اسلام نے یورپ کے عوام کی نفسیات پر ایک گہرا اور مستقل تاثر مرتب کیا تھا۔ مسلمانوں نے اپنے وقت میں جو عالمی جوش وولولہ بیدار کیا تھا' اس کی مثال یورپ کی تاریخ میں نہیں تھی۔ بعد میں جو کچھ اس نے پیش کیا' وہ بھی کسی موازنے کے قابل نہیں۔ خمار کی ایک لہر تھی جو پورے براعظم کو اپنے ساتھ بہالے گئی۔ فخر ومباہات نے قدم رکھا اور کم از کم کچھ عرصہ تک تو قوموں' ملکوں اور طبقات کی حدیں پھلانگ گیا۔ ٹھیک اسی زمانے میں اور تاریخ میں پہلی بار یورپ کو اتحاد ملا اور یہ اتحاد دنیائے اسلام کے خلاف تھا۔ ہم غیر ضروری مبالغہ آرائی سے کام لیے بغیر کہہ سکتے ہیں کہ جدید یورپ نے صلیبی جنگوں کے جذبے سے جنم لیا تھا۔ اس سے پہلے اینگلو سیکسن اور جرمن' فرانسیسی' نارمن' اطالوی اور ڈینش قوموں کی تفریق تھی' لیکن صلیبی جنگوں کے دوران ''مغربی تہذیب'' کا ایک نائی تصور ابھرا۔ تمام یورپی قوموں کا ایک مشترکہ نصب العین تخلیق ہوا اور اس نئی تخلیق کے پیچھے اسلام دشمنی کا دیوتا متحرک تھا۔

تاریخ کی عظیم ستم ظریفیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اجتماعی شعور کا یہ پہلا قدم جو یورپی دنیا کی طرف سے اٹھایا گیا' ان لہروں کی وجہ سے تھا جن کی پشت پناہی مسیحی چرچ کر رہا تھا' جب کہ مغرب کی بعد کی کامیابیاں صرف اس وجہ سے ممکن ہوئیں کہ چرچ جن باتوں کا اظہار کرتا تھا' ان کے خلاف عقلیت پسندی نے بغاوت کر دی۔ یہ ایک المناک صورت حال تھی۔ مسیحی چرچ کے نقطہ نظر سے بھی اور اسلام کے نقطہ نظر سے بھی۔ چرچ کے لیے یوں المناک تھی کہ ایک چونکا دینے والے آغاز کے بعد اس کی گرفت یورپ کے ذہن پر ختم ہوگئی۔ اسلام کے لیے یوں المیہ ثابت ہوئی کہ اسے صلیبی جنگوں کی آگ سے کئی کھلی اور چھپی صورتوں کے ذریعے صدیوں تک واسطہ رہا۔

ناقابل بیان مظالم کے بطن سے جو چرچ کے عمائدین نے مسلمانوں کے علاقوں میں اپنی فتوحات کے بعد ڈھائے' وہ زہریلے بیج پھوٹے جنہوں نے صدیوں پر محیط مشرق اور مغرب کے درمیان دشمنی کو فروغ دیا۔ ورنہ اس طرح کے معاندانہ جذبات کی کوئی موروثی ضرورت نہیں تھی۔ اگرچہ اسلامی اور مغربی تہذیبیں جیسا کہ ہم یقین رکھتے ہیں' اپنی روحانی بنیادوں اور سماجی ساخت کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں' پھر بھی یہ دونوں ایک دوسرے کو برداشت کر لیتیں اور دوستانہ اختلاط کے ساتھ ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو رہ سکتی تھیں یہ امکان محض تصوراتی طور پر نہیں بلکہ واقعتاً مہیا کیا گیا تھا۔ اسلام کی طرف سے باہمی احترام اور درگزر کی پُرخلوص خواہش ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔ جب خلیفہ ہارون الرشید نے شہنشاہ شارلیمان کے پاس اپنی سفارت بھیجی تو یہ اقدام اسی خواہش کے تحت اٹھایا گیا تھا۔ اسے فرانکوں کے ساتھ دوستی کے ذریعے کسی مالی منفعت کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ ان دنوں یورپ ثقافتی لحاظ سے انتہائی ابتدائی مرحلہ میں تھا۔ وہ اس موقع کی افادیت کو ٹھیک طرح سمجھ ہی نہ سکا۔ تاہم اس نے کسی ناپسندگی کا بھی اظہار نہ کیا' لیکن پھر اچانک افق پر صلیبی جنگیں نمودار ہوگئیں اور انہوں نے اسلام اور مغرب کے درمیان تعلقات کو بننے سے پہلے بگاڑ دیا' لیکن یہ محض جنگ کی بات نہیں تھی۔ انسانی تاریخ میں قومیں کئی دفعہ آپس میں برسرپیکار ہوئی ہیں اور پھر تصادم کو بھول چکی ہیں۔ کئی دشمنیاں دوستی میں بدل چکی ہیں' لیکن وہ شر جو صلیبی جنگوں نے پیدا کیا' وہ ہتھیاروں تک محدود نہ

Marfat.com

رہا۔ یہ پہلا اور اہم ترین شر علمی سطح پر پھیل گیا۔ اس نے یورپی ذہن کو اسلام کے خلاف زہر آلود خیالات سے بھر دیا۔ اسلام کی تعلیمات اور عقائد کو مسخ کر کے یورپ کے معصوم ذہنوں میں اتارا۔ اسی دور میں اسلام کو ایک مضحکہ خیز مذہب کے طور پر پیش کیا گیا جس میں شہوانیت اور بربریت کے سوا کچھ نہ تھا' جو روح کی پاکیزگی پیدا کرنے کی بجائے محض رسموں کی ادائیگی پر زور دیتا تھا۔ یورپیوں کے ذہنوں میں مضحکہ خیز تاثرات اور پھر برقرار رہا۔ انہی دنوں پہلی مرتبہ پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یورپ میں ''ماہومد'' کہا گیا۔

نفرت کا بیج بو دیا گیا تھا۔ صلیبی جنگوں کا جوش جلد ہی سارے یورپ میں پھیل گیا۔ اسی نے سپین کی عیسائی آبادی کو ''کافروں'' سے اپنا وطن واپس لینے کے لیے لڑنے کا حوصلہ دیا۔ مسلم سپین کی تباہی اگرچہ صدیوں میں مکمل ہوئی' لیکن اس لڑائی کی طوالت کے سبب یورپ کے اسلام دشمن جذبات گہرے اور مستقل ہو گئے۔ اس کے نتیجہ میں سپین سے مسلمان عنصر کو نکالنے کے لیے جس سفاکی اور بہیمیت کا مظاہرہ کیا گیا' اس کا منظر کرہ ارض نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس پر پورا یورپ خوشی سے جھوم اٹھا' حالانکہ سپین میں اس کی فتح کے نتیجہ میں نہ صرف سائنس اور ثقافت کی تباہی ہوئی بلکہ قرون وسطیٰ کی جہالت اور اکھڑ پن کو فروغ ملا۔

لیکن اس سے پہلے کہ سپین کے واقعات کی گونج ختم ہوتی' ایک تیسرا بڑا واقعہ رونما ہو گیا۔ اس کی اہمیت نے اسلام اور مغربی دنیا کے درمیان تعلقات کی تباہی میں رہی سہی کسر پوری کر دی۔ یہ واقعہ ترکوں کے ہاتھوں سقوط قسطنطنیہ تھا۔ یورپ کی نظروں میں قدیم یونانی اور رومن شان و شوکت کی باقیات بازنطینی سلطنت کی شکل میں موجود تھیں۔ اسے وہ ہمیشہ سے ایشیاء کے ''وحشیوں'' کے سامنے مضبوط سمجھتے تھے۔ اس کی حتمی شکست کے بعد یورپ کے دروازے مسلم سیلاب کے لیے کھل گئے تھے۔ بعد کی جنگی کیفیت' صدیوں میں اسلام کے خلاف یورپ کی دشمنی محض ثقافت کا معاملہ نہ رہی بلکہ سیاسی اہمیت اختیار کر گئی۔ اس بات نے دشمنی کی شدت میں مزید اضافہ کر دیا۔

اس تمام تر صورت حال میں بھی یورپ نے ان آویزشوں سے قابل ذکر حد تک فائدہ اٹھایا۔ نشاۃ ثانیہ کے دوران یورپی آرٹس اور سائنس کی حیات نو اسلامی خصوصاً عربی ذرائع کے بھرپور استفادے سے ممکن ہوئی جو مشرق اور مغرب کے درمیان مادی رابطوں کی بدولت میسر آئے۔ یورپ نے اس سے ثقافت کے میدان میں جو کچھ حاصل کیا' وہ دنیائے اسلام سے بھی زیادہ تھا' لیکن یورپ نے اپنی قدیم نفرت اور اسلام دشمنی کی وجہ سے کبھی اس احسان کو تسلیم نہیں کیا' بلکہ اس کے برعکس وقت کے ساتھ ساتھ نفرت کو بڑھایا اور اسے ٹھوس انداز میں رسم بنا دیا۔ جب بھی لفظ ''مسلم'' کا ذکر ہوتا' یہ نفرت پھیل جاتی۔ یہ لوگوں کے روزمرہ ضرب الامثال میں شامل ہو گئی تھی۔ پھر اسے ہر یورپی مرد اور عورت کے دل میں اتار دیا گیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ تمام ثقافتی تبدیلیوں کے باوجود برقرار رہی۔ اصلاح مذہب کا دور آیا اور یورپ دو مذہبی گروہوں میں تقسیم ہو گیا۔ دونوں فرقے ایک دوسرے کے خلاف مسلح تصادم میں مصروف ہو گئے' لیکن باہمی دشمنی کے باوجود اسلام دشمنی ان کی قدر مشترک رہی۔ ایک وقت ایسا آیا جب یورپ میں مذہبی جذبات تحلیل ہونا شروع ہو گئے' لیکن اسلام دشمنی برقرار رہی۔ فرانسیسی فلاسفر اور شاعر والٹیئر اٹھارویں صدی

Marfat.com

میں عیسائیت اور اس کے چرچ کا شدید دشمن تھا' مگر وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کا بھی شدید دشمن تھا۔ کچھ عشروں بعد ایک وقت ایسا آیا جب یورپ کے تعلیم یافتہ لوگوں نے غیر ملکی مذاہب اور ثقافتوں کا مطالعہ اور اس کا تجزیہ ہمدردی سے کرنا شروع کر دیا' لیکن اسلام کے معاملے میں ان کی روایتی نفرت اور کینہ پروری انہیں سائنسی و عقلی رویہ چھوڑ کر غیر دانشمندانہ جانبداری پر لے آتی اور پھر جو ثقافتی خلیج بدقسمتی سے تاریخ نے اسلام اور مغرب کے درمیان حائل کی تھی' وہ عبور نہ ہو سکی۔ اسلام کی توہین یورپی فکر لازمی حصہ بن گئی۔ حقیقت یہی ہے کہ جدید زمانے کے اولین مستشرقین وہی عیسائی مبلغین تھے جو مسلمان ملکوں میں کام کرتے رہے۔ انہوں نے اسلام کی جو مسخ شدہ تصویر پیش کی' اس نے یورپی ذہنوں کو ''کافروں'' کے لیے مخصوص رویہ اپنانے میں مدد دی۔ یہ ذہنی موڑ اب بھی موجود ہے' حالانکہ مشرقی علوم یورپی مشنریوں کے اثرات سے آزاد ہو چکے ہیں اور گمراہ کن مذہبی جنون کا بہانہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کے لیے ان کا تعصب جدی جبلت ہے جو خبط کی صورت میں صلیبی جنگوں کے وقت سے یورپیوں کے دل و دماغ پر سوار ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ ایک قدیم دشمنی جو اصل میں مذہبی نوعیت رکھتی تھی اور اپنے وقت میں ممکن تھی کیونکہ مسیحی چرچ کا غلبہ تھا' اب اس دور میں جب کہ مذہبی خیالات ماضی کا حصہ بن چکے ہیں' یہ اپنی پوری شد و مد سے کس طرح جاری رہ سکتی ہے؟

اس طرح کے الجھاؤ حیران کن نہیں ہیں۔ علم نفسیات میں یہ بات اچھی طرح سمجھی جاتی ہے کہ کوئی انسان پوری طرح ان مذہبی عقائد سے دور ہو سکتا ہے جو بچپن میں اس کے ذہن میں بٹھا دیئے گئے تھے' لیکن کچھ عجیب سی اوہام پرستی جو بنیادی طور پر انہی عقائد سے مربوط تھی' مسلسل اس کے ساتھ رہتی ہے اور عمر بھر عقلی جواز سے نبرد آزما رہتی ہے۔ یہی معاملہ اسلام کے بارے میں یورپیوں کے رویہ کا ہے۔ اگرچہ مذہبی سوچ جو اسلام دشمنی کی جڑوں میں پائی جاتی تھی' اس دوران زندگی کے مادی نقطہ نظر کو اپنی جگہ دے چکی ہے' لیکن پرانی ناراضگی (عداوت) جوں کی توں یورپ کے لاشعور میں موجود ہے۔ صلیبی جنگوں کا جذبہ ایک لطیف صورت میں یقینی طور پر ابھی تک یورپ میں پایا جاتا ہے' چنانچہ اس کی تہذیب کا رویہ مسلم دنیا کے بارے میں اسی سخت جان بھوت کے نقش رکھتا ہے۔

مسلم حلقوں میں ہم عموماً سنتے ہیں کہ اسلام کے ساتھ یورپ کی عداوت جو ماضی کے شدید تصادم کی وجہ سے تھی' ہمارے دور میں بتدریج ختم ہو رہی ہے۔ یہ ''الزام'' بھی دیا جاتا ہے کہ یورپ اسلام کی طرف اس کی مذہبی اور سماجی تعلیمات کے لیے میلان رکھتا ہے اور بہت سے مسلمان پوری سنجیدگی سے یقین رکھتے ہیں کہ یورپیوں کی اکثریت کا عنقریب مسلمان ہو جانا ناگزیر ہے۔ یہ اعتقاد ہمارے لیے غیر معقول نہیں کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جو غیر جانبدار تنقید کا سامنا کامیابی سے کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ انجام کار اسلام ہی تمام بنی نوع انسان کے لیے ایک قابل قبول عالمی مذہب ہو گا' لیکن دوسری طرف ایسا ہلکا سا بھی شائبہ نظر نہیں آتا کہ یہ بات مستقبل قریب میں رونما ہو سکے۔ جہاں تک مغربی تہذیب کا تعلق ہے تو یہ شدید قسم کے ذہنی اور سماجی انقلاب کے بعد ہی ممکن ہے جو یورپ کی موجودہ ثقافتی خود پسندی

Marfat.com

کو پاش پاش کر دے اور اس کی ذہنیت کو مکمل طور پر تبدیل کر دے جس کے بعد یہ زندگی کی مذہبی تشریح کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ آج کل تو مغربی دنیا کلی طور پر اپنی مادی کامیابیوں کی پرستش میں محو اس بات پر یقین وایمان رکھتی ہے کہ آسائش اور صرف آسائش ہی جدوجہد کے قابل ایک ہدف ہے۔ اس کی مادہ پرستی اور مذہبی رنگ رکھنے والے خیالات کی مذمت پوری قوت کے ساتھ بڑھ رہی ہے، لیکن جس طرح کچھ خوش فہم مسلمان توقع رکھتے ہیں، اس طرح مغرب کی مادہ پرستی اور مذہب بیزاری میں کوئی کمی نہیں آ رہی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جدید سائنس نے فطرت کے مظاہرے کے پیچھے ایک اکلوتی تخلیقی قوت کی موجودگی کو تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے۔ ایسا کہنے والے خوش فہم سمجھتے ہیں کہ مغربی دنیا میں ایک مذہبی شعور کی صبح طلوع ہو رہی ہے، لیکن اس طرح کے مفروضے یورپ کی سائنسی سوچ سے آگاہی نہ رکھنے کی وجہ سے محض فریب ہیں۔ کوئی سنجیدہ سائنس دان اس امکان کو رد کر سکتا ہے اور نہ آج تک رد کر سکا ہے کہ کائنات اپنی تخلیق میں اثر آفریں مقصد رکھتی ہے۔ تاہم سوال یہ ہے اور ہمیشہ سے رہا ہے کہ کون سی خوبیاں ایک فرد اس مقصد سے منسوب کر سکتا ہے۔ تمام آسمانی مذاہب کا دعویٰ ہے کہ یہ ایک ایسی قوت ہے جو مکمل شعور اور بصیرت رکھتی ہے۔ یہ قوت کسی منصوبے اور مقصد کے تحت کائنات کو تخلیق کرتی اور اس پر حکمرانی کرتی ہے۔ وہ خود کسی قانون کی پابند اور مجبور نہیں جسے ایک لفظ میں ''خدا'' کہا جاتا ہے، لیکن جدید سائنس نہ تو اس بات کو مانتی ہے اور نہ ماننے پر تیار ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ یہ سائنس کا میدان نہیں ہے) وہ شعور اور اختیار بالفاظ دیگر ''الوہیت'' کے سوال کو کھلا رکھتی ہے۔ اس کا رویہ کچھ ایسا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہو، لیکن مجھے اس کا علم نہیں اور میرے پاس اسے جاننے کے لیے سائنسی ذرائع نہیں ہیں۔ مستقبل میں یہ فلاسفی ایک قسم کی وحدت الوجود کا نظریہ رکھنے والی دہریت میں تبدیل ہو سکتی ہے جس میں روح اور مادہ، مقصد اور وجود، خالق ومخلوق سب کچھ ایک اور وہی قرار دے دیا جائے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس طرح کا عقیدہ خدا کے مثبت اسلامی تصور کی طرف ایک قدم ہوگا۔ یہ مادہ پرستی کو خدا حافظ کہنا نہیں بلکہ اسے مزید اوپر لے جانا اور زیادہ شائستہ قسم کے علمی درجہ پر رکھنا ہوگا۔

ٹھوس حقیقت یہ ہے کہ یورپ جس قدر اسلام سے دور آج کل ہے، کبھی بھی نہ تھا۔ ہمارے مذہب کے خلاف اس کی فعال دشمنی ممکن ہے زوال پذیر ہو، لیکن یہ بھی اسلامی تعلیمات سے آگاہی اور قدر دانی کے نتیجہ میں نہیں بلکہ اسلامی دنیا کی ٹوٹ پھوٹ اور بڑھتی ہوئی ثقافتی کمزوری کے پیش نظر ہے۔ یورپ کسی زمانے میں اسلام سے بہت خوفزدہ تھا۔ یہی خوف اسے ہر اس چیز کے خلاف معاندانہ رویہ اپنانے پر مجبور کرتا تھا جس میں اسلامی رنگ ہو، چاہے خالصتاً مذہبی اور سماجی امور کیوں نہ ہوں، لیکن اب جب کہ اسلام یورپی مفادات کے خلاف کسی اہمیت کا قائل نہیں رہا تو قدرتی بات ہے کہ خوف ختم ہونے پر یورپ اپنی اسلام دشمنی کی شدت میں کمی لے آئے۔ اگر اس کے معاندانہ جذبات کم سرگرم اور کم گہرے ہو چکے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کوئی ایسا نتیجہ اخذ کر لیں کہ مغرب داخلی طور پر اسلام کے قریب آ چکا ہے۔ صرف اور صرف ایک اشارہ ملتا ہے اور وہ اسلام کے لیے مغرب کی بڑھتی ہوئی بے نیازی ہے۔

Marfat.com

مغربی تہذیب نے کسی بھی طرح اپنے عجیب وغریب ذہنی رویہ میں تبدیلی پیدا نہیں کی۔ یہ آج بھی زندگی کے مذہبی تصور کا اتنا ہی دشمن ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ کوئی ایسی سنجیدہ شہادت موجود نہیں ہے جو مستقبل قریب میں کسی تبدیلی کا امکان ظاہر کرے۔ کچھ اسلامی تبلیغی افراد کا یورپ میں موجود ہونا یا کچھ یورپیوں اور امریکیوں کا اسلام قبول کر لینا کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے۔ (حلقہ بگوش اسلام ہونے والے افراد زیادہ تر اسلامی تعلیمات کو سمجھے بغیر آگے بڑھے ہیں) ایک ایسے دور میں جب مادیت پرستی غالب ہے' یہ بالکل فطری بات ہے کہ کچھ افراد یہاں اور وہاں جو ابھی تک روحانی حیات نو کے متمنی ہیں' بڑی رغبت کے ساتھ جو مذہبی تصورات پر مبنی باتیں سنتے ہیں۔ اس حوالے سے مغرب میں اسلامی تبلیغی مشن تنہا نہیں ہیں۔ لاتعداد عیسائی فرقے ''احیائے نو'' کے رجحانات کے ساتھ موجود ہیں۔ یہاں مضبوط قسم کی مذہبی تنظیموں میں تھیوسوفیکل موومنٹ نمایاں ہے۔ دیگر مذاہب کے پیروکار ہیں۔ بدھ مت کے مندر اور مشن ہیں۔ بدھ مت کے مشن بھی اسلامی تبلیغی مشنوں کی طرف سے دیئے جانے والے دلائل کے ساتھ دعوئ کر سکتے ہیں کہ یورپ بدھ مت کے قریب آ رہا ہے' لیکن دونوں مذاہب کے لوگوں کی طرف سے کئے جانے والے دعوے مضحکہ خیز ہیں: چند افراد کا اسلام یا بدھ ازم قبول کر لینا کم از کم یہ ثابت نہیں کرتا کہ دونوں مذاہب میں سے کسی ایک نے مغربی زندگی کو وسیع پیمانے پر متاثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ مزید آگے بڑھ کر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان مشنوں میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں کہ معتدل قسم کا اشتیاق پیدا کرنے کے علاوہ کچھ کر سکے۔ یہ بھی اس دلکشی کی وجہ سے ہوا ہے جو کوئی ''بیرونی'' مذہب تخیل پسند اذہان کے لیے پیدا کر سکتا ہے۔ یقیناً اس معاملے میں استثناء موجود ہے اور مذہب تبدیل کرنے والوں میں سے کچھ واقعی سچائی کے متلاشی ہوں۔ لیکن مستثنیات کبھی بھی کسی تہذیب کا مزاج بدلنے کے لیے کافی نہیں ہوا کرتیں۔ دوسری طرف اگر ہم اس بات کا موازنہ ان یورپی افراد کی تعداد سے کریں جو خالصتاً مادہ پرستی کے میدان میں روزانہ اتر رہے ہیں جیسا کہ مارکسزم اور فاشزم ہے' تو ہمیں مغربی تہذیب کی مقبولیت کا بہت اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا۔

جیسا کہ پہلے نشان دہی کی گئی ہے' ممکن ہے کہ بڑھتی ہوئی سماجی اور معاشی بے چینی اور اب تک نامعلوم سمتوں اور سائنسی دہشت گردی کی نئی عالمی جنگ مغربی تہذیب کی مادی خود پسندی کو ایسے راستے پر ڈال دے کہ اس کے ذہن ایک بار پھر پورے اشتیاق اور اخلاص کے ساتھ روحانی سچائی کی تلاش میں لگ جائیں اور تب مغرب میں اسلام کی کامیاب تبلیغ ممکن ہو سکے' لیکن ایسی کوئی تبدیلی ابھی تک مستقبل کے پردوں میں چھپی ہے۔ یہ ایک خطرناک اور خود فریبی پر مبنی خوش فہمی ہے کہ مسلمان اسلامی اثر و رسوخ کو یورپ کی روح فتح کرنے کے راستے پر رواں دواں دیکھ رہے ہیں۔ اس طرح کی باتیں حقیقت میں اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ قدیم عقیدۂ مہدی کو ایک جدید بہروپ میں دیکھا جا رہا ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ ایک طاقت اچانک نمودار ہو گی اور اسلام کے لڑکھڑاتے ہوئے ڈھانچے کو پوری دنیا میں فتح مند بنا دے گی۔ یہ عقیدہ انتہائی خطرناک ہے کیونکہ یہ بہت خوش کن' آسان اور ہمیں ان حقائق کی آگاہی سے بہت دور لے جاتا ہے کہ ثقافتی اعتبار سے ہم کچھ بھی نہیں ہیں' جب کہ مغربی اثرات آج اسلامی دنیا میں زیادہ گہرے ہیں اور یہ

Marfat.com

کہ ہم تو سو رہے ہیں' جب کہ یہ اثرات ہر جگہ اسلامی معاشرے کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ اسلام کے غلبہ کی خواہش کرنا ایک بات ہے' جب کہ اس خواہش پر غلط امیدیں تعمیر کرنا' دوسری بات ہے۔

ہم دور دراز مقامات پر اسلام کی روشنی پھیلنے کے خواب دیکھ رہے ہیں جب کہ اسلام کے نوجوان جو ہمارے اردگرد پائے جاتے ہیں' ہمارے نصب العین اور ہماری امیدوں سے دامن چھڑا رہے ہیں۔

(در: احیائے علوم (لاہور)، شمارہ ٦ (بابت جنوری ٢٠٠٦ء)' ص ٥-٨۔ ماخوذ از اسلام دوراہے پر، مؤلفہ محمد اسد۔ مترجم طاہر منصور فاروقی' لاہور ٢٠٠٠ء)

Marfat.com

محمد اسد/مترجم: ڈاکٹر محبوب سبحانی

اسلام کے متعلق مغربی رویہ

کسی بھی طور پر مغربی تہذیب نے اسلام کے متعلق اپنا ذہنی رویہ تبدیل نہیں کیا۔ وہ آج بھی پہلے کی طرح زندگی کے مذہبی تصور کی مخالف ہے اور اس بات کی کوئی معقول شہادت موجود نہیں کہ مستقبل قریب میں اس رویہ میں تبدیلی آ جائے گی۔ مغرب میں اسلامی مشنوں کا قیام اور بعض یورپیوں اور امریکیوں کا قبول اسلام (بیشتر صورتوں میں اسلامی تعلیمات کو پورے طور پر سمجھے بغیر) تبدیلی کی دلیل نہیں ہے۔ ایک ایسے دور میں جس میں مادہ پرستی کا ہر طرف راج ہے' چند افراد کا روحانی اقدار کی تلاش میں مذہبی تصورات پر مبنی کسی عقیدہ کے متعلق ذوق وشوق سے تقاریر سننا بالکل فطری بات ہے۔ مغرب میں صرف مسلمانوں ہی کے مشن نہیں ہیں' وہاں عیسائیوں کے بے شمار راہبانہ فرقے بھی موجود ہیں جن میں اصطلاحات کے رجحانات ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد خاصی طاقتور تحریکیں ہیں جو گیان دھیان پر زور دیتی ہیں۔ بودھوں کے مندر اور مشن ہیں اور یورپ اور امریکہ کے شہروں میں بودھ مذہب قبول کرنے والے بھی ہیں۔ مسلمانوں کے مشن جو دلائل دیتے ہیں' وہی دلائل بودھ مشن بھی دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یورپ بودھ مت کے قریب آ رہا ہے۔ مسلمانوں کی طرح بودھوں کا دعویٰ بھی مضحکہ خیز ہے۔ چند لوگوں کے بودھ مذہب یا اسلام قبول کر لینے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان مذاہب نے مغربی زندگی پر واقعی اثر انداز ہونا شروع کر دیا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی مذہب معمول سے زیادہ تجسس پیدا نہیں کر سکا اور جو تجسس پیدا ہوا ہے وہ محض اس لیے پیدا ہوا ہے کہ روحانیت کے متلاشی لوگوں کے ذہنوں کو بدیسی عقائد کا سحر متاثر کرتا ہے۔ یقینی طور پر بعض قابل ذکر استثناء بھی ہیں اور اسلام قبول کرنے والے نئے لوگوں میں بعض حقیقت کے متلاشی ہوتے ہیں' لیکن ان استثنائی واقعات کی بنیاد پر تہذیب کی تبدیلی کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ دوسری طرف اگر ہم ان مستثنیات کی تعداد کا ان مغربی لوگوں کی تعداد سے موازنہ کریں جو مارکسزم ایسے خالص مادہ پرستانہ نظریہ کی طرف جوق در جوق راغب ہو رہے ہیں تو ہم صحیح طور پر مغربی تہذیب کے حقیقی رجحان کا اندازہ کر سکیں گے۔

جیسا کہ پہلے بھی اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ بڑھتی ہوئی سماجی اور اقتصادی بے چینی کی وجہ سے عالمی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو سکتا ہے جس کی نہ معلوم کتنی جہتیں ہوں گی اور جن میں تباہ کن سائنسی ہتھیار استعمال ہوں گے۔ اس کے

Marfat.com

نتیجہ میں مغربی تہذیب کی مادہ پرستانہ خودفریبی کے اتنے ہولناک نتائج نکلیں گے کہ انسان ایک مرتبہ پھر انتہائی جوش و خروش اور عاجزی سے حقیقی روحانی حقائق کی تلاش میں نکل کھڑا ہوگا۔ اس کے بعد مغرب میں اسلام کی کامیاب تبلیغ ممکن ہوگی' لیکن یہ تبدیلی ابھی مستقبل کے پردہ میں چھپی ہوئی ہے۔ مسلمانوں کا یہ کہنا خطرناک قسم کی غلط فہمی ہے کہ اسلامی اثرات مغرب کی روح کو فتح کرنے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس قسم کی باتیں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مہدی کی آمد کے عقیدہ کو عقلیت پسندی کا جامہ پہنایا جائے۔ یہ عقیدہ کہ اچانک ایک طاقت کا ظہور ہوگا جو زوال پذیر مسلمان معاشرہ کو دنیا پر غالب کردے گی' خطرناک ہے کیونکہ یہ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنے سے گریز کی راہ دکھاتا ہے کہ ہم اب ثقافتی طور پر کچھ بھی نہیں رہے۔ مسلم دنیا پر آج مغربی اثرات بہت گہرے ہیں۔ ہم خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہیں جبکہ یہ اثرات ہر جگہ اسلامی معاشرہ کو تباہ و برباد کررہے ہیں۔ اسلام کے غلبہ کی خواہش ایک چیز ہے' لیکن اس خواہش پر جھوٹی توقعات وابستہ کرنا دوسری چیز ہے۔

Marfat.com

محمد اسد/مترجم: ڈاکٹر محبوب سجانی

مغرب کی نقالی کیوں؟

مسلمانوں کی مغربی طرز زندگی کی انفرادی اور سماجی سطح پر نقالی بلاشبہ اسلامی تہذیب کے وجود بلکہ احیاء کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ یہ ثقافتی بیماری کئی عشرے پہلے شروع ہوئی۔ مسلمانوں نے جب مغرب کی مادی طاقت اور ترقی کو دیکھا اور اس کا اپنی افسوسناک حالت سے موازنہ کیا تو انہیں سخت مایوسی ہوئی جس کی وجہ سے ان میں نقالی کا رجحان پیدا ہوا۔ اسلام کی صحیح تعلیمات سے ناواقفیت کی بنا پر جس کی وجہ نام نہاد علماء کے گروہ کی تنگ نظری ہے، مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اس وقت تک دنیا کی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتے جب تک کہ وہ مغرب کے سماجی اور اقتصادی طریقوں کو اختیار نہیں کر لیتے۔ چونکہ عالم اسلام جمود کا شکار ہے، اس لیے بہت سے مسلمان اس سطحی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اسلام کا معاشرتی اور اقتصادی نظام ترقی کی ضروریات پوری نہیں کر سکتا، لہٰذا اس میں مغربی خطوط پر ترمیم ہونی چاہیے۔ یہ روشن خیال مسلمان یہ معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ مسلمانوں کے زوال میں اسلامی تعلیمات کا کس حد تک دخل ہے۔ یہ لوگ اسلام کی حقیقی آئیڈیالوجی کی تحقیق بھی نہیں کرتے، البتہ وہ یہ کہتے ہیں اور صحیح کہتے ہیں کہ ان کے دور کے دینیات کے ماہرین کی تعلیمات بہت سے معاملات میں مادی کامیابیوں کی راہ میں رکاوٹ ہیں، لیکن ان لوگوں نے اصل مآخذ قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنے کی بجائے خاموشی سے شریعت کو جامد فقہ کے مترادف سمجھ لیا ہے، پھر یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ اس میں بہت سے سوالوں کا جواب نہیں ہے، لہٰذا ان کی شریعت سے عملاً تمام دلچسپیاں ختم ہو گئیں اور انہوں نے اس کو قصہ ماضی اور محض نظری کتابی علم سمجھ لیا۔ انہیں یہ توقع پیدا ہو گئی ہے کہ مغربی تہذیب کی نقل کر کے ہی عالم اسلام کو ادبار و انحطاط کی دلدل سے نکالا جا سکتا ہے۔

ان ''روشن خیال'' مسلمانوں کی گمراہ کن کوششوں میں دوسرے درجہ کی معذرت خواہانہ تحریروں کے سیلاب نے مدد دی جو بیسویں صدی کے پہلے دو عشروں میں منظر عام پر آئیں۔ ان تحریروں کے ذریعہ سے اسلام کی عملی تعلیمات کی نفی تو نہیں کی گئی، لیکن ان کے ذریعہ یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ اسلامی تعلیمات کو مغربی دنیا کے سماجی اور اقتصادی تصورات کے تابع کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح مغربی تہذیب کی نقالی کو جائز قرار دے دیا گیا اور یوں بتدریج اسلام کے بنیادی سماجی اصولوں سے لاتعلقی کی راہ ہموار ہو گئی۔ اس کے لیے ہمیشہ کی طرح اسلامی ''ترقی'' کا لبادہ

Marfat.com

اوڑھ لیا گیا۔آج بیشتر ترقی یافتہ مسلمان ملکوں میں سے متعدد ملک اسی راہ پر گامزن ہیں۔

بہت سے مسلمان ''دانشور'' کہتے ہیں کہ اس بحث کی کوئی روحانی اہمیت نہیں ہے کہ ہم اس طرح رہتے ہیں یا اُس طرح' ہم مغربی لباس پہنتے ہیں یا اپنے آباؤ اجداد کا لباس' ہمارے رسوم و رواج فرسودہ ہیں یا نہیں۔اس قسم کی باتیں گمراہ کن ہیں۔ بلاشبہ اسلام میں تنگ نظری نہیں ہے۔جیسا کہ اس کتاب کے پہلے باب میں بیان کیا گیا ہے۔ اسلام انسان کو اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے وسیع میدان پیش کرتا ہے' بشرطیکہ مذہبی تعلیمات کی خلاف ورزی نہ کی جائے' لیکن مغربی معاشرے کے کئی اہم پہلو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں۔مثال کے طور پر مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول اور اقتصادی سرگرمیوں کے لیے سرمایہ پر سود۔صرف سطحی قسم کے لوگ ہی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کسی تہذیب کی ظاہری نقالی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کی روح ان پر اثر انداز نہیں ہوگی۔تہذیب ایک جاندار کی مانند ہوتی ہے۔ جیسے ہی ہم اس کی ظاہری شکل اختیار کرنا شروع کر دیتے ہیں' اس کے اندرونی اثرات غیر محسوس طریقہ سے ہمارے پورے رویے میں سرایت کرتے چلے جاتے ہیں۔اس حقیقت کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

من تشبہ بقوم فھو منھم (سنن ابی داؤد' اللباس' باب فی لبس الشھرۃ' حدیث:۴۰۳۱)

''جو شخص کسی قوم کی نقل کرتا ہے وہ ان ہی میں سے ہو جاتا ہے۔''[۱۱]

یہ مشہور حدیث محض اخلاقی انتباہ نہیں ہے بلکہ اس میں ایک معروضی حقیقت بیان کی گئی ہے۔درحقیقت مسلمان جس غیر مسلم تہذیب کے خارجی مظاہر کی نقالی کرتے ہیں' وہ لازماً بتدریج ان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔

ایسی صورت میں سماجی زندگی کے ''اہم اور غیر اہم'' پہلوؤں کے بنیادی فرق کو دیکھنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔اس تناظر میں کوئی چیز غیر اہم نہیں ہوتی' مثال کے طور پر اس سے بڑی کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی کہ لباس کی حیثیت صرف ظاہری ہے اور اس کا انسان کی ذہنی اور روحانی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں۔لباس عوام کے صدیوں کے ذوق اور ضروریات کی بنیاد پر ترقی کرتے کرتے خاص شکل اختیار کرتا ہے۔اس کا فیشن عوام کے جمالیاتی ذوق کے مطابق ہوتا ہے۔عوام کے کردار اور رجحانات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ لباس میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔مثال کے طور پر آج کے مغربی فیشن جدید مغرب کے ذہنی اور اخلاقی کردار کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ مسلمان اپنا لباس چھوڑ کر مغربی لباس اختیار کر کے لاشعوری طور پر مغرب کے مزاج کو اختیار کر لیتے ہیں اور ان کا ذہنی اور اخلاقی وجود تبدیل ہوتے ہوتے آخر کار نئے لباس کے ''مطابق'' ہو جاتا ہے۔اس طرح وہ اپنے لوگوں کے ثقافتی تصورات کے بہت بڑے حصہ سے اعلان برأت کر دیتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ بیرونی تہذیب کے روایتی مزاج' ان کی جمالیاتی اقدار' ان کی پسند و ناپسند کو اختیار کر لیتے ہیں اور بالآخر وہ اس تہذیب کی ذہنی اور اخلاقی غلامی قبول کر لیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اگر کوئی مسلمان مغرب کے لباس' ان کی عادات و اطوار اور ان کی طرز زندگی کی نقالی کرتا ہے تو وہ اپنی تہذیب سے غداری کرتا

Marfat.com

ہے' خواہ وہ ایسا نیک نیتی ہی سے کیوں نہ کرے۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی بیرونی تہذیب کو پسند کیے بغیر اس کی نقالی کی جائے۔ اس طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ایسی تہذیب کی نقالی کی جائے جو مذہبی نظریہ زندگی کی مخالف ہو اور پھر اچھا مسلمان بھی رہا جائے۔

کسی غیر ملکی تہذیب کی نقالی احساس کمتری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہی معاملہ ان مسلمانوں کا بھی ہے جو مغربی تہذیب کی نقالی کرتے ہیں۔ وہ اس کی طاقت' فنی استعداد اور ظاہری چمک دمک کا موازنہ عالم اسلام کی پستی سے کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں مغربی طرز زندگی اختیار کرنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں۔ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے لیے اسلام کو مطعون کرنا آج کا فیشن بن چکا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہمارے نام نہاد دانشور معذرت خواہانہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے آپ کو اور دوسروں کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مغربی اقدار کو اختیار کرنے کی راہ میں اسلام مانع نہیں ہے۔

عالم اسلام کی بیداری کے لیے ضروری ہے کہ اصلاحات کا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے مسلمان اپنے مذہب اور سماجی ڈھانچہ کے متعلق معذرت خواہانہ رویہ ترک کریں۔ ایک مسلمان کو دنیا میں اپنا سر بلند کر کے رہنا چاہیے۔ اس کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ وہ باقی دنیا سے مختلف اور ممتاز ہے جس پر اس کو فخر کرنا چاہیے اور اس فرق کو ایک قیمتی وصف کی حیثیت سے محفوظ رکھنا چاہیے۔ معذرت کرنے اور دوسری ثقافتوں میں اس کو ضم کرنے کی بجائے اس قیمتی وصف کا پوری جرأت سے اعلان کرنا چاہیے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مسلمان بیرونی دنیا سے بالکل ہی بے تعلق ہو جائیں' البتہ انہیں اپنی تہذیب ترک کیے بغیر وقتاً فوقتاً بیرونی تہذیب کے نئے اور مثبت اثرات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ اس کی ایک مثال یورپ کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ یورپ نے کتنی جلدی عربوں کے علمی اثرات کو قبول کر لیا' لیکن یورپ نے عربوں کی وضع قطع اور عرب ثقافت کی کبھی نقالی نہیں کی اور اپنی دانش اور جمالیاتی آزادی کو قربان نہیں کیا۔ یورپ نے عربوں کے اثرات کو اپنی زمین میں کھاد کے طور پر استعمال کیا جیسا کہ عربوں نے اپنے زمانہ میں یونانی اثرات کو استعمال کیا تھا۔ ان دونوں صورتوں میں روحانی دولت میں اضافہ ہوا اور ایک نئی اور توانا تہذیب نے جنم لیا جو اعتماد سے بھرپور اور پُروقار تھی۔ کوئی بھی تہذیب اپنا وقار کھو کر اور ماضی سے رشتے کاٹ کر پھل پھول نہیں سکتی بلکہ زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔

افسوس ہے کہ مسلم دنیا میں مغرب کی نقالی بڑھتی جا رہی ہے اور وہ مغربی خیالات اور تصورات کو اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اس طرح وہ بتدریج ماضی سے اپنا رشتہ کاٹتی چلی جا رہی ہے' نہ صرف اپنی ثقافتی جڑیں بلکہ روحانی جڑیں بھی کاٹ رہی ہے۔ اس کی مثال اس درخت کی سی ہے جو بہت توانا تھا مگر اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا گیا ہے' جس کی وجہ سے درخت آہستہ آہستہ گرتا چلا جا رہا ہے کیونکہ وہ اپنی غذا سے محروم ہو گیا ہے۔ اس کے پتے جھڑ چکے ہیں' اس کی شاخیں ٹوٹ چکی ہیں۔ اب صرف تنارہ گیا ہے' جس کے گرنے کا خطرہ ہے۔

عالم اسلام اس وقت روبہ زوال ہے' جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عملی مذہب کو محض ظاہری رسوم و رواج کا

Marfat.com

مذہب بنادیا گیا ہے اور اس کی روح نکال کر اسے بے جان کر دیا گیا ہے۔ اس کے احیاء کا صحیح طریقہ مغرب کی نقالی نہیں ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ مسلمان ذہنی اور عقلی طور پر تحریک کے لیے جس کی انہیں آج شدید ضرورت ہے، کس طرف دیکھیں؟

جواب بڑا آسان ہے۔ درحقیقت جواب سوال ہی میں مضمر ہے۔ اس کا جواب اسلام ہے جس کے متعلق میں کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ یہ صرف عقیدہ نہیں بلکہ یہ انفرادی اور سماجی زندگی کا لائحہ عمل ہے۔ بیرونی ثقافت اس کو ہڑپ کر کے ختم کر سکتی ہے کیونکہ اس ثقافت کی اخلاقی بنیادیں بالکل مختلف ہیں۔ اس کا احیاء اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم اس کو اپنی ذاتی اور سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں میں اختیار کریں۔

نئے خیالات اور متضاد رویوں کے زیر اثر جو موجودہ دور کی خصوصیت ہے، اسلام کھوکھلی صورت میں قائم رہنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر اس پر صدیوں سے طاری طلسمی نیند کو توڑ دیا جائے تو یہ زندہ ہو سکتا ہے، ورنہ مر جائے گا۔ مسلمانوں کا حال اس وقت اس مسافر کا سا ہے جو دوراہے پر پہنچ چکا ہے۔ وہ وہیں کھڑا رہ سکتا ہے، لیکن اس کے معنی فاقہ کشی کی موت ہوں گے۔ وہ اس راستہ کا انتخاب کر سکتا ہے جس پر سنگ میل لگا ہوا ہے: ''مغرب کی طرف''، لیکن اس صورت میں اسے ہمیشہ کے لیے اپنے ماضی سے رشتہ کاٹنا ہوگا یا پھر وہ دوسرا راستہ اختیار کر سکتا ہے جس کا سنگ میل کہتا ہے: ''اسلام کی طرف۔'' یہ راستہ صرف ان لوگوں کا ہے جو اپنے ماضی پر اور اس کو ایک جاندار مستقبل میں تبدیل کرنے کے امکانات پر یقین رکھتے ہیں۔

حاشیہ

۱۔ مغربی معاشرے میں حالیہ عشروں میں جنسی آوارگی، بے راہ روی اور مرد و زن کے اختلاط کو بڑا فروغ حاصل ہوا ہے جو اسلام کی اخلاقی بنیادوں کے خلاف ہے۔ اس پر مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک سود کا تعلق ہے وہ جدید اقتصادی سرگرمیوں کا لازمی حصہ ہے، لیکن یہ جان لینا چاہیے کہ مسلمانوں نے بلاسود اسلامی بینکنگ کا نظام قائم کرنے میں بڑی ترقی کی ہے۔ اس طرح ایک ایسے اقتصادی نظام کے قیام کی طرف پیش رفت ہوئی ہے جو شریعت کے تقاضوں کے مطابق ہوگا۔

(در: ملت اسلامیہ دوراہے پر۔ محمد اسد، مترجم ڈاکٹر محبوب سبحانی، لاہور ۲۰۰۴ء)

Marfat.com

محمد اسد / مترجم: محمد جمیل احمد

کچھ تقلید کے بارے میں

مسلمانوں میں مغربی تقلید کی ابتداء اور اس کے اسباب

اسلامی تہذیب کی بقاء...... بلکہ احیاء کے ضمن میں بلاشبہ سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں کو مغربی طرز معاشرت کی تقلید سے ہے۔ اس ثقافتی دباؤ (جس کو اور کوئی نام دینا ممکن ہی نہیں) کی ابتداء قرنوں پہلے مسلمانوں کی اس یاسیت اور ناامیدی سے ہوتی ہے جو ان میں اپنے معاشرہ کی زبوں حالی کے مقابلہ میں مغرب کی مادی طاقت اور ترقی کو دیکھ کر پیدا ہوئی تھی۔ صحیح اسلامی تعلیمات کے متعلق مسلمانوں کی لاعلمی اور جہالت نے...... جس کی ذمہ داری ایک بہت بڑی حد تک علماء کے تنگ نظرانہ رویہ پر عائد ہوتی ہے...... یہ خیال پیدا کر دیا کہ مسلمان اس وقت تک باقی دنیا کی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتے جب تک کہ وہ مغرب کے معاشرتی اور معاشی اصولوں کو اختیار نہ کرلیں۔ اسلامی دنیا بے حس و حرکت اور ساکن و جامد ہو گئی تھی' اس وجہ سے بہتیرے مسلمان اس سطحی نتیجہ پر پہنچے کہ اسلامی معاشرت اور معیشت کا نظام ترقی کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے اور اس لئے مغربی طرز پر اس میں ردوبدل کی ضرورت ہے۔ ان نام نہاد ''روشن خیال'' اور ''ترقی پسند'' لوگوں نے یہ دریافت کرنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ اسلام اپنی تعلیمات کی رو سے کس حد تک مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی کا ذمہ دار ہے۔ وہ اسلام کی حقیقی اساس یعنی قرآن کریم اور سنت نبویؐ پر غور و خوض کرنے کے لئے نہیں ٹھہرے۔ انہوں نے صرف اس بات پر زور دیا کہ بیشتر ہم عصر مذہبی علماء کی تعلیمات مادی ترقی اور کمالات کے حصول میں سدراہ ہیں۔ اسلام کے اصلی سرچشموں اور ماخذوں پر غور و فکر کرنے کی بجائے انہوں نے خاموشی سے موجودہ عہد کے جامد و ساکن فقہ کو شریعت کا ہم پلہ قرار دے دیا' مگر اسے بہت سی صورتوں میں ناکافی پایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شریعت سے ان کی تمام عملی دلچسپی ختم ہو گئی اور وہ صرف تاریخ اور کتابی علم کا جزو بن کر رہ گئی اور اس لئے ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمان زبوں حالی کی جس دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں' اس سے نکلنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ ہے مغربی تہذیب کی تقلید۔

موجودہ دور کی وہ تصانیف جو زیادہ غور و خوض کا نتیجہ ہیں...... خصوصاً شہزادہ سعید حلیم پاشا کی معرکۃ الآراء کتاب ''اسلام اشماق'' (Islam Ashmaq) جس نے قطعی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ اسلامی شریعت عہد حاضر کی ترقی میں ہرگز حائل نہیں ہے...... اس قدر تاخیر سے منصۂ شہود پر آئیں کہ وہ مسلمانوں کی کورانہ تحسین مغرب* کے سیلاب

Marfat.com

کو روک نہ سکیں۔ان کتابوں کی صحتمندانہ اور اصلاحی تاثیر کو دوسرے درجہ کے اس معذرت خواہ ادب نے زائل کر دیا' جس نے گو صاف طور پر اسلام کی عملی تعلیمات کا انکار تو نہیں کیا' پھر بھی...... یہ بات ظاہر کرنے کی کوشش ضرور کی کہ شریعت کو مغربی دنیا کے سماجی اور معاشی نظریات کا تابع ضرور بنایا جا سکتا ہے۔اس طرح مسلمانوں کے لئے مغربی تہذیب کی تقلید جائز اور روا قرار دی گئی اور اس طرح اسلام کے اہم ترین بنیادی معاشرتی اصولوں کو بتدریج ترک کرتے جانے کے لئے راہ ہموار ہوگئی......اور یہ چیز ہمیشہ ''اسلامی'' کا نام لے کر کی گئی...... جیسا کہ آج بہت سے ترقی یافتہ مسلم ممالک کی ترقی کے سلسلہ میں دیکھا جاتا ہے۔کسی تہذیب کے ظاہری پہلوؤں کی تقلید اس کی روح کی تقلید کا پیش خیمہ ہوتی ہے'اس بات پر بحث کرنا لا حاصل ہے' جیسا کہ اکثر تعلیم یافتہ مسلمان کیا کرتے ہیں کہ روحانی اعتبار سے اس بات کو کوئی اہمیت حاصل نہیں کہ ہم اس طریقہ سے زندگی بسر کرتے ہیں یا اُس طریقہ سے' ہم مغربی لباس پہنتے ہیں یا آبائی' ہم جہاں تک فکر اور عقیدہ کا تعلق ہے محتاط و متشدد ہیں یا نہیں۔' بلاشبہ اسلام میں تنگ نظری نہیں ہے جیسا کہ پہلے باب میں کہا جا چکا ہے۔اسلام انسان کو ممکنات کا ایک وسیع میدان عطا کرتا ہے تاوقتیکہ وہ مذہبی احکام کی خلاف ورزی نہ کرے' لیکن اس حقیقت سے قطع نظر کہ بہت سی چیزیں جو مغربی معاشرتی نظام کا جزو لاینفک ہیں...... مثلاً مرد و عورت کا آزادانہ ملاپ یا معاشی عمل کی بنیادی حیثیت' سرمایہ پر سود...... یقینی طور پر اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں۔مغربی تہذیب کی جبلت اور طبعی خصلت' انسان کی مذہبی تجدید و ترقی کے منافی ہے جیسا کہ میں پہلے واضح کرنے کی کوشش کر چکا ہوں اور صرف انتہائی سطحی لوگ ہی اس بات پر یقین رکھ سکتے ہیں کہ کسی تہذیب کے ظاہری خدوخال کی تقلید اس کی سرشت اور روح سے متاثر ہوئے بغیر بھی ممکن ہے۔تہذیب ایک بے روح قالب نہیں ہوتی بلکہ ایک زندہ قوت ہوتی ہے۔جس وقت سے ہم اس قالب کو اپنانا شروع کرتے ہیں' اسی وقت سے اس کے اندر چھپی ہوئی لہریں اور ان کے متحرک اثرات ہماری ہستیوں میں نفوذ کرنے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ غیر مرئی اور غیر محسوس طور پر ہماری تمام ذہنی افتاد اور رجحان کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔

یہ ان تجربی حقائق کا صرف ایک مکمل جائزہ تھا جس کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

من تشبه بقوم فهو منهم (مسند احمد ابن حنبلؒ' سنن ابوداؤدؒ)

(جو دوسری قوموں کی نقل کرتا ہے وہ ان ہی میں سے ہو جاتا ہے)

یہ مشہور و معروف حدیث صرف ایک اخلاقی اشارہ ہی نہیں بلکہ اس حقیقت کا خارجی اور واقعاتی اظہار بھی ہے' جس کے تحت یہ لازم اور ناگزیر ہے کہ مسلمانوں کو وہ غیر مسلم تہذیبیں آہستہ آہستہ اپنے اندر ضم کر لیتی ہیں جن کے خارجی خدوخال کی یہ تقلید کرتی ہیں۔

یہاں اہم اور غیر اہم پہلوؤں کا امتیاز بے معنی ہے

Marfat.com

اس سلسلہ میں معاشرتی زندگی کے ''اہم'' اور ''غیر اہم'' پہلوؤں میں کوئی امتیاز قائم کرنا ناممکن ہے۔ اس سیاق وسباق میں کوئی چیز بھی غیر اہم نہیں۔ یہ سمجھ لینے سے بڑھ کر کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کہ مثلاً لباس ایک خالص خارجی شے ہے اور اس وجہ سے انسان کے ذہنی اور روحانی وجود کے لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ عام طور پر لباس کسی قوم کی کسی مخصوص سمت میں پسندیدگی اور رغبت کے صدیوں کے ارتقاء کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس کی وضع قطع اس قوم کے جمالیاتی تصورات اور اس کے رجحانات کے مطابق ہوتی ہے۔ جن تبدیلیوں سے اس قوم کے احوال اور رجحانات گذرتے ہیں۔ ان ہی کے مطابق اس کے لباس کی وضع قطع متعین ہوتی ہے اور ان ہی کے مطابق اس میں پیہم ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر آج مغربی لباس کی جو وضع قطع ہے، وہ مکمل طور پر یورپ کے عقلی اور اخلاقی خصائص کی آئینہ دار ہے۔ مسلمان جب مغربی لباس استعمال کرتا ہے تو وہ غیر شعوری طور پر اپنے ذوق کو مغربی ذوق سے ہم آہنگ کر لیتا ہے اور اپنی عقل اور اخلاق کی انانیت کو اس طرح توڑتا مروڑتا ہے کہ بالآخر وہ نئی پوشاک کے مطابق ہو سکے۔ اس عمل میں وہ اپنی قوم کے ثقافتی ممکنات کو خیر باد کہہ دیتا ہے۔ وہ اس کے آبائی ذوق کو، اس کی جمالیاتی اقدار کو اور اس کی پسند اور ناپسندیدگی کو ترک کر دیتا ہے اور عقلی اور اخلاقی غلامی کے اس طوق کو قبول کر لیتا ہے جو ایک بیرونی تہذیب نے اس کی گردن میں ڈالا ہے۔

تقلید کا منطقی نتیجہ

اگر مسلمان یورپ کے لباس، عادات واطوار اور طرز زندگی کی تقلید کرتا ہے تو وہ یورپ کی تہذیب کے لئے اپنی طرف سے ترجیح کا اظہار کرتا ہے چاہے اس کے مکر آمیز دعوے کچھ بھی ہوں۔ عملی طور پر یہ ممکن نہیں کہ کسی بیرونی تہذیب کے عقلی اور جمالیاتی پہلوؤں کی کوئی شخص تقلید کرے اور اس کی روح کو پسند نہ کرے اور اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ایسی تہذیب کی روح کو کوئی پسند کرے جو خود زندگی کے دینی نظریہ کی مخالف ہو اور پھر بھی وہ ایک صالح مسلمان بنا رہے۔

مغربی تہذیب کی تقلید احساس کمتری کا نتیجہ ہے

کسی بیرونی تہذیب کی تقلید کا رجحان احساس کمتری سے پیدا ہوتا ہے۔ ان مسلمانوں کا، جو مغربی تہذیب کی تقلید کرتے ہیں، یہی اور صرف یہی معاملہ ہے۔ وہ اس کی قوت، اس کی فنی ہنرمندی اور اس کی سطحی آب وتاب کا موازنہ دنیائے اسلام کی (موجودہ) قابل افسوس پستی اور زبوں حالی سے کرتے ہیں اور وہ اس بات کا یقین کرنے لگتے ہیں کہ ہمارے موجودہ دور میں مغربی طریقہ پر چلنے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں ہے۔ اپنی خامیوں اور غلطیوں کے لئے اسلام کو مورد الزام ٹھہرانا اس زمانہ کی عادت بن گئی ہے۔ وہ لوگ جن کو دانشور یا صاحبان عقل وخرد کہا جاتا ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کرتے ہیں کہ معذرت خواہی کا رویہ اختیار کرتے ہوئے خود اپنے آپ کو اور دوسروں کو یہ سمجھانے کی

Marfat.com

کوشش کرتے ہیں کہ اسلام مغربی تہذیب سے ہم آہنگ ہے۔

اس معاملہ میں مسلمانوں کالائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟

مسلمانوں کے لئے لازم ہے کہ وہ اسلام کے احیاء کے لئے اصلاح کا کوئی بھی طریقہ اختیار کرنے سے پہلے اپنے مذہب کے سلسلہ میں معذرت خواہی اور انفعال کے ہر جذبہ سے اپنے آپ کو قطعی طور پر آزاد کرلیں۔ مسلمان کو اپنا سر اٹھا کر زندگی بسر کرنا چاہیے۔ ضرورت ہے کہ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ وہ باقی دنیا سے ممتاز اور مختلف ہے اور ضرورت ہے کہ وہ اپنے اس مختلف ہونے پر ناز کرنا سیکھ جائے۔ ضرورت ہے کہ وہ اس اختلاف اور امتیاز کو ایک قیمتی سرمایہ سمجھ کر قائم رکھنے کی کوشش کرے اور فخر و ناز سے دنیا کے سامنے اس کا اعلان کرے...... بجائے اس کے کہ وہ اس کے لئے معذرت خواہ اور منفعل ہو اور دوسرے ثقافتی دائروں میں اپنے آپ کو ضم کرنے کی کوشش کرتا پھرے' اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمان اپنے کان باہر سے آنے والی ہر آواز کے لئے بند کرلیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ انسان بغیر اپنی تہذیب کو برباد کئے' کسی بیرونی تہذیب سے نئے ایجابی اور مثبت اثرات قبول کر سکے۔ اس قسم کی ایک مثال یورپ کی ''نشاۃ ثانیہ'' تھی۔ وہاں ہم دیکھ چکے ہیں کہ یورپ نے کس قدر مستعدی اور آمادگی کے ساتھ علوم کے موضوعات اور طریقوں کے سلسلہ میں عربی اثرات سے استفادہ کیا' لیکن اس نے عربی ثقافت کی ظاہری شکل اور اس کی معنویت کی کبھی تقلید نہیں کی اور اس نے کبھی اپنی عقلی اور جمالیاتی آزادی اور خود مختاری کو قربان نہیں ہونے دیا۔ اس نے عربی اثرات کو اپنی زمین کی زرخیزی کے لئے کھاد کے طور پر استعمال کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ عربوں نے اپنے زمانہ میں یونانی اثرات کو استعمال کیا تھا۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ایسی طاقتور' جدید وطنی تہذیب کی نشوونما کی صورت میں ظاہر ہوا جو خود اعتمادی اور خود افتخاری کے جذبہ سے معمور تھی۔ کوئی تہذیب اس فخر کو کھو لنے کے بعد اور اپنے ماضی سے رشتے منقطع کر لینے کے بعد نہ پھل پھول سکتی ہے اور نہ اپنے وجود ہی کو قائم رکھ سکتی ہے۔

موجودہ اسلامی دنیا کا رجحان اس کے برعکس ہے

لیکن اسلامی دنیا' یورپ کی تقلید اور مغربی افکار اور نظریات کی نقالی کے بڑھتے ہوئے جنون کے ساتھ ساتھ بتدریج ان رشتوں کو بھی منقطع کرتی جا رہی ہے جو اس کو ماضی سے وابستہ کرتے ہیں اور اس لئے وہ نہ صرف اپنی ثقافتی بلکہ روحانی اساس بھی کھوتی جا رہی ہے بلکہ وہ ایک ایسے درخت کے مانند ہے جو اس وقت تک مضبوط تھا جب تک اس کی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں پیوستہ تھیں' لیکن مغربی تہذیب کے کوہستانی سیلاب نے ان جڑوں کی مٹی ہٹا کر ان کو برہنہ کر ڈالا ہے اور وہ درخت بتدریج غذا کی کمی کی بنا پر سوکھتا جا رہا ہے اور بالآخر خود تنے کے گر پڑنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔

اس کا مداوا

Marfat.com

چنانچہ اس ذہنی اور معاشرتی بے حسی سے جو ایک عملی مذہب کو محض ایک ایسی رسم بنا ڈالنے سے پیدا ہوئی ہے جس میں نہ کوئی زندگی کی رمق ہے نہ کوئی اخلاقی تڑپ' اسلام کو بچانے اور اس کو حیات تازہ بخشنے کا صحیح ذریعہ مغربی تہذیب نہیں ہو سکتی۔ پھر مسلمان اس روحانی عقلی تحریک کو کہاں تلاش کریں جس کی آج اس قدر شدید ضرورت ہے؟

جواب اسی قدر آسان ہے جتنا کہ سوال آسان ہے۔ بلاشبہ اس کا جواب خود سوال ہی میں موجود ہے۔ جیسا کہ کئی بار پہلے بھی بتایا جا چکا ہے' اسلام صرف تصدیق قلب ہی کا نام نہیں بلکہ انفرادی اور سماجی زندگی کا ایک نہایت واضح نظام بھی ہے۔ اگر اس کو کسی ایسی بیرونی ثقافت میں ضم کر دیا جائے جو لازمی طور پر مختلف اخلاقی بنیادوں پر استوار ہو تو یہ تباہ و برباد ہو سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح اس کا احیاء اسی وقت عمل میں آ سکتا ہے' جب اس کو اس کے اصل کی طرف لوٹا دیا جائے اور اس کو ایک ایسے محرک کی حیثیت دے دی جائے جو ہمارے انفرادی اور معاشرتی وجود کے تمام پہلوؤں کو متعین اور متشخص کرتا ہو۔

اسلام کا مستقبل مسلمانوں کے موجودہ رویہ پر منحصر ہے

ان نئے افکار و خیالات اور متقابل و متصادم ثقافتی نظریات کے زیر تحت' جو اس عہد کی جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں' اس کی اہم خصوصیات ہیں' اسلام ایک خالی پیکر بن کر نہیں رہ سکتا۔ اس کے صدیوں کے خواب گراں کا طلسم اب ٹوٹ چکا ہے۔ اس کو اب بیدار ہونا ہے یا ختم ہو جانا ہے۔ وہ مسئلہ جو آج مسلمانوں کو درپیش ہے' وہی مسئلہ ہے جو اُس مسافر کو پیش آتا ہے جو چلتے چلتے ایک دوراہے پر آ گیا ہو' وہ اس جگہ کھڑا رہ سکتا ہے اور وہ اس راستہ کو اختیار کر سکتا ہے جس پر ''مغربی تہذیب کی جانب'' کی تختی لگی ہوئی ہے؟ لیکن پھر اس کو اپنے ماضی کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنا پڑے گا یا پھر وہ دوسری راہ اختیار کر سکتا ہے جس پر یہ تحریر ہے ''اسلام کی حقیقت کی طرف۔'' صرف یہ وہ راہ ہے جو ان لوگوں کو پسند آ سکتی ہے جو اپنے ماضی پر یقین رکھتے ہیں اور جو اس امکان پر یقین رکھتے ہیں کہ اس کو ایک زندہ مستقبل میں بدلا جا سکتا ہے......

خلاصہ کلام

مسلمانوں کی موجودہ پستی اور زبوں حالی

گذشتہ ابواب میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام اپنے حقیقی معنوں میں مغربی تہذیب کی تقلید یا مشابہت سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتا' لیکن دوسری طرف آج اسلامی دنیا میں اتنی توانائی باقی نہیں رہی ہے کہ وہ اس خطرے کا خاطر خواہ مقابلہ کر سکے۔ اس کے ثقافتی وجود کی باقیماندہ یادگاروں کو مغربی افکار اور اطوار کے اثرات کے تحت مٹایا جا رہا ہے۔ ''تن بہ تقدیر'' رہنے کا ایک رویہ نمایاں ہے اور محض تقدیر پر تکیہ کر کے بیٹھ جانا قوموں اور ثقافتوں کی

Marfat.com

موت ہے۔

کیا اسلام اپنی مدت حیات پوری کر چکا ہے؟

اسلام کے ساتھ دراصل معاملہ کیا ہے؟ کیا جیسا کہ ہمارے دشمن اور خود ہم میں سے شکست خوردہ ذہنیت رکھنے والے افراد ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں' وہ ایک ''مردہ قوت'' ہے؟ کیا وہ اپنا منفعت بخش کام ختم کر کے اپنی زندگی کی مدت پوری کر چکا ہے اور کیا جو کچھ وہ دنیا کو دے سکتا تھا' دے چکا ہے؟

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ تمام انسانی ثقافتیں اور تہذیبیں زندہ وجود رکھتی ہیں اور ذی روح ہستیوں کے مشابہ ہیں۔ وہ تمام مراحل ومنازل سے گذرتی ہیں جن سے نشوونما پانے والی زندگی گزرتی ہے۔ وہ پیدا ہوتی ہیں جوان ہوتی ہیں' پختہ عمر کو پہنچتی ہیں اور بالآخر ان میں انحطاط اور زوال شروع ہو جاتا ہے۔ درختوں کی طرح جو مرجھا کر اور خشک ہو کر زمین پر گر پڑتی ہیں۔ ثقافتیں اور تہذیبیں بھی اپنی مدت حیات پوری ہونے کے بعد مٹ جاتی ہیں اور دوسری تر و تازہ نوزائیدہ ثقافتوں کے لئے جگہ خالی کر دیتی ہیں۔

کیا اسلام کے سامنے بھی یہی معاملہ درپیش ہے؟ بادی النظر میں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ بلاشبہ اسلامی ثقافت کی ابتدا شاندار تھی اور اس کا ایک پُر شوکت زمانہ عروج تھا۔ اس میں ایسی توانائی تھی' جو لوگوں میں بڑے بڑے کام کرنے اور عظیم الشان کارنامے انجام دینے کا جوش وولولہ اور ایثار وقربانی کا حیرت انگیز جذبہ پیدا کر دیتی تھی۔ اس نے قوموں کی زندگی اور دنیا کی حالت کو یکسر بدل ڈالا تھا۔ پھر اس قوت میں ایک جمود پیدا ہو گیا اور وہ ساکت ہو گئی۔ اس کے بعد وہ ایک بے معنی لفظ بن گئی اور اب ہم اس میں انتہائی ابتری اور انحطاط دیکھ رہے ہیں' لیکن کیا ساری حقیقت بس یہی کچھ ہے؟

اسلام ابدی نظام ہے

اگر ہم اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ اسلام بہت سی دوسری ثقافتوں میں سے صرف ایک ثقافت نہیں ہے اور محض انسانی فکر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خدائے قادر مطلق اور علیم وبصیر کا نافذ کردہ قانون ہے جس کا اتباع انسانی ارتقاء کے لئے تا ابد ضروری قرار دیا گیا ہے تو سارا مطمح نظر اور انداز فکر ہی بدل جاتا ہے۔ اگر اسلامی ثقافت اس قانون کی تعمیل کا نتیجہ ہے یا تھی جو بذریعہ وحی منکشف ہوا تھا تو ہم اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتے کہ اس کا وجود مرور ایام سے وابستہ ہے اور ایک مخصوص زمانہ تک محدود ہے۔ جو چیز دراصل اسلام کا زوال نظر آتی ہے وہ اور کچھ نہیں صرف ہمارے دلوں کی موت اور ویرانی ہے جو اس قدر مردہ ہو چکے ہیں کہ اس کا سرمدی نغمہ بھی نہیں سن سکتے۔ کوئی نشانی اس امر کی موجود نہیں ہے کہ انسانیت اپنی موجودہ ارتقائی منزل میں اسلام سے آگے بڑھ چکی ہے۔ وہ اس وقت تک اخلاقیات کا اس سے بہتر کوئی نظام مرتب کرنے سے قاصر رہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ وہ انسانی اخوت کے نظریہ کو ہنوز عملی جامہ نہیں

Marfat.com

پہنا سکی ہے جیسا کہ اسلام اپنے مافوق القومیت نظریۂ امت میں کر چکا ہے۔ وہ اب تک ایک ایسا سماجی نظام قائم کرنے میں ناکام رہی ہے جس میں افراد کی باہمی رقابتوں اور مخالفتوں کے لئے کم از کم گنجائش باقی رہنے دی گئی ہو جیسا کہ اسلام کے سماجی نظام میں کیا گیا ہے۔ وہ اب تک انسانی شرف و عظمت کو بلند نہیں کر سکی۔ اس کے احساس تحفظ کو زیادہ قوی نہیں کر سکی۔ اس کی روحانی توقعات کو رفعت اور سرفرازی نہیں بخش سکی۔ نہ اس کی مسرت ہی میں کوئی اضافہ کر سکی ہے۔

اسلام کا نظام حیات دنیا کا افضل ترین نظام ہے

ان تمام باتوں میں بنی نوع انسان کے اکتسابات اور کارنامے ابھی اسلامی نظام سے بہت پیچھے ہیں۔ پھر اس قول کا جواز کیا ہے کہ اسلام ماضی کی ایک چیز ہے اور اب قابل عمل نہیں ہے۔ کیا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلام خالص مذہبی بنیادوں پر قائم ہے اور مذہبی تصورات آج کل کی رسم کے منافی ہیں؟ لیکن اگر ہم اس حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک ایسا نظام جو مذہب پر مبنی ہے زندگی کا ایک ایسا عملی ضابطہ مرتب کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے جو ہر اس چیز سے جو انسانی ذہن تجویزوں اور اصطلاحوں سے اب تک پیش کر سکا ہے' زیادہ مکمل' زیادہ ٹھوس' زیادہ حقیقی اور انسانی نفسیات کے زیادہ قریب ہے...... تو کیا صرف یہی ایک بات مذہبی نظریہ کے حق میں ایک نہایت وزنی دلیل نہیں ہے؟

انسان کے ارتقائی کارنامے اور لغزشیں اسلام کی تصدیق کرتی ہیں

ہمارے پاس تمام وجوہ یہ یقین کرنے کے لئے موجود ہیں کہ اسلام کی تائید بطور احسن انسان کے مثبت کارنامے اور کمالات کر چکے ہیں۔ چونکہ ان کے حصول سے بہت پہلے اسلام ان کا پوری طرح تصور کر چکا تھا اور ان کو لائق طلب و خواہش بتا کر ان کی طرف اشارہ کر چکا تھا اور اسی طرح اس کی تصدیق انسانی ارتقاء کی خامیاں' غلطیاں اور ٹھوکریں بھی کر چکی ہیں۔ چونکہ اس سے بہت پہلے کہ انسانیت ان کو غلطیاں سمجھنے کے قابل ہوئی' وہ باآواز بلند اور واضح طور پر ان کے بارے میں متنبہ کر چکا تھا۔ اپنے مخصوص مذہبی معتقدات سے قطع نظر' ایک خالص عقلی نقطہ نظر سے انسان کی اس امر پر آمادگی کا قوی امکان موجود ہے کہ وہ اعتماد کے جذبہ کے ساتھ اسلام کی عملی ہدایات پر عمل کرے۔

اسلامی احیاء کس طرح ممکن ہے؟

اگر ہم اپنی ثقافت اور تہذیب کو اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو ہم لازمی طور پر اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس کا احیاء ممکن ہے۔ ہمیں اسلام کی ''اصلاح'' کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ بعض مسلمان سوچتے ہیں...... چونکہ اسلام بطور

Marfat.com

خود مکمل ہے؛ جس چیز کی ہمیں اصلاح کرنے کی ضرورت ہے وہ مذہب کے متعلق ہمارا رویہ اور رجحان ہے۔ وہ ہماری سہل انگاری اور تن آسانی ہے۔ وہ ہماری خود بینی اور خود رائی ہے۔ وہ ہماری تنگ نظری اور کم نگاہی ہے۔ ایک لفظ میں وہ خود ہمارے نقائص ہیں۔ اسلام کے کوئی مفروضہ نقائص نہیں ہیں۔ اسلامی احیاء کے حصول کے لئے کہیں باہر سے طریق عمل وسلوک کے نئے اصول وضابطے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف قدیم اور متروک اصولوں پر از سرنو عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ ہمیں دوسری ثقافتوں سے نئے محرکاتی اثرات قبول کرنا چاہئیں' مگر ہم اسلام کے کامل نظام کے کسی جزو کو کسی بھی غیر اسلامی چیز سے بدل نہیں سکتے' چاہے وہ مغرب سے حاصل کی گئی ہو یا مشرق سے۔ ایک روحانی اور سماجی نظام کی حیثیت سے اسلام میں کسی مزید ''اصلاح'' کی گنجائش نہیں ہے۔ ان حالات کے پیش نظر اس کے نظریات یا اس کی سماجی تنظیم اور معاشرتی ضابطہ میں کوئی ایسی تبدیلی جو بیرونی ثقافتی اثرات کو زبردستی ٹھونسنے کی بناء پر پیدا کر دی گئی ہو' درحقیقت ''ترقیٔ معکوس'' اور ایک تباہ کن عمل ہے اور اس لئے انتہائی قابل افسوس ہے۔ تبدیلی ہونا چاہئے مگر یہ تبدیلی ایسی ہو جو خود ہمارے اندر سے پیدا ہو...... اور اس کا رخ اسلام کی سمت ہونا چاہئے' اس کی مخالف سمت میں نہیں۔

مسلمانوں کو اپنی موجودہ حالت کا اندازہ کر لینا چاہئے

مگر ان سب باتوں کے باوجود ہمیں خود فریبی اور ریاکاری سے کام نہیں لینا چاہئے۔ ہم جانتے ہیں کہ ساری دنیا' یعنی اسلامی دنیا' ایک آزاد ثقافتی وجود کے اعتبار سے اپنا حقیقی مقام کھو چکی ہے۔ میں یہاں مسلمانوں کے زوال کے سیاسی پہلو کے متعلق گفتگو نہیں کر رہا ہوں۔ ہماری موجودہ حالت کے اہم ترین اسباب عقلی اور سماجی پہلو ہیں' یعنی ہمارے عقائد کے ضعف وزوال اور ہماری سماجی تنظیم کا انتشار اور انحطاط ہیں۔ اس ابتدائی قوت اور تنومندی میں سے اب بمشکل ہی کچھ باقی رہا ہے' جو ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابتدائی اسلامی معاشرہ کی اس قدر حیرت ناک خصوصیت تھی۔ ثقافتی انتشار اور زبوں حالی کی وہ کیفیت جس سے ہم آج گذر رہے ہیں' واضح طور پر یہ بتاتی ہے کہ وہ توازن برقرار رکھنے والی قوتیں جو کبھی دنیائے اسلام کی عظمت اور شوکت کی ذمہ دار تھیں' آج قریب قریب ختم ہو چکی ہیں۔ ہم بہے جا رہے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ ہمارا ثقافتی انجام کیا ہوگا۔ آج ملت کے افراد میں نہ کوئی ذہنی عزم ہی باقی ہے اور نہ اس امر کی کوئی خواہش ہی پائی جاتی ہے کہ بیرونی اثرات کے اس سیلاب کا مقابلہ کیا جائے یا اس کا رخ موڑ دیا جائے جو ہمارے مذہب اور ہمارے معاشرے کے لئے باعث تباہی وہلاکت ہیں۔ ہم نے ان بہترین اخلاقی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا ہے جو دنیا کو کبھی نصیب ہوئی تھیں۔ ہم اپنے مذہب کی خود تکذیب کرتے ہیں جبکہ ہمارے اسلاف کے لئے اسلام ایک زندہ فعال قوت تھی۔ ہم اس پر شرمسار اور منفعل ہیں جب کہ وہ اس پر نازاں تھے۔ ہم سفلہ طینت اور خود پرست ہیں جبکہ انہوں نے فیاضانہ طور پر اپنے آپ کو ساری دنیا کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ہم اندر سے خالی ہیں' وہ اندر سے معمور تھے۔

Marfat.com

اس کا صحیح احساس ہی اس کا علاج ہے

ہر غور و تدبر کرنے والا مسلمان اس توجہ و ماتم سے اچھی طرح واقف ہے۔ ہر شخص نے اس کو بار بار سنا ہے' اس لئے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا اس کو پھر دہرانے سے کوئی فائدہ ہے؟ میرا خیال ہے کہ فائدہ ہے۔ انحطاط اور پستی کی شرمساری سے باہر نکلنے کا ہمارے پاس صرف یہی ایک دروازہ ہے......اور وہ یہ کہ ہم اس شرمساری اور ندامت کے احساس کو تسلیم کر لیں اور اس کو شب و روز اپنی نظر کے سامنے رکھیں اور اس کی تلخی کا مزہ چکھتے رہیں حتیٰ کہ ہم ان اسباب کو دور کر دینے کا بیڑا نہ اٹھا لیں جو اس کے ذمہ دار ہیں۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ ہم تلخ حقائق پر پردہ ڈال دیں اور فریب اور ریا سے یہ ظاہر کریں کہ دنیائے اسلام میں زندگی کی حرکت بڑھتی جا رہی ہے۔ چاروں براعظموں میں تبلیغی جماعتیں کام کر رہی ہیں اور یہ کہ اقوام مغرب روز بروز اسلام کے محامد و محاسن کو زیادہ تسلیم کرتی جا رہی ہیں۔ اس تمام خود فریبی سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ اپنے آپ کو اس امر کا یقین دلانے کے لیے کہ ہماری ذلت و خواری ابھی حد سے نہیں گزری ہے اور نہ فقیہانہ اور شاطرانہ تاویلات سے کوئی فائدہ ہے؟

اسلام کا مستقبل

لیکن کیا پھر یہی اختتام ہونا ہے؟

ایسا نہیں ہو سکتا۔ حیات نو کی وہ تڑپ' اپنے آپ کو موجودہ حالت سے بہتر بنانے کی وہ خواہش اور امنگ' جو آج ہم میں سے اکثر لوگوں کے دلوں میں موجود ہے۔ ہمیں اس توقع کا حق دیتی ہے کہ ابھی سب کچھ ختم نہیں ہوا ہے۔ حیات نو کے حصول کا ایک راستہ ابھی موجود ہے اور وہ راستہ ہر اس شخص کو صاف نظر آ رہا ہے جو دیدۂ بینا رکھتا ہے۔

حیات نو کا راستہ

ہمارا پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے دلوں سے اسلام کے متعلق معذرت خواہی کی کیفیت کو مٹا دیں جو صرف عقلی شکست خوردگی کا دوسرا نام ہے' جو صرف ہماری ذہنی فطرت اور نفاق کا ایک بدلا ہوا بھیس ہے اور ہماری دوسری منزل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا شعوری اور بالارادہ اتباع ہونا چاہئے۔ چونکہ سنت کا مطلب اسلامی تعلیمات کی عملی صورت کے علاوہ اور کچھ نہیں' اپنی روزمرہ کے مشاغل کو اس آخری کسوٹی پر کس کر ہم آسانی سے یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ مغربی تہذیب کی کن تحریکی قوتوں کو قبول کیا جا سکتا ہے اور کن کو مسترد کر دینا ضروری ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم عجز و شکست خوردگی کے جذبہ کے ساتھ اسلام کو بیرونی عقلی کسوٹیوں پر کسنے کے لئے پیش کریں۔ ہمیں پھر وہ بھولا ہوا سبق یاد کر لینا چاہئے کہ دراصل اسلام وہ کسوٹی ہے جس پر ساری دنیا کو پرکھ کر جانچنا چاہئے۔

Marfat.com

اسلامی نظریات کو اصل مآخذ کی روشنی میں ازسرِ نو مرتب کرنے کی ضرورت

لیکن یہ صحیح ہے کہ اسلام کی بہت سی فروعات ناموزوں اور ناکافی ہیں۔ عام طور پر تسلیم شدہ تاویلوں کی بنا پر پوری نہیں ہو سکیں اور ان مسلمانوں کے پیش نظر اسلام اور اسلامی چیزوں کی کم و بیش بگڑی ہوئی ایک تصویر موجود ہے اور وہ خود اس قابل نہیں ہیں کہ اصلی مآخذ کی طرف پلٹ کر اپنے اپنے تصورات اور نظریات کو اس کے مطابق بنا سکیں۔ وہ ناقابل عمل تجاویز جن کو آج نام نہاد "متدین" طبقہ اسلام کے اصولوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ وہ بیشتر صورتوں میں حقیقی اصولوں کی صرف روایتی تاویلیں ہیں جو عہد ماضی کی جدید افلاطونی منطق پر مبنی ہیں' جو دوسری یا تیسری صدی ہجری کے لئے "جدید" یعنی قابل عمل ہوں تو ہوں' لیکن اب بالکل بیکار اور مسترد ہو چکی ہیں۔ وہ مسلمان جس کی تعلیم مغربی اصولوں پر ہوئی ہے اور جو بیشتر عربی سے ناواقف اور فقہ کی باریکیوں سے لاعلم ہوتا ہے اس کو قدرتی طور پر یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ زنگ خوردہ شخصی تاویلات و تصورات شارع علیہ اسلام کے حقیقی مقاصد کے ترجمان ہیں اور اس مایوسی کی کیفیت میں جو ان کے نامکمل اور ناکافی ہونے کی بنا پر اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے' وہ خود شریعت ہی سے بے تعلق ہو جاتا ہے' جس کو اسلامی عقائد کا قانون سمجھتا ہے' اس لئے اگر اسلامی نظریات و افکار کو ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کی زندگی میں ایک تخلیقی قوت بنانا مقصود ہے تو ضروری ہے کہ ہم ان کو اصلی مآخذ کی روشنی میں اپنے فہم کے مطابق ازسرِنو مرتب کیا جائے اور ان پر سے روایتی تاویلوں سے وہ موٹی تہیں ہٹا دی جائیں جو صدیوں سے ان پر جمتی رہی ہیں اور جو موجودہ زمانہ کے لئے ناکافی پائی گئی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی مساعی کا نتیجہ ایک نئی فقہ کی صورت میں برآمد ہو جو اسلام کے دو حقیقی مآخذوں...... قرآن حکیم اور اسوۂ رسول کریمؐ...... کے عین مطابق ہو اور جو ساتھ ہی ساتھ دور حاضر کی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرتا ہو' بالکل اسی طرح جیسے کہ فقہ کی قدیم صورتیں اس دور کے تقاضوں کو پورا کرتی تھیں جس پر ارسطو اور جدید افلاطونی فلسفہ کا اثر غالب تھا اور جو زندگی کے ان حالات کے مطابق تھیں' جو ان ابتدائی ادوار میں پائے جاتے تھے۔

عظمتِ رفتہ کے حصول کا واحد طریقہ

لیکن اگر ہم اپنی گمشدہ خود اعتمادی دوبارہ حاصل کر لیں تو ایک مرتبہ پھر ہم ترقی و عروج کی توقع کر سکتے ہیں۔ اس منزل مقصود تک ہم ہرگز نہیں پہنچ سکتے اگر ہم اپنے سماجی نظام کو تباہ کر ڈالیں یا کسی بیرونی تہذیب کی تقلید کی کوشش کریں...... بیرونی تہذیب جو صرف تاریخی یا جغرافیائی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ روحانی اعتبار سے بھی بیرونی ہے۔

آج جو حالات درپیش ہیں' ان میں اسلام ایک ڈوبتے ہوئے جہاز کے مانند ہے' جو کوئی بھی اس کی مدد کر سکتا ہو' عرشہ جہاز پر اس کی موجودگی کی ضرورت ہے' لیکن اس کو صرف اسی صورت میں بچایا جا سکتا ہے کہ مسلمان قرآن کریم کے اس اعلان کو غور سے سنیں اور سمجھ لیں کہ:

Marfat.com

لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللّٰہ والیوم الاخرo

(سورہ احزاب آیت ۲۱)

تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی (کرنی ہے (یعنی) اس شخص کو جسے اللہ (سے ملنے) اور روز قیامت (کے آنے) کی امید ہو۔

(اسلام اور مغرب از علامہ محمد اسد۔ مترجم محمد جمیل احمد، کراچی ۲۰۰۵ء ص ۱۰۹-۱۱۸، ۱۵۳-۱۶۱)

Marfat.com

محمد اسد

عرفات

ہمارے پرانے احباب میں سے اکثر ''عرفات'' کے نام سے نا آشنا نہیں' لہٰذا ان کی خدمت میں اس کا تعارف غیر ضروری ہے' لیکن موجودہ حالات میں ''عرفات'' کی اشاعت چونکہ مغربی پنجاب کی اسلامی حکومت کے زیر اہتمام عمل میں آ رہی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات سے جو امید ہے' اب ہمارے حلقے میں شریک ہوتے جائیں گے۔ اس کی گذشتہ سرگرمیوں کے متعلق چند باتیں عرض کر دی جائیں۔

یہ ۱۹۴۶ء تھا جب پہلے پہل ''عرفات'' شائع ہوا اور جب اس کے تمام مضامین صرف ایک شخص یعنی راقم السطور مرتب کے قلم سے نکلے۔ ''عرفات'' کے مقاصد کی تشریح اشاعت اول (ستمبر ۱۹۴۶ء) میں کر دی تھی جس کا اگر نئے احباب کی خاطر ہم ایک دفعہ پھر اعادہ کر دیں تو ہمارے پرانے احباب ہمیں معذور سمجھیں:

''سراسر انقلاب اور سراسر ہیجان' یہ کیفیت ہے موجودہ عالم کی۔ ان سنی خوں ریزیاں، تشدد اور تباہی، متعدد اجتماعی روایات کا خاتمہ، تصورات (Ideologies) کا تصادم اور نئے نئے طریقہ ہائے زندگی کے لئے ایک بڑی تلخ اور ہمہ گیر جدوجہد، یہ ہیں ہمارے زمانے کے بعض خصائص۔ پھر ان خوفناک تبدیلیوں سے جو سائنس کے اکتشافات اور سائنس کی ایجادات سے مترتب ہوئیں' ایسے اکتشافات اور ایسی ایجادات جن کا دس بیس برس پہلے کسی کو وہم و گمان بھی نہیں تھا' اس ہلاکت اور بربادی سے' جو نتیجہ ہے دو عالمگیر اور کئی ایک چھوٹی چھوٹی لڑائیوں، علی ہذا متعدد انقلابات اور جوابی انقلابات کا اور ان معاشی آفات سے جن کی کوئی نظیر دنیا کی تاریخ نہیں ملتی' ایک حقیقت ہے جو رفتہ رفتہ لیکن ان عظیم الشان واقعات کی بدولت نا قابل انکار طور پر ہمارے سامنے آ رہی ہے اور وہ یہ کہ اب تک ہم اپنی زندگی جس انداز سے بسر کر رہے تھے' اس کا قائم رہنا ناممکن ہے۔

''یہ بات ہے کہ اگر ہم چاہیں بھی تو جس رنگ میں آج تک زندہ رہتے چلے آئے ہیں' زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ بے جا طمانیت کی زندگی تھی اور ہم اس دھوکے میں کہ زندگی کا وہ طور طریق جو ماضی میں ٹھیک تھا' آگے چل کر بھی ٹھیک رہے گا' اپنے آپ کو محفوظ و مصوّن تصور کرتے رہے' لیکن اس بے جا طمانیت اور وثوق و تیقن یا فریب کو پچھلے بیس تیس برس کے واقعات نے ختم کر کے رکھ دیا ہے۔

Marfat.com

''اندریں صورت ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنے سرمایہ تہذیب وثقافت کا ازسرنو جائزہ لیں۔آج صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارا اپنا ایک تصور ہے۔ہمیں ثابت کرنا ہوگا کہ ہمارے نظام افکار وتصورات میں اتنی زندگی ہے کہ زمانے کے تغیرات کا مقابلہ کر سکے۔ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ اگر ہم مسلمان ہیں تو ازروئے اسلام ہمیں اپنے اندر کیا تبدیلی پیدا کرنی ہوگی۔بہ الفاظ دیگر ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ آیا اسلام حیات اجتماعیہ کی تشکیل میں کوئی قطعی ہدایات دیتا ہے اور آیا اس کی دعوت میں اتنا زور اور اثر ہے کہ اس پر عمل پیرا ہو سکیں۔اس قسم کا فیصلہ کرنے سے پہلے ہمیں پھر اسلام پر غور کرنا ہوگا۔ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔احکام اور قوانین کیا ہیں، یہ اس لئے کہ ہم نے صدیوں سے ان باتوں پر غور کرنا چھوڑ دیا اور ان خیالات پر قناعت کر رکھی ہے جو ہماری پچھلی نسلوں نے اسلام کے متعلق قائم کیے اور یہی وجہ ہے کہ ہماری رائج الوقت فقہ کے زیادہ حصے کی مثال اس لباس کی ہے جس کا استعمال بھی اب کسی کو معلوم نہیں، لیکن جو بار بار بازار میں آتا اور مرمت ہو کر بکتا ہے اور خریدنے والے محض اس خیال سے خوش ہو کر خریدتے ہیں کہ اس کے سینے والے کیسے اچھے استاد ہیں اور ماہرین فن تھے۔

''ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں جب اسلامی دنیا ایک بڑے نازک دور سے گزر رہی ہے۔جب صدیوں کے لئے اس بات کا فیصلہ ہو جائے گا کہ اسلام قابل عمل ہے یا نہیں، ہم اپنی اس روش پر قائم نہیں رہ سکتے۔آج سے زیادہ کبھی اس امر کی ضرورت نہیں تھی کہ ہم اپنے دل و دماغ کا ہر پہلو سے احتساب کریں۔یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں کہ اس وقت کی بدلتی ہوئی دنیا میں ہماری معاشرت بھی تغیر کے اٹل قانون کی زد میں آرہی ہے۔تغیر ہوگا اور ضرور ہوگا' خواہ ہم اسے پسند کریں یا نہیں بلکہ تغیر ہو رہا ہے اور ہماری آنکھیں اسے دیکھ رہی ہیں۔ساری اسلامی دنیا تغیر وانقلاب سے گزر رہی ہے۔یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے اور زبردست امکانات کی حامل جو اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی۔اچھے اور برے اس لئے کہ ''تغیر'' ہی دوسرا نام ہے ''حرکت'' کا۔ایک ملی وجود کی حرکت تخلیقی بھی ہو سکتی ہے اور تخریبی بھی۔لہٰذا اسلامی نقطہ نظر سے تخلیقی حرکت کے معنی ہوں گے' دوسروں سے مستعار لئے ہوئے اصول وقواعد اور بے نتیجہ مراسم میں اعتماد واعتبار کو چھوڑ کر قرآن وسنت کے حقائق کا افراد اور ان کی اساس پر کیا باعتبار عمل اور کیا باعتبار فکر نئی نئی راہوں کی تلاش اور ان کی اساس پر کیا باعتبار عمل اور کیا باعتبار فکر نئی نئی راہوں کی تلاش وجستجو۔برعکس اس کے مغربی تصورات اور مغربی نظامات کی طرف بے سوچے سمجھے بھاگنا جیسا کہ اس وقت مسلمانوں کا شیوہ ہے' تخریب اور ہلاکت کا باعث ہو گا۔اب جی چاہے تو بدستور مغرب کی رو میں بہتے رہئے تا آنکہ اسلام کا تہذیب وتمدن کی دنیا میں کوئی حصہ نہ رہے اور جی چاہے تو اس کی روشنی میں پھر سے قدم اٹھائے اور ملت کو ادبار ونکبت اور رسم ورواج کے اس گڑھے سے نکالئے جس میں وہ دن بدن گرتی جا رہی ہے۔اگر یہ بات سچ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں تغیر اور تبدیلی سے محفوظ نہیں رکھ سکتی تو اس تغیر اور تبدیلی کو جس سمت چاہیں' موڑنا ہمارے اختیار میں ہے۔ہم اب بھی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اپنی زندگی کی تعمیر اسلامی قدروں پر کریں یا اسلام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تہذیب مغرب کے حاشیہ بردار بن جائیں۔

''ہمارے سامنے صرف یہی دو راستے ہیں' لہٰذا یہ بڑی حماقت ہوگی اگر ہم اس دھوکے میں مبتلا رہے کہ ان

Marfat.com

خیالات اور مراسم کو جو بالکل فرسودہ ہو چکے ہیں' جوں کا توں قائم رکھنا ممکن ہے۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں (اور بدقسمتی سے ان کی تعداد بہت کافی ہے) وہ گویا وہی کھیل کھیل رہے ہیں جو شتر مرغ کھیلتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس جانور کے لئے فیصلے کا وقت آتا ہے تو اپنا سر ریت میں چھپا لیتا ہے۔ یہ بڑا خطرناک کھیل ہے (اور ناقابل بیان حد تک احمقانہ) کیونکہ یہ لوگ شتر مرغ ہی کی طرح اس خطرے سے دوچار ہونے کا موقع کھو رہے ہیں جس نے سارے اسلام کو دعوت مبارزت دے رکھی ہے کہ اگر اس کی حیثیت فی الواقعہ ایک ثقافت آفریں جزو زندگی کی ہے تو اس دعوے کی صحت کا کوئی عملی ثبوت پیش کرے۔ معلوم ہوتا ہے ان لوگوں کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہو چکا ہے کہ ابھی تھوڑے دن ہوئے ہمارا ماضی چونکہ سرتاسر ''اسلامی'' تھا اس لئے کل تک ہمارے رسم ورواج کی جو کیفیت تھی' اس سے گریز کرنا خواہ اس کا تعلق ملی شعائر سے ہو' خواہ شرعی مسائل پر' ایک نئے انداز میں غور کرنے سے اسلام کے منافی ٹھہرے گا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اجتماعی اور ذہنی ہر لحاظ سے اس راستے پر چلتے رہے جس پر اب تک چل رہے تھے تو ہر بات ہماری مرضی کے مطابق ہوتی جائے گی۔ گویا پھر وہی شتر مرغ کی مثال پیش نظر رکھئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان لوگوں کے نزدیک اسلام اور مسلمانوں کا رسم ورواج چونکہ ایک ہی چیز ہے (جسے ظاہر ہے کہ آپ بھی تسلیم نہیں کریں گے) لہٰذا اسلام کی بقا کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ان حالات کو بدستور قائم رکھنے کی کوشش جاری ہے جن کے ماتحت ناممکن ہے کہ آج مسلمان صحیح اسلامی عقائد کے مطابق زندگی بسر کر سکیں (اور جو یقیناً آپ کے نزدیک بھی ایک بڑی غلط منطق ہے)۔ بہرحال یہ مفروضات کیسے بھی خالی از معنی اور بے حقیقت کیوں نہ ہوں شتر مرغ جیسے اذہان کچھ ایسے ہی طریق پر قائم ہیں۔ پھر چونکہ یہ لوگ سرے سے اس بات کے منکر ہیں کہ ہمیں اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا کرنی چاہیے اس لئے مسلمان دن بدن تقلید مغرب کا شکار ہو رہے ہیں۔

پس ان صفحات میں ہمارا خطاب ان لوگوں سے ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ شتر مرغ کا کھیل کھیلنا اپنی ہستی کی نفی کرنا ہے۔ پھر ہمارا روئے سخن بالخصوص مسلمانوں کے اس طبقے سے ہوگا جسے اسلامی تہذیب وتمدن کی موجودہ نازک صورت حالات کا بخوبی احساس ہے اور جو خود بھی غور وفکر سے کام لینا محض خالی خولی الفاظ اور فریب نفس سے بچنا چاہتے ہیں' جن کے نزدیک اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنا ایک بہت بڑا گناہ ہے اور جن کو اتنی جرأت ہے کہ حقائق کا جیسا کہ وہ فی الواقعہ ہیں نہ کہ جیسا ہم اپنی خود پسندی میں سمجھ رہے ہیں' سامنا کریں یا مختصراً جو اسلام کی ''خدمت'' ہی نہیں بلکہ خود بھی مسلمان بن کر زندہ رہنے کے متمنی ہیں۔

''یہ حضرات ہیں جن کی خدمت میں ہم ''عرفات'' پیش کر رہے ہیں اور جو ایک حقیری کوشش ہے اسلامی افکار کے احیاء کی' لہٰذا اگر قارئین کرام میں سے بعض کی یہ رائے ہو کہ ہماری تنقید کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ کڑی اور سخت ہو جاتی ہے تو انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ طلوع فجر سے پہلے جو ہوائیں چلتی ہیں' اکثر بڑی تیز بلکہ ناخوشگوار ہوتی ہیں۔ ہمیں بہرحال ایسی ہی ہوا کی ضرورت ہے' تازہ ہوا کی جو ہماری نکبت اور ادبار کا تار و پود اڑا لے جائے۔ ایسی ہوا جو ہمیں اسلام کے دوگونہ ماخذ یعنی قرآن وسنت سے قریب تر کر دے۔ ہم نے اپنی زندگی کی ابتدا قرآن وسنت سے کی تھی اور

Marfat.com

اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو ہم کو پھر قرآن وسنت ہی کی طرف لوٹنا ہوگا۔

''اس مجلّے کا نام ''عرفات'' تجویز کیا گیا تو اس کے تین وجوہ تھے۔ یہ عرفات ہی کا میدان ہے جہاں ہر سال لاکھوں مسلمان جامہ احرام پہنے جمع ہوتے ہیں اور جہاں یہ اجتماع صحیح معنوں میں ایک امت کا مظہر بن جاتا ہے' وہ امت جس میں نسل کا امتیاز ہے نہ قومیت اور جماعتی مراتب کا' جو فرقوں کے اختلاف کو تسلیم کرتی ہے نہ ''مذاہب خیال'' کے' جو صرف مسلمانوں کی امت ہے اور جس کے لئے کسی دوسرے اسم صفت کی ضرورت نہیں۔ ثانیاً ہمارے نبی صلعم نے میدان عرفات میں مسلمانوں کے اجتماع کو میدان حشر کے اس عظیم تر اجتماع سے تشبیہ دی ہے جو قیامت کے دن ہو گا اور جس میں ہر کوئی فیصلے کا منتظر اور ان اعمال وافعال کا حساب پیش کرتا رہے گا جو اس نے دنیا کی زندگی میں کئے تھے۔ ہمارے نزدیک مسلمانوں کو آج سب سے زیادہ کچھ ایسی ہی تنبیہ وتذکیر کی ضرورت ہے اور وہ احتساب نفس سے بڑھ کر کسی بات کے محتاج نہیں۔ ثالثاً یہ عرفات ہی کا موقع تھا جب حجتہ الوداع میں یہ آیہ شریفہ حضور رسالت مآب (صلعم) پر نازل ہوئی:

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا

''آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا، اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لئے صرف اسلام ہی کو دین پسند کیا۔''

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

یہ نہج تھا جس پر ''عرفات'' کی اشاعت تقسیم ہندوستان کے فیصلہ کن ایام تک جب یہ نیم براعظم ایک ناقابل مثال خلفشار میں مبتلا ہو گیا' جاری رہی۔ اس خلفشار کا اثر ''عرفات'' پر بھی پڑا۔ اس کی اشاعت بند ہو گئی لیکن چند مہینوں کے لئے کیونکہ اس سرزمین میں ایک نئی زندگی کے جو زبردست امکانات ملت کے سامنے آ رہے تھے' ان کا تقاضا تھا کہ ''عرفات' کی وہ مہم جس کا تعلق اسلام کے عملی احیاء سے ہے اور زیادہ شدید کر دی جائے' لہٰذا یہ مجلّہ محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کے اپنے پرچے کے طور پر جو ابھی حال میں قائم ہوا اور جس کی نگرانی کا شرف راقم الحروف کو حاصل ہے' جاری ہو رہا ہے۔ پھر جیسا کہ قارئین کرام آئندہ صفحات میں ملاحظہ کریں گے' اس مجلّے کی غرض وغایت بھی وہی ہے جو ''عرفات'' کی اپنی زندگی کے نجی دور میں تھی اور جس میں کوئی تغیر ہوا تو صرف اتنا کہ پاکستان کے قیام نے ہمیں اس امر کا موقع دے دیا ہے کہ اپنے بعض نظریوں کے لئے اور زیادہ جدوجہد اور ان کی تعبیر کی عملی کوشش کریں۔

''عرفات'' اس نئے دور میں اردو اور انگریزی دو زبانوں میں شائع ہوا کرے گا۔ اب یہ صرف ایک ''شخص واحد'' کا پرچہ نہیں' اس کے صفحات دوسرے حضرات کے لئے بھی کھلے ہیں۔ بایں ہمہ ''عرفات'' کو محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کی آواز تصور کرنا چاہیے۔ سردست اس کی اشاعت سہ ماہی ہوگی لیکن خیال ہے کہ آئندہ سال سے اس کے انگریزی اور اردو دونوں نسخے ماہوار شائع ہوں گے۔ ان شاء اللہ۔

(عرفات، جلد ا عدد ا، بابت مارچ ۱۹۴۸ء)

Marfat.com

محمد اسد

احیائے ملت اسلامیہ

ان زبردست روحانی اور مادی تغیرات کے پیش نظر جو پچھلے چند دنوں سے ملت اسلامیہ کے اندر اس ملک میں رونما ہو رہے ہیں، حکومت مغربی پنجاب نے مناسب سمجھا کہ ایک نئے محکمے کی بنا ڈالے تاکہ وہ بعض ایسے مسائل کا حل سوچے جو ان تبدیل شدہ حالات سے مترتب ہوئے۔ اس محکمے کی غایت یہ ہے کہ اسلامی اصولوں کے ماتحت زندگی کی ازسرنو تعمیر میں ملت کا ہاتھ بٹائے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا نام ''محکمہ احیائے ملت اسلامیہ'' رکھا گیا۔ عصر حاضر میں یہ پہلا موقع ہے جس اس ملک میں ایک سرکاری محکمے کے ساتھ ''اسلام'' کا لفظ ملحق نظر آتا ہے۔ پھر یہ بات حکومت کی گذشتہ روایات سے اس قدر مختلف ہے کہ ہمیں اپنا کام شروع کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوا کہ چند باتیں عامۃ الناس کی آگاہی کے لئے عرض کر دیں۔

پچھلے چند مہینوں میں اہل پاکستان پر کیا کچھ نہیں گزری، ہم کتنے بڑے خطرات میں گھر گئے تھے، کتنی جانیں ضائع ہو گئیں اور کتنا بڑا مالی نقصان ہوا جس کی کوئی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ پناہ گزینوں کو دیکھئے تو ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ مصائب کا خیال کیجئے تو بیان کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ یہ باتیں تھیں جن کا ایک آزاد اور خود مختار ریاست کی حیثیت سے وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بہت پہلے ہمیں سامنا کرنا پڑا اور جن کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اب ان کا سلسلہ ختم ہوا، کیونکہ گو پاکستان ایک مستقل حقیقت بن چکا ہے، جسے دنیا کی کوئی طاقت نیست و نابود نہیں کر سکتی، پھر بھی اس کے لئے زبردست جدوجہد درکار ہے تاکہ ہم ان خطرات پر غالب آئیں جنہوں نے ہر چہار طرف سے ہمیں گھیر رکھا ہے اور جیسا کہ قائداعظم کا ارشاد تھا: ''اپنے تصور کی ایک ریاست'' قائم کر سکیں، وہ ریاست جو ہماری اس آرزو کے عین مطابق ہو کہ ہم اپنے نظام سیاست کی بنا اسلام پر رکھیں۔ ہم نے اس کام کی ابتدا کی ہے لیکن ہمیں جو راستہ چلنا ہے، وہ طویل بھی ہے اور کٹھن بھی۔ اس سے کہیں زیادہ طویل اور کٹھن جیسا کہ ہمارے عجلت پسند احباب نے سمجھ رکھا ہے، دراصل ایک صحیح اسلامی نظام سیاست کا قیام کوئی معمولی بات نہیں۔ بالخصوص جب ہم صدیوں سے ذلت اور محکومیت میں مبتلا تھے، جب ہماری ہمتیں پست اور ملی اخلاق و فضائل کا بڑی حد تک خاتمہ ہو چکا تھا۔ بایں ہمہ یہ کام ہے جس سے ہم اپنا منہ نہیں موڑ سکتے اور جسے اگر ہم اپنے سابقہ دعووں پر قائم ہیں تو بہرحال کرنا

Marfat.com

پڑے گا۔

پھر جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے ہم نے پاکستان کے لئے جو لڑائی لڑی' اسلامی مطمح نظر کے ماتحت لڑی۔ ہم نے کہا تھا اور آج بھی کہتے ہیں کہ مسلمان ایک ملت ہیں کیونکہ ہمارا مذہب اسلام ہے۔ ہمارے نزدیک مذہب کی حیثیت محض یہ نہیں کہ وہ ایک مجموعہ عقائد اور ضابطہ اخلاق ہے' ہم کہتے ہیں کہ وہ ایک اصول عمل بھی ہے۔ اسلام اس بات پر جیسا کہ تقریباً سب مذاہب کا شیوہ ہے' راضی نہیں ہو جاتا کہ اپنا تعلق صرف عالم روحانیات سے رکھے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہماری زندگی کے مادی پہلو بھی اس کے نظریہ حیات کے مطابق ڈھل جائیں۔ قرآن حکیم اور نبی صلعم کے اسوۂ حسنہ میں زندگی کا جو زبردست نظام ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے' وہ حیات انسانی کے جملہ مظاہر-- اخلاق اور مادی، روحانی اور ذہنی، انفرادی اور اجتماعی-- کا جامع اور ان سب کو اس ناقابل تقسیم کل کا ایک جزو ٹھہراتا ہے جسے ہم "انسانی ہستی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ہم محض اسلامی عقائد کے اقرار سے اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس کے سوا کچھ اور بھی کرنا پڑے گا اور وہ یہ کہ اگر اسلام کو صرف ایک لفظ بن کر زندہ نہیں رہنا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اپنے اخلاق اور کردار میں بھی انفرادی اور اجتماعی ہر لحاظ سے وہی رنگ پیدا کریں جو ہمارے عقائد کا ہے۔

اسلام کا یہی خاص پہلو (جسے ہر وہ شخص جو اس کے اصولوں سے ذرا سی بھی واقفیت رکھتا ہے' خوب جانتا ہے)، وہ بنا ہے جس کے ماتحت ہم نے ایک آزاد اور خودمختار ریاست کا مطالبہ کیا' کیونکہ یہ صرف ایک آزاد ریاست ہے جس میں ہم حکومت، قانون اور اجتماعی نظم و نسق کے سارے ساز و سامان کے ساتھ اس نظام کی عملاً تکمیل کر سکتے ہیں جو اسلام نے ہمارے سامنے پیش کیا۔ یہ نصب العین تھا جس کی خاطر ہم نے ایک آزاد پاکستان کے حصول کی جدوجہد کی اور ایسی ایسی مصیبتیں اٹھائیں اور اٹھا رہے ہیں جو اس زمانے میں دنیا کی اور کسی قوم کو پیش نہیں آئیں۔ پھر جس قدر ہمارے عزائم بلند تھے' اتنی ہی ہماری مصیبتیں سخت۔ یوں بھی اس عہد میں جب ہر کہیں کسی نسلی یا ثقافتی بنیادوں پر وطنیت کا تصور جاگزیں ہو چکا ہے۔ ایک تصوری (ideological) ریاست کا تخیل ایسا عجیب و غریب اور ان باتوں سے جن کو دنیا "وقت کے مطابق" اور پسندیدہ ٹھہراتی ہے' اتنا غیر متناسب اور دور واقع ہوا ہے کہ اس کی زبردست مخالفت ناگزیر تھی۔

بات یہ ہے کہ آج کل زیادہ تر لوگوں کے نزدیک قومیت کی اساس نسلی روابط اور تاریخی روایات ہی پر رکھی جا سکتی ہے۔ برعکس اس کے ہم مسلمان ایک ملی تصور کے قائل ہیں یعنی ایک ایسی ملت کے جو زندگی کے ایک قطعی نصب العین اور اخلاقی قدروں کے ایک قطعی پیمانے پر متفق ہو اور اسے قومیت کے بلند ترین مرتبے سے تعبیر کرے' پھر ہمارے اس دعوے کی محض یہ وجہ نہیں کہ ہمیں اپنے مخصوص تصور حیات یعنی اسلام کے منجانب اللہ ہونے کا یقین ہے بلکہ یہ بھی کہ از روئے عقل وہی قوم انسانیت کا زیادہ بہتر اور ترقی یافتہ نمونہ ٹھہرے گی جس کی تشکیل میں افکار و تصورات نے حصہ لیا' نہ کہ وہ جس کا دارومدار نسل یا زبان یا وطن کی اتفاقی وحدت پر ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم اوپر عرض کر آئے ہیں' موجودہ زمانے میں یہ نظریہ کچھ بہت زیادہ مقبول نہیں کیونکہ ہمارے معاصرین ابھی تک اپنے اپنے ملکوں میں ان قدیم اور فرسودہ قومی عزائم اور باقی دنیا کی طرح قومی تعصبات کے چکر سے

Marfat.com

نہیں نکلے جوصدیوں میں متشکل ہوئے' وہ عزائم اوروہ تعصبات جن کی بدولت آج دنیا میں ہر کہیں فتنہ وفساد رونما ہے۔ لہٰذا ہماری یعنی ملت اسلامیہ کی یہ شان نہیں کہ باقی دنیا کی طرح فتنہ وفساد کے راستے پر چلے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اسلام کی ازلی اورابدی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ایک تصوری ریاست کی تاسیس کا بیڑا اٹھائیں۔

ہمارے پیش نظرایک آزادانہ معاشرہ ہے جس کا دروازہ ہراس شخص کے لئے کھلا ہوگا جو ہمارا ہم خیال ہے اور اس شخص کے لےبھی جواگر چہ مذہباً ہمارے تصورات سے متفق نہیں لیکن اس کے باوجود ہم سے اشتراک عمل کے لئے تیار ہے۔لہٰذا ہماری خواہش ہے کہ ہمیں اس کی تشکیل کا موقع دیا جائے۔ یہ بڑی اہم بات ہے اوراس لئے ہم پاکستان کے غیر مسلم باشندوں سے درخواست کریں گے کہ اس پر ذرا اچھی طرح سے غور کریں۔ ہمارا معاشرہ ہر شخص کے لئے کھلا ہے یعنی اجتماعی لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمارے اشتراک عمل کا دائرہ صرف مسلمانوں تک محدود نہیں کہ صرف وہی شہریت کے جملہ فوائد سے مستفید ہوں' لہٰذا ہم ہرایسے شہری کوخواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان' لیکن اس دستور کی بنا پر آمادۂ تعاون ہے جسے''پاکستان دستور ساز اسمبلی'' سے عنقریب وضع کرنے کے لئے کہا جائے گا۔ اشتراکِ عمل کی دعوت دیں گے۔ اس ریاست کا اپنے شہریوں سے اگر کوئی مطالبہ ہوگا تو صرف یہ کہ اس کے اسلامی دستور کے عملاً وفادار رہیں۔ وفاداری ہی کوشہریوں کے اچھے برے ہونے کا معیار تصور کیا جائے گا۔ قطع نظر اس سے کہ وہ نتیجہ ہے ان کے مذہبی عقیدے یااس معمولی فہم وفراست کا کہ ان اجتماعی تصورات کوجن پر اکثریت کا اتفاق ہے' خود بھی اختیار کرلیا جائے۔

حقیقت میں اس دستورکو وضع کرنے کا اصل بوجھ مسلمانوں ہی کے کاندھوں پر ہوگا۔ مسلمانوں ہی کی اس ملک میں اکثریت ہے اوروہی ان تصورات کے علم بردار ہیں جن کے ماتحت پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ پھر یہ صرف دستور ساز اسمبلی کے ارکان ہی نہیں بلکہ ساری ملت ہے جو بحیثیت مجموعی اس امر کی ذمہ دار ہوگی کہ جو دستور تیار ہوتا ہے کیسا ہوتا ہے' لہٰذا یہ بہت بڑی غلطی ہوگی اگر ہم یہ سمجھتے رہیں کہ ایک ایسا دستور جو فی الواقعہ کامیابی سے چل سکے' مجالس وضع قوانین سے چنے ہوئے کچھ ارکان کے ہاتھوں آپ سے آپ مرتب ہو جائے گا۔ اس کے قوانین اور دفعات کی ترتیب تو بے شک یہی حضرات جن کو ہم نے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا' کریں گے لیکن ان کی کوششیں اس وقت تک بارآور نہیں ہو سکتیں جب تک ساری ملت ایک زبان ہوکران کی تائید نہ کرے۔ یادرکھنا چاہیے کہ ہماری قوم اگر صحیح معنوں میں متحد ہو سکتی ہے اوراس میں وحدت مقصد پیدا ہوگی (جس کے بغیر ملت کوملت کہلانے کا حق نہیں) تو اس شرمناک پراگندہ خیالی اور پستی، اس افسوسناک ایمانی کمزوری اور خلوص ملی کی کمی اوراس اخلاقی تباہی سے نکل کر جو پچھلے چند دنوں سے گویا ہماری سیرت وکردار کا جزو بن چکی ہے۔ بالفاظ دیگر ملت کا فرض ہے کہ ایک دفعہ پھر اپنے روحانی اور عقلی سرمائے کو یکجا کرے' اپنی قوت اخلاق کوجس کی یہ ملت بحیثیت ملت اسلامیہ یقیناً اہل ہے' بروئے کار لائے اوراس اسلامی فضا کی تعمیر میں جو اسلام کے عملی احیاء کے لئے ناگزیر ہے' پھر سے مصروف ہو جائے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

Marfat.com

سطور ذیل میں ہم اس لائحہ عمل کا ایک خاکہ پیش کریں گے جو آئندہ چند مہینوں کے لئے محکمۂ احیائے ملت اسلامیہ کے سامنے ہے' لیکن اس لائحہ عمل کو بجائے خود مکمل تصور کرنا غلط ہوگا۔ اسلامی فکر وعمل کا احیاء اور وہ بھی صدیوں کے زوال وانحطاط کے بعد کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ اتنا بڑا کام ہے جس کے لئے بہترین دماغوں کے اشتراک عمل کی ضرورت ہوگی تاکہ وہ اس مقصد کے لئے ایک قطعی راستہ اور اس کی ضروریات کا ایک مکمل نقشہ تجویز کرسکیں۔ لہٰذا ہماری سرگرمیوں کی آخری شکل جب ہی متعین ہوسکے گی کہ اس محکمے اور رائے عامہ کا تعلق آپس میں قائم ہوجائے۔ ذیل میں جو خاکہ دیا گیا ہے'اس رقبے کی ''نشاندہی'' ہے جس میں سردست احیائے اسلام کے مسائل محدود رہیں گے۔

پھر توضیح مطلب کی خاطر ہم نے اگرچہ یہ سب مقاصد چند ذیلی عنوانات کے ماتحت جمع کردیئے ہیں لیکن عملاً ہمارے کئی ایک وظائف جو ویسے یہاں الگ الگ بیان ہوئے' چونکہ ساتھ ساتھ ادا ہوا کریں گے' لہٰذا ضروری ہوگا کہ ہم ان کو ایک یکساں ضابطے میں شامل کرلیں۔

ا۔ تعلیم

عام طور سے دیکھا جائے تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو بہ حیثیت مجموعی اسلامی تعلیمات کی صحیح روح سے پھر آشنا کیا جائے۔ اس سلسلے میں ہمیں نوجوانوں پر خاص طور سے نظر رکھنی ہوگی جن کی تربیت اسکولوں اور کالجوں میں ہورہی ہے' لہٰذا محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ ارباب تعلیم کے سامنے وقتاً فوقتاً ایسی تجاویز پیش کرتا رہے کہ ہمارے کالج اور اسکول اس نئی زندگی کا پورا پورا نمونہ بن سکیں' جواب ملت کے سامنے ہے۔ ان تجاویز کا تعلق نصاب تعلیم، کتب درس اور مباحث متعلقہ کے علاوہ اس روش سے بھی ہوگا جو ہماری درسگاہوں کو بالعموم اسلامی معاملات میں اختیار کرنی چاہیے۔ مسلمان طالب علموں کے لئے دینیات کی تعلیم لازم قرار دی جائے گی اور وہ قرآن و حدیث سے شروع ہوکر -- اعلیٰ جماعتوں میں اصول تفسیر وشرح کا مطالعہ بھی ضروری ہوگا -- قرآن وحدیث ہی پر ختم ہوجائے گی۔ مقصد یہ ہے کہ -- اونچے درجوں میں -- طلباء قرآن پاک کے مطالب اور سنت نبوی سے واقفیت کے ساتھ ساتھ اس امر کو بھی جان لیں کہ ہمارے مختلف مذاہب فقہ کا طرز عمل اس بارے میں کیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی لازم آئے گا کہ دینیات کی تعلیم کے لئے جو نصاب تیار کیا جائے' اس میں تاریخ اسلام کے ابتدائی عہد کے ایک نہایت درجہ تفصیلی اور تنقیدی مطالعے کا -- قطع نظر اس سے کہ تاریخ کی عام تعلیم میں ہم اسے کیا جگہ دیتے ہیں -- اضافہ کرلیا جائے۔ فلسفۂ اسلام کی مختلف شاخوں کو بھی فلسفہ کے عام مطالعہ کے علاوہ نصاب دینیات میں شامل کرنا پڑے گا۔ پھر اس جدید نصاب کی آخری منزلوں میں اس امر کا التزام رکھا جائے گا کہ اسلام نے جو نظام حیات پیش کیا ہے' اس پر موجودہ زمانے کے ان مسائل کا لحاظ رکھتے ہوئے جن کا تعلق ہماری معاشی زندگی اور علوم اجتماعیہ سے ہے' بالاستیعاب نظر ڈالی جائے۔ ان سب باتوں سے قدرتاً ہم رفتہ رفتہ مجبور ہوجائیں گے کہ اپنے تعلیمی مقاصد کے اندر صحیح اسلامی روح پیدا کریں۔ البتہ سردست ہم اس قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کرسکتے۔ مسائل اتنے ہیں اور ان کا اثر اتنی دور تک پہنچتا ہے کہ اس کی تحقیق وتفتیش کا کام ہمیں علماء کی ایسی کمیٹیوں کے ذمے کرنا پڑے گا جو اپنے وقت پر اس مقصد کے لئے قائم

Marfat.com

کی جائیں گی اور جن کو یہ سوچنا ہوگا کہ اس ضمن میں حکومت کے سامنے کیا تجاویز پیش کی جائیں گی۔

ہماری خواہش ہے کہ سربرآوردہ ارباب تعلیم اور ماہرین علوم مشرقی کی ایک کمیٹی قائم کی جائے اور وہ اس امر پر غور کرے کہ (الف) آیا عربی زبان کو اسکولوں اور کالجوں میں لازمی قرار دینا چاہیے اور (ب) اگر ایسا کرنا ضروری ہے تو اس مقصد کے لئے ایک ایسی اسکیم مرتب کرے جو ہر لحاظ سے قابل عمل ہو۔

پھر ان امور کے علاوہ جن کا تعلق نصاب تعلیم سے ہے' محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کا یہ بھی ارادہ ہے کہ اسکولوں اور کالجوں کی زندگی میں اسلامی رنگ پیدا کرنے کے لئے چند قطعی تجاویز پیش کرے۔

۲۔ مرکزی دارالعلوم

اگر پاکستان کو جدید دنیائے اسلام کا ثقافتی مرکز بننا ہے-- جیسا کہ اپنے زبردست وسائل اور سیاسی حیثیت کے اعتبار سے اس کا حق ہے-- تو ہمیں اس ملک میں ایک ایسا مرکزی دارالعلوم قائم کرنا پڑے گا جہاں ہماری ملی ضروریات کے لئے بڑے بڑے مقتدر علماء پیدا ہوں۔ سردست اس قسم کا کوئی ادارہ موجود نہیں' لہٰذا حکومت نے محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کو اختیار دیا ہے کہ مشاہیر علماء، علوم مشرقیہ کے ماہرین اور ارباب تعلیم کی ایک مجلس ترتیب دے جو علوم اسلامیہ کے مطالعے کے لئے ایک عظیم الشان درسگاہ کی تشکیل کے متعلق مبسوط تجاویز پیش کرے۔ اس ادارے میں مصر کی مشہور و معروف درسگاہ جامعہ ازہر کے نقش قدم ہی پر نہیں چلا جائے گا بلکہ ممکن ہوا تو عہد جدید کے وہ عناصر تعلیم بھی داخل کر دیئے جائیں گے جو اس زمانے کی مقتضیات کو پورا کر سکیں' لہٰذا اس دارالعلوم کے طلباء کو قرآن، حدیث، فقہ (اس کے مختلف مذاہب) اور علوم متعلقہ کی مکمل تعلیم کے علاوہ جس میں قدیم اور جدید عربی ادب کا مطالعہ بھی شامل ہے جو موجودہ زمانے کے معاشی اور اجتماعی تغیرات سے بھی اس حد تک باخبر رکھا جائے گا کہ وہ-- علمائے متقدمین کی طرح-- ملت کے صحیح رہنما اور پیشوا بن جائیں۔

اس کمیٹی کے قیام سے پہلے محکمہ احیائے ملت اسلامیہ جہاں تک ممکن ہو سکا' پاکستان اور پاکستان کے باہر دوسرے اسلامی ممالک کے زیادہ سے زیادہ علماء کا مشورہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا تا کہ یہ کمیٹی سچ مچ ملت کی رائے عامہ کی ترجمانی کر سکے۔

۳۔ شریعت اور احیائے ملی

ایک بہت بڑی مشکل جو اسلامی نقطہ نظر سے احیائے ملت کے راستے میں پیش آتی ہے اور جس کی وجہ سے ہم اب تک اس سلسلے میں کوئی صاف صاف، واضح اور عملی اسکیم تیار نہیں کر سکے' یہ ہے کہ ہمارے پاس قوانین شریعت کا کوئی ایسا ضابطہ موجود نہیں جس کا اطلاق تمام اجتماعی امور میں متفقہ طور پر ہوتا ہے' لہٰذا ان تمام معاشی، اجتماعی منصوبوں اور تجاویز و تدابیر کے متعلق جن کا آج کل ہر کہیں چرچا ہے' ملت کا انتشار خیال اس افسوس ناک حد تک پہنچ گیا ہے کہ اس باب میں ''اسلامی'' اور ''غیر اسلامی'' کا فیصلہ ہی نہیں ہونے پاتا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اس مسئلے میں علمائے اسلام کے اندر (خواہ وہ قدیم الخیال ہوں یا جدید الخیال) جو اختلاف پایا جاتا ہے' اس کا تعلق ان طریقوں سے ہے جو قرآن و

Marfat.com

سنت کی تعبیر میں اختیار کیے جاتے ہیں' لہٰذا جب تک یہ اختلاف دور نہیں ہوگا یعنی جب تک ہم اپنے عملی اور جماعتی معاملات کو اتفاق رائے سے سلجھا نہیں لیتے، ناممکن ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے کوئی ایسا لائحہ عمل تیار ہو سکے جس پر ہمارے سب مذاہب فقہ نہیں تو کم از کم ان کی اکثریت کا اتفاق ہو جائے۔ مزید برآں اسلامی فقہ میں صدیوں سے جو انتشار اور پیچیدگی رونما ہے' اس کا لحاظ رکھ لیجئے تو سردست مشکل ہے کہ موجودہ فقہی اختلافات کو دور کرتے ہوئے ہم ان کی الگ الگ تعبیرات اور اجتہادی استنباطات کو جو اس انتشار اور پیچیدگی کا حقیقی سبب ہیں' ایک نہج پر لا سکیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں اقدام کے لئے کوئی عملی -- بلکہ یہ بھی کہنا چاہیے کہ قابل عمل -- تجویز مرتب کرنی ہے تو ہمارا فرض ہے کہ بالفعل ان سب باتوں سے قطع نظر کر لیں جن میں تعبیر و استنباط ناگزیر ہے اور اپنی توجہ صرف ان شرعی قوانین پر رکھیں جو بجائے خود واضح اور قرآن و سنت کے ظواہر الفاظ میں اس طرح بیان کر دیئے گئے ہیں کہ ان کے متعلق کسی مذہب فقہ میں اختلاف رائے کی گنجائش ہی نہیں۔ اگر ان احکام کی تدوین ہو جائے تو احیائے ملّی کے فریضے میں ایک اقل قلیل اور متفقہ لائحہ عمل ہمارے سامنے ہوگا۔

لہٰذا اس محکمے کی تجویز ہے کہ جملہ مذاہب فقہ کے مشاہیر علماء سے ایک شریعت کمیٹی کے لئے جس کا قیام عنقریب عمل میں آئے گا' کچھ فاضل ترین حضرات کو نمائندوں کے طور پر نامزد کرنے کی درخواست کی جائے۔ اس کمیٹی کا کام یہ ہوگا کہ قرآن و سنت کے ان معاشی اور اجتماعی احکام کی تدوین کرے جن کو ہم نصوص سے تعبیر کر سکتے ہیں یعنی جن کے الفاظ اور عبارت اس قدر صاف اور واضح ہے کہ ان کے معانی و مطالب کے متعلق کوئی ابہام یا شک و شبہ باقی نہیں رہتا اور اس لئے ناممکن ہے کہ ان کی تعبیر میں نزاع و اختلاف کا دروازہ کھل سکے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم اپنی طرف سے کوئی شرعی قوانین ''وضع'' کر رہے یا ''از سر نو وضع'' کرنا چاہتے ہیں۔ کمیٹی کے لئے جو ہدایات کار طے کی جائیں گی' ان کی رو سے اس کا کام صرف اتنا ہوگا کہ قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں جن پر گویا تمام مذاہب کا اتفاق ہے' جس قدر احکام نصاً آئے ہیں جمع کرتے ہوئے ان کی تدوین چند مخصوص عنوانات کے ماتحت کر دے۔ یوں ایک ایسا ضابطہ مرتب ہو جائے گا جو فی الجملہ مختصر اور محض امور جماعت سے متعلق ہوگا اور جس کے بارے میں ہم کہہ سکیں گے کہ مختلف مذاہب کے درمیان قدر مشترک کا حکم رکھتا ہے۔ اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہو گئے تو جہاں تک اجتماعی معاملات کا تعلق ہے' شرعی قوانین کا ایک اقل قلیل ضابطہ ملت کے ساتھ آ جائے گا اور اس سلسلے میں مزید غور و فکر کی اساس کے علاوہ قانون سازی میں بھی تمہید اور ابتدا کا کام دے گا۔

۴۔ اسلامی فقہ اور اسلامی معاشیات

علمائے اسلام اور ماہرین معاشیات کی ایک دوسری کمیٹی اس امر کے متعلق عملی تجاویز پیش کرے گی کہ ہماری معاشی زندگی میں از روئے اسلام کس طرح صحیح نشو و نما پیدا ہو سکتا ہے اس کمیٹی کو اپنے کام میں جس شرط اولیں کی ضرورت ہے' وہ اس اقل قلیل ضابطہ قوانین شریعت کی صورت میں جس کی طرف اوپر کی عبارت میں اشارہ کر دیا گیا ہے' پہلے سے موجود ہوگا۔ کمیٹی کی ہدایات کار میں یہ بات شامل ہوگی کہ بعض جدید معاشی مسائل کی تحقیق شریعت اسلامی کی

Marfat.com

روشنی میں کرے۔ مثلاً صرافہ (Banking) اور بیمہ، قرضوں کا لین دین، ذاتی جائیداد کا تصرف (Requisition) جماعتی اغراض کے لئے، زرعی اصلاحات (جس میں زمین کی عام ملکیت (Nationalisation) کا سوال بھی آ جاتا ہے) وغیرہ کی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم معاشی منصوبہ بندیوں (Planning) کے لئے جو حکومت کے دوسرے محکموں کا کام ہے، تفصیلی خاکے (Blue-print) تیار کرنا چاہتے ہیں' ہرگز نہیں۔ اس کمیٹی کا وظیفہ صرف یہ ہو گا کہ (الف) بعض معاشی مسائل کے متعلق شرعی نقطہ نظر کی وضاحت کرے اور (ب) بتلائے کہ ہم اپنی موجودہ زندگی کی ضروریات کو اس نظام کے مطابق کس طرح ڈھال سکتے ہیں جو اسلام کے پیش نظر ہے۔ اس طرح جو نتائج مرتب ہوں گے' ان سے آگے چل کر ہماری مجالس وضع قوانین بخوبی استفادہ کر سکتی ہیں۔

۵۔ اوقاف کی تنسیق

ہمارے ملک میں اوقاف اور ایسے اسلامی اداروں کی کمی نہیں جو قوم کی ملکیت ہیں۔ ان میں بعض کی آمدنی بڑی معقول ہے اور ان کا قیام وقتاً فوقتاً اس غرض سے عمل میں آتا رہا کہ ملت کے دینی، تعلیمی اور اجتماعی سود و بہبود کا خیال رکھیں۔ چنانچہ بعض اوقاف کا انتظام بھی اچھا ہے لیکن بیشتر کی حالت بڑی خراب ہے اور کچھ ادارے تو ایسے ہیں جن کے متعلق یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ان کو متولیوں نے اپنی ذاتی جائیداد سمجھ رکھا ہے۔ اس حالت میں بعض اوقاف کا سرمایہ جس طرح خورد برد ہو رہا ہے' ظاہر ہے لیکن یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے سب اوقاف چونکہ کسی ایک نسق پر نہیں چل رہے' اس لئے یہ سرمایہ یونہی ضائع ہو رہا ہے حالانکہ وہ ملت کی کئی ایک مفید اغراض میں صرف ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مسلمانوں کا نیک نیتی سے خیال تھا کہ ان سب اوقاف کا کسی ایک نسق پر اور اس کے ساتھ ساتھ ایک مرکزی جماعت -- جو ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی -- کے زیر نگرانی آ جانا ضروری ہے تا کہ ان کی بدانتظامی اور بے نتیجہ تکرار عمل کا سدباب ہو سکے۔ لہٰذا اگر ہم اس مطالبے میں کامیاب ہو جائیں تو آمدنی کا ایک اتنا بڑا اور مجتمعہ ذریعہ ہمارے ہاتھ آ جائے گا جسے ملت کی اصلاح و ترقی کے لئے بعینہٖ صرف کیا جا سکتا ہے جیسا کہ ان نیک دل حضرات کی جنہوں نے یہ وقف قائم کیے' خواہش تھی۔

محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کی تجویز ہے کہ بعض سربرآوردہ حضرات اور نامور علماء کی ایک کمیٹی شرعی نقطہ نظر سے اس جائیداد کے مسئلے پر غور کرے جو اوقاف سے متعلق ہے اور پھر ہر ضروری پہلو کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی ایسی مرکزی جماعت کے زیر نگرانی جسے حکومت اس مقصد کے لئے مقرر کرے گی' تنسیق اوقاف کی ایک قطعی تجویز حکومت کے سامنے لائے۔

۶۔ اخلاق ملی

ہماری ملی زندگی کا سب سے زیادہ تشویشناک پہلو وہ زبردست زوال اور پستی ہے جو اسلامی اور شہری دونوں نقطہ ہائے نظر سے ہمارے اخلاق میں پیدا ہو چکی ہے۔ لہٰذا اگر پاکستان کو اپنا محبوب نصب العین حاصل کرنا اور ایک پھر سے زندگی پذیر اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بننا ہے تو اخلاق ملی کی تعمیر اور تربیت کے لئے ہر اچھے، نیک اور مخلص مسلمان

Marfat.com

کی خدمات سے مستفید ہونا ضروری ہے؛ ورنہ شاید حکومت اپنی نیک نیتی کے باوجود مسلمانوں کے اندر وہ مطمح نظر پیدا نہ کر سکے جس کے بغیر ناممکن ہے کہ ہم فی الواقعہ ایک اسلامی ملت کے خطاب کے مستحق ہو سکیں۔

یاد رکھیے! یہ صرف ہم یعنی پاکستان میں بسنے والے مسلمان ہیں (ساری دنیائے اسلام میں صرف پاکستان کے مسلمان) جنہوں نے علی الاعلان نسل اور وطن کے تعصبات اور خود غرضیوں سے کنارا کشی کرتے ہوئے یہ کہا کہ ہم اپنی ریاست کی بنا اسلام کے سوا اور کسی اساس پر نہیں رکھیں گے' لہٰذا اب تک اس نصب العین کے متعلق ہم نے کچھ بھی کوتاہی برتی ہو' ہم اس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ آج کی اسلامی دنیا میں اگر کسی عوامی تحریک نے اسلامی نظام سیاست کو اپنا مقصد ٹھہرایا تو صرف اس (تحریک) نے جس کی انتہا پاکستان کے قیام پر ہوئی۔ اندریں صورت یہ ہماری قوت اخلاق، ہمارا کردار اور ہمارے اعمال و افعال ہیں جن سے نہ صرف ہمارے بلکہ تمام بلاد اسلامیہ کے لئے اس بات کا فیصلہ ہو جائے گا کہ آنے والی نسلوں میں اسلام کا مستقبل کیا ہے۔ بالفاظ دیگر اگر پاکستان کے لوگ اس مقصد میں کامیاب ہو جائیں کہ ہماری ریاست سرتا سر اسلامی ہو، اگر ہم اس ناامید دنیا کو سچ مچ بتا سکیں کہ بنی نوع انسان کے تمام سیاسی اور اجتماعی امراض کا مداوا اسلام اور صرف اسلام کے پاس ہے تو ساری دنیا کے مسلمان مجبور ہو جائیں گے کہ جلد یا بہ دیر ہمارے نقش قدم پر چلیں اور اسلام پھر اپنی پہلی سی شان و شوکت حاصل کرلے' لیکن اگر خدانخواستہ ہم اس کوشش میں ناکام رہے تو صرف ہم یعنی مسلمانان پاکستان ہی نہیں جو اپنا یہ ایمان کھو بیٹھیں گے کہ اسلام قابل عمل ہے' بلکہ اس ناکامی سے سارے عالم اسلام کا دل جس کی نگاہیں آج ہم پر لگی ہیں' ٹوٹ جائے گا اور رفتہ رفتہ یہ خیال عام ہوتا جائے گا کہ مذہب نہ سیاست کی بنا ہے نہ معیشت کی اور یہ وہ خیال ہے جسے ہمارے دشمن بڑے زور شور سے پھیلا رہے ہیں۔

گویا اگر ہم اس عظیم الشان مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ساری دنیائے اسلام اس مقصد میں کامیاب ہوتی ہے اور اگر ہم گمراہی اختیار کرتے ہیں تو اغلب یہ ہے کہ ساری دنیائے اسلام ہمارے ساتھ گمراہ ہو جاتی ہے اور پھر صدیوں کے لئے ایک اسلامی ریاست کی تاسیس کا خیال بھی کسی کو نہیں آئے گا' لہٰذا یاد رکھیے' ہمیں ناکام نہیں ہونا ہے۔

محکمہ احیائے ملت اسلامیہ اس دعوت کو جس کا تعلق عملی اسلام سے ہے' گھر گھر پہنچانا اپنا فرض اولیں سمجھتا ہے کیونکہ اگر ہم فی الواقعہ مسلمان بن کر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ سب سے پہلے مسلمانوں کی طرح غور و فکر کرنا سیکھیں۔ چنانچہ اس محکمے کا ارادہ ہے کہ ایک خوب سوچی سمجھی ہوئی اور مبسوط اسکیم کے مطابق ان اجتماعی، اخلاقی اور ذہنی مسائل کے متعلق جو آج ملت کو درپیش ہیں' کچھ مطبوعات ترتیب دے۔ پھر ان مختلف کمیٹیوں کی روئیدادوں کے علاوہ جن کا اوپر ذکر کیا گیا تھا' ہم (الف) نامور مسلمان مفکرین کے لکھے ہوئے پمفلٹوں (ب) رسالوں اور (ج) ریڈیو تقریروں کے ایک سلسلے کی جن کا موضوع یہی احیائے ملی کا زبردست مسئلہ ہے' اشاعت بھی کریں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ درس قرآن کا ایک سلسلہ ہر روز ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا کرے۔ ہم اس مقصد کے لئے ایسے مقتدر علماء سے اشتراک عمل کی درخواست کریں گے جو ہمارے موجودہ مسائل اور موجودہ مشکلات کا خاص طور سے لحاظ رکھتے ہوئے تعلیمات قرآن کی تفسیر کریں تاکہ ملت سچ مچ قرآن مجید سے عملاً ہدایت کا سبق لے سکے۔ آگے چل کر جب ہمارے

Marfat.com

محکمے کی تنظیم مکمل ہو جائے گی تو ہم مساجد اور عام جلسوں کے ذریعے جمہور اسلام سے رابطہ پیدا کریں گے جو صرف وعظ و نصیحت تک محدود نہیں رہے گا بلکہ یوں ملت کے روحانی سرمایہ کو ہم صحیح معنوں میں اسلامی نظام سیاست ایسے عظیم الشان مقصد کی تکمیل علیٰ ہذا اس پست ہمتی اور اس اجتماعی اور اخلاقی فساد کو دور کرنے میں استعمال کریں گے جو ہماری محکومیت کے زمانے سے ہمارے دل و دماغ کو ماؤف کر رہی ہے۔

یہ مقاصد ہیں جن کے ماتحت محکمہ احیائے ملت اسلامیہ وقتاً فوقتاً حکومت کے سامنے اصلاح جماعت کی مختلف تجاویز پیش کرتا رہے گا۔ ان میں وہ تجاویز بھی ہوں گی جن پر کوئی خاص قانون وضع کیے بغیر فوراً عمل کیا جا سکتا ہے اور وہ تجاویز بھی جن کے لئے ہمیں کچھ نئے قانون وضع کرنے پڑیں گے۔ پھر دو مسئلے ہیں جن پر اس صورت میں ہمیں بالخصوص توجہ کرنا ہوگی، ایک شراب، دوسرا زنان بازاری کا۔ جب تک ان اجتماعی مفاسد کا قلع قمع نہیں ہو جاتا' ہم کس منہ سے اپنے معاشرے کو اسلامی کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں؟ لہٰذا ہماری کوشش ہوگی کہ (سب نہیں تو کم از کم مسلمانوں کے لئے) شراب نوشی قطعاً ممنوع اور عصمت فروشی کی ہر شکل کا ازالہ ہو جائے۔

محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کا یہ بھی خیال ہے کہ کچھ دنوں بعد احیائے ملی کے خطہ وار ادارے قائم کیے جائیں۔ اس کی ابتدا لاہور سے ہوگی اور رفتہ رفتہ ان کا سلسلہ سارے ملک پر پھیل جائے گا۔ ان میں وہ ممتاز شہری اور قومی کارکن بھی شامل ہوں گے جو عام مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو ایک صحیح اسلامی نظام سیاست کی تعمیر میں عملی اقدام پر آمادہ کر سکیں۔

حاصل کلام یہ کہ ہم محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کو ان افکار و خیالات اور ان مساعی کا ایک مرکز سا بنتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں جو ملت اسلامیہ کی مذہبی اور اجتماعی ترقی کے لئے کی جائیں۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک اتنے بڑے لائحہ عمل کی تعمیل جس میں جیسا جیسا ہمارا کام بڑھے گا اور بھی اضافہ ہوتا جائے گا، بہ مراحل ہی ممکن ہے۔ پھر یہ محکمہ ابھی نیا ہے اور اس لئے اس کی ابتدا ابھی حقیر ہے' لہٰذا ملت سے درخواست ہے کہ اس محکمے کے متعلق ذرا برداشت سے کام لے اور اس سے کسی معجزے کی توقع نہ رکھے۔ ہم صرف محنت اور جدوجہد ہی سے کام لے سکتے ہیں۔ یہ ملت کا فرض ہے کہ ہمارا ہاتھ بٹائے تاکہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں' چنانچہ ہمیں اس سلسلے میں سب سے اول جس اشتراک عمل کی ضرورت ہے (اور کوئی وجہ نہیں کہ حکومت سے اشتراک عمل پر اصرار نہ کرے) وہ یہ کہ لوگ خود اپنے اندر ایک نئی امید، نئے عزم اور اجتماعی دیانت کی روح پیدا کریں۔ ایک اسلامی ریاست کی تعمیر کا خواب اگر کبھی پورا ہوگا تو کچھ ایسے ہی اشتراک عمل کی بدولت۔

(در: عرفات، جلد ا عدد ا، بابت مارچ ۱۹۴۸ء۔ انگریزی مضمون بعنوان Islamic Reconstruction)

Marfat.com

محمد اسد

اصولِ دستورِ اسلامی

مسئلہ کیا ہے؟

پچھلی چند صدیوں میں اگر یہ مسئلہ زیر بحث آتا کہ اسلامی ریاست کی بنا کن اصولوں پر ہونی چاہیے تو اس کی حیثیت ایک عالمی مشغلے سے زیادہ نہ ہوتی۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ صدیوں سے اس امر کی کوئی صورت ہی نہیں تھی کہ اگر ہم چاہتے بھی تو یہاں ایک اسلامی ریاست قائم ہو سکتی' لیکن جب سے پاکستان کی آزاد خود مختار مملکت معرضِ وجود میں آئی' ہے یہ امکان بھی کہ ریاست کی تاسیس اسلامی اصولوں پر کی جائے' پیدا ہو گیا ہے۔ لہٰذا موقع ہے کہ اگر ہم چاہیں تو اس امکان کو یقین سے بدل دیں اور اگر چاہیں تو بدستور عالمی بحث و مباحثہ میں (اور وہ بھی خدا معلوم کب تک) الجھائے رکھیں۔ بہرحال دنیا کی کوئی طاقت نہیں جو اب ہمیں ان دونوں میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کرنے سے روکے۔ ہم جو کچھ کریں گے اپنی پسند اور مرضی سے کریں گے اور اس کی ذمہ داری بھی ہم اور صرف ہمیں پر ہو گی۔

بایں ہمہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہمارا سواد اعظم اگرچہ دل سے اس بات کا آرزومند ہے کہ پاکستان میں ایک اسلامی ریاست قائم ہو۔ کچھ ایسی قوتیں بھی ہیں جو اندر ہی اندر بڑی تیزی سے کام کر رہی اور چاہتی ہیں کہ مسلمان اپنی منزل مقصود سے ہٹ جائیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ ہم بھی غیر اسلامی دنیا کی اندھا دھند تقلید میں ایک ایسی ریاست کی بنا رکھیں جو غیر مسلمانوں میں تقریباً ہر کہیں مقبول اور اصطلاحاً ''غیر مذہبی'' (Secular) سے تعبیر کی جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ آج کل دوسرے ممالک کی طرح بعض اسلامی ممالک میں بھی اس خیال کا غلبہ ہے کہ مذہب کا یہ تصور کہ وہ بجائے خود ایک نظام ہے' پرانا ہو چکا ہے اور از روئے علم و حکمت بھی کچھ ایسا (وقیع) نہیں' کیونکہ یوں ان ''ترقی پسندانہ'' کوششوں کی نفی ہو جاتی ہے جو ہر ایسے اخلاقی ضابطے کے خلاف ہیں جسے انسان نے خود اپنے لئے وضع نہیں کیا اور جسے گویا اس زمانے کی ''روشن خیال'' دنیا اپنے قومی اور اجتماعی منصوبوں میں کوئی جگہ نہیں دے سکتی' لہٰذا قدرتی بات ہے کہ جب کبھی ریاست کے لئے کوئی دینی اساس تجویز کی جائے تو یہ لوگ اسے رجعت پسندی سے تعبیر کریں یا محض ایک ناقابل عمل خیال پرستی (Impractical idealism) ٹھہرائیں۔

تعلیم یافتہ مسلمانوں میں سے اکثر کچھ یہی انداز فکر اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ زندگی کے دوسرے شعبوں

Marfat.com

کی طرح یہاں بھی ان کا دل و دماغ مغربی اثرات سے مغلوب ہو چکا ہے لیکن مغرب کو مذہب (اپنے خاص مذہب) سے جو بے اطمینانی پیدا ہوئی' اس کے وجوہ بھی مغرب ہی سے مختص اور اس اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی خلفشار میں صاف صاف جھلک رہے ہیں جس میں آج کل دنیا کا زیادہ حصہ مبتلا ہے۔ اہل مغرب چونکہ اپنے اعمال و افعال کی بنا کسی عالمگیر اخلاقی قانون پر جیسا کہ بالآخر مذہب کا تقاضا ہے' نہیں رکھتے لہٰذا ان کے یہاں ہر امر کا فیصلہ ''مصلحت'' (Expediency) کی بنا پر کیا جاتا ہے' لیکن مصلحت کا تصور تو ہر حلقے، ہر جماعت اور ہر قوم کے نزدیک مختلف ہوگا' اس لئے ضرورت ہے کہ ان کے مفاد کا تصادم ایک پریشان کن صورت حالات پیدا کردے' کیونکہ ہوسکتا ہے جو بات (عملاً) آپ کی نظر میں پسندیدہ اور عین مصلحت ہے وہ میرے لئے نہ ہو' بلکہ عام طور سے تو یہی دیکھا جاتا ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے' لہٰذا جب تک ہم اپنی ذات سے باہر کسی اخلاقی اصول کو اپنا رہنما تسلیم نہیں کر لیتے' ہمارا مفاد بھی ایک دوسرے سے ٹکراتا رہے گا۔ پھر جوں جوں ہمارے اختلافات کا دائرہ وسیع ہوگا' اسی اعتبار سے معروف و منکر کے متعلق بھی ہمارے مصالح اور ہمارے تصورات کی کشمکش بڑھتی چلی جائے گی۔

یہ غالباً حقیقی وجہ ہے اس انتشار اور بدنظمی کی جس کا سلسلہ آج لحظہ بہ لحظہ دنیا میں پھیلتا جارہا ہے۔ بہرحال یہ تو ظاہر ہے کہ مغرب کے رائج الوقت تصورات (Ideologies) میں سے خواہ وہ معاشی حریت (Economic Liberalism) ہو خواہ اشتمالیت (Communism) خواہ فاشیت (Fascism) یا اشتراکی جمہوریت (Social Democracy) وغیرہ، کسی ایک میں یہ صلاحیت نہیں کہ اس بدنظمی کو نظم اور انتشار کو ترتیب سے بدل سکے۔ یہ اس لئے کہ ان میں سے کوئی نظام تصورات بھی معاشی اور اجتماعی مسائل کو کسی مطلق اخلاقی اصول کے ماتحت دیکھنے کے لئے تیار نہیں اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان پر کوئی ایک قوم بھی کلیتاً متفق نہیں۔ بعینہٖ یہی کیفیت ہے مغرب کے ان ممالک کی جہاں بظاہر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہمارے تصورات ''قبول عام'' حاصل کر چکے ہیں۔ مثلاً روس کا دعویٰ اشتمالی نظام کے متعلق جس کی مقبولیت دراصل یک بالائی طاقت کی ممنون احسان ہے جہاں آمرانہ نظم و نسق، خفیہ پولیس اور ترہیب عامہ سب ہی قسم کے حیلوں سے کام لیا جارہا ہے اور جس کے معنی یہ ہیں کہ اشتمالی نظام پر بھی فی الحقیقت ہر شخص کا اتفاق نہیں۔ ممکن ہے اشتمالیت کے حامی یہ کہیں کہ اس وقت روس کے اندرونی حالات اور بیرونی دنیا سے اس کے روابط کا یہی تقاضا ہے کہ اس قسم کی آمریت کو مصلحت کے عین مطابق ٹھہرایا جائے لیکن یہی تو اصل بات ہے کہ اگر مصلحت ہی کو دلیل ٹھہرانا ہے تو پھر کون سا فعل ہے جس کی تائید میں یہ عذر پیش نہیں کیا جاسکتا؟ یوں تو کمیونسٹ (اشتمالی) اور سرمایہ دار سب ہی اپنے اپنے طرز عمل کی حمایت کرنے لگیں گے' بلکہ آپ بد سے بدتر مظالم کا ارتکاب کرتے ہوئے بھی بزعم خود یہ سمجھیں گے کہ آپ نے جو کچھ کیا ایک مصلح کی حیثیت سے کیا۔ چنانچہ تہذیب مغرب نے (خواہ وہ سرمایہ دار ہو یا اشتمالی) بھی اس وقت نوع انسانی پر جو ظلم و ستم روا رکھا ہے' اس کی تہ میں یہی عذر کام کر رہا ہے' لہٰذا جب تک حکومتیں اس روش پر قائم ہیں اور عوام اپنی سادگی سے اسے حق بجانب قرار دیتے ہیں' ناممکن ہے کہ اس ریاست کے تصور میں جو بمحاورہ عامہ ''غیر مذہبی'' سے تعبیر کی جاتی ہے' کوئی اخلاقی معنی پیدا ہوسکیں۔ ایک ''غیر مذہبی''

Marfat.com

ریاست میں چونکہ معروف ومنکر کا کوئی ایسا معیار نہیں ہوگا جسے مستقل ٹھہرایا جائے لہٰذا وہاں جو کچھ کیا جائے گا ''قومی مفاد'' کی خاطر کیا جائے گا' لیکن اگر اخلاقی قدروں (Values) کا کوئی خارجی (Objective) پیمانہ موجود نہیں تو قومی مفاد کی تعریف بھی مختلف حلقوں میں مختلف ہوگی' بلکہ لازماً ہوا کرتی ہے۔ایک سرمایہ دار کا دیانت داری سے یہ خیال ہوسکتا ہے کہ اگر معاشی حریت کی جگہ کہیں اشتراکیت (Socialism) نے لے لی تو تہذیب وتمدن کا خاتمہ ہو جائے گا۔ برعکس اس کے اشتراکی کہے گا کہ تہذیب وتمدن کو برقرار رکھنا منظور ہے تو سرمایہ داری کو فوراً اشتراکیت سے بدل دینا چاہیے۔اندریں صورت دونوں کے اخلاقی نظریے (یہ نظریات کہ انسان کیا کرے اور کیا نہ کرے) ان کے معاشی نظریوں پر مبنی ہوں گے۔علیٰ ہذا روابط کا وہ انتشار اور بدنظمی بھی جو قدرتی نتیجہ ہے اس اختلاف کا۔

ہم نے اوپر کی بات محض ایک مثال کے طور پر پیش کی' ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ''غیر مذہبی'' معاشروں کے درمیان اور ان میں سے ہر ایک کے اندر طرح طرح کے اخلاقی اختلافات کی موجودگی ناگزیر ہے۔یوں بھی اگر معروف ومنکر کا دارومدار کسی خاص فرد یا مجموعہ افراد کے ذاتی مفاد یا بالفاظ دیگر لوگوں کی ذاتی ترجیحات پر ہے تو کیسے ممکن ہے کہ ان اختلافات کا خاتمہ ہو سکے۔لہٰذا اس صورت حالات کو فطری (اور اس لئے پسندیدہ) قرار دینا گویا یہ مان لینا ہے کہ معروف ومنکر کی نوعیت اضافی ہے۔ان کے معنی ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے بلکہ خاص خاص حالات، خاص خاص وقتوں اور ہر فرد کے مفادات کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔منطقی اعتبار سے اس استدلال کی انتہا بالآخر اس نتیجے پر ہوگی کہ اخلاقی فرائض کا فی نفسہ کوئی وجود نہیں' کیونکہ جب ایک دفعہ ''اخلاقی فرائض'' کی مطلق پابندی سے انکار کر دیا گیا تو ظاہر ہے کہ ان کی حیثیت بے معنی ہو جائے گی۔بات یہ ہے کہ جہاں معروف ومنکر کی تعیین جماعتی رسم ورواج اور ماحول پر چھوڑ دی گئی' ناممکن ہے کہ امور انسانی کی رہنمائی کے لئے کوئی ایسا اصول مل سکے جو اعتماد اور بھروسے کے قابل ہو۔اندریں صورت ہم ان امور کی تدبیر میں پہلے سے بڑھ کر اخلاق کو پس پشت ڈالتے اور رفتہ رفتہ مصلحت کے اشارے پر چلنے لگتے ہیں۔اس سے پھر ہر حلقے اور ہر جماعت کے اندرونی اور بیرونی اختلافات بڑھتے اور اس مسرت اور شادمانی کا بتدریج خاتمہ ہو جاتا ہے جو بنی نوع انسان کے حصے میں آئی ہے۔

لیکن کوئی قوم یا جماعت مسرت اور شادمانی حاصل نہیں کر سکتی جب تک وہ اندرونی اعتبار سے متحد نہ ہو اور کسی قوم یا جماعت میں یہ اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا' جب تک وہ معروف ومنکر پر اتفاق نہ کر لے۔پھر یہ اتفاق اس وقت تک ناممکن ہے جب تک وہ قوم یا جماعت اس امر کو تسلیم نہیں کر لیتی کہ اخلاقی فرائض کا سرچشمہ دراصل ایک مستقل اور مطلق اخلاقی قانون ہے۔اب ظاہر ہے کہ اس قسم کا کوئی قانون مل سکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اتحاد واتفاق بھی جو کسی قوم یا ملت کے اندر اخلاقی فرائض کے بارے میں ہونا چاہیے تو صرف مذہب سے۔لہٰذا یہ کوئی بہت زیادہ سوچنے اور سمجھنے کی بات نہیں کہ ایک مذہبی ریاست کے اندر کسی ''غیر مذہبی'' سیاسی نظام کی نسبت خوشی اور مسرت کا کہیں زیادہ دور دورہ ہوگا بشرطیکہ وہ مذہبی اصول جو اس ریاست کی بنا اور حاکمیت (Sovereignty) کا سرچشمہ ہے۔ایسا نہیں کہ انسان کی طبعی احتیاجات یا اجتماعی اور ذہنی نشوونما کا لحاظ نہ رکھے۔ان میں سے پہلی ضرورت تو اس طرح پوری ہو جائے گی کہ یہ

Marfat.com

دینی اصول فطرت انسانی کے جسمانی اور حیاتی (Biological) پہلوؤں کا اثبات کرے (جیسا کہ اسلام بلاشبہ کرتا ہے)۔ دوسری یوں کہ ہمارے سیاسی قانون کے دینی تصور میں جمود کا رنگ نہ ہو اور یہی ہمارا دعویٰ ہے اس قانون سیاست کے متعلق جسے قرآن وسنت نے ہمارے لئے وضع کیا۔

دستوری تشکیلات

سطحی نظر سے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا یہ دعویٰ صحیح نہیں کیونکہ اسلامی ریاست کی شکلوں اور وظائف کے متعلق بالعموم جن خیالات سے سابقہ پڑتا ہے' ان میں کچھ ویسا ہی جمود پایا جاتا ہے جسے ہم ارتقائے انسانی کے منافی ٹھہراتے ہیں۔ راقم الحروف کو بالخصوص اس خیال کی طرف اشارہ کرنا ہے جو مسلمانوں میں عام ہے اور جس کا مطلب یہ ہے کہ "اسلامی" ریاست کی صرف ایک ہی شکل ممکن ہے اور یہ وہ جو خلفائے راشدین نے قائم کی۔ لہٰذا اس سے ذرا سا انحراف کرنا گویا ریاست کی اسلامی حیثیت کی نفی کرنا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ خیال سرتا سر غلط ہے' اس لئے کہ اگر ہم ان احکام اور قوانین کا بنظر غائر مطالعہ کریں جن کا تعلق قرآن وسنت سے ہے تو معلوم ہو جائے گا کہ اسلامی ریاست کے لئے کوئی "مخصوص" شکل وضع نہیں کی گئی۔ شریعت نے کہیں بھی اصرار نہیں کیا کہ ریاست پر کسی خاص ہیئت کی پابندی لازم ہے' نہ اس کا کوئی مبسوط دستوری نظریہ پیش کیا۔ برعکس اس کے وہ حکومت کے طور طریق اور انتظامی معاملات کو بڑی حد تک خود ہماری مرضی پر چھوڑ دیتی ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ قرآن وسنت سے جو قانون سیاست مترتب ہوتا ہے' وہ محض خیال ہی خیال ہے' ہرگز نہیں۔ یہ قانون ایک حقیقت ہے اور بہمہ وجوہ مکمل' لہٰذا ایک ایسے سیاسی نظام کے خاکے کا حامل جس پر ہر وقت اور ہر حالت میں عمل کیا جا سکتا ہے' لیکن جس پر چونکہ ہر وقت اور حالت میں عمل کیا جا سکتا ہے' اس لئے تفصیل سے نہیں بلکہ ایک خاکے کی صورت میں پیش کیا گیا کیونکہ ہماری سیاسی، اجتماعی اور معاشی ضروریات زمانے پر موقوف اور بدیں وجہ ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ پھر شریعت کے احکام من جانب اللہ ہیں' اس لئے ایک تو اس نے تمام ایسے امکانات اور ضروریات کا لحاظ رکھا جن کا نشوونما بتدریج ہوتا ہے' دوسرے چند اساسی، کھلے کھلے اور واضح قوانین پیش کر دیئے جن کی پابندی ہر اسلامی ریاست پر فرض ہے۔ ان قوانین سے باہر شریعت نے اجازت دی ہے کہ ہم اپنی دستور اور قانون ساز (Legislative) سرگرمیاں جاری رکھیں اور جیسا بھی زمانہ ہو اس کے مطابق اجتہاد سے کام لیں۔

سطور بالا سے یہ نتیجہ مترتب ہوا کہ اسلامی ریاست کی کوئی ایک شکل مقرر نہیں۔ یہ ہمارا کام ہے کہ ہر عہد میں حالات کے مطابق اس کو بہتر سے بہتر شکل میں متشکل کریں۔

ہم نے ابھی شریعت کے جن سیاسی قوانین کی طرف اشارہ کیا (اور جن سے ہم ابھی بحث کریں گے) ان کا تمام وکمال اظہار خلافت راشدہ کی دستوری شکلوں میں ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین نے جو ریاست قائم کی' ہر پہلو سے اسلامی تھی لیکن یہاں ایک بات اور یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ اس زمانے میں دولت اسلامیہ جس غیر

Marfat.com

مکتوب دستور پر چل رہی تھی' اس میں تدبیر ریاست کے شرعی قوانین کے علاوہ بعض ایسے قوانین بھی مروج تھے جن کا شریعت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں یعنی وہ قانونی ضوابط جو قرآن وسنت سے تو ماخوذ نہیں تھے' البتہ انتظامی اہلیت یا رفاہ عامہ کے لئے عام فہم وفراست کی بنا پر وضع ہوئے۔ پھر جہاں تک یہ ضوابط حکومت وقت یعنی خلیفہ کی منظوری سے نافذ کیے گئے اور لفظاً یا معناً شریعت کے خلاف نہیں تھے' وہ از روئے قانون اس زمانے کے لئے تو سرتا سر صحیح اور قابل تسلیم تھے' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر زمانہ کے لئے صحیح اور نا قابل تسلیم تصور کیے جائیں۔

یہ بات سمجھ میں آتی (بلکہ ہمیں کہنا چاہیے تھا ناگزیر) ہے کہ ذہنی اور معاشی ماحول کی تبدیلی سے اس امر کے متعلق بھی کہ انتظامی کارکردگی عدل اجتماعیہ اور رفاہ عامہ کے حصول کا بہترین ذریعہ کیا ہے' ہمارے خیالات بدل جائیں۔ لہٰذا دستوری ضوابط کا بہت بڑا حصہ ہر زمانے کے اعتبار سے بدلتا رہے گا۔ اس تبدیلی سے وہ دستوری عناصر تو بے شک متاثر نہیں ہوں گے جن کا تعلق شریعت سے ہے اور جن میں اس وجہ سے کوئی ردوبدل نہیں ہوسکتا۔ نہ اس بنیادی شرط میں کہ ہم اپنے عقل وفہم سے جو غیر شرعی ضوابط نافذ کریں' وہ شریعت کے منافی نہیں ہوں گے، نہ لفظاً نہ معناً لیکن ان دونوں اصولوں کو مانتے ہوئے بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس اسلامی دستور کی تشکیل خلفائے راشدین سے تیرہ سو سال بعد میں ہوگی' وہ اس زمانے کے دستور سے بجا طور پر کئی ایک باتوں میں مختلف ہوگا' محض اس لئے کہ ہمارا زمانہ اس زمانے کی نسبت بہت کچھ بدل چکا ہے۔

پھر اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کہ ہر زمانے کی دستوری ضروریات مختلف ہوتی ہیں' ہمارے لئے تیرہ سو برس کی زمانی مسافت کا عذر پیش کرنا بھی ضروری نہ تھا۔ خلفائے راشدین کو بھی تو بیس تیس برس کے اندر اپنے انتظامی طور طریق یا جیسا کہ آج کل کی زبان میں کہا جائے گا' دستور ریاست میں کئی ایک پہلوؤں سے تبدیلی کرنا پڑی۔ مثال کے طور پر سربراہ ریاست (Head of the State) کے مسئلہ انتخاب ہی کو لیجئے۔

اصحاب رسول صلعم کا اس بارے میں تو کوئی اختلاف نہیں تھا کہ حکومت ایک انتخابی امر ہے۔ پھر جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوجائے گا شریعت نے یہ معاملہ بالکل صاف اور واضح طور پر بیان کردیا ہے' لیکن اس امر کی وضاحت کے باوجود کہ سربراہ ریاست کا عہدہ انتخابی ہے' شریعت نے انتخابات کا کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں کیا۔ لہٰذا اصحاب رسول صلعم کی بجا طور پر یہ رائے تھی کہ طریق انتخاب کا معاملہ حدود شریعت سے باہر ہے اور اس لئے ہر زمانے کے حالات اور ملت کے بہترین مفاد کے ساتھ ساتھ بدلتا رہے گا۔ چنانچہ خلفائے راشدین میں سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب میں صرف ان صحابہ کبار (مہاجرین وانصار) نے حصہ لیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر مدینہ منورہ میں موجود تھے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بستر مرگ پر حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین منتخب کیا اور اس انتخاب کی تصدیق عام (Ratification) پوری ملت نے کردی (گویا اس معاملے میں تصدیق عام کو انتخاب کا مرادف تصور کیا گیا)۔ پھر جب حضرت عمرؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے ممتاز ترین صحابہ میں سے چھ کی ایک مجلس مقرر کی اور ان کے ذمے یہ فریضہ کیا گیا کہ اپنے اندر سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرلیں۔ اس مجلس کی نظر انتخاب حضرت عثمانؓ پر پڑی اور

Marfat.com

ملت نے بھی حضرت عثمانؓ کو حضرت عمرؓ کے بعد خلیفہ برحق تسلیم کر لیا۔ حضرت عثمانؓ کے جانشین حضرت علیؓ ہوئے جن کے امیر المومنین ہونے کا اعلان مسجد نبوی میں صحابہ کی ایک جماعت نے کیا اور جس کی پھر ساری ملت نے تصدیق و توثیق کر دی۔

لہٰذا ان چاروں خلافتوں میں جن کے لئے ہم ''راشدہ'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں' ریاست کا دستور ایک خاص اور اہم پہلو سے ہمیشہ تبدیل ہوتا رہا' کیونکہ سربراہ ریاست کا طریق انتخاب ایک ایسا دستوری معاملہ ہے جس کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا' لیکن اصحاب رسول صلعم نے اس معاملے میں (کیا باعتبار رائے دہندگان (Electorate) اور کیا باعتبار طریق رائے دہندگی) مختلف موقعوں پر مختلف رویہ اختیار کیا۔ گویا صحابہ کے نزدیک یہ ممکن تھا کہ دستور میں وقتاً فوقتاً تبدیلیوں کے باوجود ریاست کی ''اسلامی'' حیثیت میں کوئی فرق نہ آتا اور ظاہر ہے کہ ان کی یہ رائے بالکل درست تھی۔ اسلام کا مطالبہ صرف اتنا ہے۔ نہ زیادہ ہے نہ کم کہ شریعت سے اس سلسلے میں جو معدودے چند اساسی اور صاف وصریح قوانین مترتب ہوتے ہیں' ان کی ترجمانی دستور میں ہوتی رہے۔ دستور کی دوسری شقیں جیسا کہ زمانے کی ضروریات ہوں' ملت کے اجتہاد پر چھوڑ دی گئی ہیں۔

ان خیالات کے پیش نظر ہم بآسانی اس امر پر غور کر سکتے ہیں کہ اسلامی ریاست کی شرعی بنیاد کیا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہ وہ کیا قوانین ہیں جن کو ایک اسلامی ریاست کا دستور کسی حالت میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔

بنیادی اصول

اسلامی ریاست کی غایت ہے ایک سیاسی ہیئت کا قیام، ملت کے اتحاد و اشتراک کے لئے لیکن یہ اشتراک اسلامی رنگ میں اور اسلام کی خاطر ہوگا۔ ارشاد ربانی ہے:

''و اعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعاً و لا تفرقوا- واذکروا نعمت اللّٰہ علیکم اذ کنتم اعداء فألف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخواناً- و کنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم منها- کذالک یبین اللّٰہ لکم آیاته لعلکم تھتدون- و لتکن منکم امة یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر و اولئک ھم المفلحون (۳:۱۰۳-۱۰۴)

''اللہ کے عہد پر مضبوطی سے جمے رہو اور تفرقہ مت ڈالو اور یاد رکھو اللہ کی اس نعمت کو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دل جوڑے اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھوں کے کنارے کھڑے تھے مگر اللہ نے تمہیں بچا لیا۔ یوں اللہ تمہارے لئے اپنی نشانیاں کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ تم ہدایت پاؤ اور ایک ایسی امت بنو جو نیکی کی دعوت دے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔''

لہٰذا ثابت ہوا کہ اسلام کے نزدیک ریاست بجائے خود کوئی مقصد نہیں بلکہ ایک مقصد کا وسیلہ۔ یہ مقصد کیا ہے؟ ایک ایسی امت کی تشکیل جو عدل و انصاف کی علم بردار ہو۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ گویا دوسرے لفظوں

Marfat.com

میں اسلامی ریاست کا مقصد ہے وہ اجتماعی حالات پیدا کرنا جن میں زیادہ سے زیادہ انسان اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ قانون فطرت یعنی اسلام کے مطابق روحانی اور مادی زندگی بسر کرسکیں کیونکہ اس مقصد کا حصول زیادہ تر اجتماعی حالات ہی پر موقوف ہے۔ آپ اپنی نیکی کے باوجود جماعت کے اندر رہ کر الگ تھلگ صحیح اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتے' نہ اپنی انفرادی زندگی کو اس شکل میں ڈھال سکتے ہیں جس کا اسلام اعمال و افعال میں ہم سے متقاضی ہے۔ جب تک وہ معاشرہ جس میں آپ رہتے سہتے ہیں' اس بات پر اتفاق نہ کرلے کہ ہم اپنے معاملات میں اسلامی طور وطریق اختیار کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے اعمال وافعال کی اخلاقی قدروقیمت، علیٰ ہٰذا روحانی مدارج میں بتدریج ارتقا (جو گویا صحیح نصب العین ہے مذہب کا) کا کسی ایسی چیز پر موقوف ہے جو آپ کی ذات سے باہر اور اس امر سے متعلق ہے کہ آپ جن لوگوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں' وہ آپ کے مددگار ہیں۔ آپ کی حوصلہ افزائی کرتے اور حفاظت کا دم بھرتے ہیں یا نہیں۔ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو دوسرے بھی آپ سے ویسی توقع رکھیں گے اور ویسے ہی اشتراک عمل کے خواہش مند ہوں گے' چنانچہ ہوتا بھی یہی ہے کہ ہر جماعت کے اندر افراد اپنی ذاتی اور مشترکہ دونوں حیثیتوں سے ایک دوسرے کے اعمال وافعال کے ذمہ دار بن جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر مہذب معاشرے میں اس ذمہ داری کا ایک مخصوص ذریعہ قائم ہو جاتا ہے یعنی ریاست جو ان تمام امور کو ایک نسق پر لاتی اور امر و نہی کا حق رکھتی ہے۔ اسلامی معاشرے کے نقطہ نظر سے ہم ریاست کے اس وظیفے کو اور زیادہ سہل الفاظ میں یوں بیان کریں گے کہ ریاست کا وظیفہ ہے ایک تو انسانی روابط کو اس طرح منضبط کرنا کہ افراد کے راستے میں کم سے کم رکاوٹیں حائل ہوں اور ثانیاً انہیں زیادہ سے زیادہ اس بات کا موقع دینا کہ اپنی ذات کی تربیت اسلامی اصولوں پر کریں۔ یہ اور صرف یہ شرعی تصور ہے ریاست کا وہ تصور جسے پیغمبر اسلام صلعم نے آغاز دعوت ہی میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا تھا۔

اسلام کے قانون کو ملک کا قانون ٹھہرانا، ایسے حالات پیدا کرنا کہ لوگ ایک دوسرے سے اسلامی اصول عدل و انصاف کے مطابق تعاون کریں' ان کو موقع دینا کہ اسلامی تعلیمات پر صرف عقائد ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے اجتماعی اور معاشی معاملات میں بھی عمل کریں' اندرونی خلفشار اور بیرونی خطرات سے محفوظ رکھنا اور اسلام کی دعوت کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانا یہ اصل مقصد ہے اس ریاست کا جس کی تشکیل داعی رسالت صلعم نے کی اور جس کے لئے اس کا قیام لازم آتا ہے۔ اگر کوئی ریاست سچ مچ ان باتوں پر عمل کر رہی ہے تو اسے فی الحقیقت 'خلیفۃ اللہ فی الارض' سے تعبیر کرنا جائز ہوگا۔ ساری دنیا کے لئے نہیں تو کم از کم دنیا کے اس حصے میں جہاں اس کا قانون چل رہا ہے۔

پھر چونکہ اس ریاست کی قانونی حیثیت کا دارومدار اشتراک و تعاون کے ایک مخصوص اور متفقہ نظام پر ہے' اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ملت ہی کا حکم کارفرما ہے۔ یعنی اس کی حاکمیت (Sovereignty) ملت کو حاصل ہے لیکن ایک ایسی جماعت میں جسے اپنے مسلمان ہونے کا پورا پورا شعور ہے۔ اس مخصوص نظام پر اتفاق رائے کے لئے جو اسلام کو من جانب اللہ سمجھ کر واجب الاطاعت ٹھہراتا ہے' یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ ملت کو حاکمیت کا یہ حق بہ حیثیت ملت از خود حاصل ہے۔ اس کا اختیار و اقتدار دراصل ایک نائب کا ہے جو خدا کی طرف سے اس اختیار و اقتدار کا امین

Marfat.com

ہے۔لہٰذا اسلامی ریاست میں حاکمیت کا اصل سرچشمہ خدا ہی کی ذات ہے اور اس لئے ہمارے دستور کی پہلی دفعہ یہ ہونی چاہیے۔

''ریاست کا اختیار واقتدار ایک امانت ہے خدا کی طرف سے تا کہ لوگ اسلامی شریعت کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔''

اس دفعہ سے قدرتاً یہ نتیجہ مترتب ہوتا ہے کہ ان تمام علاقوں میں جو کسی اسلامی ریاست کے زیرنگیں ہوں' قانون شریعت کا نفاذ ریاست کا فرض اولیں ہوگا۔قرآن مجید میں صاف صاف مذکور ہے:''**ومن لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولئک ھم الفاسقون**''(۵:۴۷)

''جو لوگ خدا کے قانون کو حکم نہیں مانتے وہ فاسق ہیں' لہٰذا ہم کسی دستور کو اسلامی نہیں ٹھہرا سکتے جب تک اس میں ذیل کی شق موجود نہ ہو۔

''وہ احکام شریعت جن کا تعلق امور جماعت سے ہے' قانون عامہ (Public Law) کی ناقابل تغیر اساس ہیں۔''

یہاں اتنا اور عرض کر دیا جائے کہ ریاست کے اختیارات کو صرف ''مفاد عامہ'' تک محدود رکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ شریعت کا دائرہ بھی مفاد عامہ تک محدود ہے' کیونکہ شریعت ساری زندگی پر حاوی ہے' کیا انفرادی اور کیا اجتماعی۔ ہمارا کہنا صرف یہ تھا کہ ایک اجتمائی نظام کی حیثیت سے ریاست کا تعلق چونکہ حیات اجتماعیہ سے ہے لہٰذا وہ شریعت سے صرف ایک ایسے ضابطے کا مطالبہ کرتی ہے جو امور جماعت تک محدود ہو' لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ایک اسلامی ریاست کے لئے اس ضابطے کی پابندی ہر حال میں ضروری اور لازم ٹھہرے گی۔

شریعت کے حدود کیا ہیں اور اس کا حلقہ کار کہاں تک وسیع ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر علمائے اسلام کو پورا پورا اتفاق نہیں۔لہٰذا بہتر ہوگا کہ اس سلسلے میں چند ضروری باتیں عرض کر دی جائیں۔

شریعت اسلامی کا مسئلہ

آج کل جس چیز کو شریعت سے تعبیر کیا جاتا ہے' اس کا بہت کم حصہ ان احکام پر مشتمل ہے جو اسلام کے دو مآخذ یعنی قرآن وسنت میں صاف صاف اور اوامر و نواہی کی شکل میں بیان ہوئے۔فقہ اسلامی کی رو سے جن قوانین کو شرعی کہا جاتا ہے' وہ زیادہ تر نتیجہ ہیں صدیوں کے اجتہاد یا یوں کہیے کہ ان استنباطات کا جو ائمہ فقہ نے قرآن وسنت کی بنا پر کئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ائمہ فقہا قرآن وسنت میں گہری نظر رکھتے اور بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے لیکن اس کے باوجود تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کے استنباط داخلی (Subjective) یعنی اسلام کے مآخذ قانون کے ذاتی مطالعہ اور تعبیر پر مبنی تھے۔انہوں نے اس معاملے میں طرح طرح کے ذہنی منہاجات سے کام لیا' لہٰذا امتداد زمانہ کے ساتھ اسلامی قانون نے بھی ایک ایسی پیچیدہ شکل اختیار کر لی جس کا ایک عام مسلمان کے لئے خواہ وہ کیسا ہی ذہین ہو' سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے' الا یہ کہ اس نے بہت کافی مدت فقہ کے خاص مطالعہ میں صرف کی ہو۔مزید برآں یہ ناممکن تھا کہ ائمہ فقہا کا

Marfat.com

اجتہاد اپنے زمانے کے اجتماعی اور ذہنی ماحول سے متاثر نہ ہوتا۔ پھر یہ ماحول چونکہ کئی ایک باتوں میں ہمارے ماحول سے مختلف تھا لہٰذا ضرور ہے کہ فقہ اسلامی کے متعلق جو خیالات آج سے مثلاً ایک ہزار برس پہلے قائم کیے گئے وہ موجودہ اجتماعی مشاہدات سے کئی ایک پہلوؤں میں متصادم ہوں۔ ہماری رائے میں یہ اصل وجہ ہے جس کی بنا پر آج کل کے ''تجدد پسند'' مسلمان سیاسیات اور معاشیات کے عملی مسائل میں اسلامی اصولوں کے اطلاق سے گریز کرتے ہیں۔

لہٰذا اگر اسلام کو ایک عملی ضابطے کی حیثیت دینا ہے تو اسے ان سب پابندیوں سے آزاد کرنا پڑے گا جو صدیوں کے وقتی یعنی حالات زمانہ کی پابند فقہ نے اس پر عائد کر رکھی ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ شریعت میں پھر وہی ایجاز، وہی صفائی، وضاحت اور صراحت پیدا کریں جو نبی صلعم کے زمانے میں اسے حاصل تھی۔ بغیر اس کے شریعت کی ابدی قدروں پر (وہ قدریں جو بحیثیت قانون الٰہی اس سے مترتب ہوتی ہیں) زور دینا اور ساتھ ہی ساتھ اس کا سلسلہ انسانی اجتہاد سے جوڑنا ایک بے جا سی بات ہے' گو تیسری صدی ہجری کے بعد کئی ایک علماء اس غلطی کے مرتکب ہوتے رہے۔

شریعت چونکہ اللہ کا بھیجا ہوا قانون ہے اس لئے ناممکن ہے کہ اسے قیاس واستدلال اور رائے کے ماتحت لایا جا سکے۔ برعکس اس کے وہ تمام وکمال ان واضح اور قطعی احکام کی شکل میں (جن میں کسی بات کو صاف صاف کرنے یا نہ کرنے کے لئے کہا گیا یا کسی امر کی بالوضاحت تصریح کر دی گئی) جیسا کہ قرآن وسنت میں مذکور اور اصطلاحاً نص سے تعبیر کیے جاتے ہیں' ہمیشہ باقی رہے گی۔ پھر احکام نص میں بحیثیت احکام نص اختلاف رائے کی گنجائش ہی نہیں یعنی ان میں تعبیر وتاویل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ سراسر واضح ہیں اور اپنے معنوں میں بہمہ وجوہ مکمل یاد رکھنا چاہیے ''قرآن وسنت میں نص سے مراد ہے وہ احکام جن کا مطلب ظواہر الفاظ سے عیاں ہو'' (لسان العرب، ج،۸،ص ۳۶۷) مستند عربی قوامیس میں بھی نص کی تعریف یونہی کی گئی ہے کہ ''اس کے معنی ہیں وہ بات جسے اللہ اور اس کے رسولؐ نے صاف صاف بیان کر دیا ہو' وہ کلمہ، عبارت یا جملہ جس کے ایک ہی معنی ہو سکیں، دوسرے معنوں کا محتمل نہ ہو، وہ آئین یا حکم جس کی تبیین قرآن وسنت نے کھلے کھلے اور واضح الفاظ میں کر دی۔'' ذرا غور فرمایئے گا' علمائے لسانیات نے کس طرح بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ نص عبارت ہے ان کلمات سے جو بالکل ظاہر اور ایک سے زیادہ معنوں کے حامل نہیں یعنی قرآن وسنت کے وہ احکام جو سرتاسر غیر مبہم اور اس لئے تاویل واختلاف سے آزاد ہیں۔

پھر قرآن وسنت نے ہر نص کی تشکیل اس خوبی سے کر دی ہے کہ ہم اس کا اطلاق اپنے اجتماعی نشوونما کے ہر مرحلے پر کر سکتے ہیں۔ برعکس اس کے فقہا کے داخلی (Subjective) استنباطات (Deductions) سے ایک مخصوص زمانے اور مخصوص ذہنی ماحول کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی صحت پر ہمیشہ کے لئے اصرار نہیں کر سکتے بلکہ ہمیں یہ مضحکہ خیز تصور اپنے ذہن سے نکال دینا چاہیے کہ علمائے متقدمین کا وہ غور وفکر جو انہوں نے شریعت کے بارے میں کیا اور خود شریعت ایک ہی چیز ہیں۔

مزید برآں ظاہر ہے کہ اسلام کی حقیقی اور ناقابل تبدیل شریعت مشتمل ہے قرآن وسنت کے غیر مختلف، بجائے

Marfat.com

خود واضح، صاف وصریح اور کھلے کھلے نصوص (یہ کرو، وہ نہ کرو، یہ ٹھیک ہے، وہ غلط) پر۔ اس قسم کے احکام کی تعداد قرآن وسنت میں مقابلتاً بہت کم ہے لہٰذا حقیقی شریعت کو سمجھنا آسان ہے اور وہ اس اجتہادی فقہ سے حجم میں بھی کم ہے جس کا نشوونما اسلامی افکار کے متعدد مذاہب کی شکل میں ہوا۔ پھر اس کا یہی اختصار اس امر کا سبب کہ شریعت نے زندگی کی ہر اتفاقی ضرورت کے لئے کوئی تفصیلی ضابطہ پیش نہیں کیا، نہ اس کا مقصد تھا کہ پیش کرے۔ بہ الفاظ دیگر صاحب شریعت کو صاف صاف منظور تھا کہ شریعت کے علاوہ ہمیں جس قانون کی ضرورت ہو' اسے اپنے اجتہاد سے وضع کریں لیکن اس طرح جو اجتہادی قانون بر بنائے قانون وسنت وضع ہوگا (اور جس میں کبھی کبھی پچھلی نسلوں کے اجتہادات بھی شامل ہوں گے) اور وہ اس قانون کا ایک حصہ تصور کیا جائے گا جسے نہایت مناسب الفاظ میں مسلمانوں کا قانون (Muslim Law) کہا گیا ہے' جو باعتبار زمانہ متبدل اور ہمیشہ ترمیم واصلاح کا محتاج رہے گا مگر جس کو اسلام کے قابل تغیر وتبدل قانون یعنی شریعت سے ممتاز رکھنا ضروری ہے۔

شریعت میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں کیونکہ وہ اللہ کا بھیجا ہوا قانون ہے اور اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ اس کا ہر حکم اس طرح متشکل ہوا کہ شریعت اور انسان کی اصل فطرت اور معاشرے کی حقیقی ضروریات میں کوئی تصادم پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اس لئے کہ شریعت نے زندگی کے صرف اسی پہلو کو مدنظر رکھا جو دوامی اور تغیر وتبدل سے آزاد ہے۔ پس شریعت الٰہیہ کی یہ خصوصیت کہ اس کا اطلاق ارتقائے انسانی کی ہر منزلت اور ہر مرحلے پر ہو سکتا ہے گویا اس بات پر مشروط ہے کہ شریعت کے احکام کا تعلق اولاً صرف عام اصولوں سے ہے (تفصیلات اور جزئیات کو ہر زمانے کی مقتضیات پر چھوڑ دیا گیا ہے) اور ثانیاً ان معاملات میں قانون کی توسیع وتشریح سے جو انسانی ترقی کے باوجود تبدیلی زمانہ سے متاثر نہ ہوں۔ چنانچہ جو کوئی شریعت کا مطالعہ کرے گا' اسے معلوم ہو جائے گا کہ ہمارا یہ مفروضہ سرتا سر درست ہے۔

جہاں کہیں احکام نص کا کوئی تفصیلی بیان آیا ہے' وہاں ہمیشہ زندگی کے انفرادی یا اجتماعی صرف ان پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے جو قید زمانی سے آزاد ہیں اور جن میں ماحول کی تبدیلی سے کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی (مثلاً فطرت انسانی کے بنیادی عناصر اور بنیادی روابط) البتہ جہاں کہیں انسانی ترقی کے لئے ضروری تھا کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے (مثلاً امور حکومت، قوانین صنعت وحرفت اور اس قسم کے دوسرے معاملات) وہاں شریعت نے کوئی تفصیلی ضابطہ پیش نہیں کیا۔ صرف چند عام اصول بیان کر دیئے یا بالکل خاموشی اختیار کر لی۔ لہٰذا یہی وہ میدان ہے جس میں مسلمانوں کی قانون سازی (وقتی اجتہاد جیسا کہ اوپر بیان کر دیا گیا تھا) کا عمل دخل شروع ہوتا ہے کیونکہ شریعت کا تعلق صرف ان باتوں سے ہے جو صاف صاف الفاظ میں فرض یا حرام ٹھہرائی گئیں۔ اس کے ماورا جو وسیع دائرہ اعمال وافعال کا رہ جاتا ہے اور جن کے بارے میں صاحب شریعت نے کچھ نہیں کہا -- نہ از روئے نص ان کے کرنے کا نہ از روئے نص نہ کرنے کا حکم دیا -- ان کو مباح تصور کرنا چاہیے۔ گویا وہ معاملات جن کو شریعت اسلامی کی رو سے مباح تصور کیا جاتا ہے' حقیقی موضوع ہیں مسلمانوں کی قانون ساز سرگرمیوں کا۔ ہمارے نزدیک یہ قانون سازی

Marfat.com

جس میں ہمیشہ ترمیم و تبدیلی ہوتی رہے گی اور جس صحت کا دار و مدار اسلام کے ناقابل تغیر قانون یعنی شریعت پر ہے' حیات ملّی کے ارتقا اور ٹھیک ٹھیک اسلامی زندگی بسر کرنے کے لئے ناگزیر ہے کیونکہ اسلامی زندگی جب ہی ممکن ہے کہ ہم اپنے اجتہاد و تفقہ اور غور و فکر کو تازہ رکھیں۔

مسلمانوں کی قانون سازی

علمائے اسلام میں سے بعض نے صدیوں سے اس امر کو نظر انداز کر رکھا ہے کہ اسلامی قانون اور مسلمانوں کے وضع کردہ قوانین یعنی اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت اور فقہا کے اجتہاد میں فرق کرنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ فقہا کے اجتہادات نے بلاوجہ شرعی احکام کا درجہ حاصل کر رکھا اور اس طرح خود اجتہاد بھی ایک مخصوص زمانے کے خیالات کا پابند ہو گیا ہے یا یوں کہیے کہ اجتہاد کو ہماری ملّی زندگی میں کوئی دخل نہیں رہا۔ اجتہاد اور تفقہ کے رجحانات کا یوں دب جانا ہی ایک بہت بڑا سبب ہے' اسلامی ثقافت کے حسرت ناک زوال کا۔

لہٰذا اگر ہم اس ثقافتی پستی کو دور کرنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ فقہائے متقدمین کے اجتہادات کو قطعی اور غیر متبدل نہ سمجھیں تا کہ اجتہاد اپنا کھویا ہوا مرتبہ پھر حاصل کر لے۔ گویا شریعت اسلامی کی رو سے ہمارا یہ حق ہے اور ہم پر واجب بھی کہ کسی امر کو جائز یا ممنوع قرار دینے میں نصوص قرآن و سنت کے علاوہ اور کسی چیز کو حجت نہ مانیں۔ شریعت کی ابتدا اور انتہا بھی ان احکام پر ہوتی ہے جو نصوص قرآن و سنت پر مشتمل ہیں' لہٰذا رسول پاک صلعم کے بعد کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے اجتہاد کو شرعی حجت یا قطعیت کا درجہ حاصل ہے۔ ائمہ سلف نے بھی تو کبھی یہ نہیں کہا کہ ان کا اجتہاد قطعی یا شرعی حیثیت رکھتا ہے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ انسانی غور و فکر عیب اور خطا سے پاک نہیں۔ وہ ہمیشہ پورے عجز اور فروتنی سے نور ہدایت کے متمنی رہے۔ آگے چل کر اگر ان کی ذات کو غلطی سے مبرا تصور کر لیا گیا تو اس کی ذمہ داری ان پر نہیں بلکہ ان کم نظر متبعین پر عائد ہوتی ہے جن میں خود تو یہ صلاحیت نہیں تھی کہ اجتہاد و تفقہ کے اس درجے کو پہنچ سکیں جو ائمہ کو حاصل تھا' لہٰذا انہوں نے غور و فکر سے کام لینا چھوڑ دیا اور صرف اس بات پر قناعت کر لی کہ اسلاف کے خیالات کو دہراتے رہیں۔

ناممکن ہے کہ ذہنی جمود کی یہ عادت جو ملت اسلامیہ نے صدیوں سے اختیار کر رکھی ہے' کسی خوشگوار نتیجے کا باعث ہو۔ جب بھی کوئی قوم غور و فکر کے اس راستے سے آگے نہیں بڑھتی جس پر ایک مخصوص عہد کے علماء چل رہے ہوں (محض اس لئے کہ ایسا کرنے سے ان کے احترام میں فرق آ جائے گا) وہ گویا اپنی موت پر راضی ہو جاتی ہے کیونکہ جہاں کسی قوم میں اجتہاد و تفقہ کی قوتیں ناپید ہوئیں' اس پر روحانی موت طاری ہو گئی۔

ان سب باتوں کا مسلمانوں کے وقتی قانون سازی سے براہ راست تعلق ہے۔

ہم نے ابھی عرض کیا تھا کہ شریعت چونکہ صرف ان احکام پر مشتمل ہے جو نصاً قرآن و سنت میں مذکور ہیں' لہٰذا اس کا دائرہ اتنا وسیع نہیں جیسا کہ بالعموم تصور کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ ماننا لازم آتا ہے کہ حیات اجتماعیہ کی وہ ہنگامی ضروریات جو زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی اور نت نئی شکلوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں' اگر قانون کی حدیں آ سکتی ہیں تو

Marfat.com

اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہم اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھیں۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اس مقصد کے لئے کس طرح کے قانون ساز وسائل سے کام لینا پڑے گا۔ یہاں اتنا عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ شریعت کے ابدی اور غیر متبدل قانون کے ساتھ ساتھ خود مسلمانوں کے ایک وقتی اور ترمیم طلب قانون کے ارتقا میں کیا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

ہمارا فرض ہے کہ جہاں کسی معاملے میں شریعت نے کوئی خاص حکم صادر نہیں کیا لیکن مفاد ملت کا تقاضا ہے کہ اس بارے میں کوئی تفصیلی ضوابط وضع کیے جائیں' وہاں یہ دیکھیں کہ شریعت نے اس سلسلے میں کوئی عام اصول تو بیان نہیں کیا۔ پھر اگر نصوص قرآن وسنت میں اس قسم کا کوئی عام اصول نہ ملے تو مسلمانوں کو پورا پورا اختیار ہے کہ احکام شریعت کا لحاظ رکھتے ہوئے خود اس کی جزئیات ترتیب دیں' لیکن ہوسکتا ہے کہ بعض ایسے مسائل بھی پیش آئیں جن کا شریعت میں کہیں ذکر نہیں آیا۔ یعنی ایسے قانونی معاملات اور قانونی حالات جن کا نصوص قرآن وسنت میں کوئی تفصیلی ضابطہ مذکور ہے نہ عام اصول۔ ان مسائل میں ہمیں پوری پوری آزادی ہے کہ اصول اسلام اور مفاد ملت کا لحاظ رکھتے ہوئے جیسے بھی حالات ہوں' خود اپنی مرضی سے وقتی قانون وضع کریں۔ یہی وہ اصول ہے جسے امام مالک نے استصلاح سے تعبیر کیا تھا اور جس کی طرف قرآن مجید نے صاف صاف ان الفاظ میں اشارا کر دیا ہے:

''لکل جعلنا منکم شرعة و منهاجاً'' (۵:۴۸)

''ہم نے تم سب کے لئے ایک شریعت اور ایک منہاج (کھلا کھلا راستہ) تجویز کیا'' لہٰذا جہاں شریعت نے ان حدود کا ایک خاکہ پیش کر دیا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے مسلمان اپنی زندگی کو نشو ونما دے سکتا ہے' وہاں صاحب شریعت نے اجازت دی کہ ان ہنگامی ضروریات کے لئے جن کو شریعت کے مجموعی دائرے سے ارادۃً مستثنیٰ رکھا گیا' حدود شریعت کے ماتحت وقتی اجتہاد یا قانون سازی کا ''کھلا کھلا راستہ'' (منہاج) اختیار کریں۔ زیادہ قطعی الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے وقتی اجتہادات یا قانون سازی کا تعلق (الف) ان جزئیات سے ہے جن کا شریعت نے کسی معاملے یا کسی حالت کے پیش نظر ایک عام اصول تو بیان کر دیا لیکن جزئیات سے احتراز کیا اور (ب) ایسے اصول اور جزئیات سے جن کا شریعت میں سرے سے کوئی ذکر نہیں اور اس لئے ان کو مباح تصور کیا جائے گا۔

لیکن شریعت کے اٹل اور غیر متبدل قانون کے ساتھ ساتھ اگر ہمیں خود بھی وقتی اور عارضی قوانین بنانے کی اجازت ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان وقتی قوانین میں شریعت کے کسی فیصلے کو نظر انداز کر دیا جائے یا کوئی ایسا قانون بھی وضع ہوسکتا ہے جو لفظاً یا معناً شریعت کے منافی ہو لہٰذا ہمیں اپنے دستور میں صاف صاف کہنا پڑے گا۔

''جو وقتی قانون خواہ اس کی حیثیت حکم کی ہو یا رخصت
کی' احکام شریعت کے منافی ہوگا' باطل ٹھہرے گا''

گویا صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو ہم کہیں گے کہ ایک اسلامی دستور کا تقاضا جب ہی پورا ہوسکتا ہے کہ اس میں ان تینوں دفعات کو جن سے ہم اوپر بحث کر آئے ہیں' شامل کر لیا جائے یعنی'' ریاست کا اختیار واقتدار ایک امانت ہے

Marfat.com

خدا کی طرف سے' ثانیاً ''شریعت قانون عامہ کی ناقابل تغیر وتبدل اساس ہے'' اور ثالثاً ''جو وقتی قانون احکام شریعت کے منافی ہے' باطل ٹھہرے گا۔'' ان تینوں دفعات سے اسلامی ریاست کی غرض و غایت اور مطمح نظر کا پورا پورا اظہار ہو جاتا ہے لیکن عملی ضروریات کا تقاضا ہے کہ ہمارا دستور صرف ان تین دفعات تک محدود نہ رہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں مسلمانوں میں شریعت کے صحیح معنوں کے متعلق بہت کافی انتشار پایا جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ شریعت کی تدوین آج تک ظاہری اصولوں پر نہیں ہوئی (حالانکہ یہی وہ تدوین ہے جس کے ماتحت ہم فقہی تعبیرات سے پیدا شدہ اختلافات اور نزاعات سے بچ سکتے ہیں)۔ سردست علمائے کرام شاید قانون کے ایک مشترکہ تصور پر متفق نہ ہوں لیکن اس قسم کی کوئی تدوین جلد یا بدیر ضروری ہے اور کسی نہ کسی وقت ہو کر رہے گی۔ حاصل کلام یہ کہ بہ حالت موجودہ شریعت کا کوئی اقل قلیل ضابطہ جو ہر شخص کے لئے قابل قبول ہو' موجود نہیں۔ لہٰذا قدرتی بات ہے کہ مذاہب فقہ کے اختلافات کو دیکھتے ہوئے خود اس اصول کے متعلق کہ ہمارے دستور میں ''شریعت قانون عامہ کی ناقابل تغیر وتبدل اساس ہے۔'' فی الواقعہ اور بالتصریح کون کون سی دفعات شامل ہونی چاہئیں، طرح طرح کے اور مختلف نظریے پیدا ہو جائیں۔ اندریں صورت ایک ایسی مشترک اساس کے لئے جس پر تمام فقہائے اسلام کا اتفاق ہو' ہم اسلامی دستور کے بعض ایسے پہلوؤں کا تجزیہ کریں گے جن کا تعلق قرآن وسنت کے وضع کردہ چند بنیادی سیاسی قوانین سے ہے۔ اس تجزیے میں اول ریاست کی ترکیب اور پھر شہریوں کے حقوق وفرائض کی بحث آئے گی۔

سربراہ ریاست

اسلامی نظام اجتماع (Polity) کا مقصد چونکہ دنیا بھر میں شریعت اسلامی کو نافذ کرنا ہے' اس لئے ضروری ہے کہ ریاست کی زمام قیادت اس شخص کے ہاتھ میں ہو جو خود بھی مسلمان اور شریعت پر ایمان رکھتا ہے۔ ہمارا مقصد نسلی اور ثقافتی خود اختیاری (Self-determination) تو ہے نہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ اسلام ہی تمام معاملات میں عملاً ہماری رہنمائی کرے لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس مقصد میں کامیابی کے لئے وقت چاہیے۔ ہمارا روحانی انحطاط آج کی نہیں پرانی بات ہے۔ ہمارے یہاں بہت کافی مذبذب اور بہت کافی ''حریت پسند'' لوگ موجود ہیں جن کے نزدیک مذہب زمانہ ماضی کی ایک تکلیف دہ یادگار ہے۔ مختصراً یہ کہ ہم میں ایسے لوگ بہت ہیں جو صرف نام کے مسلمان ہیں' جن کو اسلامی مقاصد کے لئے کچھ کرنے کی ہمت ہے نہ کوئی چیز ان کو اس پر ابھارتی ہے۔ لہٰذا ہم اپنے مقصد میں بتدریج اور دکھ درد سہہ کر ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ بایں ہمہ پاکستان کے مسلمان جو دستور آج ترتیب دیں گے' وہ دیر تک اس معاملے میں ہماری رہنمائی کرے گا۔ اندریں صورت ہمارا فرض ہے کہ پاکستان کے لئے جو آئین (Statutes) تیار کریں' اس نہج پر کریں کہ ہماری خامیوں کے باوجود صحیح اسلامی ارتقا کا سنگ بنیاد ثابت ہوں۔ ہمیں سب سے پہلے ہر مسلمان پر واضح کر دینا چاہیے کہ اسلامی ریاست کے بغیر اسلامی زندگی ناممکن ہے۔ علیٰ ہذا یہ کہ جب تک کسی ریاست کا نظم ونسق ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں آتا جو احکام الٰہیہ کی اطاعت پر دل وجان سے تیار ہیں' اسے اسلامی ٹھہرانا غلط ہوگا۔

Marfat.com

پاکستان کے غیر مسلم شہریوں کے خلاف یہ ''امتیاز'' خواہ ان لوگوں کی نظر میں جو مذہب سے بے اعتنائی برتتے ہوئے ترقی کو تجدد کا مترادف قرار دیتے ہیں' کیسا ہی قابل اعتراض ہو' ہمیں اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے کہ مسلم اور غیر مسلم کی تفریق کے بغیر اسلامی ریاست کا وجود ہی ممکن نہیں۔ لہٰذا اس معاملے میں لیت ولعل سے کام لینا یا تو آس پاس کی غیر اسلامی دنیا سے بددیانتی کرنا ہے یا خود پاکستان کے اندر ملت اسلامیہ سے، گو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم زندگی کے عام معاملات میں بھی مسلمان اور غیر مسلمان کی تفریق پیدا کریں۔ پاکستان میں غیر مسلموں کو ویسی ہی آزادی حاصل ہوگی جیسے مسلمانوں کو۔ وہ صرف اس امر کے حق دار نہیں ہوں گے کہ مسلمانوں کی زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لیں۔ ہم اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں کہ جو شخص مسلمان نہیں' اس بات کا اہل ہو سکتا ہے کہ اسلامی اصول و مقاصد کے معیار پر پورا اترے' خواہ وہ ریاست کا کیسا ہی وفادار یا اپنی ذات میں سے کیسا ہی لائق اور قابل کیوں نہ ہو؟ جیسا کہ ہم بار بار عرض کر آئے ہیں' اسلامی ریاست کی حقیقی غرض و غایت یہ نہیں کہ (باصطلاح جدید) ''قوم'' (Nation) کے دنیوی مصالح کی حفاظت کرے۔ اسلامی ریاست کا فرض ہے حیات انسانی کو اسلامی اصولوں کے ماتحت لانا۔ لہٰذا کسی تصوری (ideological) ریاست کے لئے (قطع نظر اس سے کہ اس کی بنا مذہب پر ہے یا کسی غیر مذہبی عقیدے پر) یہ ممکن ہی نہیں کہ اپنی زمام کار اس شخص کے سپرد کر دے جو اس کے تصورات کا قائل نہیں۔ مثال کے طور پر کیا سوویٹ (Soviet) روس میں یہ ممکن ہے کہ ایک غیر اشتمالی (Non-Communist) کو ریاست کی سرداری تو کیا' کلیدی اسامی بھی مل سکے؟ ظاہر ہے کہ نہیں اور بجا طور پر نہیں کیونکہ جب تک اس ریاست کی بنا اشتمالی اصولوں پر ہے' اس کے نظم ونسق میں اشتمالی مقاصد کی ترجمانی کسی ایسے شخص ہی کے ذریعے ممکن ہے جو خود بھی اشتمالیت کا دل سے قائل ہے۔ یہی اصول اسلامی نظام اجتماع کے لئے بھی موزوں رہے گا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے ریاست کا قانونی جواز (Legality) یعنی اس کا یہ دعویٰ کہ ریاست کی اطاعت ہر مسلمان پر بے چون و چرا فرض ہے' اس نص قرآنی پر مبنی ہے: ''اطیعوا اللّٰہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم'' (۵۹:۴) اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور اہل امر کی جو تم میں سے (یعنی مسلمان) ہوں۔'' لہٰذا کوئی ایسی حکومت جس کی عنان قیادت غیر مسلمانوں کے ہاتھ ہے' شرعاً اطاعت کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔ لیکن ہم چونکہ ریاست کو یہ حق دینا چاہتے ہیں کہ شرعاً ہم سے اطاعت کا مطالبہ کرے اس لئے ضروری ہے کہ پاکستان کے ارباب حل وعقد جو اس کی تدبیر و سیاست کا رخ جس طرح چاہیں موڑ سکتے ہیں' مسلمان ہوں' محض اپنی واقعی (de facto) اکثریت کی بناء پر نہیں بلکہ قانوناً (de jure) یعنی از روئے دستور و آئین بھی۔ بات یہ ہے کہ اگر پاکستان میں ہم فی الحقیقت ایک تصوری ریاست کی تاسیس کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں علی الاعلان یہ کہنے کی اخلاقی جرأت ہونی چاہیے کہ ہم اس جھوٹی ''حریت پسندی'' کی خاطر جس کی نظر میں ایمان وعقائد کی کوئی وقعت نہیں' کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ اپنا مستقبل خطرے میں ڈال دیں۔ برعکس اس کے ہمارے نزدیک کسی شخص کا ایمان اور عقیدہ زیادہ اہم ہے بہ نسبت اس اتفاقی امر کے کہ اس کی پیدائش دنیا کے کس حصے میں ہوئی یا اس نے دنیا کے کس ملک میں توطن (Naturalisation)

Marfat.com

اختیار کیا۔[1]

پھر اس امر کے علاوہ کہ اسلامی حکومت کی اطاعت ملت پر فرض ہے' قرآن مجید کی محولہ بالا آیت سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ جب تک حکومت کا دارومدار ملت کے اختیار اور قبول عام پر ہے' اس کی حیثیت نمائندہ بھی رہے گی اور اسلامی بھی، ورنہ ہم اس کے ارباب اختیار پر "منکم" کا اطلاق نہیں کر سکیں گے۔ لہٰذا شرعی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ہم اس کے مکلف ٹھہرتے ہیں کہ ریاست کی قیادت یعنی امارت کا فیصلہ عام انتخاب سے کریں۔ رہا یہ امر کہ اس انتخاب کی شکل اور طریق کیا ہو' اسے ملت کی سمجھ پر چھوڑ دیا گیا (جیسا کہ خلفائے راشدین کی مثال سے ظاہر ہو جاتا ہے)۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی غیر انتخابی ذریعے مثلاً موروثی بادشاہت کے "پیدائشی حق" کی بنا پر اختیار حکومت کو اپنے تصرف میں لانے کی کوشش کرتا ہے تو ایسا کرنے والا خواہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو' اس کا یہ فعل ویسا ہی ناجائز ٹھہرے گا جیسے ملت پر کسی بیرونی طاقت کا غلبہ۔[2] اندریں صورت ہمارے دستور میں ایک دفعہ یہ ہوگی۔

> "سرِ ریاست یعنی امیر ہمیشہ مسلمان ہوگا اور اس کا انتخاب ملت کرے گی۔ انتخاب پر امیر اعلان کرے گا کہ اس کی حکومت شریعت اسلام کی پابند رہے گی۔"

جیسا کہ پہلے عرض کر دیا گیا ہے' شریعت نے انتخاب کی کوئی خاص شکل مقرر نہیں کی۔ گویا یہ کام مجالس دستور ساز کا ہے کہ ملت کے بہترین مفاد کے پیش نظر اس کا کوئی طریق مقرر کرے۔ امارت کے میعاد کا فیصلہ بھی اسی اصول کے ماتحت کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس عہدے کی مدت مقرر کر دی جائے یا بصورت دیگر یہ کہ وہ عمر کے ایک خاص حصے سے آگے نہ بڑھے، بشرطیکہ امیر سے ادائے فرض میں کوتاہی نہ ہو۔ نہ اصولاً نہ عملاً۔ یا پھر یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ امارت کا عہدہ مدت العمر کے لئے ہوگا' لیکن اگر اس بات کا ثبوت مل گیا کہ امیر اپنے فرائض کا کما حقہ ادا نہیں کر رہا یا خرابی صحت یا ذہنی انحطاط کے باعث اس عہدے کے قابل نہیں تو اس سے دست برداری لازم آئے گی۔ شریعت نے ان تینوں صورتوں میں سے کسی ایک کو صاف و صریح الفاظ میں ترجیح نہیں دی' لہٰذا یہ کام مجلس دستور ساز کا ہے کہ اس بارے میں سوچ سمجھ کر کوئی مناسب قانون وضع کرے۔

استبداد یا شوریٰ؟

اب ہمیں ریاست کے قانون ساز پہلو کا رخ کرنا چاہیے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں' شریعت نے ہماری اجتماعی زندگی کی بدلتی ہوئی ضروریات کے متعلق کوئی مبسوط قوانین وضع نہیں کیے، نہ ایسا کرنا اس کا مقصد تھا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ حالات زمانہ کے مطابق وقتی قانون سازی کی مسلسل ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔

البتہ اسلامی ریاست میں جو قانون اس طرح وضع ہوں گے' ان کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو وہ مسائل جن کا شریعت میں کہیں ذکر نہیں آیا یعنی ایسے قانونی امور جو ملت کی سوچ سمجھ پر چھوڑ دیئے گئے ہیں اور دوسرے وہ مسائل جن کے عام اصول تو شریعت نے بیان کر دیئے لیکن جزئیات سے کوئی بحث نہیں کی۔ اندریں صورت ملت کو چاہیے کہ اس بارے میں اجتہاد سے کام لے کر مبسوط اور مناسب قوانین وضع کرے۔ یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ ہم اپنی ملی

Marfat.com

زندگی کا کوئی معاملہ کسی ایک یا معدودے چند اشخاص کے اجتہاد پر نہیں چھوڑ سکتے۔ برعکس اس کے ان باتوں کا فیصلہ اجماع امت سے ہوگا۔ گو اس کا یہ مطلب نہیں کہ امت کسی مسئلے میں فقہائے متقدمین کے اجتہاد پر جمع نہیں ہو سکتی۔ پس اسلامی ریاست کا ایک فریضہ تو یہ ہے کہ اس قسم کی قانون سازی کے لئے امت کے باہمی مشورے کا کوئی ایسا انتظام کرے جو ہر اعتبار سے آزادانہ اور ملت کا ترجمان ہو اور دوسرا یہ کہ ان قوانین کو جو اس طرح (مشورۃ) وضع ہوں' نافذ بھی کرے۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملت کے نام پر وقتی قانون سازی کی یہ خدمت کون لوگ سرانجام دیں گے۔ ملت تمام وکمال یعنی اس کے جملہ افراد تو باہم جمع ہو کر ایسا نہیں کر سکتے' لہٰذا ملت اپنا یہ حق کسی ایک فرد یا جماعت افراد ہی کو تفویض کرے گی اور اس کا فیصلہ ساری امت کے لئے واجب التعمیل ہوگا۔ اس صورت میں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ خدمت کس شخص یا اشخاص کے ذمے کی جائے۔

بعض مسلمانوں کا خیال ہے اور بظاہر خلفائے راشدین کی مثال کے پیش نظر یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس قانون سازی کے جملہ اختیارات ایک شخص یعنی امیر کے ذمے ہونا چاہیے کیونکہ امیر کا انتخاب امت کی آزادانہ رائے سے عمل میں آئے گا' لہٰذا وہ نہ صرف امور تنفیذ (Executive) بلکہ قانون سازی (Legislative) میں بھی ان کی نیابت کر سکتا ہے' لیکن بعض مسلمانوں کی رائے ہے اور اس کی تاریخ سے بھی تائید ہوتی ہے کہ ایک ہی شخص کو اتنے اختیارات دے دینا خطرے سے خالی نہیں کیونکہ ایک بڑا نیک نیت اور زیرک انسان بھی کسی معاملے میں جانبداری کی وجہ سے فیصلے کی غلطی کر سکتا ہے۔ برعکس اس کے ایک ایسا اجتماع جو متعدد اشخاص پر مشتمل (اور جس میں گویا پہلے ہی سے رائے کا اختلاف موجود) ہے' جس مسئلے پر بحث کرے گا' ہر زاویہ خیال سے کرے گا۔ لہٰذا اس کی قانون سازیوں میں انفرادی جانب داری کا امکان اگر کلیتہً نہیں تو بڑی حد تک دور ہو جائے گا۔ مزید برآں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض طبائع پر مطلق اختیارات کا اثر اچھا نہیں پڑتا اور وہ اکثر موقعوں پر اپنے یا اپنے دوستوں کے مفاد کی طرف راغب ہو جاتی ہیں۔ یہ گویا اس امر کی دلیل ہے کہ قانون سازی کے اختیارات کو محض ایک شخص یعنی امیر کی ذات میں محدود رکھنا غلط ہوگا۔ بالفاظ دیگر یہ اختیارات ایک ایسی جماعت کے سپرد ہونا چاہیے جسے ملت بالتخصیص اس خدمت کے لئے منتخب کرے۔

اس سلسلے میں مسلمانوں کے لئے بظاہر دو راستے ہیں۔ ایک مطلق العنان امیر اور دوسرا امیر معہ مجلس شوریٰ۔ لیکن بنظر تعمق دیکھا جائے تو ہمارے لئے کسی راستے کے انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن مجید نے شروع سے اس کے متعلق اپنا یہ ناطق فیصلہ دے رکھا ہے' "امرھم شوری بینھم" (۳۸:۴۲) "وہ اپنے معاملات مشورے سے طے کرتے ہیں۔"

لہٰذا اس حکم منوص کو تدبیر ریاست کے معاملے میں اسلامی غور وفکر کی اساسی اور کارفرما (Operative) دفعہ تصور کرنا چاہیے۔ یہ دفعہ اتنی جامع اور ہمہ گیر ہے کہ ہماری سیاسی زندگی کے تقریباً ہر شعبے کا احصا کر لیتی ہے اور پھر ساتھ

Marfat.com

ہی ساتھ ایسی واضح اور صاف وصریح کہ اس کی کوئی من مانی تعبیر ممکن نہیں۔لفظ امر کا اشارہ ہر اجتماعی معاملے کی طرف ہے' لہٰذا اس میں وہ طریقہ بھی آ جاتا ہے جس پر اسلامی ریاست چلائی جائے گی۔ بالفاظ دیگر ثابت ہوا کہ شریعت یعنی صحیح اسلامی زندگی کا تقاضا صرف اس حکومت کے ذریعے پورا ہوسکتا ہے جو عام رائے اور مشورے سے قائم کی جائے۔ کیا باعتبار ہیئت ترکیبی اور کیا بہ لحاظ وضع قوانین۔ اور اس کا صاف صاف یہ مطلب ہے کہ ریاست کی قانون ساز سرگرمیاں قطعاً ایک مجلس شوریٰ کے ذمے ہونا چاہئیں جو رائے عامہ کے ماتحت اس خدمت پر مامور ہو۔

لیکن یہاں ایک اعتراض کا جواب دینا ضروری ہے جس کا بعض تاریخی اسباب کی بنا پر مسلمانوں کو بجا طور پر حق پہنچتا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں کوئی قانون ساز مجلس جیسا کہ آج کل اس کا مطلب سمجھا جاتا ہے' موجود نہیں تھی۔ بے شک خلفاء ہر اہم مسئلے میں اکابر ملت سے مشورہ کرتے لیکن ایسا نہیں تھا کہ ملت ان حضرات کو بالخصوص اس مقصد کے لئے منتخب کرتی' نہ خلفاء اپنے آپ کو اس بات پر مجبور سمجھتے تھے کہ ان کے مشورے پر عمل کریں۔ خلفاء مشورہ کرتے لیکن اس کے مخالف اور موافق دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے جیسا مناسب سمجھتے فیصلہ کرتے۔ کبھی اکثریت کی رائے قبول کر لی جاتی اور کبھی اقلیت کی۔ کبھی نہ اکثریت نہ اقلیت کی۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خلفائے راشدین نے کسی نیابتی (Parliamentary) طریق حکومت کی ضرورت محسوس نہیں کی تو آج کس بنا پر یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ اس قسم کا کوئی طرز حکومت شارع علیہ السلام کے منشا کے مطابق ہے۔ کیا ہم صحابہ کبار سے بھی اسلام کے حقیقی مفہوم کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں یا اندریں صورت کیا یہ زیادہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم صحابہ ہی کے نقش قدم پر چلیں اور کم وبیش ایک ایسی مطلق العنان ریاست قائم کرلیں جس میں مجلس شوریٰ کا وظیفہ صرف مشورے تک محدود رہے۔ البتہ امور ریاست میں جو بھی فیصلہ ہو امیر کا ہو، خواہ یہ امور تنفیذی ہوں خواہ قانونی۔

اس اعتراض میں درحقیقت جذبات کو بڑا دخل ہے اور سطور ذیل میں ہم اس کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

بے شک نبی صلعم نے تاکید فرمائی کہ ہم صحابہ کے نقش قدم پر چلیں اور اس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ صحابہ حضور نبی صلعم کی صحبت بابرکت سے مستفیض ہوتے اور اس لئے خوب سمجھتے تھے کہ ان کے آقا و مولیٰ کی سنت کیا ہے بلکہ یوں بھی کہ صحابہ رسول صلعم نے اپنے اعمال وافعال اور سیرت وکردار میں انسانی عظمت کا وہ بلند ترین مقام حاصل کرلیا تھا جو منصب نبوت کے بعد کسی شخص کو مل سکتا ہے۔ اب اگر یہ ہمارا دینی اور اخلاقی فرض ہے کہ صحابہ کا اتباع کریں تو اس اتباع کا تعلق ان کے مدارج اور مکارم ذات یعنی روحانی خلوص، ملی دیانت، ایثار، بے نفسی، طلب کمال اور رضائے الٰہی کے سامنے بے چون وچرا سر تسلیم خم کردینے سے ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں، نہ ہوسکتا تھا کہ ریاست کے وقتی یا کسی مخصوص معاملے میں انہوں نے جو باتیں اختیار کیں' وہ آئندہ نسلوں کے لئے بعینہٖ اور بغیر کسی تغیر وتبدل کے واجب الاتباع ٹھہریں گی۔

Marfat.com

صحابہ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ان کے ہر اجتہاد کی پابندی خواہ اس کا تعلق عقائد سے ہو یا اعمال سے' آگے چل کر بھی مسلمانوں پر لازم رہے گی۔ ان کے دلوں کو اللہ نے وہ عاجزی بخشی تھی جس سے بڑھ کر روحانیت کا کوئی درجہ نہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی اپنے آپ کو "شارع ثانی" کی حیثیت نہیں دی۔ بعد کی نسلوں نے البتہ انہیں کچھ ایسی ہی حیثیت دے رکھی ہے۔ ہمارا مطلب ہے ان لوگوں سے جو خود تو غور وفکر سے کام لیتے نہیں، بر عکس اس کے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اس غور وفکر کی ساری ذمہ داری گویا ان کے پیش رووں پر عائد ہوتی تھی۔ وہ اصحاب رسول صلعم کے بجا طور پر مداح ہیں لیکن اس حقیقت کو کہ انسان فطرتاً ناقص ہے یعنی اس کی بشریت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یوں انہوں نے امور سیاست میں بھی صحابہ کے تمام اجتہادات کو قانونی نظائر (Legal Precedents) کا رنگ دیتے ہوئے غلطی سے یہ رائے قائم کر رکھی ہے کہ ان اجتہادات کا اتباع ملت پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے واجب ہے۔ حالانکہ یہ بات نہ از روئے شریعت جائز ہے نہ عقل ہی اس کو تسلیم کرتی ہے۔

اصحاب رسول صلعم کے احترام میں ذرا سا فرق لائے بغیر ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ بڑے سے بڑے آدمی کا اجتہاد بھی نتیجہ ہوگا' اس کے ماحول اور علمی حیثیت کا۔ اب علم اور وہ بھی اجتماعی معاملات کا انسان کی سیرت اور کردار پر اتنا موقوف نہیں جتنا اس بات پر کہ وہ ان احوال سے کہاں تک واقف تھے جو تاریخی اعتبار سے دنیا کو پیش آئے۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے اور صحابہ کے زمانے میں چونکہ تیرہ سو سال کا فرق ہے' اس لئے ہم ان احوال کے مشاہدے میں کچھ آگے بڑھ گئے ہیں' گو اس میں ہماری اپنی فضیلت کی کوئی بات نہیں کیونکہ اس مشاہدے کا تعلق صرف مرور زمانہ سے ہے۔ مثال کے طور پر اسی ایک امر کو لیجئے کہ ان تیرہ صدیوں میں ہمارے نفسیاتی اور عمرانی تصورات میں کیا زبردست نشوونما ہوا اور اس لئے اسلام کے بعض اجتماعی اور معاشی تصورات کی اندرونی علت زمانہ گذشتہ کی نسبت زیادہ واضح طور پر ہمارے سامنے آگئی، کیونکہ ہم تیرہ سو برسوں کے ان تاریخی تجربات سے مستفید ہو چکے ہیں جو صحابہ کے لئے مستقبل کا حکم رکھتے اور اس لئے ان کی نظر سے پوشیدہ تھے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کی دعوت ابدی ہے اور اس لئے انسان کی عقلی جستجو کے لئے اس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا۔ قرآن پاک اور رسول مقبول صلعم کے اسوۂ حسنہ کی عظمت کا راز بھی اس امر میں پوشیدہ ہے کہ جیسے جیسے دنیا ترقی کرتی اور اس کے متعلق ہمارا علم بڑھتا ہے' ویسے ہی ان احکام کی اندرونی علت جو قرآن وسنت سے ماخوذ ہیں اور زیادہ خوبی سے ہمارے ذہن پر عیاں ہو جاتی ہے۔ لہٰذا قرآن وسنت کے احکام کی اندرونی گہرائیوں اور نئے نئے معنوں کا انکشاف ایک ایسا فریضہ ہے جو ہر سچے مسلمان پر عائد ہوتا ہے اور جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے نہیں پاتا۔

بازگشت

پھر اس خاص مسئلے میں کہ ایک ایسی مجلس شوریٰ کا قیام عمل میں آنا چاہیے یا نہیں جس کے وضع کیے ہوئے قانون ساری ملت پر جن میں خود امیر کی ذات بھی شامل ہے' نافذ ہوں گے ہمیں آزادی ہے کہ بعض جزئیات کوئی ایسا طریق عمل اختیار کر لیں جس کی نظیر صحابہ کے زمانے سے نہیں ملتی۔ مثلاً جب خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ کو ارشاد قرآنی "امرھم

Marfat.com

شوریٰ بینھم'' کے ماتحت اس مجلس کی ضرورت محسوس ہوئی جو امور ریاست میں ان کی مشیر و معاون بنتی تو انہوں نے بالطبع ایک ایسے نظام کا رخ کیا جو عرب میں قدیم ہی سے رائج تھا اور جس پر اسلامی شریعت کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا تھا۔ یعنی وہ مجلس جو قبائل اور ان کی مختلف شاخوں کے سرداروں سے ترکیب پاتی۔ یوں بھی ان حالات میں یہی فیصلہ درست تھا کیونکہ باوجود قبائلی رشتوں کا زور ٹوٹ جانے کے (جو بجائے خود نتیجہ تھا اسلام کا) یہ رشتے سراسر منقطع نہیں ہو گئے تھے۔ لہٰذا اس زمانے کے اسلامی معاشرے کی تنظیم بڑی حد تک قبائلی اصولوں پر تھی اور سرداران قبائل کا قول وفعل قانوناً نہیں تو واقعی طور پر پورے قبیلے کا قول وفعل تھا۔ مثلاً قریش میں سے بنوزہرہ یا انصار میں سے اوس کے سردار اگر کسی بات پر اتفاق کر لیتے تو یہ گویا سارے قبیلے کا اتفاق تھا' لہٰذا خلفاء نے انتخابات کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ صحابہ کبار اور سرداران قبائل کو جمع کر لیں۔ یوں ایک ایسی مجلس شوریٰ قائم ہو جاتی جس سے زیادہ نمائندہ مجلس کا قیام ان حالات میں ناممکن تھا۔ اسلامی اور بالخصوص عربی معاشرے کا یہ نظام چونکہ خلافت راشدہ کے آخری زمانے تک قائم رہا' اس لئے خلفائے راشدین میں سے کسی نے یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ مجلس شوریٰ کی ہیئت ترکیبی میں کوئی ردوبدل کیا جائے۔

لیکن موجودہ اسلامی معاشرے کی ترکیب میں چونکہ قبائلی روابط کا کوئی خاص دخل نہیں (اور خدا کا شکر ہے کہ نہیں) لہٰذا بجز رائے عامہ کے ہمارے پاس اور کیا ذریعہ ہے جس سے اس امر کا پتہ چل سکے کہ ملت کے سواد اعظم کا رخ کس طرف ہے؟ زیادہ اہم معاملات میں رائے دہندگی استصواب عام کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ بہرحال ایسی باتوں میں جن کے متعلق روز کوئی نہ کوئی قانون وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے' آج تک انتخابات سے بہتر کوئی طریقہ ایجاد نہیں ہوا اور انتخابات کا مطلب ہے' ملت کا مختلف حلقوں کی طرف سے چند اشخاص کو اپنا نائب مقرر کرنا۔

یہ سارا معاملہ اس قدر واضح ہے کہ ہمارا اس کے متعلق کچھ کہنا لا حاصل تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثر مسلمانوں نے ابھی تک اس فرق کو نہیں سمجھا (اور یہ کوئی معمولی فرق نہیں) جو ہمارے اور صدر اسلام کے اسلامی معاشرے کی ہیئت ترکیبی میں پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر خلفائے راشدین کو بھی اپنے زمانے میں وہی حالات پیش آتے جو آج ہمیں درپیش ہیں تو انہیں بھی مجلس شوریٰ کی تشکیل میں انتخابات سے کام لینے میں کوئی تامل نہ ہوتا۔ بالفاظ دیگر یہ کہ ان کا اجتہاد بھی اس معاملے میں وہی ہوتا جو آج تیرہ سو سال کے بعد ہمارا ہے۔

تحقیق بالا کا تعلق مجلس شوریٰ کے طریق قیام ہی سے نہیں' ان ہدایات کا رجن کے ماتحت وہ کام کرے گی اور اس حیثیت سے بھی ہے جو اسے آج کل کسی اسلامی ریاست میں دی جائے گی۔ بات یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی چند سالوں میں خلفائے راشدین کو جن سادہ سادہ انتظامی اور قانونی امور سے سابقہ پڑا' ان کے ماتحت ''امرھم شوریٰ بینھم'' کے بارے میں ان کا تصور ہمارے آج کے تصور سے ایک حد تک مختلف تھا۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ اسلامی نظام اجتماع کی رو سے امور ریاست میں شوریٰ سے کام لینا ضروری ہے لہٰذا انہوں نے مجالس شوریٰ قائم کیں اور جب کبھی ضرورت پیش آئی' مشورے سے گریز نہیں کیا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ عامتہ الناس میں ابھی سیاسی شعور کا

Marfat.com

آغاز ہے اور اس لئے خدشہ تھا کہ ان کی رائے شاید قبائلی مفاد سے آگے نہ بڑھے۔ لہٰذا ان کا یہ فعل کہ اپنے مشیروں کی رائے قبول کریں یا نہ کریں' بڑی حکمت پر مبنی تھا۔ یوں بھی شاید اس وقت اس سے بہتر اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ بایں ہمہ خیال ہوتا ہے کہ امیر کو اپنے فیصلوں میں اس قسم کی بے روک ٹوک آزادی کا حق دینا ان اسباب میں سے ہے جو بڑی تیزی سے خلافت کے انحطاط کا باعث ہوئے۔ بے شک حضرت عمرؓ کی طرح ایک قوی اور دور اندیش انسان کے معاملے میں تو اس آزادی سے نہایت اچھے نتائج مترتب ہوئے لیکن جب بھی کسی کمزور حکمران نے فیصلے کی کوئی خطرناک غلطی کی تو اس سے خود خلافت کے نام پر دھبہ لگ گیا۔ مثال کے طور پر کیا معلوم کہ اگر حضرت عثمانؓ کے عہد حکومت میں رائے عامہ کے مطابق قائم کردہ مجلس شوریٰ کے فیصلوں کو (قانوناً) واجب التعمیل ٹھہرایا جاتا تو اسلام کی ساری تاریخ کا انداز کچھ اور ہوتا۔

اس قیاس کا جواب جس طرح چاہے دے لیجئے' ہمارا یہ خیال یقیناً غلط ہے کہ ہم جس کسی کو امیر منتخب کریں گے وہ اصابت رائے اور حکمت ودانائی میں اسی صفت سے متصف ہوگا جو حضرت عمرؓ میں پائی جاتی تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی عظیم شخصیتوں کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے' علیٰ ہٰذا یہ کہ منتظمین ریاست کو اپنی مرضی پر چھوڑ دیا جائے تو وہ (خواہ کوئی زمانہ اور کوئی ملت ہو) بڑی خطرناک غلطیاں کر بیٹھتے ہیں' لہٰذا انہیں اپنی مرضی پر چھوڑ دینا ٹھیک نہیں۔ تاریخ کا یہ ناقابل انکار سبق کبھی نہ بھولئے کہ جو قوم اس بارے میں غفلت کرتی ہے' وہ اپنی ہستی کو آپ ہلاکت میں ڈالتی ہے۔

پھر یہ خیال کرنا بھی غلط ہے کہ ریاست کی جو شکل خلفائے راشدین نے قائم کی' نیز انتظامی امور میں جن طریقوں سے کام لیا' ان سے ریاست کی ساری جزئیات کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے احتوا ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اسلام کی دعوت بھی صرف یہ ہوتی کہ ہم ایک ہی بات کو دہراتے رہیں کیونکہ اس صورت میں ہمارے لئے سوائے اس کے اور کوئی کام نہ رہ جاتا کہ اسلام نے جو کچھ کیا ہے' اس کا تکرار کرتے رہیں۔ حالانکہ اسلام روحانی اور اجتماعی ہر اعتبار سے ایک دعوت ہے مسلسل ترقی کی۔

تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ خلافت راشدہ ایک نہایت ہی شاندار ابتدا تھی اسلامی ریاست کی' جس سے نہ کوئی آگے بڑھ سکا اور جس کا سلسلہ نہ آئندہ صدیوں میں جاری رہا۔ بایں ہمہ وہ صرف ایک ابتدا تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے آغاز سے حضرت علیؓ کی شہادت تک اسلامی ریاست کی ہیئت ترکیبی لگاتار بدلتی رہی اور اس میں ہر نئی فتح اور ہر نئے انتظامی مشاہدے کے ساتھ بتدریج نشوونما ہو رہا تھا۔ آنحضرت صلعم کی وفات کو ابھی مشکل سے دس بیس سال گزرے تھے کہ دولت اسلامیہ کے حدود جزیرۃ العرب کے چند علاقوں سے لے کر بحر اطلانطک اور وسط ایشیا میں دور دور تک پھیل گئے۔ اس طرح جو عظیم الشان مملکت قائم ہوئی ہو وہ اس ریاست سے جو ابتدا میں صرف زراعت پیشہ اور گلہ بان جماعتوں پر مشتمل تھی اور جن کی ضروریات محدود اور وسائل تقریباً ہمیشہ ایک سے رہتے' دفعتہ بازنطینی اور ساسانی ایسی پیچیدہ تہذیبوں کا وارث بن گئی۔ اب ہر روز انتظامی اور معاشی امور میں نئے نئے مسائل پیدا ہوتے اور حکومت مجبور تھی کہ بعض صورتوں میں جو فیصلہ کرے' عین اس موقع پر کرے جب کوئی مسئلہ پیش آئے۔ لہٰذا

Marfat.com

اس قسم کے بعض فیصلوں کی حیثیت محض تجربے کی تھی اور مختصراً یہ کہ اس ترقی کی رفتار اتنی تیز اور ہمہ گیر کہ حکومت کو اپنی ساری طاقتیں فوجی استحکام اور اقل قلیل انتظامی کارکردگی تک محدود رکھنا پڑیں۔

ان حالات میں خلفائے راشدین کے پاس نہ اتنا وقت تھا اور نہ اتنی فراغت کہ ایک مبسوط سیاسی نظریہ وضع کرتے اور اسے کوئی عملی شکل دیتے۔ پھر "امرھم شوریٰ بینھم" کا جو اصول قرآن مجید نے پیش کیا' ایسا انقلاب انگیز اور حکومت کے مروجہ طور وطریق سے اس قدر مختلف تھا کہ خلافت راشدہ میں بھی اسے بایں ہمہ ذہانت وفطانت یک بیک کسی صاف وصریح دستوری ضابطے کی شکل نہ دی جا سکی۔ لہٰذا اس زمانے میں شوریٰ کا نظام ایک تجربے تک محدود رہا۔ وہ اس کا انتہائی ارتقا نہیں تھا۔ ہاں اگر خلافت کا اندرونی نشوونما خلفائے راشدین کے قائم کردہ نہج پر جاری رہتا تو یہ ابتدائی تجربہ بھی تھوڑے دنوں میں اپنی پوری شان سے ہمارے سامنے آ جاتا' مگر ایسا نہیں ہوا۔ حضرت معاویہ اور ان کے جانشینوں کے ماتحت استبداد اور مطلق العنانی کا جو دور اچانک شروع ہو گیا تھا' اس نے اسلامی نظام اجتماع کے تمام اصولوں کو پس پشت ڈال دیا اور ہمارے لئے بجز ایک تجربے کے جس کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا' اور کچھ نہ رہا۔

اس عظیم الشان تجربے سے آگے نہ بڑھنا اور یہ کوشش کرنا کہ خلفائے راشدین کے تیرہ سو سال بعد ہم اپنی ریاست کی تشکیل بعینہ اس شکل میں کریں جو ان (خلفاء) کی ریاست نے گویا بطور آزمائش اختیار کی' کوئی دینداری کی بات نہیں' بلکہ خلفاء کی تخلیقی کوششوں سے انحراف۔ وہ ہمارے پیش رو تھے اور انہوں نے ہمارے لئے راستہ تلاش کیا۔ لہٰذا اگر ہم صدق دل سے ان کے نقش قدم پر چلنے کے خواہش مند ہیں تو ہمیں چاہیے کہ اس کام کو جس کے اتمام کا انہیں موقع نہیں ملا' ان ہی کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق جاری رکھیں تاکہ دنیا بھر میں اللہ کی حکومت قائم ہو جائے لیکن اگر ہم اس فریضے کی ادائیگی سے قاصر رہے جیسا کہ ہم سے پہلے کئی نسلیں قاصر رہیں اور گذشتہ شان وشوکت کے تصور میں اپنے آپ کو بہلائے رکھا یا یہ سمجھتے رہے کہ ہمارا کام صرف پچھلے تجربوں کو دہرانا ہے' تو اس کا مطلب گویا یہ ظاہر کرنا ہے کہ ابھی دنیا اسلام کے لئے تیار نہیں۔

شوریٰ

لہٰذا "امرھم شوریٰ بینھم" کے متعلق ہم نے جو بحث کی ہے' اس کا ماحصل یہ ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں صاف صاف بتا دیا ہے کہ مسلمان اپنی ریاست اور ملت کا ہر امر مشورے سے طے کریں' لہٰذا ہر اسلامی ریاست شرعاً ایک مجلس شوریٰ قائم کرنے کی مکلف ہے۔

۲۔ لفظ "منکم" کا اشارہ سب مسلمانوں یعنی پوری ملت کی طرف ہے' لہٰذا اس مجلس کے ارکان وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو فی الواقعہ ملت کے نمائندہ ہوں۔ اس قسم کی نمائندگی کا حق صرف عام اور آزادانہ انتخابات ہی کے ذریعے ادا کیا جا سکتا ہے اور اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان ارکان کا منتخب ہونا ضروری ہوگا۔ بایں ہمہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ساری ملت مجلس شوریٰ کا انتخاب نہ کرے بلکہ اس مجلس کو خود امیر ہی جس کا انتخاب رائے عامہ کے ماتحت عمل میں آیا تھا' اپنی مرضی سے نامزد کر دے تب بھی وہ ملت کی ترجمانی کر سکتی ہے لیکن اس خیال کی غلطی اسی وقت ظاہر ہو جاتی ہے جب ہم یہ

Marfat.com

دیکھتے ہیں کہ مجلس شوریٰ کا طریق قیام بھی ریاست کے امور مہمہ میں شامل ہے۔ پس اگر ہم اس ارشاد ربانی کے قائل ہیں جیسا کہ ہمیں یقیناً ہونا پڑے گا کہ مسلمانوں کے امور مشورے سے طے ہوں تو اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ مجلس شوریٰ کی ترکیب کا معاملہ بھی ساری امت تک وسیع اور براہ راست مشورے سے طے کرنے کا ہے۔ آج کل اس طرح کا مشورہ صرف انتخاب ہی کے ذریعے ممکن ہے جس میں ہر امیدوار کے خصائل علی الاعلان زیر بحث آتے ہیں اور جسے ہر شخص اپنے اپنے خیال کے مطابق رائے دیتا ہے۔ رہا طریق انتخاب' سو یہ معاملہ ملت کے اپنے اجتہاد سے طے کرنے کا ہے۔

۳۔ قرآن مجید کی رو سے وضع قوانین کا عمل شوریٰ کا مترادف ہے کیونکہ بفحوائے آیہ کریمہ ''امرھم شوریٰ بینھم ''ان کا امر (ریاست کے معاملات) کیا ہے۔ ان کا مشورہ۔ لہٰذا مجلس شوریٰ کے ہر قانونی فیصلے کی حیثیت اختیاری نہیں ہوگی کہ اہل حکومت چاہیں تو اس پر عمل کریں اور چاہیں تو رد کر دیں۔ برعکس اس کے حکومت ان کے نفاذ پر مجبور ہوگی۔

۴۔ ''بینھم'' کے ماتحت امیر کی ذات بھی واضعان قانون میں شامل ہو جاتی ہے کیونکہ اس نے یہ عہدہ بذریعہ انتخاب حاصل کیا تھا اور اس لئے وہ ملت کا سب سے پہلا نمائندہ ہے۔ پھر چونکہ وہ سر ریاست اور اس لئے باصطلاح قرآنی ہر امر کا مرکز ہے' اس لئے وہ مجلس شوریٰ کا ایک عام رکن نہیں بلکہ اس کا صدر تصور کیا جائے گا۔ اس کا حق ہے کہ خود یا کسی مندوب کے ذریعے مجلس شوریٰ کی صدارت اور اس کی سرگرمیوں کی رہنمائی کرے۔ یہ خاص اضافہ ہے جو اسلام نے ہمارے سیاسی نظریات میں کیا اور جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے ریاست کے نظم و نسق میں اس کے تنفیذی اور قانون ساز پہلوؤں کو ایک دوسرے سے قطعاً الگ الگ نہیں رکھا۔ برعکس اس کے یہ دونوں پہلو امیر کی ذات میں باہم جمع ہو گئے ہیں کیونکہ امیر کے تنفیذی وظائف بہ حیثیت امیر اور قانون ساز وظائف بہ حیثیت صدر مجلس شوریٰ ایک دوسرے پر موقوف ہیں۔ راقم الحروف کے نزدیک صرف یہی ایک صورت ہے جس میں اسلام کے حکم **''امرھم شوریٰ بینھم''** پر پورا عمل کیا جا سکتا ہے۔

ان نتائج کی بنا پر ہمارے دستور میں ایک دفعہ یہ ہونی چاہیے:

> ''ریاست کے اختیارات قانون سازی مجلس شوریٰ کے ذمہ ہوں گے اور ملت اس کے ارکان کا آزادانہ انتخاب کرے گی۔ مجلس کو حق ہے کہ تمام ایسے امور میں جو شرعاً مباح ہیں' قانون وضع کرے۔ اس کی صدارت امیر یا ارکان مجلس میں سے امیر کا کوئی مندوب کرے گا۔ مجلس جو قانون وضع کرے گی' حکومت اس کے نفاذ پر مجبور ہوگی۔''

رہا یہ امر کہ مجلس اس خدمت پر کس عرصے تک مامور رہے گی' اس سے بحث کرنا لاحاصل ہے کیونکہ شریعت نے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ گویا اس کا شمار پھر ان امور میں کرنا چاہیے جن میں مجلس دستور ساز جیسا چاہے فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔ ہم اس سے پہلے یہی بات انتخابات کے بارے میں عرض کر آئے ہیں۔ بایں ہمہ ہماری اس سلسلے میں ایک

Marfat.com

تجویز ہے۔

نبی صلعم کی بعض احادث پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کے کسی انتخابی منصب یا عہدے کے لئے اپنا نام آپ پیش کرنا ممنوع ہے۔ مثلاً جب حضرت ابوموسیٰ اشعری نے ایک عہدے کی درخواست کی تو آپ نے بزور فرمایا۔ ''واللہ ہم اس عہدے پر کسی ایسے شخص کو مقرر نہیں کریں گے جو اس کی درخواست کرے یا جسے اس کی حرص ہو'' (بخاری اور مسلم عن ابی موسیٰ)۔ اس کے علاوہ اور بھی معتبر حدیثیں جن میں تقریباً ایسا ہی ارشاد ہوا' لہٰذا یہ امر اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہوگا اگر ہم اپنے دستور میں صاف صاف کہہ دیں:

''جو کوئی حکومت کے کسی منصب یا انتخابی مجلس کی رکنیت کے لئے اپنا آپ پیش کرے گا' وہ اس تقرر یا انتخاب کا خود بخود نااہل قرار دیا جائے گا۔''

اس قانون سے وہ سب سے بڑا اعتراض بھی رفع ہو جائے گا جو آج کل کے نیابتی (پارلیمنٹی Parliamentary) نظام حکومت کے خلاف کیا جاتا ہے۔ بحالت موجودہ ایک دولت منداور بارسوخ شخص کا خواہ اس کی ذاتی قابلیت کچھ بھی ہو ذرا سے اثر سے کام لے کر کسی مجلس قانون ساز کا رکن منتخب ہو جانا آسان ہے' لیکن قانون بالا کے ماتحت ان تمام کوششوں سے خواہ وہ بالواسطہ ہوں یا بلاواسطہ' امیدوار مذکور انتخاب کا نااہل قرار دیا جائے گا' لہٰذا صرف وہی لوگ کامیابی کی امید رکھ سکیں گے جن کو رائے دہندگان فی الواقعہ احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جو خود بھی ان سے کسی امداد کے طالب نہیں' لیکن اس کے باوجود ممکن ہے کہ ایک دولت مند، گو ویسے نا قابل امیدواریوں دیکھنے میں تو ذاتی رائے طلبی (Self-canvassing) سے احتراز کرے' لیکن دوسروں کے ذریعے اپنا پراپیگنڈہ جاری رکھے۔ پھر بھی ایسے امیدواروں کو چونکہ خود تو انتخابی تقریریں کرنے یا جلسوں میں حصہ لینے کی اجازت نہ ہوگی' اس لئے ان کا کامیاب ہونا مشکل ہو جائے گا۔ بہر حال ہم اس امر کے لئے کہ صرف وہی لوگ مجلس شوریٰ میں آئیں جو حقیقتاً اس کے اہل ہیں' یہ بھی کر سکتے ہیں کہ مجلس دستور ساز بالواسطہ (Indirect) انتخابات کا طریقہ رائج کر دے۔ مثال کے طور پر یہ کہ منتخب ارکان محض عام انتخاب کی بنا پر مجلس شوریٰ کے رکن متصور نہیں ہوں گے۔ یہ صرف ابتدائی انتخاب ہوگا تا کہ امیر یوں منتخب شدہ حضرات میں سے مجلس شوریٰ کے ارکان کا آخری انتخاب خود اپنی رائے سے کرے۔ اس طریق انتخاب کے دو فائدے ہیں۔ اول یہ کہ ابتدائی انتخاب میں حصہ لینے والے امیدواروں کو اس امر کا یقین نہیں ہوگا کہ وہ اس کے آخری امتحان سے بھی نکل جائیں گے یعنی امیر کی نظر انتخاب فی الواقعہ انہیں پر پڑے گی اور اس لئے بہت کم امیدوار کوشش کریں گے کہ رائے دہندگان کو بالواسطہ یا بلاواسطہ رشوت دے کر اپنی طرف مائل کریں۔ ثانیاً اس طرح جو مجلس قائم ہوگی وہ اس قسم کی انتخابی مجالس کی نسبت جیسا کہ آج کل دیکھنے میں آتا ہے' مختصر بھی ہوگی اور زیادہ اہل بھی۔ مزید برآں امیر کا یہ اختیار کہ ابتدائی انتخاب میں کامیاب ہونے والے امیدواروں میں سے حسب منشا مناسب ارکان کا انتخاب کرے۔ ''امرھم شوریٰ بینھم'' کے عین مطابق یعنی ایک ''مشورہ'' ہوگا' منتخب شدہ امیر اور ملت کے درمیان۔

Marfat.com

مجلس شوریٰ کے طریق کار کے متعلق ابھی ہمیں چند باتیں اور کہنا ہیں۔

جیسا کہ قانون ساز مجالس کا قاعدہ ہے' اس مجلس کے فیصلے بھی کثرت رائے سے کئے جائیں گے۔ عام باتوں میں محض اکثریت اور غیر معمولی باتوں مثلاً امیر کے عزل (جس سے ہم آگے چل کر بحث کریں گے) یا اعلان جنگ وغیرہ کا معاملہ ہو تو دو تہائی بلکہ تین چوتھائی اکثریت سے۔

لیکن مغرب کے نام نہاد جمہوری نظامات کی ناکامی کو دیکھتے ہوئے آج کل اکثر مسلمانوں کو یہ بات کچھ بہت زیادہ پسند نہیں کہ ایک اسلامی ریاست بھی وضع قانون کے معاملے میں رائے شماری سے کام لے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جو بات کثرت رائے سے طے ہو' اس کا فی الواقعہ صحیح ہونا ضروری نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ بعض موقعوں پر اکثریت خواہ اس کی تعداد کتنی بھی اور نیت کیسی بھی نیک ہو' غلط فیصلہ کرے۔ برعکس اس کے اقلیت باوجود اقلیت کے اپنی رائے میں درست اور حق بجانب ہو سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس استدلال کی صحت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ انسان سے ہر وقت غلطی سرزد ہو سکتی ہے اور یوں بھی وہ ہمیشہ حق و انصاف کے تقاضوں پر عمل نہیں کرتا۔ تاریخ ان مثالوں سے بھری پڑی ہے جب ایک حماقت زدہ اکثریت نے مخالفین کی تنبیہ کے باوجود غلط فیصلے کیے' لیکن سوال یہ ہے کہ جو حضرات کثرت رائے کی بنا پر کوئی فیصلہ کرنے کے خلاف ہیں' وہ اس کا کیا بدل پیش کرتے ہیں۔ اس امر کا کون مجاز ہوگا کہ ہر بات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بتلائے کہ مجلس شوریٰ میں اکثریت حق پر تھی یا اقلیت؟ آخر میں فیصلہ کسی کی رائے سے ہوگا؟ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ آخری فیصلہ امیر کا ہونا چاہیے لیکن قطع نظر اس بات سے کہ کسی شخص کو اپنے اختیارات میں مطلق العنان چھوڑ دینا ''امرھم شوریٰ بینھم'' کے (جس پر شریعت نے اس درجہ اصرار کیا ہے) خلاف ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود امیر کی رائے غلط اور اکثریت کی ٹھیک ہو۔ امیر کی درستی رائے کی منجانب اللہ تو کوئی ضمانت دی نہیں گئی۔ ان سوالات کے جواب میں شاید یہ کہا جائے کہ جب ہم امیر کا انتخاب کریں گے تو اس بات کا لحاظ رکھ لیں گے کہ وہی شخص منتخب ہو جو سب سے زیادہ نیک اور دانا ہے۔ لہٰذا اس کی دانائی اور نیکی ہی اس امر کی ضمانت ہے کہ اس کا جو فیصلہ ہوگا صحیح ہوگا۔ ٹھیک، لیکن اس طرح تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مجلس شوریٰ کے انتخاب میں بھی یہی اصول مدنظر رہے گا کہ اس کے لئے صرف نیک اور دانا ہستیوں کا انتخاب کیا جائے۔ اندریں صورت کیا یہ اس امر کی ''بہت کافی ضمانت'' نہیں کہ ان کے قانونی فیصلے ہمیشہ درست ہوں؟ ہرگز نہیں، کیونکہ ''بہت کافی ضمانت'' خواہ اس کا تعلق امیر سے ہو یا مجلس سے کبھی پوری پوری اور کامل ضمانت کی قائم مقام نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کی کاملیت انسانی دسترس سے باہر ہے۔

حقیقتاً انسانی دل و دماغ نے مجتمعہ فیصلوں کے لئے کثرت رائے سے بہتر کوئی اصول وضع ہی نہیں کیا بلکہ یہ خیال ہے کہ اس سے بہتر اصول شاید کبھی وضع نہیں ہوگا۔ اگر اکثریت غلطی کر سکتی ہے تو اقلیت بھی۔ آپ کسی پہلو سے دیکھئے، انسان بالطبع غلطیاں کرتا ہے اور ہمیشہ کرتا رہے گا' لہٰذا ضروری ہے کہ غلطی کو زندگی کا ایک جزو لازم تسلیم کر لیا جائے۔ ہم جو کچھ سیکھتے ہیں غلطی، آزمائش اور اصلاح ہی کی بدولت سیکھتے ہیں اور یہی فی الحقیقت معنی ہیں ترقی کے۔

Marfat.com

نافذہ

اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے آیت قرآنی "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول اولی الامر منکم " کی طرف اشارہ کریں گے۔اوپر کی بحث سے ثابت ہو جاتا ہے کہ قانون سازی کے معاملات میں مجلس شوریٰ ہی (جس کی صدارت امیر کے ذمے ہے) اولوالامر کی قائم مقام ہوگی۔امور تنفیذی میں البتہ سر ریاست بہ حیثیت رئیس حکومت خود ذوالامر ہے۔اس سے یہ ماننا لازم آئے گا کہ امیر کو جملہ تنفیذی اختیارات حاصل ہیں ورنہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں سے یہ کہنا کہ امیر کی اطاعت کریں' بے معنی ہو جاتا ہے۔لہٰذا مجلس شوریٰ کو اگر چہ یہ تو اختیار ہوگا کہ ایسے قوانین وضع کرے جن کے مطابق ملک میں حکومت کی جائے گی لیکن اس کے روزمرہ نظم ونسق اور عملداری میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہوگا۔شرعی نقطۂ نظر اس امر کے خلاف ہے کہ ریاست کو حکومت کا کوئی اختیار نہ دیا جائے۔گویا اس کی حیثیت صدر فرانس یا شاہ انگلستان کی طرح محض کٹ پتلی کی ہو لیکن یہ وہ بات ہے جس پر ہم غور بھی نہیں کریں گے۔البتہ امیر کو پورے پورے اختیار دینے کے باوجود یعنی اگر یہ بات طے شدہ ہو کہ سر ریاست ہی سر حکومت ہوگا سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا وظائف حکومت امیر اور صرف امیر کے ذمے ہوں گے یا بالاشتراک مثلاً ایک کابینہ (Cabinet) وزراء کی مدد سے جو مجلس شوریٰ کی مختلف جماعتوں کے نمائندہ اور اپنے اعمال وافعال کے لئے اس کی اعتماد رائے کے محتاج ہیں' ادا ہوں؟

فرض کیجئے ہماری دستور ساز مجلس دوسری صورت اختیار کرتی ہے۔اندریں صورت ہمارے امیر کی مثال وہی ہو گی جو اکثر مغربی جمہوریتوں میں وزیر اعظم کی ہے (جیسے انگلستان میں)۔پہلی صورت میں البتہ امیر صدر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مشابہ ہوگا جس کی ذات میں سر ریاست اور سر حکومت کو دوگونہ حیثیتیں جمع ہیں۔شریعت میں ان دونوں صورتوں کے متعلق کوئی صاف وصریح حکم موجود نہیں' لہٰذا یہ ہمارا کام ہے کہ جی چاہے تو جملہ اختیارات نافذہ امیر کو سونپ دیں مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس پر مجلس شوریٰ کے (جس کا وہ خود ہی صدر ہے) قانونی فیصلوں کی پابندی لازم ہوگی۔یا جی چاہے تو یہ طے کریں کہ ان اختیارات میں وزراء کا ایک کابینہ اس کا شریک ہوگا جو مجلس کی طرف سے اس خدمت پر مامور اور اس کے سامنے جواب دہ ہیں' لیکن عقل کہتی ہے کہ امیر اور مجلس شوریٰ کے درمیان وظائف نافذہ کی اہلیتوں اور ذمہ داریوں کی اس تقسیم سے امیر کی حیثیت بے معنی ہو جائے گی کیونکہ ایک طرف تو اسے بہ حیثیت امیر حاکم اور ذوالامر تسلیم کرنا پڑے گا۔دوسری جانب اختیارات نافذہ میں وزراء کا ایک کابینہ جو آخر آخر مجلس شوریٰ کے سامنے جواب دہ ہے' اس کا شریک ہوگا۔پھر قطع نظر ان انتظامی مشکلات کے جو اس نظام کا خاصہ ہیں' اس سے قدرتاً حکومت کو اپنی حکمت عملی میں ہمیشہ مختلف جماعتوں کے مختلف بلکہ بعض صورتوں میں متصادم لائحہ ہائے عمل کے درمیان مفاہمت (لگاتار مفاہمت) سے کام لینا پڑے گا اور اس لئے ناممکن ہے کہ اس میں وہ تصوری یک جہتی اور داخلی تسلسل پیدا ہو سکے جو ایک اسلامی ریاست کے لئے ناگزیر ہے۔

پھر ہر سیاسی جماعت کے بدلتے ہوئے لائحہ عمل اور دوسری سیاسی جماعتوں کے لائحہ ہائے عمل کے درمیان

Marfat.com

مفاہمت کا ذریعہ ڈھونڈتے رہنا ایک ایسی خرابی ہے جسے مغرب کی نام نہاد جمہوریتیں جو بجائے خود کسی نظام تصورات کی پابند نہیں اور اس لئے مجبور ہیں کہ جیسے بھی حالات ہوں اپنے ہر سیاسی فعل میں معروف و منکر کے متعلق لوگوں کے افادیت پسند نظریوں کا لحاظ رکھیں، ناگزیر سمجھ کر برداشت کر رہی ہیں لیکن ایک تصوری ریاست میں جہاں معروف و منکر کا تصور کسی ''مصلحت'' کا پابند نہیں اسے کیونکر برداشت کیا جاسکتا ہے؟ اس ریاست میں تو وضع قوانین کیا انتظامی حکمت عملی میں بھی اس داخلی تسلسل اور ان اصولوں کی ترجمان لازم ٹھہرتی ہے جن پر ساری ملت کا پہلے ہی سے اتفاق ہے لہٰذا اگر حکومت کے اختیارات تنفیذ اور روزمرہ سرگرمیاں جماعتوں کی ہر لحظہ بدلتی ہوئی سیاست کی نذر ہو گئیں جو ایک مرض کی طرح آج کل مغرب کو کھائے جا رہا ہے تو ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا مگر اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ اسلامی نظام اجتماع کو سیاسی ''جماعتوں'' (Parties) کا وجود ہی گوارا نہیں۔ جب تک اس امر کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ آزادی رائے اور آزادی تنقید ہر شہری کا طبعی حق ہے (جیسا کہ اسلام کا تصور سیاست بلاشبہ کرتا ہے) لوگوں کو اختیار ہوگا کہ اگر چاہیں تو ریاست کی حکمت عملی کے متعلق اپنی اپنی رائے کے مطابق خیالات کی اشاعت کے لئے الگ الگ جماعتیں بنا لیں۔ پھر جب تک یہ خیالات ان تصورات (یعنی شریعت) کے منافی نہیں ہوں گے جن پر ریاست کی بنا ہے ان کو حق ہوگا کہ مجلس شوریٰ کے اندر اور باہر ان کی صحت پر استدلال کر سکیں۔ بایں ہمہ جماعت سازی کی یہ آزادی اس حد تک نہیں بڑھے گی کہ حکومت کے روزمرہ وظائف میں مخل ہو لیکن اگر وزراء اپنی اپنی جماعت کی طرف سے اس خدمت پر مامور اور صرف اسی کے سامنے جواب دہ رہے تو یقیناً ہوگی۔

لہٰذا ریاست کے اسلامی مصالح کا تقاضا ہے کہ حکومت کے اختیارات تنفیذ صرف ایک شخص یعنی امیر کے ذمے ہوں اور وہی اس کی حکمت عملی کا مجلس شوریٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ یوں ایک ہی وقت میں سر ریاست اور واقعی طور پر سر حکومت کی حیثیت سے وہ اپنے اختیارات تنفیذ میں ایک آزادانہ قائم شدہ کابینہ وزراء کا حصہ دار نہیں رہے گا بلکہ خود وزراء کی حیثیت (ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرح) اس کے ''معتمدین'' (سیکرٹریوں) سے زیادہ نہ ہوگی جن کا تقرر وہ اپنی سمجھ سے کرے گا اور جو صرف اس کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ اس طرح حکومت جماعتی سیاسیات کے مضر اثرات سے بڑی حد تک محفوظ ہو جائے گی اور اس اصول پر بھی عمل ہوتا رہے گا کہ حکومت مجلس شوریٰ کے منظور کردہ قوانین پر چلے۔

جیسا کہ ہم اوپر عرض کر آئے ہیں شریعت نے کہیں بھی واضح طور پر حکومت کی اس شکل کو روا نہیں رکھا لیکن بعض احادیث کے الفاظ ایسے ہیں جن سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم کے نزدیک اسلامی نظام اجتماع کی رو سے سر ریاست اور سر حکومت کے وظائف کا ایک ہی شخص کی ذات میں (جسے آپ نے کبھی امیر اور کبھی امام کے نام سے موسوم کیا) جمع ہونا زیادہ مناسب ہے۔ ان احادیث میں سے کچھ یہ ہیں:

رسول اللہ صلعم نے فرمایا ''جو کوئی اپنے دل سے اور اپنا ہاتھ دے کر امام کی بیعت کرتا ہے وہ جب تک ممکن ہو اس کی اطاعت کرے (یعنی جب تک امام کوئی ایسا حکم نہ دے جو شریعت کے خلاف ہے) پھر اگر کوئی شخص امام کا حق

Marfat.com

غصب کرنے کی کوشش کرے تو اس کو قتل کر دو'' (مسلم عن عبداللہ بن عمرو)۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا ''جب تم ایک شخص کے حکم کے نیچے جمع ہو گئے اور پھر کوئی شخص کوشش کرتا ہے کہ تمہاری طاقت کو توڑے اور تمہارے اتحاد میں انتشار پیدا کرے تو اسے قتل کر ڈالو'' (مسلم عن عرفجہ)۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا ''جب اللہ کسی امیر کا بھلا چاہتا ہے تو اسے ایک نیک وزیر عطا کر دیتا ہے تاکہ جب امیر بھولے تو وزیر یاد دلا دے اور جب امیر یاد رکھے تو اس کی امداد کرے' لیکن اگر اللہ اس کا بھلا نہیں چاہتا تو اسے بدعمل وزیر دیتا ہے جو اس کے بھول جانے پر اس کو یاد نہیں دلاتا اور اگر یاد رکھے تو امداد نہیں کرتا'' (ابوداؤد، نسائی، عن عائشہ)۔

یہ اور اس قسم کی اور احادیث کے اس عام حکم کے بالکل مطابق ہیں کہ جب مسلمانوں کو جماعتی حیثیت سے کوئی اہم کام درپیش ہو تو اپنے اندر سے ایک امیر چن لیں' لہٰذا اگر ہم بھی اپنی ریاست کے جملہ اختیارات تنفیذ امیر کے ذمے کر دیتے ہیں جیسا کہ بمحاورہ عامہ ''امریکی طریقہ حکومت'' میں کیا جاتا ہے تو یہ گویا اسی اصول پر عمل کرنا ہوگا جسے آنحضرت صلعم نے اس زمانے میں وضع کیا جب ابھی امریکہ کا کسی کو علم بھی نہیں تھا اور یہ بجائے خود اتنی اہم بات ہے کہ مجلس دستور ساز کو اس امر کا آخری فیصلہ کرتے ہوئے ضرور بالضرور اپنے ذہن میں رکھنا چاہیے' لیکن ابھی ایک اور دلیل ہے جسے ہم اس طریقہ حکومت کی تائید میں پیش کریں گے۔

ہمیں معلوم ہے کہ اسلامی ریاست میں ''اولی الامر'' صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو مسلمان ہوں۔ اب اگر ریاست کے اختیارات نافذہ جماعتی نیابت کے اصول پر مجلس وضع قوانین سے چنے ہوئے وزراء کے ایک کابینہ کو تفویض کر دیئے جائیں (یورپ کی اکثر جمہوریتوں کی طرح) تو یہی وزراء ہوں گے جو امیر کے ساتھ مل کر بہ حیثیت اولوالامر تنفیذی وظائف ادا کریں گے، کیونکہ وہ مجلس وضع قانون کی طرف سے اس خدمت پر مامور ہیں۔ اندریں صورت اگر کوئی غیر مسلمان وزراء میں شامل ہوا تو اس سے شریعت کے اس صاف وصریح حکم کی خلاف ورزی ہوگی جس کو ہم ابھی اوپر بیان کر آئے ہیں (یعنی اولی الامر کا مسلمان ہونا ضروری ہے)' لہٰذا ملت کے سامنے دو راستے ہوں گے' یا تو ہر غیر مسلم شہری کو از روئے آئین عہدہ وزارت کے نااہل قرار دینا (جس سے شاید ان کا وفاداری کے ساتھ ریاست سے تعاون کرنا مشکل ہو جائے) یا شریعت کے ایک بنیادی قانون سے بلا تامل روگردانی (جو گویا ریاست کے اسلامی تصور کا سرے سے انکار کرنا ہے)۔ برعکس اس کے اگر جملہ اختیارات حکومت امیر کی ذات میں جمع کر دیئے جائیں تو صرف وہی تن تنہا اولی الامر اور حکومت کی تنفیذی روش کا ذمہ دار ہوگا۔ اس صورت میں وزراء کی حیثیت محض اس کے معتمدین کی ہوگی جن کا تقرر اس کی مرضی سے ہوگا اور جن کے ذمے وہ اپنے انتظامی فرائض میں سے کچھ تفویض بھی کر دے گا۔ پھر چونکہ یہ ذمہ داری وزراء کی نہیں ہوگی کہ ریاست کی حکمت عملی کیا ہے' اس لئے ان پر اولی الامر کا اطلاق بھی نہیں ہو سکے گا۔ اندریں صورت اگر کسی غیر مسلم کو وزارت کا عہدہ دے دیا جائے تو از روئے شریعت اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

Marfat.com

ہمارے یہاں (بالخصوص مشرقی پاکستان میں) چونکہ غیر مسلم اقلیتیں موجود ہیں' اس لئے محض یہ امر اس بات کا مقتضی ہے کہ ہم اپنے دستور میں ذیل کی ایک دفعہ شامل کرلیں۔

''امیر رئیس حکومت ہوگا اور امور حکومت کے لئے بھی وہی مجلس شوریٰ کے سامنے جواب دہ تصور کیا جائے گا۔ امیر ہی اپنی سمجھ سے وزراء کا تقرر اور برطرفی کرے گا۔ وزراء اس کے معتمدین (Secretaries of State) کی حیثیت سے کام کریں گے اور صرف اس کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔''

دستور کی محافظت

جونہی امیر کا انتخاب ہوا اور اس نے شریعت اسلامی کے مطابق حکومت کرنے کا حلف اٹھایا' مسلمانوں پر اس کی اطاعت شرعاً فرض ہو جائے گی کیونکہ نبی صلعم کا ارشاد ہے ''جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جو میری نافرمانی کرتا ہے وہ اللہ کی نافرمانی کرتا ہے جو میرے امیر (یعنی میرے احکام کے مطابق حکم کرنے والے) کی اطاعت کرتا ہے وہ میری اطاعت کرتا ہے اور جو اس کی نافرمانی کرتا ہے وہ میری نافرمانی کرتا ہے'' (بخاری، عن ابی ہریرہ)۔

لہٰذا بحیثیت افراد شہریوں کے لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ امیر کی اطاعت کریں یا نہ کریں۔ ایک دفعہ جب ملت نے طے کرلیا کہ زمام حکومت کسی ایک شخص یا متعدد اشخاص کے ہاتھ دے دی جائے تو ہر شہری کا فرض ہے کہ اخلاقاً اور قانوناً اس فیصلے کا احترام کرے' خواہ ذاتی طور سے وہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس مضمون کی کئی صحیح حدیثیں موجود ہیں کہ آنحضرت صلعم نے ملت کے متفقہ فیصلوں کے خلاف بغاوت تو کیا، خاموشی سے الگ تھلگ رہنے تک کی شدید مذمت کی ہے۔ پھر یہ سب احادیث گویا آپ کے اس ارشاد میں جمع ہیں ''جو کوئی جماعت سے الگ ہو (من فارق الجماعة) جاہلیت کی موت مرا'' (مسلم، عن ابی ہریرہ)۔

گویا ایک صحیح طور پر قائم شدہ اسلامی حکومت کی اطاعت ہر مسلمان کا فرض اولین ہے اور شہریت کے اس اصول کے عین مطابق جسے ہر تہذیب یافتہ معاشرے میں بنیادی قرار دیا جاتا ہے' لیکن یہاں ایک بات خاص طور پر اہم ہے اور وہ یہ کہ اسلامی نظام اجتماع کے اندر اطاعت کا یہ فریضہ صرف اس وقت تک فریضہ تصور کیا جاتا ہے جب تک حکومت (یا امیر) کے کسی عمل سے شریعت کی خلاف ورزی نہ ہو، یعنی جب تک حکومت کوئی ایسا حکم نہ دے یا ایسی باتوں کو قانوناً جائز نہ ٹھہرائے جو شریعت کے نزدیک ممنوع ہیں یا ایسی باتوں سے روکے جن کا شریعت نے حکم دیا ہے۔ اس صورت میں حکومت کی اطاعت ملت پر فرض نہیں رہتی جیسا کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ''معاصی میں کوئی اطاعت نہیں، اطاعت صرف معروف میں ہے'' (بخاری اور مسلم، عن علی)۔ ''سننا اور اطاعت کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے خواہ وہ اسے پسند کرے یا ناپسند بشرطیکہ اسے گناہ کرنے کے لئے نہ کہا جائے' لیکن اگر اسے گناہ کرنے کے لئے کہا جائے تو اس صورت میں نہ سننا ہے نہ اطاعت کرنا'' (بخاری اور مسلم، عن ابن عمر)۔

Marfat.com

لہٰذا جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے' ان کے لئے حکومت کی اطاعت اس بات پر مشروط ہوگی کہ خود حکومت کا طرز عمل شریعت کے بارے میں کیا ہے۔ بالفاظ دیگر رسول اللہ صلعم نے ملت کو حق دیا ہے کہ اگر امیر احکام شریعت کی مخالفت یا روگردانی کرے تو اسے معزول کر دیا جائے۔ البتہ اتحاد ملی کے اس اصول کے پیش نظر جسے قرآن وسنت نے بار بار تاکیداً بیان کیا، یہ فیصلہ کرنا کسی ایک یا متعدد شہریوں کا کام نہیں کہ ایک ایسے امیر کی اطاعت جو باقاعدہ اس منصب کے لئے منتخب ہوا' کب اور کن حالات میں نہ مذہباً فرض رہ جاتی ہے نہ ازروئے اصول شہریت۔ اس قسم کا فیصلہ ملت بہ حیثیت ملت یا ایک غیر معمولی اکثریت کی بنا پر ہی کر سکتی ہے یعنی استصواب عام کے ذریعے۔

مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس عام استصواب کا حکم کون دے گا؟ امیر تو یہ حکم دے نہیں سکتا کیونکہ وہ خود ملزم ہے اور اسی کا معاملہ فیصلے کے لئے درپیش۔ ممکن ہے بعض لوگ کہیں کہ اس صورت میں یہ اختیار مجلس شوریٰ کو ملنا چاہیے لیکن ہم اس سے پہلے طے کر آئے ہیں کہ مجلس کا تعلق ریاست کے صرف قانونی امور سے ہے، انتظامات سے نہیں۔ لہٰذا اس مقصد کے لئے ایک دوسری جماعت کی ضرورت ہوگی بلکہ ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ صرف اس مقصد کے لئے نہیں کیونکہ امیر کے عزل کا معاملہ تو کبھی شاذ و نادر ہی پیش آئے گا' البتہ ایسا ہو سکتا ہے کہ مجلس شوریٰ کو حکومت کے کسی انتظامی فعل پر محض اس وجہ سے اعتراض ہو کہ اس سے ارکان مجلس کے نزدیک کسی قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور یہ بھی کہ خود امیر ہی کسی وقت دیانت داری سے محسوس کرے کہ اسے مجلس کا کوئی قانونی فیصلہ رد (Veto) کر دینا چاہیے' خواہ وہ اکثریت کا منظور کردہ ہو لیکن اس کی رائے میں شریعت کے منافی۔ اس قسم کا اختلاف رائے امیر اور مجلس کے درمیان ہمیشہ آئینی جمود (Deadlock) کا باعث ہوتا رہے گا کیونکہ نہ تو امیر کو یہ اختیار ہے کہ مجلس کی اکثریت کے فیصلوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جیسا جی چاہے کرے، نہ مجلس شوریٰ کا یہ حق کہ حکومت کے روزمرہ وظائف میں دخل انداز ہو۔ لہٰذا یہ دوسری ضرورت ہے جس میں غیر جانب دار ثالثی کے لئے کسی وسیلے کی تلاش ناگزیر ہو جاتی ہے۔

لیکن امیر اور مجلس شوریٰ کے درمیان اس قسم کے اختلاف علیٰ ہذا امیر کے عزل ایسے نازک مسئلے کے لئے قرآن پاک نے خود ہی ایک حل پیش کر دیا ہے۔

سطور بالا میں ہم قرآن مجید کے اس حکم کی طرف اشارہ کر آئے ہیں: ''اطیعو اللّٰہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم '' لیکن ہم نے اس آیت کا صرف پہلا حصہ پیش کیا تھا۔ اس کا دوسرا حصہ یہ ہے: ''فان تنازعتم فی شی فردوہ الی اللّٰہ والرسول '' (۴:۵۹) ''لیکن اگر تمہارا کسی بات میں نزاع ہو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔'' لہٰذا ظاہر ہے کہ جب کبھی مجلس شوریٰ اور امیر یا امیر اور ملت کے درمیان کوئی بنیادی اختلاف رونما ہو تو جانبین کا فرض ہے کہ اس معاملے میں کسی غیر جانب دار مجلس کو اپنا حکم تسلیم کریں۔ پھر یہ کام اس مجلس کا ہوگا کہ خدا اور رسول (یعنی قرآن وسنت) کی اس بارے میں جو رائے ہے' اس کو مدنظر رکھتے ہوئے امیر متنازعہ فیہ کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کرے' لیکن یہ مقصد ایک دارالقضائے عالی (Supreme Tribunal) ہی کی وساطت سے پورا ہو سکتا ہے اور اس لئے خیال ہوتا ہے کہ آیت بالا کا اشارہ بھی اس کی طرف ہے۔

Marfat.com

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس دارالقضا کو وقت کے اکابر علماء پر مشتمل ہونا چاہیے' ایسے علماء جو قرآن و حدیث پر پورا پورا عبور رکھتے اور دنیا کے معاملات سے بھی خوب واقف ہیں' کیونکہ جہاں تک انسان کے لئے ممکن ہے صرف یہی لوگ بہ تیقن اس امر کا فیصلہ کر سکیں گے کہ مجلس شوریٰ کا جو فیصلہ یا حکومت کی جو انتظامی کارروائی محل نظر ہے' وہ ازروئے شریعت جائز تھی یا ناجائز۔ اس امر کی بہرحال کوئی ضمانت نہیں کہ اس دارالقضا کے تمام ارکان جو فیصلہ کریں گے' اتفاق رائے سے کریں گے۔ اندریں صورت جہاں کہیں اتفاق رائے نہ ہو سکا' وہاں پھر کثرت رائے کے اصول پر عمل کرنا پڑے گا۔ البتہ یہ طے ہے کہ دارالقضا کا جو فیصلہ بھی ہوگا' ناطق ہوگا اور اس کی پابندی حکومت اور ملت دونوں کو بہرصورت کرنا پڑے گی۔ الا یہ کہ دارالقضا کا کوئی اور فیصلہ آگے چل کر اس کی تنسیخ کر دے۔ یہ استثنیٰ بہت ضروری ہے اور ہم نے اس کا ذکر اس لئے کیا کہ ہو سکتا ہے کسی دوسرے موقع پر ارکان دارالقضا کا فیصلہ پہلے سے مختلف ہو۔ گویا ان معاملات میں بھی اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کھلا رہے گا۔ لہٰذا ہمارے دستور میں ایک دفعہ یہ بھی ہونی چاہیے:

> ''دستور کی محافظت دارالقضائے عالی کے ذمے ہے جس کے ارکان کا انتخاب مجلس شوریٰ امیر کی رائے سے کرے گی۔ دارالقضا کو اختیار ہوگا کہ (الف) ایسے تمام امور میں جو امیر اور مجلس شوریٰ کے درمیان مختلف فیہ ہیں اور جن کو جانبین میں سے کوئی دارالقضا کے سپرد کرے' قرآن و سنت کے منصوص احکام کے ماتحت اپنا فیصلہ دے۔ (ب) خود اپنی طرف سے مجلس شوریٰ کے کسی قانونی فیصلے یا امیر کے انتظامی فعل کو جو اس کی سوچی سمجھی ہوئی رائے کے مطابق قرآن و سنت کے کسی منصوص حکم کے خلاف ہے، رد کر دے اور (ج) اگر مجلس شوریٰ کی دو تہائی اکثریت امیر کے خلاف اس بنا پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کرے کہ اس کی حکومت شریعت کی کھلی کھلی نافرمانی کر رہی ہے تو امیر کے عزل کا مسئلہ طے کرنے کے لئے استصواب عام کا حکم دے۔''

اس دفعہ میں کچھ اور دفعات کا اضافہ بھی ہونا چاہیے۔ مثلاً راقم الحروف کے نزدیک اس دفعہ کا کہ دارالقضا کے ارکان کا انتخاب اس فہرست سے ہوا کرے جسے امیر اس مقصد کے لئے مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کرے گا، ارکان کا تقرر عمر بھر کے لئے ہو، یعنی ہر رکن کو عملی طور پر عمر کے ایک خاص حصے تک فرائض رکنیت سرانجام دیتا رہے لیکن اس خدمت سے سبکدوش ہونے پر بھی اس کے منصب یا تنخواہ میں تاحین حیات کوئی فرق نہ آئے۔ پھر جب تک وہ کسی دماغی یا جسمانی عارضے کے زیر اثر ادائے فرائض سے قاصر نہیں رہتا یا ایسا رویہ اختیار نہیں کرتا جو قابل اعتراض ہے تو اسے پیش از وقت اس خدمت سے الگ نہیں کیا جائے گا اور آخر الامر یہ کہ ایک دفعہ جب وہ دارالقضا کا رکن بن گیا تو اس سے علیحدگی کے بعد آئینی طور پر ریاست کے کسی عہدے کا خواہ وہ انتخابی ہو یا انتظامی، بامعاوضہ یا بلا معاوضہ، اہل متصور نہیں ہوگا۔ حاصل کلام یہ کہ دارالقضا کے ارکان کو کسی اور عہدے کے حصول کی خواہش نہ رہے اور ان کا دل ذاتی اغراض اور حرص و ہوا سے ہمیشہ کے لئے پاک ہو جائے۔

Marfat.com

جیسا کہ ہم ابھی عرض کر آئے ہیں' ارکان دارالقضا کا شریعت اسلامی میں پورا پورا عبور رکھنے کے علاوہ عام طور سے اعلیٰ پایہ کا تعلیم یافتہ اور اس کے ساتھ ساتھ دنیا سے باخبر ہونا ضروری ہے' لیکن یہ کوئی آسان بات نہیں کیونکہ اس قسم کے جامع النظر علماء آج کل مسلمانوں کے اندر بہت کم ملیں گے اور موجودہ حالات میں ہمیں جیسے کچھ افراد مل سکتے ہیں ان ہی پر قناعت کرنا پڑے گی۔ لہٰذا بہتر ہوگا کہ سردست دارالقضا کی رکنیت کو بہترین علماء اور ایسے مسلمان وکلاء میں جو قانون کے ماہر ہیں' برابر برابر تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن اس مسئلے کا آخری حل یہ ہے کہ پاکستان میں ایک ایسا دارالعلوم قائم ہو جو ایک مناسب وقت کے اندر صحیح قسم کے علماء جن کی آج ملت کو اس درجہ ضرورت ہے، پیدا کر سکے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

دارالقضائے عالی کا ذکر آیا ہے تو ہمیں عدالت کے بارے میں بھی چند باتیں سرسری طور پر عرض کرنا پڑیں گی۔

جیسا کہ بالعموم خیال کیا جاتا ہے' اس کے برعکس شریعت نے عدالت کا کوئی تفصیلی نظام پیش نہیں کیا۔ صرف عدل، غیر جنبہ داری اور عدالتی اخلاق (جن میں قاضیوں کا طور وطریق اور کردار بھی آجاتا ہے) اور قانون شہادت وغیرہ کے متعلق چند بنیادی اصول بیان کر دیئے۔ رہا عدالتوں کا انتظامی پہلو یعنی ان کی ہیئت ترکیب اور طریق قیام کا مسئلہ' سوا سے ملت کی سمجھ پر چھوڑ دیا گیا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ہر زمانے کے اجتہاد پر۔ لہٰذا مجلس دستور ساز کو آزادی ہے کہ موجودہ زمانے کے بہترین نتائج کو مدنظر رکھتے ہوئے عدالت کا جیسا جی چاہے' نظام تیار کر لے مگر اس شرط کے ساتھ کہ عدل وانصاف کا دارومدار احکام شریعت پر اور ان کے منشا کے عین مطابق ہوگا۔ اگر اس اصول کا لحاظ رکھ لیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں قاضیوں کی عدالتوں اور ''دنیوی عدالتوں'' کے الگ تھلگ قیام کی کوئی ضرورت نہیں جیسا کہ آج کل عوام ناسمجھی سے مطالبہ کر رہے ہیں۔ ''قاضی'' عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے وہی معنی ہیں جو لفظ ''جج'' (Judge) کے۔ لہٰذا جو ریاست اسلام کے قانون (شریعت) کو ملک کا قانون قرار دے گی' اس میں ''شرعی'' اور ''دنیوی'' جج کا امتیاز فضول ہے۔ پھر اگر شریعت فی الواقعہ وہ اصل ضابطہ ہے جس پر قانون عامہ کی اساس رکھی جائے گی (اور رکھی جانی چاہیے اگر ریاست کو سچ مچ اسلامی ریاست بننا ہے) تو پھر جج کو خواہ مخواہ شرعی جج یعنی قاضی ٹھہرانا پڑے گا کیونکہ وہ صرف ان قوانین میں عبور حاصل نہیں کرے گا جن کو مجلس شوریٰ منظور کرے بلکہ ان سب شرعی احکام میں بھی جو قرآن وسنت میں نصاً بیان ہوئے۔ یوں ہمارے مجموعۂ قانون کی ''مذہبی'' اور ''غیر مذہبی'' دو شعبوں میں تقسیم رفتہ رفتہ ناپید ہو جائے گی۔

لیکن یہ تقسیم بتدریج ناپید ہوگی تو اس وقت جب ہم اپنے سارے مجموعہ قانون کی از سر نو ترتیب اس طرح مکمل کر لیں گے جیسا کہ شریعت کا فی الحقیقت تقاضا ہے۔ اس کام میں سب سے پہلے ہمیں قرآن وسنت کے ان تمام نصوص کی تدوین جن کا تعلق جماعتی معاملات سے ہے' ظاہری اصولوں پر کرنا پڑے گی اور پھر ان گوناگوں مسائل اور وقتی ضروریات کے لئے جن کا شریعت میں کہیں ذکر نہیں آیا' مجلس شوریٰ ایک دوسرے ضابطہ قانون ضمیمے کے طور پر ایزاد کرے گی۔ ظاہر ہے کہ ہمارے قانونی نظام کی یہ نظر ثانی کہیں برسوں میں جا کر تکمیل کو پہنچے گی۔ پھر اس کے لئے یہ بھی

Marfat.com

ضروری ہے کہ ہماری قانونی درسگاہوں میں قانون کی تعلیم جس طرح ہو رہی ہے' اس کا سارا انداز بدل دیا جائے۔ یہ دونوں تبدیلیاں یعنی موجودہ قانون کی ترتیب نو اور اس کے نظام تعلیم کی از سر نو تعین پہلو بہ پہلو جاری رکھی جاسکتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک مرکزی دارالعلوم کی خدمات سے بھی جس سے اگر ایک مدرسہ قانون کا براہ راست الحاق کر دیا جائے بالخصوص فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ لہٰذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ قانون کی تعلیم اور اس کا عمل دونوں مقتضیات شریعت کے عین مطابق آ جائیں تو راقم الحروف کی تجویز ہے کہ شیخ (Rector) دارالعلوم کو بحیثیت عہدہ ریاست کا مفتی اعظم اور مجلس شوریٰ کی قانونی کمیٹیوں کا مشیر اعلیٰ قرار دیا جائے اور جس کا ہم اپنے دستور میں بخوبی التزام رکھ سکتے ہیں۔

آزادی رائے' مذہب اور تعلیم

اوپر کی ساری بحث کا تعلق اسلامی ریاست کے عناصر ترکیبی سے تھا۔ آیئے اب بنیادی حقوق کے مسئلے پر نظر ڈالیں۔

ان میں سے بعض حقوق کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے مثلاً شہریوں کا یہ حق کہ نافذہ اور شوریٰ کی ہیئت ترکیبی میں از روئے انتخاب براہ راست حصہ لیں' علیٰ ہذا یہ کہ اگر حکومت شریعت اسلامیہ کی خلاف ورزی کرے تو شہری بذریعہ استصواب عام اسے معزول کر سکتے ہیں اور جس سے قدرتاً یہ ماننا لازم آتا ہے کہ جب بھی کسی شہری کو حکومت کے طرز عمل پر اعتراض ہو تو وہ اس کی قانونی اور انتظامی روش پر رائے زنی کا مجاز ہے۔ قرآن مجید کی کئی آیات اور رسول پاک صلعم کی متعدد احادیث میں کہا گیا ہے کہ کھلے کھلے ظلم اور جور کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا مومن کا فرض اولین ہے۔ بالخصوص اس وقت جب ظالم صاحب حکمت ہو۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا'' گمراہ حکومت کے سامنے کلمہ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے'' (ابوداؤد' ترمذی اور ابن ماجہ' عن ابی سعید الخدری) لیکن ظاہر ہے کہ اس آزادی تنقید کا یہ مطلب نہیں کہ لوگوں کو حکومت کے خلاف اکسایا جائے کیونکہ اسلامی حکومت کی اطاعت فرض ہے' خواہ بعض شہریوں کو اس کے احکام ناگوار ہی کیوں نہ ہوں اور یہ وہ بات ہے جس کی طرف نبی صلعم نے صاف صاف ان لفظوں میں اشارہ کر دیا تھا'' اگر تم اپنی حکومت میں کوئی ایسی بات دیکھو جو تمہیں ناگوار گزرے تو صبر سے کام لو' کیونکہ جو شخص بالشت بھر بھی جماعت سے الگ ہوا' جاہلیت کی موت مرا'' (بخاری' عن ابن عباس)۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں کو اعمال حکومت پر نکتہ چینی کی اجازت دی گئی ہے تو بغاوت اور فتنہ و فساد کے لئے نہیں' اس لئے کہ اسلامی حکومت معزول ہوگی تو ملت کے مجموعی فیصلے سے۔ فرد محض اتنا ہی کر سکتا ہے کہ اگر اس کے نزدیک حکومت کی روش میں اصلاح کی توقع بے سود ہے تو پوری ملت کو صلح صفائی کے ساتھ اس قسم کا کوئی فیصلہ دینے پر آمادہ کرے۔

لیکن یہ صرف حکومت ہی نہیں جس پر ملت کو جرح و نقد کا حق پہنچتا ہے۔ خدا اور اس کے رسول کا تو یہ بھی حکم ہے کہ جہاں کہیں شر نظر آئے' اسے دور کر دو اور جہاں کہیں ممکن ہو جماعتی حالات کی اصلاح میں لگے رہو۔ پھر اس حق تنقید کے علاوہ جس کے بغیر ناممکن ہے کسی قوم کے اجتماعی شعور میں کوئی صحیح نشو ونما پیدا ہو، ہر شہری کا حق ہے کہ ملت کے سامنے نئے نئے افکار پیش کرتا رہے اور ان پر علی الاعلان گفتگو کی جائے ورنہ ملت کی ذہنی ترقی رک جائے گی۔ صفحات

Marfat.com

ماسبق میں ہم ثابت کر آئے ہیں کہ صحیح اسلامی زندگی کے لئے ان تمام معاملات میں اجتہاد کی مسلسل آزادی شرط ہے جو قرآن وسنت کے ناقابل اختلاف اوصاف وصریح نصوص کی رو سے واجب نہیں ٹھہرتے۔لہٰذا ایک اسلامی ریاست کے شہریوں کا اساسی حق ہے کہ اپنی رائے کا آزادانہ ظہار کریں' البتہ یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ آزادی ان خیالات کی تبلیغ واشاعت کی آزادی نہیں جو اسلام کے خلاف ہوں اور اس لئے ہمارے دستور کو صاف صاف اعلان کرنا پڑے گا:

''ہر شہری کو تحریراً اور تقریراً حق پہنچتا ہے کہ جماعتی معاملات میں جس پر چاہے اظہار رائے کرے' بشرطیکہ اس اظہار رائے کا یہ مطلب نہ ہو کہ (الف) لوگوں کو اسلامی عقائد سے برگشتہ کیا جائے (ب) شریعت اسلامی کے خلاف اکسایا یا حکومت وقت کے خلاف بغاوت پر ابھارا جائے یا (ج) اس سے تہذیب وشائستگی کو صدمہ پہنچے۔''

اس دفعہ کی شق اول سے قطعی طور پر یہ نتیجہ مترتب ہوتا ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں کسی غیر مسلم کو اسلام کے خلاف تبلیغ اور یوں مسلمانوں کو اس امر پر آمادہ کرنے کا حق نہیں پہنچتا کہ اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا مذہب قبول کریں۔ غیر مسلمانوں کو اس امر کی تو اجازت ہوگی کہ دوسرے غیر مسلمانوں کے اندر اپنے مذہب کی تبلیغ کریں لیکن وہ ان تصورات کے خلاف کیونکر زبان کھول سکتے ہیں جن پر خود ریاست کی ہستی کا دارومدار ہے' لہٰذا ہمیں دستور میں ذیل کی ایک دفعہ بھی رکھنا پڑے گی:

''غیر مسلم شہریوں کو اس امر کی آزادی ہے کہ اپنے یا مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے پیرووں میں مذہبی تبلیغ کریں لیکن مسلمانوں میں کسی دوسرے مذہب کی تبلیغ کرنا جرم قابل مواخذہ (Cognisable Offence) ہوگا اور اس کی قانوناً سزا دی جائے گی۔''

یہ قانون پھر ویسا ہی ''امتیازی'' ہے جیسا کہ ہم شروع میں عرض کر آئے ہیں کیونکہ جہاں مسلمانوں کو اجازت ہوگی کہ غیر مسلمانوں میں اسلام کی اشاعت کریں' وہاں کسی غیر مسلم کو اختیار نہیں ہوگا کہ مسلمانوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرے' لیکن اس سلسلے میں ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ ایک تصوری ریاست میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان تھوڑا بہت امتیاز ناگزیر ہے۔اگر اسلام ہمارے دستور کی اساس ہے تو کسی مسلمان کو اسلامی عقائد سے برگشتہ کرنا دستور کی اصل غرض وغایت کی نفی یعنی قانون کی خلاف ورزی کرنا ہے۔مزید برآں ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس قسم کے کسی قانون سے ریاست کی غیر مسلم اقلیتوں کے سود و بہبود پر کیا زد پڑتی ہے کیونکہ اصول قرآنی ''لا اکراہ فی الدین'' (۲:۲۵۶) ''دین میں کوئی جبر نہیں'' کی رو سے ریاست ان کی مذہبی آزادی، ان کے معابد اور ثقافتی مصالح کے تحفظ کی ذمہ دار ہوگی۔لہٰذا اس اصول کو صاف صاف دستور میں بیان کرنا پڑے گا کہ:

''ریاست اس بات کا ذمہ لیتی ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہبی عقائد اور مذہبی رسوم کی بجا آوری میں پوری پوری آزادی ہوگی اور وہ اپنی تہذیب وتمدن کے مسلمہ مقاصد کی تکمیل بھی کر

Marfat.com

سکے گا۔ غیر مسلمانوں کو ان کے ضمیر اور مرضی کے خلاف اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا' کسی غیر مسلمان کو جبراً مسلمان کرنا جرم قابل مواخذہ (Cognisable Offence) ہوگا اور اس کی قانوناً سزا دی جائے گی۔''

پھر اسلام نے مسلم اور غیر مسلم دونوں کو آزادی رائے اور آزادی مذہب کا جو حق دیا ہے' اس سے خواہ مخواہ یہ نتیجہ مترتب ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کا ہر شہری ایک ایسے نظام تعلیم سے فائدہ اٹھانے کا مجاز ہے اور حکومت کا فرض ہے کہ اس کا انتظام کرے جس کی بدولت مرد، عورتیں سب بے روک ٹوک اور مفت علم حاصل کر سکیں۔ اسلام نے حصول علم اور اس لئے تعلیم پر جو زور دیا ہے' اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ قرآن و سنت دونوں میں ایسے احکام کی کمی نہیں جن میں تحصیل علم کا ذکر آیا ہے اور جو سب گویا بہ کمال خوبی آنحضرت صلعم کے اس ارشاد میں جمع ہو گئے ہیں۔ ''طلب العلم فریضة علی کل مسلم'' (ابن ماجہ اور بیہقی، عن انس) ''علم کی طلب ہر مسلمان پر فرض ہے۔'' لہٰذا ثابت ہوا کہ جب کوئی ریاست اس لئے قائم کی جاتی ہے کہ اس کے قیام کا خود اسلام متقاضی ہے اور وہ اسلام کے قانون (شریعت) کو ملک کا قانون ٹھہرائے گی تو اس کا فرض ہے کہ ہر مسلم اور مسلمہ کے لئے حصول تعلیم کو آسان ہی نہیں کرے لازمی قرار دے۔ پھر چونکہ اسلامی ریاست کا یہ بنیادی اصول ہے کہ غیر مسلم شہریوں کو بھی زندگی کی تمام سہولتیں بہم پہنچیں' اس لئے وہ ہر شہری کے لئے بلا تخصیص مذہب لازمی اور مفت تعلیم کا انتظام کرے گی۔ اندریں صورت ہمیں اپنے دستور میں ذیل کی دفعہ کا اضافہ کر لینا چاہیے:

''ریاست کے ہر علاقے میں سب شہریوں کو خواہ وہ مرد ہوں یا عورت -- سال کی عمر سے لے کر -- سال کی عمر تک لازمی اور مفت تعلیم دی جائے گی اور حکومت کا فرض ہوگا کہ مدارس کے قیام و انصرام کی مناسب ذمہ داری لے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے' ان کے نصاب تعلیم میں دینیات کو جزو لازم قرار دیا جائے گا۔ نیز ایسے مدارس میں جو حکومت کے ماتحت ہیں' غیر مسلمانوں کے لئے خود ان کے عقائد کے مطابق مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا ضروری ہوگا بشرطیکہ وہ اس کا مطالبہ کریں۔''

اوپر کی دفعہ سے یوں کہنا چاہیے کہ تقریباً چودہ سال کی عمر تک ابتدائی تعلیم کا انتظام ہو جاتا ہے۔ رہی اعلیٰ تعلیم سو اس کے لئے بھی دستور میں مناسب گنجائش رکھی جا سکتی ہے تاکہ اگر امیر و غریب چاہیں تو بغیر کوئی تکلیف یا مشکل اٹھائے آسانی سے حاصل کر سکیں۔

ریاست اور شہری

پچھلے صفحات میں ہم اس امر کی طرف اشارہ کر آئے ہیں کہ اسلامی ریاست کے مفاد کو بہ حیثیت مجموعی اپنا بنیادی مفاد تصور کرنا ہر مسلمان کا قانونی ہی نہیں بلکہ دینی فریضہ ہے اور اس کی وجہ یہ کہ اسلامی ریاست کو ''خلیفة اللہ فی الارض'' قرار دیا گیا ہے' لیکن ظاہر ہے کہ اس ریاست کا یہ مطالبہ کہ اس کی اطاعت ہر شہری پر مطلقاً واجب ہے'

Marfat.com

صرف اس جہت سے پورا نہیں ہوگا کہ شہریوں پر ریاست کی طرف سے کیا فرائض عائد ہوتے ہیں یا وہ انہیں کیا آزادی دیتی ہے بلکہ خود ریاست کو بھی شہریوں کی خاطر چند قطعی فرائض اپنے ذمے لینا پڑیں گے۔

ان میں سے ایک فریضہ شہریوں کی حفاظت کا ہے۔ جیسا کہ اسلام کا عام اصول ہے رسول پاک صلعم نے حجۃ الوداع پر عرفات میں اپنا مشہور خطبہ دیتے ہوئے فرمایا ''تمہیں ایک دوسرے کی جان و مال کی ویسے ہی حرمت کرنا ہوگی جیسے اس دن کی'' (مسلم، عن جابر بن عبداللہ) لہٰذا حضور نبی صلعم کے اس ارشاد اور قرآن وسنت کے دوسرے احکام کے پیش نظر ہمیں اپنے دستور میں ذیل کی دفعہ کا اضافہ کرنا پڑے گا:

> ''کسی شہری کی جان' مال اور آزادی سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا اور سوائے اس کے کہ قانون کا تقاضا ہو' اس کی جان، مال اور آزادی ہر طرح سے محفوظ رہے گی۔''

لیکن ریاست پر شہریوں کی طرف سے جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں' صرف اس دفعہ سے پوری نہیں ہو جاتیں کیونکہ جان و مال کا تحفظ ایک ایسی ذمہ داری ہے جس کا تعلق اس چیز سے ہے جو گویا پہلے سے موجود تھی' لہٰذا اگر ریاست مطالبہ کرے کہ اسے ہر شہری سے غیر مشروط اطاعت کا حق حاصل ہے تو اسے ان کے سود و بہبود کے لئے کچھ اور بھی کرنا پڑے گا۔ بالفاظ دیگر ریاست کا فرض ہے کہ ہر شخص کے لئے معاشی سہولتیں پیدا کرے اور وہ یہ بات ہے جسے رسول اللہ صلعم نے ایک حدیث میں کیا خوب ادا فرمایا ''تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور اپنی رعیت کا ذمہ دار' امام (حکومت) راعی ہے اور اپنی رعیت کا ذمہ دار' مرد گھر میں راعی ہے اور اپنے گھر کا ذمہ دار' عورت اپنے خاوند کے گھر اور بچوں کی راعی ہے اور ان کی ذمہ دار، نوکر آقا کے مال کا راعی ہے اور اس کا ذمہ دار، یاد رکھو تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی'' (بخاری اور مسلم، عن عبداللہ بن عمر)۔

قارئین کرام نے ملاحظہ کیا کہ اس حدیث میں حکومت پر شہریوں کی طرف سے جو فریضہ عائد ہوتا ہے' اسے وہی حیثیت دی گئی ہے جو باپ یا ماں کی خود اپنے بچوں کے متعلق ذمہ داری کی ہے۔ جس طرح باپ اپنے بچوں کا راعی یعنی محافظ ہے اور اخلاقاً اور شرعاً اس بات پر مجبور کہ بچوں کی حفاظت و پرورش کا کفیل ہو' بعینہٖ حکومت بھی اخلاقاً اور شرعاً ہر شہری کے سود و بہبود کی ذمہ دار ہے اور اس بات کا خیال رکھے گی کہ اس کا معیار زیست جیسا کہ انصاف کا تقاضا ہے' ایک خاص سطح سے نیچے نہ گرنے پائے۔ یہ اس لئے کہ ہم مسلمان گو زندگی کو صرف معاشی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے قائل نہیں کیونکہ زندگی کی حقیقی قدریں روحانی ہیں' لیکن ہم اس بات کو بھی غلط قرار دیتے ہیں کہ روحانی صداقتوں کو زندگی کے طبعی حقائق سے بالکل الگ تھلگ رکھا جائے۔ اسلام کا تصور معاشرے کے متعلق یہ ہے کہ وہ صرف ''روحانیات'' ہی میں نہیں، زندگی کی مادی ضروریات میں بھی عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ دے۔ لہٰذا ایک صحیح اسلامی ریاست کا مدعا جب ہی پورا ہو سکتا ہے کہ اس میں تمام اجتماعی معاملات اس طرح سرانجام ہوں کہ ہر مرد و زن کو معاش کی طرف سے کم سے کم دل جمعی حاصل ہو جائے کیونکہ اس دل جمعی کے بغیر نہ حقیقی آزادی ممکن ہے نہ صحیح روحانی ارتقا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ریاست ہر شہری کے لئے بے فکر زندگی کا انتظام کرے یا اس کے لئے ایسا کرنا ممکن ہے۔ اس کا مطلب صرف

Marfat.com

اتنا ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک طرف انتہائی دولت وثروت ہو اور دوسری جانب کمر شکن افلاس۔ ثانیاً یہ کہ ریاست کے تمام مادی وسائل سے اس طرح کام لیا جائے کہ ہر شہری کو بشرطیکہ وہ کام کرنے کے لئے تیار اور اس کا اہل ہے' یہ احساس رہے کہ اسے ایک معقول معیار زیست کے مطالبہ کا حق پہنچتا ہے۔ مزید یہ کہ اس کا یہ حق دستور میں از روئے قانون تسلیم کر لیا جائے۔

جب تک ریاست اس بات کا انتظام نہیں کرتی کہ اس میں ہر شہری کو معاش کی طرف سے اطمینان ہوگا' ہم اس کو اسلامی نہیں کہہ سکتے۔ نبی صلعم نے فرمایا ''اہل ایمان ایک دوسرے کے لئے ایسے ہیں جیسے عمارت کے لئے اس کے حصے، ہر ایک کو دوسرے سے پہنچتی ہے'' (بخاری اور مسلم، عن ابی موسیٰ) اور مزید یہ کہ ''وہ مومن نہیں جو خود اپنا پیٹ بھر لے جب اس کا ہمسایہ بھوکا رہتا ہے۔'' (بیہقی، عن ابن عباس) اور یہ کہ ''اہل ایمان ایک جسم واحد کی طرح ہیں۔ اگر آنکھ کو تکلیف ہے تو سارے جسم کو تکلیف ہے، سر کو تکلیف ہے تو سارے جسم کو تکلیف ہے۔'' (مسلم، عن نعمان بن بشیر)۔

لہٰذا عمرانی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اسلام سے ہمیں جو زبردست سبق ملتا ہے' وہ یہ کہ اس معاشرے میں مسرت اور شادمانی کی امید رکھنا فضول ہے جو اس ناانصافی کو روا رکھتا ہے کہ اس کے کچھ افراد تو ناواجب طور پر افلاس اور ناداری کا شکار رہیں۔ درآنحالیکہ دوسروں کے پاس ضرورت سے بھی زیادہ ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض غیر معمولی واقعات کی بدولت جب ساری جماعت عسرت اور تنگی کی حالت میں ہو جیسا کہ ملت ہجرت مدینہ کے بعد تھی' تو یہی عسرت اور تنگی روحانی قوت اور آئندہ عظمت کا پیش خیمہ بن جاتی ہے' لیکن اگر کسی قوم کے معاشی وسائل کی تقسیم ایسی ناہموار ہو کہ اس کے کچھ حلقے تو ناز ونعمت کی زندگی بسر کریں اور عام لوگوں کا یہ حال کہ پیٹ بھرنے کے لئے خون پسینہ ایک کر دیں تو یہی عسرت روحانی ترقی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوگی اور بعض اوقات قوم کی قوم کو اللہ کے راستے سے ہٹا کر مادیت کی بھٹی میں جھونک دیتی ہے جس میں روح اور ضمیر سب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہی بات تھی جس کے پیش نظر آنحضرت صلعم نے فرمایا ''ہوسکتا ہے فقر (ناداری) کفر بن جائے۔'' لہٰذا اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ بہ حیثیت خلیفۃ اللہ فی الارض عدل وانصاف سے کام لے اور دیکھے کہ ہر شہری مرد، عورت، بچے کے پاس گزر اوقات یعنی کھانے پینے، پہننے اور رہنے سہنے کا معقول انتظام ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دولت کو سرے سے موقوف کر دیا جائے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ افلاس اور ناداری کو موقوف ہو جانا چاہیے' اس لئے کہ دولت وثروت کے درمیان افلاس اور ناداری سے اسلام کے اصول اخوت کی جس پر گویا اس کی بقا کا دارومدار ہے' نفی ہو جاتی ہے' لہٰذا اس اسلامی اصول کے ماتحت ہم اپنے دستور میں ذیل کی دفعہ کا اضافہ کریں گے:

''ریاست کی ذمہ داری ہے کہ ہر شہری کا یہ حق تسلیم کرے کہ (الف) جب تک وہ کام کرنے کا اہل اور تندرست ہے' اسے کوئی نہ کوئی بارآور اور آمدنی خیز کام ملتا رہے۔ (ب) دوران علالت میں مفت اور مناسب طبی امداد حاصل رہے گی اور (ج) ایسے حالات میں

Marfat.com

جب علالت، مجبورانہ بے روزگاری، پیرانہ سالی یا صغرسنی کے باعث وہ کسب معاش سے معذور ہے' اس کے لئے خوراک، لباس اور مکان کا انتظام کیا جائے گا۔ کوئی شہری جب کہ دوسروں کے پاس ضرورت سے زیادہ ہے' بے جا عسرت اور تنگی کا شکار نہیں ہوگا بلکہ اس بے جا عسرت اور تنگی کا انسداد لازمی اور مفت سرکاری بیمے (State Insurance) کے ذریعے کیا جائے گا تاکہ ہر شہری کے لئے اقل قلیل گذارے کا جس کی تعیین حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے از روئے قانون کی جائے گی' انتظام رہے۔''

اس دفعہ کے ماتحت عام سماجی بیمے (Social Insurance) کی ایک بہت بڑی تجویز پر عمل کرنا ضروری ہو جاتا ہے جس کے لئے امیر اور خوش حال طبقوں سے زکوٰۃ کے علاوہ ہمیں جائیداد پر بھی مزید ٹیکسوں کے ذریعے معقول سرمایہ بہم پہنچانا پڑے گا جیسا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ''مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے'' (ترمذی اور ابن ماجہ، عن فاطمہ بنت قیس)۔ پھر کہیں قارئین کو یہ خیال نہ گزرے کہ عام سرکاری بیمے کی یہ تجویز ''عہد حاضر کی ایجاد'' ہے۔ اس سلسلے میں ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ اس تجویز پر اس وقت بھی عمل ہو رہا تھا جب ابھی اس کا نام وضع نہیں ہوا تھا اور نہ مغربی ممالک نے اس کی ضرورت محسوس کی تھی۔ ہمارا مطلب ہے خلفائے راشدہ کے زمانے میں۔ سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے ۲۰ھ میں ایک خاص محکمہ یعنی دیوان حکومت اس غرض سے قائم کیا کہ برابر وقفوں پر آبادی کی باقاعدہ مردم شماری ہوا کرے۔ پھر یہی مردم شماری تھی جس کی بنا پر (الف) بیواؤں اور یتیموں (ب) ان تمام صحابہ کے لئے جو نبی صلعم کے زمانے میں اسلام کی خدمت میں پیش پیش تھے اور جس کی ابتدا امہات المومنین، اہل بیت، اصحاب بدر، شروع شروع کے مہاجرین اور انصار وغیرہ سے کی گئی اور (ج) ہر قسم کے معذور، بیمار اور بوڑھوں کے لئے سالانہ وظائف مقرر کیے۔ کم از کم وظیفہ جو اس تجویز کے ماتحت دیا جاتا تھا' ۲۵۰ درہم سالانہ تھا۔ رفتہ رفتہ نومولود بچوں کے لئے بھی باقاعدہ وظیفہ مقرر ہوا جو ان کے والدین یا ولیوں کو دیا جاتا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں جناب فاروقؓ اکثر فرمایا کرتے تھے ''اگر میں زندہ رہا تو دیکھوں گا کہ صنعاء کے پہاڑوں میں تن تنہا پھرنے والے چرواہے بھی امت کی دولت سے اپنا حق وصول کرتے ہیں'' (ملاحظہ ہو ابن سعد، ج ۳، حصہ اول، ص ۲۱۳-۲۱۷)۔ حضرت عمرؓ نے تو اس معاملے میں تیس تیس آدمیوں پر تجربہ کرنا بھی شروع کر دیا تھا تاکہ اس امر کا اندازہ ہو جائے کہ ایک آدمی کو اپنی طاقت اور صحت قائم رکھنے کے لئے اوسطاً کتنی خوراک کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان تجربات کی بنا پر انہوں نے حکم دیا کہ ملک بھر میں ہر مرد، عورت کو بیت المال سے گیہوں کی ایک مخصوص مقدار ماہ بہ ماہ ضرور مل جایا کرے جو اس کے دو وقت کھانے کے لئے کافی ہو (ابن سعد، ج ۳، حصہ اول، ص ۲۱۹-۲۲۰) لیکن ابھی حضرت عمرؓ عام سرکاری بیمے کی اس عظیم الشان تجویز کا اہتمام کرنے نہیں پائے تھے کہ قاتل کے خنجر نے ان کی مقدس زندگی ختم کر دی۔

خاتمہ سخن

یہاں ان شرعی اصولوں کی بحث ختم ہو جاتی ہے جن کو ہم نے اساسی قرار دیا تھا اور جن کا پاکستان کے دستور میں،

Marfat.com

اگر پاکستان کو نام کی بجائے فی الحقیقت ایک اسلامی ریاست بننا ہے' شامل کر لینا ضروری ہوگا۔ پھر جیسا کہ قارئین دیکھ آئے ہیں راقم الحروف نے اس دستور کا مسودہ تیار کرنے کی کوشش نہیں کی اس لئے کہ ہمارے نزدیک یہ کام ''شوریٰ'' یعنی باقاعدہ انتخاب شدہ مجلس دستور ساز کے کرنے کا ہے۔ ہم نے صرف یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ قرآن وسنت سے ہمیں ایک سیاسی قانون کا نہایت صاف صاف اور واضح خاکہ مل جاتا ہے جس کی تفصیل اور جزئیات کی خانہ پروری ہر زمانہ اپنے اجتہاد سے کرے گا۔ پھر قرآن وسنت یعنی اسلام کے ان دو مآخذ میں اس قانون سیاست کی موجودگی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ان لوگوں کے خلاف جو اپنے شوق ''تجدد'' میں اس بات کے خواہش مند ہیں کہ پاکستان کے آئندہ دستور کو ریاست کے غیر اسلامی تصورات کے ماتحت لے آئیں۔ اس طرح وہ گویا دبی زبان سے اسلام کے اس دعوے کا انکار ہی نہیں کر رہے کہ اس کے تصورات ہر اعتبار سے جامع اور کامل ومکمل ہیں' بلکہ پاکستان کے حقیقی تصور کو بھی نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں' کیونکہ اگر ہماری ریاست کی تشکیل اور رہنمائی کا دارومدار اسلام پر نہیں تو پھر ایک ''اسلامی'' ریاست کی ضرورت ہی کیا ہے؟

لیکن یہی نکتہ ہے جو ہمارے نام نہاد ''روشن خیال'' طبقے کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ نہیں سمجھتے کہ ایک ایسی ریاست کے لئے جو کسی دینی جماعت کے نام پر اور اس کی خاطر سے وجود میں لائے' لازماً تصوراتی (ideological) ہونا ضروری ہے' ورنہ اس کی تاسیس کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔

لہٰذا راقم الحروف کے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ جو اس وقت ہماری مجلس دستور ساز کے ارکان کو درپیش ہے' وہ یہ کہ ریاست اور قوم کے معاملے میں ان کے افکار کا رخ مغرب کی بجائے اسلام کی طرف پھر جائے' لیکن سردست ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ، مرد، عورتیں، سب اندھا دھند مغربی خیالات کی رو میں بہہ رہے اور اور بھولے پن سے یہ سمجھتے ہیں کہ جو چیز مغرب سے آئے' وہ لامحالہ ''وقت کے مطابق'' ہوگی۔ رفتہ رفتہ اس خیال کے ماتحت، جس کی وجہ ہے اسلام سے ناواقفیت اور بے اعتنائی اور ملت اسلامیہ کے اندر جو کچھ ہو رہا یا آگے چل کر ہوگا' اس پر بھی یونہی بے سوچے سمجھے مغربی مصطلحات اور مغربی تصورات کا اطلاق کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً جب بھی اسلام کے اصول مساوات اور حریت سیاسی پر زور دینے کا موقع آتا ہے اور وہ بھی غیر مسلمانوں کے سامنے تو ہمارے یہ افرنجیت مآب دوست قطعی طور سے سمجھ لیتے ہیں کہ مغربی جمہوریت اور ریاست کے اسلامی تصور میں کوئی فرق نہیں۔ ایسے ہی اگر معاشی انصاف کا مسئلہ زیر بحث آئے جس پر قرآن مجید نے بار بار اور نہایت زوردار الفاظ میں اصرار کیا ہے تو یہ حضرات اپنی کور چشمی سے فوراً کہہ اٹھتے ہیں کہ قرآن پاک کا اصول انصاف محض ایک آغاز تھا' مارکسی اشتراکیت کی کسی ایک یا دوسری شکل کا اور پھر دونوں صورتوں میں ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ اگر اسلام نے مغربی غور وفکر کے ان دو مظاہر کی سرتاسر متابعت نہیں کی تو اس کو ''زمانے کے مطابق'' ٹھہرانا مشکل ہو جائے گا۔ انہیں اس بات کا خیال ہی نہیں آتا کہ خود اپنے غور وفکر سے کام لے کر اتنا معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ آیا اسلام نے سرمایہ دارانہ جمہوریت (Capitalistic Democracy) جو استحقاق دولت پر مبنی ہے اور اس لئے حقیقی جمہوریت سے بہت دور، یا مارکسیت (Marxism) جسے زندگی کی

Marfat.com

روحانی قدروں سے انکار ہے اور چاہتی ہے کہ انسانی معاشرہ دیمک کے گھر یا شہد کے چھتے کی صورت اختیار کر لے' دونوں کے مقابلے میں ایک اپنا بدل پیش کیا ہے یا نہیں۔ یوں ان کے دل و دماغ پر ہمیشہ مغربی خیالات چھائے رہتے ہیں حتیٰ کہ ''عوام'' کی خاطر اسلامی اصطلاحات میں گفتگو کرتے ہوئے بھی ان کے ذہن میں مغرب کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اسلامی اصطلاحات میں اس لئے کہ عوام کو باوصف جہالت اگر دلچسپی ہے تو زیادہ تر اسلام ہی کے عملی امکانات سے۔ وہ مذہبی فرائض کی بجا آوری میں بے شک سستی اور تساہل سے کام لیتے اور بعض اوقات ایسی باتیں کر بیٹھتے ہیں جن کی اسلام مطلق اجازت نہیں دیتا' لیکن ان کے دل کے کسی مخفی گوشے میں اسلام سے عشق کی ایک چنگاری دبی ہے کہ ادھر اسلام کے لئے کوئی نتیجہ خیز ولولہ پیدا ہوا اور اُدھر یہ چنگاری بھڑک اٹھے۔ برعکس اس کے ہمارے ''ترقی پسند'' مفکرین میں سے اکثرت کے نزدیک یہ ممکن ہی نہیں کہ مستقبل قریب میں اسلام کو سردست کوئی عملی جگہ دی جا سکے۔ ان ''ترقی پسند'' حضرات میں سے بعض کو اس سے کچھ جذباتی تعلق ضرور ہے لیکن وہ اپنی مغربی تعلیم اور مغربی طرز معاشرت کے زیر اثر اس بات پر مجبور ہیں کہ اسلام کو ایک ''نا قابل عمل خیال پرستی'' (Impractical Idealism) سے تعبیر کرتے ہوئے عملی سیاسیات میں مغرب کی ویسی ہی کورانہ تقلید کرتے رہیں جیسے بھیڑوں کا گلہ اپنی رہنما بھیڑ کی۔

یوں بھی اس خطرے کے علاوہ جو مغرب کی سیاسی اور اجتماعی صورت حالات میں صاف صاف جھلک رہا ہے' ہمارا مطلب ہے قوموں کی اندرونی کشاکش اور باہمی جنگوں، اجتماعی اخلاق کے زوال، سرمایہ داری کی معاشی ناانصافی اور جیسا کہ اشتمالیت کا تقاضا ہے حریت ذات کے خاتمے سے، ایک اور وجہ بھی ہے۔ نہایت اہم وجہ، جس کی بنا پر لازم آتا ہے کہ مغربی دنیا کی مخصوص سیاسی تشکیلات سے کنارہ کشی کی جائے اور وہ یہ کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کو یہ موقع کبھی نہیں ملا تھا کہ اپنی لوحِ دل کی ہر بات سے پاک وصاف کرتے ہوئے خود اپنے آپ اور لاکھوں کروڑوں مسلمانوں پر جو دنیا کے دوسرے حصوں میں آباد، تذبذب اور ہزیمت خوردہ ذہنیت کا شکار ہو چکے ہیں، یہ ظاہر کر دیں کہ اسلامی شریعت محض خشک تصنیفات اور چکنے چپڑے وعظ و نصیحت کا موضوع نہیں' بلکہ حیات انسانی کا ایک زندہ اور متحرک لائحہ عمل۔ وہ لائحہ عمل جو اپنا آپ مختار اور ہر قسم کی وقتی ''صورت بندیوں'' سے آزاد ہے' لہٰذا ہر حالت اور ہر زمانے میں قابلِ عمل۔ اس لائحہ عمل سے ملت کو اپنے ارتقا اور نشوونما کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔ برعکس اس کے یہ وہ لائحہ عمل ہے جس پر چل کر وہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ ترقی پذیر، سب سے زیادہ خود اعتماد اور سب سے زیادہ طاقتور جماعت بن جائے گی۔

(عرفات، جلد ا عدد ا، بابت مارچ ۱۹۴۷ء۔ انگریزی مقالہ بعنوان Islamic Constitution-Making)

ا۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ زمانہ حال کے ایک ایسے دستور میں جسے مغربی رجحانات کا بہترین مظہر تصور کیا جاتا ہے یعنی ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں صرف وہی شخص صدارت کا امیدوار بن سکتا ہے جو وہاں پیدا ہوا۔ یوں قدرتاً وہ

Marfat.com

سب لوگ اس حق سے محروم رہ جاتے ہیں جنہوں نے وہاں توطن اختیار کرلیا ہو اور یہ ایک کھلا ہوا امتیاز ہے، ان لوگوں کے خلاف جن کو ویسے اور سب باتوں میں وہی حقوق حاصل ہیں جو ریاست ہائے متحدہ کے ان شہریوں کو جن کی وہاں پیدائش ہوئی۔ اسلامی ریاست میں اس عہدے کا فیصلہ پیدائش کی بجائے اسلامی اصولوں کے ماننے یا نہ ماننے سے کیا جائے گا۔

۲۔ ممکن ہے بعض علماء ہماری اس رائے سے اختلاف کریں اور ان حدیثوں کا حوالہ دیں جن کا معتبر ہونا ثابت ہے اور جن میں سیاسی امور کا ذکر کرتے ہوئے لفظ سلطان بھی آیا ہے چنانچہ اس اصطلاح کی آڑ میں صدیوں تک بادشاہت ایسے غیر اسلامی نظام کی حمایت ہوتی رہی، لیکن یہ عذر سراسر غلط ہے کیونکہ نبی صلعم کا کبھی یہ مطلب نہیں تھا کہ اس لفظ کو بادشاہ کا مترادف ٹھہرایا جائے۔ قدیم عربی محاورے میں بھی جب کبھی لفظ سلطان کو سیاسی معنوں میں استعمال کیا گیا تو اس کا مطلب حکومت کے سوا اور کچھ نہ تھا اور نبی صلعم نے بھی اس کے یہی معنی لئے۔ آگے چل کر جب اس کا اطلاق ایک مخصوص فرد (بادشاہ) پر ہونے لگا تو یہ اس لئے کہ متاخرین نے اس کے صحیح معنوں کو مسخ کر دیا تھا۔ عربی زبان کی تمام معتبر اور قدیم کتب لغت میں سلطان کے یہی معنی آئے ہیں۔

۳۔ ہم نے یہاں امیر کا لقب محض سہولت کے لئے استعمال کیا ہے۔ مزید برآں یہ ان دو القاب میں سے ایک ہے جو نبی صلعم نے سرِ ریاست کے لئے استعمال فرمائے (دوسرا لقب ہے امام)۔ البتہ ملت کو شرعاً اس امر کی تکلیف نہیں دی گئی کہ ضرور یہی لقب اختیار کرے لہٰذا اگر دستور ساز اسمبلی نے کوئی اور لقب تجویز کرلیا تو اس کا یہ فعل قابل اعتراض نہ ہو گا۔

Marfat.com

محمد اسد

ہم پاکستان کیوں بنانا چاہتے ہیں؟

تین چار ماہ پہلے کی بات ہے' میں نے ''عرفات'' کے شمارہ فروری میں ایک سوال اٹھایا تھا: ''کیا واقعی ہم اسلام چاہتے ہیں؟'' یہ کوئی خطیبانہ سوال نہیں تھا کہ قارئین کی دینی اصلاح کے لئے ذہن میں آیا ہو۔ فی الحقیقت یہ ایسا سوال تھا جو ہمیں اپنے آپ سے ضرور پوچھنا چاہئے۔ یہ کہ ''کیا واقعی ہم اسلام چاہتے ہیں؟'' وقت آ گیا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو اس سوال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اپنے حال اور مستقبل کے حوالے سے اس سوال کے تمام نتائج وعواقب کا پورا پورا تجزیہ کرنا ہوگا اور اپنے اندر اخلاقی جرأت پیدا کرنی ہوگی کہ اس سوال کے جواب میں ایمانداری سے ''ہاں'' یا ایمانداری سے ''نہ'' کہہ سکیں۔ فی زمانہ جیسے حالات ہمارے مشاہدے میں آ رہے ہیں' ان کی کیفیت یہ ہے کہ بے شمار مسلمان زبان سے تو کہتے ہیں ''ہاں'' اور عمل سے کہتے ہیں ''نہ''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام کی باتیں تو بہت کرتے ہیں اور بلند بانگ ادعا کے ساتھ کہتے ہیں کہ اسلام بہترین ضابطہ حیات ہے، اسلام واحد ضابطہ حیات ہے جو انسان کو تباہی کے راستے سے بچا سکتا ہے، اس لئے اسلام واحد منزل مقصود ہے جس کے نفاذ کے لئے کوشش کی جانی چاہئے۔ یہ لوگ کہتے تو یہی ہیں، لیکن اپنے اعمال اور سماجی رویوں سے وہ اسلام سے زیادہ سے زیادہ دور ہوتے جاتے ہیں۔ ہماری جدید تاریخ میں اسلام کے بارے میں اتنی باتیں کبھی نہیں ہوئی تھیں، جتنی آج کے ہندوستان میں ہو رہی ہیں۔ ہر طرف اسلام، اسلام کا غلغلہ ہے، اور اس کا برعکس بھی درست ہے کہ اسلام کی سچی روح کے مطابق عملاً اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے کی طرف اتنی بے توجہی کبھی نہیں برتی گئی، جتنی آج ہندوستان میں برتی جا رہی ہے۔

اس مقام پر شاید میرے اس دعوے کے خلاف آپ کے دل میں شکایت یا احتجاج پیدا ہوا اور آپ اس زبردست جوش وخروش کی طرف توجہ دلائیں جو نظریہ پاکستان نے مسلمانان ہند میں برپا کر رکھا ہے۔ آپ کہیں گے، اور ایسا کہنے میں آپ حق بجانب ہوں گے کہ مسلمانان ہند اپنی طویل گراں خوابی سے بیدار ہو گئے ہیں، انہوں نے ایک عظیم مقصد کے لئے اتنا زبردست اتفاق واتحاد حاصل کر لیا ہے کہ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا، یہ کہ مسلمان ہونے کی بناء پر انہوں نے اپنا جداگانہ ثقافتی تشخص قائم کرنے کا شعور حاصل کر لیا ہے، یہ کہ تحریک پاکستان کا پہلا نعرہ ہی ''لا الہ الا اللہ'' مقرر ہوا ہے، یہ کہ انہوں نے ایسی سیاست حاکمہ قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے جس میں مسلم تصور

Marfat.com

کائنات، مسلم اخلاقیات اور مسلم معاشرتی افکار مکمل اظہار کی راہ پاسکیں، اور شاید آپ کسی قدر رنجیدگی سے مجھ سے دریافت کریں گے کہ کیا میں ان سب باتوں کو اسلامی نقطہ نظر سے بے وقعت اور غیر اہم خیال کرتا ہوں؟

بات یہ ہے کہ میں ہرگز ہرگز ان کو بے وقعت اور غیر اہم خیال نہیں کرتا۔ میری نظر میں یہ بہت وقیع اور اہم ہیں۔ میرا عقیدہ ہے (اور گذشتہ چودہ سال سے میں اس عقیدے پر قائم ہوں) کہ ہندوستان میں اسلام کا کوئی مستقبل نہیں، ماسوا اس کے کہ پاکستان ایک حقیقت بن کر قائم ہو جائے۔ اگر پاکستان واقعی قائم ہو جاتا ہے تو پورے عالم اسلام میں ایک روحانی انقلاب آسکتا ہے، یہ ثابت کرنے کے لئے کہ جس طرح تیرہ سو سال پہلے ایک نظریاتی، اسلامی ہیئت حاکمہ قائم کرنا ممکن تھا، کم و بیش اسی طرح آج بھی ممکن ہے لیکن ہمیں ایک سوال کا جواب دینا ہوگا: کیا تحریک پاکستان کے تمام قائدین، اور اہل دانش جو تحریک کے ہراول ہیں، کیا وہ اپنے ان دعوؤں میں سنجیدہ اور مخلص ہیں کہ اسلام، اور صرف اسلام ہی ان کی جدوجہد کا اولین محرک ہے؟ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ''پاکستان کا مطلب کیا'' لا الہ الا اللہ'' تو کیا وہ اس کا مطلب بھی جانتے ہیں کہ وہ کہہ کیا رہے ہیں؟ تو کیا وہ اس کا مطلب بھی جانتے ہیں کہ وہ کہہ کیا رہے ہیں؟ پاکستان کا نظریہ اور پاکستان کا خواب کیا ہم سب کے ذہنوں میں ایک ہی ہے، یا مختلف و متفرق ہے؟

یہ سوالات معمولی نہیں ہیں۔ یہ بڑے سوال ہیں، اتنے بڑے کہ ہمارے موجودہ مصائب سے بھی بڑے ہیں، اور ان انفرادی تکالیف سے بڑھ کر ہیں جو اس ملک میں ہزاروں مسلمان مرد و زن سردست برداشت کر رہے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب ہی سے فیصلہ ہوگا اس امر کا کہ یہ تکالیف اور قربانیاں مستقبل کے ایک نئے تناظر یعنی اسلام کے مکمل اثبات و نفاذ کی نوید لائیں گے یا ایک قومی مسلم ریاست کی تشکیل کے ذریعے مسلمانان ہند کی محض اقتصادی صورت حال کی اصلاح و ترقی کی ضامن ہوں گی۔

یہاں میں جریدہ ''عرفات'' کے شمارہ فروری 1947ء میں شائع شدہ اپنے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرنے کی جسارت چاہتا ہوں۔ میں نے لکھا تھا: ''تحریک پاکستان ایک نئے اسلامی نظام کا نقطہ آغاز بن سکتی ہے بشرطیکہ ہم مسلمان محسوس کریں، اور قیام پاکستان کے بعد بھی برابر محسوس کرتے رہیں کہ اس تحریک کی حقیقی اور تاریخی وجہ جواز یہ نہیں ہے کہ ہم اس ملک کے دوسرے باشندوں سے مختلف لباس پہنتے، مختلف زبان بولتے یا مختلف انداز میں علیک سلیک کرتے ہیں، یا یہ کہ ہمیں دوسری قوموں سے کچھ شکایات ہیں یا یہ کہ ہمیں زیادہ معاشی مواقع کی خواہش ہے یا یہ کہ ان لوگوں کے لئے جو خود کو محض عادت کے طور پر ''مسلمان'' کہلواتے ہیں، زیادہ کشادہ جگہ کی طلب ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ مطالبہ پاکستان کا اگر کوئی جواز تو ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ایک سچی اسلامی مملکت قائم کی جائے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ عملی زندگی میں اسلامی احکام و شعائر رائج کئے جائیں۔''

''پاکستان کے بارے میں میرا تصور یہی ہے'' اور میں سمجھتا ہوں کہ بہت سے مسلمانوں کا بھی یہی تصور ہے۔ میں نے ''بہت سے'' کہا ہے ''سب'' نہیں کہا، اور نہ ''بیشتر'' کہا ہے۔ اس احتیاط کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اکثر و بیشتر تعلیم یافتہ طبقے کا تصور پاکستان یہ نہیں ہے۔ ان کے نزدیک پاکستان کا مطلب فقط یہ ہے کہ مسلمانان ہند کو ہندو

Marfat.com

غلبے سے نجات دلائی جائے اور ایک ایسی سیاسی ہیئت حاکمہ قائم کی جائے جہاں مسلمانوں کو اقتصادی مفہوم میں اپنی ایک خود مختار جگہ مل جائے۔ ان کے نزدیک اسلام کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ متعلقہ لوگوں کا مذہب اتفاق سے اسلام ہے، جیسے کہ آئر لینڈ کی جدوجہد میں کیتھولکیت کو بھی اس لئے کچھ اہمیت حاصل ہوگئی تھی کہ آئر لینڈ کے بیشتر باشندوں کا یہی مذہب تھا۔ اور جس طرح کہ آئرستانی قومیت کی تحریک میں کیتھولکیت کو محض ایک اضافی، جذباتی عنصر کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، اسی طرح خدشہ ہے کہ تحریک پاکستان میں اسلام کے نام پر نعرے بازی بھی نہیں، قومی خود اختیاری کی جدوجہد میں محض ایک اضافی، جذباتی عنصر بن کر نہ رہ جائے۔"

میں صاف صاف اور واشگاف لفظوں میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے بہت سے بھائی اور بہنیں پاکستان کے روحانی و اسلامی مقاصد پر یقین تو کیا رکھیں گے وہ اس کی مطلق پروا بھی نہیں کرتے، اور وہ ایسے جذبات کے بہاؤ میں بہے چلے جا رہے ہیں جو قوم پرستی کے جذبات سے ملتے جلتے ہیں۔ اور یہ بات خاص طور پر ان لوگوں پر لاگو ہوتی ہے، جنہوں نے مغربی خطوط پر تعلیم پائی ہے۔ دین اسلام سے ان کی بے اعتنائی گزشتہ چند عشروں میں پختہ ہوئی ہے۔ شرعی احکام کی پابندی ایسے لوگوں کے لئے خاصی پریشان کن اور تکلیف دہ بن گئی ہے۔ مغربی طرز فکر کے سوا کسی اور انداز میں سوچنے سمجھنے کی قابلیت ان میں مفقود ہو چکی ہے۔ چنانچہ ان کے قلوب میں یہ عقیدہ پیدا ہی نہیں ہوتا کہ دنیا کے معاشرتی اور سیاسی مسائل خالص مذہبی اصولوں کے تحت حل پذیر ہو سکتے ہیں۔ اسلام کا نام ان کی زبان پر آتا ہے تو محض رسماً آتا ہے، کسی اصول ونظریے کے تابع ہو کر نہیں آتا۔ انہیں اسلام سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے، تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ اپنی قوم کی روایات میں ثقافتی اقدام کا بھرم رکھا جائے۔ اس قسم کی ذہنیت والے لوگوں کے لئے پاکستان کا مطالبہ ویسا ہی قومی مطالبہ ہے، جیسے مصر مصریوں کے لئے، چیکوسلوواکیہ چیک لوگوں کے لئے، یعنی لوگوں کے ایک گروہ کی جانب سے، چند مخصوص اقتصادی مفادات اور چند مشترکہ ثقافتی خصائص (اور مسلمانان ہند کی صورت میں اسلام سے وابستہ ثقافتی خصائص) کی اساس پر خود اختیاری کا مطالبہ۔ نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔

یقیناً آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ پاکستان کا بہت کمزور تصور ہے۔ یہ تصور اس اسلامی جوش وخروش سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، جس کا مظاہرہ ہمارے عوام کی بہت بڑی اکثریت بڑے واضح، لیکن بڑے بے ہنگم طریقے سے کر رہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے اکثر نام نہاد ارباب دانش اسلام سے صرف اس حد تک غرض رکھتے ہیں، جس حد تک کہ وہ ان کی سیاسی خود اختیاری کی جدوجہد کے لئے مفید مطلب ہو سکتا ہے، جبکہ ہمارے عوام خود اختیاری کا مطالبہ صرف احیائے اسلام کی آرزو کے تحت کر رہے ہیں، لیکن چونکہ ان کی آرزوئیں واضح نہیں ہیں، اور وہ نہیں جانتے کہ انہیں حاصل کیونکر کیا جاتا ہے، اس لئے وہ قدرتاً اہل قیادت پر بھروسا کرتے ہیں۔ پس قیادت کے روحانی اوصاف ہی سے یہ طے ہوگا کہ پاکستان کے لئے مسلمانوں کی جدوجہد کی روحانی کیفیت کیا ہوگی اور پاکستان اپنے قیام کے بعد کیا رنگ روپ اختیار کرے گا۔

Marfat.com

پاکستان کی انفرادیت

جہاں تک مسلمانان ہند کا تعلق ہے، تحریک پاکستان کی جڑیں ان کے اس جبلی احساس میں پیوست ہیں کہ وہ ایک ''نظریاتی قوم'' ہیں اور اسی لئے وہ خود مختار، جداگانہ سیاسی وجود کے حق دار ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ محسوس کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ان کا جداگانہ تشخص، دوسری اقوام کی طرح، مشترکہ نسلی مشابہتوں اور قرابتوں یا مشترکہ ثقافتی اقدار و روایات کے شعور کی بنیاد پر قرار نہیں پاتا، بلکہ اسلامی نظریہ و اعتقاد سے مشترکہ وابستگی کی اساس پر قرار پاتا ہے۔ پس ان پر لازم آجاتا ہے کہ وہ اپنے جداگانہ تشخص کے جواز کی خاطر ایسا معاشرتی و سیاسی نظام قائم کریں، جس میں اسلامی نظریہ و اعتقاد (یعنی شریعت) ان کی قومیت کے ہر پہلو اور ہر مظہر میں سب کو دکھائی دے۔

یہ کہ تحریک پاکستان کا حقیقی و تاریخی نصب العین۔ یہ ہرگز ہندوستان میں مسلم اقلیت کے اجتماعی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ پاکستان میں ہمیشہ غیر مسلم اقلیتیں رہیں گی، جس طرح کہ ہندوستان میں مسلم اقلیتیں رہیں گی، اس لئے اقلیتوں کے مسئلے کے سراسر حل کی ذمہ داری پاکستان پر عائد نہیں ہوتی۔ یہی ہے وہ نکتہ جس پر ہمیں اور ہمارے نکتہ چینوں کو ذرا رک کر غور و فکر کر لینا چاہئے۔ اقلیتوں کا مسئلہ بے شک ہر لحاظ سے ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے لئے انتہائی اہم ہے، لیکن یہ مسئلہ بنیادی طور پر تحریک پاکستان کا ذمہ دار نہیں ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ اقلیتوں کا مسئلہ تحریک پاکستان کے اصلی نصب العین کا ایک اتفاقی لازمہ ہے۔ تحریک پاکستان کا اصلی نصب العین کیا ہے؟ ایک اسلامی ہیئت حاکمہ کا قیام، جس میں ہمارا نظریہ حقیقت کا رنگ روپ اختیار کر سکے۔ صرف اسی نصب العین کی روشنی میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ بمبئی یا مدراس کے مسلمان، جن کو خوب معلوم ہے کہ ان کے صوبے پاکستان کا حصہ نہیں بنیں گے، حصول پاکستان کے اتنے ہی متمنی ہیں جتنے پنجاب یا بنگال کے مسلمان۔ بمبئی اور مدراس کے مسلمان یہ جاننے کے باوجود کہ ان کے صوبے جغرافیائی و علاقائی اعتبار سے پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے، اگر ''مسلم اکثریت'' کے صوبوں کے بھائیوں کی مانند پوری شدت و توانائی سے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ اس دعوے کا ٹھوس ثبوت ہوگا کہ اسلام ایک عملی مذہب اور مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہ کہ مسلمان، محض مسلمان ہونے کی بنا پر ایک ملت ہیں، خواہ وہ جغرافیائی لحاظ سے کسی بھی علاقے میں آباد ہوں۔ اور اگر غیر مسلم ہمارے اس دعوے پر اس بنیاد پر نکتہ چینی کرتے ہیں کہ دنیا میں کہیں بھی حتیٰ کہ دنیائے اسلام میں بھی، کسی ملک یا علاقے میں محض مذہبی عقائد کی اساس پر جداگانہ قومیت کا مطالبہ نہیں کیا جاتا، تو ہمارا جواب یہ ہے کہ یہی تو تحریک پاکستان کی خاص انفرادیت ہے۔

کیا دوسروں کو یہ طے کرنے کا حق دے دیا جائے کہ ہماری قومیت کے عناصر کیا ہونے چاہئیں اور کیا نہیں؟ کیا ہمیں اس حقیقت کے اعتراف میں شرمساری محسوس کرنی چاہئے کہ ہمارا سیاسی نصب العین ترکوں، مصریوں، افغانیوں، شامیوں یا ایرانیوں کے موجودہ سیاسی نصب العین سے بالکل مختلف ہے؟ کیا ہمیں یہ سوچ کر فخر نہیں کرنا چاہئے کہ تمام مسلم اقوام میں، یہ ہم اور صرف ہم مسلمانان ہند ہیں جو گردش ایام کو پیچھے کی طرف ہٹا کر ''امت واحدہ'' کے اس تصور کی

Marfat.com

جستجو میں نکل کھڑے ہوئے ہیں جن کی ہدایت انسان کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ کے لئے روشن کر دی تھی۔

پس دنیائے اسلام میں جہاں کہیں بھی سیاسی عوامی تحریکیں چل رہی ہیں، ان سب کے مقابلے میں تحریک پاکستان فی الحقیقت منفرد و یکتا ہے۔ اس جیسی اور کوئی تحریک نہیں۔ بلاشبہ وسیع و عریض دنیائے اسلام میں اور بھی لوگ ہیں جو اسلام کے سچے شیدائی ہیں، جو رسول اکرم کی تعلیمات کے فروغ کے لئے اور اپنی قوم کی اخلاق سربلندی کے لئے بے لوث خدمات انجام دے رہے ہیں، لیکن پوری دنیا میں کہیں بھی ایسا نہیں ہے، سوائے تحریک پاکستان کے، کہ پوری کی پوری مسلم قوم منزل اسلام کی جانب گامزن ہو گئی ہو۔ پوری دنیائے اسلام میں کوئی عوامی تحریک ایسی نہیں ہے، جس کی اساس، اسلامی جذبے پر رکھی گئی ہو، سوائے تحریک پاکستان کے۔ کسی بھی موجودہ اسلامی ملک میں ایسی تحریک نہیں چلی جس کا مقصد اسلامی نظام کا نفاذ ہو، سوائے تحریک پاکستان کے۔ بعض اسلامی ممالک مثلاً ترکی اور ایران، اپنے سرکاری و حکومتی مقاصد میں علانیہ غیر اسلامی ہیں، اور انہوں نے کھلم کھلا اعلان کر رکھا ہے کہ اسلام کو سیاست اور عوام کی معاشرتی زندگی سے الگ رکھنا چاہئے۔ حتیٰ کہ ان اسلامی ملکوں میں بھی، جہاں مذہب کی تھوڑی بہت قدر باقی ہے، اور جہاں مختلف مدارج میں اس کی روحانی میراث برقرار ہے وہ بھی، یوں سمجھئے کہ صرف ان معنوں میں ''اسلامی'' ہیں کہ وہاں کے باشندوں کی اکثریت کا مذہب اسلام ہے، جبکہ ان کے سیاسی مقاصد و عزائم اسلامی اصول و نظائر کے تابع نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے حکمران یا مقتدر گروہ جس چیز کو ''قومی مفادات'' کہتے ہیں، مغرب کے مفہوم ہی میں ''قومی مفادات'' ہیں۔ اس لئے ان ملکوں کی سیاسی تنظیمات سے، خواہ وہ سعودی عرب یا افغانستان کی طرح مطلق العنان سلطنت ہوں یا شام کی طرح ری پبلک ہوں یا مصر اور عراق کی طرح آئینی بادشاہت ہوں، اسلام کی طرف جھکاؤ رکھنے کی توقع نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان ملکوں کے عوام یا حکمران اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مختلف تاریخی وجوہ سے ان کی حکومتوں یا سیاسی نظاموں کا اسلام سے براہ راست تعلق نہیں ہے۔

تحریک پاکستان کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ بلاشبہ اس تحریک میں اسلام سے جذباتی وابستگی اور اسلامی سیاسی نظام میں آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس تحریک کی عملی کامیابی کا سبب ہمارے عوام کی یہ جذباتی خواہش (اگرچہ مبہم) ہے کہ ایک ایسی ریاست قائم کی جائے، جہاں حکومت کی اشکال و اغراض اسلام کے اصول و احکام کے مطابق ہوں، ایک ایسی ریاست جہاں اسلام عوام کے مذہبی و ثقافتی روایات کا محض ٹھپہ نہیں ہوگا بلکہ ریاست کی تشکیل و تاسیس کا بنیادی مقصد ہوگا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک ایسی نئی اسلامی ریاست...... جو جدید دنیا میں پہلی ریاست ہوگی...... تمام اسلامی ملکوں کے سیاسی افکار میں انقلاب برپا کر دے گی، اور دوسرے اسلامی ملکوں کے عوام میں بھی تحریک پیدا کرے گی کہ وہ ایسے ہی نصب العین کے لئے جدوجہد کریں، اور یوں یہ ریاست (پاکستان) دنیا کے اکثر حصوں میں تجدید و احیائے اسلام کی عالمگیر تحریک کا پیش خیمہ بن جائے گی۔

اس لئے مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ تحریک پاکستان احیائے اسلام کے لئے زبردست امکان کا درجہ رکھتی ہے، اور جہاں تک میری نظر جاتی ہے، تحریک پاکستان ایک ایسی دنیا میں تجدید و احیائے اسلام کی ''واحد امید'' ہے جو بڑی

Marfat.com

تیزی سے اسلامی مقاصد سے دور ہٹتی جا رہی ہے۔ لیکن یہ ''واحد امید'' بھی اس اعتبار پر قائم ہے کہ ہمارے قائدین اور عوام قیام پاکستان کا اصل مقصد اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں اور اپنی تحریک کو ان نام نہاد ''قومی'' تحریکوں میں شامل کرنے کی ترغیب میں نہ آئیں جو آئے دن جدید دنیائے اسلام میں ابھرتی رہتی ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا خطرہ ہے، اور مجھے کبھی کبھی اس کے رونما ہونے کا خدشہ صاف نظر آتا ہے۔ میری مراد نسلی خطوط پر قوم پرستی سے نہیں ہے، جس کی مثالیں دوسرے ملکوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ مسلمانان ہند میں نسلی بنیاد پر قوم پرستی ناممکن ہے، کیونکہ یہاں مسلم قوم انتہائی متنوع نسلی عناصر سے ترکیب پاتی ہے۔ لیکن تحریک پاکستان کے اپنے اصلی نظریاتی راستے سے منحرف ہونے کا خطرہ مجھے ایک اور سبب سے نظر آ رہا ہے۔ وہ سبب یہ ہے کہ ''ثقافتی قومیت'' پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے، مشترکہ نظریاتی اساس کے بجائے چند مخصوص ثقافتی رجحانات، سماجی عادات و رسوم کا تحفظ، اور اس گروہ کے معاشی مفادات کا تحفظ جو بر بنائے پیدائش ''مسلمان'' واقع ہوتے ہیں۔ اس میں شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ اسلامی خطوط پر مسلمانوں کے مستقبل کی منصوبہ سازی میں ثقافتی روایات و اقدار اور فوری معاشی تقاضوں کی پاسداری انتہائی اہمیت کے حامل عوامل ہیں، لیکن جو نکتہ ذہن نشین کرانا مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ ان انتہائی اہم عوامل کو ہمارے نصب العین سے الگ جداگانہ حیثیت نہیں دی جا سکتی۔

لیکن صاف نظر آ رہا ہے کہ ہمارے اکثر و بیشتر ارباب دانش سے یہ غلطی سرزد ہو کر رہے گی۔ جب وہ پاکستان کی بات کرتے ہیں تو وہ اکثر یہ تاثر دیتے ہیں کہ جیسے مسلم دنیا کے ''حقیقی'' مفادات اسلام کے خالص نظریاتی مفادات سے جدا کوئی چیز ہوں۔ بالفاظ دیگر اسلام کے بنیادی نظائر و شعائر سے کوئی تعلق رکھے بغیر بھی ''اچھا پاکستانی'' بننا ممکن ہے۔

میرا خیال ہے کہ قارئین محترم میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ ''مسلم مفادات'' اور ''اسلامی مفادات'' میں تفریق کرنا بے عقلی کی بات ہے۔ اسلام مسلمانوں کے وجود تشخص کے چند عوامل و خصائص میں سے محض ایک نہیں ہے بلکہ اسلام تو ان کے وجود کی تاریخی علت اور بنیادی جواز ہے۔ اور مسلم مفادات کو اسلام سے جدا کوئی چیز خیال کرنا ایسے ہے جیسے کسی ''زندہ چیز'' کو زندہ بھی کہنا اور زندگی سے عاری بھی سمجھنا۔ ایک سوچنے سمجھنے والے آدمی کے نزدیک یہ کیسی ہی بے عقلی کی بات ہو، یہ امر بھی تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بیشتر لوگ (اور ان میں ہمارے بیشتر ارباب دانش بھی شامل ہیں) غور و فکر نہ کرنے کی عادت میں مبتلا ہیں۔

فراریت اور خود فریبی

جب ہمارے قائدین اور ہمارے ارباب دانش حصول پاکستان کی خاطر مسلمانوں سے اتحاد، اخوت، ایثار اور ضرورت پڑنے پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کی اپیلیں کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں ''اسلامی ہیئت حاکمہ'' کا نقشہ کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ درست نہیں ہے کہ وہ تحریک پاکستان کے منفی پہلو سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ یہ منفی پہلو ناممکنات سے ہے، یہ کہ غیر مسلم غلبے کے تحت مسلمانوں کا آزادانہ زندگی گزارنا۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ وہ تحریک پاکستان کے مثبت پہلو سے تعلق کم رکھتے ہیں۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ اسلام کی خاطر، اسلام کے مطابق اپنا معاشرتی و سیاسی نظام قائم کرنا۔

Marfat.com

کیا یہ درست نہیں ہے کہ اکثر و بیشتر تعلیم یافتہ مسلمانوں اور ہمارے اکثر سیاسی لیڈروں کے نزدیک اسلام محض غیر مسلموں سے فرقہ وارانہ جدو جہد میں ایک جنگی تدبیر ہے، بجائے اس کے کہ اسلام مقصود بالذات ہوتا۔ گویا اسلام ہماری منزل مقصود نہیں، ایک منطقی استدلال ہے۔ ایک امنگ نہیں، ایک نعرہ ہے۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ ہمارے اکثر رہنما نام نہاد مسلم قوم کے لئے زیادہ سیاسی قوت اور زیادہ معاشی مراعات کے حصول کے لئے کوشاں ہیں، بجائے اس کے کہ وہ نام نہاد مسلم قوم کو ایک سچی اسلامی قوم بنانے کی کوشش کرتے؟

ہمارے رہنماؤں نے اب تک جو اچھے کام انجام دیئے ہیں، میں انہیں کم کر کے نہیں دکھانا چاہتا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بعض اعتبار سے ان کے کارنامے بہت زیادہ ہیں اور انتہائی تعریف و توصیف کے مستحق ہیں۔ انہوں نے ایک خواب خرگوش میں ڈوبی ہوئی قوم کو بیدار کیا ہے، یہی کارنامہ بہت بڑا ہے۔ پھر یہ کہ انہوں نے قوم میں ایسا زبردست اتحاد پیدا کیا ہے، جو دنیائے اسلام میں اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آتا۔ ہر ذی ہوش آدمی اس کا اعتراف کرے گا اور کرنا چاہئے۔ میں جو اپنے بعض رہنماؤں پر الزام تراشی کرتا رہتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلم عوام کی تقدیر بدل دینے والی اس فیصلہ کن گھڑی میں انہیں روحانی عظمت کی راہ پر گامزن کرنے کے بجائے، دیدہ دانستہ اس راہ پر لگا دیا جو بنیادی طور پر ہمارے موجودہ بحران کی ذمہ دار ہے۔ اس بات کو میں سادہ لفظوں میں یوں کہوں گا کہ ہمارے رہنماؤں نے یہ بتانے اور دکھانے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی کہ اسلام ہی ہماری موجودہ جدوجہد اور تحریک کا اصل اور بنیادی مقصد و منتہا ہے۔ اس میں شک نہیں، جب وہ اخباری بیان جاری کرتے ہیں یا عوامی جلسے سے خطاب کرتے ہیں تو اسلام کا نام ضرور لیتے ہیں، لیکن لفظ اسلام کا استعمال وہ صیغہ مستقبل میں کرتے ہیں، کہ جب پاکستان وجود میں آجائے گا تو اسلام بھی آجائے گا۔ انہوں نے کبھی مسلمانوں کے موجودہ طرز فکر اور طرز حیات کو اسلام اور اصول و احکام سے زیادہ ہم آہنگ اور مطابق کرنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ میرے خیال میں، یہ بہت بڑی فروگذاشت ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ مستقبل حال کا بچہ ہے۔ اٹل ہے، غیر متبدل ہے۔ جیسا ہم آج سوچیں اور کریں گے، اس کا اثر ہماری کل کی زندگی پر ضرور پڑے گا۔ اگر پاکستان کا مطلب فی الواقع "لا الہ الا اللہ" کے کلمے میں پوشیدہ ہے تو ہمارا عمل بھی اس کلمے کے مطلب کے قریب سے قریب تر ہونا چاہئے، گویا ہمیں صرف اپنے قول کا سچا مسلمان نہیں، بلکہ اپنے عمل کا بھی پکا مسلمان ہونا چاہئے۔

یہ فریضہ اور منصب ہمارے رہنماؤں کا ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو تلقین کریں کہ آج وہ پکے مسلمان بنیں تا کہ کل سچے پاکستانی بن سکیں۔ حالانکہ وہ ہمیں صرف اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ پاکستان کے بنتے ہی ہم پکے مسلمان بن جائیں گے۔

یہ آسان اور لفظی یقین دہانی ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ پرلے درجے کی خود فریبی ہے۔ اگر ہم اسلامی زندگی کا بیج آج نہیں بوئیں گے، جبکہ اسلام کے ساتھ ہمارا تحریکی جوش و خروش اپنے عروج پر ہے، تو کوئی بھی معقول آدمی اس یقین دہانی پر اعتبار نہیں کرے گا کہ جب تحریک ختم ہو جائے گی اور سیاسی آزادی مل جائے گی، تو ہم یکا یک

Marfat.com

اور خود بخود سچے اور پکے مسلمان بن جائیں گے۔

بعض رہنما میرے اس خیال کے جواب میں کہتے ہیں: ''بھائی صاحب! تم قنوطی ہو۔خواہ مخواہ تشویش میں مبتلا رہتے ہو۔ہم سب سچی اسلامی زندگی کے آرزومند ہیں، لیکن ابھی اسی وقت اس پر اصرار خلاف مصلحت ہوگا۔ ہماری صفوں میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو سیاسی میدان میں قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں، لیکن غلط تربیت کے باعث مذہب کی زیادہ پروانہیں کرتے۔ اگر ہم اپنی تحریک کے آغاز ہی میں اپنی جدوجہد کے مذہبی پہلو پر زیادہ زور دیں گے تو ان قیمتی کارکنوں کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا، جس کا ہماری جدوجہد پر بہت برا اثر پڑے گا اور یہ سراسر نقصان کی بات ہوگی۔ ہمارے نصب العین کو ضعف پہنچے گا۔ ہم اپنے رضا کاروں کو کھونا نہیں چاہتے۔ ان کی خدمات سے محروم نہیں ہونا چاہتے۔ ہماری اپنی اسلامی مملکت حاصل ہونے تک ہم اپنے عوام کی مذہبی اصلاح کا کام ملتوی کرنے پر مجبور ہیں۔ فی الحال ہمیں اپنی پوری توانائیاں اس چھوٹے مقصد کے حصول کے لئے وقف کر دینی چاہئیں، یعنی غیر مسلم تسلط سے مسلمانوں کی آزادی، اور اپنی توانائیاں خالص مذہبی معاملات پر فی الحال خرچ نہیں کرنی چاہئیں۔ ایک سچی اسلامی ہیئت حاکمہ کا قیام اور مسلمانوں میں سچا مذہبی شعور بہت اہم کام ہے، لیکن یہ قیام پاکستان کے بعد شروع ہوگا۔ فی الحال مغرب زدہ بھائیوں اور بہنوں کو اپنے نصب العین سے الگ کر دینے سے نقصان ہوگا، بلکہ مذہب پر زیادہ زور دینے سے پاکستان کے علاقے میں رہنے والی غیر مسلم اقلیتوں کو بھی تشویش پیدا ہوگی۔''

میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ طرز استدلال بالکل غلط ہے، اور عقلی لحاظ سے بددیانتی۔ آیئے ان حضرات کی ایک ایک دلیل پر، نکتہ بہ نکتہ غور کرتے ہیں۔ پہلے غیر مسلم اقلیتوں والی بات لیتے ہیں۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ اسلامی طرز فکر و حیات پر زور دینے سے ہماری غیر مسلم اقلیتوں میں تشویش پیدا ہوگی، تو میں آپ سے پوچھتا ہوں: ''وہ کیا چیز ہے جس نے غیر مسلموں کو نظریہ پاکستان کا سخت مخالف بنا رکھا ہے؟'' ظاہر ہے، فرقہ وارانہ راج کا خوف، اس بات کا خوف کہ مسلم اکثریتی علاقے بھارت ماتا سے کٹ جائیں گے۔ یہ مسئلہ غیر مسلموں کے ذہن میں پیدا ہی نہیں ہوتا کہ مسلمان اسلامی اصول و احکام کے مطابق اپنی زندگی گزارنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ وہ اگر خائف ہیں تو اس بات سے کہ بعض علاقوں میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار قائم ہو جائے گا۔ انہیں بہ نظر ظاہر اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ مسلمان اپنے مذہب پر چلنے کی کتنی امنگ رکھتے ہیں اور اس پر چلنے کے کیسے عزائم رکھتے ہیں۔ بعض علاقوں میں مسلم سیاسی اقتدار کے خلاف وہ ہر حالت میں اور ہر صورت میں مخالفت کریں گے اور اسے رکوانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے۔

ہمارے حریفوں کے مخالفانہ رویے کے باوجود، اگر انہیں یہ باور کرایا جائے کہ ہم مسلمانوں کا مقصد ''سب کے لئے عدل و انصاف'' کا قیام ہے تو وہ کسی حد تک اس خیال سے متاثر ہو سکتے ہیں، میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ ضرور متاثر ہو جائیں گے، صرف یہ کہا ہے کہ متاثر ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ ہم انہیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جائیں کہ ہم مسلمانوں کے مفاد کی خاطر غیر مسلموں کا استحصال نہیں کرنا چاہتے، بلکہ ہم انسانی اخلاق کے بنیادی اصولوں کی بالادستی قائم کرنے

Marfat.com

کے متمنی ہیں۔ لہٰذا یہ ہمارا فرض عین ہے کہ ہم پوری دنیا پر ثابت کر دیں کہ ہم فی الواقعی قرآن مجید کے ان الفاظ کے معنی ومنشاو معیار کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں:

کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنکر و تومنون باللّٰہ

(ترجمہ: اب دنیا میں وہ بہترین امت تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو...... سورہ آل عمران۔ آیت 110)

اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہمارا بہترین امت ہونے کا انحصار اس امر پر موقوف ہے کہ ہم ہمیشہ اور ہر حالت میں انصاف کی بالادستی اور بے انصافی کے انسداد کے لئے، جدوجہد کے لئے ہمہ وقت تیار رہیں۔ غیر مسلموں کو اپنی عدل گستری کا یقین دلانے سے پہلے ہم کو ایک سچی مسلم قوم بننا پڑے گا۔ ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک غیر مسلم کو ایک ایسی ریاست میں رہتے ہوئے تشویش ضرور لاحق ہوگی، جو اس کی نظر میں معاشی حقوق ومفادات میں مسلمانوں کو غیر مسلموں پر ترجیح دے گی۔ لیکن اگر اسے یقین دلایا جائے کہ وہاں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ساتھ یکساں سلوک ہوگا تو اس کی تشویش دور نہیں ہوگی، تو اس میں کمی ضرور ہو جائے گی۔ اب یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ ہم اپنے حریفوں کو اپنی اصلی سچائیاں نہیں دکھا سکتے، جب تک ہم ان پر ثابت نہیں کر دیں، اول یہ کہ اسلامی حکومت کا مطلب ہے عدل سب کے لئے، دوم یہ کہ ہم مسلمان واقعی اپنے دین کے احکامات پر، قول وفعل میں، سچے پیروکار ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلامی حکومت میں عدل سب کے لئے ہوتا ہے، تو ایسا ہی ہوگا۔ اس لئے یہ سمجھنا انتہائی غلط ہے کہ اگر ہم اپنے مذہبی مقاصد پر زور نہیں دیں گے اور حتی الوسع براہ راست مذہبی حوالے دینے سے احتراز کریں گے تو اس طرح غیر مسلم اقلیتوں کی تشویش دور ہو جائے گی۔ بلکہ ہمارے اس رویے سے تو انہیں یہ شبہ ہوگا کہ ہم منافقت سے کام لے رہے ہیں۔ ان کی تشویش دور یا کم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم صاف دلی سے، اور پوری تفصیلات کے ساتھ بتا دیں کہ ہمارے اخلاقی مقاصد کیا ہیں جن کے لئے ہم جدوجہد کر رہے ہیں، لیکن صاف دلی سے دیئے گئے بیانات سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا، تاوقتیکہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں انہیں یہ مشاہدہ نہ کرا دیں کہ ہمارے اخلاقی مقاصد محض نعرے نہیں ہیں، بلکہ ہمارے اخلاقی اعمال ہیں۔

عارضی قسم کے ''خلاف مصلحت'' یا ''سیاسی تدبر'' کے نام پر (غلط فہمی سے) اپنے اصل مستقل اسلامی مقاصد سے گریز پائی ایک ایسی ناعاقبت اندیشی ہے، جس سے غیر مسلموں پر تو برا اثر پڑتا ہی ہے، ہم مسلمانوں کے اخلاقی مزاج پر بھی نقصان دہ اثر پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہی نکل سکتا ہے کہ ہم اسلام کے بتائے ہوئے راستے سے مزید دور ہو جائیں۔ ہم مسلمانوں کے سامنے احیائے اسلام کا جو اصل نصب العین ہے، اس سے زیادہ سے زیادہ شعور وآگہی کے بجائے، ہم دوبارہ مصلحت اندیشی اور فوری آسائش کی اصطلاحوں میں سوچنے کے عادی ہو جائیں گے، جیسا کہ ہم صدیوں سے اس کے عادی چلے آرہے ہیں اور یوں پاکستان کا اسلامی نصب العین یقیناً گھٹ کر صرف نظریہ پرستی بن کر رہ جائے گا، جب کہ مغرب کی نام نہاد مسیحی اقوام میں مسیحیت کے سچے مقاصد گھٹ کر اپنی اصلیت کھو چکے ہیں۔

Marfat.com

ہم ہرگز ایسا نہیں چاہتے۔ ہم پاکستان اس لئے بنانا چاہتے ہیں کہ اسلام کو اپنی روزمرہ کی زندگیوں میں "حقیقت" بنادیں۔ ہم پاکستان اس لئے بنانا چاہتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک شخص، مردوزن، سچی اسلامی زندگی گزار سکے اور کسی فرد کے لئے اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے راستے پر زندگی بسر کرنا ممکن نہیں، تاوقتیکہ پورے کا پورا معاشرہ شعوری طور پر اسلام کو ملک کا قانون و دستور نہ بنائے اور کتاب وسنت کے احکام پر صدق دل سے عمل نہ کرے۔

لیکن اس قسم کا اصلی پاکستان کبھی حقیقت کا جامہ نہ پہن سکے گا، تاوقتیکہ ہم اسلامی قانون کو اپنے "غیر واضح اور مبہم" مستقبل کے لئے اصل اصول نہ بنائیں اور ابھی اسی گھڑی، اسی گھنٹے، اسی منٹ، اسی سیکنڈ سے اسلام اور اس کے احکام کو اپنے تمام شخصی اور معاشرتی طرزعمل کی اساس نہ بنائیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری صفوں میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو مذہب کو اس حد تک غیر اہم خیال کرتے ہیں، کہ ہم جو تحریک پاکستان کے مذہبی رخ پر اس قدر اصرار کررہے ہیں تو ہم سے ناراض ہو جائیں گے۔ اگرچہ دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ اگر انہیں یہ احساس دلایا جائے کہ مسلم قوم بہ حیثیت مجموعی اسلام کی جانب پیش قدمی کرنے کا عزم صمیم کر چکی ہے تو مذہب سے بے زار یہ لوگ، بہت جلد جماعت کے آگے سر تسلیم خم کر دیں گے۔ بہرصورت ان کی ذاتی ترجیحات کی زیادہ پروا نہیں کرنی چاہئے اور ہمارے عزم کی راہ میں ان کی بے عزمی کو راہ نہیں ملنی چاہئے۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ رسول کریم کفار قریش کی ناراضگی سے بچنے کے لئے، اور اس انتظار میں کہ ایک روز وہ اسلامی ریاست کی تشکیل وتعمیر میں معاون و مددگار ثابت ہوں گے، ایک دن کے لئے بھی اسلامی مقاصد کی تحصیل وتکمیل کو ملتوی کر دیتے؟

آپ اس کے جواب میں زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ "رسولؐ تو آخر رسولؐ تھے۔ ان کے لئے مصلحت کو نظرانداز کرنا ممکن تھا۔ ہم تو عام سے فانی بندے ہیں۔" اس کے جواب میں آپ سے پوچھوں گا کہ کیا آپ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر یقین رکھتے ہیں:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (ترجمہ: درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ تھا۔ سورہ احزاب' آیت ۲۱)

کیا یہ حکم ربانی آپ کی سیاست اور آپ کی دعاؤں، آپ کے ذاتی حالات وتفکرات اور آپ کی اجتماعی و معاشرتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا؟

پس چہ باید کرد

یہ سوچ ہماری روحانی ژولیدگی کی علامت ہے، اور اس کی بڑی وجہ صدیوں سے چلا آنے والا ہمارا زوال ہے، کہ کوئی سیاسی تحریک جو بیک وقت اسلامی تجدید واحیا کا بھی دعویٰ کرے، وہ اپنے اصل مقصد سے منحرف ہونے کے باعث ضرور ناکام ہو جاتی ہے اور گھٹ گھٹا کر مصر، ترکی اور شام جیسے ملکوں کی "قومی تحریک" بن جاتی ہے۔ ہمارے اکثر وبیشتر لیڈروں کا غالب رجحان طبع یہ ہے کہ وہ ہماری جدوجہد کے روحانی اسلامی پس منظر کو تو (غالباً نادانستہ) نظرانداز کر دیتے ہیں اور مسلمانوں کے مطالبہ آزادی کے جواب میں ہندو اکثریت کے ساتھ ان کے تلخ تجربات پیش کرنے کے

Marfat.com

پہلو بہ پہلو ہندوؤں کے سماجی رسوم وروایات اور ثقافتی مظاہر سے مسلمانوں کے اختلافات بیان کر کے ایک ''جداگانہ قوم'' ثابت کرنے پر زور بیان صرف کر دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جداگانہ مسلم قومیت کی حقیقت پر (اور بلاشبہ یہ حقیقت ہی ہے) لفظ ''قومیت'' کے مغربی مفہوم میں بیان کرنے کا رجحان بڑھتا چلا جا رہا ہے، بجائے اس کے کہ لفظ امت یا ملت کے اسلامی مفہوم میں ''جداگانہ مسلم قومیت'' کے مفہوم کی تشریح کی جائے۔ ہمیں بلاخوف وخطر، بہانگ دہل، ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کرنے میں ہچکچاہٹ کیوں ہے کہ لفظ ''قوم'' کے رواجی مفہوم سے ہمیں کوئی نسبت نہیں ہے۔ ہاں ہم ایک قوم ہیں، لیکن محض اس لئے نہیں کہ ہماری عادات، ہمارے رسوم ورواج، ہمارے ثقافتی مظاہر، اس ملک میں بسنے والی دوسری قوموں سے مختلف ہیں۔ بلکہ ہم اس مفہوم میں ایک قوم ہیں کہ ہم اپنے ایک خاص نصب العین کے مطابق اپنی زندگی ڈھالنا چاہتے ہیں۔

اسلام سے وابستہ ہونا ہی ہمارے جداگانہ تشخص کا واحد جواز ہے۔ ہم کوئی نسلی وحدت نہیں ہیں۔ ہم لسانی وحدت بھی نہیں ہیں، حالانکہ اردو مسلمانان ہند کی زبان کی حیثیت سے بڑی ترقی یافتہ زبان ہے۔ ہم انگریزوں یا عربوں یا چینیوں کی طرح ''قوم'' نہیں ہیں، اور نہ کبھی اس مفہوم میں قوم بن سکتے ہیں۔ اور یہی ایک حقیقت کہ ہم لفظ ''قوم'' کے روایتی ورواجی مفہوم میں نہ تو قوم ہیں اور نہ قوم بن سکتے ہیں، ہماری اندرونی قوت کا بہت بڑا سرچشمہ ہے۔ کیونکہ اس حقیقت کی بنیاد پر ہمیں یہ شعور حاصل ہوتا ہے کہ پورے کرہ ارض پر، پوری دنیا میں، ہم، فقط ہم، بشرطیکہ ہم ایسا چاہیں، اس شاندار منظر میں حیات نو پیدا کر سکتے ہیں جو چودہ سو سال پہلے عرب کے صحراؤں سے اٹھا تھا، ایسے آزاد مردوں اور عورتوں کی ایک امت کا شاندار منظر جو نسل، زبان اور وطن کے اتفاقی وحادثاتی بندھنوں کے باعث متحد و یک جان نہیں ہوئے تھے، بلکہ ایک مشترکہ نصب العین سے اپنی باشعور اور آزادانہ وفا شعاری کے باعث متحد و متفق ہوئے تھے۔

بدقسمتی سے ہمارے صف اول کے اکثر رہنما مسلمانوں کے اس گم کردہ راہ اور تشکیک پسند طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جن کے نزدیک اسلام ''ثقافتی روایت'' کے سوا کچھ نہیں، اور یوں پاکستان بھی ان کے خیال میں محض اس راہ کا ایک نشان ہے۔ پہلا قدم سہی، جن پر نام نہاد ''ترقی یافتہ'' مسلم اقوام دیر سے چلتی آ رہی ہیں، یعنی بہ تمام وکمال قومیت کی راہ۔ ہماری جدوجہد کے اسلامی پہلو پر یہ رہنما کبھی کبھار، زبانی کلامی کہہ بھی لیتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت اسلام کے مذہبی اصولوں کے مطابق مسلمانوں کی ذاتی واجتماعی زندگی ڈھالنے کی طرف اشارے کنایے میں بھی بات نہ کرنے کو ''جدیدیت'' خیال کرتے ہیں۔ پاکستان کے مطالبے کو بھی اسلامی مقاصد سے ہم آہنگ کرنے میں انہیں عار محسوس ہوتی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ دودلانہ رویہ تحریک پاکستان کے بدن سے، سب سے متحرک اور فعال عنصر یعنی روحانی عنصر کو نکال لیتا ہے۔ اور یہ چیز پاکستان کے مستقبل کے لئے اتنا بڑا خطرہ ہے کہ باہر کی کوئی مخالفت اس خطرے کی پاسنگ بھی نہیں ہے۔

عظیم اقوام کے مقدر کا انحصار اس بات پر نہیں ہوتا کہ ان کی پڑوسی اقوام اصولاً ان کے اغراض ومقاصد سے

Marfat.com

اتفاق یا اختلاف کرتی ہیں۔ان کے مقدر کا انحصار ان کے اغراض و مقاصد کی روحانی طاقت (یا کمزوری) پر ہوتا ہے۔

اگر پاکستان کے لئے ہماری آرزو نتیجہ ہے ہماری تخلیقی قوت اور ہمارے قلبی خلوص کا، اگر منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی اس کے منظر کے بارے میں ہماری بصارت واضح اور ہماری بصیرت پاکیزہ ہے، اگر مقصد کو مقصد بالذات جان کر اس سے محبت کرنے کا سلیقہ سیکھ لیں، اس عقیدے کے ساتھ کہ اپنے مطلقہ مفہوم میں یہ خیر اعلیٰ ہے (یا یوں کہئے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں خیر اعلیٰ ہے) اور محض اس لئے خیر نہیں ہے کہ بہ نظر ظاہر ہمارے لئے اور ہماری قوم کے لئے معاشی طور پر فائدہ رساں ہے۔تب دنیا کی کوئی طاقت ہمیں پاکستان بنانے سے نہیں روک سکتی جو دنیا بھر میں تجدید واحیائے اسلام کا دروازہ کھول دے گا۔

اور اس کے برعکس اگر خود اختیاری کے لئے ہمارا مطالبہ نتیجہ ہے غیر مسلم اکثریت کے تسلط کے خوف کا، اگر ہمارے ذہن پر مستقبل کی تصویر کا محض نیگٹو ثبت ہے، اگر یہ کسی بلند و بالا چیز کی خاطر آزاد ہونے کی آزادانہ آرزو نہیں ہے، اگر یہ صرف کسی چیز سے آزاد ہو جانے کی گداگرانہ خواہش ہے، اگر اسلام ہمارے لئے مقصود بالذات اور ایک اخلاقی داعیہ نہیں ہے، اگر اسلام ہمارے لئے محض ایک عادت، ایک رسم اور ایک ثقافتی ٹھپہ بن کر رہ گئی ہے، تب ایسی صورت میں یہ تو ممکن ہے کہ ہم اپنی عددی طاقت کے بل پر پاکستان کی قسم کو کوئی چیز حاصل کر لیں، لیکن ایسا پاکستان اس پاکستان کے برابر نہ ہوگا، جسے حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں بے حد و شمار امکانات سے نوازا ہے۔ایسا پاکستان بے شمار قومی ریاستوں کے منقسم ہجوم میں ایک اور ''قومی ریاست'' سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔ بہت سی ریاستوں سے اچھا، بہت سی ریاستوں سے برا۔ مسلم عوام کے تحت الشعور میں بسا ہوا خواب، اور ان لوگوں کے شعور میں آیا ہوا خواب جنہوں نے پہلے پہل پاکستان کی باتیں اس وقت کیں، جب یہ نام بھی پردۂ شہود میں نہ آیا تھا۔ وہ خواب کیا تھا؟ ایک ایسی ہیئت حاکمہ کا قیام جس میں رسول کریمؐ کے اسوۂ حسنہ اور سنت کو ہر قدم پر، ہر پہلو سے عملی حقیقت کا جامہ پہنایا جاسکے۔

فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہے

اگر ہمارے موجودہ رہنما ہمارے عوام کی دل کی دھڑکنیں سن سکیں، تو انہیں یقیناً احساس ہو جائے گا کہ عام مسلمان محض ایک ایسی نئی ریاست کا خواب نہیں دیکھتا، جس میں مسلمانوں کو موجودہ معاشی مراعات سے کچھ زیادہ حاصل ہو سکے۔وہ تو ایک ایسی ریاست کا خواب دیکھ رہا ہے جس میں احکام الٰہی کی فرماں روائی ہو۔ایسا نہیں ہے کہ عام آدمی معاشی مراعات و سہولیات کی پروا نہ کرتا ہے۔وہ یقیناً پرواہ کرتا ہے، بہت زیادہ کرتا ہے۔معاش ہر شخص کی بنیادی ضرورت ہے۔لیکن وہ محسوس کرتا ہے اور بجا طور پر محسوس کرتا ہے کہ ایک سچی اسلامی ریاست میں اسے نہ صرف معاشی انصاف اور مادی ترقی کا مساوی موقع ملے گا' جو فی الوقت اسے حاصل نہیں ہے، بلکہ اس کے انسانی وقار اور اس کے روحانی استحکام میں بھی قابل قدر اضافہ ہوگا۔

ہمارے عام آدمی کا یہ احساس، یہ امید، یہ آرزو، یہ خواب، جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں، منتشر ہے، بکھرا

Marfat.com

ہوا ہے، الجھا ہوا ہے۔ یہ عقلی نہیں، جبلی ہے۔ ہمارے عوام کے ذہن صاف نہیں ہیں کہ نئی اسلامی ریاست، جس کے لئے وہ جدو جہد کر رہے ہیں، اپنے قیام کے بعد کیسی اور کس شکل وصورت کی ہوگی۔ وہ پوری طرح نہیں جانتے کہ اس ریاست کے قیام کے لئے انہیں کیا ایثار کرنا ہوگا، اور کیا قیمت ادا کرنا ہوگی اور کیا قربانیاں کس کس شکل میں دینی پڑیں گی۔ وہ صاف دل اور صاف ذہن ہو بھی کیسے سکتے ہیں؟ صدیوں سے ان کا رشتہ اسلامی تعلیمات سے کٹا ہوا ہے۔ صدیوں سے وہ جہالت، ضعیف الاعتقادی اور سیاسی تذلیل کے ڈونگے کنوئیں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس لئے اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ وہ صرف نعروں اور زبانی کلامی وعدوں پر تکیہ کرتے ہیں۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے کہ وہ اپنے باطن میں چھپی ہوئی خواہشوں، اپنے دل میں پوشیدہ ارمانوں، اور اپنے ذہن کے لاشعوری خوابوں کے درمیان کوئی ربط پیدا نہیں کر سکتے، اور انہیں ان کے اظہار وقدرت حاصل نہیں ہے۔ وہ محسوس تو کرتے ہیں، لیکن انہیں اپنے محسوسات کے اظہار کا سلیقہ نہیں آتا۔ وہ یہ تو جانتے ہیں کہ انہیں ان کی خواہشات، محسوسات اور خوابوں سمیت آتش فشانی جہنم میں جلنے کو ڈال دیا گیا ہے لیکن یہ نہیں جانتے کہ اس جہنم سے نکلنے کا راستہ کیا ہے۔ یہ راستہ جاننے کے لئے روحانی قیادت کی ضرورت ہے، جس کی اہمیت سیاسی قیادت سے کم نہیں۔

ہمارے رہنماؤں کے سامنے اصل کرنے کا کام کیا ہے؟ ہمارے عوام کے خوابوں اور خواہشوں کو ایک تخلیقی اور مثبت رخ پر منظم کرنا، ان میں اسلام کی روح سمونا۔ ان کی تنظیم صرف سیاسی طور پر نہیں، بلکہ پاکستان کے عظیم تر مقصد کی خاطر روحانی اور نظریاتی طور پر بھی کی جائے۔ انہیں صرف اس پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے کہ انہیں ایک جماعت میں منظم کر دیا جائے اور ان کے سیاسی مطالبات کو زبان دے دی جائے۔ ملت ان سے کچھ اور بھی تقاضا کرتی ہے۔ بلاشبہ تنظیم کی سخت ضرورت ہے۔ سیاسی اجتماع بھی ایک ضرورت ہے۔ لیکن یہ تمام ضرورتیں ہمارے نظریاتی مقصد کے حصول کی خاطر ہونی چاہئیں، نہ کہ جیسا کہ آج کل دیکھنے میں ارہا ہے، یہ دوسرے تیسرے درجے کی چیزیں بن کر رہ گئی ہیں۔ ایک مسلمان کے نزدیک، جس کے لئے اسلام ہی اس کا جینا مرنا ہے، ہر سیاسی تحریک کو اپنی سند جواز مذہب سے حاصل کرنی چاہئے، کیونکہ مذہب سیاست سے الگ نہیں ہو سکتا، اور اس کی وجہ بڑی سادہ ہے، یہ کہ اسلام صرف ہمارے روحانی ارتقا سے غرض نہیں رکھتا، بلکہ ہماری جسمانی، معاشرتی اور اقتصادی زندگی سے بھی پورا پورا تعلق رکھتا ہے۔ اسلام ہمارا مکمل ضابطہ حیات ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے لئے، پاکستان کی حمایت میں، پاکستان کی خاطر مسلم عوام سے مسلم رہنما جو پُر زور اپیلیں کرتے رہتے ہیں، ان کا پہلا حوالہ پاکستان میں اسلام کا دینی و مذہبی پہلو ہونا چاہئے۔ اگر اس اندرونی آواز اور مطالبے کو نظر انداز کیا گیا، تو ہماری جدو جہد اپنے تاریخی مشن کو پورا نہ کر سکے گی۔

ہمارے لیڈروں کے لئے اسلامی ونظریاتی قیادت کی ضرورت آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اگر سب رہنما نہیں، تو گنتی کے چند رہنما ایسے ضرور موجود ہیں جو وقت کی اس اہم ضرورت سے پوری طرح باخبر بھی ہیں اور اس ذمہ داری سے پوری طرح عہدہ برآ بھی ہو رہے ہیں، مثال کے طور پر چند سال قبل مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے شاندار جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر قائد اعظم کے دست راست لیاقت علی خان صاحب نے جو خطبہ صدارت پیش کیا، انہوں

Marfat.com

نے بڑے زوردار طریقے سے اس حقیقت کو اجاگر کیا کہ تحریک پاکستان کے محرکات کا اصل سرچشمہ قرآن مجید ہے، لہٰذا ہم جس اسلامی ریاست کے قیام کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں، وہ اپنی سند اختیار و مجاز صرف شریعت سے حاصل کرے گی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے بھی متعدد موقعوں پر ایسے ہی انداز فکر میں خطاب کیا ہے۔ ایسے بیانات وخطبات چونکہ مسلم لیگ کی ہائی کمان کی طرف سے آتے ہیں، اس لئے مسلم لیگ کے مقاصد واغراض کی تشریح وترجمانی ہو جاتی ہے، لیکن محض تشریح وترجمانی کافی نہیں۔ اگر مسلم لیگ کے اسلامی اغراض ومقاصد کو ہماری سیاست پر عملاً اثر انداز ہونا ہے تو مسلم لیگ کی ہائی کمان کو زیادہ ٹھوس بنیاد پر وضاحت وتشریح کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ اس کام کی خاطر ارباب دانش کی ایک بااختیار مجلس بنانی چاہئے۔ جو ان اصولوں کی مناسب وضاحت وتشریح کرنے کا فریضہ انجام دے جن پر پاکستان کی بنیاد استوار کی جائے گی۔

چند سال پہلے تک اس کام کی ضرورت اتنی شدید نہ تھی، کیونکہ اس وقت ہماری سیاسی منزل مقصود بھی واضح نہ تھی۔ لیکن جیسا کہ آج کل کے حالات کا تقاضا ہے، ملک میں ایسی زبردست تبدیلیاں پے در پے آ رہی ہیں جس کے سبب مستقبل قریب میں پاکستان کا حصول وقیام ایک ممکن العمل چیز نظر آ رہا ہے۔ اب یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جون 1948ء سے پہلے پہلے پاکستان نام کی ایک نئی آزاد اور خود مختار ریاست کسی نہ کسی شکل میں وجود میں آ جائے گی۔ یہی ہے وہ نکتہ جو میں آپ کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ہے: ''کسی نہ کسی شکل میں''...... اب یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام ہے، اور یہ ہمارے ہاتھ میں ہے کہ پاکستان کی شکل کیسی ہو۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ یہ سوال کہ ''کیا ہم واقعی اسلام چاہتے ہیں؟'' اب محض نرے غور وفکر کے صاف ستھرے شعبے سے نکل کر فوری نوعیت کی عملی سیاست میں داخل ہو گیا ہے اور پوری شدت سے پوچھ رہا ہے: ''کیا ہم واقعی اسلام چاہتے ہیں؟''

یہ عین ممکن ہے کہ اس مضمون کے شائع ہونے سے پہلے ہی قائداعظم نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی قائم کرنے کا مژدہ مسلمانان ہند کو دے دیا ہو، اور اگر ابھی تک ایسا نہ ہو سکا ہو تو بہت جلد اس کا اعلان منظر عام پر آ جائے گا۔ لہٰذا مسلمان واضعین قانون اور ارباب دانش کو فوراً ذہنی طور پر خود کو تیار کر لینا چاہئے کہ نئی اسلامی ریاست کا سیاسی نظام کیا ہوگا، کس نوعیت کا معاشرہ استوار کرنا ہوگا، اور قومی مقاصد کیا ہوں گے۔ ان کے سامنے جو مسئلہ درپیش ہے، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل سادہ ہے: کیا ہماری ریاست مذہب سے عالمی دوری کی ایک اور علامت ہوگی، ان مسلم ریاستوں میں ایک اور مسلم ریاست کا اضافہ، جن میں اسلام کا کوئی اثر اور عمل دخل نہیں ہے۔ نہ سیاسی نظام کی تشکیل میں نہ معاشرتی طرز عمل میں۔ یا پھر یہ جدید تاریخ میں ایک نہایت پُر جوش اور انتہائی شاندار تجربہ ہوگا۔ اس شاہراہ میں پہلا قدم جو انسان کامل نے پوری انسانیت کو دکھائی تھی؟ کیا پاکستان برعظیم ہندوستان کے چند خاص علاقوں میں مسلمانوں کی قومی ترقی کا ایک ذریعہ ہوگا، یا پھر پاکستان ایک عملی سیاسی نظریہ کے طور پر پوری دنیا میں اسلام کی تجدید واحیا کی علم برداری کرے گا؟

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

Marfat.com

اگر کبھی کسی قوم کے سامنے فیصلے کی گھڑی آئی ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں شعوری فیصلہ کرے، تو مسلمانانِ ہند کے لئے فیصلے کی گھڑی آ گئی ہے۔ اب یہ ذمہ داری ہمارے رہنماؤں کے کندھوں پر ہے کہ وہ فیصلہ کریں اور صحیح فیصلہ کریں۔

اس سے پہلے کبھی مسلم رہنماؤں کو ایسا اختیار تفویض نہیں ہوا کہ وہ ملت کی تقدیر کا فیصلہ صحیح (یا غلط) سمت میں کریں۔ یہ ان کے اختیار و طاقت میں ہے کہ وہ جلد از جلد اپنا فیصلہ سنائیں کہ ہندی مسلمان صحیح معنی میں مسلمان اور حیات نو پانے والے اسلام کی پشت پناہ بن جائیں گے، یا پھر نام نہاد مسلمان گروپوں اور ریاستوں کے ہجوم میں ایک اور مسلمان گروپ اور ریاست کا اضافہ ہو جائے گا، جہاں اسلام کی حیثیت ایک ثقافتی ٹھپے سے زیادہ نہیں، جہاں اسلام اور اس کے اصول و احکام امت المسلمین کے معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی وجود کے لئے ناگزیر خیال نہیں کئے جاتے۔ مسلم لیگ کی موجودہ قیادت' میں پھر دہراتا ہوں، مسلم لیگ کی موجودہ قیادت کے ہاتھ میں ہے فیصلہ کرنا، صحیح فیصلہ کرنا، کیونکہ حصول پاکستان کے لئے جوش و خروش کی جو زبردست لہر اٹھی ہے، وہ مسلم لیگ نے اٹھائی ہے اور اس نے اس ملک کے تمام مسلم عوام کو اٹھا دیا ہے، انہیں متحد کر دیا ہے، اور متحدہ کیا ہے کہ اس سے پہلے کبھی ماضی کی تاریخ میں اتحاد کا ایسا شاندار مظاہرہ دیکھنے میں نہیں آیا اور جوش و خروش کی اس لاثانی لہر نے ہمارے رہنماؤں کو مسلمانوں کی قیادت کے لئے ایسی باوقار طاقت تفویض کی ہے، جو گزشتہ کئی صدیوں کے دوران میں کسی قوم نے اپنے رہنماؤں کو کبھی تفویض نہیں کی تھی۔ گویا اسی بااختیار و وقار و طاقت کی بنا پر ان کی اخلاقی ذمہ داری بھی بہت زیادہ ہے۔ انہیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی ذمہ داری "سیاسی تدبر" سے شروع اور "سیاسی تدبر" پر ختم ہو جاتی ہے۔ سیاسی تدبیریں خواہ کتنی بھی ضروری اور ناگزیر ہوں، یہ محض ثانوی نوعیت کی ہوتی ہیں اور لیڈروں کے فرائض میں ایک عبوری اور عارضی مرحلے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیڈروں کا اصل منصب و فریضہ "قوم سازی" ہے۔ چونکہ ہماری قومیت کی بنیاد اسلام ہے، اس لئے ہمارے لیڈروں کو فوراً اسلام کی اصطلاحوں میں سوچنا شروع کر دینا چاہئے، کیونکہ مستقبل کے لئے افکار تازہ کی نمود کو ملتوی کئے جانا اب کسی اعتبار سے مناسب نہیں (یہ سوچنا اور کہنا اب غلط اندیشی ہے کہ "ایسے امور و معاملات پر اس وقت غور کیا جائے گا جب پاکستان قائم ہو جائے گا")۔ ہمارے لیڈروں کو اسلام کے تقاضوں اور مسلم قوم کے عارضی مفادات کے درمیان خیالی خط نہیں کھینچنا چاہئے کیونکہ اسلام کے تقاضے جامع اور ہمہ گیر ہیں، ان میں مسلمانوں کے روحانی معاملات بھی شامل ہیں اور معاشی مفادات بھی۔ اسلام کے تقاضوں کے روبرو مکمل، رضا کارانہ اور باشعور دست برداری واحد حل ہے۔

مختصر یہ کہ اب یہ ہمارے سیاسی رہنماؤں کا فرض ہے کہ وہ عوام کو بار بار تلقین کریں کہ حصول پاکستان کا مقصد ایک سچی اسلامی ہیئت حاکمہ کا قیام ہے اور یہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتا، جب تک تحریک پاکستان کا ہر کارکن، وہ مرد ہو یا عورت، بڑا ہو یا چھوٹا، دیانت داری سے اپنی زندگی کو ہر گھنٹے اور ہر منٹ اسلام کے قریب سے قریب تر لانے کی کوشش نہ کرے گا، کیونکہ ایک اچھا مسلمان ہی ایک اچھا پاکستانی بن سکتا ہے۔

Marfat.com

ہمارا اخلاقی قدوقامت

یہ بات جہاں عامۃ المسلمین پر صادق آتی ہے، وہاں ہمارے لیڈروں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ انہیں اپنے معاشرتی رویے سے یہ ظاہر و ثابت کرنا ہوگا کہ وہ پوری سنجیدگی سے اسلام کو ایک سچا اصول و نظریہ قرار دیتے ہیں، اور اسے محض ایک نعرہ نہیں سمجھتے۔ سادہ لفظوں میں یوں کہیے کہ وہ اسلام کے عین تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش۔ یقیناً ہمارے لیڈروں میں بہت سے ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک اسلام ایک زندہ محرک ہے، اور ان کے لئے اظہار خلوص و عقیدت ہم پر واجب ہے۔ لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جن کی صرف زبان پر اسلام کا نام آتا ہے، اور وہ بھی اس وقت جب وہ کسی عوامی جلسے سے خطاب کر رہے ہوں یا کوئی اخباری بیان ان کی طرف سے جاری ہوتا ہے۔ حالانکہ ان کا شخصی ظاہری رویہ اسلام سے اسی طرح خارج ہوتا ہے، جس طرح یورپ اور امریکہ کے کسی عام سیاسی لیڈر کا شخصی و ظاہری رویہ عیسائیت سے خارج ہوتا ہے۔ اگر حصول پاکستان کی خاطر ہماری جدوجہد کو اس مرض (قومیت) کی قابل رحم حالت میں ضائع نہیں ہونا ہے، جس میں پوری دنیائے اسلام مبتلا ہے، تو ہمارے لیڈروں کا رویہ فوراً بدل جانا چاہئے۔ اگرچہ یہ ہمارا کام نہیں ہونا چاہئے کہ کسی شخص کے ذاتی عقائد کے نگران و منصف بن جائیں، کیونکہ یہ صرف اللہ کا کام ہے، تاہم ملت کو اپنے رہنماؤں سے یہ توقع کرنے کا حق حاصل ہے کہ ان کا طرز زندگی اس نظریے کے عین مطابق ہے، جس کے تحفظ کا وہ اپنی جان سے دعویٰ کرتے ہیں۔

آخر میں ایک اور بات...... اگر ہمارے لیڈر اسلامی شعور و آگہی کی اعلیٰ ترین بلندیوں پر پہنچ جائیں، تب بھی صرف ان کی مثال ہمارے روحانی مقصد کے حصول و تحفظ کے لئے ناکافی ہوگی۔ ہماری قوم کو اخلاقی و معاشرتی زوال کے اس گڑھے سے نکل کر اٹھنا ہوگا، جس میں وہ گری پڑی ہے۔ ہمارا موجودہ اخلاقی و معاشرتی قدوقامت اس معیار سے بہت نیچے ہے جس کا تقاضا اسلام ہم مسلمانوں سے کرتا ہے۔ تہذیب کی روح کا ہم میں فقدان ہے۔ آرام طلبی اور تن آسانی سے ہمیں محبت ہے۔ جب ذاتی مفاد کی کوئی بات سامنے آئے تو ہمیں جھوٹ بولنے سے عار نہیں۔ ہمیں اپنے وعدے وعید توڑنے میں مزا آتا ہے۔ جب بدعنوانی، خودغرضی، چال بازی، فریب کاری کے واقعات ہماری روزمرہ کی زندگی کے مشاہدے میں آتے ہیں تو ہم بڑی معنویت سے مسکراتے یا بڑی ڈھٹائی سے ہنستے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے بیشتر افراد کو کسی چیز سے کوئی سچی لگن ہے، تو وہ چیز وہ ہے جسے عرف عام میں ''کیریئر'' کہتے ہیں۔ اپنے لئے اور اپنے رشتہ داروں کے لئے چھوٹے سے چھوٹے فائدے کے لئے وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں، جو ان سے ہوسکتا ہے۔ اپنے مسلمان بھائیوں کے پیٹھ پیچھے غیبت کرنا اور بہتان لگانا ہمارا قومی شعار بن چکا ہے۔ مختصر یہ کہ ہم نے اپنے وجود کے اصل سرچشمے یعنی اسلامی تعلیمات سے فیض یاب نہ ہونے کی قسم کھا رکھی ہے۔

ایسے حالات میں ہم کیونکر ایک سچے اسلامی ملک پاکستان کے شایان شان سچے شہری بن سکتے ہیں؟ ایسے حالات میں ہم کیونکر ایسا سچا اسلامی ملک پاکستان حاصل کر سکتے ہیں، جس کے حصول کی خاطر ہم اپنی موجودہ اخلاقی پستی سے اوپر اٹھنے کی ذرا بھی کوشش نہ کریں؟ جب ہمارے دل میں حب الٰہی اور خوف خدا ہی موجود نہ ہو تو ہم کیونکر حکم

Marfat.com

الٰہی کو اپنے معاشرتی نظام کا مقتدر بنا سکتے ہیں؟ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان سوالوں کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ اگر مسلمان اپنے طور طریق اور اپنے اخلاقی معیار فوری طور پر تبدیل نہیں کریں گے اور ہر قدم پر شریعت کے احکام کی خلاف ورزی کی روش ترک نہیں کریں گے، تو یقین جانیے کہ پاکستان کے نظریے میں سے اس کی روح غائب ہو جائے گی، اور یوں پاکستان کو اسلام کی جدید تاریخ میں جو منفرد پوزیشن حاصل ہونے والی ہے، وہ حاصل نہ ہو سکے گی۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اور اب بھی کہتا ہوں کہ عامۃ المسلمین جبلی طور پر پاکستان کی اسلامی روح کا احساس رکھتے ہیں، اور دل و جان سے چاہتے ہیں کہ ''لا الہ الا اللہ'' پاکستانی قوم کی ترقی و تعمیر کے لئے نقطہ آغاز بن جائے، لیکن ان کے خیالات میں ابہام اور ژولیدگی ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ جانا کدھر کو ہے۔ انہیں رہنمائی کی ضرورت ہے۔ رہنمائی رہنما کا منصب ہے۔ سوال گھوم پھر کر پھر قیادت کا سامنے آ گیا ہے۔

مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ عصر حاضر کی مسلم قیادت کا بڑا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کی رہنمائی صرف سیاست و معیشت کے میدان میں نہ کریں بلکہ روحانی اور اخلاقی میدان میں بھی کریں، اور مسلمانوں کو باور کرائیں کہ:

ان اللہ لایغیر ما بقوم حتٰی یغیروا مابانفسہم

(ترجمہ) حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔

(سورہ رعد۔ آیت ۱۱)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی قوم کی سیاسی و معاشی حالت بہتر نہیں ہو سکتی، جب تک اس کی مجموعی اخلاقی حالت بھی بلند نہ ہو۔

(در: شاہکار میگزین، شمارہ ۳، علامہ محمد اسد نمبر، مئی ۲۰۰۱ء، ص ۱۶-۲۲۔ انگریزی مقالہ در: عرفات، مئی ۱۹۴۷ء، ۲۳۱-۲۵۴)

Marfat.com

محمد اسد

اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول

یہ کتاب ان افکار کے نشو وارتقاء پر مشتمل ہے جو میں نے اپنے ایک مقالے ''اسلامی دستور سازی'' میں پیش کیے تھے۔ یہ مقالہ حکومت کی زیر سرپرستی اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا تھا (مارچ ۱۹۴۸ء)۔
میں اُس زمانے میں اسلامی تعمیر نو کے محکمے کا ناظم (ڈائریکٹر ڈیپارٹمنٹ اسلامک ری کنسٹرکشن) تھا۔ یہ ایک سرکاری ادارہ تھا جس کا مدعا یہ تھا کہ ان ذہنی اور اجتماعی اصول کی تفصیلات مدون کی جائیں جو ہمارے لئے نئے معاشرے اور نئی مملکت کی بنیاد واساس ہوں گے۔ جو مسائل میرے دل ودماغ پر حد درجہ چھائے ہوئے تھے طبعاً ان میں سے ایک مسئلہ پاکستان کے آئندہ دستور کا بھی تھا۔ اس زمانے میں بھی ہر شخص پر یہ امر واضح نہ تھا کہ دستور کی وضع و ہیئت کیا ہونی چاہیے اور آج بھی واضح نہیں۔ اگرچہ ہمارے ملک کے باشندوں کی اکثریت حقیقی اسلامی مملکت کے تصور سے سرتاپا متاثر تھی، یعنی چاہتی تھی کہ ایک مملکت (مروجہ سیاسی گروہ بندیوں سے بالکل الگ رہ کر) نسل وقومیت کے تصورات پر نہیں بلکہ خالصۃً قرآن وسنت کے نظریات پر تعمیر کی جائے۔ تاہم کسی کو مثبت انداز میں معلوم نہ تھا کہ اس حکومت اور اس کے اداروں کے اوضاع واطوار کیا ہونے چاہئیں جو عملاً واضح طور پر اسلامی ہوگی۔ ساتھ ہی دور حاضر کے تقاضوں کو ٹھیک ٹھیک پورا کر سکے گی۔ آبادی کے بعض عناصر سادلوحی سے مسلم سمجھے بیٹے تھے کہ حقیقی اسلامی حکومت بننے کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان کا نظام ابتدائی عہد کی خلافت کے عین مطابق ہو۔ رئیس مملکت کو تقریباً ہی آمرانہ اختیارات سونپ دیئے جائیں۔ تمام اجتماعی اوضاع میں (ان میں عورتوں کی کم وبیش کامل علیحدگی بھی شامل ہو) قدامت پسندی قائم رکھی جائے۔ ویسا ہی بالکل ابتدائی دور کا اقتصادی نظام بیسویں صدی کے پُر پیچ سلسلۂ نظم ونسق مالیات کی جگہ لے لے۔ سب سے آخر میں دور حاضر کی فلاحی مملکت کے تمام مسائل صرف ایک محصول یعنی محصول زکوۃ کی بنا پر حاصل ہو جائیں گے۔ دوسرے طبقے -- یہ لوگ زیادہ حقیقت پسند تھے لیکن اسلام کو اجتماعی زندگی میں ایک کارفرما عامل بنا لینے سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی -- یہ تصور کیے بیٹھے تھے کہ پاکستان کا نشو وارتقاء ان ہی اصول پر ہوگا جنہیں دور حاضر کے مغرب کی پارلیمانی جمہوریتوں میں مشترکا درست ومعقول مانا جاتا ہے اور ان دونوں میں بجز اس کے کوئی فرق نہ ہوگا کہ ہمارے ہاں دستور میں رسماً لکھ دیا جائے گا، مملکت کا مذہب اسلام ہے اور آبادی کی بہت بڑی

Marfat.com

اکثریت کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے وزارت امور مذہبی قائم کردی جائے گی۔

افراط وتفریط کے ان دونظریوں کے درمیان توافق پیدا کرنا آسان نہ تھا۔ضرورت ایسے دستوری خاکے کی تھی جو ایک طرف حقیقی معنی میں اسلامی ہوتا اور دوسری طرف ہمارے عہد کے تمام عملی تقاضوں کو اس میں پیش نظر رکھا جاتا۔ ہمارا عقیدہ یہ تھا کہ اسلام کا اجتماعی نظام تمام اداروں اور انسانی نشو وارتقاء کے تمام مراحل کے لیے صحیح جواب مہیا کرتا ہے۔اس عقیدے کو حق بجانب ثابت کرنے کی یہی صورت تھی کہ ہم مذکورہ بالا وضع کا ایک دستور پیش کردیتے لیکن اسلامی کتابوں کا جو ذخیرہ ہمارے سامنے تھا' اس میں ہماری اس مشکل کے لئے رہنمائی کا کوئی سامان نہ تھا۔گذشتہ صدیوں کے بعض علمائے اسلام نے--خصوصاً عباسیوں کے عہد حکومت میں--اسلام کے سیاسی قانون پر چند کتابیں مرتب کی تھیں لیکن ان مسائل کے متعلق ان کا طریق فکر ونظر ان کے عہد کے ثقافتی ماحول اور اجتماعی وسیاسی تقاضوں پر مبنی تھا۔یوں ان کی محنت ومشقت کے نتائج بیسویں صدی کی ایک اسلامی مملکت کی ضرورتوں کا جواب نہیں بن سکتے تھے۔دور حاضر میں اس موضوع پر مسلمانوں نے جو کتابیں لکھیں' ان میں عموماً دور حاضر کے یورپ کے سیاسی تصورات، ادارات اور حکمرانی کے طور طریقے بے تکلفی سے قبول کر لئے گئے تھے اور انہیں دور حاضر کی اسلامی مملکت کا معیار بنایا گیا تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف امور میں ان مصنفوں نے بہت سے ایسے تصورات اختیار کر لئے جو اسلامی نظریات کے حقیقی تقاضوں سے بالکل متناقض تھے۔

غرض ہمارے معاصرین یا پیشروؤں کی تصانیف کوئی اطمینان بخش فکری بنیاد مہیا نہیں کرتی تھیں جس پر پاکستان کی نئی مملکت کی عمارت قائم کی جاتی۔میرے لئے صرف ایک راستہ باقی رہ گیا تھا اور وہ یہ کہ قانون اسلام کے ابتدائی مآخذ--قرآن وسنت کی طرف متوجہ ہوتا اور اس طرح پاکستان کے آئندہ دستور کے لئے مثبت اصول اخذ کرتا جو اسلامی مملکت کے موضوع پر مرتبہ کتابوں سے بالکل مستقل ہوتے۔اس مقصد کی تکمیل کے سلسلے میں میں نے اسلامی دستور کا ایک نظری خاکہ تیار کردینے کا فیصلہ کیا جو قرآن اور صحیح احادیث کے واضح سیاسی احکام پر مبنی ہوتا۔اس ضمن میں مجھے قرآن، احادیث اور اصول فقہ کے اس مطالعے سے بڑی مدد ملی جو میں پیشتر کر چکا تھا۔اس خاکے کے بنیادی اصول قرآن نے مہیا کیے۔اکثر متعلقہ تفصیلات اور ان کے اطلاق کا طریقہ میں نے رسول اللہ (صلعم) کے تقریباً ستر ارشادات سے اخذ کیا جو ملی زندگی کے مختلف سیاسی واجتماعی پہلوؤں پر مشتمل تھے۔ان ہی کوششوں کا نتیجہ ''اسلامی دستور سازی'' پر وہ طویل مقالہ تھا جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔خاص سیاسی حالات کے باعث جن پر یہاں بحث کی ضرورت نہیں، اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کے سلسلے میں میری نہایت کم تجاویز کی صدا سنی جا سکتی ہے جسے دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۴۹ء میں منظور کیا تھا۔[1]

اب دس سال کے افسوسناک تجربات سے ہم گزر چکے ہیں اور پاکستان کے آئندہ دستور کا مسئلہ تاحال حل نہیں ہوا' لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ ایک اسلامی مملکت کے دستور میں جو اصول کارفرما ہونے چاہئیں' ان پر غور وبحث کی افادی حیثیت کا سلسلہ جاری رکھنا حد درجہ ضروری ہوگیا ہے۔موجودہ مسلم ممالک میں سے کوئی بھی اب تک حکومت کی وہ شکل

Marfat.com

اختیار نہیں کر سکا جسے واقعی اسلامی کہا جا سکے۔ یہ غور و بحث کم از کم ان قوموں کے لئے بہت ضروری ہے جن کی زندگی میں اسلام کو ایک محکم حقیقت حاصل ہے۔ پیش نظر کتاب کا مقصد یہ ہے کہ وہ غور و بحث جاری رہے۔ میں جن نتائج پر پہنچا، ان میں سے بعض کے متعلق اختلاف پیدا ہونا ناگزیر ہے لیکن میرا عقیدہ یہ رہا -- اور آج میں اس میں زیادہ پختہ ہو گیا ہوں -- کہ حرکت انگیز تصادم آراء کے بغیر اسلامی معاشرے میں ذہنی ترقی ہو ہی نہیں سکتی اور رسول اللہ (صلعم) کے اس ارشاد:

اختلاف علماء اُمتی رحمة

"میری اُمت کے علماء کا اختلاف خدا کی رحمت کا نشان ہے" کی مثبت تخلیقی قدر و قیمت ہے، جسے اسلامی تاریخ میں نظر انداز کیا جاتا رہا اور اس سے مسلمانوں کی اجتماعی ترقی کو نقصان پہنچا۔

میں حاجی انیس الرحمٰن میموریل سوسائٹی، کراچی کا شکریہ بہ صمیم قلب ادا کئے بغیر یہ دیباچہ ختم نہیں کر سکتا۔ اس کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی سے مجھے یہ کتاب اپنے پاکستانی بھائیوں کے روبرو پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

(دیباچہ)

حاشیہ

۱۔ اس سے مقصود "قرارداد مقاصد" ہے۔

Marfat.com

محمد اسد/مترجم: غلام رسول مہر

پیشِ نظر مسئلہ

اسلامی ریاست کیوں؟

ہر قوم کی زندگی میں زود یا بدیر ایسا وقت آ جاتا ہے جب معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنی تقدیر کے آزادانہ انتخاب کا موقع مل گیا ہے یعنی ایسے فیصلوں کا موقع کہ اسے کون سی راہ اختیار کرنی چاہیے اور اس کا نصب العین کیا ہو؟ وہ مخالف احوال وظروف کے دباؤ سے آزاد نظر آتی ہے اور اسے کوئی ایک راستہ انتخاب کر لینے سے دنیا کی کوئی قوت روک نہیں سکتی۔ ایسے تاریخی اوقات ولمحات نہایت کم پیش آتے ہیں اور انتہائی تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ اگر کوئی قوم ایسے مواقع سے فائدہ نہیں اٹھاتی تو اغلب ہے کہ آئندہ کے لئے صدیوں تک ایسی کوئی مہلت اسے مل ہی نہ سکے۔

آزادانہ انتخاب کا یہ وقت عالم اسلام کے ملکوں کے لئے آ گیا ہے۔ وہ ایک صدی تک جدوجہد کرتے رہے۔ امیدوں، غلطیوں اور مایوسیوں کے طوفانوں سے گزرے۔ آخر ان اکثر ملکوں کو سامراجی حکومت سے پوری آزادی مل گئی جہاں مسلمان آباد ہیں۔ آزادی کے حصول نے یہ مسئلہ حد درجہ اہم بنا دیا ہے کہ وہ کون سے بنیادی اصول ہیں جن کی پابندی کرتے ہوئے عوام کی راحت و بہبود یقینی ہو جائے گی۔ یہ محض انتظامی صلاحیت ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ نظریاتی مسئلہ بھی ہے۔ یہ فیصلہ مسلمانوں کا کام ہے کہ آیا آزاد شدہ مملکتوں کو دور حاضر کے مغربی تصورات کے تحت رکھا جائے جن میں مذہب کو قوم کی عملی زندگی کی تشکیل کا حق حاصل نہیں' یا انہیں بہر حال حقیقی معنی میں اسلامی نظام واساس کے تابع آ جانا چاہیے؟ کسی مملکت میں اسلامی آبادی کی بھاری اکثریت یا کاملاً اسلامی آبادی کا مطلب لازماً یہ نہیں کہ وہ اسلامی مملکت ہے۔ ہر مملکت اسی وقت حقیقی اسلامی مملکت بنتی ہے جب قوم کی زندگی کے لئے اسلام کے سیاسی وعمرانی اصول قصد واہتمام سے نافذ کیے جاتے ہیں اور جب وہ اصول ملک کے بنیادی دستور میں شامل ہو جاتے ہیں۔

سوال کیا جا سکتا ہے کیا اسلام واقعی متوقع ہے کہ مسلمان ہر وقت اور ہر حالت میں اسلامی مملکت کے قیام کے لئے کوشاں رہیں یا کیا یہ خواہش صرف ان کی تاریخی روایات پر مبنی ہے؟ کیا اسلام کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے پیرو سیاسی اور اجتماعی اعمال میں ایک خاص مسلک ومشرب کے پابند رہیں یا وہ بھی دوسرے مذاہب کی طرح پیرووں کو یہ آزادی دیتا ہے کہ تمام سیاسی اقدامات کا فیصلہ وقت کے تقاضوں کی روشنی میں وہ خود کر لیا کریں؟ مقصود یہ ہے کہ آیا مذہب و

Marfat.com

سیاست کو ملائے رکھنا اسلام کا حقیقی بنیادی اصول ہے یا نہیں؟

اسلامی تاریخ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مذہب وسیاسیات کے درمیان گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ دور حاضر کے مغربی تعلیم پائے ہوئے مسلمانوں کے لئے یہ گہرا تعلق ایک حد تک ناخوشگوار ہے کیونکہ وہ عقائد اور عملی زندگی کے مسائل کو کاملاً جداگانہ دائروں میں سمجھنے اور رکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کی اہمیت کا اس وقت تک صحیح اندازہ ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس مسئلے پر پوری طرح غور نہ کرلیا جائے۔ تعلیمات اسلام سے کسی شخص کی واقفیت کتنی ہی سطحی کیوں نہ ہو' تاہم وہ جانتا ہے کہ یہ تعلیمات صرف خدا سے انسان کے تعلق ہی پر حاوی نہیں بلکہ اس تعلق کے نتیجے میں اسے جو اجتماعی روش اختیار کرنی چاہیے' اس کے باب میں بھی ایک قطعی نظام طے کر دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی تعلیم کا بنیادی اصول موضوعہ یہ ہے کہ طبعی زندگی کے تمام احوال وظروف ارادۂ باری تعالیٰ کے تابع ہیں' لہٰذا ان کی ایک مستقل قدر و قیمت ہے۔ اسی طرح تخلیق کی یہ علت غائی بھی بدرجۂ کمال واضح کر دی کہ مخلوق کو ارادۂ خالق کے تابع رہنا چاہیے۔ انسان کے تعلق میں اس تابعیت -- جسے اسلام کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی خواہشات اور کردار عمداً اور عملاً زندگی کے ان قوانین کے مطابق رہیں جن کا فیصلہ خالق نے فرما دیا ہے۔ اس تقاضے میں -- کم از کم اس حد تک جس حد تک انسانی زندگی کا تعلق ہے -- تصورات حق و باطل کے معنی وہ ہیں جو ہر معاملے میں اور ہر وقت تبدیل نہیں ہوتے بلکہ تمام اوقات واحوال میں استوار و پائیدار رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم اپنے علم ونظر کی بنا پر حق و باطل کی جو تعبیرات کریں گے' ان میں ویسی ابدی استواری پیدا نہیں ہوسکتی کیونکہ انسانی فکر اساساً موضوعی ہے اور اس پر مفکر کے وقت و ماحول کا گہرا اثر پڑتا ہے' لہٰذا اگر مذہب کا مقصد و مدعا حقیقتاً یہی ہے کہ انسانی خواشات و اعمال کو ارادۂ باری تعالیٰ کے عین مطابق رکھا جائے تو اسے غیر مشتبہ طریق پر بتا دینا چاہیے کہ نیک و بد کے درمیان امتیاز کی کیا صورت ہے؟ یعنی یہ بتا دینا چاہیے کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے؟ محض عام اخلاقی تعلیمات -- مثلاً ''ہم جنسوں سے محبت کرو''، ''راست بازی کے پابند رہو''، ''خدا پر بھروسا رکھو'' -- کافی نہیں کیونکہ ان کی بے شمار تعبیرات ہوسکتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے پختہ قوانین کا انتظام ہو جائے جن میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں -- روحانی وجسمانی، انفرادی واجتماعی، اقتصادی وسیاسی -- کا خاکہ سامنے آجائے، خواہ وہ کتنا ہی سرسری سا ہو۔

اسلام نے الٰہی قانون کے ذریعے سے جسے شریعت کہتے ہیں' یہ ضرورت پوری کر دی ہے۔ قرآن مجید نے خاص احکام مہیا کر دیئے ہیں اور رسول اللہ (صلعم) نے تعلیمات کے ایک مجموعے کی شکل میں جسے سنت یا طریق حیات کہتے ہیں، ان کی تفصیل وتفسیر فرما دی، نیز نظائر مہیا کر دیئے۔ مومن کے نقطۂ نگاہ سے قرآن وسنت ہمارے لئے تخلیق کے ہمہ گیر خدائی منصوبے کو ایسی شکل میں پیش کرتے ہیں جو قابل فہم ہے۔ انسان کے تعلق میں وہ (قرآن و سنت) خدا کی رضا کا تنہا مثبت اظہار ہیں کہ انسان کو کیسا ہونا اور کیا کرنا چاہیے؟

مگر یہ اس کے ارادے کا صرف اظہار ہے۔ وہ ہمیں اس پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کرتا۔ اس نے ہمیں انتخاب

Marfat.com

کی آزادی دے رکھی ہے۔ہم چاہیں تو خوشی سے اس کے الہامی قانون کے فرماں بردار بن سکتے ہیں۔گویا خدا سے تعاون کر سکتے ہیں۔چاہیں تو اس کے خلاف جا سکتے ہیں یعنی خدا کے قانون کو ٹھکرا سکتے ہیں' مگر نتائج کے ذمہ دار ہم ہوں گے۔ہم جو کچھ بھی کریں' ذمہ داری ہماری ہوگی۔یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ اسلامی زندگی بسر کرنا چاہیں تو ہمیں پہلا راستہ انتخاب کرنا ہوگا۔بایں ہمہ اگر ہم خدا کی فرماں برداری کا فیصلہ بھی کر لیں تو یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ پوری فرمانبرداری کر سکیں۔اگرچہ ظاہر ہے کہ اسلامی قانون کا حقیقی مدعا انفرادی اعتبار سے انسان کی راست بازی ہے۔اسی طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قانون کا بڑا حصہ صرف اسی صورت میں مؤثر ہو سکتا ہے جب بہت سے افراد عمداً اس کے لئے متحدہ کوشش کریں یعنی یہ کوشش اجتماعی ہو۔اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک فرد کی نیت کتنی ہی نیک ہو، وہ اپنی نجی زندگی کو اس وقت تک اسلامی تقاضوں کے سانچے میں نہیں ڈھال سکتا جب تک کہ گردوپیش کا معاشرہ عملی معاملات میں اسوۂ اسلام کی تابعیت پر متفق نہ ہو جائے۔اس قسم کا شعوری تعاون اخوت کے محض احساس سے پیدا نہیں ہو سکتا۔اخوت کا یہ تصور مثبت اجتماعی عمل میں پیدا ہونا چاہیے۔مطلب یہ ہے کہ نیکی کا حکم دیا جائے اور برائی سے روکا جائے۔(امر بالمعروف و نہی عن المنکر) یا دوسرے لفظوں میں ایسے اجتماعی حالات پیدا کیے جائیں اور انہیں قائم رکھا جائے جن میں انسانوں کا زیادہ سے زیادہ حصہ ہم آہنگی، آزادی اور عزّ و وقار کی زندگی بسر کر سکے۔ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص معاشرے کے خلاف روش اختیار کر لے تو دوسرے لوگوں کے لئے بھی نصب العین تک پہنچنے میں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ایسے سرکشوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی، باقی لوگوں کی مشکلات اتنی ہی بڑھ جائیں گی۔گویا کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے مطابق قوم کا عزم تعاون اس وقت تک زیادہ تر نظری ہی رہیگا جب تک کوئی دنیوی قوت قوم کے ایک حصے کی طرف سے اسلامی قانون کے نفاذ اور سرکشی کے انسداد کی ذمہ دار نہ بن جائے--کم از کم اجتماعی معاملات میں۔یہ ذمہ داری کسی منظم ادارے ہی کی طرف سے پوری کی جا سکتی ہے جسے امر اور نہی یعنی حکم اور ممانعت کے اختیارات حاصل ہوں۔اس سے مراد مملکت ہے لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی مملکت یا مملکتوں کی تنظیم اسلامی زندگی پیدا کرنے کے لئے ایک ناگزیر شرط ہے۔

''سیکولر'' ریاست کیوں نہیں؟

بے شک و شبہ بے شمار مسلمانوں کی دلی خواہش یہ ہے کہ اسلامی اصول کے مطابق اجتماعی و سیاسی نشوو ارتقاء کا انتظام ہو۔اسی طرح موجودہ دنیا کی ذہنی فضا میں بہت سے تعلیم یافتہ لوگوں کے نزدیک یہ تقریباً بدیہی ہو گیا ہے کہ مذہب کو سیاسی زندگی میں مداخلت کا موقع نہ دینا چاہیے۔سیکولرازم کا اصول خود بخود ''ترقی'' کا مترادف بن گیا ہے اور مذہب کے تحت عملی سیاسیات نیز اجتماعی و اقتصادی منصوبہ بندی پر غور و فکر کو رجعت پسندی یا ناقابل عمل مثالیت قرار دے کر الگ کر دیا جاتا ہے۔آج بظاہر اکثر تعلیم یافتہ مسلمانوں کی رائے یہی ہے اور ہماری معاصرانہ زندگی کے دوسرے بہت سے پہلوؤں کی طرح اس سلسلے میں بھی مغربی افکار کا اثر غیر مشتبہ ہے۔

Marfat.com

اہل مغرب خاص وجوہ کی بنا پر مذہب سے (یعنی اپنے مذہب سے) بیزار ہیں اور یہ بیزاری اس اخلاقی، عمرانی اور سیاسی ابتری میں منعکس ہو رہی ہے جو دنیا کے بہت بڑے حصے پر مسلط ہے۔ اپنے فیصلوں اور اعمال کو کسی اخلاقی قانون کی کسوٹی کے حوالے کرنے کے بجائے -- جو ہر اعلیٰ مذہب کا حقیقی مقصد ہے -- یہ لوگ وقتی مصلحت (لفظ کی وقتی تعبیر و تخصیص کے اعتبار سے) کو عام معاملات میں واجبات کی تنہا بنیاد مانتے ہیں۔ چونکہ وقتی مصلحت کے متعلق ہر گروہ، قوم اور جماعت کی تعبیرات و افکار مختلف ہیں' اس لئے سیاسی دائرے میں خواہ وہ قومی ہو یا بین الاقوامی، اغراض و مفاد کی حد درجہ حیرت انگیز کشمکش بپا ہوگئی ہے کیونکہ بظاہر جو چیز ایک گروہ یا ایک قوم کو خاص عملی نقطہ نگاہ سے قرین مصلحت نظر آتی ہے' ضروری نہیں کہ وہ دوسرے گروہ اور قوم کے نزدیک بھی قرین مصلحت ہو۔ لہٰذا جب تک انسان اپنی کوششیں کسی اخلاقی مصلحت کے تابع نہ رکھیں' ان کے جداگانہ مفاد میں کسی نہ کسی نقطے پر تصادم ناگزیر ہوگا اور وہ ایک دوسرے کے خلاف جتنی کشمکش جاری رکھیں گے' ان کے اغراض و مفاد کی خلیج وسیع تر ہوتی جائے گی۔ ساتھ ہی انسانوں کے تعلق میں نیکی اور برائی کے متعلق ان کے افکار میں بھی زیادہ سے زیادہ مزاحمت پیدا ہوتی جائے گی۔

غرض دور حاضر کی سیکولر مملکت میں کوئی ایسا مستقل معیار موجود نہیں' جس کی بنا پر حق و باطل اور نیک و بد کے درمیان فیصلہ کیا جاسکے۔ صرف ایک معیار ممکن سمجھا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے ''قومی مفاد'' لیکن اخلاقی اقدار کا کوئی ایک معروضی و خارجی معیار موجود نہ ہو تو لوگوں کے مختلف گروہ -- بلکہ ایک قوم کے مختلف احزاب -- کے آراء و نظریات بھی قوم کے بہترین مفاد کے بارے میں مختلف ہوسکتے ہیں اور عموماً مختلف ہوتے ہیں۔ ایک سرمایہ دار کا عقیدہ اخلاص کے ساتھ یہ ہوسکتا ہے کہ اگر اقتصادی آزادی کی جگہ اشتراکیت نے لے لی تو تہذیب برباد ہو جائے گی۔ اس کے برعکس اشتراکی کا نظریہ پوری راست بازی کے ساتھ یہ ہوسکتا ہے کہ تہذیب کی بقا سرمایہ داری کی تنسیخ اور اشتراکیت کے غلبے پر موقوف ہے۔ دونوں اپنے اپنے نظریات کو اخلاقی رنگ میں پیش کرتے ہیں یعنی یہ کہ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہ ہونا چاہیے۔ دونوں انسانوں کے متعلق اپنے اپنے اقتصادی نظریات پر قائم ہیں اور دونوں کے باہمی تعلقات میں کشیدگی موجود ہے۔

یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ معاصر مغربی سیاسی نظاموں -- اقتصادی آزادی، اشتمالیت (کمیونزم)' قومی اشتراکیت (نیشنل سوشلزم)' عمرانی جمہوریت وغیرہ -- میں سے کوئی بھی اس کشیدگی اور ابتری کو کسی ایسی چیز میں تبدیل نہیں کرسکا جو نظم سے مشابہ ہو۔ وجہ صرف یہ ہے کہ کسی نے بھی سیاسی اور عمرانی مسائل پر مستقل اخلاقی اصول کی روشنی میں غور کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس ان میں سے ہر نظام میں نیکی اور بدی کے تصور کی بنیاد اس طبقے یا اُس طبقے، اس گروہ یا اُس گروہ یا قوم کے مفروضہ مفاد پر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بنیاد لوگوں کی بدل جانے والی مادی ترجیحات پر مبنی ہے اور وہ مسلسل بدل رہی ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ انسانی معاملات کی یہی طبعی اور مطلوب حالت ہے تو ہم ضمناً یہ بھی تسلیم کرلیں گے کہ نیکی اور بدی کی اصطلاحات کا مستقل مفہوم کوئی نہیں' بلکہ یہ ایسے افسانے ہیں جو ہم نے سہولت کے خیال سے تیار کر رکھے ہیں اور یہ افسانے وقت اور عمرانی و اقتصادی حالات نے وضع کیے۔

Marfat.com

اس نظریے کا منطقی تعاقب کیا جائے تو اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ انسانی زندگی میں ہر اخلاقی ضابطے سے انکار کر دیا جائے کیونکہ اگر اخلاقی ضوابط کو ایک قطعی اور مستقل حیثیت دے دی جائے تو ان کا تصور ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ جب ہم یہ مان لیں کہ نیکی اور بدی یا حق اور باطل کے معیار انسان کے ساختہ پرداختہ ہیں اور یہ عمرانی معمولات و ماحول کی بدلتی رہنے والی پیداوار ہیں تو ہم انہیں انسانی معاملات میں قابل اعتماد ہدایت کا وسیلہ قرار نہیں دے سکتے۔ ان معاملات کی منصوبہ بندی کے سلسلے میں اخلاقی ہدایت سے ہم تدریجاً بے نیاز ہوتے جاتے ہیں اور صرف ہنگامی مصلحت پر اعتماد کر لیتے ہیں۔ یہ طریقہ انسانی گروہوں کے اندر اور ان کے درمیان اختلافات بڑھانے کا موجب ہوتا ہے اور انسان کے لئے جو مقدار راحت کی لازم ہے اس میں رفتہ رفتہ کمی ہوتی جاتی ہے۔ موجودہ دنیا کے اندر جو گہری تشویش و بے اطمینانی آج نمایاں ہے غالباً اس کی حقیقی توجیہ یہی ہے۔

کوئی قوم یا جماعت اس وقت تک راحت سے ہمکنار نہیں ہو سکتی جب تک اس میں حقیقی اتحاد موجود نہ ہو۔ کوئی قوم اس وقت تک حقیقتاً متحد نہیں ہو سکتی جب تک انسانی معاملات میں نیک و بد کے متعلق اس کے اندر وسیع ہم آہنگی پیدا نہ ہو جائے۔ اس قسم کی ہم آہنگی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ قوم یا جماعت کسی دائمی اور مستقل اخلاقی قانون سے پیدا ہونے والے اخلاقی ضابطے پر متفق نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ صرف مذہب اسی قسم کا قانون مہیا کر سکتا ہے اور یہی قانون کسی گروہ کے اندر اس اخلاقی ضابطے پر اتفاق کی بنیاد بن سکتا ہے جو گروہ کے تمام افراد پر واجب و لازم ہو۔

مذہب اور اخلاق

کسی مذہب کے خاص احکام کچھ ہوں' اس کی تعلیمات اعلیٰ پیمانے کی ہوں یا دقیانوسی وضع کی یا وہ توحید کا داعی ہو یا شرک کا، اصنام پرستی اس کا شیوہ ہو یا وہ وحدت وجود پر قائم ہو، تاہم ہر مذہب کی داخلی بنیاد و اساس -- تاریخ کے ہر دور اور تہذیب کی ہر نمود میں -- اول انسان کا یہ دلی عقیدہ رہا ہے کہ اس دنیا کے تمام وجود اور تمام حوادث و وقائع ایک دانا و بینا اور ہمہ گیر تخلیقی قوت کا نتیجہ ہیں یا سادہ لفظوں میں کہہ لیجئے کہ الٰہی ارادے کے مظہر ہیں۔ دوم یہ احساس کہ ہر فرد کو اس ارادے سے روحانی ہم آہنگی ہے یا کم از کم ایسی ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ اسی احساس اور اسی عقیدے پر نیک و بد کے فیصلے میں انسانی صلاحیت مبنی رہی اور مبنی ہے۔ جب تک ہم یہ نہ مان لیں کہ ایک مطلق اور منصوبہ بند ارادہ پوری تخلیق کی تہہ میں کارفرما ہے یہ فرض کرنے کے کوئی معنی نہیں کہ ہمارے مقاصد و اعمال اصلاً نیک ہیں یا بد، اخلاقی ہیں یا غیر اخلاقی۔ ایسے منصوبہ بند ارادے کے عقیدے کے بغیر اخلاق کے متعلق ہمارے تصورات لازماً مبہم ہو جاتے ہیں اور وہ وقتی مصلحتوں کے زیادہ سے زیادہ تابع بن جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے سامنے مسئلے کی صرف یہ صورت رہ جاتی ہے کہ آیا کوئی مقصد یا عمل متعلقہ فرد یا اس قوم کے لئے جس کا وہ رکن ہے' مفید (اس لفظ کی عملی حیثیت میں) ہے یا نہیں؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق و باطل یا نیک و بد صرف اضافی اصطلاحیں رہ جاتی ہیں۔ جو شخص چاہے ذاتی یا جماعتی

Marfat.com

ضرورتوں کے مطابق ان کی تعبیر کر لے اور یوں یہ اصطلاحات ہر طبقے کے عمرانی واقتصادی ماحول میں مسلسل تغیر و تبدیل کا محور بن جاتی ہیں۔

اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ عہد حاضر کے رجحانات قطعاً مذہب کے خلاف ہیں تو دائرہ اخلاق میں مذہبی فکر واحساس کے متعلق یہ افکار انتہائی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ارباب فکر ونظر کا کوئی نہ کوئی طبقہ ہمیں ہر روز اور ہر مقام پر بتا تا رہتا ہے کہ مذہب صرف انسان کے ماضی کی وحشت و بربریت کی یادگار ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں اور اب اس کی جگہ ''سائنس کے دور'' نے لے لی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ سائنس فرسودہ اور دقیانوسی مذہبی نظاموں کی جگہ لینے والا ہے۔ یہ بڑی جلالت وشان سے بے پناہ طریق پر پیش قدمی کر رہا ہے اور آخر انسان کو ''عقل مجرد'' کے مطابق رہنا سہنا سکھا دے گا اور اس قابل بنادے گا کہ انسان کسی فوق الادراک تصدیق وتوثیق کے بغیر اخلاق کے لئے معیار مدون کر لے۔

سائنس کے تعلق میں یہ طبعی وفطری رجائیت حقیقتاً دور حاضر کی پیداوار نہیں، بلکہ یہ پہلے سے چلی آتی ہے۔ مغرب نے اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں جس رجائیت پر زور دیا تھا۔ یہ اسی کی نقل ہے مگر اس کی جانچ پڑتال پر کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ اس دور میں (خصوصاً انیسویں صدی کے نصف آخر میں) مغرب کے بہت سے سائنس دان سمجھ رہے تھے کہ اسرار کائنات کا حل بالکل قریب آ گیا ہے اور آئندہ انسان انتہائی آزادی ومعقولیت سے زندگی کا نقشہ آراستہ کر لے گا۔ کوئی طاقت اس کے راستے میں حائل نہ ہو سکے گی۔ ہمارے عہد کے مفکرین اس باب میں اگر متشکک نہیں تو کم گو ضرور ہیں۔ دور حاضر یعنی بیسویں صدی کی طبعیات کے زبردست اثر کے تحت دور حاضر کے ارباب فکر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ علت ومعلول کا پابند سائنس وہ روحانی امیدیں پوری نہیں کر سکتا جو اس کے ساتھ سو بلکہ پچاس سال پیشتر وابستہ کی گئی تھیں کیونکہ جیسے جیسے کشف وتحقیق کا قدم آگے بڑھا، کائنات کے اسرار زیادہ سے زیادہ پُراسرار و پیچیدہ ہوتے گئے۔ یہ حقیقت واضح تو ہوتی جا رہی ہے کہ ممکن ہے خالص سائنٹفک ذرائع سے مندرجہ ذیل سوالوں کا جواب مل ہی نہ سکے:

۱۔ یہ کائنات کیونکر وجود میں آئی؟

۲۔ اس پر زندگی کا ظہور کیونکر ہوا؟

۳۔ جس شے کو ہم زندگی سے تعبیر کرتے ہیں' وہ کن اجزاء سے مرکب ہے؟

۴۔ انسانی بقا کی حقیقی نوعیت اور مقصد کیا ہے؟

ظاہر ہے کہ جب تک آخری سوال کا جواب نہ مل جائے ہم نیک وبد یا حق وباطل یا خیر وشر کی اخلاقی قدر وقیمت معین کرنے کے لئے قدم ہی نہیں اٹھا سکتے کیونکہ جب تک ہمیں انسانی بقا کی نوعیت ومقصد کے متعلق علم (حقیقی یا قیاسی) نہ ہو جائے، نیک وبد، حق وباطل اور خیر وشر کے کوئی معنی ہی نہیں نکلتے۔

ہمارے انتہائی ترقی یافتہ سائنس دان اب اس حقیقت کا احساس کرنے لگے ہیں۔ وہ طبعیات میں کشف وتحقیق کی بنا پر فوق الطبعیات مسائل کا کوئی جواب مہیا نہیں کر سکے' لہٰذا انہوں نے گذشتہ دو سو سال کی یہ امید ہی ترک کر دی

Marfat.com

ہے کہ سائنس اخلاق وآداب کے دائرے میں ہدایت کا ذریعہ بن سکتا ہے یا کبھی بنے گا۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اعلیٰ درجے کے سائنسدان سائنس پر اعتماد کھو بیٹھے ہیں۔ حاشاوکلا اس کے برعکس ان کا عقیدہ ہے کہ سائنس عالم انسانیت کو علم وعمل کے بدر جہا عجائب خیز کارناموں تک پہنچائے گا مگر ساتھ ہی انہیں احساس ہو چکا ہے کہ سائنفک سعی وکوشش کو انسان کی اخلاقی اور روحانی زندگی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ بے شک سائنس ہمارے لئے اپنے اندر اور گردو پیش کی دنیا کے متعلق فہم وبصیرت کے بہتر مواقع مہیا کر سکتا ہے اور کر رہا ہے لیکن اس کا تعلق صرف حقائق فطرت کے مشاہدے سے ہے اور وہ ان قوانین کا تجزیہ کرتا ہے جو ان حقائق کے باہمی تعلق پر حاوی ہیں' لہٰذا سائنس سے یہ امید نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ انسانی زندگی کے مقصد ونصب العین پر فتوے صادر کرے گا اور یوں ہمارے لئے عمرانی روش کے سلسلے میں ایسے محکم ہدایت نامے مہیا ہو سکیں گے جنہیں اختیار کر لینا چاہیے جو حقائق مسلم ہیں۔ ان کی بنا پر محض قیاسی استدلال کے ذریعے سے بالواسطہ سائنس ہمیں مشورہ دینے کی کوشش کر سکتا ہے' مگر وہ برابر تغیر پذیری کی حالت میں ہے۔ فطرت کے متعلق نئے حقائق دریافت ہوتے رہتے ہیں اور جو فیصلے سابقہ دریافت شدہ حقائق کی بنا پر کیے گئے تھے' ان کی تعبیر وجائزہ میں مسلسل تبدیلی ہوتی رہتی ہے' لہٰذا سائنس کا مشورہ متذبذب، غیر مسلسل اور بعض اوقات سابقہ مشورے کی بالکل ضد ہوگا۔ گویا خلاصۃً کہا جا سکتا ہے کہ سائنس کسی بھی دور میں یقین ووثوق کے ساتھ یہ نہیں بتا سکتا کہ بہبود وراحت کے حصول کی غرض سے انسان کو کیا کرنا اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ بنابریں سائنس انسان میں اخلاقی شعور کی تربیت نہیں کر سکتا (نہ کبھی اس نے ایسی کوشش کی ہے)۔ غرض اخلاق وآداب کے مسائل کے دائرے سے باہر ہیں۔ ان کا تعلق کاملاً مذہب کے دائرے سے ہے۔

صرف مذہب ہی کے ذریعے سے ہم اخلاقی جائزے کے ان معیاروں پر پہنچ سکتے ہیں -- صحیح یا غلط -- جو ہمارے ماحول کے وقتی تغیرات سے بالا ہوں۔ میں نے کہا: ''صحیح یا غلط'' کیونکہ استدلال کے معروضی وخارجی اصول کے مطابق مذہب میں فوق الطبیعت مقدمات کے متعلق غلط فہمی کا امکان ہے۔ اس وجہ سے ان اخلاقی جائزوں میں بھی غلطی کا امکان ہے جو ان مقدمات پر مبنی ہوں۔ غرض کسی مذہب کے قبول وعدم قبول کا فیصلہ ہمارے عقل واستدلال کی بنا پر ہونا چاہیے اور ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کون سا مذہب انسان کی تمام مادی وروحانی ضرورتوں کا کفیل بن سکتا ہے۔ یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ کسی مذہب کی تعلیمات کے متعلق اپنی انتقادی صلاحیتوں سے کام لینے کی ضرورت اس بنیادی معاملے پر اثر انداز نہیں ہوتی کہ صرف مذہب ہماری زندگی میں معنی پیدا کر سکتا ہے اور ہماری فکر وروش میں ان اخلاقی اقدار سے مطابقت کو تقویت پہنچا سکتا ہے جو ہماری انفرادی بقا کی عارضی تابانی سے کاملاً بالا ہو۔ دوسرے لفظوں میں صرف مذہب ہی انسانوں کے بڑے بڑے گروہوں کے درمیان اتحاد واتفاق کے وسیع مواقع مہیا کر سکتا ہے اور وہ جان سکتے ہیں کہ نیکی اور خیر کیا ہے (لہٰذا وہ مطلوب ہے)۔ نیز بدی اور شر کسے کہتے ہیں (لہٰذا اس سے دور رہنا چاہیے) اور کیا اس باب میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کا اتحاد واتفاق انسانی روابط میں کسی نوع کا نظم پیدا کرنے کے لئے ایک قطعی اور ناگزیر شرط ہے؟

Marfat.com

اس نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو انسان میں مذہبی جذب وطلب اس کے روحانی نشو و ارتقاء کی تاریخ کا محض عارضی پہلو نہیں بلکہ اس کے اخلاقی فکر اور تصورات آداب کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ وہ ہماری قدیم خوش اعتقادی کا نتیجہ نہیں جس کی ضرورت ایک متنور دور کو نہیں رہتی' بلکہ ہر دور اور ماحول میں انسان کی حقیقی اور بنیادی ضرورتوں کا وہ واحد کفیل ہے۔ اسے وجدان کہنا چاہیے۔

یہ سمجھ لینا عین قرین دانش وفکر ہے کہ جو مملکت مذہب کی بنیادوں پر تعمیر کی جائے گی' اس میں قومی راحت کے حد درجہ بہتر ممکنات مہیا ہوں گے اور جو مملکت سیکولر سیاسی تصور کی بنا پر قائم ہو گی' اس میں ویسے ممکنات مہیا نہیں ہو سکتے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ جس مذہبی نظریے پر مملکت کا انحصار ہے۔ جس سے یہ اختیار حاصل کرتی ہے-- اس میں اولاً انسان کی حیاتیاتی اور عمرانی ضرورتوں کے لئے پورے انتظامات کیے جائیں۔ ثانیاً اس تاریخی اور فکری ارتقاء کا قانون پیش نظر رکھا جائے' جو ہر انسانی معاشرے پر حاوی ہے۔ ان دو شرطوں میں سے پہلی شرط یوں پوری ہو سکتی ہے کہ زیر غور مذہبی نظریے میں انسان کی صرف روحانی فطرت ہی کی نہیں بلکہ حیاتیاتی فطرت کی مثبت قدر و قیمت بھی پیش نظر رکھی جائے۔ اسلام کا خاصہ لاریب یہی ہے۔ دوسری شرط کے پورا کرنے کی صورت یہ ہے کہ سیاسی قانون جو قوم کی روش کا رہنما ہو گا' محض مثبت اور بدیہی ہی نہ ہو بلکہ سختی اور صلابت سے بھی آزاد ہو یعنی لچکیلا ہو۔ قرآن وسنت نے جو سیاسی قانون پیش کیا ہے' اس میں یہ دونوں شرطیں پوری ہوتی ہیں۔

میں آئندہ صفحات میں اس دعوے کے اثبات کی کوشش کروں گا لیکن یہ کام شروع کرنے سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں اسلامی قانون کے تصور سے متعلق چند عام گزارشیں پیش کر دوں کیونکہ مسلم اہل علم وفضل کے درمیان شرعی قانون سازی کے حدود و تفصیلات کے سلسلے میں اتفاق رائے موجود نہیں۔

اسلامی قانون کی وسعت

معلوم ہے کہ اسلامی فقہ کا موضوع جو قوانین ہیں' وہ سب کے سب ان ہدایات و امتناعات (اوامر و نواہی) پر مبنی نہیں' جن کے بارے میں قرآن وسنت نے واضح الفاظ میں فیصلہ کر دیا۔ فقہی فیصلوں کا بڑا حصہ مختلف استنباطی استدلال کا نتیجہ ہے۔ ان میں قیاس کو سب سے زیادہ دخل حاصل ہے۔ دور ماضی کے بڑے بڑے فقیہ قرآن وسنت کے مطالعے کی بنا پر قانونی نکتے دریافت کر سکے اور بلاشبہ فقہ کے ممتاز ترین شارحین کا یہ مطالعہ حد درجہ گہرا اور پُرخلوص تھا' تاہم مطالعے کے نتائج اکثر بڑی حد تک داخلی و موضوعی تھے' یعنی اسلام کے شرعی مآخذ سے متعلق مختلف ائمہ وفضلاء نے اپنی تعبیرات اور نقطہ نگاہ پیش نظر رکھا۔ ساتھ ہی ان کے عہد کا عمرانی وفکری ماحول ان کے سامنے رہا۔ چونکہ وہ ماحول مختلف اعتبارات سے ہمارے ماحول کے مقابلے میں بڑی حد تک مختلف تھا لہٰذا ہم ان مآخذ سے استنباط نتائج کریں تو یہ استنباط ان ائمہ کے نتائج سے طبعاً مختلف ہو گا۔ دور حاضر کے مسلمان رسمی فقہ کے احکام و نتائج سے معاصر سیاسی و اقتصادی معاملات میں کام لینے کے متعلق جس تامل و توقف کا اظہار کر رہے ہیں' اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

Marfat.com

یہ فیصلے صادر کرنے والوں کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ خاص مسائل کے متعلق شرعی اصول کے اطلاق میں سہولت رہے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا' ان مسائل کے متعلق عوام کے دل میں ایک خاص قسم کا احترام پیدا ہوتا رہا۔ اب بہت سے مسلمان ان فیصلوں کو شریعت یعنی مذہبی قانون کا لاینفک جزو سمجھتے ہیں۔ اس عوامی نظریے کی تائید میں کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید یا صحیح احادیث میں اوامر ونواہی کے متعلق واضح بیانات کا ذخیرہ اتنا نہیں جو ممکن قانونی ضروریات کے لئے کافی سمجھا جائے۔ لہٰذا قانونی مجموعے کی توسیع استنباط کے ذریعے سے ضروری ہوگئی۔ سب سے پہلے یہ ظاہر ہے کہ قرآن یا سنت سے شریعت کی ایسی من مانی توسیع کے لئے کوئی خفیف شہادت بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔ پھر یہ کہنا بھی بجا ہوگا (اور مسلمان فضلاء کی خاصی بڑی تعداد برابر یہ کہتی رہی) کہ قرآن وسنت کے واضح احکام کا دائرہ اتفاقی اغماض کی بنا پر محدود نہیں رہا بلکہ عمداً اس اہم مصلحت کی بنا پر محدود رکھا گیا کہ قانونی وعمرانی لوچ اور لچک پر کوئی اثر نہ پڑے۔ غرض یہ سمجھ لینا بالکل معقول ہے کہ شریعت میں تمام ضروریات زندگی کی تفصیلات دانستہ بیان نہیں کی گئیں۔ گویا اصل مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ چند قانونی حدیں مقرر کردی جائیں جن کے اندر رہ کر امت خود بخود نشوو ارتقاء کے مراحل طے کرے اور جتنے بھی بے شمار قانونی مواقع پیش آسکیں' ان کا فیصلہ مسئلہ بہ مسئلہ وقت اور بدلتے ہوئے عمرانی حالات کے تقاضوں کی بنا پر کیا جائے۔

اصل شریعت فقہ کے اس قانونی نظام کے مقابلے میں بہت موجز و بلیغ اور مختصر ہے' جو اسلامی فکر کے مختلف دبستانوں نے تیار کردیا۔ شریعت الٰہی قانون کا مجموعہ ہے جو داخلی وموضوعی وضع کے فاضلانہ استنباطات یا نتائج پر منحصر نہیں ہوسکتی بلکہ اسے کاملاً قرآن وسنت کے قطعی احکام کی شکل میں دیکھنا چاہیے' یعنی وہ احکام جن کے متعلق مثبت قانونی وضع میں بتادیا گیا۔ ''یہ کرو اور یہ نہ کرو''، ''یہ چیزیں خیر ہیں اس لئے مطلوب ہیں''، ''یہ چیزیں شر ہیں اس لئے ان سے بچنا چاہیے۔'' ان احکام کو اصطلاحاً ''نصوص'' کہتے ہیں۔ ان کی مختلف تعبیرات کی ہی نہیں جاسکتیں بلکہ ان میں تعبیر کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ اپنی جگہ مکمل اور الفاظ میں غیر مبہم ہیں۔ تمام عرب ماہر لسانیات اس امر پر متفق ہیں کہ نصوص، قرآن وسنت کے ان احکام کو کہتے ہیں جو ظاہر الفاظ میں بدیہی ہوں[1]۔ تمام نصوص ایسی شکل میں پیش کیے گئے ہیں کہ انسان کے عمرانی وفکری نشوو ارتقاء کے ہر مرحلے پر ان کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ اس کے برعکس فقہاء کے بہت سے داخلی و موضوعی نتائج ایک خاص وقت اور ذہنیت کے افکار ہیں' لہٰذا ان کی دائمی صحت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ گویا نصوص قرآن وسنت -- اور صرف وہی -- بہ حیثیت مجموعی حقیقی اور دائمی شریعت اسلام ہیں۔ یہ شریعت صرف ان احکام پر مبنی ہے' جن میں کسی واجب کا فیصلہ غیر مشتبہ الفاظ میں کردیا گیا ہے یا اسے ناجائز قرار دے دیا گیا ہے لیکن جن چیزوں اور سرگرمیوں کے وسیع تر دائرے کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا -- نہ از روئے نص ان کے کرنے کا حکم دیا گیا اور نہ ان کی ممانعت کی گئی -- ان سب کو شرعی نقطہ نگاہ سے مباح سمجھنا چاہیے۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ جو نظریہ اوپر پیش کیا گیا ہے' وہ اسلامی فکر میں کوئی نئی چیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ (صلعم) کے صحابہ کا نقطہ نگاہ یہی تھا اور آگے چل کر اسلام کے بعض بہت بڑے علماء کا نقطہ نگاہ یہی رہا' خصوصاً اس شخص کا

Marfat.com

نقطہ نگاہ' جسے بجا طور پر اسلام کے ممتاز ترین فقہا میں شمار کیا جاتا ہے یعنی ابن حزم قرطبی (۹۹۴ء تا ۱۰۶۴ء)۔ زیر غور مسئلے کے متعلق اس سے زیادہ توضیحی بیان کوئی نہیں ہوسکتا جو ابن حزم کی عظیم القدر تصنیف ''المحلی'' کے مقدمے میں درج ہے:

''شریعت پوری کی پوری یا تو فرض ہے جس کا ترک موجب معصیت ہے یا حرام ہے، جس کا ارتکاب گناہ ہے یا مباح ہے جس پر نہ عمل گناہ ہے، نہ اس کا ترک گناہ ہے۔ مباح کی تین قسمیں ہیں۔ اول وہ افعال جنہیں مستحب قرار دیا گیا (مندوب)۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا کرنا باعث اجر ہے، نہ کرنا گناہ نہیں۔ دوم وہ افعال جنہیں مکروہ قرار دیا گیا۔ ان کا ترک باعث اجر ہے اور جو کرے' وہ گنہگار نہیں۔ سوم مطلق مندوب یعنی نہ کرنے پر اجر ہے، نہ ترک پر گناہ ہے۔ اسی طرح نہ ان کا کرنا موجب گناہ ہے، نہ ترک........

رسول اللہ (صلعم) نے فرمایا: ''جن امور کے متعلق میں نے کچھ نہیں کہا' ان کے بارے میں مجھ سے سوال نہ کرو۔ دیکھو! تم سے پہلے جو لوگ گزر چکے ہیں' وہ اس لئے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے اپنے انبیاء سے بہت سوال کیے۔ پھر انبیاء سے متعلق ان میں اختلاف پیدا ہوا (ان کی تعلیمات کے متعلق) پس اگر میں کسی چیز کے لئے کرنے کا حکم دوں تو اس حد تک کرو جس حد تک تم میں استطاعت ہو۔ اگر میں کسی چیز سے روک دوں تو اس سے باز رہو۔''[۲۲]

''اس حدیث میں دین کے تمام اصول اول سے آخر تک جمع ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جن امور کے متعلق رسول اللہ (صلعم) نے سکوت فرمایا نہ کرنے کا حکم دیا، نہ منع کیا، وہ مباح ہیں یعنی نہ مسنون ہیں نہ واجب۔ جن امور کا حکم دے دیا' وہ فرض ہیں اور جن امور سے منع کر دیا وہ حرام ہیں۔ گویا رسول اللہ (صلعم) نے جو احکام صادر فرما دیئے' ان پر ہمارے لئے استطاعت کی حد تک عمل واجب ہے۔''[۲۳]

چونکہ حقیقی شریعت اوامر و نواہی تک محدود ہے' جو قرآن و سنت میں واضح طریق پر بیان کر دیئے گئے' اس لئے شریعت حد درجہ مختصر اور بلیغ ہے اور اسے سمجھ لینا بہت سہل ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی جلد میں سما سکتی ہے اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں' اس میں زندگی کی ہر ضرورت کے متعلق تفصیلی قانون سازی کا انتظام نہیں کیا گیا، نہ کیا جا سکتا تھا۔ یعنی ہم مسلمانوں کے متعلق قانون دینے والے کا منشا یہ تھا کہ مزید ضروری قانون سازی کا انتظام اجتہاد سے کریں اور وہ روح اسلام کے عین مطابق ہونا چاہیے۔ یہ حقیقت بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآن و سنت کی بنا پر ہم جو اجتہادی قانون سازی کریں گے۔ (وقتاً فوقتاً گذشتہ دوروں کے اجتہاد سے بھی مدد لیں گے)۔ اس قانون سازی میں آئندہ نسلوں کے اجتہاد سے برابر ترمیم ہو سکے گی۔ یعنی ہماری قانون سازی ہنگامی ہوگی اور یہ قانون ناقابل تردید و تنسیخ شریعت کے

Marfat.com

تابع بدلتا رہے گا۔ یہ شریعت نصوص قرآن وسنت کے سوا کچھ نہیں۔

شریعت میں کوئی ردو بدل نہیں ہوسکتا' کیونکہ وہ الہٰی قانون ہے۔اس میں ردو بدل کی ضرورت بھی نہیں، کیونکہ اس کے احکام اس طریق پر بنائے گئے ہیں کہ کوئی بھی حکم انسان کی فطرت صحیحہ اور انسانی معاشرے کے حقیقی تقاضوں سے کسی بھی زمانے میں متصادم نہیں ہوسکتا۔اس کی صاف اور سادہ وجہ یہ ہے کہ ان احکام میں انسانی زندگی کے ان پہلوؤں کو نظم وضبط کے تابع لایا گیا ہے' جن میں فطرۃً تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی۔الہٰی قانون کا یہ خاص پہلو--انسانی ارتقاء کے تمام احوال ومراحل پر اس کا اطلاق--اس امر کا متقاضی ہے کہ اس کے احکام اولاً عام اصول پر حاوی ہوں (تفصیلات میں ہنگامی ضرورت کے وقت تبدیلی کی اجازت ہے)۔ثانیاً ان میں ایسے معاملات کے متعلق تفصیلی قانون سازی کا انتظام کر دیا گیا ہو جن میں انسان کے عمرانی ارتقاء سے کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔نصوص کے متن کا جائزہ لیا جائے تو یہ گزارش بالکل درست ثابت ہوتی ہے۔جب کسی نص میں کوئی تفصیلی قانون موجود ہے تو وہ ایسی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے متعلق ہو گا جسے ہنگامی تغیرات سے بالا سمجھنا چاہیے۔(مثلاً انسانی فطرت اور انسانی روابط کے بنیادی عناصر)۔اس کے برعکس جب انسانی ترقی کے لئے کوئی تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے (مثلاً نظام حکومت، فنکاری، اقتصادی قانون سازی وغیرہ) تو شریعت مفصل قوانین بناتی ہی نہیں۔ایسے امور میں یا تو صرف عام اصول بیان کر دینے پر اکتفا کرتی ہے یا قانون سازی سے بالکل اعراض کر لیتی ہے۔یہی وہ مقام ہے جہاں اجتہاد کی بنا پر قانون سازی بجا سمجھی جاسکتی ہے۔اس معاملے کو زیادہ معین شکل میں پیش کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اجتماعی قانون سازی کا جائز دائرہ مندرجہ ذیل پر مشتمل ہے:

(الف) ان معاملات ومواقع کے متعلق تفصیلات کا انتظام، جن میں شریعت نے صرف عام اصول پیش کر دیئے اور مفصل احکام نہیں دیئے۔

(ب) ان معاملات کے متعلق اصول وتفصیلات کا انتظام جو مباح ہیں یعنی شرعی قانون ان پر حاوی نہیں۔

یہی قاعدہ ہے جس کا ذکر قرآن نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

لکل جعلنا منکم شرعة و منھا جاً-- ہر ایک کو تم میں سے دیا ہم نے ایک دستور اور ایک راہ[ع]

(ترجمہ شیخ الہند مرحوم)

عرض الہٰی قانون (شریعت) نے اسلامی زندگی کے لئے وہ دائرہ کھینچ دیا ہے جس میں نشو وارتقاء کی اجازت ہے۔سرچشمہ قانون نے اس دائرے میں ہمیں کھلا راستہ (منہاج) دے دیا ہے تا کہ دنیوی زندگی کے لئے قانون بنا لیں جو ان ضرورتوں کو پورا کر سکے جنہیں نصوص قرآن وسنت نے دانستہ چھوڑ دیا۔[۵]

آزاد تحقیقات کی ضرورت

اسلام کے کھلے راستے (منہاج) کی ازسرنو دریافت ایسے مواقع پر حد درجہ ضروری ہے جب دنیائے اسلام

Marfat.com

ثقافتی بحران میں مبتلا ہے اور ایک عملی قضیے کی شکل میں اسلام کی صداقت کا فیصلہ نفیاً یا اثباتاً صدیوں کے لئے ہو جائے گا۔ ہم تیزی سے بدلنے والی دنیا کے اندر بیٹھے ہیں۔ ہمارا معاشرہ بھی اسی بے پناہ قانون تغیر کا تختہ مشق ہے۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں، تغیر ناگزیر ہے، بلکہ یہ ہماری آنکھوں کے سامنے ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ یہ حقیقت جتنی بدیہی ہے اتنی ہی بے پناہ ممکنات سے لبریز ہے۔ خواہ وہ بہتر ہوں یا بدتر۔ ''بہتر ہوں یا بدتر'' کا جملہ خاص توجہ کا محتاج ہے اور ہمیں بھولنا نہ چاہیے کہ ''تغیر''، ''حرکت'' کا دوسرا نام ہے اور ایک عمرانی نظام میں ''حرکت'' تخلیقی حیثیت بھی اختیار کر سکتی ہے اور تخریبی بھی ہو سکتی ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے قرآن وسنت کے حقائق کی طرف عود اور اپنے سیاسی فکر، نیز عمرانی سرگرمیوں کے لئے نئے وسائل کے مبانی کی تلاش پہلی قسم کی ''حرکت'' ہوگی۔ (یعنی تخلیقی) لیکن اگر اسلامی معاشرہ موجودہ حالت کی طرح مغربی تصورات و ادارات کی طرف مستقل ہوتا گیا تو یہ ''حرکت'' دوسری قسم کی ہوگی (یعنی تخلیقی)، لیکن اگر اسلامی معاشرہ موجودہ حالت کی طرح مغربی تصورات و ادارات کی طرف منتقل ہوتا گیا تو یہ ''حرکت'' دوسری قسم کی ہوگی (یعنی تخریبی) ہمیں سازگار معلوم ہو تو مغربی تصورات و ادارات کی جانب پیش قدمی کا سلسلہ جاری رکھ سکتے ہیں۔ نتیجہ یہی ہوگا کہ اسلام تہذیب کے ایک مستقل عامل کی حیثیت میں رفتہ رفتہ محو ہوتا جائے گا۔ اگر ہم چاہیں تو اسلام کا عمرانی وسیاسی لائحہ عمل از سرِنو تیار کر سکتے ہیں اور اس طرح اپنی ثقافت میں -- جو ابِ انحطاط کی افسردہ راکھ پر افتادہ ہے -- زندگی کی نئی روح پھونک سکتے ہیں۔

اگر ہم دوسری راہِ عمل کا فیصلہ کریں تو محض یہ کہہ دینا کافی نہ ہوگا کہ ''ہم مسلمان ہیں اور ہمارے اپنے نظریات ہیں۔'' ہمیں وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جس سے ہم اپنے آپ پر اور ساری دنیا پر آشکار کر سکیں کہ ہمارے نظریات میں زندگی کی اتنی قوت ہے جو ہر طرف سے آنے والے متعدد مخالف عمرانی وثقافتی اثرات کا مقابلہ کر سکے اور ان نظریات میں آج بھی ہمیں اپنا مستقل سیاسی نظام بنا لینے کی روشن ہدایتیں موجود ہیں۔ اس کارنامے کو پورا کرنے کے قابل ہم اس وقت ہو سکتے ہیں، جب اسلام کے ان عمرانی وسیاسی قوانین پر بے نتیجہ اعتماد سے کنارہ کش ہو جائیں، جو سابقہ ادوار کے مسلم علماء کو آخری و قطعی معلوم ہوتے رہے۔ پھر ہمیں از سرِنو تخلیقی طریق پر غور وفکر شروع کر دینا چاہیے جو اسلام کے اصل مآخذ کے مطالعے پر مبنی ہو۔

اگر ہم اس آزادانہ تحقیق وتفتیش کے جذبے کے پیشِ نظر کام کی ابتدا کریں گے تو دو اہم نتیجوں پر پہنچیں گے: اول اسلامی قانون کا تصور -- خصوصاً عام قانون کے متعلق -- پھر وہی سادگی اختیار کر لے گا جو سرچشمہ قانون نے اسے دی تھی، لیکن آگے چل کر یہ بہت سی رسمی اور اکثر من مانی تعبیرات کی تہوں کے نیچے دفن ہوتا رہا۔ دوم -- اور یہ پیشِ نظر مسئلے کے لئے حد درجہ موزوں ہے -- اسلامی مملکت کے ظاہری اشکال ووظائف کے لئے ضروری نہیں کہ وہ لازماً کسی تاریخی نمونے کے مطابق ہوں۔ کسی مملکت کے لئے اسلامی کہلانے کا استحقاق حاصل کرنے کی غرض سے صرف یہ مطلوب ہے کہ اس کے دستور اور کاروبار میں اسلام کے وہ غیر مشتبہ قوانین واضح طور پر شامل ہو جائیں جنہیں امت کی عمرانی، سیاسی اور اقتصادی زندگی سے براہِ راست تعلق ہے۔ یہ احکام بہت کم ہیں اور بڑی وضاحت سے پیش کر دیے گئے

Marfat.com

ہیں۔ نیز وہ سب کے سب اس نوعیت کے ہیں کہ ہمیں خاص اوقات اور خاص عمرانی حالات میں ضروریات کے مطابق زیادہ سے زیادہ آزادی وکشادگی حاصل رہتی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

راستے کی مشکلات

یہاں ان بنیادی شرعی اصول کے متعلق بحث ختم ہوگئی جنہیں مملکت کے دستور میں شامل ہونا چاہیے' بشرطیکہ وہ مملکت محض نام کی اسلامی نہ ہو بلکہ عملاً بھی اسلامی ہو۔

اس کتاب میں میری کوشش یہ نہ تھی کہ کسی مملکت کا دستور پیش کر دیتا۔ میں نے اسلام کے بعض بدیہی احکام پیش کرنے کی کوشش کی جو کسی مملکت اور حکومت کے مسائل سے متعلق ہیں۔ دور حاضر کی ضروریات کے مطابق ان پر عمل کے طریقے بحث میں آئے اور ان قانونی انتظامات کی طرف توجہ دلائی جنہیں بہرحال اس دستور میں شامل ہونا چاہیے جو اسلامی ہونے کا مدعی ہو۔ کتاب کی محدود گنجائش کے باوجود میں نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ اسلام نے ہمارے سامنے اپنا واضح اور قطعی سیاسی قانون پیش کر دیا ہے اور تفصیلات کا معاملہ وقتی احوال کے مطابق اجتہاد پر چھوڑ دیا ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسلامی مملکت کی تنظیم میں جو طور طریقے اور کارروائیاں مضمر ہیں' ان پر محض بحث اسلام کے پورے منصوبے کی حقیقی حیثیت واضح نہیں کر سکتی کیونکہ اسلام محض سیاست یا عمل کا پروگرام نہیں' بلکہ اس سے بہت زیادہ ہے۔ یہ عقائد، اخلاق اور عمرانی اصول کا نظام ہے۔ تمام انفرادی اور اجتماعی معاملات میں راست بازی کی دعوت ہے۔ یہ ایک مکمل اور کفیل بالذات نظریہ ہے جو ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے' خواہ وہ اخلاقی ہوں یا جسمانی، روحانی ہوں یا ذہنی، انفرادی ہوں یا اجتماعی۔ یہ سب پہلو ایک غیر منقسم کل کے اجزا ہیں جسے ہم انسانی زندگی کہتے ہیں۔ چونکہ اسلامی نظریہ بجائے خود مکمل و کفیل بالذات ہے لہٰذا اس کے پیرو محض اسلامی عقائد کی بنا پر حقیقی اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ انہیں بہت کچھ کرنا چاہیے۔ اگر اسلام کا اسم بامسمّٰی بننا ضروری ہے تو انہیں چاہیے کہ جن عقائد کے وہ مدعی ہیں ان ہی کے مطابق عمرانی روش رکھیں۔ ایسی اجتماعی روش اور کوشش اس وقت تک ممکن نہیں جب تک پوری قوم اسلام کے عمرانی و اقتصادی قوانین کی پیروی قبول نہ کر لے۔ لہٰذا ایک آزاد نظریاتی مملکت کے نظام ہی میں -- جو اسلامی اصول پر مبنی ہو اور اس میں حکمرانی، قانون سازی اور تنفیذ قوانین کا پورا انتظام ہو -- اسلامی مقاصد بار آور عملی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔

ہم جس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں' اس میں زیادہ تر قومی تصورات کو غلبہ حاصل ہے۔ ان کی حیثیت یا تو نسلی ہے یا زیادہ سے زیادہ خالص ثقافتی۔ ایسی دنیا میں اسلامی مملکت کا تصور اس سے دور افتادہ ہے جسے باقی دنیا دور حاضر کی چیز یا مطلوب سمجھتی ہے۔ جب مذہبی نظریے کی بنا پر تعمیر مملکت کی وکالت کی جائے گی تو یقیناً سخت مخالفت سے سابقہ پڑے گا۔ ہمارے عہد کی اکثر قومیں نسلی رشتوں یا تاریخی روایتوں ہی کو قومیت کے جائز مقدمات قبول کرنے کی عادی ہو چکی ہیں۔ اس کے برعکس ہم مسلمان ایک نظریاتی جمعیت -- ایسے افراد کی جمعیت جو زندگی کے متعلق قطعی نقطہ نگاہ اور

Marfat.com

اخلاقی اقدار کے متعلق ایک قطعی معیار میں مشترک ہیں-- کو قومیت کی اعلیٰ ترین شکل سمجھتے ہیں۔ ہم یہ دعویٰ محض اس بنا پر نہیں کرتے کہ ہمیں اپنے خاص نظریے یعنی اسلامی کی حقانیت کا یقین ہے جو خدا کی طرف سے بہ صورت قانون ہمیں عطا ہوا بلکہ ہماری عقل بھی یہی کہتی ہے کہ مشترک افکار کی بنا پر قائم شدہ جمعیت اس جمعیت کے مقابلے میں انسانی زندگی کا بدرجہا ترقی یافتہ مظہر ہے جو نسل یا زبان یا جغرافیائی موقع و محل پر مبنی ہو۔

اگر ہم اپنے نظام سیاست کو اسلامی اوضاع و مقاصد کے مطابق بنانے کا فیصلہ کر لیں تو جن مشکلات سے سابقہ پڑے گا' انہیں معمولی نہ سمجھنا چاہیے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ صدیوں کی تذلیل و بے قدری اور محکومی نے ملت اسلامیہ کی قوت سلب کر لی اور اس کی اجتماعی حوصلہ مندی میں ضعف آ گیا ہے۔ ایسے حالات میں حقیقی اسلامی نظام سیاست کا قیام آسان کام نہیں۔ مسلمانوں نے سیاسی انحطاط کے دوران میں ثقافتی خود اعتمادی کا بھی بڑا حصہ زائل کر دیا۔ بہت سے مسلمانوں کو یہ مشکل بھی درپیش ہے کہ وہ آج غور و فکر کرتے وقت ''مملکت'' اور ''قومیت'' کی مغربی اصطلاحات سے الگ نہیں رہ سکتے اور اسلامی اصطلاحات سے کام نہیں لے سکتے۔ وہ آنکھیں بند کر کے فکر کے مغربی نمونوں کی پیروی کر رہے ہیں اور سادہ لوحی سے سمجھتے ہیں کہ مغرب سے جو بھی چیز آتی ہے وہ ہی مسلمانوں کی پیدا کردہ کسی چیز کے مقابلے میں تازہ ترین ہونا چاہیے۔ ان کا یہی یقین اس امر کا باعث ہے کہ اپنے معاشرے میں جو کچھ پیش آتا ہے' اس پر غیر ذمہ دارانہ انداز میں مغربی سیاسی تصورات سے کام لیتے رہتے ہیں۔ ان کے برعکس بہت سے قدامت پسند مسلمان ہیں جو قولاً اور عملاً روایتی اوضاع قائم رکھنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ اس وجہ سے قوم کی مغربیت مآبی کے مخالف ہیں۔ ان کی مخالفت اسلام کی حقیقی اقدار کے صحیح اندازے پر مبنی نہیں' بلکہ اس کی بنا ان عمرانی معمولات پر ہے' جو ہمارے دور انحطاط میں بروئے کار آئے۔ وہ غالباً فرض کیے بیٹھے ہیں کہ اسلام اور مسلم معاشرے کے معمولات ایک شے ہیں (حالانکہ ہر صاحب فکر پر واضح ہے کہ یہ مفروضہ سرتاسر غلط ہے) لہٰذا جس حد تک ان معمولات سے اختلاف کیا جائے گا' جو ہماری تاریخ کے دوران میں بروئے کار آئے-- وہ معمولات بھی جن کا تعلق عمرانی عادات سے ہے اور وہ بھی جو مسائل مملکت و حکومت کے باب میں ہمارے نقطہ نگاہ سے متعلق ہیں-- وہ اسلام کے خلاف ہوگا۔ گویا اسلامی مملکت کا فرض یہ ہے کہ ان تمام عمرانی اوضاع کی قانونی توثیق کرے اور انہیں صورت دوام دے دے' جن میں ہم اب تک زندگی بسر کرتے آئے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے معاشرے کے ان قدامت پسند عناصر نے فرض کر رکھا ہے کہ اسلام کی بقا ان احوال کے قیام پر موقوف ہے جنہوں نے اپنی بے ثمر صلابت کے باعث مسلمانوں کے لئے حقیقی اسلامی اصول کے مطابق زندگی بسر کرنا اب ناممکن بنا رکھا ہے۔ خوانندۂ کتاب کو اس اعتراف میں تامل نہ ہوگا کہ یہ بڑی ہی افسوسناک منطق ہے لیکن یہ مفروضات کتنے ہی مہمل کیوں نہ ہوں' ان سے وہ بنیاد ضرور واضح ہو جاتی ہے جس پر قدامت پسند نکتہ چینوں کے قلوب کارفرما ہیں۔ وہ ہمارے عمرانی تصورات و عادات میں کسی بھی تغیر کی ضرورت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں اور بے شمار مسلمانوں، مردوں اور عورتوں کو بہ حالت بے چارگی مغرب کی نقالی پر مجبور کر رہی ہے۔ ان کا اصرار یہ ہے کہ دور حاضر کی اسلامی مملکت ہمارے ماضی کے تاریخی نمونوں کا ہو بہو چربہ ہونی چاہیے۔ اس وجہ سے

Marfat.com

اغلب ہے۔ اسلامی مملکت کا نظریہ ہی بے حرمتی اور استہزاء کا ہدف بن جائے۔

خود ہمارے ثقافتی انحطاط اور اسلامی فکر میں صدیوں کے جمود سے جو مشکلات پیدا ہوئیں' انہیں ایک طرف رکھئے۔ جب ہم اپنے وطنوں کو صحیح اسلامی اصول پر منظم کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو غیر مسلم دنیا میں لامحالہ ایک خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ بلاواسطہ یا بالواسطہ ہر قسم کی مشکلات پیدا کی جاتی ہیں تا کہ ہم اس نصب العین کی طرف گامزن نہ ہو سکیں۔ حروب صلیبیہ کے زمانے سے اسلام کو اہل مغرب کے روبرو غلط انداز میں پیش کیا جا رہا ہے اور ہر اسلامی معاملے کے متعلق گہری بے اعتمادی--تقریباً نفرت--مغرب کی ثقافتی میراث کا غیر منفک جزو بن گئی ہے۔ اہل مغرب کو اسلامی اصول میں ان کے اکثر بنیادی، مذہبی عقائد کا رد ہی پریشان نہیں کرتا بلکہ وہ اسلام کو سیاسی خطرہ بھی سمجھتے ہیں۔ اسلامی دنیا اور یورپ کے درمیان صدیوں تک شدید رزم و پیکار کا سلسلہ جاری رہا۔ ان تاریخی یادوں کے زیر اثر وہ اسلام پر یہ تہمت لگاتے ہیں کہ اس مذہب میں تمام غیر مسلموں سے عداوت مضمر ہے اور انہیں یہ خوف دامنگیر ہے کہ اسلامی مملکت کے خیال میں اسلامی روح کا احیاء شامل ہے اور ممکن ہے کہ مسلمانوں کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہو جائیں اور وہ دوبارہ مغرب کی طرف نئے جارحانہ اقدامات شروع کر دیں۔ اس ممکن رجحان کے سدباب کی غرض سے اہل مغرب وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو اسلامی ملکوں کی سیاسی قوت کے احیاء کی روک تھام کے لئے ضروری ہے اور جس کی وجہ سے اسلام کو دوبارہ مسلمانوں کی عمرانی و ذہنی زندگی میں مقتدر حیثیت حاصل ہو سکتی ہے۔ ان کے وسائل مقابلہ محض سیاسی نہیں، ثقافتی بھی ہیں۔ مغربی درسگاہوں کے ذریعے سے نیز اسلامی دنیا میں مغربیوں کے جاری کردہ طریق تعلیم کے ذریعے سے اسلام کے خلاف بے اعتمادی پیدا کی جا رہی ہے۔ مردوں اور عورتوں کی نئی نسل کے دلوں میں منظم طریق پر یہ بٹھایا جا رہا ہے کہ اسلام کے عمرانی اصول قابل اعتماد نہیں۔ اسلام کے خلاف بے اعتمادی کی مہم میں سب سے بڑا حربہ نادانستہ ہمارے معاشرے کے قدامت پسند عناصر مہیا کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اصرار کر رہے ہیں کہ معاصر اسلامی مملکت کے سیاسی اوضاع اور وسائل کا کاروبار وہی ہونے چاہئیں جن کا نمونہ ابتدائی اسلامی دور میں بروئے کار آیا (حالانکہ قرآن و سنت میں اس کے لئے کوئی سند موجود نہیں)۔ رسول اللہ (صلعم) جو پیغام حق لے کر اس دنیا میں آئے' اس کے یہ خود ساختہ محافظ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے وقت کے سیاسی تقاضوں کے مطابق شریعت کو نظام کی شکل میں قبول کر لینا ناممکن بنا رہے ہیں۔ یہ جہاد کو غیر مسلم علاقوں میں مملکت کی جارحانہ توسیع کا حربہ ظاہر کر رہے ہیں۔ یوں اس مقدس فریضے کو ایسی شکل دے رہے ہیں' جس سے تمام قرآنی احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اس طرح یہ غیر مسلموں کے دل میں خوف کا بیج بوتے ہیں اور بہت سے راست باز مسلمانوں کے دل میں اس رجحان کی بے انصافی پر بیزاری رونما ہوتی ہے۔ آخر میں ان لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے اندر زندگی کے تمام اجتماعی پہلوؤں میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان امتیاز کا فرض عائد کرتی ہے (حالانکہ اس کے لئے بھی قرآن و سنت میں کوئی سند موجود نہیں)۔ گویا غیر مسلم اقلیتوں میں بیزاری پیدا ہوتی ہے اور ان اقلیتوں کے لئے یہ خیال اطمینان سے برداشت کر لینا ناممکن بنایا جاتا ہے کہ جس ملک میں وہ مقیم ہیں' وہ اسلامی ملک بن جائے۔

Marfat.com

اس خطرے پر جو غیر مسلم دنیا کو عموماً اور ہمارے غیر مسلم شہریوں کو خصوصاً درپیش ہے' قابو پانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اسلام کے عمرانی وسیاسی منصوبے کی توضیح کر سکیں اور بتا سکیں کہ اس کا مقصد مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لئے حق وانصاف ہے اور حقیقی اسلامی مملکت کے قیام کے لئے ہمارے محرک صرف اخلاقی مصالح ہیں۔ خیر ہمارا فرض ہے کہ پوری دنیا پر ثابت کر دیں کہ ہم حقیقتاً قرآن کے ان مقدس الفاظ کا عملی پیکر بن کر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں:

کنتم خیر امة اخرجت للناس	تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو لوگوں (کے ارشاد واصلاح)
تامرون بالمعروف وتنهون عن	کے لئے ظہور میں آئی ہے۔ تم نیکی کا حکم دینے والے، برائی
المنکر و تؤ منون باللّٰه (۳:۱۱۰)	سے روکنے والے اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو۔[۲]

ہمارے راست باز قوم ہونے کا انحصار اس پر ہے کہ ہم ہمیشہ اور تمام حالات میں حق وانصاف کی پاسداری کے لئے جدوجہد پر آمادہ رہیں اور تمام قوموں کے لئے ناحق اور بے انصافی موقوف کرا دیں۔ محض اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ حقیقی ملت اسلامیہ اپنے درمیان رہنے والے غیر مسلموں کے لئے کبھی بے انصافی کی مرتکب نہیں ہو سکتی۔

ہمارے سامنے جو دوسری مشکل ہے-- جو اسلامی مملکت کی نوعیت وطرز عمل کے متعلق قدامت پسند مسلمانوں کے متعصبانہ اور رسم پرستانہ آراء سے پیدا ہوئی--اس پر قابو پانے کی صرف یہ صورت ہے کہ ہم قرآن وسنت میں پیش کردہ سیاسی قانون کے مسئلے پر تخلیقی انداز سے غور کریں اور تمام تاریخی نمونوں سے بے نیاز ہو جائیں۔ ساتھ ہی ان تمام تعبیرات سے دستکش ہو جائیں، جو ہمیں سابقہ نسلوں سے ملیں۔ بہ الفاظ دیگر ہمیں اس قابل ہونا چاہیے کہ بتا سکیں، قدامت پسندوں کے تمام اعتراضات کے علی الرغم قانون اسلام فقہی موشگافیوں یا خطبات جمعہ کی عبارت آرائیوں ہی کا موضوع نہیں بلکہ یہ انسانی زندگی کا ایک زندہ اور حرکی پروگرام ہے۔ ایسا پروگرام جو اپنی جگہ کامل واکمل ہے۔ وہ ہر خاص ماحول سے بالکل بے نیاز ہے' لہٰذا تمام اوقات اور تمام احوال میں قابل عمل ہے۔ یہ پروگرام ایسا ہے کہ اس پر عمل پیرائی سے نہ محض ہمارے معاشرے کے نشوو ارتقا ہی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو گی بلکہ یہ ہمارے معاشرے کو زیادہ سے زیادہ ترقی پذیر، زیادہ سے زیادہ کفیل بالذات اور تمام موجود معاشروں میں حد درجہ زبردست اور قوی بنا دے گا۔

مجموعۂ قوانین کی ضرورت

اسلامی مملکت کے اصول کی یہ بحث ختم کرنے سے پیشتر میں چند الفاظ مجموعۂ قوانین اسلامی کی ضرورت کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔

ہم دیکھ چکے ہیں' اسلامی مملکت کا اولین فرض یہ ہے کہ اپنے زیر اقتدار علاقوں میں شریعت کے احکام نافذ کرے اور اس غرض سے ہمیں قوانین شریعت کے ایک ایسے مجموعے کی ضرورت ہے جو مختصر اور واضح طور پر جامع ہو لیکن ایسے مجموعے کے لئے سامان کہاں سے ملے گا؟ اس کا بدیہی جواب یہ ہے کہ قرآن وسنت کے نصوص میں' مگر کیا احکام نصوص کبھی پورے کے پورے جمع کر کے موشگافانہ رسمی فقہ کے قیاسی اضافے کے بغیر ملت اسلامیہ کے سامنے پیش کیے گئے؟ افسوس سے کہنا پڑتا ہے' اس کا جواب نفی میں ہے۔ اسلامی قانون کو حقیقی' سادہ اور بہ آسانی قابل فہم شکل میں پیش

Marfat.com

کرنے کے بجائے مسلمانوں کے سامنے فقہی استخراجات وتعبیرات کا ایک عظیم الشان اور ذو اطراف ذخیرہ پیش کیا جاتا ہے جو مختلف علماء اور دبستان ہائے فکر نے ایک ہزار سال پیشتر ترتیب دیا' لیکن استخراجات وتعبیرات نہ محض تعداد ہی میں زیادہ ہیں بلکہ حد درجہ پیچیدہ بھی ہیں اور اکثر نہایت اہم قانونی نکات میں باہم دگر متناقض ہیں۔ مثلاً اسلامی کے مقاصد کیا ہیں اور مسلمانوں کو اجتماعی وسیاسی معاملات میں کیسی روش اختیار کرنی چاہیے۔ اس قسم کے امور کے متعلق سنی فقہ میں سے حنفی دبستان، اثناء عشری شیعوں اور صوفیوں کے نظریات میں ہم آہنگی نہیں۔ بہت سے کم درجے کے دبستان ہائے فقہ کا ذکر بھی کیا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مختلف فقہی نظاموں میں سے اسلامی مملکت کے لئے قانون عامہ کا مجموعہ ترتیب دینے کی غرض سے کس نظریے کو بنیاد بنانا چاہیے؟

کہا جا سکتا ہے کہ ہر اسلامی ملک میں اس غرض سے وہ فقہی تعلیمات استعمال کرنی چاہئیں جن کی پابند آبادی کی اکثریت ہے۔ یعنی جہاں حنفیوں کی اکثرت ہے' حنفی فقہ قانون عامہ کی بنیاد ہو۔ جس ملک میں شیعوں کی اکثریت ہے' وہاں جعفری فقہ کو بنیاد مانا جائے وقس علیٰ ہٰذا' لیکن اس طرز عمل کے خلاف کم از کم دو اعتراض بڑے وزنی ہیں۔ اول مروجہ فقہی نظاموں میں سے کوئی بھی موجودہ وقت کی ضروریات کے مطابق نہیں کیونکہ استخراجات بڑی حد تک اس زمانے کے تجربات پر مبنی ہیں جو ہمارے زمانے سے بالکل مختلف تھا۔ دوم یہ ناقابل تصور ہے کہ جو مملکت اسلامی ہونے کی مدعی ہے' وہاں وہ فقہ رائج ہو جو آبادی کے صرف ایک حصے کے نزدیک قابل قبول ہو (اگرچہ وہ حصہ بہ لحاظ تعداد اکثریت کا حامل ہو) اور یہ فقہ قوم کی اقلیت پر اس کی مرضی کے خلاف عائد کی جائے۔ یوں اسے سیاسی اعتبار سے بھی اقلیت بنا دیا جائے۔ اس قسم کی من مانی کارروائی قرآن کے اصول مواخات اور تمام مسلمانوں کی مساوات کے صریح خلاف ہوگی' لہٰذا اسلامی مملکت کے پاس شرعی احکام کا ایک ایسا مجموعہ ہونا چاہیے۔

(الف) جو تمام مسلمان شہریوں کے نزدیک فی الجملہ قابل قبول ہو اور فقہی دبستانوں سے ان کے تعلق کا کوئی امتیاز پیش نظر نہ رکھا جائے۔

(ب) جس سے الٰہی قانون کی دائمی اور غیر متبدل خصوصیت اس شان سے واضح ہو جائے کہ اس کا اطلاق تمام زمانوں اور انسان کے اجتماعی وذہنی نشوو ارتقاء کے تمام مرحلوں پر کیا جا سکتا ہے۔

موجودہ اسلامی دنیا میں اس دوگونہ کام کی ضرورت جس تیزی سے محسوس کی جا رہی ہے' وہ محتاج بیان نہیں۔ اکثر تجویزیں پیش کی جاتی ہیں کہ مروجہ فقہی دبستان ہائے فکر کی تعلیمات میں ہم آہنگی پیدا کرنی چاہیے۔ نیز دور حاضر کے فکر اور زندگی کے موجودہ حالات کی روشنی میں ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ ایسی کوشش نہ محض اصل مقصد کے خلاف جائے گی بلکہ مسائل شریعت کے متعلق مسلمانوں کی روش کے سلسلے میں نہایت افسوسناک حالات پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

اول:۔ ''مختلف دبستان ہائے فقہ اسلامی میں ہم آہنگی'' بظاہر کتنی ہی مطلوب ہو' وہ مجموعہ قوانین مطلقاً پیدا نہیں کر سکتی جو بالکل سادہ ہو اور فکر سلیم رکھنے والا ہر مسلمان اسے سمجھ سکے' خواہ اس نے قانونی امور میں درجہ تخصیص حاصل کیا ہو

Marfat.com

یا نہ کیا ہو۔ ہم آہنگی کا مطلب یہ ہوگا کہ ان حد درجہ قیاسی اور بے شمار استخراجات میں (جن سے تمام دبستانوں کی مروجہ فقہ مرکب ہے) مصنوعی لحاظ سے ارتباط پیدا کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قیاسی فقہ کا نظام پیچیدہ تر ہو جائے گا۔

دوم: اس قسم کی ہر ہم آہنگی اور ارتباط سے وہ پریشانی مستقل حیثیت اختیار کر لے گی جو بہت سے مسلمانوں کے دلوں میں موجود ہے۔ پریشانی یہ کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے کیا حکم دیا تھا (دوسرے لفظوں میں قانون دینے والے نے قرآن وسنت میں کون سے نصوص رکھے تھے) اور اس قانون کے متعلق مسلمان علماء کی رائے نسلاً بعد نسلٍ کیا رہی۔ یوں ہمارا شرعی تصور پھر اس فکر کی زنجیروں میں جکڑا جائے گا جو تاریخ کے ایک خاص دور-- انسانوں کے درمیان خاص وقت پر-- میں رائج تھا۔

سوم: اگر موجودہ حالات کی روشنی میں شریعت پر ''نظر ثانی'' کی کوشش کی گئی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ دوام وثبات کا وہ آخری رشتہ بھی ختم ہو جائے گا جو مسلمانوں کے نزدیک وجداناً-- اور بالکل بجا-- قانون الٰہی کے تصور سے وابستہ ہے کیونکہ اگر نظر ثانی اب ضروری ہے تو چند قرن گزر جانے کے بعد پھر ضروری ہو جائے گی کیونکہ ''موجودہ حالات'' بدل جائیں گے۔ یہ سلسلہ متواتر اسی طرح جاری رہے گا' یہاں تک کہ قانون اسلام نظر ثانی ہی کے تواتر سے ناپید ہو جائے گا۔ اگر اسے حق بجانب سمجھا جائے تو ہمیں یہ دعویٰ کرنے کا کیا حق ہے کہ قانون دینے والے نے قانون اسلام کو دائمی اور ابدی قرار دیا تھا؟ کیا اس طرز عمل کو درست سمجھنے کے بجائے صاف صاف یہ کہہ دینا مناسب نہ ہوگا کہ قانون اسلام، حالات پیدا کرنے کے بجائے ان کے تابع ہے' لہٰذا اسے الٰہی قانون نہیں کہا جا سکتا؟

ایسی شکست خوردہ روش ہماری ذہنی ابتری اور پریشانی ختم نہیں کر سکتی۔ یہ ابتری و پریشانی الٰہی قانون کی دوامی اور غیر متبدل خصوصیت کو ترک کر دینے سے دور نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس ہم اس دوامی او غیر متبدل خصوصیت کو اس وقت تک کامیابی سے قائم نہیں رکھ سکتے' جب تک حوصلے اور ہمت سے کام لیتے ہوئے اور رسمی وابستگیوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے خدا کی اصل شریعت کو انسان کے ساختہ پرداختہ استخراجی فقہی قوانین سے الگ نہ کر دیں۔ یعنی اسلامی قانون کو ابتدائی حدود و دائرۂ عمل کے اندر لے آئیں۔ قرآن وسنت کے سادہ، واضح اور غیر مشتبہ احکام سامنے رکھ لیں۔ اسلامی نظریے کو از سر نو سمجھنے کی یہی ایک صورت ہے۔ اسی طرح مسلمان ثقافتی جمود وانحطاط پر قابو پا سکتے ہیں اور اس مکروہ غیر ارادیت سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ جو اب مذہبی فکر پر غالب ہے۔ اسی طرح شریعت ایک اسلامی مملکت میں ایک زندہ شے بن سکتی ہے۔

مجموعہ کیونکر مرتب کیا جائے؟

جو اسلامی ملت احکام اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور چاہتی ہے کہ اپنے عمرانی واقتصادی پروگرام کو سیاسی عمل کی شکل دے دے' اس کے لئے پہلا قدم یہی ہوگا کہ ان نصوص قرآن وسنت کا ایک مجموعہ مرتب کرے' جن میں عوام سے تعلق رکھنے والے مسائل کے متعلق واضح اور روشن قوانین موجود ہیں۔ اس سلسلے میں اسلامی مملکت کے لئے طریق عمل میرے نزدیک مندرجہ ذیل خطوط کے مطابق ہونا چاہیے:

Marfat.com

ا۔مجلس شوریٰ علماء کی ایک مختصری جماعت منتخب کرے جس میں مختلف دبستان ہائے فقہ کی نمائندگی کا انتظام ہو۔ اس کے ارکان قرآن کی تاریخ اور طریق ومنہاج نیز علم حدیث سے پوری طرح واقف ہوں اور مجموعے کی ترتیب کا کام انہیں سونپ دیا جائے۔ان کا فرض ہوگا' قرآن وسنت کے صرف ایسے احکام پر متوجہ ہوں' جو

(الف) نص کی لسانی تعریف کے عین مطابق ہوں یعنی ایسے احکام وبیانات، جو ظاہر الفاظ کی بنا پر ایک مخصوص مفہوم کے حامل ہوں اور ان کی ایک سے زیادہ تعبیر نہ ہو سکے۔

(ب) ان کی حیثیت واضح طور پر امر یا نہی کی ہو۔

(ج) ان کا تعلق براہ راست انسان کے اجتماعی چلن اور عمل سے ہو۔

۲۔قرآن مجید سے نصی احکام کا انتخاب مقابلۃً سہل ہے' کیونکہ ایک ہی متن زیر غور ہوگا لیکن جب اس اصول کا اطلاق احادیث پر کیا جائے گا تو ہر حدیث کا پورا جائزہ اس کے مناسب تاریخی پس منظر میں لینا ضروری ہوگا۔صرف وہی احادیث زیر غور لانی چاہئیں جو تاریخی اور فنی نکتہ چینی کے اعلیٰ معیار پر پوری اتر چکی ہوں۔جن احادیث کی صحت پر معمولی سی گنجائش اعتراض بھی موجود ہو' انہیں ابتداہی میں الگ کر دینا چاہیے (اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو احادیث فنی نقطۂ نگاہ سے کسی حد تک مجروح ہیں اور باقی اعتبارات سے ان میں صحت کے تمام علائم موجود ہیں' انہیں وقتاً فوقتاً اجتہاد کی غرض سے استعمال نہ کیا جائے۔ میں اس نکتے پر زور دینا چاہتا ہوں کہ زیر بحث شرعی مجموعۂ قوانین کے متن میں ایسی احادیث شامل نہ کی جائیں)۔رسول اللہ (صلعم) نے بعض احکام تمام حالات اور تمام اوقات کے لئے مقرر فرمائے۔ بعض احکام خاص موقع اور وقت کی ضرورت پوری کرنے کے لئے دیئے گئے تھے۔ان میں امتیاز قائم رکھنا چاہیے۔یہ آخری قسم کے احکام یا تو رسول اللہ (صلعم) کے ارشادات ہی سے واضح ہو جاتے ہیں یا ان صحابہ نے ان کے ساتھ توضیحات لگا دیں جو متعلقہ احادیث کے راوی تھے۔بعض اوقات کسی حکم کی موقت حیثیت دوسری احادیث سے واضح ہو جاتی ہے جو اسی موضوع کے متعلق آئی ہیں۔ جب کوئی تصریح وتوضیح نہ مل سکے تو اس حکم نص کو جو صحیح احادیث میں آچکا ہے' دائمی صحت وتوثیق کا حامل سمجھنا چاہیے۔

۳۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ شرعی قانون قائم کرنے کے لئے ہمیں قرآنی آیات کے مختلف ٹکڑے یا متفرق احادیث چن لینے پر اکتفا نہ کرنا چاہیے بلکہ ہر معاملے میں قرآن وسنت کا پورا سیاق پیش نظر رکھ کر غور کرنا چاہیے۔بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی کوئی آیت بجائے خود کوئی قانونی حکم پیش نہیں کرتی' تاہم اگر اسے کسی دوسری آیت یا صحیح حدیث سے ملا کر دیکھا جائے تو قانون کی نص بن جاتی ہے۔عموماً یہی کیفیت رسول اللہ (صلعم) کی سنت ہے۔ہمیں فراموش نہ کرنا چاہیے کہ رسول اللہ (صلعم) نے ملت کے امام اور قانون ساز کی حیثیت میں جو کچھ فرمایا' موجودہ احادیث میں سے اکثر حضورؐ کے ارشادات کے محض بعض حصے یا متفرق واقعات بیان کرتی ہیں' جنہیں تاریخی پس منظر سے الگ کر لیا گیا ہے۔لہٰذا حضورؐ کی طرف سے جو قانونی احکام جاری ہوئے' وہ بعض اوقات اس وقت واضح ہوتے ہیں جب متعدد صحیح احادیث پہلو بہ پہلو رکھی جاتی ہیں یا متعلقہ احادیث کو کسی ہم معنی قرآنی آیات سے ملا کر پڑھا جاتا

Marfat.com

ہے۔ بہر حال یہ حقیقت کبھی نظر انداز نہ کرنی چاہیے کہ قرآن وسنت ایک لاینفک کل ہیں جو ایک دوسرے کی توضیح وتفسیر کرتے ہیں۔ لہٰذا مجوزہ شرعی ضابطہ ترتیب دیتے وقت دونوں یعنی قرآن وسنت کا پورا متن سامنے رہنا چاہیے۔

۴۔ قرآن وسنت سے جو فقہی احکام واضح ہوں' انہیں خاص عنوانوں کے تحت مرتب کر لینا چاہیے جن کا تعلق مسلمانوں کی اجتماعی وسیاسی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ہو۔ پھر اس مجموعے کو دنیائے اسلام کے مستند فضلا کے پاس بھیجا جائے تا کہ وہ بھی ان پر تبصرہ کریں اور کوئی چیز رہ گئی ہو تو تجویز کر دیں۔ خصوصیت سے اس طریقے پر تبصرہ ضروری ہے جس کے مطابق احادیث پر مبنی احکام لئے گئے ہیں۔ اس حقیقت پر زور دینا چاہیے کہ اس طرح قرآن وسنت کو نصی احکام کی شکل دینا مقصود نہیں اور واضح کر دیا جائے کہ اس مجموعے کی ترتیب کا مقصد وہ احکام پیش نظر لانا ہے' جو اپنی ظاہر حیثیت کی بنا پر متناقض تعبیرات کا موضوع نہیں بن سکتے۔ اس بنا پر انہیں مختلف دبستان ہائے فقہ کے درمیان زیادہ سے زیادہ قدر مشترک کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ قرآن وسنت کے جن بیانات کی تعبیر ایک سے زیادہ طریقے پر کی جا سکے۔ مجموعہ مرتب کرنے والی کمیٹی کو بتا دیا جائے' انہیں مجموعے سے باہر رکھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ مجموعہ تمام مسلمان قبول کر لیں گے' خواہ ان کا تعلق کسی فقہی دبستان سے ہو نیز قانون عامہ کا ایک ایسا مجموعہ مرتب ہو جائے گا جو حجم میں کم، حد درجہ مختصر اور اوسط درجے کی عقل وتعلیم کے ہر مسلمان مرد وزن کے لئے قابل فہم ہوگا۔

۵۔ جن علماء کے پاس شرعی قوانین کا یہ مجموعہ بھیجا جائے گا' اس پر نقد وتبصرہ اور تجاویز کو ان کی حقیقی حیثیت کے اعتبار سے سوچا جائے گا اور آخری نظر ثانی میں ان سے کام لیا جائے گا۔ پھر اسے ملک کے بنیادی قوانین کی حیثیت میں اختیار کر لینے کی تجویز کے ساتھ مجلس شوریٰ کے حوالے کر دیا جائے گا۔

اگر ہم شریعت کے اجتماعی احکام تجویز کردہ خطوط کے مطابق مرتب کر لیں تو اسلام کا سیاسی نظریہ (سیاسی کو وسیع معنی میں استعمال کیا گیا ہے) اس وضاحت سے سامنے آ جائے گا جس میں یہ کبھی نہ آیا۔ اس کی تمام دفعات معین معانی کی حامل ہوں گی جن میں متناقض تعبیرات کے لئے کوئی گنجائش نہ رہے گی۔ ہر مسلمان پر واضح ہو جائے گا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت میں اسے شرعی قانون کی حاکمیت بے چون وچرا تسلیم کر لینی چاہیے۔ اہل علم کے اجتہاد کی گنجائش ختم نہ ہوگی' بلکہ اس کی ضرورت بہت بڑھ جائے گی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے' حقیقی شریعت (مجموعہ نصوص قرآن وسنت) کا مدعا کبھی یہ نہ تھا کہ ہماری زندگیوں کے ہر ممکن واقعے کے متعلق ہر تفصیل بنا دی جائے۔ یہ محض ایک خاکہ تھا اور ہمیں اپنی تخلیقی قوتوں سے کام لے کر اس کی روشنی میں اپنے یومیہ معاملات ترتیب دینے چاہئیں۔ اگر ہم یہ یاد رکھیں تو واضح ہو جائے گا کہ خود ہمارے آزاد استدلال کی کارفرمائی کے لئے کتنا وسیع میدان موجود ہے۔ اجتہادی فکر ونظر کے مختلف نتائج میں اختلاف ضرور ہوگا لیکن اس سے کیوں گھبرائیں؟ جب ایک مرتبہ اجتماعی وسیاسی قوانین شریعت مسلمانوں کی اجتماعی زندگی غیر متبدل بنیاد واساس کے طور پر قائم ہو جائیں گے تو تمام غیر شرعی معاملات کے متعلق ہمارے آراء کا اختلاف رسول اللہ (صلعم) کے اس غیر قانونی ارشاد کے تابع چلا جائے گا جو میں اس کتاب میں پہلے پیش کر چکا ہوں۔

اختلاف علماء امتی رحمة میری اُمت کے علماء کا اختلاف خدا کی رحمت کا نشان ہے۔

Marfat.com

بہ حالت موجودہ کوئی صاحب عقل وہوش ان اختلافات وتنازعات آراء کو رحمت باری تعالیٰ کی شہادت قرار نہیں دے سکتا جس نے موجودہ دنیائے اسلام کو انسانیت کا ایک غیر متشکل، غیر منضبط اور ثقافتی اعتبار سے بے ثمر ہجوم بنا رکھا ہے۔ان میں اس مسئلے پر کوئی بنیادی اتفاق نہیں کہ اسلام کے اجتماعی وسیاسی قانون کا مفہوم کیا ہے۔ یہ جھگڑے اور آراء کا یہ اختلاف ہماری تخلیقی قوتوں میں اضافہ نہیں کرتا بلکہ اس سے ہمارے شکوک، ہماری مایوسی، ہماری ثقافتی شکست خوردگی نیز اپنے متعلق اور اپنی نظریاتی میراث کے متعلق بیزاری بڑھتی ہے۔ان حالات میں اس وقت تک کوئی خوش گوار تغیر نہیں پیدا ہوسکتا اور یہ صورت حالات رفتہ رفتہ اسلام سے ایک عملی مسلک کی حیثیت میں گریز کی طرف لے جا رہی ہے اور آخر ہماری ثقافت درہم برہم ہو جائے گی۔ جب تک ہم شریعت کے اجتماعی وسیاسی قوانین کا مجموعہ مرتب کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے، مدت سے فراموش کردہ اس کام پر توجہ نہ کریں گے اور اسے اپنی اجتماعی زندگی کی بنیاد نہ بنائیں گے۔ جب تک یہ نہ ہوگا' مسلمان ان اجتماعی طور طریقوں کے متعلق حد درجہ متخالف نظریات پر قائم رہیں گے جن کے مطابق کار بند ہو کر اسلام کے فروغ پانے کی امید ہے۔ یہاں تک کہ آخر فروغ وترقی کے متعلق ہمارے تمام افکار اسلام سے کاملاً الگ ہو جائیں گے۔

کیا ہم مسلمان چاہتے ہیں کہ یہ صورت حال پیش آئے؟ یا کیا ہماری خواہش یہ ہے کہ اپنے آپ پر اور باقی دنیا پر واضح کر دیں کہ اسلام ہمیشہ کے لئے ایک عملی دین ہے' لہٰذا یہ ہمارے عہد کے لئے بھی عملی ہے۔

نظریہ اسلام کو عملی یا غیر عملی ثابت کرنا ہم مسلمانوں کا کام ہے۔اگر ہم دور ماضی کے فقہی قیاسات تک اسلامی تصور کا دائرہ محدود رکھیں تو یہ بالکل غیر عملی رہے گا۔اگر ہم حوصلے اور فکر ونظر سے کام لیتے ہوئے اس پر متوجہ ہوں، تازہ اور بے میل نقطہ نگاہ اختیار کرتے ہوئے رسمی فقہی قیاسات کے دائرے سے اسے باہر نکال لیں تو اس کی عملیت معاروز روشن کی طرح نمایاں ہو جائے گی۔ یقیناً یہ بدیع نقطہ نگاہ ہم میں سے اکثر کے لئے تکلیف دہ ہوسکتا ہے کیونکہ اکثر طریق فکر سے واضح انقطاع اختیار کرنا لازم ہوگا اور یہ طریق فکر مدت سے مسلمانوں کی عادت ثانیہ چلے آتے ہیں۔ جو اجتماعی مراسم صدیوں کے عمل سے تقدس کا درجہ حاصل کر چکے ہیں' انہیں ترک کرنا پڑے گا۔اس خوش اعتقادی سے بھی دست کش ہونا پڑے گا کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے تمام اصول وفروع مستند اور قطعی طور پر فلاں یا فلاں کتاب فقہ میں بتائے جا چکے ہیں۔غرض اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان نئے مراکز کی طرف پیش قدمی کرنی ہوگی جنہیں ابھی تک ہمارے نقشے پر جگہ نہیں ملی۔ یہ صورت حال زیادہ قدامت پسندوں کے لئے ہراس انگیز ہے اور اس مقصد کے لئے جو بھی کوشش کی جائے گی' اسے لاریب شدید مخالفت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یہ مخالفت خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کی طرف سے ہوگی جو زمانہ ماضی کے بڑے فقہا کے آراء پر بے چون وچرا اعتماد کو اپنا مسلمہ مشرب ومسلک بنائے بیٹھے ہیں۔اس ''خیر'' کا انحصار ذہنی اور اجتماعی معاملات میں ان کی اپنی بے عملی اور بزدلی پر ہے لیکن اگر ہمارے دل میں اسلام اور صرف اسلام کے غلبے کا صحیح جذبہ موجود ہے تو ہمیں کسی مخالفت کو عناں گیر ہونے کا موقع نہ دینا چاہیے۔

Marfat.com

(در: اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول از محمد اسد۔ مترجم مولانا غلام رسول مہر، لاہور ۱۹۶۳ء، ص ۶-۱۷۲)

حواشی

۱۔ لسان العرب۔ مطبوعہ بیروت ۱۹۵۷ء (۱۳۷۵ھ) جلد نمبر ۷، ص ۹۸

۲۔ صحیح مسلم بہ روایت ابو ہریرہؓ

۳۔ ابو محمد علی ابن حزم کی کتاب ''المحلی'' مطبوعہ قاہرہ ۱۳۴۷ھ۔ جلد اول، صفحہ ۶۲-۶۴۔

۴۔ سورۂ مائدہ، آیت ۴۸۔

۵۔ یہاں یہ توضیح کر دینی چاہیے کہ ایک چیز دین ہے اور ایک شرع ومنہاج ہے۔ دین اصل ہے وہ خدا پرستی اور نیک عملی کا قانون ہے۔ شرع اور منہاج دستور العمل اور طور طریقہ ہے جو اصل کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے ٹھہرایا جاتا ہے۔ دین ایک ہی ہے اور تمام پیغمبروں نے اسی کی تعلیم دی، لیکن شرع ومنہاج میں اختلاف ہوا، کیونکہ ہر عہد اور ہر ملک کے احوال وظروف یکساں نہ تھے (ترجمان القرآن، جلد اول۔ صفحہ ۴۲۱)۔ خدا نے ہر امت کا آئین اور طریق کار اس کے احوال واستعداد کے مناسب جداگانہ رکھا ہے اور باوجودیکہ تمام انبیاء اور ملل سماویہ اصول دین اور مقاصد کلیہ میں، جن پر نجات ابدی کا مدار ہے، باہم متحد اور ایک دوسرے کے مصدق رہے ہیں، پھر بھی جزئیات وفروع کے لحاظ سے ہر امت کو ان کے ماحول اور مخصوص استعداد کے موافق خاص خاص احکام وہدایات دی گئیں۔ اس آیت میں اسی فرعی اختلاف کی طرف اشارہ ہے (حواشی قرآن از شیخ الہند، صفحہ ۱۵۰)۔ مطلب یہ کہ مستند علماء کے نزدیک یہاں تقسیم شریعت اور منہاج کی نہیں، بلکہ دین اور شرع ومنہاج کی ہے۔ دین سب کا ایک ہے، شرع ومنہاج کا اختلاف وقتی حالات کی بنا پر ہوا، پھر آخر میں اسلام نے شرع ومنہاج کا معاملہ بھی ہمیشہ کے لیے طے کر دیا۔ قرآن مجید کی اس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ جو قومیں کسی الہامی کتاب کو مانتی ہیں، ان کے شرائع میں جزوی اختلاف اصل دین پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ سورۂ مائدہ کے جس مقام پر یہ ٹکڑا آیا ہے، اس کا سیاق اسی مفہوم کا مؤید ہے۔ مفسرین سے شرع اور منہاج کے مفہوم کے متعلق مختلف قول منقول ہیں۔ میں نے تفصیل ضروری نہیں سمجھی (مترجم)۔

۶۔ سورۂ آل عمران، آیت نمبر ۱۱۰۔

Marfat.com

پروفیسر گرونے باؤم

مملکت وحکومت کے بنیادی اصول

تاریخ یا اجتماعی علوم کے دائرے میں بالعموم کوئی بیان یک گونہ ابہام سے محفوظ نہیں رہ سکتا' جو تاریخی ادراک میں مضمر ہے' اگر چہ وہ بیان مفہوم کے اعتبار سے کتنا ہی تحلیلی ہو اور اس کے لئے اسناد کی فراہمی میں کتنی ہی احتیاط ملحوظ رکھی جائے۔ ایسے بیانات میں حقائق اور لائحہ ہائے عمل بھی پیش کیے جاتے ہیں اور اس وجہ سے وہ اس ذہنی تاریخ کا سرچشمہ بن جاتے ہیں جو ابھی لکھی نہیں گئی۔ عموماً بے تکلفی سے الزام عائد کر دیا جاتا ہے کہ کوئی مورخ اپنے آپ کو تعصب سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ الزام بالعموم اس لئے لگایا جاتا ہے کہ اضطراب افزا بصیرت کی قدر و قیمت زائل کی جائے۔ اس الزام کے بجائے یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ ہر مصنف کی انتہائی آرزو کا اندازہ متعلقہ حقائق کی فراہمی اور ان سے کام لینے کی صلاحیت پر موقوف ہے۔

ممکن ہے انتہائی آرزو مخفی یا مضمر رہے۔ الماوردی (وفات ۱۰۵۸ھ) نے اسلامی مملکت کے نظام کے متعلق جو جامع بیان مدون کیا تھا' وہ مصنف کی وفات سے کچھ کم نو سو سال بعد روشنی میں آیا' اگر چہ اس کے معاصروں کو وقتی حالات سے الماوردی کے نظریات کی مطابقت ہی نہیں' بلکہ خلافت کے سلسلے میں عملی پروگرام کی اہمیت سے بھی آگاہی تھی۔ تاریخ یا سیاسی علم کے متعلق کسی کتاب کا وظیفہ مختلف وقت، ماحول اور تہذیب کے سلسلے میں مختلف ہو سکتا ہے۔ مغربی قارئین کے نزدیک الماوردی کے نظریات کاروبار مملکت کے سلسلے میں اصلاً اسلامی افکار کی ایک دستاویز ہیں۔ اس اعتبار سے اسے اجتماعی تنظیم کے مسئلے تک قطعی رسائی کے مطالعے کے لئے ایک معروضی اور خارجی ماخذ سمجھنا چاہیے۔ ممکن ہے اسے اس رسائی کی ترتیب یا ترمیم کے سلسلے میں ایک منشور سمجھا گیا ہو۔

اسی طرح مسٹر اسد نے ''اسلامی حکومت اور مملکت کے اصول'' کے متعلق جو کچھ لکھا ہے' اس کی اہمیت بھی دوگونہ ہے۔ الماوردی کی ''الاحکام السلطانیہ'' کے برعکس اس کتاب کو واضح طور پر ایک پروگرام کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ مسٹر اسد فرماتے ہیں کہ یہ مرحلہ ایسا ہے جس میں ملل اسلامیہ کو اپنی تقدیر کے آزادانہ انتخاب کی رخصت دے دی گئی ہے۔ وہ آج حقیقی معنی میں اسلامی نظام سیاسیات پر قائم ہو سکتی ہیں۔ شاید یہ موقع دوبارہ نہ آئے۔ اس یگانہ فرصت کی تیز روی کے احساس سے متاثر ہو کر مسٹر اسد نے اسلامی مملکت کے متعلق اپنے تصورات پیش کر دیئے ہیں اور کوشش کی

Marfat.com

ہے کہ ان کی بنا پر ایک قابل عمل اصول نامہ خاصی تفصیل سے مرتب کر دیں۔ ان کے آراء اسلامی استدلال کے مسلمہ مآخذ یعنی قرآنی الہام اور سنت (یعنی رسول اللہ صلعم کے ارشادات) پر مبنی ہیں' تاہم اسلامی مملکت کا یہی تصور نہیں جو پیش نظر ہے' لہٰذا اس نقطۂ نگاہ سے مسٹر اسد کے پروگرام کی مطلقیت اور ذہنی خود اختیاری ختم ہو جاتی ہے اور وہ ان متصادم نظریاتی تموجات کی متعدد شہادتوں میں سے ایک شہادت رہ جاتا ہے جن کا ظہور اسلامی دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔ اس کتاب کی دو گونہ اہمیت ہمارے لئے اس وجہ سے بہ طور خاص بڑھ جاتی ہے کہ مسٹر اسد نے جو نظریات پیش کیے' وہ مسلمانوں کے ایک بڑے اور ذی اثر طبقے کے نظریات ہیں۔

مسٹر اسد کے افکار پیغام اسلام کی معروضی اور عالمگیر طور پر مسلمہ تعبیر کے مطابق ہیں لیکن موصوف جن عوام کو متاثر کرنا چاہتے ہیں' وہ مسلمان ہیں' خصوصاً پاکستان کے وہ اسلامی حلقے جو سیاسی اعتبار سے خود آگاہ ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر مسٹر اسد نے ایک خاص طریق عمل اور ایک خاص اسلوب اظہار اختیار کیا۔ یہ ایسے ماحول میں بروئے کار آیا جسے ایک مغربی خوانندۂ کتاب کسی حد تک غیر معمولی سمجھ سکتا ہے۔ ڈیڑھ سو سال کے تاریخی ادراک کے بعد مسٹر اسد کے عوام کو غالباً ہمارے مقابلے میں سہو زمانی کا کم احساس ہو۔ کسی دلیل کے دل نشیں اثبات کے لئے الہامی متن پر انحصار انتخاب و تعبیر کی ایسی تحریک کا موجب بنتا ہے' جس سے مغرب میں سائنس اور مذہب کے باشیین ایک دو صدی پیشتر تو متعارف تھے لیکن آج کل بعض اوقات یہ تکنیک من مانی اور غیر مستند معلوم ہوتی ہے۔ مغربی قارئین کو یاد رکھنا چاہیے کہ جدید رجحانات اور جدید افکار کی توثیق کے لئے صحائف سماوی اور متعلقہ معلومات کی تعبیر نو معاشرے کے ذہنی ڈھانچے میں سند اور آزادی کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ یوں یہ کتاب بہ یک وقت تین سطحوں پر پڑھی جانی چاہیے۔ اولاً یہ ایک توضیحی دستاویز ہے اور اس میں مملکت کا وہ نظریہ پیش کیا گیا ہے جسے مصنف لازم قرار دیتا ہے۔ گویا یہ فرد اور معاشرے کے فرائض کی تکمیل کا واحد ذریعہ ہے جو قرآن و حدیث کے رو سے غیر متبدل ہیں۔ مغربی قارئین کے نزدیک اس کتاب میں دور حاضر کے مغرب کے سیاسی افکار اور اسلامی روایات کی میراث کے درمیان موافقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ محض توضیحی نہیں بلکہ اعتقادی دستاویز بھی ہے۔ اسے کیلون کے ضوابط یا کمیونسٹوں کے منشور کی صف میں رکھنا چاہیے۔

لیکن یہ موجودہ اسلامی یا زیادہ تعین سے کہنا چاہیے' پاکستانی فکر و نظر کی ایک اہم دستاویز ہے' جس کا تعلق ایک فوری اور عملی ضرورت سے ہے۔ درحقیقت اسے ایک غیر معمولی طور پر خوش ترتیب اور خوش اسلوب بیان اس نقطۂ نگاہ کے متعلق سمجھنا چاہیے جو ماضی قریب تک عربی بولنے والے ملکوں، نیز پاکستان کے تعلیم یافتہ اور اسلام کے بہی خواہ علماء میں رائج رہا۔

سب سے آخر میں یہ کہ اس دستاویز میں مغربیت کا ایک پہلو منعکس ہے یعنی دو روایتوں کے درمیان کم و بیش عمداً تطابق پیدا کرنا۔ یہ تطابق صرف سیاسی تمنا ہی تک محدود نہیں بلکہ خوانندہ کے سامنے پیش کرنے کے طریقے میں بھی نمایاں ہے' جسے یہ یقین دلانا منظور ہے کہ روایتی مفروضات طبعاً دور حاضر کے نتائج پر پہنچاتے ہیں اور یہ نتائج اس

Marfat.com

مذہبی پیغام کے حقیقی مفاد کی انتہا ہیں، جس سے اسلامی میراث نے نشو وارتقاء پایا۔ اسلوب بیان ایسا رکھا گیا ہے جو قدامت پسند مومن کے نزدیک زیادہ قابل قبول ہے۔ ساتھ ہی اسلامی الہام کی لامتناہی ثروت بےنقاب کی گئی ہے اور مغربی میراث کے بہترین عناصر کے مبادی بھی اس میں شامل قرار دیئے گئے ہیں۔

یہ کتاب حاجی انیس الرحمٰن میموریل سوسائٹی، کراچی (پاکستان) کی سرپرستی میں مرتب ہوئی اور سوسائٹی ہی کے ایماء سے کیلیفورنیا یونیورسٹی، لاس اینجلس کے مرکز مشرق قریب نے اس کی اشاعت کا انتظام کیا۔ سوسائٹی کی یہ خواہش ہے کہ اسے مغرب میں شائع کیا جائے۔ اس کتاب اور متعلقہ مسائل کی ماورائے ثقافت اہمیت کا ثبوت ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کرنے کے سلسلے میں مرکز مشرق قریب کی ادارتی پالیسی کے متعلق اگر کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے تو یہ ہے کہ سائنٹفک فکر مختلف صورتوں میں جو متعدد وظائف وعوامل اختیار کر سکتا ہے، ہمیں اس کا پورا احساس ہے۔ ہم آئندہ بھی ایسی کتابیں شائع کرتے رہیں گے تاکہ تحقیق وتجسس اور دستاویزوں کے پیش کرنے کے عالمی سلسلے کو تقویت پہنچے۔ ساتھ ہی ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ کسی خاص کتاب کی حیثیت زیادہ تر اس کے ثقافتی ماحول پر منحصر رہے گی، جس سے اس کا تعلق ہے۔

(در: اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول، متذکرہ صدر، پیش لفظ)

Marfat.com

محمد اسد

شہری اور حکومت

جب امیر باقاعدہ منتخب کرلیا جاتا ہے تو گویا یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے پوری قوم کی وفاداری (بیعت) حاصل کر لی ہے یعنی یہ کہ اکثریتی ووٹ سے بلکہ اقلیت کے ان ووٹوں سے بھی جو اس کے خلاف ڈالے گئے ہیں' کیونکہ تمام فرقہ وارانہ فیصلوں میں جس میں شرعی رہنمائی شامل ہو' اکثریت کی رائے کمیونٹی کے ہر رکن پر مقدم ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:[1]

''اللہ کا ہاتھ کمیونٹی (جماعت) پر ہوتا ہے اور وہ جو اپنے آپ کو اس سے علیحدہ رکھتا ہے' جہنم میں علیحدہ رکھا جائے گا۔''

''وہ جو کمیونٹی (جماعت) سے ایک ہاتھ کے فاصلے کے برابر بھی علیحدہ رہتا ہے' اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ لغوی طور پر اپنے کندھے سے اسلام کو جھٹک دیتا ہے۔''[2]

''تاآں کار اگر حکومت ضرورت پوری کرتی ہے جو شرع نے نافذ کیے ہیں تو شہریوں سے وفاداری کا دعویٰ مطلق ہے۔ شہری پابند ہیں۔''[3]

سننا اور اطاعت کرنا عسرت میں' راحت میں' خوشگوار حالات میں مختصر یہ کہ انہیں حکومت کی پشت پر متحد رہنا چاہیے اور اس اتحاد کے لئے اپنے ذاتی آرام، مفادات، ملکیت اور حتیٰ کہ اپنی جانیں قربان کرنی چاہئیں کیونکہ: ''سن لو! اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانیں اور املاک جنت کے عوض خرید لی ہے۔''[4] اس لئے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک حکومت جو اللہ اور اس کے پیغمبر کے نام اور قانون اسلام کے مطابق حکمرانی کرتی ہے' شہریوں کے تمام وسائل طلب کرنے کا حق رکھتی ہے۔ بشمول جان و املاک۔ جب بھی قوم کے مفادات اور ریاست کا تحفظ ایسا تقاضہ کریں۔ دوسرے الفاظ میں حکومت حق بجانب ہوگی۔ (الف) زکوٰۃ جس کا غیر متبدل طریقہ قرآن وسنت میں مذکور ہے کہ دوسرے اضافی ٹیکس اور جبری عائد کردہ ٹیکس جو قوم کی بہبود کے لئے ضروری متصور ہو۔ (ب) جب بھی ضروری ہو چند نوع کی ذاتی ملکیت، ذرائع پیداوار اور قدرتی وسائل پر پابندی لگا سکتی ہے۔ اس نیت کے ساتھ کہ ان کا انتظام حکومت پبلک افادیات کے نظریہ سے کرے گی۔ (ج) تمام صحت مند شہریوں کو ملک کی حفاظت کے لئے فوجی خدمت (جبری

Marfat.com

بھرتی) کا حق۔

جہاد کا مسئلہ

چونکہ یہ کتاب آئینی اصولوں پر غور وخوص تک محدود ہے جو اسلامی ریاست کے نظریہ کی عمیق ہے۔ ہمیں یہاں قانونی تفصیلات کے متعلق فکرمند نہیں ہونا چاہیے جو ریاست کو اپنے شہریوں پر محصولات اور دیگر معاشی فرائض انتظامی ضروریات کے مطابق حکومت کو عائد کرنے کے قابل بنا دے گی۔ تاہم شہریوں کی فوجی خدمت کے متعلق چند الفاظ کہنے ضروری ہیں۔ ایک فرض جو بظاہر تصور جہاد سے متعلق ہے جیسا کہ ہم جانتے ہیں جس کی تقریباً تمام غیر مسلم نکتہ چینوں اور خود مسلمانوں کے چند فقہاء نے بھی بیرحمانہ طور پر توجیہہ کی ہے۔

لفظ جہاد مشتق ہے جہد سے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے سعی کی یعنی کسی ایسی شے کے خلاف جو بدی کی طرف اشارہ کرتی ہے یا دلالت کرتی ہے۔ مثلاً یہ نظیر کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کی اپنی خواہشات اور کمزوریوں کے خلاف کشمکش (جہاد بالنفس) کو جہاد عظیم فرمایا ہے۔[5] اس اصطلاح جہاد کا مطلب قرآن شریف میں بطور خاص جنگ مدافعت بیان کیا گیا ہے۔ انسان کی مذہبی مدافعت' اس کے اپنے وطن کی مدافعت اور اس کی اپنی قوم کی آزادی کی مدافعت۔

جنگ کرنے کی اجازت انہیں دی گئی ہے جن کے خلاف ظلم و جور سے جنگ تھوپی گئی ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ وہ ظلم و جور سے اپنے گھروں سے محض اس وجہ سے بے گھر کر دیئے گئے ہیں کہ انہوں نے کہا تھا کہ "ہمارا مولا خدا ہے" اور اگر اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو دیکھنے کی طاقت نہ عطا فرماتے تو یقین ہے کہ صومعات، کلیسے، مساجد و مدارس جہاں اکثر اللہ کی بڑائی بیان کی جاتی ہے' ویران کر دیئے جاتے۔[6]

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مسئلہ جہاد پر یہ اولین حوالہ ہے۔ اس نکتہ پر تمام احادیث کی روشنی میں مکمل اتفاق ہے۔[7] ان دونوں آیتوں میں قرآن شریف صرف جارحیت کے خلاف مدافعتی جنگ کے اخلاقی بنیادی جواز مہیا کرتا ہے اور "صومعات"، کلیسے، مساجد و مدارس کی طرف حوالہ واضح کر دیتا ہے کہ سیاسی و روحانی آزادی کی مدافعت مسلمانوں کی طرف سے نہ صرف مسلمانوں کو دی جانی چاہیے بلکہ غیر مسلموں کو بھی' جو ان کے ساتھ رہتے ہیں۔

اسلام کسی صورت میں بھی جارحانہ جنگ کی اجازت نہیں مرحمت کرتا ہے۔

اللہ کی راہ میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں مگر تم خود جارحیت کا ارتکاب نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔[8] اور ان کے خلاف اس وقت تک لڑتے رہو جب ان کی ایذا رسانی ختم نہیں ہو جاتی اور لوگ اللہ کی بندگی کرنے کے لئے آزاد نہیں ہو جاتے ہیں (لغوی مطلب یہ ہے کہ تمام مذاہب اللہ کے ہیں) لیکن اگر وہ ایذا رسانی سے باز آ جاتے ہیں تو دشمنی ختم ہو جانی چاہیے' سوائے ظالموں کے ساتھ۔[9] ان لوگوں کے متعلق (کافروں) جنہوں نے مذہب کی بنیاد پر تمہارے خلاف جنگ نہیں چھیڑی ہے اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے۔ اللہ تمہیں منع نہیں کرتا ہے کہ تم ان سے مہربانی اور انصاف کا سلوک نہ کرو۔ سنو اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔[10]

Marfat.com

ان فیصلہ کن اور بدیہی احکامات قرآن کی روشنی میں جہاد کے متعلق احادیث کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ جب بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی خوبیوں وفوائد کی تعریف بیان فرمائی' انہوں نے جاری جنگوں کا حوالہ دیا۔ پھر مستقبل کی جنگوں کا جو لازماً قرآنی احکامات کے تقاضے پوری کرتی ہو۔ صرف ایسی ہی جنگیں "راہ مولا" کی جنگیں تصور کی جاسکیں گی۔ (اصطلاح جو تقریباً غیر متبدل طریقہ پر جہاد کے سلسلہ کی احادیث میں پایا جاتا ہے) اور اس لیے شرعی نکتہ نظر سے اسی قدر قابل قدر، قابل جواز اور سودمند ہے۔

اسلامی ریاست کا تصور جس کی بنیاد قرآنی تعلیمات اور سنت پر ہے' از خود حکومت کی ایسی ریاست کو جارحانہ جنگ کے متعلق سوچنے سے بھی باز رکھے گی۔ درحقیقت حکومت اپنے شہریوں سے ایسی مثالوں میں جائز طور پر اطاعت کی توقع نہیں کرسکتی ہے کیونکہ اس اصول پر عمل کہ "اگر کسی مسلمان کو ارتکاب گناہ کا حکم دیا جاتا ہے تو نہ اس کا سننا اور نہ اس پر اطاعت واجب ہے۔[11] شہری مکمل طور پر اس اصطلاح کی طرف رجوع کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ "بااصول اعتراض" یعنی کسی اخلاقی طور پر قابل ملامت مقصد کے لئے ہتھیار اٹھانے سے انکار۔ دوسری طرف کسی مسلمان کے لئے کبھی ایسا اعتراض جائز نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر اسے ملک پر حملہ یا بیرونی یا اندرونی بغاوت کے خلاف مدافعت کے لئے حکم دیا جاتا ہے کیونکہ یہ درحقیقت "اللہ کی راہ میں" جنگ ہے اور ایسی جنگ میں قتل ہونا اعلیٰ درجہ کی شہادت ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر صحت مند مسلمان جہاد میں ہتھیار اٹھانے کا پابند ہے۔ جب کبھی آزادی عقیدہ یا اس کی قوم کا سیاسی تحفظ خطرہ میں ہو وہ مسلمان جو جسمانی طور پر بطور فوجی خدمت کے لائق نہ ہوں' اپنی عملی مدنی سعی سے اپنا حصہ مالی مدد کے ذریعہ ادا کریں' جب تک وہ ایسی سعی کے قابل ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث شریف کے مطابق۔

"وہ جو راہ خدا میں کسی مجاہد کو اسلحہ سے لیس کرتا ہے حقیقتاً بہ نفس نفیس جنگ میں حصہ لیتا ہے اور وہ جو کسی مجاہد کے اہل وعیال کی اس کی غیر موجودگی میں حفاظت کرتا ہے' درحقیقت جنگ میں حصہ لیتا ہے۔"[12]

"وہ جو نہ تو خود لڑتا ہے اور نہ ہی کسی مجاہد کو اسلحہ سے لیس کرتا ہے اور نہ اس مجاہد کی جو اپنے اہل وعیال اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے' نگہداشت کرتا ہے۔ اللہ کے ہاتھوں روز قیامت سے پیشتر عذاب پائے گا (زندگی میں)۔"[13]

یوں تمام صحت مند افراد کو قوم کے دشمن کو بھگانے کی سعی میں حصہ لینا چاہیے اور ریاست کی تمام ایجنسیوں کو انفرادی سعی کی وقت کی مناسبت کے لحاظ سے عام نظام مدافعت مجتمع کرنے ہیں۔

لیکن غیر مسلموں کے متعلق کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے؟ کیونکہ بظاہر ہر قرآنی اصول کی روشنی میں:

"دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔"[14] اسلام کے دینی احکام غیر مسلموں پر لاگو نہیں ہیں۔

جواب عیاں ہے۔ اگر اسلامی ریاست کے احکام جہاد کے قرآنی تصور پر کاربند ہیں جو صرف جنگ مدافعت کی

Marfat.com

اجازت دیتا ہے۔ ریاست کی مدافعت کا فرض جو انہیں تحفظ فراہم کرتی ہے' بظاہر غیر مسلموں پر بھی فرض ہے اور یہ فرض اسی قدر زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کے زاویہ نگاہ سے کہ اسلام نہ صرف ان کی مادی معاملات کی حفاظت کرتا ہے بلکہ انہیں مذہبی آزادی بھی عطا کرتا ہے۔[15] یہ درست ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس بات پر اصرار نہیں کیا کہ مسلمانوں کی حفاظت میں رہتے والے غیر مسلم (ذمی) عملی طور پر جنگ میں حصہ لیں گے جو انہوں نے اسلام کی مدافعت میں لڑی تھی مگر انہوں نے ممانعت بھی نہ فرمائی تھی کہ غیر مسلم اگر ان کی خواہش ہو تو مسلمانوں کے شانہ بشانہ لڑیں۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کا فرق اس لحاظ سے کہ اول الذکر اپنے مذہبی احکامات کی رو سے اگر ضرورت ہوئی تو ایک صحیح جنگ میں اپنی جان کی قربانی پیش کرنے کا پابند ہے۔ صرف صحیح جنگ ہی جہاد کہلا سکتا ہے جبکہ تمام حالات میں غیر مسلموں کو جنگ میں ایسا کرنے کے لئے نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اگر چہ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ غیر مسلم شہریوں کی اکثریت راضی بلکہ شائق ہو سکتی ہے۔ اس ریاست میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے جو انہیں ہر طرح کی حفاظت فراہم کرتی ہے اور انہیں ہر مدنی حق کی ضمانت دیتی ہے۔ پھر بھی یہ قابل فہم ہے کہ ان غیر مسلموں میں کچھ- خاص طور سے عیسائی -ہتھیار اٹھانے کو اپنے مذہب کے برعکس سمجھیں اور نتیجے کے طور پر جنگی خدمت میں گھسیٹے جانے پر اعتراض کریں تو ایسے اصول پر معترضین پر فطری طور پر حکم لاگو ہوگا کہ ''دین میں کوئی چیز نہیں ہے''۔ خاص ٹیکس جسے جزیہ کہا جاتا ہے' اسے ادا کرنے پر انہیں فوجی خدمت سے استثنا کا حق ملتا ہے' جو جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' فوجی خدمت کے عوض تلافی ٹیکس کہلاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کوئی شرح مقرر نہیں کی ہے لیکن تمام دستیاب احادیث سے ظاہر ہے کہ اس کی مقدار جو مسلمان ادا کرتے ہیں' اس سے کم ہے اور جو- چونکہ خاص اسلامی مذہبی فریضہ ہے- غیر مسلموں پر نافذ نہیں کیا جاتا ہے۔ صرف وہی غیر مسلم جو اگر مسلم ہوتے تو ان سے ریاست کی مسلح افواج کی خدمت کی توقع کی جاتی (اور ان میں سے جو مالی لحاظ سے اس قابل ہوئے) جزیہ ادا کرنے کے پابند ہیں۔

یوں مندرجہ افراد قانونی طور پر اس سے مستثنیٰ ہیں: (الف) خواتین۔ (ب) مرد جو بلوغت کو نہ پہنچے ہوں۔ (ج) معمر افراد۔ (د) بیمار معذور۔ (ھ) پادری و پروہت اور (و) وہ تمام افراد جو فوجی خدمت پیش کرنی پسند کرتے ہیں۔

حدود تابعداری

مسائل جہاد اور فوجی خدمت کے موضوع سے ہٹ جانے کے بعد ہم ان فرائض کی طرف غور و خوض کے لئے پلٹتے ہیں جو خاص طور پر مسئلہ وفاداری پر اسلامی ریاست کے شہریوں کے لئے لازمی ہے۔

جب تک ریاست مطالبات شرع کے اصول و طریقوں کے مطابق ہے۔ ایک مسلمان شہری کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے الفاظ میں حکومت سے وفاداری مذہبی فریضہ ہے۔

وہ جو (امیر) کی وفاداری سے اپنے ہاتھ کھینچ لیتا ہے' اسے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی عنایت نصیب نہیں ہوگی اور جو اپنے آپ کو وفاداری کا پابند سمجھ کر نہ مرتا ہے (لغوی طور پر جبکہ اس کے کاندھے پر وفاداری کا

Marfat.com

بظاہر جو نہیں ہے) اسے ایام جاہلیہ کی موت نصیب ہوتی ہے (یعنی کافر)۔

قرآن وسنت کے اس قدر زبردست اصول مسلم اتحاد کی تاکید کے مطابق اس اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی سعی لازما ایک اعلیٰ درجہ کا جرم متصور ہوگا - درحقیقت - اعلیٰ درجہ کی غداری - اور جس کی سخت سزا ہونی چاہیے۔ نتیجے کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:[16]

''خواہ وہ کوئی کیوں نہ ہوں۔ اگر میری امت کے اتحاد کو توڑتا ہے قابل گردن زنی ہے۔''[17] اگر تم ایک شخص کی امارت پر متحد ہو جاؤ اور پھر جو تمہاری قوت منتشر کرے یا تمہارے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کرے اسے قتل کر دو۔''[18]

تاہم ایک مسلمان کی حکومت سے وفاداری جس کی نمائندگی بشکل امیر ہوتی ہے غیر مشروط نہیں ہے۔ جیسا کہ بلند ترین شخصیت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے۔ انسان کی وفاداری کی پہلی شرط جو اس وفاداری سے نمو پاتی ہے اس کی اپنی انفرادی استطاعت پر ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں:

جب کبھی ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سننے اور اطاعت کرنے کا عہد کیا تو وہ فرماتے تھے۔ ''جہاں تک تم میں اس کی تعمیل کی استطاعت ہے۔''[19] ہم نہایت سلامتی سے فرض کر سکتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امتوں پر ایسا کوئی فرض عائد نہیں کیا ہے جو اس کی استطاعت سے ورے ہے لیکن اپنی امت کو قانون فراہم کرنے والے کی حیثیت سے بلاشبہ ان پر یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ کسی ارضی صاحب اقتدار کی ''سننے اور اطاعت کرنے'' کا فرض چند تحدیدات کا پابند ہے۔ کسی شہری کے قبضہ قدرت سے ورے جسمانی معذوری ان میں سے ایک حد ہو سکتی ہے۔ اخلاقی معذوری۔ دوسری یہ کہ موخر الذکر کے متعلق ہے جب انہوں نے حوالہ کر دیا۔

''اطاعت معصیت کے حکم میں واجب نہیں۔'' اطاعت صرف حق پر موقوف ہے۔ (فی المعروف)[20] اس حدیث کے دوسرے بیانوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اظہار کی اطلاع ملی ہے۔[21] اس کی اطاعت واجب نہیں ہے جو خود اللہ کی اطاعت نہیں کرتا۔ اور اس کی اطاعت واجب نہیں ہے جو اللہ کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔[22]

یہ تمام باتیں شہری کے حق اور فرض پہلے ہی سے متعین کرتے ہیں کہ حکومت کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھی جائے اور اس کی انتظامی اور قانونی حکمت عملی پر نکتہ چینی کی جائے۔ جب فرض کرنے کی ایسی کوئی وجہ نظر آئے کہ معاملات حکومت غلط طور پر نمٹائے جا رہے ہیں۔ قرآن شریف میں بہت سی آیتیں ہیں اور اس نتیجہ پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی احادیث ہیں کہ بین خطا پر کسی کی مخالفت میں آواز بلند کرنا ایک مسلمان کا اولین فریضہ ہے اور بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ خطا کا مرتکب مسلمہ مقتدر ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''افضل ترین جہاد حاکم وقت کے سامنے جو راہ مستقیم سے ہٹ گیا ہو کلمہ حق کہنا ہے۔''[23]

اگر تم میں سے کوئی برائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ (زور) درست کرنا چاہیے اور اگر وہ ایسا کرنے سے معذور ہے تو

Marfat.com

اپنی زبان سے روکنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اگر وہ اتنا بھی کرنے سے عاجز ہے تو اپنے دل میں اسے برا سمجھے لیکن یہ ایمان کا ادنیٰ درجہ ہے۔[24] دوسرے لفظوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدی کو عمل سے دور کرنا اعلیٰ درجہ کا ایمان قرار دیا ہے اور اسی اصول کا اطلاق نا انصاف حکومت کے لئے شہریوں کے رویے کا ہونا چاہیے۔

لیکن کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ حکومت کے خلاف شہریوں کے حق بغاوت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جب تک حکومت شرعی احکامات کی خلاف ورزی نہ کرتی ہے؟ بظاہر نہیں' کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ:

''جس نے نیک نیتی اور ہاتھوں کے بیعت سے کسی رہبر (امام) کی اطاعت کا عہد کیا' وہ اس کی اطاعت کرے گا۔ اگر (یا جب تک وہ اطاعت کر سکتا ہے)[25] یعنی جب تک امام اسلامی اقتدار پر عمومی طور پر قائم ہے اور قصداً اس کے مقاصد کو نہیں بھلاتا ہے۔ وقتی چُوک اس کی طرف سے شہریوں کو حق نہیں بخشتی۔ کم از کم اس وقت تک جب تک قوم کی اکثریت نے اس کے خلاف اعلان نہ کر دیا ہو۔ یعنی حکومت کے خلاف بغاوت کا اعلان نہ کر دیا ہو۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اگر کوئی شخص اپنے امیر کا کوئی ایسا ناپسندیدہ عمل دیکھتا ہے' تس پر بھی اسے صبر کرنا چاہیے کیونکہ آگاہ ہو جاؤ جو کوئی بھی ایک ہاتھ کے فاصلہ کے برابر متحدہ قوم سے علیحدہ ہوتا ہے اور ایسی حالت میں مرتا ہے تو اسے ایام جاہلیہ کی موت آئی۔[26]

پھر ایک غیر منصف حکومت کو شہری کس وقت اور کس حد تک برداشت کریں گے؟ اس سوال کا جواب متعدد احادیث اور خاص طور سے ان حدیثوں سے ملتا ہے جنہیں اکٹھا پڑھا جانا چاہیے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''تمہارے اماموں میں سے بہترین وہ ہیں جن سے تم محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت کرتے ہیں۔ جن پر تم اللہ کی رحمتیں بھیجتے ہو اور جو تم پر اللہ کی رحمتیں بھیجتے ہیں۔ تم میں سے سب سے برا امام وہ ہے جس سے تم نفرت کرتے ہو اور وہ تم سے نفرت کرتا ہے۔'' (حاضر صحابیوں نے) دریافت کیا۔ ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا اگر ایسی صورت ہو تو ہم اسے امامت سے خارج نہیں کر سکتے؟'' انہوںؐ نے فرمایا۔ ''نہیں جب تک وہ تمہارے درمیان نمازیں قائم رکھتا ہے۔''[27]

اس سیاق و سباق سے یہ ظاہر ہے کہ ''نمازوں کا قائم رکھنا'' محض جماعت سے نماز پڑھنے کی نسبت وسیع معنی رکھتا ہے' یہ ظاہر کرتا ہے جیسا کہ قرآن شریف کے دوسرے پارہ کی ابتدا میں ہے۔ ایمان کا مثبت قیام عبادہ ابن الصامث سے منقول دوسری حدیث یوں ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بلایا اور ہم لوگوں نے ان سے وفاداری کا عہد کیا۔ انہوں نے پسندیدہ و ناپسندیدہ امر میں' ابتلا و آزمائش آرام میں خواہ ہماری ترجیحات کیسی ہی کیوں نہ ہوں' ہم پر سننے اور اطاعت کرنے کا فرض عائد کیا اور (ہم لوگوں سے) اصرار کیا کہ ہم ان کا اقتدار ختم کریں جنہیں اقتدار سونپا گیا ہے؟ جب تک انہیں کھلم

Marfat.com

کھلا ارتکاب کفر کرتا نہ دیکھیں جو (کتاب الٰہی سے) واضح ہے۔"[۲۸]

اس نکتہ سے متعلق تمام احادیث کے سیاق وسباق میں چار اصول واضح ہو جاتے ہیں۔[۲۹] جب تک امیر قانونی طور پر قائم شدہ حکومت کی نمائندگی کرتا ہے، تمام شہری اس کی اطاعت کے پابند ہیں، خواہ وہ کتنا ہی اس کی شخصیت یا کسی موقع پر اس کی انتظامی عمل کو ناپسند کرتے ہوں۔ (۲) اگر حکومت ایسا قاعدہ یا قانون نافذ کرتی ہے جو شرعی نکتہ نظر سے ارتکاب گناہ پر دال ہے تو ایسے قاعدہ وقانون کی مطابقت میں امیر کی اطاعت موقوف ہو جاتی ہے۔ (۳) اگر حکومت بالقصد کھلم کھلا قرآن کے نص کے خلاف عمل کرتی ہے تو حکومت کے جرم کفر کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں امیر سے اقتدار واپس لیا جانا چاہیے اور (۴) اقتدار کے واپس لینے کا یہ عمل کمیونٹی کی اقلیت کی طرف کبھی مسلح بغاوت کے ذریعے نہیں کیا جانا چاہیے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے:

وہ جو ہمارے خلاف اسلحہ اٹھاتا ہے ہم میں سے نہیں رہتا ہے (یعنی امت مسلمہ سے خارج ہو جاتا ہے)۔[۳۰]

جو ہمارے خلاف میان سے تلوار نکالتا ہے اس کا ہم میں سے ہونا موقوف ہو جاتا ہے۔[۳۱]

اس لئے یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو حکومت کے شرعی احکامات کے نہ ماننے کا اختیار دیا گیا ہے اور اگر حکومت کھلم کھلا کفر کرتی ہے تو اس کو اقتدار سے محروم کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ تاہم فرقہ وارانہ اتحاد کے اصول کے متعلق جس پر قرآن وسنت نے اس قدر زور دیا ہے، امکانی طور پر انفرادی شہری پر فیصلہ کا یہ اختیار نہ چھوڑا جانا چاہیے کہ کس نکتہ پر امیر کی اطاعت موقوف ہو جاتی ہے۔ اس قسم کا فیصلہ مجموعی طور پر یا اس کے مقرر کردہ نمائندوں کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے۔ کوئی لازماً یہ تصور کر سکتا ہے کہ ایسے سانحہ کی صورت میں مجلس شوریٰ ہی مقتدرہ تصور کی جا سکتی ہے لیکن اس وضع کے خلاف ہماری دریافت کہ مجلس شوریٰ اور امیر کے درمیان اختلاف رائے ناقابل حل تعطل کی طرف رہنمائی کر سکتی ہے جب تک کسی غیر جانبدار ثالث کی طرف رجوع نہ کیا جائے یعنی یہ کہ اعلیٰ ثالث کا قیام۔ پچھلے باب میں میں ذکر کر چکا ہوں کہ ثالث کا یہ فرض ہوگا کہ کسی قانون یا انتظامی قاعدہ کو جو شرع کے خلاف ہو، کالعدم قرار دے۔ اس طرح ٹربیونل ثالث کے دائرہ کار میں ہوگا کہ امیر کی معزولی کے سوال پر عام استصواب کرائے۔ اگر کسی ایسے مقدمہ کو ترجیح دی جاتی ہے کہ امیر قصداً اسلامی قانون کے خلاف حکمرانی کرتا ہے۔ اگر ایسے استصواب رائے کے ذریعہ قوم کی اکثریت امیر کے خلاف رائے دیتی ہے تو امیر کو قانونی طور پر معزول شدہ تصور کرنا چاہیے۔ اس وقت لوگوں پر امیر کی اطاعت ختم ہو جاتی ہے۔

اس طرح شہریوں کا سرکاری سرگرمیوں پر نگاہ رکھنا اوران پر نکتہ چینی کا حق اور بدرجہ مجبوری امیر کو معزول کرنے کے حق کو کسی طور پر انفرادی یا گروہی بغاوت (جس کا وجود نہیں ہے) سے گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔ کسی مسلم حکومت کو اقتدار سے محروم کرنا صرف قوم کی طرف سے کھلم کھلا فیصلہ کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اگر ممکن ہو تو پرامن طور پر اور ضروری ہو تو بزور بازو۔

Marfat.com

آزادیٔ رائے

تاہم مسئلہ صرف اسی کا نہیں ہے کہ آیا کسی حکومت کو معزول کرتا ہے۔ایک مسئلہ جو غالباً شاذ ہی کھڑا ہو سکتا ہے کہ ایک مسلمان شہری اپنی نکتہ چینی کی صلاحیت کو بروئے کار لانے اور اپنی اخلاقی ہمت کو حق وانصاف کے لئے بلند کرنے کا پابند ہے کیونکہ قرآن کے مطابق اس پر برائی کے خلاف لڑنا فرض ہے اور جب انصاف کا خون ہوتا دیکھے تو اس کی استواری کے لئے جدوجہد کرے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم نیکی کا حکم کرو اور برائی سے بچنے کی ممانعت کرو ورنہ اللہ تم پر عذاب نازل کرے گا۔اس وقت تم اسے پکارو گے لیکن وہ تمہاری نہیں سنے گا۔''[۴۲]

اللہ کا عذاب ہمیشہ افراد تک ہی محدود نہیں رہ سکتا ہے جو نافرض شناس ہیں۔ بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پوری قوم کے مقدر کو متاثر کر سکتا ہے۔[۴۳]

''نہیں، خدا کی قسم! تمہیں لازماً بھلائی کا حکم دینا ہے اور برائی سے بچنے کا حکم دینا ہے اور تمہیں غلط کاروں کے ہاتھ تھامنے ہیں، اسے انصاف (الحق) کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کو ایک دوسرے کے خلاف کر دیں گے۔

اگر لوگ کسی غلط کار کو دیکھتے ہیں اور اس کے ہاتھ نہیں تھامتے تو گمان غالب ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں گھیر لے گا۔''[۴۴]

اسی روایت کے دوسرے بیان میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا گیا ہے:

''ایک قوم جس کے درمیان ارتکاب گناہ ہو رہا ہے اور جسے روکا جا سکتا تھا لیکن روکا نہیں جا رہا ہے، گمان غالب ہے کہ اللہ کا عذاب پوری قوم کو گھیر لے گا۔''[۴۵] اس طرح یہ پوری امت کے مفاد میں ہے کہ اس کا ہر فرد اخلاقی وعمرانی ترقی کے لئے جہاں اور جب بھی ممکن ہو سعی کرے کیونکہ:

''سنو! اللہ تعالیٰ نے اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلی ہے جب تک وہ خود اپنی حالت نہیں بدلتی۔'' یہ یاد رکھنا چاہیے کہ لوگوں کے ظاہری و باطنی اخلاق کے باہم دیگر قانون کا انحصار دو طرفہ عمل کرتا ہے۔قوم کے اخلاقی ڈھانچے کی بلندی مآل کار مادی وسیاسی فلاح کی طرف لے جا سکتی ہے جبکہ اخلاقی زوال ناگزیر طور پر معاشرتی، معاشی اور سیاسی زوال پر منتج ہو گی۔

کوئی مثبت تبدیلی-یعنی معاشرتی اور اخلاقی ترقی کی طرف تبدیلی-اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب قوم اس ترقی کی حاجت سے آگاہ ہو۔ نتیجہ کے طور پر یہ ہر فکر مند مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ماحول کو متجسس ونکتہ چیں نگاہ کا پابند بنائے اور مجموعی بھلائی کے لئے آواز بلند کرے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''صرف دو قسم کے آدمیوں پر بجا طور پر رشک کیا جا سکتا ہے۔ایک تو وہ جسے اللہ تعالیٰ نے دولت سے نوازا ہے اور پھر اسے راہ حق میں مال خرچ کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائی ہے۔اور دوسرا وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بصیرت عطا

Marfat.com

فرمائی ہے اور وہ اپنی بصیرت سے دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔''[۳۶]

اس طرح نکتہ چینی اور مشورہ حق - جو اسلامی فہم سے صحت مند مدنی شعور کے لئے اس قدر لازم ہے۔ اپنی قوم کے لئے - انفرادی شہری کی نظریاتی فرائض تک ختم نہیں ہو جاتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک صحیح اسلامی زندگی پہلے ہی فرض کر لیتی ہے اور ہم سے تمام معاملات میں جس قانون کا ذکر قرآن شریف اور سنت کے غیر متبدل اور بین نص احکامات میں نہیں ہے' اس کے لئے غیر مختتم اجتہاد کا مطالبہ کرتی ہے اور اجتہاد کی یہ آزادی جب فرقہ وارانہ معاملات زیر بحث آتے ہیں تو اخلاقی و معاشرتی فرض بن جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں قوم کے دانشمند رہنما اخلاقی طور پر فرقہ وارانہ ترقی کے لئے ایسے خیالات پبلک طور پر ظاہر کریں اور اس وجہ سے کسی کا اپنی رائے کا تحریری و تقریری حق اسلامی ریاست میں کسی شہری کا بنیادی حق ہے مگر یہ ضرور یاد رکھا جائے کہ رائے اور اس کے اظہار کی آزادی (جو لازماً پریس کی آزادی پر مشتمل ہے) قانون اسلام اور اخلاق عامہ کے خلاف بھی یا مسلمہ حکومت کے خلاف بغاوت کے لئے استعمال نہ کرنے دیا جائے۔

شہریوں کا تحفظ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسلمان نہ صرف قانونی بلکہ اخلاقی طور پر بھی اپنے ذاتی مفاد کو مجموعی طور پر اسلامی ریاست کے مفادات کے ہمیشہ پابند بنانے پر مجبور ہے اور محض اس اصول کے تحت کہ ایسی ریاست ''زمین پر اللہ کی نیابت ہے۔'' تاہم یہ ظاہر ہے کہ ریاست سے مذہبی وفاداری کا دعویٰ شہریوں پر یکطرفہ نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی شہری اور حکومت کے درمیان رشتہ شہری پر عائد کردہ فرائض تک محدود نہ رہنا چاہیے یا حتیٰ کہ اس آزادی کی حد تک جو ریاست نے کسی کو بخشی ہے۔ مثلاً آزادی رائے اور اس کے اظہار کے حق رائے دہی کے ذریعہ کسی حکومت کو برسر اقتدار لانے سے محروم کرنے کا حق۔ مگر یہ بھی کہ شہریوں کے لئے بعض سرکاری ذمہ داریوں کا واضح اور مثبت انعکاس ہونا چاہیے۔ ایک مسلمان شہری کے ہمزاد کا فوجی خدمت پیش کرنے کا فرض ریاست کی طرف سے انہیں اندرونی بیرونی دشمنوں کے خلاف تحفظ فراہم کرنے کا فرض عائد ہوتا ہے۔ اسی طرح قانونی طور پر مسلمہ حکومت کے احترام کی ذمہ داری ہر شہری کا فرض ہے اور جس کا اظہار سرکاری ڈیوٹی پر معمور ہمزاد شہری کی نجی زندگی کی حفاظت فراہم کرنے ہی سے ہوتا ہے۔

اسلام کے عام عقائد کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری حج کے موقعہ پر عرفات میں فرمایا تھا:

''آگاہ ہو جاؤ! تمہاری زندگیاں اور تمہاری املاک تمہارے مابین اسی طرح مقدس ہیں جس طرح یہ مقدس حج کا دن ہے۔''[۳۷] اور دوسرے موقعہ پر انہوں نے فرمایا:

کسی مسلمان کا دوسرے مسلمان کے لئے خون، جائیداد اور آبرو مقدس (حرام) ہے[۳۸] اور یہ قرآن و سنت کے دوسرے احکامات اسلامی ریاست کے آئین میں ایک شق کی شمولیت کا اس مقصد سے تقاضہ کرتے ہیں کہ شہریوں کی جانیں اور املاک مقدس ہیں اور یہ کہ کسی شخص کو اس کی زندگی، آزادی، جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا مگر یہ کہ قانونی عمل کا اطلاق اور بات ہے۔

Marfat.com

تحفظ جو ریاست اپنے شہریوں کو لازماً فراہم کرے گی' وہ شہریوں کی زندگی کے ظاہری عناصر تک ہی محدود نہیں رہے گا۔ مثلاً ان کی جانیں اور املاک بلکہ اس تحفظ کو ان کے وقار و عزت اور گھروں کی حرمت تک وسیع ہونا چاہیے۔ قرآن شریف میں مذکور ہے:

''برا ہو ہر بہتان باندھنے اور الزام تراشنے والے کا۔'' [۳۹۰] اے ایمان والو! بدگمانی سے جہاں تک ممکن ہو بچو کیونکہ آگاہ ہو جاؤ سوءِ ظن کبھی گناہ بھی ہوتا ہے اور ایک دوسرے کے عیب نہ تلاش کرو اور کسی کی پیٹھ پیچھے برائی نہ بیان کرو۔'' اسی کی روشنی میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے امتی کو نصیحت فرمائی ہے:

بدگمانی سے ہوشیار رہو کیونکہ بدگمان (کی بنیاد) کسی نہایت غلط اطلاع پر ہو سکتی ہے اور ایک دوسرے کے عیب نہ تلاش کرو اور نہ کسی کی مخفی کمزوری ظاہر کرنے کی کوشش کرو اور نہ کسی کو رسوا کرنے کی کوشش کرو کیونکہ خبردار ہو جاؤ اگر کوئی اپنے مسلمان بھائی کو رسوا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ خود اسے رسوا کر دیں گے۔

اور انجام کار

اگر امیر لوگوں پر شبہ کرنے میں گرفتار ہو جاتا ہے تو وہ انہیں بددیانت بنانے کا باعث ہوتا ہے۔

یہ تمام احادیث قرآنی حکم کے مطابق ہیں۔

اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوائے دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک اجازت حاصل نہ کر لو اور اہل خانہ کو سلام نہیں کر لو۔ یہ تمام باتیں آئینی قانون سازی کا تقاضہ کرتی ہیں جو کسی شہری کے گھر، نجی زندگی اور عزت و وقار کی تقدیس کی ضمانت مہیا کریں گی اور حکومت کو اس بنیادی ضمانت کے خلاف جوابی سرگرمی سے باز رکھیں گی۔ یوں شہریوں کو خفیہ پولیس کی نگرانی کے حوالہ کرنا سوائے اس کے جو پہلے سے سنگین جرم کے مجرم ہیں' ایک صحیح اسلامی ریاست کے یکسر دائرہ کار سے باہر ہوگا۔ محض شبہ کی بنیاد پر گرفتاری آئین کے خلاف ہوگی اور بغیر عدالتی کارروائی کے قید یا نظر بندی' مسلمہ عدالت کے حکم کے بغیر سزا دینا انسانی حرمت کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہوگی جس کی قرآن و سنت نے غیر مبہم الفاظ میں وضاحت کر دی ہے۔

مفت و لازمی تعلیم

حکومت کی کارروائیوں پر ایک شہری کا محتاط نگاہ رکھنے کے فرض کا منطقی نتیجہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے' آزادی رائے اور اس کے اظہار کی ضمانت ہے جو اسلام کمیونٹی کے ہر بالغ رکن کو بخشتا ہے لیکن کسی کا اپنی رائے کے آزادانہ حق کا اظہار بے معنی ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ معاشرہ کے بہترین مفاد کے خلاف مضرت رساں بھی۔ اگر وہ رائے ٹھوس خیال و فکر پر جو اپنے بارے میں گہرے علم کا حامل ہونے کا جس کا پہلے ہی تصور کر لیا جاتا ہے' مبنی نہ ہو۔ نتیجہ کے طور پر ہر شہری کا حق اور حکومت کا یہ فرض ہے کہ ایسا نظام تعلیم رائج کرے جس حد تک ریاست کے ہر بالغ مرد و زن کی بہ آسانی پہنچ ہو۔ مسئلہ تعلیم پر قرآن و سنت دونوں کے متعلق بہت سے احکامات ہیں۔ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شمار مواقع پر تعلیم کی اعلیٰ قدر و قیمت کے متعلق زور دیا ہے مثلاً:

Marfat.com

اگر کوئی شخص علم کی تلاش میں نکلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں پہنچنے کا راستہ آسان کر دیتے ہیں۔[۴۰]

''عابدِ محض پر عالم کی برتری ایسی ہے جیسے چاند جب ضوفشاں ہوتا ہے تو ستاروں کی ضوفشانی پر اسے برتری ہوتی ہے۔''[۴۱] بلکہ انہوں نے اس سے بھی آگاہ فرمایا ہے:

''عابدِ محض پر عالم کی برتری ایسی ہے جیسی باقی امتی پر مجھے برتری حاصل ہے''[۴۲] اور آخر میں:

''علم کی تلاش ہر بالغ مسلمان مرد وزن کا مقدس فریضہ ہے۔''[۴۳]

اس لئے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک ریاست جو اسلام کی رہین منت ہے اور جس کا مقصد ریاست میں اسلامی قانون کا قیام ہے' لازمانہ صرف یہ کہ حصول علم کو آسان بنائے بلکہ یہ کہ ہر مرد وزن کے لئے اسے لازمی قرار دے دے اور چونکہ اپنے غیر مسلم شہریوں کے۔ لئے بھی زندگی کی تمام سہولتیں فراہم کرنا ایسی ریاست کے بنیادی عقائد میں سے ایک بنیادی عقیدہ ہے' اس لئے بلالحاظ مذہب تمام شہریوں کے لئے مفت تعلیم عام ہونی چاہیے۔

معاشی تحفظ

آخر میں شہریوں پر اپنے دعویٔ وفاداری کی مکمل توجیہہ کے لئے ان کی مادی ترقی کی فعال ذمہ داری لازماً قبول کرنی چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں ریاست کی ایسی معاشی سہولتیں جو انسانی زندگی کی مسرت وعزت کے لئے لازمی ہے فراہم کرنے کی ذمہ داری کے زمرے میں آتی ہے۔ اس اصول کی بہترین تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ہوتی ہے:

> ''سنو! تم میں سے ہر ایک چرواہا ہے اور ہر چرواہا اپنے ریوڑ کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ اس طرح امام (حکومت) جو لوگوں پر قائم ہے' ایک چرواہا ہوا جو اپنے ریوڑ کی حفاظت کا ذمہ دار ہے اور ہر شخص اپنے خاندان کا چرواہا ہے اور بیوی اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد پر چرواہی ہے اور دونوں کی حفاظت کی ذمہ دار ہے اور خادم اپنے آقا کی املاک پر چرواہا ہے اور وہ اس کا ذمہ دار ہے۔ سنو! تم میں سے ہر شخص چرواہا ہے اور ہر شخص اپنے ریوڑ کا ذمہ دار ہے۔''[۴۴]

قاری سے یہ مشاہدہ کرنے میں چوک نہیں ہوگی کہ اس حدیث شریف میں شہریوں کے لئے حکومت کی ذمہ داری والدین کی بچوں کی ذمہ داری کے برابر بیان کی گئی ہے۔ ٹھیک جس طرح کوئی باپ اپنی اولاد کا چرواہا یعنی سرپرست ہوتا ہے جو خاندان کی خورش و پوشش اور بہبود کا اخلاقی طور پر پابند ہے۔ حکومت بھی قانونی اور اخلاقی طور پر اپنے شہریوں کو معاشی بہبود فراہم کرنے کی ذمہ دار ہے اور یہ بھی کہ کسی شخص کا معیار زندگی مساویانہ سطح سے نیچے نہ گرے کیونکہ اگرچہ اسلام نے یہ واضح کر دیا ہے کہ انسانی زندگی کی تعریف تنہا مادی وجود پر نہیں کی جاسکتی ہے۔ زندگی کا مآل کار اقدار روحانیت میں ہے۔ مسلمان روحانی سچائیوں اور قدروں کو انسانی وجود کے عناصر سے کوئی مختلف شے دیکھنے کے حقدار نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ اسلام ایک ایسے معاشرے کا مطالبہ کرتا ہے جو نہ یہ ظاہری طور پر درست بلکہ عملی طور پر بھی

Marfat.com

درست ہو۔ جو اپنے اراکین کی جسمانی اور روحانی دونوں ضرورتیں پوری کرتا ہو اس لئے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی ریاست جو صحیح طور پر اسلامی کمیونٹی کے امور یوں انجام دے کہ ہر فرد مرد و زن کم از کم مادی بہبود حاصل کرے، جس کے بغیر انسانی وقار صحیح معنی میں آزادی اور آخر میں روحانی ترقی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اس سے بلاشبہ یہ مطلب نہیں ہے کہ ریاست کو اپنے شہریوں کو آسانی اور بے فکری سے زندگی گزارنے کے ضمانت دے۔ اس کا تو صرف یہ مطلب ہے کہ اسلامی ریاست میں روح فرسا فلاکت کے ساتھ امارت نہ ہوگی۔ دوئم ریاست کے تمام ذرائع معاش کے لئے فراہم کیے جائیں اور سوئم یہ کہ اس ضمن میں تمام شہریوں کے لئے مساوی مواقع فراہم کیے جائیں اور یہ کہ کوئی شخص دوسرے کی قیمت پر اعلیٰ معیار زندگی سے لطف اندوز نہ ہونے پائے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''مسلمان ایک دوسرے کے لئے عمارت کی اینٹوں کی طرح ہیں۔ ہر اینٹ دوسری اینٹ کو تقویت پہنچاتی ہے۔''[45] اس طرح زندگی کے ہر لحہ میں باہم اشتراک اسلام کی بنیادی شرط ہے اور کوئی ریاست اس وقت اسلامی نہیں کہلائی جا سکتی جب تک وہ اس اشتراک کی قانون سازی کے ذریعہ رہنمائی نہیں کرتی ہے۔ اس طرح اپنے شہریوں کو مطالبات اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کے قابل نہیں بناتی ہے جس کا اعلان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''تم جنت میں داخل نہ ہو گے جب تک ایمان نہ لاؤ گے اور تم اس وقت تک ایمان حاصل نہ کر سکو گے جب تک ایک دوسرے سے محبت نہ کرو گے۔''[46] ''زمین والوں کے ساتھ رحم کا برتاؤ کرو پھر اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ رحم سے پیش آئیں گے۔''[47] ''اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ رحم کا معاملہ نہ کرینگے جو اس کی مخلوق کے ساتھ رحم سے پیش نہیں آتا'' اور مزید خصوصی صراحت یہ ہے:

> ''اگر کوئی مسلمان لباس کے حاجت مند مسلمان کو لباس پہناتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بہشتی حلہ مرحمت فرمائیں گے اور اگر کوئی مسلمان کسی بھوکے مسلمان کو کھانا کھلاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بہشت کے پھل کھلائیں گے اور اگر کوئی کسی پیاسے مسلمان کو پانی پلاتا ہے تو اللہ تعالیٰ بہشت کے چشمہ سے اسے پلائیں گے۔''[49]
>
> ''وہ مومن ہی نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔''[50]

مبادا کہ ان کی امت سمجھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں انفرادی حیثیت سے عمل کرنے کی نصیحت فرمائی ہے اس لئے انہوں نے باہم دیگر مدد اور اشتراک کے پہلو پر اکثر زور دیا ہے۔

> ''مومن ایک جسد واحد کی طرح ہے۔ اگر اس کی آنکھوں میں تکلیف ہوتی ہے تو اس کے پورے جسم کو تکلیف محسوس ہوتی ہے اور اگر اس کے سر میں درد ہوتا ہے تو اس کے پورے جسم کو تکلیف پہنچتی ہے[51]۔'' تم مومنوں کو ان کے باہم اشتراک، محبت اور

Marfat.com

ہمدردی کے ذریعہ پہچان لوگے۔مومنین ایک جسم واحد کی طرح ہیں۔اگر اس کا کوئی عضو
بیمار ہوتا ہے تو پورا جسم بخار اور بے خوابی کی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے۔''[۵۲]

تو یہ اسلام کا گہرا معاشرتی سبق ہے۔کسی ایسے معاشرہ میں مسرت وقوت نہیں ہوسکتی جو اپنے بعض اراکین کو جائز حاجت کے پوری نہ ہونے کی تکلیف میں مبتلا ہونے کی اجازت دے جبکہ دوسروں کے پاس ان کی حاجت سے زیادہ ہو۔اگر غیر معمولی حالات کی وجہ سے پورا معاشرہ فلاکت میں مبتلا ہے (جیسا کہ ابتدائے اسلام میں واقع ہوا تھا تو ایسی فلاکت روحانی قوت کا ذریعہ بن سکتی ہے اور اس کے ذریعہ مستقبل میں عظمت حاصل ہوسکتی ہے) لیکن جب معاشرے کے دستیاب وسائل غیر مساوی طریقہ پر تقسیم ہوں کہ بعض گروہ تو عیش وعشرت کی زندگی گزاریں اور دوسرے نان ونفقہ کے لئے جان توڑ کوشش کریں تو فلاکت روحانی ترقی کی خطرناک دشمن بن جاتی ہے اور بعض پوری کمیونٹی کو گمراہ اور روح شکن مادہ پرستی کی طرف دھکیلتی ہے۔اسی کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں تنبیہ فرمائی ہے:

''اور فلاکت کبھی بے یقینی (کفر) کی طرف بھی پھیر کر سکتی ہے۔''[۵۳]

فلاکت کے درمیان کثرت اصول اخوت کی نفی ہے جس پر اسلام کی بقا اور زوال کا دارومدار ہے۔اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے کوئی شخص حقیقی ایمان کا مالک ہو ہی نہیں سکتا ہے جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے وہی خواہش نہیں رکھتا ہے جس کی وہ اپنے لئے خواہش رکھتا ہے۔''[۵۴] نتیجہ کے طور پر اسلامی ریاست کو یہ دیکھنا ہے کہ کمیونٹی میں مساوات قائم رہے اور یہ کہ ہر شہری-مرد وزن اور بچہ-کو کافی خورش و پوشش میسر ہو۔بحالت علالت علاج معالجہ اور رہنے کے لئے ایک اچھا مکان میسر ہو۔اس مقصد کے حصول کے لئے ملک کے آئین میں اس لحاظ سے ایک شرط لازماً شامل ہونی چاہیے کہ ہر شہری حق رکھتا ہے (الف) کام کرنے کی عمر اور صحت مند حالت میں پیداواری کام کرنے اور اجرت کرنے کا (ب) اگر ایسے پیداواری کام کے لئے تربیت کی ضرورت ہو تو سرکاری خرچ پر تربیت کا (ج) بیماری کی صورت میں مفت اور بھرپور علاج کا اور (د) بیماری کی صورت میں معذوری، بیوگی، بیروزگاری کسی فرد کے قبضہ قدرت سے باہر حالات میں بڑھاپا یا صغیر سنی کی حالت میں ریاست کی طرف سے کافی نشوونما اور پوشش اور مکان کی فراہمی کا۔

آئین کے متعلق ایسی قانون سازی قومی پیمانہ پر معاشرتی بیمہ منصوبہ کی متقاضی ہوگی جس کی سرمایہ حکم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق دولت پر ایک جامع ٹیکس کے ذریعے کی جائے گی۔

''امیروں سے وصول کیا جائے گا اور ان میں سے غریبوں پر صرف کیا جائے گا''[۵۵] زکوۃ اور آمدنی دونوں پر ٹیکس کے ذریعہ کیونکہ بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔''

''مال پر زکوۃ کے علاوہ ایک محصول (حق) ہے۔''[۵۶]

Marfat.com

حواشی

۱۔ الترمذی بروایت عبداللہ ابن عمر۔

۲۔ ابوداؤد اور احمد ابن حنبل بروایت ابوذر۔

۳۔ بخاری و مسلم بروایت عبادہ ابن الصامت۔

۴۔ قرآن ۹:۱۱۱۔

۵۔ البیہقی ،السنن الکبریٰ بروایت جابر ابن عبداللہ۔

۶۔ قرآن ۴۰-۳۹:۲۲۔

۷۔ تفسیر ابن کثیر (قاہرہ) پانچویں جلد صفحہ ۵۹۲۔

۸۔ قرآن ۲:۱۹۰۔

۹۔ قرآن ۲:۱۹۳۔

۱۰۔ قرآن ۸:۶۰

۱۱۔ بخاری و مسلم بروایت حضرت عبداللہ ابن عمر۔

۱۲۔ ابوداؤد بروایت ابوامامہؓ۔

۱۳۔ ایضاً۔

۱۴۔ قرآن ۲:۵۶۔

۱۵۔ قرآن ۴:۲۲۔

۱۶۔ ابومسلم بروایت حضرت ابن عمر۔

۱۷۔ النسائی بروایت عثمان ابن شارک۔

۱۸۔ ابومسلم بروایت عارفجہ۔

۱۹۔ بخاری و مسلم بروایت ابن عمر۔

۲۰۔ بخاری و مسلم بروایت حضرت علیؓ۔

۲۱۔ احمد ابن حنبل بروایت معاذ ابن جبل۔

۲۲۔ احمد ابن حنبل بروایت عبادہؓ۔

۲۳۔ ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ بروایت حضرت ابوسعید الخذری۔

۲۴۔ ابومسلم بروایت حضرت ابوسعید الخذری۔

۲۵۔ ابوداؤد بروایت عبداللہ ابن عمر۔

Marfat.com

۲۶۔ بخاری و مسلم بروایت ابن عباس۔

۲۷۔ ابو مسلم بروایت عوف ابن ملک الاشجعی۔

۲۸۔ قرآن ۳:۴۔

۲۹۔ بخاری بروایت عبادہ ابن الصامت۔

۳۰۔ بخاری و مسلم بروایت عبداللہ ابن عمر و ابو ہریرہ۔

۳۱۔ ابو مسلم بروایت سلامہ ابن الاکوئی۔

۳۲۔ ترمذی، من ہدایہ۔

۳۳۔ ابوداؤد بروایت عبداللہ ابن مسعودؓ۔

۳۴۔ ابوداؤد بروایت حضرت ابوبکرؓ۔

۳۵۔ ایضاً۔

۳۶۔ بخاری و مسلم بروایت ابن مسعودؓ۔

۳۷۔ مسلم بروایت جابر ابن عبداللہ۔

۳۸۔ مسلم بروایت حضرت ابو ہریرہؓ۔

۳۹۔ قرآن ۱:۱۰۴۔

۴۰۔ ابوداؤد بروایت حضرت ابو ہریرہؓ۔

۴۱۔ ترمذی، ابوداؤد اور احمد ابن حنبل بروایت ابودردا۔

۴۲۔ ترمذی بروایت امام الباہلی۔

۴۳۔ ابن ماجہ بروایت حضرت انس۔

۴۴۔ بخاری و مسلم بروایت عبداللہ ابن عمر۔

۴۵۔ بخاری و مسلم بروایت ابوموسیٰ۔

۴۶۔ ابو مسلم بروایت حضرت ابو ہریرہؓ۔

۴۷۔ ترمذی و ابوداؤد بروایت عبداللہ ابن عمر۔

۴۸۔ بخاری و مسلم بروایت جریر ابن عبداللہ۔

۴۹۔ ترمذی ابوداؤد بروایت حضرت ابوسعید۔

۵۰۔ البیہقی بروایت ابن عباس۔

۵۱۔ مسلم بروایت نعمان ابن بشیر۔

۵۲۔ البخاری و مسلم بروایت ابن بشیر۔

Marfat.com

۵۳۔ السیوطی، الجامع الصغیر۔

۵۴۔ بخاری و مسلم بروایت حضرت انسؓ۔

۵۵۔ بخاری و مسلم بروایت عبداللہ ابن عباس۔

۵۶۔ ترمذی و ابن ماجہ بروایت فاطمہ بنت قیس۔

(در: اسلامی اصول ریاست اور حکومت از محمد اسد: ترجمہ حیدر علی مولجی طہٰ کراچی، بلا تاریخ ص ۱۲۲-۱۶۱)

Marfat.com

منور علی

پاکستان اور شریعت اسلام

(علامہ اسد آسٹروی کے خیالات کا خلاصہ)

فی زمانہ شریعت اسلامی سے متعلق ہمارے مروجہ روایتی تخیلات ونظریات پر فوری نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے تا کہ ملت اسلامی ان تصورات سے اپنا سابقہ رشتہ دوبارہ قائم کر سکے جن پر اس کی ثقافتی زندگی کا مدار ہے۔ علم شریعت کے شفاف سرچشمہ کو دقیق علمی بحثوں اور فلسفیانہ موشگافیوں سے پاک کر کے اسے مسلمانوں کی عملی زندگی میں حقیقی طور پر رائج کرنے کی اس کوشش کا دو طبقوں میں بالخصوص نامقبول ہونا یقینی ہے۔ اول تجدید نواز و دوم علمائے کرام کا ایک خاص طبقہ اس کی مخالفت کرے گا، لیکن یہ دونوں طبقے بالکل مختلف وجوہ کی بنا پر اول الذکر اس تحریک سے اختلاف کریں گے۔ اول الذکر اسے مسلمانوں کو پھر سے رجعت پسندی اور تنگ نظری کی طرف لے جانے کی ایک کوشش قرار دیتے ہیں تا کہ مسلمانوں کو مذہبی جکڑ بندیوں مین کس کران کی زندگی کو بہت حد تک بے کیف اور آئندہ ترقی سے عاری بنادیا جائے اور قدامت پسند علماء اسے مسلمانوں کو ہر مذہبی قید سے آزاد کرنے کا پروانہ تصور کرتے ہیں تا کہ قانون الٰہی کے مسخ ہونے کے بعد تجدد پرستوں کے لیے قابل قبول بن جائے۔

اول الذکر گروہ کا غالباً کوئی علاج نہیں اس سے میں صرف یہ کہوں گا کہ مذہب میرے نزدیک حیات زندگی کی سب سے مستحکم حقیقت ہے اور اس کے بغیر اچھائی و برائی کا ہر امتیاز قطعاً بے معنی ہے۔ اور ان علماء سے جو اسے شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، میں عرض کروں گا کہ اس نظر ثانی سے مراد تجدد پسندی، مغرب زدگی نہیں بلکہ تعلیمات اسلامی کو از سرنو اس عام فہم اور سادہ طریقہ پر پیش کر دینا ہے جس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا تھا اور زمانہ مابعد کی وہ ان تمام زمانی اور وقتی تشریحات سے جنہوں نے اصلی شریعت کو مختلف تاویلات کا آماجگاہ بنادیا کہ عام لوگوں کو رسائی سے باہر بنا رکھا ہے ان بنیادی قوانین کو پاک صاف کر کے پیش کیا جائے۔ تا کہ اسلام کی سیدھی سادی تعلیم ہر مسلمان تک پہنچ سکے۔ دراصل اسلام کسی جدید اصلاح کا محتاج نہیں۔ یہ اگر خدائی قانون ہے تو زندگی کے تمام مسائل جو اسے پیش آئے یا اپنی ارتقائی منزلوں میں آئندہ پیش آئیں، ان سب کا استحضار اس قانون کے بنانے والے

Marfat.com

نے ضرور کر لیا ہوگا اور اس لیے لازمی طور پر اس قانون کو ہر زمانہ کے مطابق اور مناسب ہونا چاہیے۔ اور اگر ایسا ہے اور وہ زمانہ حال کی ضروریات کا جو اس طرح پوری نہیں کرتا، جیسا کہ وہ ماضی میں کرتا آیا ہے تو اس کو خدائی اور ربانی نہیں کہا جاسکتا۔ میرا عقیدہ ہے کہ یہ قانون یقیناً خدائی اور الٰہی قانون ہے اور یہ میرا ایمان ہے۔ تو اگر اس میں سے کوئی شق ایسی نظر آتی ہے جو حال و مستقبل کی ضروریات کے حل دینے سے قاصر ہے تو ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ وہ یا تو باہر سے لا کر اس میں ٹھونس دی گئی ہے یا پھر اسی کو توڑ مروڑ کر اس میں سے نکال لی گئی ہے۔ بہر حال وہ خدائی اور ربی حکم ہرگز نہیں۔

غیر شرعی قوانین کا شریعت کے ساتھ یہ خلط مبحث زیادہ تر علمائے سلف کی ان مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ ہے جو انہوں نے پوری نیک نیتی کے ساتھ اس قانون کی دقت کے لحاظ سے تفسیر و تشریح کرنے میں فرمائیں۔ ان کے ان حواشی کو اور ان کے ان استنباطی اور اخراجی احکام کو جو لامحالہ وقت اور مقام کی قید سے مقید تھے، بعد کی نسلوں نے اصلی قانون کے ساتھ اس طرح باہم مخلط کر دیا کہ آج وہ اس کا ایک جزو لاینفک ہو کر رہ گئے ہیں۔

اسلامی معاشرہ کے پیدا شدہ مسائل پر تو پھر کبھی بحث کی جائے گی لیکن جو کچھ اب تک کہا گیا ہے اس سے یہ چیز تو اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وقت کی پکار اسلامی قانون کو دوبارہ اپنی پاکیزگی اور سادگی پر لے آنے کے متقضی ہے۔ یہ کام اتنا اہم ہے کہ اسے کل پر اٹھا نہیں رکھا جا سکتا۔ خوش قسمتی سے آج کل مسلمان خصوصاً ہندی مسلم عوام اس ضرورت کا احساس رکھتے ہیں۔ یہ ان کے وجدان کی آواز ہے اور اس کی صدائے بازگشت "قرآنی نظام" "اسلامی ریاست" "اسلامی اصول معاشرت و معیشت" "اسلامی اصول سیاست" اور اسی قسم کے وہ متعدد نعرے ہیں جن سے آج کل کی فضا معمور ہے۔ ان نعروں نے پاکستان کے تخیل میں اپنا نصب العین پا لیا ہے، البتہ اس کا کوئی واضح اور صاف پروگرام ابھی تک مسلمانوں کے پیش نظر نہیں۔

دور حاضر میں عالم اسلام کی سرگرم تحریکوں میں سے صرف پاکستان ہی وہ واحد تحریک ہے جو مسلم قوم کی نشاۃ ثانیہ کے امکانات رکھتی ہے۔ یہ تحریک دیگر سیاسی تحریکوں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس کا بنیادی نظریہ قومیت (Nationalism) نہیں۔ یہ نظریہ قومیت بجائے خود اسلامی اصولوں کے یکسر خلاف ہے۔ بلکہ یہ احساس کہ مسلمان ایک فکری اصول رکھتے ہیں اور ان کی یہ تمنا ہے کہ ایک ایسا سیاسی ماحول تشکیل پا جائے جس میں ان کے نظریات عملی شکل اختیار کر سکیں، اس تحریک کا بنیادی نقطہ ہیں۔ اس تحریک کے موجودہ راہنما مذہبی قیادت کی صلاحیتوں میں کتنے ہی فروتر اور دینداری کے جذبات سے کتنے ہی عاری کیوں نہ ہوں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تحریک مسلم عوام میں صحیح قسم کے احساس اور درست ادراک کا پتہ دیتی ہے۔ مسلم عوام یہ جان گئے ہیں کہ ہماری تہذیب اور ہمارا تمدن گذشتہ چند صدیوں کے تنزل اور جمود سے صرف اسی صورت میں نجات پا سکتے ہیں کہ یہ پھر سے شریعت حقہ کی بنیادوں پر قائم ہوں۔ صرف یہی وہ طریقہ ہے جس سے ہم اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں اور اپنی روایات کو پھر سے تازہ کر سکتے ہیں۔ تقریباً ہر مسلمان اس کا احساس رکھتا ہے مگر ابھی تک وہ اسے کھل کر کہہ نہیں سکا ہے۔

Marfat.com

اس نقطہ نظر سے جب ہم پاکستان کی تحریک کو دیکھتے ہیں تو اس کی تاریخی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ عام اس سے کہ یہ تحریک جلدی ہی کامیاب ہو جائے یا اس کی تکمیل میں عرصہ ہو۔ مسلمانوں میں یہ وہ پہلی عوامی تحریک ہے جس نے نظام حکومت کے قیام کو اپنا مقصد بنایا ہے۔ اس مقصد کے لحاظ سے پچھلی چند صدیوں میں بھی بظاہر ایسی چند سطحی تحریکیں ہندوستان میں اور بیرون ہندوبود میں آئیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی اتنی مقبول عام اور اتنا سیاسی شعور لیے ہوئے نہ تھیں۔ قریباً ان سب میں ایک شخص پر روحانی اعتقاد و بھروسہ وجہ تحریک تھا۔ کسی مرد واحد کا اعتقاد اپنے اور اپنے مشن میں اتنا سخت ہوتا تھا کہ دوسرے اس کی اتباع پر مجبور ہو جاتے تھے اور اسکی شخصیت اتنی اثر آفریں ہوتی تھی کہ اس کا اثر اس کے متبعین تک میں نفوذ کر جاتا تھا۔ وہ خود چاہے مجدد عصر ہو یا مہدی موعود ہونے کا اعلان کرے، عوام اس امیر پر اس کی اتباع کرتے تھے کہ اپنے کرشموں اور کرامتوں کے زور پر اسلام کو سربلند کرے گا۔ اور پھر ان تحریکوں میں ہر بار بلا استثنا جب کبھی وہ مرکزی شخصیت لوگوں کے درمیان سے اٹھ گئی ہے تو اس کے ساتھ ہی ساری تحریک اور کل امیدیں ختم ہو گئی ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے مہدی سوڈانی اور سید احمد بریلویؒ کی تحریکوں کا نفسیاتی مطالعہ کیا ہے اس بات میں ضرور مجھ سے متفق ہوں گے۔

لیکن پاکستان کی تحریک ان تمام صوفیانہ اور باطنی تحریکوں سے اصولی طور پر مختلف ہے۔ یہ کسی روحانی امامت کے تخیل پر مبنی نہیں بلکہ یہ یقین کہ اسلام ایک معقول و مناسب نظام عمل ہے اور یہی نوع انسانی کے دکھوں کا دارو اور آج کل کی نوع بنوع الجھنوں کا علاج ہو سکتا ہے، اس تحریک کا بنیادی اصول ہے۔ یہ احساس اور یہ یقین عام لوگوں میں تو وجدانی طور پر اور پڑھے لکھوں میں شعوری طور پر موجود ہے۔ اس تحریک کا یہ علمی اور عقلی پہلو ہی سب سے زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ قرون اولیٰ میں اسلام کی کامیابی اس وجہ سے ہوئی کہ اس نے انسان کی عقل سلیم کو دعوت فکر و نظر دی۔

آج کل احیائے اسلام کی اگر کچھ توقع ہو سکتی ہے تو مسلمانوں کا وہ جوش و خروش جو پاکستان کے تخیل نے انہیں عطا کیا ہے، اس کی ایک خوشگوار علامت ہے۔ لیکن محض یہ جوش و ولولہ ہی ہماری تسلی کے لیے کافی نہیں۔ اسمبلیوں کی گرما گرم بحثوں، لیڈروں کی پُر جوش تقریروں اور اخبارات و رسائل کے زوردار مضمونوں میں فقط یہ ابلتا ہوا جوش اس بات کی مقبول ضمانت نہیں کہ اسلامی ریاست کے مسلمان اسلامی نظام کی نعمتوں سے بہرہ ور بھی ہو جائیں گے۔ جب بلقان کے عیسائیوں نے انیسویں صدی میں ترکوں کے خلاف بغاوت کی ہے تو وہ بھی اپنی مذہبی و ثقافتی روایات کا ڈھنڈورا پیٹتے تھے۔ ان کا نعرہ بھی یہی تھا کہ ''ہم آزادی چاہتے ہیں تاکہ ایک عیسائی کی طرح آزاد رہ کر زندگی بسر کر سکیں اور یہ چیز اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم ترکوں کے غلام ہیں، کیونکہ ہمارا مذہب ہماری تہذیب، ہمارا تمدن، ہماری زبان سب کچھ ترکوں سے مختلف ہے'' اور آپ دیکھیں گے کہ یہ نعرہ کتنا ملتا جلتا ہے، موجودہ پاکستان والوں کے نعروں سے۔ لیکن جب آخر کار وہ عیسائی قومیں ترکی اقتدار سے آزاد ہو گئیں تو انہیں اپنا وہ اولیں مقصد لینے عیسائیت کے اصولوں کو بنائے ریاست قرار دینا بھی یاد نہ رہا۔ ان کا وہ عیسائیت کی سربلندی کے لیے جوش و خروش ختم ہو گیا اور جب عملی طور پر ایک ریاست کے قیام کا سوال آیا تو انہوں نے بھی ہو بہو دیگر اقوام یورپ کی طرح اس کی بنیاد اسی

Marfat.com

قومیت کے اصول پر رکھ دی۔

پاکستان کے تخیل کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کو بھی اس خطرہ سے ہشیار رہنا چاہیے۔ ''پاکستانی قومیت'' کا خطرہ بہت بڑا خطرہ ہے اور ان لوگوں کے نزدیک جو اسلام کو ایک عملی نظام نامہ قرار دیتے ہیں، اس کی اہمیت یہ کہہ کر کی جا سکتی ہے کہ ''یہ خطرہ ہمیں لاحق نہیں ہو سکتا'' آخر کیوں نہیں؟ یہ خطرہ ہندی مسلمان کو بھی اسی طرح پیش آ سکتا ہے جس طرح بلغاریہ اور سربیا کے عیسائیوں، اور دور کیوں جایئے خود آپ کے ترکی، ایرانی اور مصری بھائیوں کو لاحق ہو چکا ہے۔ یہ قومیت، یہ عصبیت جاہلیہ جس سے خبردار رہنے کا آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا حکم دیا ہے، بہت سے پُراسرار موثر ذرائع اپنے تصرف میں رکھتی ہے۔ کہیں کسی ایک گروہ کی معاشی واقتصادی مصلحتیں اس عصبیت کا بیج بوتی ہیں تو کہیں ہمچو ما دیگرے نیست کا غلط اذعان اس کے لیے زمین ہموار کرتا ہے اور آخر کار وہ منزل آ جاتی ہے جہاں صرف عرب، ترک یا ایرانی اور خدا نہ کرے پاکستانی ہونا ہی ایک طرح کی روحانی فضیلت کا نشان قرار پا جاتا ہے۔ فی زمانہ اپنی نوعیت کی یہ واحد پاکستانی تحریک اسلام کے احیاء کے لیے ایک نقطہ آغاز ثابت ہو سکتی ہے بشرطیکہ مسلمان یہ سمجھیں اور پاکستان کے حصول کے بعد بھی انہیں یہ نہ بھولیں کہ پاکستان کے اصلی اور تاریخی جواز کی وجہ یہ نہیں کہ وہ لباس، عادات میں برادران وطن سے کوئی مختلف طریقہ رکھتے ہیں یا ان میں سے کسی گروہ سے انہیں شکایات ہیں اور یہ بھی یاد رہے کہ پاکستان کا یہ مقصد نہیں کہ اپنے ہم قوموں کے لیے اقتصادی مراعات حاصل کی جائیں اور ان لوگوں کے لیے جو اپنے آپ کو عادتاً مسلمان کہتے ہوں، کچھ سہولتیں بہم پہنچائیں بلکہ صحیح اسلامی ریاست کے قیام کی خواہش اور احکام اسلامی کو عملی زندگی کا دستور بنانے کی تمنا ہی پاکستان کے قیام کو حق بجانب بنا سکتی ہے۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ جب تک احکام شریعت کو ہر مسلمان تک عملی طور پر پہنچانے کا کوئی نیا انتظام نہ کر لیا جائے، یہ تمام دل خوش کن خواہشیں تشنہ تکمیل رہیں گی۔ اور جب تک قانون اسلام ہر ہوشمند مسلمان مرد اور مسلمان عورت کے لیے ایک سوچی سمجھی اور جانی پہچانی ہوئی چیز نہیں بنا دیا جاتا، اس وقت تک ''اسلامی دستور العمل'' اور اس جیسے دوسرے خوش نما فقرے فقط کھوکھلے الفاظ رہیں گے۔ ہر معنی سے عاری یہاں تک کہ وہ دن آ جائے گا جبکہ اسلامی تہذیب کے آخری نشانات مٹ کر رہ جائیں اور پاکستان کے قیام کے لیے ہر وجہ جواز ختم ہو جائے۔

(در: صدق (لکھنو)، بابت ۷ مئی ۱۹۴۷ء، ص ۶-۷)

Marfat.com

ضیاء شاہد

اسلامی ریاست میں سیاسی ڈھانچہ

نامور مستشرق اور سکالر جناب محمد اسد کے خیالات

نامور مستشرق اور نومسلم سکالر جناب محمد اسد کے بارے میں یہ خبر چھپ چکی ہے کہ اسلام آباد میں مولانا ظفر احمد انصاری کی سربراہی میں کام کرنے والے کمیشن میں انہیں بطور خاص شرکت کی دعوت دی گئی اور انہوں نے پاکستان پہنچ کر کمیشن کے متعدد اجلاسوں میں شرکت کی ہے۔ جناب محمد اسد نے انگریزی زبان میں اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام ہے ''اسلام میں ریاست اور حکومت کے اصول''۔ یہ کتاب 1961ء میں کیلی فورنیا یونیورسٹی سے شائع ہوئی تھی۔ بعدازاں اس کے دیگر زبانوں میں تراجم بھی چھپے۔ اس کتاب کی روشنی میں جناب محمد اسد کے خیالات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور یہ مطالعہ موجودہ حالات میں دلچسپی کا حامل ہوگا کہ آج کل پاکستان میں اس موضوع پر بحث بھی جاری ہے اور سیاسی ڈھانچہ وضع کرنے کے لیے جس کمیشن کو ذمہ داری سونپی گئی ہے، جناب اسد اس میں بطور سکالر اور محقق کے پیش بھی ہو رہے ہیں۔

جناب اسد نے کتاب کے آغاز ہی میں لکھا ہے کہ اسلامی ریاست میں زبان، نسل یا علاقے کی بنیاد پر وطنیت کا کوئی تصور موجود نہیں اور نہ اس میں سیکولرازم کی کوئی گنجائش ہے کیونکہ اسلام زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آج کے مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ مغربی اصطلاحوں یا دنیا میں رائج دیگر نظاموں کی روشنی میں اسلام کو پرکھنا چاہتے ہیں۔ جبکہ اسلام کا دیگر شعبوں کی طرح سیاست اور نظام حکومت کے سلسلہ میں بھی اپنا ایک مربوط اور واضح نظام ہے۔ انہوں نے لکھا کہ پارلیمانی صدارتی، آمرانہ، ووٹ، اسمبلیاں، مدت انتخاب اور اس قسم کی دیگر اصطلاحیں ایک دن میں وضع نہیں ہوگئیں بلکہ ان کے پیچھے ایک طویل تاریخ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان اصطلاحوں کو بعینہٖ کسی اسلامی ریاست میں رائج کرنے کی کوشش کی جائے تو مشکل پیش آتی ہے اور مسئلہ اس طرح الجھتا ہے کہ ڈور کا سرا ملتا نہیں۔

جناب محمد اسد نے قرآن حکیم کی آیات جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''وہ اپنے معاملات مشورے سے طے کرتے

Marfat.com

ہیں'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی روشنی میں عوام کی رضا مندی اور شمولیت حاصل کرنا حکومت کے لیے از بس ضروری ہے جس کا بہترین طریقہ آج کے دور کے انتخابات ہیں۔انہوں نے لکھا ہے کہ قرآن حکیم کی آیت جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''اے ایمان والو! اللہ، اس کے رسولؐ اور جو لوگ تم میں سے صاحب اقتدار ہیں، ان کی اطاعت کرو'' کے مطابق امیر کی اطاعت ضروری ہے لیکن امیر میں وہ خصوصیات ہونی چاہئیں جو اسلامی ریاست کے سربراہ کے لیے ضروری ہیں۔

جناب اسد نے کہا کہ اسلامی ریاست کا مقصد کسی نسلی، ثقافتی یا لسانی علاقے کا تحفظ نہیں بلکہ اسلام کے مطابق بنی نوع انسان کے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے۔لہٰذا یہ ضروری ہے کہ امیر یا سربراہ ریاست بنیادی طور پر پکا مسلمان ہو اور اس طرح جیسے آج ایک کمیونسٹ ریاست میں سربراہ تو کیا، اعلیٰ عہدوں میں سے کسی کے لئے بھی غیر کمیونسٹ شخص کے تقرر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اسی طرح اس سے بڑھ کر اسلامی ریاست میں بھی صحیح اور سچے مسلمان کے سوا ایک اور سربراہ ریاست تو کیا اس کے عمال حکومت بھی مقرر نہیں کیے جا سکتے۔البتہ بزرگی اور بڑائی کی تعریف از خود قرآن نے مقرر کر دی ہے۔جب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''تم میں سے شریف ترین اور معزز ترین وہ شخص ہے جو تم سب میں متقی ہے۔''

جناب اسد نے کہا کہ اسلامی ریاست میں مجلس شوریٰ کا قیام لازمی ہے، البتہ اس مجلس کے ارکان کسی بھی طور پر نامزد نہیں ہو سکتے، کیونکہ ایک منتخب اور متقی امیر کی طرف سے بھی نامزدگی میں غلطیاں ہو سکتی ہیں اور شوریٰ کا تصور ہی اس امر سے عبارت ہے کہ وہ لوگوں کے مشورے سے بنی ہو، چنانچہ آج کی اصطلاحوں میں مجلس شوریٰ کے ارکان وہ لوگ ہوں گے جو آزادانہ اور منصفانہ انتخاب کے ذریعے سامنے آئے ہوں، البتہ رسول کریمؐ کے قول مبارکہ کے مطابق کہ ''ہم کسی شخص کو کوئی عہدہ نہیں دیتے جو خود اس کا طلب گار ہو'' یہ بات لازم ہوگی کہ امیر سربراہ مملکت ہو یا شوریٰ کا رکن، وہ خود کو اس منصب کے لیے پیش نہیں کرے گا، بلکہ اس کی اچھی شہرت، ذہانت، بزرگی اور دیانت و امانت کے باعث عامۃ المسلمین اس کا نام اس مقصد کے لیے تجویز کریں گے۔جناب اسد نے لکھا ہے کہ اس اصول کی روشنی میں انتخابی مہم چلانا یا اپنی شان میں تقریر بازی ممنوع قرار پائے گی اور ایک اسلامی ریاست میں اس امر کی اجازت نہیں دی جائے گی بلکہ جو شخص اپنے لئے مہم چلاتا ہوا نظر آئے گا، اسے اس انتخاب میں حصہ لینے کے لئے نااہل قرار دے دیا جائے گا۔

جہاں تک قانون سازی کا تعلق ہے، جناب اسد نے لکھا ہے کہ وہ قوانین جو اسلام میں واضح کر دیے گئے ہیں، ان میں کسی قسم کی تبدیلی یا تحریف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ ضرورت کے تحت بنیادی اصولوں کی روشنی میں اجتہاد سے کام لیا جا سکتا ہے، تاہم اجتہاد کے لیے ساری شرعی شرائط پوری کرنا ہوں گی۔دوسری طرف بنیادی معاملات میں جہاں اسلام نے کوئی واضح حکم نہیں دیا بلکہ حالات اور وقت کے اعتبار سے فیصلے کرنے کا حکم دیا ہے، اختلاف رائے کی گنجائش بھی ہے اور شوریٰ کے ارکان اس پر بحث بھی کریں گے۔رسول کریمؐ کی حدیث مبارکہ کہ ''میری امت کے

Marfat.com

پڑھے لکھے لوگوں میں اختلاف رائے رحمت کا باعث ہے'' کا تذکرہ کرتے ہوئے جناب اسد نے لکھا ہے کہ اس موقع پر اختلاف رائے سے مراد دنیاوی معاملات کے فیصلے میں اختلاف ہے نہ کہ دینی معاملات میں جن کا فیصلہ اوپر سے ہو چکا ہے۔

جناب اسد نے امیر یا سربراہ مملکت کے اختیارات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگرچہ یہ بہت زیادہ نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت یہ تمام اللہ کے احکام کی پیروی میں ہیں۔ اس کے خلاف ایک اسلامی ریاست کا سربراہ جا ہی نہیں سکتا اور جہاں تک دنیاوی معاملات یا ایسے مسائل کا ذکر ہے جن میں فیصلہ کرنے کا اختیار اسلام نے وقت اور حالات کی ضرورت کے تحت انسان کو دیا ہے، وہاں امیر یا سربراہ ریاست کو مشورہ کرنے کا پابند کر دیا گیا ہے۔

جناب اسد نے رسول کریمؐ کی اس حدیث مبارک سے کہ ''سواد اعظم کے پیچھے چلو'' یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جن معاملات میں براہ راست اللہ اور اس کے رسول کا واضح فرمان موجود نہیں اور فیصلہ خود کرنا ہو، تو اجماع کے اصول پر چلنا ہوگا۔

انتظامیہ اور مقننہ کی بحث میں اسد نے امیر یا سربراہ ریاست کو دونوں کا نگران اور آخری اتھارٹی قرار دیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ اسلامی ریاست میں یہ حیثیت زیادہ بہتر ہوتی ہے اور مغربی جمہوریتوں کی طرح سے ان دونوں اداروں میں بلاوجہ کی کشمکش پیدا نہیں ہوتی۔

صدارتی اور پارلیمانی نظام کی بحث میں جناب اسد نے مغرب کی اصطلاحوں کے مطابق صدارتی نظام کو اسلامی ریاست کے لیے زیادہ موزوں قرار دیا ہے اور اس کے حق میں دلائل دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام میں امیر یا امام کا تصور ہے اور جہاں تک حکم دیا گیا ہے کہ سفر کے لئے چلو تو اپنے میں سے ایک امیر مقرر کر لو اور پھر اس کی اطاعت کرو۔ جناب اسد نے کہا کہ پارلیمانی نظام میں اختیارات اگرچہ وزیراعظم ہی استعمال کر سکتا ہے، تاہم منتخب وزراء بھی اپنے اپنے احاطے میں اختیارات کے مالک ہوتے ہیں اور براہ راست منتخب اسمبلی کو جوابدہ ہوتے ہیں۔ جناب اسد نے ایک اور دلیل میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ پارلیمانی نظام حکومت میں غیر مسلم بھی وزیر بن سکتے ہیں اور اگر ان کی آبادی ہو تو انہیں وزیر نہ بنانا زیادتی ہوگی، لیکن اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو کسی طور پر گوارا نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ انہیں اختیارات سونپے جاتے ہیں، جبکہ صدارتی نظام میں وزیر یا امریکی نظام حکومت کی طرح سیکرٹری صدر خود نامزد کرتا ہے اور ان کی حیثیت صدر کے نزدیک کارکنوں کی ہوتی ہے اور وہ صدر ہی کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا صدر مسلمان ہو تو ضرورتاً غیر مسلم وزیر بھی رکھ سکتا ہے جو اس کے کارکنوں کی طرح کام کریں گے اور اس کے سامنے جوابدہ ہوں گے اور وہی انہیں نکال سکے گا۔

جناب اسد نے کتاب میں شہریوں کے حقوق، اجتہاد کی اہمیت اور تعلیم کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے اور اسلامی ریاست کے قیام کے لیے سب سے زیادہ ضروری یہ کام قرار دیا ہے کہ عالم اسلام میں سے کوئی ایک ملک جہاں اسلامی ریاست قائم کرنے کا تجربہ کیا جا رہا ہو، وہاں قرآن و حدیث کی روشنی میں تمام فرقوں سے بالا ہو کر اسلامی قانون

Marfat.com

مرتب کیا جائے اور اس کی نقول دنیا بھر کے مسلم علماء میں پھیلائی جائیں۔ان کی آراء کی روشنی میں ان متفق علیہ قوانین کو مفادی اصولی نظریہ کے طور پر اپنایا جائے اور دیگر معاملات پر اجتہاد اور عقلی دلائل سے کام لیا جائے۔صرف اس طرح اسلامی ریاست کے قیام کی داغ بیل ڈالی جاسکتی ہے جس میں امیر یا سربراہ ریاست آج کی سیاسی اصطلاحوں کے مطابق صدر ہوگا اور اس کی مدد کے لئے سیکرٹری یا وزیر ہوں گے جو اس کے سامنے جوابدہ ہوں گے اور پھر پوری ریاست سے منصفانہ طور پر منتخب شدہ مجلس شوریٰ ہوگی جو مقننہ کا کام بھی دے گی اور انتظامی امور میں صدر کو ضروری مشورے بھی دے گی۔مساوی نمائندگی، جماعتی یا غیر جماعتی بالواسطہ یا بلاواسطہ انتخاب اور اسی قسم کے دیگر معاملات میں جناب اسد نے ملکی ضرورتوں کے پیش نظر کوئی سا نظام اپنانے کی سفارش کرتے ہوئے کہا کہ ان امور میں ان کے نزدیک اسلام کسی قسم کا حکم عائد نہیں کرتا بلکہ مقامی ضرورتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر کوئی سا نظام اپنانے کی اجازت دیتا ہے جس سے مطلوبہ نتائج حاصل کئے جاسکیں۔

(در: نوائے وقت (لاہور)، ۳۱ جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۵، ۸)

Marfat.com

محمد اسد

اسلام کیا کہتا ہے؟

(1) انسان اور کائنات کا باہمی تعلق

(سوال نمبر ا)

س: آپ کی رائے میں ہماری دنیا اور ہماری حقیقت کا باہمی تعلق کیا ہے؟ نیز ہماری دنیا کا فوق الفطرت سے کیا تعلق ہے جس کا حوالہ تمام مذاہب میں مشترک ہے؟ کیا ہماری ''یہ'' دنیا اور ''وہ'' دنیا دو الگ الگ جہان ہیں جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں؟

ج: اسلام میں حقیقت قائم بالذات ہے وجود مطلق ہے جس میں سے باقی موجودات وجود پاتے ہیں لہٰذا اسلام میں حقیقت کو ''طبعی وفطری'' ''فوق الفطری'' کے دو جہانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ہر چیز جو کہ موجود ہے اور وقوع پذیر ہے یا عالم تصور میں وجود رکھ سکتی ہے اور وقوع پذیر ہو سکتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی خلاقی کا نتیجہ ہے لہٰذا وہ چیز ہر مفہوم میں نہ صرف یہ کہ ''طبعی وفطری'' ہے بلکہ ایک ہی مربوط ''کل'' کا جزو ہے۔ اسلام میں ''کل'' ہی کو حقیقت سمجھا جا چکا ہے جو مربوط ہے مکمل ہے مطلق ہے۔ اس ہمہ جہتی ''حقیقت'' کے چند پہلو ایسے ہیں جو انسانی بصیرت وادراک کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھتے ہیں۔ ان پہلوؤں کو قرآن مجید میں ''عالم الشہادہ'' کہا گیا ہے۔ حقیقت کے چند پہلو ایسے ہوتے ہیں جو انسانی بصیرت وادراک کی رسائی سے عارضی یا مستقل طور پر باہر رہتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو قرآن مجید نے ''عالم الغیب'' کہا ہے۔ عالم الغیب کے بعض گوشے زندگی کے اگلے مرحلے یعنی حیات بعد الموت میں انسان کی بصیرت وادراک پر وا کر دیئے جائیں گے جبکہ دیگر گوشے ہمیشہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں رہیں گے۔ ہستی کے یہ دونوں طبقے، یعنی وہ بھی جسے انسان محسوس کر سکتا ہے اور وہ بھی جس کا تصور بھی انسان نہیں کر سکتا۔ ایک ہی حقیقت کبریٰ کے اجزا ہیں جس کا سرچشمہ ذات باری تعالیٰ سے پھوٹتا ہے جس کے بارے میں قرآن مجید میں آیا ہے:

اللہ لا الہ الا، الحی القیوم

(ترجمہ: اللہ، وہ زندہ جاوید ہستی جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے)۔ ایسی زبردست اور شاندار توحید کی موجودگی میں مسلمان ''حقیقت'' کو ثنویت کے تصور میں محسوس کرنے یا مشاہدہ کرنے کا

Marfat.com

خیال بھی دل میں لائے گا تو شرک کے مرض میں مبتلا ہو جائے گا۔ مزید برآں چونکہ تمام قرآنی تعلیمات کا مقصد و منشا انسان کی شعوری قوتوں کی مسلسل ترقی اور اس کے واردات روحانی کی مستقل توسیع ہے' اس لئے قابل مشاہدہ (محسوس) اور نا قابل مشاہدہ (نامحسوس) کے درمیان کوئی خط امتیاز موجودہ زندگی میں بھی نہیں کھینچا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مسلمان اپنے شعور میں آنے والی حقیقت کو اس حقیقت سے جدا نہیں سمجھتے جو ہمارے شعور سے باہر ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں حقیقتیں ایک ہی حقیقت کبریٰ کے اجزا ہیں جو ایک ہے، واحد ہے اور نا قابل تقسیم ہے۔

(سوال نمبر۲)

س: کیا فوق الفطرت کسی بھی اعتبار سے ہماری فطری حقیقت میں جلوہ گر ہوتی ہے؟ فوق الفطرت کے اسرار و رموز سمجھنے کے سلسلے میں انسان کے لئے کیا امکانات کھلے ہیں؟ کیا واقعی فوق الفطری جہان موجود ہے؟ اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس سلسلے میں الہام، وحی، مقدس آسمانی کتابیں اور مذہبی روایات کیا کردار ادا کر سکتی ہیں؟ کیا معجزے واقعی رونما ہوتے ہیں جن کے تحت ہمارے مروجہ فطری قوانین و حالات معطل ہو کر رہ جاتے ہیں؟

ج: جیسا کہ میں نے پچھلے سوال کے جواب میں بیان کیا ہے' اسلام میں حقیقت کا تصور ثنویت پر مبنی نہیں ہے بلکہ خالص توحید پر مبنی ہے۔ اللہ واحد کی خلاقی موجودات کی کثرت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے۔ لہٰذا ہم مسلمانوں کے ہاں ہماری ''حقیقت'' کے مقابل میں کسی ''دوسری حقیقت'' کے موجود ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم صرف ایک ''کل'' کے قابل مشاہدہ حصے اور نا قابل مشاہدہ حصے میں تفریق کرتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ حقیقت کے وہ پہلو جو عموماً انسانی شعور و ادراک سے ماورا ہوتے ہیں' وہ سب کے سب یا ان میں سے کوئی ایک پہلو کسی حق کے متلاشی شخص کے عقل و شعور یا محض حواس پر اپنا آپ ظاہر کر دے۔ ایسا ظہور یا انکشاف عموماً یا تو ذاتی وجدان کے ذریعے یا انفرادی یا اجتماعی تحقیق کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ''نامعلوم'' ہے، ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ ہی ''نامعلوم'' رہے۔ نامعلوم کا کچھ نہ کچھ حصہ ''معلوم'' ہوتا رہتا ہے۔ کائنات کے محسوس اور مجرد یعنی دونوں شعبوں میں اللہ تعالیٰ کی ہمہ وقت جاری و ساری خلاقی کا شعور حاصل کرنا بھی انسان کے منصب میں شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خلاقی کو قرآن مجید میں ''سنت الٰہی'' کہا گیا ہے جو ان تمام موجودات اور شواہد و ظواہر پر محتوی ہے جو ''قوانین قدرت'' کے ذریعے ہمارے شعور میں آتے ہیں۔

اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ حقیقت کے بہت سے 'روپ' جو پہلی نظر میں یا بادی النظر میں ہمیں نارسا اور نامعلوم محسوس ہوتے ہیں' وہ مختلف النوع قدرتی مظاہر کے باضابطہ مشاہدے' تجربے اور ان کے باہمی تعلقات کے مطالعے سے یعنی سائنسی تحقیق سے قابل رسا اور ''معلوم'' ہونے لگتے ہیں اور جیسا کہ میں پہلے بھی واضح کر چکا ہوں' اسلام کا مقصد و منشا انسان کے شعور کی مسلسل ترقی و توسیع و گیرائی ہے' اس لئے قرآن مجید میں بار بار قدرت کے مشاہدہ و مطالعہ کی اہمیت پر

Marfat.com

زور دیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی خلاقی کا شعور حاصل کرنے کا یہ بھی بڑا موثر اور کارگر طریقہ ہے۔ اللہ اپنے وجود و ہستی کا انکشاف اپنی خلاقی ہی کے ذریعے کرتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کی آیات اور احادیث نبویؐ میں بے شمار ہدایات اور تنبیہات آئی ہیں۔ ابتدائی صدیوں میں مسلمانوں نے جو علوم طبیعی کے میدان میں شاندار کارنامے سرانجام دیئے تھے اور ایک اچھا سائنسی طریق کار وضع کر کے اسے جو غیر معمولی ترقی دی تھی' اس کا سبب یہی ہے کہ قرآنی آیات و احادیث رسولؐ میں دی گئی ہدایات پر صدق دلی سے عمل درآمد کیا گیا۔

لیکن یہ امر ذہن نشین رہنا چاہیے کہ صرف سائنسی تحقیق حقیقت کے ''تمام'' مخفی گوشے ہم پر منکشف نہیں کر سکتی' اس لئے کہ حقیقت لاانتہا ہے' اس کی کثرت لامحدود اور اس کا تنوع بے حساب ہے اور اس کے مختلف النوع عناصر و عوامل کے باہمی تعلق اس قدر پیچ در پیچ ہیں کہ اس کے بعض پہلو عملی تحقیق اور سائنس تجربے کے حدود سے باہر رہ جاتے ہیں۔ حقیقت کے وہ پہلو جو عملی تحقیق اور سائنسی تجربے سے باہر رہ جاتے ہیں اور جو سائنسی طریق سے ''ناقابل دریافت'' ہی رہتے ہیں' وہ اخلاقیات کے شعبے میں سما کر اپنے معانی ظاہر کرتے ہیں۔ اخلاق انسانی زندگی میں ایک غالب اور فعال کردار ادا کرتا ہے اور یقیناً اخلاق کو اس چیز سے جدا نہیں کیا جا سکتا' جسے ہم ''حقیقت'' کہہ رہے ہیں۔ اخلاقی اقدار کے میدان میں ضروری اور موزوں رہنمائی کے لئے -- جو سائنس کے ذریعے ممکن نہیں -- اللہ تعالیٰ اپنی وحی کے ذریعے ہمیں بتاتا ہے کہ خیر کیا ہے' اور شر کیا۔ اخلاقی قدروں' اور سچائیوں اور ان کے باہمی روابط کی براہ راست بصیرت اللہ کے خاص الخاص اور برگزیدہ ہستیوں کو عطا کی جاتی ہے' جن کو عرف عام میں نبی یا پیغمبر کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بار بار اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ کوئی انسانی گروہ یا قوم ایسا نہیں ہے جسے ایسی پیغمبرانہ ہدایت اور رہنمائی کے بغیر چھوڑا گیا ہو' اور سلسلہ وحی اور نبوت میں تاریخی تسلسل کا اصول قرآن کا ایک بنیادی داعیہ ہے۔

جہاں تک معجزات کا تعلق ہے' یہ امر ذہن نشین رہنا چاہیے کہ قرآن کے لفظ ''آیت'' کا مطلب ہے ظاہری علامت یا نشانی' جس کا استدلال علت سے معلول کی طرف کیا جاتا ہے۔ آیت کے مفہوم میں ''معجزہ'' بھی شامل ہے یعنی ایسے واقعے کا ظہور جس کا استدلال معلول سے علت کی طرف کیا جاتا ہے۔ آیت کا ایک معنی ''پیغام'' کے بھی ہیں اور قرآن مجید میں زیادہ تر اسی معنی کا اعادہ کیا گیا ہے' پس جس چیز کو ہم معجزہ کہتے ہیں' وہ درحقیقت ایک ''غیر معمولی پیغام الٰہی'' ہوتا ہے جو اکثر رمز و کنایے کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ ایک ایسی روحانی صداقت کہ اگر پیغام کی صورت میں ظاہر نہ کی جاتی تو انسانی عقل سے چھپی ہوئی رہتی۔ ایسے غیر معمولی معجزانہ پیغامات کو بھی ''فوق الفطری'' نہیں کہا جا سکتا کیونکہ جو ''قوانین قدرت'' ہوتے ہیں' وہ بھی تو سنت الٰہی کے ہی مظاہر ہوتے ہیں اور جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ ہر چیز جو کہ موجود ہے اور وقوع پذیر ہے یا عالم تصور میں وجود رکھ سکتی اور وقوع پذیر ہو سکتی ہے' وہ اللہ تعالیٰ کی خلاقی یعنی سنت الٰہی کا نتیجہ ہے' خواہ اس کا تعلق عام قوانین قدرت سے ہو یا ان سے الگ اور ماورا ہو اور چونکہ از روئے قاعدہ یہ غیر معمولی پیغامات ہم تک اللہ کے کسی نہ کسی منتخب اور برگزیدہ پیغامبر کی وساطت سے ہی بربنائے وحی پہنچتے ہیں۔ اس لئے عام انسانی ذہن ایسے پیغامات کو معجزات خیال کرنے لگتا ہے' حالانکہ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے جسے قرآن

Marfat.com

مجید نے سورہ انعام کی آیت ۱۰۹ میں یوں دور کیا ہے:

''اے نبیؐ! ان سے کہو کہ آیات (معجزے) تو اللہ کے اختیار میں ہیں۔''

(سوال نمبر۳)

س: کیا ''دوسری دنیا'' کے وقوف میں سائنسی تحقیق انسان کی مدد کرتی ہے؟ کیا مذہبی ارشادات کا سائنسی تحقیقات سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے؟ یا ایسی ہم آہنگی ضروری نہیں؟ کیا مذہب کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب کائنات کے بارے میں سائنسی تحقیق کے تمام امکانات ختم ہو جاتے ہیں؟

ج: جہاں تک سائنس کے کردار کا تعلق ہے تو یہ امر ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ تمام سائنسی تحقیق --- یعنی مظاہر قدرت کا باضابطہ مشاہدہ اور ان کے باہمی روابط کا مطالعہ --- اسلام کے عالمگیر نظریے میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ سائنسی تحقیق کی بنیاد پر یہ بات اچھی طرح ہماری سمجھ میں آجاتی ہے کہ تمام مخلوقات و موجودات ایک واضح اور قطعی الٰہیاتی منصوبے کے مطابق وجود میں آئے ہیں اور یوں اللہ تعالیٰ کی ذات اس کے وجود اور قدرت کاملہ کے بارے میں ہمارا عقیدہ قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات کا منبع اس کی ذات ہے' اس لئے اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر تحقیقی کاوش جس کا مقصد دنیا اور اس کے پھیلے ہوئے ماحول اور اس کے اندر چھپے ہوئے خزائن کا کھوج لگانا ہو' ایک تقدیس کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ مشہور حدیث ہے کہ ''طلب العلم ہر مسلمان مرد و عورت کا مقدس فریضہ ہے'' ایک اور حدیث رسولؐ ہے ''جو شخص علم کی جستجو میں سرگرداں ہوتا ہے' اللہ اس کے لئے جنت کی راہ آسان کر دے گا۔'' اس سلسلے میں ایک اور حدیث قابل ذکر ہے۔ ''ایک عابد پر ایک عالم کی برتری کی مثال ایسے ہے جیسے چودہویں کا چاند تمام ستاروں کی روشنیوں پر حاوی ہو۔''

جیسا کہ ہم جانتے ہیں' تمام مخلوقات میں خداداد وحدت ہے' لٰہذا ہر سائنسی تحقیق جو سچی ثابت ہو چکی ہے' وہ از روئے قاعدہ لازماً ہر سچے مذہبی اصول سے ہم آہنگ ہو گی۔ جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے' اس کے ارشادات اور سچی سائنسی تحقیق کے مابین اندرونی مطابقت و ہم آہنگی کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر نظریہ ارتقا کو لیجئے جس کا حوالہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ انفرادی نامیے کا حیاتیاتی ارتقا (جس میں رحم مادر میں انسانی جنین کی نشوونما کے مراحل بھی شامل ہیں) اور نیز قوموں اور تہذیبوں کا معاشرتی و تاریخی ارتقا دونوں ہی کے اصول مع نظیروں کے قرآن مجید میں درج ہیں۔ یا پھر قرآن مجید میں اجرام فلکی کی حرکت و گردش کی مثال لیجئے۔ ستارے، سیارے، نظام شمسی اور کہکشاں اور اپنے اپنے مداروں میں گردش کرتے ہوئے ایک دوسرے سے ان کے روابط۔ یا پھر علت و معلول کے رشتے کی مثال لیجئے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر وضاحت کی گئی ہے کہ ہر مخلوق کے وجود و نمود کی بنیاد علت و معلول کے اصول ہی پر رکھی گئی ہے۔

Marfat.com

مختصر یہ کہ قطعیت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام ہمیشہ ''عقیدہ و سائنس کی کشاکش'' سے آزاد رہا ہے جو ہمیں دوسرے مذاہب میں اکثر نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اسلام مذہب اور زندگی کے درمیان کسی نوعیت کے تصادم و اختلاف کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا بلکہ تسلیم کرتا ہے تو صرف اس حقیقت کو کہ عقلی و ذہنی سرگرمی زندگی کا جزو لاینفک ہے۔

میرا خیال ہے' میں نے اوپر جو باتیں بیان کی ہیں' وہ یہ واضح کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اسلام کے مجموعی نظریہ و نظام میں سائنس کا کردار کیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ خاص طور پر یاد رکھنے کے لائق ہے کہ بلا شبہ سائنس ہمارے اردگرد کی دنیا اور ہمارے اندر کی زندگی کا درجہ بدرجہ شعور و ادراک کرنے کی اعلیٰ قابلیت و صلاحیت رکھتی ہے' لیکن سائنس میں اتنی قابلیت و صلاحیت نہیں ہے کہ وہ انسانی زندگی کے روحانی مقصد اور اس کی اخلاقی ہدایت و رہنمائی کے لئے فیصلہ دے سکتی ہو۔ بالفاظ دیگر اخلاقی معیار و اقدار کا مسئلہ، خیر و شر کا مسئلہ، یہ مسئلہ کہ انسان کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں، اس کا جینے کا نصب العین کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں، ان باتوں کا سائنس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سب باتیں مذہب کے احاطے میں آتی ہیں۔ قابل مشاہدہ کائنات کی بہتر سے بہتر تفہیم اور یوں کائنات کی تسخیر کے لئے انسانی عقل کے ہاتھ میں جتنے بھی ہتھیار ہیں' ان میں سے ایک سائنس بھی ہے اور سائنس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مذہب اسلام کے نقطہ نظر سے مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ بہتر سے بہتر روحانی اور معاشرتی زندگی کے لئے اس ہتھیار کو بہتر سے بہتر طریقے سے استعمال کرے اور استعمال کرنا چاہیے۔

(سوال نمبر ۴)

س: کیا ''دوسری دنیا'' کی تفہیم میں جذبہ کوئی کردار ادا کرتا ہے؟ کیا کائنات کے مذہبی ادراک میں فطرت، فن اور ادب کی محبت کی بھی کوئی اہمیت ہے؟

ج: جیسا کہ میں پہلے بھی واضح کر چکا ہوں' اسلام میں ''دوسری دنیا'' یعنی فوق الفطرت کا کوئی مفروضہ یا تصور سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اسلام کسی ''دوسری دنیا'' کو تسلیم نہیں کرتا۔ ہم مسلمانوں کے عقیدے میں ایک، صرف ایک حقیقت ہے۔ اس ''ایک'' حقیقت کی تفہیم کے کام میں شعوری ذہنی کاوش (مثلاً تجرباتی تحقیق یا ریاضیاتی حساب کتاب) نیز ابتدا میں بظاہر غیر مربوط نظر آنے والے مظاہر کے درمیان، اندرونی ربط ضبط کے ادراک میں وجدان وسعت و گیرائی پیدا کر سکتا ہے۔ مظاہر قدرت کے مشاہدے اور ان کے باہمی تعلق پر غور و خوض کی دعوت قرآن مجید بار بار دیتا ہے۔ دن اور رات کے باری باری آنے جانے میں، ہواؤں کا راستہ، سمندر کا مد و جزر، ستاروں کے مداروں کی زبردست مطابقت، درخت پر ایک نئی کونپل کا ظہور، انسان اور جانور کے جسم کا ارتقا تخم سے لے کر جوانی تک، نر اور مادہ کے ملاپ سے ایک بالکل نئی زندہ چیز کا وجود میں آ جانا، رحم مادر میں جنین کا تدریجی ارتقا، انسانی ذہن کی لامحدود تخلیقی

Marfat.com

قوت اور عقل کا اختیار تمیزی، اچھے برے کی شناخت اور تفریق۔قرآن مجید میں غور وفکر اور تدبر کی بار بار تاکید کی گئی ہے، با قاعدہ ہدایات نازل ہوئی ہیں کہ حق اور باطل میں کیونکر تمیز کرنی چاہیے اور ایمان کی طرف لے جانے والا سچا راستہ کون سا ہے۔ہمیں بار بار دعوت عمل دی جاتی ہے کہ ہم اپنی ذہنی قابلیت کا بہترین استعمال کریں اللہ کی قابل مشاہدہ، مرئی کائنات کا مشاہدہ کریں اور اس پر غور وفکر کریں اور نا قابل مشاہدہ، غیر مرئی کائنات پر تدبر کریں اور یہ کہ اپنے اور دوسروں کے جذباتی محرکات کو بھی سمجھنے کی کوشش کریں۔دوسرے مذاہب تو یہ تلقین کرتے ہیں کہ ''عقیدہ پیدا کرو کیونکہ اپنے عقیدے کی وساطت ہی سے تم صداقت کو پاسکو گے۔'' اس کے برعکس اسلام کی ہدایت یہ ہے: ''غور کرو، کیونکہ تمہاری عقل ہی تمہارے عقیدے کی طرف رہنمائی کرے گی۔'' نقطہ نظر اور طریق کار کا یہ اختلاف اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ قرآن جن روحانی صداقتوں کی بات کرتا ہے' ان کا دوسرے مذاہب کی طلسماتی دنیا اور انتہائی پیچیدہ اور نا قابل فہم عقائد سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔اس کے برعکس قرآن کی تعلیم انسانی ذہن کے لئے بالکل صاف، سیدھی اور سادہ فہم ہے' خواہ یہ بذریعہ وجدان حاصل کی جائے یا بذریعہ منطق واستدلال۔یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وجدان کا تعلق اکثر و بیشتر جذبے سے رہتا ہے جس کا اظہار بجا طور پر شاعری، ادب اور فنون لطیفہ میں ہوتا رہتا ہے' لیکن یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ قرآن نے بالواسطہ ہمیں تاکید کر رکھی ہے کہ مذہبی وقوف وآگہی کی جستجو میں جذبے کو ہیجانی سہارے کے طور پر استعمال نہیں کرنا چاہیے۔اگر خود کو فریب دینا مقصود نہیں تو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جذبہ شعور کا رہنما نہیں ہے بلکہ شعور کی پیداوار ہے۔

(سوال نمبر ۵)

س: کیا ''دوسری دنیا'' کا شعور تصوف اور متصوفانہ واردات سے حاصل ہوسکتا ہے؟ کیا یہ علم مراقبے سے حاصل ہوسکتا ہے؟ کیا جسے اپنے نفس کی گہرائیوں میں ڈوب جانا کہتے ہیں۔اس سے صرف اپنی شخصیت وکردار کو تشکیل دینے والے صرف چند نفسیاتی عوامل کی تفہیم پیدا ہوتی ہے' اس سے زیادہ کچھ نہیں؟

ج: قرآن حکیم نے صاف صاف لفظوں میں واضح کر رکھا ہے کہ یقیناً حقیقت کے ادراک میں متصوفانہ واردات سے وسعت اور گہرائی پیدا کی جاسکتی ہے۔بالفاظ دیگر وجدان کے ذریعے ذات باری تعالیٰ سے اور نیز ان صداقتوں سے روحانی تعلق پیدا کیا جاسکتا ہے جو ہمارے خودکار نظام مدرکہ پر خود بخود وا نہیں ہوتیں' اور نہ جو پوری طرح تجزیاتی تفکر کے احاطے میں آتی ہیں۔اس ضمن میں اسلام اور دوسرے بڑے مذاہب کے نظریوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔تصوف کی روحانی واردات وکیفیات کی اثر پذیری کے بارے میں سب مذاہب کی رائے مشترک ہے۔جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر مثال میں اثر پذیری کا انحصار متعلقہ صوفی کی ذاتی صلاحیت اور اس پر موقوف ہے کہ اس نے نفسی یا نفسیاتی مدارج یا مخصوص اصطلاح میں منازل سلوک کیونکر طے کئے ہیں تو پھر یوں کہا جاسکتا ہے کہ اسلام اس مشق کے

Marfat.com

بارے میں خاموش ہے کہ حقیقت مطلقہ سے روحانی روابط کیونکر قائم اور برقرار رکھا جائے۔ البتہ اسلام نے ایک نکتے پر واضح ہدایت جاری کر رکھی ہے اور وہ بھی نواہی کی صورت میں۔ وہ یہ کہ اسلام نے نفی ذات' ترک دنیا اور رہبانیت کی سخت ممانعت کی ہے' خواہ اس کی کوئی بھی صورت ہو۔ حدیث رسولؐ ہمیں یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ ''اسلام میں رہبانیت نہیں۔'' گویا دوسرے بعض مذاہب میں ترک دنیا اور تجرد کی جو روحانی خوبیاں بتائی گئی ہیں' اسلام ان سے انکار کرتا ہے۔ اسلام کے تمام مکاتب فکر اس حدیث پر عمل کرتے ہیں اور اس میں جو درس پنہاں ہے' اسے عقیدے کا اٹل اصول گردانتے ہیں۔ اسلام کے نقطہ نظر سے زندگی' پوری کی پوری زندگی، روحانی، جسمانی، ذہنی، حسی زندگی، اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان ہے اور اس لئے لازماً مثبت ہے۔ ایسے مثبت نقطہ نظر کی موجودگی میں ترک دنیا اور نفی ذات کا ہر اقدام اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کفران ہوگا اور یوں اس کے منصب تخلیق کی کھلی خلاف ورزی۔

(سوال نمبر ۶)

س: کیا ''دوسری دنیا'' کی وضاحت ہماری دنیا کے تصورات سے ہوسکتی ہے؟ کیا خدا کے تصور کا مطلب ایک ''ہستی'' جیسے کہ ہماری دنیا میں شخص یا شخصیت' یا یہ ایک علامت ہے ایسی چیز کی جو ہماری تمام اصطلاحوں سے ماوراء ہے؟ وہ کون سے مذہبی ارشادات ہیں جن کا مطلب لفظی لینا چاہیے اور وہ کون سے مذہبی ارشادات ہیں جن کو استعاری، تشبیہی، تمثیلی، علامتی یا اسطوری مفہوم میں لینا چاہیے؟

ج: چونکہ حقیقت کے وہ پہلو یا گوشے جو انسانی شعور وادراک اور انسانی تجربے سے بلند ماروا ہیں' لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو انسانی تجربے سے پیدا ہونے والے تصورات میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کی سورہ آل عمران کی آیت 7 میں صاف صاف لفظوں میں وضاحت کردی گئی ہے۔ ''اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں، ایک محکمات جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری متشابہات۔ جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے' وہ فتنے کی تلاش میں متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔'' قرآن مجید کے بغور مطالعے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کے اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی رویوں سے متعلق قرآن کے احکام وارشادات ''محکمات'' کے زمرے میں آتے ہیں اور حقیقت کے وہ تمام پہلو اور گوشے جو انسان کے ادراک وتخیل سے باہر ہیں۔ ان کے حوالے تمثیل کے انداز میں دیئے گئے ہیں۔ اس زمرے میں اللہ کی ذات وصفات، فرشتوں کی ماہیت وطاقت، حیات بعد الموت، یوم آخرت، جنت دوزخ وغیرہ شامل ہیں۔ میری رائے میں محولہ بالا آیت کا صحیح مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک ''تمثیل'' کا صحیح مفہوم، اس کی غرض وغایت اور نوعیت وماہیت اچھی طرح نہ سمجھ لی جائے۔

تمثیل کا مطلب ہے' کسی ایسی چیز کا مجازی رنگ میں اظہار وابلاغ جو اس قدر پیچیدہ ہو کہ براہ راست اظہار،

Marfat.com

ابلاغ میں ادائے مطلب ممکن نہ ہو یا مشکل بہت ہو۔ مفصل مفروضات کے سلسلے میں گفتگو ہو تو سمجھ میں نہ آئے' اس لئے رمز و کنایے میں بات مثالوں کے ذریعے کی جائے۔ تمثیل کا یہ مطلب وجود باری تعالیٰ کے بارے میں اسلامی تصور میں بھی شامل ہے جیسا کہ سورہ انعام کی آیت 100 میں کہا گیا ہے۔ ''اللہ پاک اور بالاتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔'' یہی وجہ ہے کہ اللہ کو انسانی زبان کے مفہوم میں لفظ ''شخص'' کے ساتھ متشخص کر کے محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس ناممکن بات کو واضح کرنے کے لئے اللہ قرآن میں، بسا اوقات ایک ہی آیت میں صیغہ واحد متکلم (میں)، صیغہ جمع متکلم (ہم) اور صیغہ واحد غائب (وہ) میں کلام کرتا ہے اور اسی نسبت سے فعل کی حالت بھی ماضی، حال اور مستقبل میں ظاہر کی جاتی ہے۔ اعلیٰ درجے کی فصاحت و بلاغت جو عربی زبان کا وصف خاص ہے' خصوصاً وہ عربی جو قرآن میں استعمال ہوئی ہے اور پھر شخصی ضمائر و افعال کا استعمال، ان دونوں چیزوں نے مل کر بڑے پُرزور، مدلل اور بالواسطہ انداز میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ اللہ حاضر و ناظر ہے' قائم و قیوم ہے، مطلق ہے، ابدی و ازلی ہے، لامکاں و لازماں ہے، نہ اس کا تصور کیا جا سکتا ہے، نہ وہ کسی تصور کے پیمانے میں سما سکتا ہے اور چونکہ وہ ناقابل تصور ہے اس لئے ناقابل بیان ہے۔

(سوال نمبر ۷)

س: کیا انسان تمام زندہ مخلوقات کی ارتقایافتہ مخلوق ہے اور حیوانات سے اسی مفہوم میں الگ ہے جس مفہوم میں حیوانات نباتات سے جدا ہیں یا انسان کوئی فوق الفطری مخلوق ہے؟

ج: عربی زبان کے لسانی محاورے میں اور یوں گویا اسلامی عقیدے کے لحاظ سے بھی جو عربی زبان ہی میں ظاہر ہوا ہے' انسان زندہ اشیا کے اس گروہ سے متعلق ہونے کی بنا پر ''حیوان'' ہے جو حواس، قدرت مدرکہ اور نقل و حرکت کی خصوصیات رکھتی ہیں، نیز انسان دوسرے حیوانات کی مانند جسمانی ضروریات و وظائف سے متصف ہے لیکن ایک وصف ایسا ہے جو انسان کو دوسرے حیوانات سے منفرد و ممتاز کرتا ہے اور وہ ہے عقل و شعور، بلکہ ''عقلی شعور'' کہنا زیادہ موزوں ہوگا' یعنی تصورات قائم کرنے اور پھر ان کے درمیان سوسو طریقوں سے اپنی مرضی و ارادے کی ذہنی کاوش سے روابط قائم کرنے کی قابلیت۔ انسانی فطرت کی اس غیر معمولی قابلیت کی وضاحت سورۃ بقرہ میں آدم اور فرشتوں کے قصے میں بڑی عمدگی سے ہوئی ہے۔ اہم اور قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ یہاں لفظ ''آدم'' محض ایک شخص نہیں بلکہ بہ حیثیت مجموعی پوری انسانیت کا ترجمان ہے۔ اس تمثیل میں اللہ فرشتوں پر یہ ظاہر و ثابت کر دیتا ہے کہ آدم کو کم از کم ایک اعتبار سے ان پر برتری حاصل ہے اور وہ یہ کہ آدم کو ''علم الاسما'' حاصل ہے یعنی وہ چیزوں کے نام (اسم) رکھنا جانتا ہے جبکہ فرشتوں کو یہ قابلیت حاصل نہیں ہے۔ عربی زبان کے تمام ماہرین لسانیات اس پر متفق الرائے ہیں کہ اصطلاح ''اسم'' کا لفظی مطلب ہے کسی چیز سے متعلق علم کا ابلاغ، خواہ وہ چیز مطلق ہو یا مجرد۔ اسم کسی چیز کے خصائص و اوصاف کی

Marfat.com

دوسری چیز سے منسوب نہیں ہو سکتے۔ (کرسی کے خصائص اور ہیں، تربوز کے اور)۔ گویا اسم یہاں تصور کے مترادف ہے۔ اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ "چیزوں کا نام رکھنے" کی قابلیت، استعارہ ہے اس حقیقت کا کہ انسان کو منطق اور تصوری اصطلاحوں میں سوچنے کی خداداد قابلیت حاصل ہے۔ دوسری مخلوقات کے مقابلے میں انسان کو یہ خاص قابلیت ایسی حاصل ہے، جس کی بنیاد پر وہ علت سے معلول کی طرف استدلال کرتے ہوئے اپنے کسی عمل کے عواقب ونتائج کا تصور کر سکتا ہے اور یوں ہر صورت حال میں کسی عمل سے متعلق جو مختلف امکانات کھلے ہوتے ہیں' ان میں سے کسی ایک کا شعوری "انتخاب" کر سکتا ہے۔ شعوری انتخاب کی آزادی کا دوسرا مطلب ہوا، ارادے کی آزادی، جبر کے مقابلے میں کسی قدر اختیار رکھنے کی قابلیت، یعنی خالص حیوانی جبلتوں اور محرکات سے آزاد ہو جانے کی قابلیت کا مطلب ہوا "اخلاقی ذمہ داری" محسوس کرنا۔ ارادے کی آزادی کے ساتھ ساتھ اخلاقی ذمہ داری محسوس کرنا، یہ دو ایسے بنیادی اور قدرتی عوامل انسانی وجود کے ساتھ لگے ہوئے ہیں جو اسے دوسرے حیوانات کے مقابلے میں منفرد وممتاز قرار دیتے ہیں۔

(سوال نمبر ۸)

س: کیا جس چیز کو انسان کی "روح" کہا جاتا ہے' وہ انسان کے جسم سے جدا کوئی چیز ہے یا روح محض مخصوص عضویاتی افعال کے اظہار کا ایک وظیفہ ہے؟

ج: قرآن میں کسی ایک مقام پر بھی انسان کی "روح" کو اس کے حیاتیاتی وجود سے الگ قرار نہیں دیا گیا۔ عربی زبان کا ایک لفظ "نفس" ہے جس کا ترجمہ غلطی یا غلط فہمی سے "روح" یا "سپرٹ" کر لیا جاتا ہے۔ "نفس" تمام زندہ و محسوس اشیا میں صرف جوہر حیات ہی کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ہر زندہ شے کا "انفرادی تشخص" بھی نفس سے طے پاتا ہے۔ انسان کے حوالے سے "نفس" کا مطلب ہے شخص یا خودی یا بالفاظ دیگر "انسانی شخصیت" کی وحدت کلی، انسانی شخصیت کی وحدت کلی میں تمام چیزیں شامل ہیں۔ اس کا جسم اور جسمانی خصوصیات، اس کا ذہن اور مخصوص ذہنی قابلیتیں، اس کا کردار، اس کے مخصوص مزاج اور وہ خاص، ناقابل تشریح چیز جو جسم میں زندگی کی لہر دوڑاتی ہے اور جسے قرآن حکیم میں کہیں کہیں لفظ "روح" سے تعبیر کیا گیا ہے (حالانکہ قرآنی مفہوم میں لفظ روح سپرٹ کا مترادف نہیں ہے بلکہ ربانی تحریک اور الہام کے مترادف ہے)۔ سچ پوچھیے تو خواہ کوئی بھی اصطلاح استعمال کی جائے، روح اور جسم کا باہمی اندرونی تعلق ہماری قوت ادراک سے باہر ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر ذہن نشین رہنا چاہیے کہ اسلام میں روح اور جسم کی دوئی یا کسی قسم کے عملی یا نظری تصادم کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اسلام کا تصور تو یہ ہے کہ روح اور بدن کے امتزاج سے انسانی شخصیت وجود میں آتی اور برقرار رہتی ہے۔

Marfat.com

(سوال نمبر ۹)

س: کیا انسانی شخصیت غیر فانی ہے؟ کیا موت کے بعد زندگی کا قیاسی تسلسل انسانی شخصیت کے لئے ایک نئے مرحلے پر، نئے عوامل وعناصر کے ساتھ، مزید ارتقاء ہے؟ کیا ایک شخص کسی نہ کسی شکل میں اپنی پیدائش سے پہلے بھی زندہ تھا؟ جسمانی موت کے بعد تسلسل حیات کا عقیدہ ہماری سمجھ میں کیونکر آ سکتا ہے؟

ج: قرآن مجید کی کسی آیت میں بھی ہمیں انسان کے لافانی ہونے کی خبر نہیں ملتی۔ انسان کی لافانیت کو خود فریبی ہی کہا جا سکتا ہے۔ صرف اللہ کی ذات لافانی اور ابدی ہے۔ اس کے عین منشا اور حکم کے مطابق اس کی تمام مخلوقات عارضی ہیں' فانی ہیں اور جلد یا بدیر ان کو فنا ہونا ہے۔ تاہم قرآن حکیم میں موت کے بعد زندگی کے تسلسل کا ذکر بار بار آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جسم کی موت انسانی وجود کا خاتمہ نہیں ہے۔ بلکہ غیر معینہ مدت کے لئے ایک نئے مرحلے کا آغاز ہے۔ زندگی کے اس آغاز کو قرآن میں ''یوم الدین'' (حشر) کہا گیا ہے یعنی پوری کی پوری انسانی شخصیت کی بحالی، جس کی وضاحت میں پچھلے سوال کے جواب میں کر چکا ہوں۔ البتہ یہ تصور کرنا اور بیان کرنا ممکن نہیں کہ بحال شدہ شخصیت کس طرح کی ہوگی۔ یوم الدین پر جب شخص دوبارہ زندہ ہو جائے گا تو اس کی حیات نو کی صورت کیا ہوگی۔ اس کا تصور محال ہے۔ ہماری حیات بعد الموت کے سلسلے میں قرآن میں جتنے بھی حوالے آئے ہیں' وہ سب تمثیلی اسلوب میں بیان ہوئے ہیں۔ ایسا ہونا ناگزیر بھی ہے کیونکہ تمثیلی اسلوب کا سادہ مطلب یہ ہے کہ وہ تمام حوالے ہم تک انسانی زبان کے ذریعے پہنچے ہیں اور ان تصورات کی اساس پر منضبط ہوئے ہیں جو ہماری موجودہ زندگی میں انسانی تجربات سے وضع ہوئے ہیں' البتہ ہماری حیات بعد الموت کے بارے میں ایک پہلو ایسا ہے جس میں قرآن نے بار بار زور دیا ہے اور وہ ہے ''انفرادی شعور'' کا غیر منقطع تسلسل۔ انفرادی شعور کے متواتر تسلسل میں ذرا سا بھی وقفہ نہیں آتا۔ موت سے پہلے نہ موت کے بعد۔ قرآن میں بار بار وعید آئی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کی تقدیر ہے کہ موت کے بعد بھی ہماری ''شخصیت'' کا تسلسل یعنی شعور کا تسلسل جاری وساری رہے گا اور گویا نئی زندگی میں گذشتہ اعمال کی اخلاقی ذمہ داری بھی قبول کرنی ہوگی۔ اس نئے مرحلے پر شعور کا یہ تسلسل اپنے ساتھ ہماری قوت مدرکہ میں بھی لاانتہا وسعت پیدا کرے گا' جس کے نتیجے میں ہمارے احساس ذمہ داری میں بھی لاانتہا وسعت پیدا ہوگی اور ہمیں موت سے پہلے کی زندگی کے تمام اعمال کی ذمہ داری بہرحال قبول کرنی ہوگی۔ اس سیاق میں زندگی کے نئے مرحلے میں انسان کی خوشی یا غم کو قرآن میں جنت اور دوزخ کی علامتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ جنت اور دوزخ کی علامتوں کا مفہوم جزا وسزا کے عام اور روایتی مفہوم سے بالکل مختلف اور ماوراء ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یوم الدین کے بعد انسان کی حالت پچھلی زندگی کے صحیح یا غلط اعمال کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کیا زندگی کے اس نئے مرحلے پر انسانی ارتقا کی خاطر مزید مقاصد پیدا کیے جائیں گے تو اس سوال کا جواب ہم صرف اسی وقت دے سکیں گے جب یوم الدین کے موقع پر ہمیں نئی روحانی بصیرتیں حاصل ہوں گی۔

Marfat.com

(سوال نمبر۱۰)

س: انسان کی نجات کس چیز میں ہے؟ کیا اس کے قدرتی افتاد مزاج کی ممکنہ اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی و تکمیل میں؟ یا کیا وقت اور ماحول نے اس کے اخلاق و ضمیر پر جو کام لا دیئے ہیں ان کی بہترین بجا آوری میں؟ یا کیا ایسے اوصاف حمیدہ اور ذہنی قابلیتوں کے کسب کمال میں جن کے باعث وہ حیات بعد الموت کے لئے پوری طرح تیار ہو سکے؟ یا اس چیز کی مسلسل جستجو میں کہ دوسرے مذاہب میں انسان کی مکتی کے لئے کیا کچھ کہا گیا ہے؟ یا اپنی پوری زندگی صرف اپنے مذہب کے اخلاقی تقاضوں کے مطابق گزارنے میں؟

ج: اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں نجات کے مسئلے سے متعلق اسلام کے دو بنیادی اصولوں کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ اول یہ کہ عیسائیت میں ''گناہ اول'' کا جو تصور ہے اسلام کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اسلام نے ''گناہ اول'' کے تصور کو یکسر مسترد کر دیا ہے۔ اسلام کے نزدیک ہر شخص صرف اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، اپنے باپ دادا کے گناہوں کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اس موضوع پر قرآن مجید میں متعدد آیات ہیں، مثلاً:

سورہ انعام کی آیت ۱۶۴: ''ہر شخص جو کچھ کرتا ہے، اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔''

سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۵: ''جو کوئی راہ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے اپنے ہی لئے مفید ہے اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔''

سورہ فاطر آیت ۱۸: ''کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور اگر کوئی لدا ہوا نفس اپنا بوجھ اٹھانے کے لئے پکارے گا تو اس کے بار کا ایک ادنیٰ حصہ بھی بٹانے کے لئے کوئی نہ آئے گا، خواہ وہ قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔''

سورہ زمر کی آیت ۷: ''انسان پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتا ہے پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نواز دیتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے۔''

یا مثلاً سورہ نجم کی آیت ۳۸: ''کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کے لئے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے۔''

اسلام میں انسان کی نجات کا انحصار ''کفارے'' پر نہیں ہے جو کہ عیسائیت کے بنیادی عقائد میں سے ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے تمام عیسائیوں کے گناہوں کا بوجھ اپنے سر مول لے کر گویا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ اسلام میں ضمیر کے داغ اور گناہوں کی سیاہی مٹانے کا یہ انداز نہیں ہے۔

اسلام کا دوسرا بنیادی اصول جس کی طرف میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسلام میں روح اور جسم کی ثنویت نہیں ہے یعنی دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی کل کے دو اجزا ہیں۔ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

Marfat.com

اسلام کے نزدیک روح اور جسم کے درمیان کوئی کشمکش اور تصادم نہیں ہے جبکہ عیسائیت کے نزدیک روح وجسم کی کشمکش ہی نام نہاد "اصلی گناہ" کی بنیاد بنی تھی۔ اسلام کے نقطہ نظر سے روح اور جسم انسانی فطرت کے دو مادی اور مثبت عوامل ہیں جن کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ عیسائیت کے نزدیک "نجات" رہبانیت میں ہے، جسم کے جائز مطالبات اور تقاضوں سے منہ موڑنے میں ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں جسم کے جائز مطالبات اور تقاضوں کا پورا کیا جانا ضروری ہے لیکن روح کے تقاضوں اور ضمیر کے مطالبوں کے مطابق۔

اسلام کے ان دو بنیادی اصولوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے نقطہ نظر سے "نجات"، روح اور جسم کی یکجائی میں، خیال وعمل کی وحدت میں، عدل یا معروف کی طرف رجحان رکھنے اور اس پر صدق دلی سے عمل کرنے میں ہے۔ اپنی رضا کو اللہ کی رضا میں جذب کرنے میں ہے۔ اپنی خداداد اچھی اور مثبت قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے میں ہے۔ دوسروں کی اخلاقی ترقی میں مدد دینے میں ہے، ان کے حقوق کا تحفظ کرنے میں ہے، ان کے معاشرتی حالات سدھارنے کے لئے مسلسل کوشش کرنے میں ہے۔ جو شخص یا عورت یا تقاضے پورے کرتا ہے، وہ گویا اسلامی مفہوم میں "نجات" حاصل کر لیتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ اسلام صرف عقیدے کو بنیادی قدر قرار نہیں دیتا بلکہ عقیدے کے ساتھ ساتھ اعمال صالحہ پر بھی یکساں زور دیتا ہے۔ قرآن مجید اہل ایمان سے کہتا ہے کہ وہ جسمانی طور پر اور روحانی طور پر، انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر اخلاقی انداز میں بھرپور زندگی بسر کریں۔ بالفاظ دیگر اسلام میں مذہبی صداقتوں کا وقوف مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ موجودہ زندگی میں اخلاقی طور پر اچھائی اور مثبت کے حصول اور آخرت میں مسرت کے حصول کا ایک وسیلہ ہے۔

(سوال نمبر ۱۱)

س: انسان کی روحانی ترقی میں غم اور خوشی کی اہمیت کیا ہے؟ کیا اسے اپنی ذات کے لئے اور دوسروں کے لئے خوشحال زندگی حاصل کرنے کے لئے دکھوں، مصیبتوں اور غموں کو ہنسی خوشی قبول کرتے ہوئے کوشش کرتے رہنا چاہیے، یہ جانتے ہوئے کہ انسانی حالت کی عدم تکمیل کے باعث دکھ اور غم ناگزیر ہیں؟ یا اپنی شخصیت کی آزمائش اور پاکیزگی کی خاطر غموں اور دکھوں کو آنے سے نہیں روکنا چاہیے اور اگر وہ پہلے سے موجود ہیں تو ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے؟

ج: اگر ہم یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اسلام کے لفظی معنی ہیں اللہ کے روبرو خود سپردگی تو ہمیں یقیناً یہ بھی محسوس و معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کے نقطہ نظر سے خوشی وغمی کا براہ راست تعلق انسان کے اخلاقی نظام سے ہے۔ خوشی کو اپنے اعمال کا صلہ نہیں سمجھ لینا چاہیے بلکہ احساس تشکر کے ساتھ اسے غیر متوقع نعمت خداوندی خیال کرنا چاہیے۔ پوری پوری کوشش کرنی چاہیے کہ اپنی خوشی میں دوسروں کو بھی شریک کیا جائے۔ اگر غم آئیں تو ان کا صبر کے ساتھ، گلے شکوے کے

Marfat.com

بغیر یہ سمجھ کر برداشت کرنا چاہیے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہیں۔ پوری پوری کوشش کرنی چاہیے کہ دوسروں کو غموں سے چھٹکارا دلایا جائے۔خوشی اور غم، ان دونوں کے مطالبے اسلام کے اخلاقی تقاضے کا مطالبہ کرتے ہیں۔خوشی پر شکر اور غم میں صبر، یہ ہے اسلام کا اخلاقی تقاضا۔انسان کو خوشی حاصل کرنے کا حق پہنچتا ہے لیکن دوسروں کا حق چھیننے کی بنا پر نہیں۔ اسے اخلاقاً یہ بھی حق پہنچتا ہے کہ انسانیت کو پیش آمدہ دکھ اور غم اور مصائب دور کرنے کے لئے اپنی سی بہترین کوشش کرے۔اس اخلاقی فریضے کی اساس قرآن مجید کا یہ اصول ہے کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیاں ہمیشہ اصلاح کا تقاضا کرتی ہیں۔ اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ذہن وجسم کو جن صلاحیتوں اور خوبیوں سے نواز رکھا ہے' ان کو بہترین عمل کے لئے مجتمع کر دیں۔ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام نے بڑی سختی سے نفی ذات، ترک دنیا اور رہبانیت کی ممانعت کی ہے اور دوسروں کے دکھوں اور غموں کو دیکھ کر منہ موڑنے کے رجحان کو مسترد کر دیا ہے۔

مختصر یہ کہ جب غم ناگزیر ہو جائے تو اسے صبر کے ساتھ برداشت کرنا چاہیے۔ جب یہ بہت ضروری ہو جائے کہ فرد جماعت کی خاطر تکلیف اٹھائے تو اسے ہنسی خوشی یہ تکلیف اٹھانی چاہیے لیکن کسی شخص کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ تکلیف اٹھانے کے لئے پیدا کرے۔اسلام میں غم برائے غم کا فلسفہ مطلوب ہے نہ پسندیدہ۔

(سوال نمبر۱۲)

س: کیا تاریخ انسانیت میں کوئی ''ترقی'' واقعی صحیح معنی میں کبھی ہوئی ہے؟ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے پہلو بہ پہلو انسانیت اور حکمت و دانش میں بھی کوئی ترقی نظر آتی ہے؟

ج: سائنس کے اوراق شاہد ہیں اور قرآن مجید نے بھی صاف اور واضح اشارے دیئے ہیں کہ نوع انسانی اخلاقی حکمت و دانش کے میدان میں ''اجتماعی ترقی'' کا مظاہرہ نہیں کرتی۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ نوع انسانی افراد کا اجتماع ہے' یہ کوئی روحانی مرکب نہیں ہے۔ ہر طرح کی معاشرتی اصلاح و ترقی جو بھی ہوتی ہے' وہ تجرباتی عمل کی مرہون منت ہے۔ظاہر ہے کہ تجربوں کے ذریعے حاصل شدہ اجتماعی علم جو سائنس ٹیکنالوجی اور نظم ونسق کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے' وہ روز افزوں ترقی حاصل کر رہا ہے کیونکہ اس کے اجزا وعناصر ایک دوسرے تک آسانی سے منتقل ہو سکتے ہیں اور آسان نقل پذیری کی وجہ سے بے شمار افراد کی فکر، قول اور فعل میں بڑی تیزی سے مجتمع ہو رہے ہیں۔ روحانیات اور اخلاقیات کے شعبوں میں ترقی کا منظر نامہ بالکل مختلف نوعیت کا ہے۔ یہاں ترقی کا دارومدار ہر فرد کے احساس وارادے پر ہوتا ہے۔اس ترقی کے اجزا وعوامل کو نہ تو ایک فرد سے دوسرے فرد میں براہ راست منتقل کیا جا سکتا ہے اور نہ اس ترکیب سے مجتمع کیا جا سکتا ہے کہ وہ نوع انسانی کی ''اجتماعی ملکیت'' بن جائیں۔ ہاں اگر روحانی تجربات کا اظہار وابلاغ ہو تو ہم ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر صحائف، جن میں قرآن مجید بھی شامل ہے پیغمبروں کی روحانی بصیرت کا حوالہ اکثر دیا گیا ہے۔اس سلسلے میں یہ امر ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ایک فرد کے روحانی

Marfat.com

تجربات کے محض اظہار وابلاغ سے دوسرے فرد کو چنداں فائدہ نہیں پہنچتا' تا وقتیکہ دوسرا فرد پہلے فرد کے "زیر اثر" نہ ہو۔ بالفاظ دیگر اللہ کے برگزیدہ پیغمبروں حضرت ابرہیمؑ، حضرت موسیٰؑ' حضرت عیسیٰؑ یا حضرت محمد ﷺ کے خیالات و محسوسات ہمارے اپنے خیالات ومحسوسات اور اعمال پر یقیناً اثر انداز ہو سکتے ہیں اور چونکہ ایک شخص کے واردات روحانی بھی دوسرے شخص کی طرف منتقل نہیں کیے جاسکتے' اس لئے ان سے اجتماعی طور پر بھی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا جیسا کہ تجرباتی علوم سے اٹھایا جاتا ہے۔ البتہ وقت کے ساتھ ساتھ روحانی واردات کو دوسرے افراد کے رشد و ہدایت کے لئے مفید مطلب بنایا جاسکتا ہے۔ پس روحانی واخلاقی ترقی کی بات ہمیشہ "افراد انسانی" کے حوالے سے تو ہو سکتی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی "نوع انسانی" کے حوالے سے نہیں ہو سکتی۔

(۲) مذاہب کا باہمی تعلق

(سوال نمبر ۱۳)

س: کیا تمام مذاہب کے اصول واحکام مبنی بر صداقت ہیں؟ کیا بعض مذاہب کم وبیش سچے ہیں؟ کیا صرف ایک مذہب سچا اور باقی سب جھوٹے ہو سکتے ہیں؟ مذہب اور دین میں کیا فرق ہے؟

ج: اسلامی عقیدے کی رو سے جس موضوع کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے' وہ ہے وحی کا تسلسل اور وحی کی مختلف شکلوں اور صورتوں میں اندرونی تعلق باہمی۔ قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ نے امتداد زمانہ کے مطابق ہر قوم یا تہذیب میں پیغمبر پیدا کیے ہیں۔ یہ پیغمبر ایک ہی بنیادی صداقت کی تبلیغ کرتے رہے ہیں' یہ کہ اللہ ایک ہے۔ اس کی ربوبیت میں کوئی شریک نہیں اور یہ کہ انسان اس کے روبرو اپنے تمام اعمال اور شعوری کاوشوں کے لئے ذمے دار اور جوابدہ ہے۔ اکثر پیغمبروں کا قرآن میں نام لے کر ذکر کیا گیا ہے لیکن ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی بے شمار پیغمبر اور نبی ہو گزرے ہیں۔ قرآن مجید میں جن پیغمبروں کا نام آیا ہے اور جن کا ذکر بائبل میں بھی آیا ہے اور جن میں سے حضرت ابرہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تمام مذکورہ پیغمبروں کے پہلو بہ پہلو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی ضرور آیا ہے۔ ان تمام پیغمبروں کی تعلیمات کا مقصد ومنشا ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب ایک، صرف ایک عقیدہ رکھتے تھے۔ جبکہ قرآن مجید میں سورۂ مائدہ کی آیت 48 میں قدرے مختلف انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ "ہم نے تم (انسانوں) میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی اگر چہ تمہارا خدا چاہتا تو سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا لیکن اس نے یہ اس لئے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ پھر وہ تمہیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔" اس آیت کی تشریح یہ ہے کہ اللہ کے تمام پیغمبروں نے جن ابدی صداقتوں کی تبلیغ کی' وہ اگرچہ ایک ہی تھیں لیکن

Marfat.com

ان کے پیغامات میں جو فرق تھا وہ ان قوانین وضوابط کا تھا جو ان کے عہد میں وضع کیے گئے۔ لہٰذا ہر قوم کی ''راہ عمل'' دوسری قوموں سے الگ اور مختلف رہی۔ قوانین وضوابط میں فرق کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر وقت اور عہد کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں اور ہر قوم یا تہذیب کی معاشرتی ترقی کسی مرحلے پر تھی' یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے۔ بالآخر انسانی عقلی و ذہنی تیاری کے اس مرحلے پر پہنچ گئی جب وحی الٰہی کے عالمگیر نظام کو سمجھنے اور قبول کرنے کی اہلیت پیدا ہو گئی۔ وحی الٰہی کے عالمگیر نظام سے مراد ایسے تمام احکام الٰہی ہیں جو تمام وقتوں اور تمام حالات کے لئے موزوں ہوں۔ اس بات میں یہ قابل تردید حقیقت بھی شامل کر لیجئے کہ تمام سابقہ مقدس صحائف میں خاصی اور دانستہ تحریفیں ہوئی ہیں۔ ایک سبب یہ بھی ہوا قرآن کے نزول کا۔ چونکہ قرآن کی تعلیمات عالمگیر ہیں' تمام انسانوں کے لئے ہیں، تمام زمانوں کے لئے ہیں اس لئے یہ تمام وحی الٰہی کا نقطۂ عروج ہے اور اسی لئے قرآن انسان کی روحانی اور معاشرتی تکمیل کا مکمل ضابطہ ہے اور چونکہ وہ پیغام الٰہی جو محمدؐ کی وساطت سے نازل و نافذ ہوا' اس میں آج تک کوئی تحریف ہوئی ہے نہ کبھی ہو گی اس لئے جیسا کہ قرآن نے خود کہہ دیا محمدؐ ''خاتم النبیین'' ہیں۔ قرآن اور قرآن لانے والے رسولؐ کی یہ لاثانی انفرادیت اس حقیقت سے متصادم نہیں ہے کہ بعض ابدی صداقتیں سابقہ مذاہب میں بھی قائم و برقرار رہی ہیں اور ان مذاہب کے مخلص پیروکاروں کو قرآن مجید کی اصطلاح میں نیکوکار کہنا چاہیے بشرطیکہ وہ صدق دلی سے اس امر پر ایمان رکھتے ہوں کہ اللہ ایک ہے۔ اس سے کوئی پیدا ہوا ہے نہ کوئی اس سے پیدا ہو گا اور یہ کہ وہ اس کے روبرو اپنے اعمال کی ذمہ داری اور جوابدہی پوری طرح محسوس کرتے ہوں اور اپنے مذہب کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہوں۔ اس نکتے پر قرآن مجید نے کافی زور دیا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ کی آیت ۶۲ کا ترجمہ: ''یقین جانو کہ نبی عربی کو ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی جو بھی اللہ اور روز آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا' اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لئے خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔''

(سوال نمبر ۱۴)

س: کیا کسی مذہب کی روح کے وقوف کا انحصار فرد کی ذہنی یا اخلاقی پختگی پر ہے؟ کیا دنیا اور زندگی کے بارے میں مذہبی شعور کا مطلب اس شخص کا ایک خاص رویہ اور خاص دانشوری ہے؟ کیا کوئی ایسا مذہب بھی ہے جسے تمام انسانوں اور تمام وقتوں کے لئے سچا قرار دیا جا سکے؟

ج: جیسا کہ میں نے پچھلے سوال کے جواب میں وضاحت کر دی ہے کہ قرآن صرف عقیدۂ توحید کو تسلیم کرتا ہے اور مذہبی مفہوم میں یہی قابل قبول عقیدہ ہے۔ قرآن مجید میں بار بار تاکید کی گئی ہے کہ اس بنیادی صداقت کا وقوف ہر بالغ اور ذہنی طور پر پختہ انسان کے لئے کھلا ہے۔ پس اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک ذہنی طور پر سادہ شخص وجود باری تعالیٰ کے متعلق جو تصور قائم کرتا ہے' وہ کئی اعتبار سے فلسفی کے تصور سے لازماً مختلف ہوتا ہے۔ شرط ہے کہ سادہ لوح

Marfat.com

شخص اور فلسفی اپنی اپنی جگہ مخلص ہوں' ایسی صورت میں وجود باری تعالیٰ کے متعلق ان کے تصورات کا جوفرق ہے' وہ دراصل تصوراور علم کے مدارج کا فرق ہے۔ اس فرق کا ان کے عقیدے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ ان دونوں میں سے کس کا عقیدہ صحیح ہے اور کس کا غلط۔ صاحب ایمان فلسفی بلاشبہ اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرت کاملہ کے بارے میں اپنے ذاتی تصور کو تقویت دینے کے لئے اپنے فلسفیانہ افکار سے بھی مدد لے۔ مظاہر قدرت کے مشاہدے کو بھی بروئے کار لائے۔ تاریخ تعلیم یافتہ مومن کی سطح پر پوری اترتی ہیں۔ وہ بے شک تاریخ، نفسیات اور عمرانیات وغیرہ کے عقلی و ذہنی ذخیروں سے واقف نہ ہو۔ یقیناً اس کا عالمی نقطہ نظر کم علمی کی وجہ سے فلسفی کے نقطہ نظر کے مقابلے میں لازماً محدود ہوگا لیکن اپنی اصلیت اور سچائی میں وہ کسی بھی لحاظ سے فلسفی کے تصور سے کمتر نہیں ہوگا۔ پس یہ کہا جا سکتا ہے کہ فلسفی اور غیر تعلیم یافتہ شخص کا عقیدہ تکمیل اور جواز حاصل کر لیتا ہے۔ جونہی ان میں سے کوئی اپنے ذاتی تصور الٰہی کو اللہ واحد کے وجود سے مربوط اور ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ اس کا برعکس بھی درست ہے کہ اس طرح کے وقوف کے بغیر کوئی عقیدہ بھی قرآنی مفہوم میں سچا قرار دیا جا سکتا۔

(سوال نمبر ۱۵)

س: اگر واقعی کوئی مذہب ایسا ہے جس کے پاس صداقت مطلقہ ہے تو کیا وجہ ہے کہ تمام انسان اسے قبول نہیں کر لیتے؟

ج: بلاشبہ مذہب بہت ہیں لیکن مذہبی صداقت صرف ایک ہے کہ اللہ ایک' صرف ایک ہے جو اپنا آپ اپنی مخلوقات کے ذریعے سے بار بار ظاہر کرتا رہتا ہے اور اپنے منتخب برگزیدہ پیغمبروں کی وساطت سے بھی اپنا وجود نمایاں کرتا رہتا ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ تمام کے تمام انسان اس سادہ سی صداقت کو ماننے کے لئے نہ تو آمادہ ہیں' نہ آمادہ ہو سکتے ہیں' تو اس کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی بڑی وجہ یہ ہے کہ بے شمار لوگ اپنے آپ کو مطلق کے تصور کے آگے جھکانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ سادہ لفظوں میں یوں کہیے کہ وہ اپنی زندگیاں اخلاقی اور اصولی تقاضوں کے تابع کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، جو عام طور پر ایسے لوگوں کے مادی و سماجی مفادات سے متصادم ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ اپنے بچپن ہی سے بعض مؤثرات کے زیر اثر رہے ہوں۔ مثال کے طور پر بچپن میں ایسے مذہبی حقائق ورثے میں ملے ہوں جو عرصہ دراز پہلے اللہ کی وحدانیت کی بنیادی صداقت سے منحرف ہو چکے ہیں اور اب اپنے پیروکاروں کو بذریعہ تقلید مجبور کر رہے ہوں کہ ایسے کرشمہ ساز عقائد کی طلسماتی بھول بھلیاں میں محصور ہو کر رہ جائیں جو انسانی عقل سے ماورا ہیں اور جو ایک متلاشی ذہن کی تشفی نہیں کر سکتے۔ ایسی تقلیدی مذہبی تعلیمات بچپن میں اور جوانی میں اس قدر واضح اور پختہ ہو جاتی ہیں کہ کسی بھی مذہبی مسئلے پر آزادخیالی کے ساتھ غور و خوض کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اور آخری وجہ یہ ہے کہ جس طرح اکثر لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو موسیقی کا ذرا بھی ذوق نہیں ہوتا' اسی طرح بہت سے لوگ ایسے بھی

Marfat.com

ہوتے ہیں جن کے دل میں اپنی روحانی سچائیاں تلاش کرنے کی امنگ نہیں ہوتی اور ہمیشہ مادی، اقتصادی اور عملی پریشانیوں میں گھرے رہتے ہیں۔ایسے ہی لوگوں کے بارے میں سورہ بقرہ ۱۷۱ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:''یہ لوگ جنہوں نے خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے انکار کردیا ہے۔ان کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے۔یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں اس لئے کہ وہ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے۔''

(سوال نمبر ۱۶)

س: ایک ہی مذہب کے اندر مختلف فرقے اور مکاتب فکر کیوں اور کیونکر پیدا ہو جاتے ہیں؟ ایسے تفرقوں اور متفرق رجحانات کی موجودگی میں وہ خاص مذہب صداقت مطلقہ کا حامل ہونے کا دعویٰ کیونکر کرسکتا ہے؟

ج: ایک ہی مسئلے پر مختلف افراد مختلف انداز میں غور و فکر کرتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر مختلف حل دریافت کرتے ہیں۔اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ کسی مذہب کے مبنی بر صداقت ہونے کا دعویٰ باطل قرار دیا جائے۔اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہر صداقت کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۳ میں آیا ہے:''پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لے آئے، انہیں اللہ نے اپنے اذن سے اس حق کا راستہ دکھادیا جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست دکھادیتا ہے۔''اسی طرح مشہور حدیث نبوی ہے:''میری امت میں علماء کا اختلاف رائے اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔''

قرآن کی محولہ آیت اور اس کی تائید میں آنحضورؐ کی حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام انسانی خیالات میں اختلاف و تنوع ایک قدرتی اور ناگزیر امر ہے اور یہ کہ اس قسم کی تنوع اور گوناگونی کے بغیر انسان کی ذہنی ترقی ناممکن سی بات ہے۔اگر کوئی اور وجہ نہ ہو تو یہی ایک وجہ کافی ہے۔یہ بتانے کے لئے کہ کسی اصولی امر یا عقیدے کی''باوثوق تعبیر و تفسیر'' کی خاطر کوئی''چرچ'' جیسا ادارہ قائم کرنے کا تصور اسلام میں نہیں ہے۔اسلام کی پوری تاریخ میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا کہ جب دینی مسائل کے بارے میں انفرادی غور اور مکرر غور علمائے دین کے سامنے ایک زندہ مسئلہ نہ رہا ہو۔اس طرز فکر کا نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ اسلام میں متعدد مکاتب فکر وجود میں آگئے۔جب تک ان کے فکر کی اساس قرآن و حدیث رہیں گے، مذہبی نقطہ نظر سے ان کو سند جواز حاصل رہے گی۔قرآن و حدیث پر مبنی طرز فکر کا مطلب یہ ہے۔۔ بنیادی عقائد کے معاملے میں ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے اور نہ کرسکتے ہیں۔

Marfat.com

(سوال نمبر ۱۷)

س: کیا کسی شخص کا مذہبی رجحان طبع اور روحانی مزاج صرف اس صورت میں تسکین پا سکتا ہے کہ وہ کسی ایک مذہب کو قبول و اختیار کرے یا وہ اپنے مسائل کا انفرادی حل آزادانہ کسی بھی موجودہ مذہب کے مطالعے سے معلوم کر سکتا ہے؟ اور کیا کسی سچے عقیدے کے حصول کے لئے پہلے مذہبی مسائل کی عقلی تفہیم لازمی ہے؟

ج: جی ہاں، ایک خاص مفہوم میں اس سوال کا جواب لفظ ''اسلام'' کے معنی پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اسلام کے لفظی معنی ہیں ''خود سپردگی'' اور اصطلاحی معنی ہیں ''اللہ کے حضور مکمل سپردگی۔'' اللہ کے حضور سر تسلیم خم کر دینا۔ جونہی ہمیں یہ آگہی حاصل ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ واقعی وجود رکھتا ہے اور ہم اپنے عقائد اور اعمال دونوں کے لحاظ سے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں اور اپنی رضا کو اس کی رضا میں شامل کر دیتے ہیں تو گویا ہم نے زندگی کا مفہوم و منشا پالیا۔ ایسے افراد جن کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر نوازا ہو، گنتی کے چند ہوتے ہیں جو اپنے ذاتی وجدان کے بل پر روحانی و ذہنی کمال کسب کر لیتے ہیں۔ انسانوں کی زیادہ تعداد ایسی ہوتی ہے جو روح و ذہن کی تکمیل بغیر بیرونی امداد کے نہیں کر سکتے اور یہ بیرونی امداد نہیں وحی الٰہی کی صورت میں ملتی ہے جو صرف انبیائے کرام کو عطا ہوتی ہے۔ وجدان اور وحی کی یہ دوگونہ حقیقت ''حی بن یقظان'' کے فلسفیانہ رومان میں بڑے مؤثر انداز میں صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے جو بارہویں صدی عیسوی میں فلسفی ابن طفیل نے قلم بند کی تھی۔

(سوال نمبر ۱۸)

س: کیا ایک مذہبی جماعت کو ہمیشہ اپنے معاشرتی و سیاسی مراعات کے حصول کی کوشش کرتے رہنا چاہیے یا اپنی توجہ تبلیغ کا دائرہ ایک ایک فرد تک وسیع کرنے پر مبذول کرنی چاہیے تا کہ سچے پیروکاروں کی تعداد میں اضافہ ہو؟

ج: قرآن کی سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۶ میں ارشاد ہوا ہے: ''دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔'' اس کا سادہ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اسلام قبول کرتا ہے تو ایسا اسے اپنی رضا مندی، خوشنودی اور آزادی سے کرنا چاہیے۔ تمام فقہا اس امر پر متفق الرائے ہیں کہ بزور تبدیلی مذہب، ہر قسم کے حالات میں ناجائز اور ناروا ہے اور کسی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش بہت بڑا گناہ ہے۔ اس سے اس غلط فہمی کا بھی ازالہ ہو جانا چاہیے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ یہ امر بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ امت مسلمہ کو کسی بھی لحاظ سے یہ حق نہیں پہنچتا کہ اسلامی ریاست میں رہنے والی غیر مسلم اقلیتوں کے معاشرتی نظام یا ان کی مذہبی و ثقافتی آزادی کو گزند پہنچائے یا انہیں ان کے شہری حقوق سے محروم کرے۔ نبی کریمؐ نے یہ اصول مسلمانوں کے دلوں پر ہمیشہ کے لئے نقش کر رکھے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وقت کے گزران کے ساتھ ساتھ اسلامی فقہ کا ایک خاص شعبہ وجود میں آ گیا ہے جو غیر مسلم اقلیتوں کے

Marfat.com

حقوق کے تحفظ کے لئے وقف ہے لیکن چونکہ اسلام میں ''دین'' اور ''دنیا'' میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا' اس لئے اسلام اپنے حق کے طور پر ان ملکوں میں جہاں مسلمان بکثرت آباد ہیں، اپنا قانونی نظام نافذ کرنا چاہتا ہے اور اسلام کا قانونی نظام تقاضا کرتا ہے کہ غیر مسلم شہریوں کے جان و مال اور دوسرے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔

(سوال نمبر ۱۹)

س: یہ درست ہے کہ اپنے وقت پر مختلف مذاہب کے درمیان باہمی تعلقات پر مکالمہ بھی ہوگا اور تجزیہ بھی، بلکہ تمام مذاہب کی بالآخر یکجائی کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ کیا اس طرح کے اندازے سے ایک خاص مذہب کی جیت اور باقی مذاہب کی شکست ہونے کا احتمال ہے؟ موجودہ صورت حال کے سیاق میں، اس ضمن میں، کیا علامات و آثار ہیں؟

ج: اسلامی نقطہ نظر سے موحدانہ مذاہب کے درمیان مکالمہ ہمیشہ سے انتہائی پسندیدہ اور مطلوب رہا ہے تاکہ باہمی افہام و تفہیم کا راستہ مشترکہ عقیدے کے اصولوں کی بنیاد پر ہموار ہو سکے۔ سورہ عمران آیت 64 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے نبیؐ کہو! اہل کتاب، آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں۔''

اس اصول کی بنیاد پر ایک باہمی معاہدہ طے ہو جانے سے ہم مسلمانوں کے خیال میں تمام سچے عقیدوں کے ضروری تقاضے پورے ہو جائیں گے اور یوں انسانیت اس قابل ہو جائے گی کہ خالص مادہ پرستی کی قوتوں کی مزاحمت کر سکے۔ خواہ وہ مشرق سے ابھریں یا مغرب سے' اور جو انسان کی روح کی تباہی اور پوری دنیا کی بربادی کے لئے زبردست خطرہ بنی ہوئی ہیں۔ قرآن حکیم نے ہم مسلمانوں کو سختی سے منع کیا ہے کہ سابقہ انبیاء کی پوری پوری تکریم و تحریم میں کوئی کمی نہ رہنے پائے۔ اس طرح ہم مسلمان اپنے غیر مسلم بھائیوں سے یہ توقع کرنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ بھی رسول اللہ محمدؐ کے لئے تحریم و تکریم کے ایسے ہی جذبات کا مظاہرہ کریں گے۔ فرض کرو، اگر ان کے لئے آنحضور ﷺ کو اللہ کا پیغمبر تسلیم کرنا ممکن نہ ہو (جیسا کہ ہم مسلمان صدق دلی سے حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور بائبل میں مذکور دوسری مقدس اور سربرآوردہ ہستیوں کی نبوت کو تسلیم کرتے ہیں) تو کم از کم انہیں ایک محترم انسان خیال کر کے پوری عزت کرنی چاہیے۔ جونہی ہم مسلمانوں کا یہ سادہ سا مبنی بر عقل مطالبہ پورا کر دیا جائے گا تو تینوں بڑے موحدانہ مذاہب خود بخود ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں گے۔ تاہم یہ امر بہر حال ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ہم مسلمان ایک لمحے کے لئے اسلام کا یہ بنیادی اصول اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے کہ اللہ ایک ہے' اس کی خلاقی میں کوئی شریک نہیں اور پوری دنیا تک اس حقیقت کی منادی کرنے کے لئے ہی اللہ نے محمد ﷺ کو مبعوث کیا تھا۔

Marfat.com

(۳) مذہب اور انسان دوستی

(سوال نمبر ۲۰)

س: ایک شخص کے مذہبی عقیدے کے پیشے اور اخلاقیات کے شعبے میں اس کے کردار کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اگر ایک شخص صرف ایک خاص مذہب کا پیروکار ہو تو کیا وہ صحیح معنوں میں انسان دوست ہو سکتا ہے؟ اور کیا ایک شخص کسی بھی مذہبی عقیدے سے وابستہ ہوئے بغیر انسان دوست ہو سکتا ہے؟

ج: میری رائے میں ہر اعلیٰ مذہب کا مقصد و منشا اخلاقیات کے مفہوم میں انسان کو "اچھی زندگی" کی طرف رہنمائی کرنا ہوتا ہے۔ پس مذہب اور اخلاقیات کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہ امر بہرصورت ذہن نشین رہنا چاہیے کہ "مذہبی تجربے یا واردات" کی اصل روح بنیادی طور پر یہ وجدانی یقین ہے کہ وہ چیز جو موجود ہے یا جو وجود میں آنے والی ہے، وہ نتیجہ ہے ایک شعوری، تخلیقی اور ہمہ گیر "ارادے" کا۔ نیز یہ کہ مومن کو اس ارادے (رضائے الٰہی) سے روحانی و ذہنی ہم آہنگی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ایسے ہی وجدانی یقین اور ایسی ہی کوشش کی بنیاد پر آدمی تمام عارضی اور وقتی معاشرتی تبدیلیوں سے بالاتر ہو کر اخلاقی اقدار کا اعلیٰ معیار محسوس کر سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر خیر اور شر کے درمیان تمیز کر سکتا ہے۔ جب بھی اس حقیقت سے ہمارا ایمان اٹھ جاتا ہے کہ کائنات کی ہر محسوس اور غیر محسوس چیز، ہر قابل تصور یا ناقابل تصور مظاہر میں ایک مطلق، باشعور "ارادہ" کا کام کر رہا ہے تو پھر منطق بھی ہمارے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے اور ہم یہ مفروضہ اور استدلال قائم رہنے کے قابل نہیں رہتے کہ ہماری کاوشیں اور ہمارے اعمال اپنی اصلیت میں صحیح ہیں یا غلط، اچھے ہیں یا برے، اخلاقی ہیں یا بداخلاقی۔ پس عقیدہ نہ ہو تو اخلاق بھی اپنا مفہوم کھو دیتا ہے۔ انسانی اعمال کے اچھا یا برا ہونے کے تصورات رفتہ رفتہ ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ مبہم، بے مقصد، محض لگی بندھی عادتیں، سانچوں میں ڈھلے ڈھلائے اعمال وجود میں آتے ہیں جن میں سے ہر عادت، ہر کام اور ہر عمل کے بارے میں یہ سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ فلاں شخص کا یہ عمل -- یا فلاں معاشرتی جماعت کا یہ عمل جس سے وہ شخص وابستہ ہے -- "عملی نقطہ نظر" سے فائدہ مند ہے یا نقصان، وہ صحیح ہے یا غلط، اچھا ہے یا برا۔ یہ اصطلاحیں خالص "اضافی" تصورات بن کر رہ جاتی ہیں جن کی تعبیر و تشریح ہمیشہ یک طرفہ طور پر دنیاداری کے انداز میں متعلقہ شخص یا سماج کی ضرورتوں کے حساب سے کی جاتی ہے۔ عقیدہ نہ ہو تو پھر "دنیاداری" کے رنگ میں رنگے ہوئے ان تصورات کی تشریح وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے عارضی نوعیت کے معاشرتی، اقتصادی اور نفسیاتی حالات کی روشنی میں کی جاتی رہے گی۔

اس مسئلے پر ہم خواہ کسی بھی نقطہ نظر سے غور و خوض کریں، ہم دیکھتے ہیں کہ زمانہ ماضی میں تاریخ کے ہر دور میں انسان کے اخلاق اور سیرت و کردار کا واحد منبع "مذہب" رہا ہے۔ آج تک مذہب کا کوئی اور متبادل سرچشمہ دریافت نہیں ہوا اور نہ آج تک کوئی ایسے ٹھوس آثار و شواہد سامنے آئے ہیں جن سے اندازہ ہو سکے کہ "غیر مذہبی" اخلاق کبھی عملی زندگی میں جاری و ساری ہو جائیں گے۔ بے شک، یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکثر منکرین اور دہریے ایسے ہیں جو گہرے

Marfat.com

اخلاقی مزعومات رکھتے ہیں جن کے پیچھے کوئی مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ جو لوگ ایسا سوچتے اور کہتے ہیں وہ یہ نفسیاتی حقیقت بھول جاتے ہیں کہ کسی فرد کے اخلاقی تصورات واقدار محض اس فرد کی ذاتی سوچ اور احساس کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ انفرادی اخلاقی تصورات واقدار کی جڑیں ان اخلاقی تصورات واقدر میں گڑی ہوتی ہیں جو اس نے سابقہ نسلوں سے، اپنے ثقافتی ماحول کی وساطت سے، ورثے میں پائے ہیں۔ اس نفسیاتی حقیقت کی منطق ودلیل کا سلسلہ دراز کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے منکر اور دہریہ بھائیوں کے مثبت اخلاقی عقائد درحقیقت ایک لاشعوری ورثہ ہے ان کے بے شمار آباؤ اجداد اور بزرگوں کی محنتوں کا، جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے ''مذہبی عقیدہ'' رکھتے تھے۔ یہ لاشعوری ورثہ مذہبی عقیدے کے بغیر اور مذہبی روح کی تقویت کے بغیر بعد میں آنے والی کتنی نسلوں تک باقی رہے گا۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب مستقبل ہی دے سکتا ہے۔

(سوال نمبر ۲۱)

س: کیا کسی ایک مذہب کے پیروکار اپنے مذہب کے تقاضوں کے مطابق بھرپور زندگی گزارنے کے لئے پابند ہیں کہ وہ دوسرے مذہب کے پیروکاروں سے حتی الوسع دور ہیں؟ یا کیا زندگی کے کچھ دائرے ایسے بھی ہیں جس میں تمام لوگ مختلف مذہبی عقائد کا لحاظ کیے بغیر باہمی تعاون واشتراک سے رہ سکتے ہیں؟ کیا ایک سچے مومن کے لئے کافروں یا کسی اور مذہب کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارنا ایک ناگزیر برائی ہے؟ یا یہ مذہبی عقائد کے اختلاف سے الگ ہٹ کر انسان دوستی کا عملی مظاہرہ ہے؟

ج: مسلمانوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ غیر مسلموں سے الگ تھلگ رہنا ضروری یا اچھی بات ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ تو یہ ہے کہ اسلام کے عقائد وتعلیمات ان تمام لوگوں تک پہنچانا اور ان کی تبلیغ واشاعت کرنا جن کو اب تک معلوم ہی نہیں کہ دین اسلام کی حقیقت کیا ہے۔ اس فریضے سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ غیر مسلموں سے مضبوط تعلقات اور روابط رکھیں۔ اس سلسلے میں قرآن پاک نے سورہ مائدہ کی آیت ۴۸ میں اپنا فیصلہ سنا رکھا ہے:

''ہم نے تم (انسانوں میں) سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی۔ اگرچہ تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا لیکن اس نے یہ اس لئے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے' اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخر تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔''

دوسرے مذاہب کے پیروکاروں بلکہ کوئی عقیدہ نہ رکھنے والوں کے ساتھ بھی کام کرنا اور مل جل کر رہنا مسلمانوں کے نزدیک ''ناگزیر برائی'' نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی تقاضا اور مطالبہ ہے۔

Marfat.com

(سوال نمبر۲۲)

س: کیا ایسے اخلاقی اقدار بھی ہیں جو موجودہ وقت کی تمام اقوام وافراد کے لئے یکساں طور پر لاگو ہوں؟ مثال کے طور پر کیا اقوام متحدہ کے چارٹر اور مغربی ممالک کے وساتیر میں دیئے گئے بنیادی انسانی حقوق کو ایسے یکساں اخلاقی اقدار کہا جاسکتا ہے؟ ایسے یکساں اخلاقی اقدار کی مزید ترویج میں مختلف مذاہب اور ان سے وابستہ اقوام کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

ج: اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے اخلاقی اقدار مثلاً سچائی، رحم دلی، عدل وغیرہ اکثر اقوام وافراد میں پسندیدہ اور یکساں طور پر لاگو نہیں ہیں۔ اس ضمن میں اعلیٰ مذاہب کے پیروکاروں میں کسی نوعیت کا اختلاف رائے موجود نہیں ہے۔ اقوام متحدہ کا چارٹر بھی ایسے ہی ہمہ گیر اور عام طور پر پسندیدہ اخلاقی اقدار سے ماخوذ ہے اور تمام اقوام کو چاہیے کہ خواہ ان کا مذہبی عقیدہ کچھ بھی ہو، ان اخلاقی اقدار کی ترویج کے لئے مسلسل کوششیں کرتی رہیں۔

(سوال نمبر۲۳)

س: پچھلے سوالات میں جن اخلاقی اقدار اور ثقافتی نظریات کا ذکر ہوا ہے، کیا ان کی یکجائی سے مختلف مذاہب کی یکجائی کا بھی خطرہ پیدا ہوسکتا ہے؟

ج: جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ مختلف مذہبی تصورات ونظریات کی باہمی یکجائی ہم مسلمانوں کے نزدیک بہت اچھی اور پسندیدہ بات ہے، لیکن اس سلسلے میں ہمیشہ اس بنیادی نکتے کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اللہ واحد ویکتا ہے، یہ نکتہ مسلمانوں کے مذہبی عقیدے کا محور ومرکز ہے اور دوسرے مذاہب سے یکجائی کے لئے واحد شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذاہب کی یکجائی پر ہمیں نہ کوئی اعتراض ہے، نہ تشکیک نہ تشویش، بلکہ ہم نیک امیدوں اور اچھی توقعات کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن یہ امر ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ موجودہ حیات اور اخلاقی اقدار میں یکجائی پیدا کرنے کا جو رجحان پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے، وہ ہم مسلمانوں کے اغراض ومقاصد کے مطابق نہیں ہے۔ یقیناً یہ یکجائی مثبت اور معیاری اخلاقی اقدار کی یکجائی کی تحریک نہیں ہے، بلکہ مادی چیزوں اور آسائشات کی بندگی کی روز افزوں تحریک ہے، یعنی یہ غیر اخلاقی اقدار کی یکجائی ہے، بالفاظ دیگر لوگوں کے تصورات واقدار میں یکسانیت اور یکجائی آرہی ہے تو اس لئے کہ نہیں وہ ایک ہی روحانی صداقت کے چشمے سے سیراب ہو رہے ہیں، بلکہ اس لئے کہ مادی مقاصد کی دوڑ میں زیادہ سے زیادہ لوگ شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ معاملے پر اس نقطہ نظر سے غور کیا جائے کہ واقعی خطرہ موجود ہے، صرف کسی ایک مذہب کو نہیں بلکہ تمام مذاہب کو بقائے وجود کا خطرہ موجود ہے۔

Marfat.com

(۴) مذہب اور معاشرہ

(سوال نمبر ۲۴)

س: کیا یہ ریاست کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ ہر شہری کے ضمیر وعقیدے کی آزادی کا ذمہ لے، یا یہ کہ ریاست کو سیکولر یعنی مذہبی زندگی کے تمام پہلوؤں سے یکسر ماورا رہنا چاہئے اور تمام مذہبی امور کی تعلیم ونگرانی کو متعلقہ مذہبی جماعت کی سپرداری میں دے دینا چاہئے؟

ج: معاشرے کے اسلامی نظریے کے مطابق سیکولر ریاست کے کسی بھی تصور کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ اسلام دین اور دنیا میں کسی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام میں دین و دنیا ایک ہیں۔ پس اسلام کے نزدیک یہ ریاست کے فرائض میں شامل ہیں کہ وہ شہریوں کی مذہبی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرے۔ جس ملک میں مسلمانوں کی اکثریت ہو، اس کی حکومت پر واجب ہے کہ تمام سرکاری سکولوں کے لئے، تمام مسلم طلبہ کے لئے مذہبی تعلیم وتدریس کو نصاب کا ناگزیر اور لازمی حصہ قرار دے، اور چونکہ اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ وہ تمام شہریوں کے ثقافتی حقوق ومفادات کا تحفظ، ان کی مذہبی وابستگی کا لحاظ کئے بغیر کرے، اس لئے مذہبی تعلیم وتدریس کے دروازے غیر مسلم اقلیتوں کے لئے بھی کھلے رکھے۔

جہاں تک سرکاری سکولوں میں غیر مسلم طلبہ کی مذہبی تعلیم وتدریس کا تعلق ہے، تو یہ مسئلہ متعلقہ مذہبی جماعت کے رہنماؤں پر چھوڑ دینا چاہئے۔ ان کی ہدایت اور فیصلے پر عمل کرنا چاہئے۔

(سوال نمبر ۲۵)

س: یونیورسٹی کی سطح پر دینیات، اور مذاہب کے عام مطالعے کا کیا کردار ہونا چاہئے؟ کیا یونیورسٹی کو کسی بھی مذہبی نظام سے ہر طرح کے روابط سے بالاتر رہنا چاہئے، یا کسی خاص مذہب کے پیروکاروں کی مذہبی تعلیم کو جائز اور موزوں مقام دینا چاہئے؟

ج: چونکہ دینیات (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) ''علم'' کے مسئلے سے گہرا تعلق رکھتی ہے، اس لئے قدرتاً اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ مسلم ممالک کی جامعات میں دینیات کی بھی باضابطہ تعلیم دی جائے، اور ظاہر ہے کہ اس میں تقابلی مذاہب کا مطالعہ بھی از خود شامل نصاب ہوگا۔ جو بات میں نے سرکاری سکولوں میں مذہبی تعلیم کے بارے میں پچھلے سوال کے جواب میں تحریر کی ہے، اس کا اطلاق جامعات پر بھی کر لینا چاہئے، یعنی اس ملک کے غالب مذہب کے اصول وشعائر کی تعلیم وتدریس جامعہ کے نصاب میں شامل کی جائے۔ بالفاظ دیگر، سرکاری جامعات میں جو دینیات پڑھائی جائے، وہ اس ملک کے اکثریتی باشندوں کے مذہبی اصول وعقائد کے مطابق ہونی چاہئے، اس شرط کے ساتھ کہ تمام مذہبی اقلیتوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ یونیورسٹی کے قواعد وضوابط کی حدود میں رہتے ہوئے، ایسے خصوصی ادارے قائم کر سکتے ہیں جہاں ان کے مذہب کے مطابق دینیات کی تعلیم دی جائے۔

Marfat.com

(سوال نمبر ۲۶)

س: کیا کسی مذہب کے اصول وعقائد سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل مثلاً سرمایہ داری، اشراکیت یا آزاد خیالی یا جمہوریت یا ایٹمی اسلحے وغیرہ کے بارے میں کوئی واضح رویہ رکھنے کی تلقین کرتے ہیں؟

ج: اسلامی نقطہ نظر سے اکثر و بیشتر سیاسی معاشی و معاشرتی مسائل کا حل مختلف وقتوں اور مختلف حالات میں مختلف ہوتا ہے۔ چونکہ وقت اور حالات کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں، اس لئے کوئی بھی حل مستقل اور دائمی نہیں ہوتا جو تمام وقتوں اور تمام حالات پر لاگو ہوسکتا ہو۔ قرآنی تعلیمات ہمیں یہی بتاتی ہیں کہ زندگی، اپنی ہر صورت میں دائماً ارتقاء پذیر ہے، اور ہمہ وقت حرکت وتغیر کی حالت میں ہے۔ اس کے باوجود اسلامی قانون نے ایسے واضح، غیر مبدل اور اٹل اصول وضع کر رکھے ہیں جن کو وقت اور حالات کے مطابق بدلا نہیں جاسکتا۔ مثال کے طور پر عدالتی ومعاشرتی انصاف، انسان پر انسان کے استحصال کی ممانعت، ریاست اور حکومت کے امور میں مشاورت اور اجماع کا اصول، اظہار رائے کی آزادی، منقولہ وغیر منقولہ جائیداد کی ملکیت کا حق (اس شرط سے مشروط کہ اجتماعی مفاد کو انفرادی مفاد پر فوقیت حاصل ہے) تمام شہریوں کی فلاح و بہبود کی ریاستی ذمہ داری، معذور و نادار شہریوں کی کفالت کی ریاستی ذمہ داری، وغیرہ وغیرہ۔ مسلمان اخلاقاً پابند ہیں کہ وہ ان غیر مبدل، پختہ اور مستقل اصولوں کی اساس پر ایسے قابل عمل حل دریافت کریں جو وقت کے تقاضوں اور معاشی ومعاشرتی حالات کے مطابق ہوں اور انسانی زندگی میں جو تغیرات پیہم آتے چلے جاتے ہیں، ان کے تقاضے پورے کرنے کے لئے قابل عمل حل بھی بار بار تبدیل ہوتے رہنے چاہئیں۔

(در: شاہکار میگزین، شمارہ ۳، علامہ محمد اسد نمبر مئی ۲۰۰۱ء ص ۴-۱۶، ترجمہ: سید قاسم محمود۔ انگریزی متن کے لیے دیکھیے: راقم کی انگریزی کتاب Muhammad Asad: Europe's Gift to Islam. vol. I, 2006, pp. 35-61)

حاشیہ

۱۔ آیت ظاہری علامت یا نشانی یا راستے کے نشان کو کہتے ہیں۔ آیت ہر اس ظاہر شے کو کہتے ہیں جو کسی چھپی ہوئی شے کا لازمی خاصہ ہو اور جب کوئی شخص اس ظاہری شے کا ادراک کرے تو وہ جان لے کہ اس نے پوشیدہ شے کا ادراک یا اندازہ کرلیا ہے۔ اللہ کی ذات انسانی شعور اور ادراک کے احاطے کے اندر نہیں آسکتی، لہٰذا اس کے متعلق ان ظاہری علامات ہی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو کائنات میں بکھری پڑی ہیں۔ اس لیے یہ کائنات اور اس کی تمام اشیا آیات الٰہی ہیں۔ انسانی دنیا میں وحی، اللہ کی سب سے بڑی نشانی ہے، اس لیے یہ بھی آیت اللہ ہے۔

Marfat.com

محمد اسد/ مترجم: غلام رسول مہر

اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول

تحریک پاکستان کے آخری مرحلے (1940ء-1947ء) میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مرکزی قیادت نے مسلمانان برصغیر کے خواب، پاکستان کو ایک ایسی ریاست کے طور پر پیش کیا تھا جسے ''اسلام کی تجربہ گاہ'' کے طور پر وجود میں آنا تھا اور عوامی سطح پر پاکستان کا مطلب لا الہ الا اللہ کے سوا کچھ نہ تھا، مگر مسلم لیگ کی مرکزی قیادت مستقبل قریب میں وجود پذیر ہونے والی ریاست کے دستور، معیشت ومعاشرت اور تعلیم وتدریس کے حوالے سے بوجوہ چنداں غور و فکر نہ کرسکی اور مسلم لیگ کی دوسری اور تیسری سطح کی قیادت نے اس سلسلے میں جو اقدامات کیے، علمی سطح پر ان سے کوئی بڑی ہلچل پیدا نہ ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ظہور پاکستان کے ساتھ اس کے دستور کی تدوین اور خصوصاً اسے اسلام کے اصولوں پر استوار کرنے کا چیلنج سامنے آیا تو سیاسی قیادت پر اسلامی دستور کے خدوخال واضح نہ تھے۔

جمعیت علمائے ہند سے وابستہ علماء تو تحریک پاکستان کے دوران میں اس کی مخالف صفوں میں کھڑے متحدہ قومیت کو شرعی تائید فراہم کرنے میں مصروف تھے اور ان کے نزدیک برصغیر کو تقسیم کر کے کسی اسلامی ریاست کے قیام کی سرے سے ضرورت ہی نہ تھی۔ ان کے برعکس علماء ومشائخ کا وہ گروہ جو تحریک پاکستان کا سرگرم حامی تھا اور پاکستان میں خلافت راشدہ کے احیاء کا آرزومند تھا، اس کے پاس بھی اسلام کے حوالے سے جدید ریاستی اداروں کی تشکیل اور ان کے طریق کار کے بارے میں کوئی واضح اور قابل عمل خاکہ نہ تھا۔ علمائے کرام میں ایسے افراد بھی کم نہ تھے جو دینی مدارس کے قیام، علماء کی نگرانی میں اوقاف کی نگہداشت اور قاضیوں کے ذریعے فصل خصومات کو اسلامی ریاست کے قائم ہونے سے تعبیر کرتے تھے۔ ان حالات میں جن اہل دانش نے دور جدید کے تقاضوں کے مطابق اسلامی ریاست و حکومت کے اصول ومبادی پر روشنی ڈالی، ان میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور علامہ محمد اسد کے نام بالخصوص نمایاں ہیں۔ سید مودودی اور علامہ محمد اسد کے دائرہ ہائے کار تو جدا جدا رہے، لیکن دونوں حضرات اس قافلے کے راہرو تھے جس نے علامہ اقبال کی خواہش پر ''دارالاسلام'' (پٹھان کوٹ) کی علمی و دینی تحریک کا آغاز کیا تھا، اور پھر زندگی بھر ایک دوسرے کے قدردان رہے۔

علامہ محمد اسد نے پہلے ''محکمہ احیائے ملت اسلامیہ، مغربی پنجاب'' کے ترجمان ''عرفات'' کے اولیں

Marfat.com

شمارے میں Islamic Constitution-Making کے عنوان سے اسلامی ریاست وحکومت کی ماہیت پر اپنے خیالات یک جا کیے اور پھر نظر ثانی کرتے ہوئے اسے The Principles of State and Government in Islam کے عنوان سے بطور کتاب مرتب کیا۔ ان کی یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۱ء میں کیلیفورنیا یونیورسٹی پریس-برکلے سے شائع ہوئی۔ دو سال بعد اسے مولانا غلام رسول مہر (م ۱۹۷۱ء) نے ''اسلامی مملکت و حکومت کے بنیادی اصول'' کے نام سے اردو میں منتقل کیا (لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، بہ اشتراک مؤسسہ مطبوعات فرینکلن، ۱۹۶۳ء)۔ مولانا مہر نے کتاب پر کوئی دیباچہ وغیرہ تو نہ لکھا، البتہ بعض مقامات پر مؤلف علامہ محمد اسد کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے حواشی کا اضافہ کیا اور اپنے حواشی کو مؤلف کے حواشی سے الگ رکھنے کے لیے ان کے آخر میں لفظ ''مترجم'' لکھ دیا۔

علامہ محمد اسد کی یہ انگریزی تالیف چند بار شائع ہوئی ہے۔ ۱۹۸۰ء میں مولف کے جدید ''شذرے'' کے ساتھ جبرالٹر سے چھپی تھی، جس کی متعدد عکسی اشاعتیں (reprints) پاکستان اور بیرون پاکستان منصۂ شہود پر آتی رہی ہیں۔ مولانا مہر کا اردو ترجمہ بھی غالباً ۱۹۶۳ء کے بعد ایک دو بار غلط سلط انداز میں چھپا ہے۔ اب جمعیۃ پبلی کیشنز، لاہور نے اس کی ایک اور اشاعت پیش کی ہے۔ اس اشاعت کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں جناب امجد علی شاکر کے قلم سے ''تقدیم'' (بہ عنوان ''توضیحات وتنقیدات''، صفحات ۷-۳۴) اور بعض مقامات پر حواشی کا اضافہ ہے۔ ان کے اپنے الفاظ میں انہوں نے ''جہاں کہیں مصنف یا مترجم سے اختلاف کی ضرورت محسوس کی ہے، اس کے اظہار سے گریز نہیں کیا۔ اس کے باوجود کتاب کے متن اور مترجم کے حواشی کو پوری دیانت داری سے پیش کیا ہے۔'' (ص ۳۴)۔

''اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول'' کی اس جدید اشاعت کے مابہ الامتیاز پہلو پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے محتویات کی فہرست دے دی جائے: ☆ پیش لفظ، از گرونے باوم ☆ دیباچہ ☆ پہلا باب- پیش نظر مسئلہ (اسلامی ریاست کیوں؟ مذہب اور اخلاق، اسلامی قانون کی وسعت، آزاد تحقیقات کی ضرورت) ☆ دوسرا باب- مصطلحات اور تاریخی نمونہ (مغربی مصطلحات کا غلط استعمال، سیاسی اور اسلامی اوضاع، صحابہ کرامؓ کا نمونہ) ☆ تیسرا باب- حکومت بہ رضائے عام ومجلس شوریٰ (اسلامی مملکت کے مقاصد، بنیادی اصول، اقتدار مملکت کا ماخذ، رئیس مملکت، مجلس شوریٰ، اختلاف رائے) ☆ چوتھا باب- حاکمہ اور مقننہ کے درمیان روابط (وظائف کا باہم دگر انحصار، تاریخی تجزیہ، اختیارات حاکیت، حکومت کا ڈھانچہ، مقننہ اور حاکمہ میں ارتباط، مقننہ اور حاکمہ میں محاکمہ) ☆ پانچواں باب- شہری اور حکومت (فریضہ اطاعت، مسئلہ جہاد، حدود اطاعت، آزادیٔ رائے، شہریوں کی حفاظت، مفت اور لازمی تعلیم) ☆ چھٹا باب- مباحث کا ماحصل (راستے کی مشکلات، مجموعہ قوانین کی ضرورت، مجموعہ کیوں کر مرتب کیا جائے؟)۔

اس کتاب میں اسلامی ریاست وحکومت کے مقاصد، حکومتی اداروں، بالخصوص مقننہ اور انتظامیہ کے باہمی تعلق اور ریاست وفرد کے فرائض وحقوق پر گفتگو کرتے ہوئے علامہ محمد اسد کے سامنے یہ بات بہت واضح تھی کہ

Marfat.com

''اسلام محض سیاست کا پروگرام نہیں، بلکہ اس سے بہت زیادہ ہے۔ یہ عقائد، اخلاق اور عمرانی اصول کا نظام ہے۔ تمام انفرادی اور اجتماعی معاملات میں راست بازی کی دعوت ہے۔ یہ ایک مکمل اور کفیل بالذات نظریہ ہے جو ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے، خواہ وہ اخلاقی ہوں یا جسمانی، روحانی ہوں یا ذہنی، انفرادی ہوں یا اجتماعی۔ یہ سب پہلو ایک غیر منقسم کل کے اجزاء ہیں جسے ہم انسانی زندگی کہتے ہیں۔'' مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ ان کی روش زندگی اسلام کے مطابق ہو مگر یہ ''اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک [ایک خطے میں آباد] پوری قوم اسلام کے عمرانی و اقتصادی قوانین کی پیروی قبول نہ کر لے، لہٰذا ایک آزاد نظریاتی مملکت کے نظام ہی میں، جو اسلامی اصول پر مبنی ہو اور اس میں حکمرانی، قانون سازی اور تنفیذ قوانین کا پورا نظام ہو، اسلامی مقاصد بارآور عملی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔''

اسلامی ریاست وحکومت کی تشکیل کی راہ میں حائل داخلی اور خارجی مشکلات سے بھی علامہ محمد اسد پوری طرح آگاہ تھے اور ان پر انہوں نے گفتگو بھی کی ہے۔ داخلی مشکلات میں انہوں نے ایک طرف مغربی تہذیب کے علمی غلبے کا ذکر کیا ہے اور دوسری طرف قدامت پسند مذہبی طبقے کے ذہنی رویوں کی کمزوری واضح کی ہے۔ مزید برآں مغربی دنیا میں اسلام کے احیاء سے جو خوف موجود ہے اس کی طرف اشارہ کیا ہے: ''حروب صلیبیہ کے زمانے سے اسلام کو اہل مغرب کے روبرو غلط انداز میں پیش کیا جا رہا ہے اور ہر اسلامی معاملے کے متعلق گہری بے اعتمادی، تقریباً نفرت، مغرب کی ثقافتی میراث کا غیر منفک جزو بن گئی ہے اور اسلامی دنیا اور یورپ کے درمیان صدیوں تک شدید رزم و پیکار کا سلسلہ جاری رہا۔ انہیں یہ خوف دامن گیر ہے کہ اسلامی مملکت کے خیال میں اسلامی روح کا احیاء شامل ہے اور ممکن ہے کہ مسلمانوں کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہو جائیں اور وہ دوبارہ مغرب کی طرف نئے جارحانہ اقدامات شروع کر دیں۔ اس ممکن رجحان کے سدباب کی غرض سے اہل مغرب وہ سب کچھ کر رہے ہیں، جو اسلامی ملکوں کی سیاسی قوت کے احیاء کی روک تھام کے لیے ضروری ہے اور جس کی وجہ سے اسلام کو دوبارہ مسلمانوں کی عمرانی و ذہنی زندگی میں مقتدر حیثیت حاصل ہو سکتی ہے۔''

علامہ محمد اسد نے یہ کتاب اپنے موضوع پر بطور ''حرف آخر'' پیش نہیں کی تھی، بلکہ ایک علمی و فکری کاوش کے طور پر اہل نظر کے سامنے رکھی تھی اور ان کے نزدیک غور و فکر پر مبنی باہم اختلاف میں حدیث نبویؐ اختلاف علماء امتی رحمة (میری امت کے علماء کے اختلاف میں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے) کے مطابق مثبت تخلیقی قدر و قیمت پوشیدہ ہے۔

☆ ☆ ☆

زیر نظر اشاعت میں جناب امجد علی شاکر نے ''تقدیم'' میں حواشی کے اضافے کا ذکر کیا ہے، مگر یہ بات ان کے ذہن میں نہ رہی کہ کہیں کہیں مولانا مہر کے حواشی حذف بھی کر دیے گئے ہیں۔ باب دوم میں علامہ محمد اسد نے تصور جمہوریت پر بحث کی ہے، مولانا مہر نے یہاں ایک طویل اختلافی حاشیہ لکھا ہے (اشاعت، شیخ غلام علی اینڈ سنز، 1963ء، صفحات 39-40)۔ یہ حاشیہ زیر تبصرہ اشاعت میں درج نہیں کیا گیا۔ مغربی جمہوریت کے ذکر کے معابعد

Marfat.com

علامہ محمد اسد نے لکھا ہے: ''جونظریاتی جمہوریت روس اور دوسری کمیونسٹ مملکتوں میں رائج ہے بہ لحا،تصور اسلامی تصور سے بظاہر مشابہ ہے'' (ص ۶۲)۔اس پر گرفت کرتے ہوئے مولانا مہر نے حاشیہ لکھا ہے:

''اس مشابہت کی اصل واساس کیا ہے؟ بظاہر وہ فہم میں نہیں آتی، حالانکہ کمیونسٹ روس یا کیمونسٹ چین کا نظام بظاہر مستبدانہ ومطلق العنان ہے۔اسلامی نظام یقیناً ایسا نہیں ہوسکتا، کیوں کہ اس کی بنیاد شوریٰ ہے اور اس نظام کی روح حق وانصاف کے سوا کچھ نہیں۔'' (اشاعت،شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۶۳ء،صفحات ۴۰-۴۱)۔

یہ حاشیہ بھی حذف کردیا گیا ہے۔ممکن ہے جناب امجد علی شاکر کو مولانا مہر کے برعکس علامہ محمد اسد کے تاثر سے اتفاق ہو، تاہم مولانا مہر کا حاشیہ درج کر کے اس سے اختلاف کا اظہار کیا جاسکتا تھا، جیسا کہ ایک دو دوسرے مقامات پر مولانا مہر سے اختلاف کیا گیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے صفحہ ۱۰۳ پر نظر بہ ظاہر مولانا مہر کا مرقومہ حاشیہ درج کیا گیا ہے، جو اگلے صفحے تک پھیلا ہوا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ حاشیے کی آخری دس سطریں جناب شاکر کا اضافہ ہیں۔

چلتے چلتے مولانا مہر سے ان کے اختلاف کا ایک نمونہ بھی درج کردیا جائے۔علامہ محمد اسد کے نزدیک مغرب کی جمہوری مملکتوں نے ہیئت مقننہ کو برتری اور سیادت کا حق دے کر اسے ہیئت حاکمہ کے عام کاروبار پر بالا دست بنادیا ہے،''اس طرح ہیئت حاکمہ اقتدار کا استعمال غیر ذمہ دار طریق پر کرنے سے روکی اور باز رکھی جاسکتی ہے۔''اس پر مولانا مہر نے تائیدی انداز میں لکھا ہے:

''بالکل صحیح،اور یہی امر حاکمہ کو غیر معمولی اختیارات یا غیر ذمہ دارانہ کارروائیوں سے روکنے کا واحد ذریعہ ہے۔یہ نہ ہو تو یقیناً حاکمہ یا اس کا رئیس مختار مطلق بن سکتا ہے۔پہلی اسلامی جمہوریت حاکمہ کے غیر معمولی اختیارات اور ہنگامی حالات میں مقننہ یا شوریٰ کی بے تنظیمی ہی کے باعث یکا یک مستبد اور مطلق العنان بنی اور خلافت علی منہاج النبوت نے ملوکیت کی شکل اختیار کرلی۔'' (ص،۹۶ حاشیہ)۔

جناب امجد علی شاکر کا کہنا ہے کہ ''مترجم کا یہ نوٹ اس غلط خیال پر مبنی ہے کہ خلافت حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں ملوکیت میں بدل گئی۔حقیقت یہ ہے کہ خلافت کا نظام مدتوں قائم رہا، اگرچہ اس نظام میں بہت سی کمزوریاں شامل ہوگئیں۔خلافت قانون سازی اور کار حکومت میں ہدایت الٰہی کی پابند ہے اور ملوکیت آزاد ہے۔ہمارے خلفاء نے کبھی الٰہی احکام سے بغاوت نہیں کی، اس لیے انہیں بعض جزئی مماثلتوں کے باعث ملوک کہنا زیادتی ہے'' (ص ۹۷)۔حضرت سفینہؓ سے مروی روایت (یعنی میرے بعد تیس سال خلافت راشدہ رہے گی اور اس کے بعد ملک عضوض حکمران ہوں گے) کی بنیاد پر ہی خلافت راشدہ اور ملوکیت کا تصور قائم ہے اور اسی کے پس منظر میں مولانا مہر نے خلافت علی منہاج النبوۃ کے خاتمے پر ملوکیت کا ذکر کیا ہے اور اہل سنت کا اس امر پر بحیثیت مجموعی اجماع ہے حتیٰ کہ ابن

Marfat.com

خلدون جیسے مورخ کو بھی اس سے انکار نہیں۔''اموی خلافت'' میں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جو اصلاحات کی تھیں، اگر خلافت اداراتی طور پر ملوکیت نہ بنی تھی، تو ان اصلاحات کی ضرورت کیوں پڑی تھی۔ کیا مطلق العنان موروثی اقتدار اسلام اور خلافت راشدہ کی روح کے مطابق ہے؟ جناب شاکر کے اس حاشیے نے چونکا دیا ہے۔

☆ ☆ ☆

جناب امجد علی شاکر نے اپنی ''تقدیم'' (توضیحات وتنقیدات'') کے ۲۸ صفحات میں کئی سوالات اٹھائے ہیں، مگر ان کا اصل مقصود جمعیت علماء اسلام (مفتی محمود گروپ) کے سیاسی نقطہ نظر کو تاریخ وسیاسیات کے پس منظر میں درست قرار دیتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے فکر و دانش اور بالخصوص اسلامی ریاست کے بارے میں ان کے افکار کو مسترد کرتا دکھائی دیتا ہے۔''تقدیم'' کا تقریباً نصف آخر علامہ محمد اسد کی کتاب کے جائزے پر مشتمل ہے، مگر وہاں بھی سید مودودی کی تردید کی خواہش نمایاں ہے۔ ان کے اٹھائے ہوئے جملہ سوالات پر گفتگو کی مختصر تبصرے میں گنجائش نہیں، ایک دو امور کی طرف توجہ دلانا ہی کافی ہوگا۔

ا۔ جناب شاکر کو اس امر سے اختلاف ہے کہ بیسویں صدی میں مسلمان زوال کا شکار ہو گئے تھے۔ ان کے نزدیک یہ سیاسی زوال تھا، اسے مکمل زوال سے تعبیر کرنا درست نہیں۔ مسلمان علم، فکر و نظر، فنون، اقدار اور دیگر تہذیبی شعبوں میں بدستور صاحب کمال تھے (صفحات 7-8)۔ اپنے اس نقطہ نظر میں جناب شاکر منفرد نہیں، بعض مغربی اہل قلم بھی ان کے ہم نوا ہیں، جن کے جانشین امت مسلمہ کو آج یہی بات سمجھانے کے لیے کوشاں ہیں کہ مسلمانوں کو اسلامی ریاستی وحکومت کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے، بلکہ انہیں ماضی کی خانقاہی روایت کو زندہ کرتے ہوئے کار جہاں کو سنوارنے کے بجائے دل کی دنیا آباد کرنا چاہیے۔

جناب شاکر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے مطالعہ وتجزیہ کے قدر دان ہیں۔ شاہ صاحب نے سلطنت مغلیہ کے زوال ہی کا تجزیہ نہیں کیا، بلکہ مسلم معاشرے کے انحطاط پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے مختلف معاشرتی طبقات کی کمزوریاں جس طرح گنائی ہیں، سوچنے کی بات ہے کہ کیا یہ ''تہذیبی کمال'' کی علامت ہیں! شاہ صاحب نے امراء اور سپاہ پیشہ لوگوں کو خطاب کرنے کے بعد مشائخ اور عامۃ الناس کی کوتاہیاں بھی گنائی ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں جتنی تعداد میں ''عبرت نامے'' لکھے گئے، وہ خود مقامی مورخین کی جانب سے تہذیبی وسیاسی ادبار وانحطاط کا اظہار ہیں۔ مزید براں درگاہ قلی خان کی تالیف ''مرقع دہلی'' سے جو تہذیبی نقشہ سامنے آتا ہے، اگر یہ کمال وعروج ہے تو زوال کیا ہوگا!

جناب شاکر کے خیال میں بیسویں صدی میں اسلامی ریاست کا نظریہ اس خاص پس منظر میں سامنے آیا کہ ''بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں سوویت انقلاب نے فکری دنیاؤں میں بھی انقلاب پیدا کر دیا۔ مارکس نے ایک بات کہی تھی کہ پہلی manifestation ریاست ہے اور اس کی پہلی functioning قانون ہے۔ اس صورت حال میں اسلامی ریاست کا نظریہ سامنے آیا۔'' (ص ۱۰)۔ اور یہ تمہید ہے یہ بتانے کی کہ سید مودودی کا اسلامی ریاست

Marfat.com

کا تصور سوویت انقلاب کے پس منظر میں وجود میں آیا، اور پھر سید مودودی کے بارے میں ایک خاص مکتب فکر کے اعتراضات یکے بعد دیگرے دہرا دیئے گئے ہیں۔اس سلسلے میں طنز و تعریض سے بھی اجتناب نہیں کیا گیا۔مثال کے طور پر لکھا ہے: ''ان کے ہاں صحابہؓ معیارِ حق نہ تھے، ان پر تنقید ہو سکتی تھی، اگرچہ ان کے متبعین ان پر کبھی تنقید نہیں کرتے'' (ص۱۰)۔

واللہ اعلم جناب شاکر نے برصغیر میں مولانا آزاد کے تصور خلافت الٰہیہ کو کیوں نظر انداز کر دیا؟ حالانکہ ان کا ذکر خیر جناب شاکر کی لوح حافظہ پر اکثر چمکتا ہے اور مصطفیٰ کمال کے الغائے خلافت کے بعد احیائے خلافت کی کوششوں پر کیوں توجہ نہ دی۔کیا مولانا آزاد کی ''خلافت الٰہیہ'' کی خواہش کسی سوویٹ انقلاب کی بازگشت تھی؟ یا اس میں قرآن و سنت اور مسلم تاریخ و تہذیب کا بھی کوئی حصہ تھا؟ بیسویں صدی میں اسلامی ریاست کی جدوجہد سے کوئی ایک صدی پیشتر سید احمد شہید کی جدوجہد اور قیام امارت اسلامی (نیز شاہ اسمٰعیل شہید کی کتاب ''منصب امامت'') کے پس منظر میں کس مارکس یا کس لینن کا انقلاب کارفرما تھا؟

۲۔ جناب شاکر نے ایک پارٹی کے مخلص اور جذباتی کارکن کا رویہ اختیار کر کے اپنے موضوع سے انصاف نہیں کیا۔کون نہیں جانتا کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دلانے کی تحریک میں مسلمانان برصغیر کے ہر مکتب فکر کا حصہ ہے اور ۱۹۷۴ء میں قومی اسمبلی میں نمائندگی رکھنے والی ہر ایک دینی جماعت نے اس جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، مگر جناب شاکر اس کا کریڈٹ ایک مجمل جملے میں یوں دیتے ہیں: ''مرزائی گروہ کو مولانا مفتی محمود کی تحریک پر قومی اسمبلی میں کافر قرار دیا گیا'' (ص۲۱)۔

۳۔ جناب شاکر نے خدمات علماء کے حوالے سے بجا طور پر لکھا ہے: ''قیام پاکستان کے بعد علماء نے شرعی قوانین کے نفاذ اور آئین کی اسلامی اصولوں کے مطابق تدوین پر زور دیا۔اس سلسلے میں علماء نے بائیس نکات تیار کیے۔یہ نکات پاکستان بھر کے علماء کی متفقہ رائے سے تیار ہوئے'' (ص۲۰)۔بائیس نکات تجویز کرنے والے علماء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی شامل تھے اور وہ علماء تو بالخصوص پیش پیش تھے جنہیں جناب شاکر نے ''علماء حق'' کے دائرے سے نکال باہر کیا ہے، کیونکہ انہوں نے ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں جناب شاکر کے بقول اپنے سیاسی مخالفوں کو کافر کہنے سے گریز نہیں کیا تھا (ص۲۲)۔تاریخ پاکستان کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ بائیس نکات مرتب کرنے والے اکتیس علماء مولانا احتشام الحق تھانوی کی دعوت پر کراچی میں اکٹھے ہوئے تھے اور اس کام میں جمعیۃ علماء ہند کے جانشینوں کے بالمقابل تحریک پاکستان کی حمایت کرنے والے علماء پیش پیش تھے۔یہی مولانا تھانوی اور ان کے رفقاء (مولانا مفتی محمد شفیع وغیرہ) تھے جنہوں نے ''سوشلزم کفر ہے'' کا فتویٰ دیا تھا۔

جناب شاکر ایک جگہ علماء کے ایک طبقے کو مورد الزام قرار دیتے ہیں، مگر ان کے کارنامے کو اپنے ممدوحین کے کھاتے میں بھی ڈال لیتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

Marfat.com

''توضیحات وتنقیدات'' اور کتاب کے مصنف ومترجم کے افکار سے جناب امجد علی شاکر کے اختلاف کا جو بھی معیار ہو، جمعیۃ پبلی کیشنز کی طرف سے اس کتاب کی اشاعت خوش آئند ہے کہ کم از کم اسلامی مملکت وحکومت کے حوالے سے ایک نقطہ نظر کو اسی بہانے دینی حلقے میں پڑھا جائے گا اور شاید غور وفکر کے حوالے سے یہ تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہو۔

(در: نقطہ نظر (اسلام آباد)، شمارہ ۲۲، بابت اپریل-ستمبر ۲۰۰۷ء، ص ۶۹-۷۶)

Marfat.com

محمد اسد/ مترجم: محمد شبیر قمر

اسلامی ریاست اور مسلم طرزِ حکومت

علامہ محمد اسد (۱۹۰۰ء-۱۹۹۲ء) کی تالیف The Principles of State and Government in Islam کے ایک اردو ترجمے ''اسلامی مملکت و حکومت کے بنیادی اصول'' کی جدید اشاعت پر ''نقطہ نظر'' کے گذشتہ شمارے میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے (صفحات ۶۹-۷۶)۔ اس کتاب کا دوسرا ترجمہ پیش نظر ہے۔ جناب مترجم نے ترجمے کے لیے انگریزی متن کی وہ اشاعت پیش نظر رکھی ہے جو مؤلف نے ۱۹۸۰ء میں مرتب کی تھی اور جبرالٹر سے شائع ہوئی تھی۔ اس اشاعت کی متعدد عکسی اشاعتیں وطن عزیز میں سامنے آتی رہی ہیں۔

نو آبادیاتی دور کے خاتمے اور مسلم ممالک کے یکے بعد دیگرے سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد اسلامی ریاست کے حوالے سے جو علمی و فکری کاوشیں سامنے آئی ہیں، ان میں سے دو چار وقیع ترین کاوشوں میں سے ایک علامہ محمد اسد کی یہ تالیف ہے۔ ان کی ہر رائے سے تو اتفاق نہیں کیا جا سکتا، مگر ان کی آراء کو آسانی سے مسترد کرنا بھی ممکن نہیں۔ علامہ اپنے مغربی پس منظر کے باوجود مغرب کے علم و دانش سے مرعوب نہیں اور امت مسلمہ کو اپنی دینی روایت میں رہ کر اپنے مسائل کو حل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ کتاب میں اسلام کی سیاسی اقدار و تعلیمات کو دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق عملی جامہ پہنانے کی ایک شکل تجویز کی گئی ہے اور یہاں غور و فکر کی خاصی گنجائش موجود ہے۔

جناب محمد شبیر قمر نے اپنے دیباچے ''سخن مترجم'' میں اس پہلو سے کچھ نہیں لکھا کہ انہوں نے کتاب کے ایک ترجمے کی موجودگی میں نیا ترجمہ کیوں کیا؟ ممکن ہے، وہ غلام رسول مہر (م ۱۹۷۱ء) کے ترجمے سے لاعلم ہوں، یا مطمئن نہ ہوں، تاہم انہوں نے کوشش کی ہے کہ ان کا اپنا ترجمہ سادہ، سبک اور سلیس ہو (ص ۱۴)۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''کہیں توضیحی اور کہیں مصنف سے اختلافی نوٹ بھی دیے گئے ہیں'' (ص ۱۴)، مگر ایسے نوٹس نہ ہونے کے برابر ہیں، البتہ صفحہ ۱۶۰ پر اختلاف علماء امتی رحمة پر مختصر سا یہ حاشیہ ہے: ''یہ حدیث موضوع ہے۔ (ادارہ)۔''

علامہ محمد اسد کی کتاب کے زیر نظر ترجمے میں جناب مترجم نے دو ضمیموں کا اضافہ کیا ہے۔ پہلا ضمیمہ ''محکمۂ احیائے ملت اسلامیہ'' کے اس تعارف نامے کے انگریزی متن کے ترجمے پر مشتمل ہے جو علامہ نے زیر نظر کتاب سے پہلے لکھا تھا۔ اس تحریر کا زیر نظر کتاب سے گہرا فکری ربط ہے۔ دوسرا ضمیمہ ''محکمۂ احیائے ملت اسلامیہ'' کے تعارف

Marfat.com

نامے پر ایک مخلص مسیحی کے تاثرات پر مشتمل ہے۔اس مسیحی دانشور نے علامہ محمد اسد کو مشورہ دیا تھا کہ وہ امت مسلمہ کی تعلیم وتربیت کرتے ہوئے ان غلطیوں سے اجتناب کی کوشش کریں جو ماضی میں مسیحی دنیا میں کی گئی تھیں،مثال کے طور پر اسلام کے داعیوں کو اپنے دور کی ان علمی اور فلسفیانہ تحریکوں سے ہرگز اغماض نہ برتنا چاہیے جن کا عام آدمی پر اثر ہوتا ہے۔

جناب مترجم نے ''سخن مترجم'' میں دوسری باتوں کے ساتھ علامہ محمد اسد کا تشنہ سا تعارف بھی لکھا ہے، برصغیر میں ان کے قیام،علامہ محمد اقبال،سید مودودی اور دوسرے اہل علم ودانش سے ان کے تعلق خاطر،حتیٰ کہ ان کی تاریخ وفات تک کا کوئی ذکر نہیں کیا،تاہم اس سے کتاب کی افادیت میں کوئی کمی نہیں آتی۔امید ہے،آئندہ ایڈیشن میں علامہ محمد اسد کا نسبتاً بھرپور تعارف شامل کردیا جائے گا۔

(در: نقطہ نظر (اسلام آباد)،۲۳،۱ اکتوبر ۲۰۰۷ء- مارچ ۲۰۰۸ء،ص ۶۳-۶۴)

Marfat.com

سید سلیمان ندوی

محمد اسد

ہم کو اپنے تمام نومسلم بھائیوں میں سے سب سے زیادہ جس کی شخصیت نے متاثر کیا ہے' وہ آسٹریا کے ایک گمنام نومسلم لیوپولڈ وائس معروف بہ محمد اسد ہیں۔ موصوف ایک اخبار کے مراسلہ نگار کی حیثیت سے اسلامی ملکوں کی سیاحت پر مامور ہوئے۔ انہوں نے عربی ممالک کی سیاحت کی اور مسلمانوں سے میل جول بڑھایا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گئے۔ سالہا سال حجاز میں گزارے اور وہاں ایک عرب خاتون سے نکاح کیا۔ اب تقریباً دو برس سے ہندوستان میں ہیں۔ گذشتہ سال لاہور کے جلسہ حمایت اسلام میں اور امسال جامعہ ملیہ دہلی کی ایک تقریب میں ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک ایسے نومسلم نظر آئے جن کو دیکھ کر مغرور پشتینی مسلمانوں کو شرمانا چاہیے۔ وہ نہ صرف عقیدہ کے مسلمان ہیں' بلکہ فرائض وسنن ومستحبات اور تمدن ومعاشرت تک میں مسلمان ہیں۔ وہ وہ یورپین ہیں جو نہ صرف مسیحی عقیدہ کے بلکہ یورپین تمدن کے مخالف ہیں۔ عربی زبان بولتے اور سمجھتے ہیں اور انگریزی اتنی جانتے ہیں کہ اس میں لکھ پڑھ سکیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

موصوف کے دل میں اسلام کی بڑی عظمت ہے اور وہ اس کو حقیقت حقہ جانتے ہیں اور یقین کرتے ہیں اور ان کے دل میں لگن ہے کہ وہ اسلام کی کوئی حقیقی خدمت بجالائیں۔ اب انہوں نے اپنا لائحہ عمل (پروگرام) مرتب کرلیا ہے اور قرول باغ دہلی میں ''عرفات'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کرلیا ہے۔ اس کی طرف سے عنقریب وہ ایک انگریزی رسالہ کے اجراء کا ارادہ رکھتے ہیں اور ''عرفات بکڈپو'' کے ذریعہ سے اپنی تصنیفات کی اشاعت کا سامان کرلیا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

چند ماہ ہوئے کہ موصوف نے اپنی ایک مختصر لیکن جامع کتاب ''اسلام ایٹ دی کراس روڈ'' (اسلام راہ عبور پر) بزبان انگریزی شائع کی ہے' (عرفات بکڈپو' قرول باغ' دہلی)۔ اس میں موجودہ حالات وخیالات کے پیش نظر اسلام کی تعلیم کو بطور طریق نجات کے پیش کیا ہے۔ اسی ضمن میں یورپ کے تمدن اور رجحانات دماغی کی تنقید کی ہے۔

Marfat.com

بعض مسلمانوں میں اس وقت یورپین تجدد اور احادیث وسنن نبویہ سے روگردانی کی بدعتوں کو ''اصلاح'' کے نام سے پیش کرنے کی جو افراط وتفریط پیدا ہو رہی ہے، اس کی غلطیاں نہایت صحت اور نکتہ سنجی کے ساتھ ظاہر کی ہیں۔ کتاب کے اس باب کو پڑھ کر اپنے ان نئے خیال کے دوستوں کو حافظ کا یہ شعر سنانے کو جی چاہتا ہے

حسن ز بصرہ، بلال از حبش، صہیب از روم
ز خاک مکہ ابوجہل، ایں چہ بوالعجبی است

(در: معارف (اعظم گڑھ)، اکتوبر ۱۹۳۴ء، ص ۲۴۲-۲۴۳، شذرہ)

Marfat.com

محمد عزیر

اسلام اور تعینِ راہ کی کشمکش

مسلمانوں کے عروج وزوال کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت تک ان کے دل ایمان و یقین کے نور سے منور تھے' ان کی ترقی کا قدم زمانہ کی نامساعدت اور مخالفت کے باوجود اللہ تعالیٰ کی وسیع زمین میں بڑھتا ہی چلا گیا اور دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو بھی ان کے سامنے سرنگوں ہو جانا پڑا' لیکن جب اس نور کی روشنی پھیکی پڑنے لگی اور ایمان ویقین کی جگہ ضعف عقائد اور تشکیک نے دلوں میں راہ پانی شروع کی تو وہ تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹنے لگے اور خدا کی زمین اپنی وسعت کے باوجود ان کے لئے تنگ ہوگئی۔

مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کا واحد سبب ان کے ایمان کی کمزوری ہے' لیکن یہ کمزوری پیدا کیونکر ہوئی؟ اس کمزوری کی بنیاد خود ان کے ''زمانہ عروج'' میں پڑ چکی تھی' عہد سعادت نبویہ اور دور خلافت راشدہ کے بعد جب جمہوریہ اسلام نے ایک عظیم الشان سلطنت کا قالب اختیار کر لیا اور اس کا نظام حریت جو انّ الحکم الا للّٰہ کی بنیاد پر قائم تھا' انسانی بادشاہت اور شخصی سلطنت کی شکل میں تبدیل ہو گیا' تو مسلمانوں کا اپنے مالک کے ساتھ وہ مخصوص رشتہ جو تمام دوسرے رشتوں کو توڑ کر جوڑا گیا تھا' کمزور ہو گیا اور ان کی پیشانیاں جو پہلے صرف رب السمٰوات والارض کے سامنے جھکتی تھیں' بادشاہوں کے درباروں میں زمین بوس نظر آنے لگیں۔ یہ تو نہیں ہوا کہ مسلمانوں نے خدا کی پرستش چھوڑ کر تخت وتاج کی پرستش شروع کر دی' لیکن یہ ضرور ہوا کہ اللّٰہیت کی وہ روح جو ان کے تمام افعال واعمال کی جان تھی' بحیثیت ملّی فنا ہو گئی۔ ان کی فتوحات کا سلسلہ اب بھی صدیوں تک جاری رہا' لیکن پہلے وہ اس لئے لڑتے تھے کہ خدا کا بول بالا ہو اور اب اس لیے جنگ کرنے لگے کہ سلطان وقت کے مقبوضات کا دائرہ وسیع ہوتا جائے۔ انہوں نے بڑی بڑی مملکتیں فتح کیں' اپنی تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کی روشنی سے تمام عالم کو منور کیا اور ایسی عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں' جن کی نظیر سے دوسری قوموں کی تاریخ خالی ہے۔ دنیا ان کے اسی دور کو ان کے عروج وکمال کا دور قرار دیتی ہے' لیکن ہمارے نزدیک یہ عروج ہی ان کے زوال کا پہلا قدم تھا۔ اسی عروج نے دنیوی جاہ وعظمت کا وہ جذبہ ان کے اندر پیدا کر دیا' جس نے تھوڑے ہی دنوں میں نصب العین کی حیثیت حاصل کر لی اور خدا کے وہ بندے جن کی حیات وممات پہلے تمام تر اپنے خالق کے لئے تھی' اب مادی قوت واقتدار کے دلدادہ ہو گئے۔

Marfat.com

اس انقلاب حال کا سب سے زیادہ مہلک اثر یہ ہوا کہ دلوں سے اللہ کی خشیت ومحبت رخصت ہونے لگی اور اس کی جگہ تخت وتاج کا رعب اور قومی عظمت وحشمت سے وابستگی پیدا ہوگئی۔ مسلمان جب تک مادی حیثیت سے ترقی کرتے رہے' یہ زہر خاموشی کے ساتھ اندر ہی اندر اپنا کام کرتا رہا اور اس کے مظاہر رونما نہیں ہوئے' لیکن جب دنیا کی اور قوموں کی طرح ان کے مادی عروج وکمال کا زمانہ بھی ختم ہوگیا اور ان کے اندر بھی انحطاط وزوال شروع ہوا تو اس زہر کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ صدیوں تک قومی حشمت وجاہ کی پرستش سے اللہ واحد القہار کے جلال وجبروت کا احساس حد درجہ کمزور ہوگیا تھا اور دلوں میں صرف مادی قوتوں کا رعب واستیلا راسخ تھا' اس لئے جب اپنی قوت کا خاتمہ ہوگیا اور دوسری قوموں نے غلبہ حاصل کرلیا تو قوت واقتدار کے پرستاروں نے جن کی پیشانیاں ایک طویل مدت سے اسی بت کی چوکھٹ پر گڑی ہوئی تھیں' اپنے نیاز وتعبد میں کوئی فرق پیدا ہونے نہ دیا اور اپنی وفاداری پر بدستور قائم رہے۔

مادی قوت واقتدار کا یہی رعب آج ملت اسلامیہ کا سب سے زیادہ شدید مرض ہے۔ مسلمانوں کی سابقہ عظمت کے مقابلہ میں ان کی موجودہ طاقت کچھ بھی نہیں ہے۔ برخلاف اس کے مغرب اپنی ترقی کے دور شباب سے گذر رہا ہے۔ اس کی تہذیب وتمدن کی برقی روشنی کے سامنے مسلمانوں کی آنکھیں جو نور حقیقی کی تجلیات سے محروم ہو چکی ہیں' خیرہ ہورہی ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ مغرب کا تسلط آج تمام دنیا پر چھایا ہوا ہے اور حربی قوت کے علاوہ علوم وفنون اور تہذیب وتمدن میں بھی اس کی حکمرانی روئے زمین کے ہر حصہ پر تسلیم کرلی گئی ہے۔ پس جن دلوں میں صدیوں سے مادی اقتدار کے رعب نے آشیانہ بنا رکھا ہے' ان کے لئے مغرب کے تسلط سے مرعوب ہونا محل تعجب نہیں' بلکہ توقع کے عین مطابق ہے۔ جو لوگ اس بات پر حیرت کرتے ہیں کہ مسلمان اپنی تہذیب کی خوبیوں کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کے دلدادہ ہورہے ہیں' وہ اس حقیقت کو نظر انداز کردیتے ہیں کہ اسلامی تہذیب تو مسلمانوں نے اس وقت چھوڑ دی تھی جب مغرب اپنی وحشت اور بربریت کے دور سے بھی نہیں گذر چکا تھا۔ اصل یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کا مفہوم ہی غلط سمجھا جاتا ہے۔ اسلامی تہذیب کا دور خلافت راشدہ کے اختتام پر ختم ہوگیا تھا' اس کے بعد مسلمانوں نے جس تہذیب کو فروغ دیا' وہ حقیقتاً اسلامی تہذیب نہ تھی' بلکہ اسلامی اور عجمی تہذیب کی ایک ایسی آمیزش تھی جس سے ملت اسلامیہ کی روح حریت کہ بہ منزلہ متاع اصلی کے تھی' فنا ہوگئی۔

غرض مغرب کا یہی رعب آج دنیائے اسلام کی بنیادی کمزوری ہے اور اسی کو دور کرنا وابستگان دامن نبوی کا اولین فرض ہے۔ مصلحین امت نے بارہا اس کے لئے کوششیں کیں اور اب بھی اپنے اپنے دائروں کے اندر اور اپنے حوصلہ وہمت کے مطابق کرتے جاتے ہیں' چنانچہ اس موضوع پر تقریروں اور تحریروں کا ایک وافر ذخیرہ جمع ہوگیا ہے' خصوصاً ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کا احساس دینی بہ مقابلہ دیگر ممالک اسلامیہ کے زیادہ بیدار ہے' لیکن "مغرب زدگی" کی ایک شامت یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم یافتہ جماعت کے لئے کوئی چیز اس وقت تک قابل اعتنا نہیں ہوتی' جب تک وہ مغربی لباس سے آراستہ نہ ہو' اور اس عموم میں ہمارے ملک کے نوجوانوں کو ایک خاص

Marfat.com

خصوصیت حاصل ہے' اس لئے ضرورت تھی کہ انگریزی زبان میں جو تقریباً تمام ممالک اسلامیہ میں کسی نہ کسی حد تک رائج ہو چکی ہے اور ہندوستان میں ثانوی زبان کی حیثیت اختیار کر چکی ہے' ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں مسلمانوں کے اصلی مرض کی تشخیص اور اس کے علاج کا صحیح طریقہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہو۔ پیش نظر تصنیف ''اسلام اون دی کراس روڈز'' (Islam on the Crossroads) اس ضرورت کو نہایت خوبی کے ساتھ پورا کرتی ہے۔ اس کا لائق مصنف محمد اسد (Leopold Weiss) آسٹریا کا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحب قلم ہے' جس نے دس بارہ سال ممالک اسلامیہ کی سیاحت میں گذارے ہیں اور مسلمانوں کی موجودہ حالت کا نہایت غور وفکر سے مطالعہ کیا ہے۔ اس نے ان کی ماضی کی تاریخ اور لٹریچر پر بھی گہری نظر ڈالی ہے اور پھر ان کی موجودہ بدحالی کے حقیقی اسباب وعلل کی جستجو بھی کی ہے۔ اسی دوران میں ہادی مطلق نے اس کے قلب کو اپنے انوار ہدایت سے منور فرمایا' اور قبول اسلام کے شرف وامتیاز سے سربلندی بخشی۔ اسلام کی عظمت کا سچا احساس جو اس نومسلم کے قلم سے ظاہر ہو رہا ہے' وہ اکثر سیزدہ صد سالہ مسلمانوں کے لئے عبرت وموعظت کا سبب ہو سکتا ہے۔

تمام دنیا کی طرح اس وقت دنیائے اسلام بھی ایک انقلابی دور سے گزر رہی ہے۔ یہاں بھی قدیم رسوم اور خیالات غائب ہو رہے ہیں اور ان کی جگہ جدید خیالات رونما ہو رہے ہیں' لیکن سوال یہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی کا یہ انقلاب جو ترقی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے' حقیقتاً مسلمانوں کو کہاں لے جا رہا ہے اور یہ ''ترقی'' اسلام کے مقاصد عالیہ کے کہاں تک مطابق ہے؟ مسلمانوں کے سامنے اس وقت سب سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ تہذیب مغرب سے متعلق ان کا طرز عمل کیا ہونا چاہیے۔

فاضل مصنف نے یہ حقیقت پالی ہے کہ اسلامی اور مغربی تہذیبوں کے بنیادی اصول یکسر مختلف ہیں اور دونوں میں تطابق پیدا کرنا قطعی طور پر ناممکن۔ اسلامی تہذیب کی بنیاد تمام تر مذہب پر قائم ہے۔ یہاں مذہب سے مراد محض وہ ''عبادت'' نہیں جو مخصوص ریاضتوں تک محدود ہے' مثلاً نماز یا روزہ' بلکہ اس کا وسیع دائرہ انسان کی تمام عملی زندگی کو محیط ہے۔ یہی اسلام کا وہ مختص مقام ہے جو اس کو دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتا ہے۔ ہماری زندگی کا واحد مقصد خدا کی عبادت ہے: و ما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون اور خدا کی عبادت نام ہے ان چند در چند اخلاقی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا جو خالص مذہبی ریاضتوں کے علاوہ محض انسان ہونے کی حیثیت سے ہم پر عائد ہیں۔ عبادت کے مفہوم میں اس نقطہ نظر سے ہماری زندگی کے تمام بڑے اور چھوٹے کام شامل ہیں: ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین۔

برخلاف اس کے جیسا مصنف نے دکھایا ہے' مغرب جدید کی عمارت خالص مادی بنیادوں پر قائم ہے۔ اس کا نصب العین فطرت کی تفتیش وتحقیق اور اس پر حکمرانی کرنا ہے۔ اس کی زندگی تمام تر حیات دنیاوی تک محدود ہے۔ مذہبی تخیل کی بنا اس عقیدہ پر ہے کہ مادی حدود سے ماورا ایک ہمہ گیر اخلاقی قانون کا وجود بھی ہے' جس کی اطاعت ہم انسانوں کے لیے لازمی ہے' لیکن جدید مغربی تہذیب کسی ایسے قانون کی اطاعت تسلیم نہیں کرتی۔ وہ صرف اقتصادی'

Marfat.com

معاشرتی یا قومی قانون کی اطاعت ضروری خیال کرتی ہے۔اس کا حقیقی معبود عیش و آسایش اور اس کا حقیقی فلسفہ قوت ہے۔وہ خدا کے وجود سے انکار نہیں کرتی' بلکہ بعض صورتوں میں معاشرتی اغراض کے لئے مذہب کی ظاہری شکل کو قائم رکھنا چاہتی ہے' لیکن اس کے نظام عقل میں (نعوذ باللہ) خدا کا کوئی مصرف نہیں ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغرب کی جدید مادی تہذیب عیسائیت کی گود میں کیونکر پرورش پاتی رہی' لیکن یہ خیال ہی غلط ہے کہ موجودہ تہذیب عیسائیت کی پیداوار ہے۔مصنف نے بہت وضاحت کے ساتھ دکھایا ہے کہ یہ تہذیب اس بغاوت کا نتیجہ ہے' جو کلیسائے مسیحی کے صدیوں کے استبداد و تشدد کے خلاف یورپ کے قوائے ذہنی نے بالآخر برپا کی اور مغرب کی تمام سائنٹیفک اور مادی ترقیاں دراصل اسی بغاوت کا حاصل ہیں۔اس کے بعد موصوف نے اس واقعہ پر تاریخ کی روشنی ڈالی ہے کہ کلیسا کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے میں یورپ بڑی حد تک عربوں کا رہین منت ہے۔انہوں نے یونانی علوم و تمدن کے بہترین اجزا اخذ کر کے اپنے علوم و تمدن کی آمیزش سے ان کو از سر نو زندہ کیا اور ٹھیک اس وقت جب یورپ کلیسا کی تعدیوں سے تنگ آ کر اپنی آزادی کے لئے تاریکی میں ہاتھ پیر مار رہا تھا' اسے ان علوم و تمدن کی روشنی دکھا کر آزادی کی شاہراہ پر لا کھڑا کر دیا۔اس طرح عربوں کی وساطت سے یورپ کو ایک نئی زندگی نصیب ہوئی۔مصنف کا بیان ہے کہ ''قرون وسطیٰ نے یورپ کے قوائے اجتہادی کو بالکل برباد کر دیا تھا' تمام علوم پر جمود کی کیفیت طاری تھی' وہم پرستی کا تسلط ہر جگہ تھا' معاشرت ایسی ابتدائی اور ناقص حالت میں تھی کہ آج اس کا یقین بھی مشکل سے ہوگا' اس وقت دنیائے اسلام کا علمی اور تمدنی اثر جو پہلے مشرق میں محاربات صلیبی اور مغرب میں اندلس کی عالیشان یونیورسٹیوں کے ذریعہ اور پھر بعد میں ان تجارتی تعلقات کی راہ سے جو جنیوا اور وینس کی جمہوریتوں کے ساتھ روز بروز بڑھتے جا رہے تھے' رونما ہوا اور تہذیب یورپ کے بند دروازوں کو کھٹکھٹانا شروع کیا۔یورپ کے فضلاء اور فلاسفہ کی خیرہ نگاہوں کے سامنے ایک دوسری ہی تہذیب ظاہر ہوئی۔نفیس' ترقی پذیر' ولولہ انگیزیوں سے معمور اور ان خزینوں کی مالک جنہیں یورپ مدتوں پہلے کھو کر فراموش کر چکا تھا' لیکن عربوں نے قدیم یونانی علوم و تمدن کے احیا کے علاوہ بھی بہت کچھ کیا۔انہوں نے خود اپنی ایک بالکل جدید سائنٹفک دنیا پیدا کی اور ترقی کی نئی راہیں دریافت کر کے انہیں ترقی دی۔یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہمارے موجودہ سائنٹفک دور کا افتتاح مسیحی یورپ کے شہروں میں نہیں' بلکہ دمشق' بغداد' قاہرہ اور قرطبہ کے اسلامی مرکزوں میں ہوا۔'' چنانچہ یہ اسلامی تعلقات کی اسی حیات بخشی کا اعتراف ہے کہ یورپ اپنی بیداری کے اس دور کو ''نشاۃ ثانیہ'' (Renaissance) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

اسلامی تعلقات کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ نمایاں اثر یہ ہوا کہ یورپ کے بہترین دماغوں نے کلیسا کے بند استبداد سے آزادی حاصل کرنے کے لئے ایک تازہ قوت کے ساتھ جنگ شروع کر دی۔ابتداءً اس جنگ نے تحریک اصلاح کی صورت اختیار کی جو تقریباً بیک وقت مختلف ملکوں میں جاری ہوگئی۔اگر یہ تحریک اعتدال کے ساتھ جاری رہتی تو بہت ممکن تھا کہ یورپ میں سائنس اور مذہب کی کشیدگی ایک حد تک دور ہو جاتی' لیکن کلیسا کی تعدیاں اس درجہ تک پہنچ چکی تھیں کہ ان کی اصلاح میں اعتدال قائم رہ نہ سکا۔علاوہ بریں تھوڑے ہی دنوں میں یہ تحریک مذہبی حدود

Marfat.com

سے نکل کر مختلف جماعتوں کی سیاسی کشمکش سے وابستہ ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کا تسلط روز بروز کم ہوتا گیا' یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی کے ربع آخر میں انقلاب فرانس کے ہاتھوں کلیسا کا استیلاء ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ اس کے بعد ہی صنعت و حرفت کی ترقی کا دور شروع ہوا اور یورپ جو مذہب کی قید سے ایک گونہ آزاد ہو چکا تھا' پوری سرگرمی کے ساتھ مادی ترقی کی ان جدید راہوں میں مشغول و منہمک ہوگیا۔ انیسویں صدی کے دوران میں مذہب کا وہ خفیف سا تعلق بھی جو انقلاب فرانس کی ہنگامہ خیزیوں کے بعد باقی رہ گیا تھا' منقطع ہو گیا اور یورپ کلیسا کے تلخ تجربہ کی بنا پر مذہب کی شکل و نوع کا قطعی طور پر مخالف ہوگیا۔ یہ صحیح ہے کہ مغرب میں اب بھی کچھ لوگ ایسے ہیں' جو اپنے اندر سچا مذہبی احساس رکھتے ہیں' لیکن ان کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ اکثریت انہی لوگوں کی ہے جو مذہبی قیود سے آزاد ہیں۔ مصنف کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ یورپ کا عام باشندہ خواہ وہ جمہوریت پسند ہو یا فاستی نظام سرمایہ داری کا موید ہو یا اصول اشتراکی کا' غرض کسی سیاسی مسلک سے تعلق رکھتا ہو' صرف ایک ہی یقینی مذہب کو جانتا ہے یعنی مادی ترقی کی پرستش اور صرف ایک ہی عقیدہ رکھتا ہے' یعنی زندگی کا مقصد بجز اس کے کچھ بھی نہیں کہ اسے روز بروز زیادہ پرعیش اور "فطرت سے آزاد" بنایا جائے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی تہذیب لازمی طور پر اس تمدن کے لئے زہر قاتل ہوگی' جس کی بنیاد مذہب پر قائم ہے۔ اسلام میں پہلا اور سب سے بڑھ کر مقصد انسان کی باطنی اور اخلاقی ترقی ہے' لیکن مغرب کی جدید تہذیب میں حالت بالکل برعکس ہے۔ وہاں مادی افادیت کا خیال اعمال انسانی کے تمام مظاہر پر چھایا ہوا ہے اور اخلاقیات کی اہمیت روز بروز زائل ہوتی جاتی ہے۔

مذکورہ بالا مذہبی اور تمدنی ناموافقت کے علاوہ ایک سبب اور بھی ہے' جس کی بناء پر مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے اتباع سے پرہیز کرنا چاہیے' وہ یہ کہ مغربی تہذیب اسلام کے خلاف ایک دیرینہ بغض و عناد کا جذبہ اپنے اندر رکھتی ہے۔ یہ جذبہ حسب تصریح مصنف ایک حد تک قدیم یونانی اور رومن تہذیب کا ترکہ ہے' یونان اور رومہ کے باشندے صرف اپنے ہی کو تہذیب و تمدن کا مالک سمجھتے تھے' ان کے علاوہ تمام دنیا کے لوگ خصوصاً وہ جو بحر روم کے مشرق میں آباد تھے "بربری" اور "وحشی" تھے۔ یہ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ آج بھی یورپ اپنے علاوہ تمام دوسری قوموں اور نسلوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

لیکن برخلاف دیگر اقوام و مذاہب کے اسلام کے خلاف یورپ کا جذبہ حقارت ہی کا نہیں' بلکہ ایک دیرینہ اور مستقل دشمنی کا جذبہ بھی ہے۔ اسلام کے علاوہ ہر مذہب سے متعلق یورپ ہمیشہ غور و تامل سے کام لیتا ہے اور آج جبکہ ہر چیز سائنٹفک تحقیق کی روشنی میں دیکھی جا رہی ہے۔ مذاہب کے مطالعہ و تفحص میں بھی جذباتی میلان کا دخل کم ہوتا جاتا ہے' لیکن جوں ہی یورپ کی توجہ اسلام کی طرف ہوتی ہے' اس کا دماغی توازن دفعتہً بگڑ جاتا ہے اور تمام سائنٹفک غیر جانبداری پس پشت ڈال دی جاتی ہے۔ یورپ کے اکابر مستشرقین بھی جیسا کہ مصنف نے صاف صاف بیان فرمایا ہے' اسلام سے متعلق ایسی صریح جانب داری کے مرتکب ہوتے آئے ہیں جو اصول علمی کے سراسر منافی

Marfat.com

ہے۔ وہ اپنی تحقیق کی ابتدا اس نتیجہ سے کرتے ہیں جو ان کا تعصب پہلے سے قائم کر لیتا ہے۔ اسلامی روایات کو مسخ کر کے پیش کرنا ان کا عام شیوہ ہے۔ اس میں کسی خاص ملک کی تخصیص نہیں۔ انگلستان' جرمنی' روس' فرانس' اٹلی اور ہالینڈ' بلا استثناء ہر ملک کے مستشرقین نے یکساں طور پر اسلام کے خط و خال کی تصویر نہایت کریہہ اور نفرت انگیز شکل میں کھینچ کر دنیا کے سامنے پیش کرنی چاہی ہے اور چونکہ یہ مستشرقین اپنی تہذیب و تمدن اور اپنے ماحول کے ترجمان ہیں' اس لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تمام یورپ مذہب اور تمدن دونوں کے لحاظ سے اسلام کے خلاف ایک مستقل عناد رکھتا ہے۔ اس کا ایک سبب تو وہی قدیم یونانی اور رومن تہذیب کا ترکہ یعنی ''یورپین'' اور ''باربیرین'' کی خود ساختہ تفریق ہے اور دوسرا سبب جس کا تعلق براہ راست اسلام سے ہے' قرون وسطیٰ کی تاریخ میں پایا جاتا ہے۔

فاضل مصنف نے تصریح فرمائی ہے کہ متحدہ یورپ اور اسلام کے درمیان پہلا زبردست تصادم محاربات صلیبی کی شکل میں ظاہر ہوا اور یہ عین اس وقت پیش آیا جب یورپین تہذیب اپنے ابتدائی مدارج سے گزر رہی تھی۔ محاربات صلیبی سے پیشتر بھی اہل یورپ اور مسلمانوں میں لڑائیاں ہو چکی تھیں مثلاً صقلیہ اور اندلس کی عرب فتوحات اور جنوبی فرانس پر عربوں کا حملہ' لیکن یہ معرکے اس وقت پیش آئے تھے جب یورپ کا جدید تمدن شروع نہیں ہوا تھا' اس لئے ان کی اہمیت تمام تر مقامی تھی۔ برخلاف اس کے محاربات صلیبی میں اسلام کا مقابلہ یورپ کے کسی خاص ملک یا قوم سے نہ تھا' بلکہ ہر ملک و قوم نے متحد ہو کر زور آزمائی کی تھی اور یہ پہلا موقع تھا جب یورپ نے اپنی وحدت کا احساس کیا۔ اس سے پہلے پورا براعظم اینگلو سیکسن' جرمن' فرنچ' نارمن' اٹالین' ڈین وغیرہ قوموں میں تقسیم تھا' لیکن محاربات صلیبی ہی کے دوران میں ''مغربی تہذیب'' کا جدید تخیل پیدا ہوا' جس میں یورپ کی تمام قومیں یکساں طور پر شریک تھیں۔ یہ اتحاد تمام تر اس عناد کا پیدا کردہ تھا جس نے اسلام کے خلاف یورپ کی ہر قوم کو برانگیختہ کر دیا تھا۔

فاضل مصنف کا خیال ہے کہ مشرق و مغرب کے تعلقات کی تلخی ان ناقابل بیان مظالم کا نتیجہ ہے جو مبارزین صلیب کے ''مقدس'' ہاتھوں سے ممالک اسلامیہ کو پہنچے اور بغض و عناد کا جو بیج محاربات صلیبی نے بویا' وہ برابر نشوونما پاتا رہا' ورنہ حقیقتاً تعلقات کی ایسی شدید ناگواری کے لئے کوئی خلقی سبب موجود نہ تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اسلامی اور مغربی تہذیبیں بالکل مختلف اور جداگانہ بنیادوں پر قائم ہیں' لیکن جیسا کہ موصوف نے تاریخی دلائل سے دکھایا ہے' ان کے درمیان دوستانہ روابط کا قیام ناممکن نہ تھا اور جہاں تک اسلام کا تعلق ہے' اس نے یورپ کی طرف ہمیشہ رواداری اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا' مثلاً جب خلیفہ ہارون رشید نے شہنشاہ شارلیمان کے دربار میں اپنی سفارت بھیجی تھی تو یہ اسی جذبہ رواداری کا عملی اظہار تھا' ورنہ قوم فرینک کی دوستی سے خلیفہ کو کسی مالی منفعت کی توقع نہ تھی۔ یورپ اس وقت اپنے تمدن کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا تھا اور اس میں اسلامی تعلقات سے کماحقہٗ فائدہ اٹھانے کی اہلیت نہ تھی' تاہم اس کی طرف سے ان تعلقات کی نسبت کسی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا گیا۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر محاربات صلیبی کے پیش آ جانے سے اسلام اور یورپ کے باہمی تعلقات کا شیرازہ دفعتہ درہم برہم نہ ہو گیا ہوتا تو باوجود مذہبی اور تمدنی اختلافات کے یورپ اس شدت کے ساتھ آج اسلام کا دشمن نہ ہوتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ قوموں کے درمیان سیکڑوں لڑائیاں ہوئیں اور

Marfat.com

فراموش کردی گئیں' انہوں نے باہمی تعلقات پر کوئی مستقل اثر نہیں چھوڑا لیکن محاربات صلیبی کی اثر اندازی صرف میدان کارزار تک محدود نہ تھی۔ ان سے اسلام کے خلاف یورپ کا ذہن و دماغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسموم ہو گیا مغرب کے کیتھولک پادریوں نے جو علوم فنون کے تنہا مالک تھے' جاہل عوام کے سامنے اسلامی تعلیمات کو مسخ کر کے ایک ایسا نفرت انگیز نقشہ پیش کیا جس کے نقوش مرور زمانہ اور تحقیق علمی کے باوجود آج تک مٹ نہ سکے۔

نفرت و عداوت کا جو بیج محاربات صلیبی کے ہاتھوں بویا گیا تھا' وہ بہت جلد بار آور ہونے لگا۔ اندلس کے عیسائیوں نے اسلامی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی اور اس مقصد کے حصول میں جتنی تاخیر ہوتی گئی' اتنا ہی اسلام کے خلاف یورپ کا جذبہ عناد زیادہ مضبوط اور مستقل ہوتا گیا۔ بالآخر انتہائی مظالم اور درندگی کے ساتھ اندلس کے بے شمار مسلمان قتل و برباد کر دیئے گئے اور جو ان روح فرسا تعدیوں کے بعد باقی رہ گئے انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔

ہنگامہ اندلس کی بازگشت ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک تیسرا نہایت اہم واقعہ پیش آ گیا جس نے یورپ اور اسلام کے رہے سہے تعلقات کو بھی برباد کر دیا یعنی ترکوں کا سلطنت بازنطینی کے پایہ تخت قسطنطنیہ پر قبضہ کر لینا سقوط قسطنطنیہ کے بعد یورپ میں اسلامی فتوحات کا جو سلسلہ شروع ہوا' وہ صدیوں تک قائم رہا اور اب اسلام کے خلاف یورپ کی دشمنی صرف مذہبی اور تمدنی اختلاف تک محدود نہ رہی بلکہ اس نے سیاسی اہمیت بھی حاصل کر لی جس کے باعث اس کی شدت اور بڑھ گئی۔ یہ شدت یہاں تک بڑھی کہ تمدنی اور مذہبی تغیرات کے بعد بھی اس میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا اصلاح کلیسا کے عہد میں یورپ مختلف جماعتوں اور فرقوں میں تقسیم ہو گیا تھا جو ایک دوسرے کو تباہ و برباد کر دینا چاہتے تھے' لیکن اسلام کی نفرت سب کے دلوں میں یکساں طور پر راسخ تھی۔ پھر ایک زمانہ ایسا آیا' جب مذہب کا اثر یورپ میں زائل ہونے لگا' لیکن اس وقت بھی اسلام کی نفرت بدستور باقی رہی' بالآخر وہ دور شروع ہوا جب فضلائے یورپ دیانتداری کے ساتھ غیر ملکی تمدنوں کا مطالعہ کرنے لگے' لیکن اسلام کے معاملہ میں ان کی ضلالت اندیشی اپنی جگہ پر قائم رہی۔

ان تاریخی حالات کے باوجود آج بعض اسلامی حلقوں میں یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ اسلام کے خلاف یورپ کے بغض و عناد کی شدت اب کم ہوتی جاتی ہے اور وہ اسلامی تعلیمات اور اصول معاشرت سے روز بروز قریب ہوتا جا رہا ہے۔ بہتیرے مسلمان یہ توقع رکھتے ہیں کہ عنقریب تمام یورپ اسلام کا حلقہ بگوش ہو جائے گا۔ فاضل مصنف نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس دلفریب غلط فہمی کو دور کیا ہے۔ موصوف کو یقین ہے کہ تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی وہ مذہب ہے جو ہر بے لاگ تنقید کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر سکتا ہے اور جو حسب ارشاد رسول مقبول صلی بالآخر تمام نوع انسانی کا ایک عالمگیر مذہب ہو کر رہے گا' لیکن مستقبل کے جن حدود تک نظر کی رسائی ہے' اس واقعہ کے عالم ظہور میں آنے کی کوئی علامت ابھی دکھائی نہیں دیتی۔ موصوف کا خیال ہے کہ یہ امکان صرف اسی وقت عمل میں آ سکتا ہے جب یورپ کے تمدنی غرور و تمرد کی عمارت معاشرتی تباہ کاریوں کے ہاتھوں بالکل برباد ہو جائے اور اس

Marfat.com

موجودہ ذہنیت اس حد تک بدل جائے کہ اس میں مذہب کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ آج مغربی دنیا صرف اپنے مادی کارناموں کی پرستش میں محو ہے۔ وہ صرف آسائش کو اپنی تمام کوششوں کا نصب العین بنا رہی ہے' اس کی مادیت اور مذہب سے مخالفت بڑھتی جا رہی ہے اور اس میں کوئی تخفیف نہیں ہو رہی ہے جیسا کہ بعض سادہ لوح مسلمانوں کا خیال ہے۔

''یورپ آج اسلام سے جس قدر دور ہے' پہلے کبھی اس سے زیادہ نہ تھا۔ ممکن ہے کہ ہمارے مذہب کے خلاف اس کی عملی دشمنی کم ہو رہی ہو' لیکن اس کا سبب اسلامی تعلیمات کی قدر دانی نہیں بلکہ وہ روز افزوں تمدنی انحطاط و اختلال ہے جو دنیائے اسلام میں واقع ہو رہا ہے۔ مغرب ایک زمانہ میں اسلام سے خائف تھا اور اس خوف نے اسے ہر اس شے کا دشمن بنا دیا تھا جس میں اسلامی رنگ پایا جاتا تھا۔ خواہ وہ شے خالص روحانی اور معاشرتی معاملات ہی سے تعلق رکھتی ہو' لیکن ایسے وقت میں جب اسلام یورپ کے ایک مخالف کی حیثیت سے اپنی اہمیت کا بیشتر حصہ کھو چکا ہے' یہ ایک بالکل قدرتی امر ہے کہ تخفیف خوف کے ساتھ یورپ ان جذبات کی شدت میں بھی کچھ کمی کر دے جو اسلام کے خلاف ابتدا میں اس نے قائم کر لیے تھے۔ اگر ان جذبات کے اظہار و عمل میں کمی پیدا ہو گئی ہے تو اس سے ہمیں یہ نتیجہ نکالنے کا حق نہیں ہے کہ مغرب باطنی طور پر اسلام سے زیادہ قریب آ گیا ہے' اس کا یہ طرز عمل اسلام سے متعلق صرف اس کی بے پروائی کو ظاہر کرتا ہے۔''

مغربی تہذیب مذہب کی مخالف جیسی پہلے تھی' ٹھیک ویسی ہی آج بھی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یورپ اور امریکہ میں چند اسلامی انجمنیں تبلیغ کا کام کر رہی ہیں اور ان کی کوششوں سے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کر لیا ہے' لیکن یہ اس امر کی دلیل نہیں کہ مغرب پھر مذہب کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ علاوہ بریں اس معاملہ میں اسلامی مشن کوئی انفرادیت بھی نہیں رکھتا۔ عیسائیت کے بے شمار روحانی فرقوں کے علاوہ مغرب میں تھیوسیفک تحریک کا بھی اچھا خاصہ اثر ہے اور یورپ کے مختلف پایہ تختوں میں بودھ مذہب کے معبد اور مشن بھی موجود ہیں۔ جرمنی میں بودھ مشن' اسلامی مشن سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا ہے۔ اس کامیابی کی بنا پر مسلمانوں ہی کی طرح بودھ مذہب والے بھی یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یورپ ان کے مذہب سے قریب ہوتا جا رہا ہے' لیکن بقول مصنف دونوں صورتوں میں یہ دعویٰ مضحکہ انگیز ہے۔ چند افراد کا اسلام یا بودھ مذہب میں داخل ہو جانا مغربی تہذیب پر کوئی قابل ذکر اثر ڈالنے کے لئے کافی نہیں۔

موصوف کا خیال ہے کہ ان میں سے کوئی مشن چند افراد کے دلوں میں تلاش و تحقیق کے ایک بہت ہی محدود شوق سے زیادہ اب تک کچھ پیدا نہ کر سکا اور وہ بھی زیادہ تر اس اثر کی وجہ سے جو ایک غیر ملکی مذہب تخیل پسند دماغوں پر ڈالتا ہے۔ بلاشبہ بعض لوگوں نے محض حق کی تلاش میں سچائی کے ساتھ تبدیل مذہب کیا ہے' لیکن ان کا شمار مستثنیات میں ہے اور ان کے عقائد تہذیب جدید کی رو پر کچھ بھی اثر نہیں ڈالتے' برخلاف اس کے جو لوگ ہر روز خالص مادی مسلکوں میں داخل ہوتے جاتے ہیں' ان کی تعداد شمار سے باہر ہے اور انہی کے خیالات سے مغربی تہذیب کے رجحانات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

Marfat.com

اوپر دکھایا جا چکا ہے کہ چونکہ اسلامی اور مغربی تہذیبوں کی بنیادیں بالکل مخالف اصولوں پر قائم ہیں' اس لئے دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ ایسی صورت میں یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ مسلمانوں کو جو تعلیم مغربی اصولوں پر دی جائے گی' وہ ان اثرات سے محفوظ رہ سکے گی جو اسلام کے مخالف ہیں۔

مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی وقت کے ان اہم مسائل میں ہے جو ہنوز ایک متفق علیہ فیصلہ کے محتاج ہیں۔ ہمارے ارباب فکر میں ایک جماعت صرف علوم دینیہ کی تعلیم کو ضروری بلکہ کافی خیال کرتی ہے۔ دوسری جماعت ان ''روشن خیال'' مفکرین کی ہے جو تمام تر علوم جدیدہ کے شیدائی ہیں۔ اکثریت انہی کی ہے اور موجودہ نسل انہی کی متبع اور ہم نوا ہے' لیکن ان دونوں کے درمیان ایک تیسری جماعت بھی ہے جس کا عقیدہ ہے کہ اسلام دین اور دنیا دونوں کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے' اس لئے وہ علوم بھی جو مادی اور ''دنیاوی'' ہونے کی حیثیت سے خالص مذہبی حلقوں میں مسترد کر دیئے گئے ہیں' مسلمانوں کی توجہ کے مستحق اور رفتار زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے ضروری ہیں۔ فاضل مصنف اسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں' لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ مذہب کا اثر ان اشخاص کے دلوں سے جنہوں نے مغربی اصولوں پر تعلیم پائی ہے' سرعت کے ساتھ زائل ہو رہا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقوں میں مذہب سے جو بے تعلقی اور برگشتگی پھیلی ہوئی ہے' اس کا سبب نادانوں کے نزدیک یہ قرار دیا جاتا ہے کہ مغربی سائنس مذہب کی صداقت کو غلط ثابت کر رہی ہے۔ موصوف اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سائنس مذہب کی صداقت کے خلاف کوئی معقول حجت پیش کرنے سے اس وقت تک قاصر ہے اور اس برگشتگی کا سبب محض یہ ہے کہ تہذیب جدید کا عقلی ماحول جو نہایت شدت کے ساتھ خلاف مذہب ہے' نوجوان مسلمانوں کے قوائے مذہبی کو اپنے اثر سے بالکل ماؤف کر دیتا ہے۔

اس وقت بنیادی سوال یہ ہے کہ علوم جدیدہ سے متعلق ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

مسلمانوں کے لئے مغربی تعلیم کو مضر قرار دینے کے یہ معنی نہیں کہ اسلام نفس تعلیم کا مخالف ہے۔ جو لوگ اسلام پر یہ الزام عائد کرتے ہیں' وہ یا تو مذہب اور تاریخ دونوں سے ناواقف ہیں یا تعصب کی شدت سے مغلوب ہو کر دیدہ و دانستہ غلط بیانی کرتے ہیں۔ قرآن پاک شروع سے آخر تک عقل و شعور اور فکر و تدبر کی دعوتوں سے پُر ہے۔ پھر طالب علم کی فرضیت اور اہمیت پر مشہور حدیث: طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة کے علاوہ ارشادات نبوی کا ایک خاصہ ذخیرہ موجود ہے۔ اسلام علوم جدیدہ کی تحصیل سے نہیں روکتا۔ مسلمانوں کو ان علوم کے حاصل کرنے اور مغربی قوموں کی طرح سائنٹفک اور اقتصادی حیثیت سے ترقی کرنے کی پوری اجازت ہے۔ مغربی تعلیم فی نفسہٖ ان کے لئے کوئی مضرت نہیں رکھتی' لیکن جو چیز ان کے لئے مضرت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ مغربی آنکھوں سے دیکھیں اور مغربی دماغوں سے سوچیں۔ فاضل مصنف نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ علم بذات خود نہ مشرقی ہے اور نہ مغربی' لیکن اس کی تحصیل و مطالعہ میں ہر قوم کا نقطہ نظر اس کی مخصوص تمدنی ذہنیت کے مطابق ہوتا ہے۔ مغرب کی موجودہ ذہنیت اپنی اعلیٰ عقلیت کے باوجود تمام تر مادی اور مخالف مذہب ہے' اس لئے اس کا پورا تعلیمی نظام بھی اسی رنگ میں

Marfat.com

رنگا ہوا ہے۔ جہاں تک جدید تجربی سائنسوں کا تعلق ہے'ان کی تحصیل مسلمانوں کے لئے مضرت رساں نہیں۔ مضرت صرف اس مغربی ذہنیت میں ہے' جس کے توسط سے مسلمان ان سائنسوں کو حاصل کر رہے ہیں۔

اگر مسلمان طلب علم کے فریضہ کی ہمیشہ پابندی کرتے تو آج انہیں ان جدید سائنسوں کے لئے یورپ کا محتاج ہونا نہ پڑتا اور وہ اس کی طرف ''ویسی نگاہ نہ ڈالتے جیسی کوئی پیاس کا مارا ریگستان میں پڑا ہوا افق کے سراب پر ڈالتا ہے۔'' لیکن غفلت میں مبتلا رہ کر انہوں نے اپنے مواقع کھو دیئے اور یورپ ترقی کی راہ میں ان سے بہت آگے بڑھ گیا۔ اب وہ مجبور ہیں کہ جدید سائنسوں کو یورپ کے تعلیمی واسطہ سے حاصل کریں' لیکن اس میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔ مصنف کی رائے ہے کہ یورپ سے ہمیں صرف سائنٹفک مواد (Matter) اور طریقہ (Method) حاصل کرنا چاہیئے' اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ موصوف کے نزدیک مدارس اسلامیہ کے نصاب میں تمام علوم مغربی میں سے صرف علوم طبیعہ (Natural Sciences) اور ریاضیات کی تعلیم کو نمایاں جگہ دینی چاہیئے' باقی مغربی فلسفہ' مغربی لٹریچر اور وہ تاریخ عالم جو مغربی نقطہ نظر سے مرتب کی گئی ہو' اسلامی نصاب تعلیم میں ان سب کی اہمیت بہت کم کر دینی چاہیے۔ مغربی لٹریچر کی تعلیم کو محض اس کی لسانی حیثیت تک محدود رکھنا چاہیے۔ اس کی تعلیم کا جو طریقہ اس وقت ممالک اسلامیہ میں رائج ہے' اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن کی روح مسلمان طلبہ کے خادم دماغوں میں سرایت کر جاتی ہے جو اسلام کی روح کے ساتھ کبھی ہم آہنگی نہیں ہو سکتی۔ ضرورت ہے کہ مغربی لٹریچر کے بجائے اسلامی لٹریچر کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جائے ''تا کہ اسلامی تمدن کی وسعت و زرریزی مسلمان طلبہ کے ذہنوں کو متاثر کرے اور ان میں مستقبل کے لئے ایک نئی امید پیدا ہو۔''

یورپین لٹریچر کی مروجہ تعلیم سے زیادہ مسلمان نوجوانوں کے لئے اس تاریخ عالم کا مطالعہ مضر ہے جو اہل مغرب کے قلم سے نکلتی ہے۔ مورخین یورپ جب دنیا کی تاریخ لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ یورپ کی نسلیں اور ان کی تہذیب تمام دوسری نسلوں اور تہذیبوں پر فوقیت رکھتی ہے اور اسی خود ساختہ فوقیت کو وہ ساری دنیا پر حکمرانی کرنے کے لئے ایک سند تصور کرتے ہیں۔ دنیا کی جو تاریخ ان کے قلم سے نکلتی ہے' وہ ''حقیقتاً ایک وسیع پیمانہ پر مغرب ہی کی تاریخ ہوتی ہے جس میں دوسری قوموں کا ذکر صرف اسی حد تک آتا ہے جس حد تک ان کے وجود اور ترقی سے خود یورپ پر کوئی اثر براہ راست پڑتا رہا۔'' ظاہر ہے کہ ایسی تاریخ کا مطالعہ مشرقی نوجوانوں کے دماغوں پر صرف یہ اثر ڈالے گا کہ وہ اپنے تمدن' اپنے ماضی اور نیز مستقبل کے امکانات میں یورپ کی قوموں سے بہت گرے ہوئے ہیں۔

سخت ضرورت ہے کہ اس اثر کو دور کرنے کے لئے اسلامی اداروں میں تاریخ کی تعلیم پر نظر ثانی کی جائے۔ بلاشبہ یہ کام آسان نہیں' اس کے لئے تمام تاریخ کی تفتیش و تحقیق از سرنو کرنا پڑے گی' لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا تو مسلمان طلبہ کے دلوں میں اسلام کی حقارت کا جذبہ روز بروز زیادہ مضبوط ہوتا جائے گا اور اپنی پستی کا احساس ان کے اندر بڑھتا ہی جائے گا۔ ''اگر مسلمان اب تک سائنٹفک تحقیقات کی طرف سے غافل تھے' تو آج اس غلطی کی تلافی اس

Marfat.com

طرح نہیں ہوسکتی کہ ہم بے سوچے سمجھے مغربی علوم کو قبول کر لیں۔ سائنس سے متعلق ہماری تمام پچھلی کوتاہیاں اور ہمارا افلاس اس مہلک اثر کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا جو مغربی نظام تعلیم کی کورانہ تقلید سے دنیائے اسلام کے مذہبی امکانات پر پڑے گا۔ اگر ہم اسلام کی حقیقت کو ایک تمدنی عنصر کی حیثیت سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں تہذیب مغرب کے عقلی ماحول سے بچنا ضروری ہے جو ہماری سوسائٹی اور ہمارے میلان پر غلبہ پا رہا ہے۔ مغربی اخلاق و آداب اور مغربی طرز معاشرت کی تقلید سے مسلمان رفتہ رفتہ مغربی مطمع نظر کو اختیار کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں' ظاہری وضع وقطع کی تقلید بتدریج ویسی ہی ذہنیت بھی پیدا کر دیتی ہے۔''

آج کل اکثر تعلیم یافتہ اشخاص کا خیال ہے کہ لباس اور وضع کو کسی قسم کی روحانی اہمیت حاصل نہیں ہے اور نہ مذہب رسم ورواج کا پابند ہے۔ مصنف کو بھی اعتراف ہے کہ اسلام میں تنگ ذہنی نہیں' لیکن وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ کسی تہذیب کی ظاہری وضع وقطع کو اختیار کرنا اس تہذیب کی روح سے متاثر ہوئے بغیر ممکن ہی نہیں ہے اور وہ بالکل صحیح فرماتے ہیں کہ قطع نظر اس واقعہ کے کہ مغربی تہذیب کی بہتیری باتیں صریحی طور پر تعلیمات اسلام کے خلاف ہیں' مثلاً عورتوں اور مردوں کا آزادانہ ایک دوسرے سے ملنا جلنا یا سود کا رواج۔ یہ تہذیب خود اپنی فطرت کی بنا پر بھی تمام تر مخالف مذہب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں تک اس تہذیب کی اثر اندازی کا تعلق ہے' وہ معاشرتی زندگی کے ''اہم'' اور ''غیر اہم'' پہلوؤں کی تفریق کو روا نہیں رکھتے۔ علاوہ بریں ''اگر کوئی مسلمان یورپ کے لباس' اخلاق وآداب اور طرز معاشرت کی تقلید کرتا ہے تو خواہ اس کا ادعا کچھ بھی ہو' وہ اس حقیقت کو فاش کر دیتا ہے کہ اس کے نزدیک یورپین تہذیب کو ترجیح حاصل ہے۔'' اس موقع پر موصوف نے چند سطروں میں جو کچھ لکھ دیا ہے' وہ اپنے اندر عبرت وبصیرت کا ایک پورا دفتر رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں: ''کسی غیر تہذیب کی تقلید کا میلان خود اپنی پستی کے احساس کا نتیجہ ہے۔ یہی اور صرف یہی حال ان مسلمانوں کا ہے جو مغربی تہذیب کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ اس تہذیب کی قوت' فنی استعداد اور ظاہری چمک دمک کا مقابلہ دنیائے اسلام کی زبوں حالی سے کرتے ہیں اور پھر یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں مغربی راہ کے علاوہ کوئی دوسری راہ نہیں ہے۔ اسلام کے سر خود اپنی کوتاہیوں کا الزام عائد کرنا آج کل ایک دستور ہو گیا ہے۔ ہمارے نام نہاد عقلا زیادہ سے زیادہ جو کرتے ہیں' وہ یہ کہ معذرت اور صفائی کا پہلو اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے اور دوسروں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام مغربی تہذیب کی روح کو بخوبی قبول کر سکتا ہے۔''

سطور بالا میں مصنف نے جس ذہنیت کو دکھایا ہے' وہ اسی مرعوبیت کا نتیجہ ہے جس کا ذکر ہم نے اس تبصرہ کے ابتدائی حصہ میں کیا ہے۔ مغرب کا رعب مسلمانوں کے دماغوں پر اس درجہ مستولی ہو گیا ہے کہ وہ ہر چیز کو اسی کے معیار سے جانچتے ہیں' چنانچہ مذہب کے ساتھ بھی ان کا طرز عمل یہی ہے۔ وہ اس حقیقت کے اعلان کی جرأت تو نہیں رکھتے کہ اسلام اور مغربی تہذیب کی بنیادیں بالکل مخالف اصولوں پر قائم ہیں' اس لئے ان میں ہم آہنگی پیدا کرنا کسی صورت سے ممکن ہی نہیں' لیکن اپنے خیال میں اسلام کی حمایت یوں کرتے ہیں کہ اس کے اصولوں کو کھینچ تان کر مغربی تہذیب سے مطابق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مصنف نے اسی افسوسناک ذہنیت کو دور کرنا چاہا ہے اور مسلمانوں کو

Marfat.com

غیرت دلائی ہے کہ جس چیز کو وہ اپنے لئے عار سمجھ رہے ہیں' وہ حقیقتاً باعث صد فخر و ناز ہے۔ فرماتے ہیں:

''احیائے اسلام کے حصول کے لئے اصلاحی تدبیریں اختیار کرنے سے پیشتر ضروری ہے کہ مسلمان اپنے مذہب کی نسبت معذرت کا پہلو بالکل ترک کر دیں۔ مسلمان کو اپنا سر بلند کر کے رہنا چاہیے' اسے سمجھنا چاہیے کہ وہ تمام دنیا سے مختلف اور ممیز ہستی ہے اور اسے اپنی اس انفرادیت پر حد درجہ فخر ہونا چاہیے۔ اسے چاہیے کہ اس فرق کو ایک بیش قیمت وصف سمجھ کر محفوظ رکھنے کی کوشش کرے اور دلیری کے ساتھ دنیا کے سامنے اس کا اعلان کرے' نہ یہ کہ اس کے لئے معذرت پیش کرے اور دوسرے تمدنی حلقوں میں ضم ہو جانے کی کوشش کرے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمان اپنے کو خارجی اثرات سے بالکل علیحدہ رکھیں' اپنی تہذیب کو برباد کئے بغیر بھی کسی غیر تہذیب کے اثرات کو قبول کرنا ہمیشہ ممکن ہے۔''

فاضل مصنف کا خیال ہے کہ اب تک مسلمانوں کی اصلاح میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہونے کا سبب محض یہ ہے کہ سنت نبویؐ کے اتباع پر کافی زور نہیں دیا گیا۔ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی طرح وہ سمجھتے ہیں کہ سنت کی پابندی اسلام کے وجود و ترقی کی مترادف اور اس سے غفلت اس کے اختلال و زوال کے ہم معنی ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے تمام امراض ملّی کا واحد علاج اتباع سنت ہے اور یہی وہ مخصوص تجویز ہے جو موصوف کو عہد حاضر کے اکثر مصلحین امت سے ممتاز کر دیتی ہے۔ سنت کی جو اہمیت بیسویں صدی کے اس نومسلم کے دل میں راسخ ہے' کاش ایک ٹکڑا بھی ان مسلمانوں کو نصیب ہوتا جو صدیوں سے اسلام کے مدعی ہیں' لیکن اتباع رسول کی ناگزیری کے قائل نہیں۔ مصنف نے صحیح فرمایا ہے کہ ایسے لوگوں کی مثال اس شخص کی ہے جو کسی محل میں داخل ہونے کی خواہش کرتا ہے' لیکن اس کنجی کو استعمال کرنا نہیں چاہتا جس کے بغیر دروازہ کا کھلنا ممکن ہی نہیں۔ موجودہ دور میں بعض دانش فروشوں نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ اسلام کی حقیقت سنت نبویؐ سے بے نیاز رہ کر بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ حضورؐ کی حیات طیبہ قرآن پاک کی ایک زندہ تفسیر تھی اور آپ نے جو احکام صادر فرمائے' وہ اسی ذات باری تعالیٰ کے حکم و ایماء سے فرمائے' جس نے یہ کتاب مقدس آپ پر نازل فرمائی تھی' ما ینطق عن الھوی. مصنف کا قلب سنت کے ولولہ سے ایسا معمور ہے کہ وہ رسولؐ کے احکام میں اس تفریق کو جائز نہیں سمجھتے کہ فلاں فلاں احکام روحانی اور مذہبی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں' اس لئے زیادہ اہم اور لائق پابندی ہے اور فلاں فلاں کا تعلق دنیاوی معاملات سے ہے' اس لئے ان کی اہمیت بھی کم ہے۔ یہ تفریق ان کے نزدیک مقام رسالت کی جامعیت سے ناآشنا ہونے کی علامت ہے۔ کیا اس زمانہ کے کسی بڑے سے بڑے عالم دین نے بھی سنت کی اہمیت پر اس سے زیادہ زور دیا ہے؟

دور جدید کے اکثر ''روشن خیال'' مسلمان اتباع سنت کے لئے اپنی آمادگی تو ظاہر کرتے ہیں' لیکن انہیں احادیث کی صحت میں کلام ہے اور چونکہ سنت کی بنیاد تمام تر احادیث پر ہے' اس لئے وہ اپنے کو سنت کی پیروی سے معذور خیال کرتے ہیں۔ اس فتنہ کی اشاعت بھی مستشرقین یورپ کا ایک نمایاں کارنامہ ہے۔ مصنف نے اس مسئلہ پر

Marfat.com

نہایت فاضلانہ بحث کی ہے اور مستند احادیث کی صحت کو بہت مضبوط دلائل سے ثابت کیا ہے۔ ہم اس بحث کا خلاصہ سطور ذیل میں پیش کرتے ہیں:

''کسی حدیث کے غلط ہونے کی پہلی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس کے پہلے راوی یعنی کسی صحابی یا بعد کے راویوں میں سے کسی ایک نے قصداً غلط بیانی کی۔ جہاں تک صحابہ کا تعلق ہے' ایسی غلط بیانی کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ آنحضرت صلعم کی شخصیت کا جس درجہ گہرا اثر صحابہ پر تھا' وہ تاریخی حیثیت سے پوری طرح ثابت ہے' لہٰذا یہ کسی طرح قرین قیاس نہیں کہ جو لوگ حضورؐ کے ادنیٰ اشارہ پر اپنی جان اور مال سب کچھ قربان کر دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے' وہ آپؐ کے ارشادات کے ساتھ بددیانتی برتیں گے' خصوصاً اس صورت میں جب کہ آنحضرت صلعم کا یہ فرمان ان تک پہنچ چکا تھا: من کذب علی متعمداً فلیتبوؤ مقعده من النار (جو شخص قصداً میرے متعلق جھوٹ بیان کرے' اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں کرے)۔

حدیث سے متعلق غلط بیانی کی دوسری وجہ کوئی ذاتی غرض ہو سکتی ہے' سو ایسی تمام حدیثوں کو جو مختلف افراد یا جماعتوں کے سیاسی اغراض سے تعلق رکھتی ہیں' اکابر محدثین خصوصاً امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے سختی کے ساتھ مسترد کر دیا ہے۔ ان حدیثوں کو چھانٹ دینے کے بعد جو ذخیرہ باقی رہ گیا' اس میں کسی ذاتی منفعت کا شبہ نہیں ہو سکتا۔

کسی حدیث کے مستند نہ ہونے کی ایک تیسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ممکن ہے کہ خود راوی اول یعنی صحابی نے یا بعد کے راویوں میں سے کسی ایک نے اس کے مفہوم کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے یا حافظہ کی خطا سے یا کسی اور نفسیاتی سبب سے اس کی روایت میں غلطی کی ہو۔ جہاں تک اس مسئلہ کے نفسیاتی پہلو کا تعلق ہے' ایسی غلطی کا امکان خصوصاً صحابہ کرام سے بہت ہی کم ہے۔ صحابہؓ کے لئے حضورؐ کا ہر ارشاد اور ہر عمل حد درجہ اہمیت رکھتا تھا' نہ صرف آپ کی شخصیت کے غیر معمولی اثر کی بنا پر بلکہ اس سبب سے بھی کہ وہ پختہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی زندگی کے معمولی جزئیات میں بھی تمام تر اتباع رسولؐ ہی کی ہدایت فرمائی ہے۔ پس وہ آپؐ کے ارشادات کو محفوظ رکھنے کی تمام امکانی کوششیں کرتے تھے اور اس مقصد کے لئے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کرتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جو صحابہ آنحضرتؐ کی خدمت میں زیادہ حاضر رہا کرتے تھے' انہوں نے آپس میں دو دو آدمیوں کی ٹولیاں بنا لی تھیں اور ہر ایک باری باری حضورؐ کی خدمت میں رہا کرتا تھا اور جو کچھ دیکھتا یا سنتا تھا' اسے اپنے ساتھی سے بیان کر دیتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضورؐ کے ارشاد و اعمال کے تحفظ کا کس قدر اہتمام کرتے تھے۔ ایسی صورت میں یہ زیادہ قرین قیاس نہیں کہ وہ الفاظ حدیث کے تحفظ میں بے پروائی کرتے رہے ہوں اور پھر اگر ہزاروں صحابہ کے لئے پورے قرآن کو حفظ کر لینا ممکن تھا اور ہجے کے جزئیات تک ان کے حافظہ سے فروگذاشت نہیں ہوئے اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں متفقہ طور پر وہ پورے قرآن کو ضبط تحریر میں لا سکے' تو صحابہ اور تابعین کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ ارشادات نبوی کو بغیر گھٹائے بڑھائے اپنے حافظہ میں محفوظ کر لیں۔ علاوہ بریں محدثین صرف انہی حدیثوں کو کامل طور پر صحیح قرار دیتے ہیں جو ایک ہی طرح سے مختلف سلسلہ رواۃ میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ صحیح حدیثوں کے

Marfat.com

ساتھ بے شمار موضوع حدیثیں بھی شامل ہوگئی ہیں' لیکن ان کی چھان بین ہمیشہ ہوتی آئی ہے اور محدثین نے ان کی تفتیش وتحقیق میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے' علی الخصوص امام بخاری اور امام مسلم نے احادیث کی جانچ میں جرح و تعدیل کا کوئی درجہ باقی نہیں چھوڑا' چنانچہ یہ اسی کاوش کا نتیجہ ہے کہ رواۃ حدیث کی تحقیق میں اسماء الرجال کا ایک مستقل فن مرتب ہوگیا' محدثین نے صرف انہی حدیثوں کو لے لیا ہے جن کے راوی ان کے قائم کردہ معیار میں پورے اترے اور وہ معیار اس قدر سخت تھا کہ کسی روایت کی تحقیق میں اس سے زیادہ سخت معیار قائم کرنا ممکن ہی نہیں۔

مذکورۂ بالا بحث کے بعد فاضل مصنف دعویٰ کرتے ہیں کہ اس وقت تک کوئی ناقد یہ ثابت نہیں کر سکا ہے کہ جو حدیثیں اکابر محدثین کے معیار صحت کے مطابق صحیح قرار دی جا چکی ہیں' وہ صحیح نہیں ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ جو مسلمان آج حدیثوں سے انکار کرتے ہیں' وہ ایک خاص سبب سے ایسا کرتے ہیں۔ وہ اپنی پست ذہنیت اور ذلیل طرز معاشرت کو روح اسلام سے جو سنت رسولؐ میں پائی جاتی ہے' کسی طرح مطابقت نہیں دے سکتے' اس لئے بجائے اس کے کہ اپنے اور اپنے ماحول کے نقائص کو دور کریں' وہ اتباع سنت کی پابندی ہی سے آزاد ہو جانا چاہتے ہیں کیونکہ اگر ایسا ہو جائے تو وہ تعلیمات قرآن کی تفسیر اپنے خاطر خواہ ''عقلیت'' کے سطحی طریقہ پر کر سکیں گے اور پھر ہر شخص اپنی طبیعت اور اپنی رائے کے مطابق قرآن کے معنی بیان کر سکے گا۔ علاوہ بریں مسلمانوں کی موجودہ نسل مغربی تہذیب کی ترقی سے مرعوب ہو کر اس کی ہر ادا کی دلدادہ ہو رہی ہے اور اسے اختیار کرنے کی بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ احادیث کو ناقابل اعتماد قرار دے کر سنت ہی سے آزادی حاصل کر لی جائے' جس کے بعد قرآن کے مفہوم کو توڑ مروڑ کر مغربی تہذیب کے مطابق کر لینا آسان ہو جائے گا۔

مخالفین اسلام کی طرف سے یہ ایک بہت قدیم اعتراض چلا آتا ہے کہ اتباع سنت کی سختی کے ساتھ پابندی کرنا انسان کی آزادی پر ایک روک عائد کر دینا ہے جس سے سوسائٹی کی فطری ترقی محدود ہو جاتی ہے۔ چنانچہ معترضین نے مسلمانوں کے انحطاط کا ایک بڑا سبب اتباع سنت ہی کو قرار دیا ہے۔ فاضل مصنف اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ فہم انسانی سختی کے ساتھ محدود ہے اور ہمارا دماغ اپنی فطرت کے لحاظ سے کلیت کے تخیل کا احاطہ کرنے سے قاصر۔ ہم تمام چیزوں کے جزئیات ہی کو سمجھ سکتے ہیں' لہٰذا اس مذہب کے مسائل میں جو فوق العقلی بنیادوں پر قائم ہے' ہمیں لابدی طور پر ایک ایسے ہادی کی ضرورت ہے جو ہماری ہدایت کے لئے مبعوث ہوا ہو۔ پس اگر ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن خدا کا کلام ہے اور محمد صلعم خدا کے رسول تھے' تو ہم نہ صرف اخلاقی بلکہ عقلی حیثیت سے بھی آپ کی ہدایتوں پر بے چون وچرا عمل کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ حضورؐ کے بعض احکام حقیقی طور پر زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جن کی اہمیت مقابلۃً کم ہے' ہمیں چاہیے کہ جو زیادہ اہم ہیں ان کو کم اہمیت والوں پر مقدم سمجھیں' لیکن ہمیں یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی غیر ضروری سمجھ کر اس سے بے اعتنائی برتیں' کیونکہ آپ کا ہر حکم اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ہے۔

اس اعتراض کے علاوہ مخالفین کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلام اب محض ایک ''زائل شدہ قوت'' ہے اور دنیا کو جو

Marfat.com

کچھ فائدہ اس سے پہنچ سکتا تھا' وہ اب سے پہلے پہنچ چکا۔ اس رائے سے وہ مسلمان بھی متفق ہیں جو تہذیب جدید سے مغلوب ہو چکے ہیں اور اپنے اندر مقابلہ کی جرأت بالکل نہیں پاتے۔ ان کے نزدیک دنیا کے اور تمدنوں کی طرح اسلامی تمدن کا دورِ عروج بھی ختم ہو گیا اور اب اس کے انحطاط و زوال کا زمانہ ہے جو ہر تہذیب و تمدن کو ایک وقت قدرتی طور پر پیش آتا ہے لہٰذا ایسی حالت میں تمام جدوجہد بے سود ہے۔ فطرت کا قانون عروج و زوال بدل نہیں سکتا اور اسلامی تمدن کی تباہی بھی ناگزیر ہے۔

لیکن مصنف کی قوت ایمانی اس تاریخی دلیل سے قطعی مرعوب نہیں ہوتی۔ وہ اسلام کو اس کلیہ سے مستثنیٰ سمجھتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ اگر اسلامی کلچر ایک ایسے قانون کی پیروی کا نتیجہ ہے یا تھا جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے تو ہم ہرگز تسلیم نہیں کر سکتے کہ دوسرے کلچروں کی طرح یہ بھی مرورِ زمانہ کے ساتھ وابستہ اور قوانین حیات عضویہ کے ساتھ محدود ہے۔ جو چیز بظاہر اسلام کی موت معلوم ہوتی ہے' وہ ہمارے دلوں کی موت اور تہی مایگی کے سوا اور کچھ بھی نہیں جو اپنی شدت سستی کی وجہ سے دائمی آواز کو سننے سے قاصر ہیں۔ اس بات کی کوئی علامت نظر نہیں آتی کہ انسان اپنی موجودہ حالت عروج میں اسلام سے مستغنی ہو گیا ہے۔ وہ اسلام کے پیش کردہ نظام اخلاق سے بہتر کوئی نظام پیش نہیں کر سکا اور وہ اخوت انسانی کے تخیل کو کسی عملی بنیاد پر قائم نہیں کر سکا' جیسا کہ اسلام نے اپنے فوق الملی تخیل ''امت'' میں کر دکھایا ہے۔ وہ کوئی ایسا معاشرتی نظام پیدا نہیں کر سکا جس میں افراد کے باہمی تنازعات و مناقشات اس حد تک کم ہو جائیں جس حد تک اسلام کے معاشرتی نظام نے کم کر دیا ہے۔ وہ انسان کی قدر و منزلت اس کے احساس امن و سلامتی' اس کی امید روحانی اور سب سے آخر لیکن یقیناً سب سے کمتر نہیں' اس کی مسرت کو ترقی نہیں دے سکا۔''

آج جب کہ ہر ''روشن خیال مصلح'' جس کے منہ میں زبان اور ہاتھ میں قلم ہے' اسلام کی ''اصلاح'' کے لئے بے قرار نظر آ رہا ہے' مناسب ہے کہ ایک خالص یورپین اور تہذیب جدید کی گود میں پرورش پائے ہوئے شخص کی رائے بھی اس باب میں سن لی جائے:

> ''ہمارے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام کی ''اصلاح'' کریں جیسا کہ بعض مسلمانوں کا خیال ہے' کیونکہ اسلام پہلے ہی سے کامل اور مکمل ہے۔ ہمیں جس چیز کی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے' وہ مذہب کی نسبت ہمارا رویہ' ہماری سستی' ہماری خود پرستی' ہماری کوتاہ نظری' مختصر یہ کہ خود ہمارے نقائص ہیں نہ کہ اسلام کے بعض مفروضہ نقائص۔ اسلام میں ایک نئی زندگی پیدا کرنے کے لئے' ہمیں باہر کے جدید اصول عمل کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں' بلکہ صرف قدیم اور چھوڑے ہوئے اصولوں ہی کو عمل میں لانے کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ ہم غیر تمدنوں سے نئی قوت حاصل کر سکتے ہیں' لیکن اسلام کے مکمل نظام کو کسی غیر شے سے خواہ وہ مغربی ہو' خواہ وہ مشرقی' بدل نہیں سکتے۔ اسلام بحیثیت ایک روحانی اور اجتماعی نظام کے' بہتر' نہیں بنایا جا سکتا۔''

(در: معارف (اعظم گڑھ)' دسمبر ۱۹۳۴ء' ص ۴۰۵-۴۲۶)

Marfat.com

محمد اسحاق بھٹی

علامہ محمد اسد

۳۱دسمبر ۱۹۵۷ء سے ۸جنوری ۱۹۵۸ء تک (نودن) لاہور پنجاب یونیورسٹی میں بین الاقوامی اسلامی مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی تھی' جس میں پاکستان کے علاوہ سعودی عرب' مصر' لیبیا' الجزائر' مراکش' شرقی اردن' انڈونیشیا' ایران اور ہندوستان کے بہت سے اصحاب تحقیق نے شرکت کی اور مختلف موضوعات پر مقالے پڑھے تھے۔ اس مجلس مذاکرہ کے انعقاد کا اہتمام پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے کیا گیا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر اس زمانے میں میاں افضل حسین تھے جو متحدہ پنجاب کے مشہور سیاسی لیڈر' وائسرائے کی کونسل کے ممبر ریلوے اور پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کے بانی میاں سر فضل حسین کے چھوٹے بھائی تھے۔ وائس چانسلر کی علمی معاونت کے لیے حکومت نے علامہ محمد اسد کو خاص طور سے اس مجلس مذاکرہ میں بلایا تھا۔ وہ یہاں آئے لیکن بعض معاملات میں ان کے اور وائس چانسلر کے درمیان ہم آہنگی نہ ہوسکی' اس لیے انہوں نے اس مذاکرے میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

میں ایک دن مجلس مذاکرہ کی کارروائی سننے کے بعد دو بجے کے قریب کچہری روڈ والے دروازے سے یونیورسٹی سے باہر نکلا تو میرے مرحوم بزرگ دوست محمد حسین بابری ایک صاحب کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔ طویل قامت' چھریرا بدن' گورا رنگ' چھوٹی چھوٹی داڑھی' تیکھے نقوش' آنکھوں پر نظر کی عینک' دیکھنے میں خوش وخرم' گرم انگریزی سوٹ میں ملبوس..... محمد حسین بابری نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: علامہ محمد اسد! وہیں ایک گوری چٹی قدرے چوڑے چہرے کی خاتون کھڑی تھیں جو ساڑھی پہنے ہوئے تھیں' ان کے متعلق بابری صاحب نے بتایا: یہ ہیں: اسد صاحب کی اہلیہ محترمہ حمیدہ!!

میں نے ان دونوں کو سلام کیا اور اسد صاحب کی طرف نہایت عقیدت سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے اور انہوں نے مسکراتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کیا۔ میرے متعلق محمد حسین بابری نے ان کو بتایا' یہ ہیں اسحاق صاحب' مولانا محی الدین احمد قصوری' مولانا محمد علی قصوری' مولانا داؤد غزنوی اور مولانا محمد حنیف ندوی کے رفیق کار اور ان کی جماعت کے ترجمان ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے ایڈیٹر! مولانا محمد علی قصوری' ایم اے کینٹب اس سے ٹھیک دو سال قبل ۱۲جنوری ۱۹۵۶ء کو وفات پا گئے تھے۔ علامہ محمد اسد نے ان سب کے متعلق پوچھا اور انہیں مولانا محمد علی قصوری کی

Marfat.com

وفات کا پتہ چلا تو افسوس کا اظہار کیا۔

علامہ ممدوح نے فرمایا: میں کل گیارہ بجے مولانا داؤد غزنوی کی خدمت میں سلام عرض کرنے کے لیے حاضر ہوں گا۔

یہ علامہ محمد اسد سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد میں دفتر گیا اور مولانا غزنوی کو علامہ اسد سے ملاقات کے متعلق بتایا اور عرض کیا کہ وہ کل گیارہ بجے آپ کے پاس آئیں گے۔

دوسرے دن ٹھیک گیارہ بجے علامہ محمد اسد ان کی بیگم حمیدہ اور محمد حسین بابری میرے کمرے میں تشریف لائے۔ اپنی بیگم اور محمد حسین بابری کو انہوں نے میرے کمرے میں بٹھایا اور خود مولانا غزنوی کے پاس تشریف لے گئے۔ تقریباً نصف گھنٹے کے بعد واپس آئے اور چند منٹ میرے کمرے میں بیٹھے اور چلے گئے۔ یہ ان سے میری دوسری ملاقات تھی۔

علم و تحقیق اور خدمت دینی کی رو سے علامہ محمد اسد کا شمار دنیائے اسلام کی عظیم شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ کم و بیش سولہ سال ان کا تعلق برصغیر کے مسلمانوں سے رہا۔ تقسیم ہند سے پہلے بھی وہ ارض ہند میں رہے اور بعد میں بھی انہوں نے پاکستان سے سلسلہ علائق قائم رکھا۔ پاکستان میں آئین سازی کے مسئلے پر بھی انہوں نے کچھ رہنما اصول مرتب کیے تھے' لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ اس کتاب میں ان کی تصنیفی خدمات بالخصوص ان کے انگریزی ترجمہ قرآن کے متعلق اپنے خوانندگان محترم کو مطلع کریں' لیکن اس سے پہلے چند الفاظ میں ان کے اور ان کے آباؤ اجداد کے متعلق آگاہی حاصل کرنا ضروری ہے۔

محمد اسد یوکرین کے شہر لووہ (Lwow) میں ۲ جولائی ۱۹۰۰ء کو ایک یہودی جرمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ اس وقت یہ شہر ہنگری کی مملکت میں شامل تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد پولینڈ کا حصہ بنا۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سوویت یونین کا حصہ بنا۔ اب جمہوریہ یوکرین میں شامل ہے۔

والدین نے محمد اسد کا نام لیوپولڈ وائس (Leopold Weiss) رکھا تھا۔ ان کے دادا یہودیوں کے مذہبی رہنما تھا' جنہیں ''ربی'' کہا جاتا ہے۔ اپنے بیٹے کو بھی وہ ربی بنانے کے خواہاں تھے' لیکن وہ باپ کی خواہش پوری نہ کر سکے اور وکیل بن گئے۔ محمد اسد کے وکیل والد چاہتے تھے کہ ان کا یہ بیٹا سائنس دان کی حیثیت سے شہرت پائے' لیکن بیٹے کو ذہنی طور پر سائنس سے تعلق نہ تھا' وہ عمرانیات سے دلچسپی رکھتے تھے۔ بالآخر ان کا یہی رجحان انہیں اسلام کی طرف لے جانے کا باعث بنا۔

محمد اسد چوں کہ مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے تھے' اس لیے ان کی ابتدائی تربیت اسی ماحول میں ہوئی۔ وہ بے حد ذہین تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ صرف تیرہ سال کی عمر میں وہ عبرانی زبان میں گفتگو بھی کرنے لگے تھے اور روانی سے اسے پڑھ بھی لیتے تھے۔ آرامی زبان سے بھی وہ آشنا تھے اور طالمود اور بائبل کا عہد نامہ قدیم آسانی سے پڑھ سکتے تھے۔ اس دور کے یورپ کے مختلف مروجہ علوم میں ابتدائی عمر ہی میں ان کا مطالعہ وسیع ہو گیا تھا۔

Marfat.com

پہلی جنگ عظیم ۲۸ جولائی ۱۹۱۴ء کو شروع ہوئی اور ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو ختم ہوئی تھی۔ اس وقت علامہ محمد اسد کی عمر چودہ سال کی تھی اور وہ مدرسے میں ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے تھے' لیکن مدرسے کی تعلیم سے انہیں دلی لگاؤ نہ تھا۔ وہ گھر سے بھاگے اور آسٹریا کی فوج میں کسی اور نام سے بھرتی ہو گئے۔ والد کو پتا چلا تو فوج کے متعلقہ افسر سے رابطہ قائم کیا اور بتایا کہ یہ بچہ کم عمر ہے' اس لیے اسے فوج میں بھرتی نہیں کیا جاسکتا' چنانچہ انہیں واپس گھر بھیج دیا گیا۔

اسی اثناء میں محمد اسد کے والد ویانا چلے گئے اور بیٹے کو بھی اپنے ساتھ ویانا لے گئے۔ پھر جنگ ختم ہوئی تو محمد اسد نے ویانا یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں فلسفہ' تاریخ اور آرٹ کو موضوع مطالعہ بنایا۔ انہی دنوں وہ فرائڈ کے نظریات سے متاثر ہوئے' لیکن یہ ان کے ذہنی اور فکری رجحانات کی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ اب ان کا احساس جاگ اٹھا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ تمام یورپ روحانی اضطراب کا شکار ہے اور ان لوگوں نے اپنی زندگیوں کو مادی وسائل کے حصول کے لیے وقف کر رکھا ہے اور دنیوی خواہشات کی تکمیل ہی ان کا اصلی نقطہ نظر ہے۔

چھوٹی عمر ہی میں وہ اپنے مطالعے کی مدد سے مختلف مذاہب کا موازنہ کرنے لگے تھے۔ یہودیت ان کے آباؤ اجداد کا مذہب تھا بلکہ ان کے دادا یہودیوں کے ربی یعنی پیشوا تھے' لیکن محمد اسد کو یہ مذہب اطمینان کی دولت نہ دے سکا' کیوں کہ یہ صرف ایک نسل یا فرقے کی نجات کا مدعی ہے۔ عیسائیت سے انہیں اس بنا پر دلچسپی نہ پیدا ہوئی کہ یہ انسان کی مادی اور روحانی زندگی کو متوازن رکھنے سے قاصر ہے۔ اس کی بنیادی تعلیم ترک دنیا اور رہبانیت ہے۔ (یاد رہے' اس سے موجودہ عیسائیت مراد نہیں بلکہ اصلی اور بنیادی عیسائیت مراد ہے)۔

اسد صاحب کو اب حق کی تلاش تھی اور اس کی تلاش میں انتہائی بے قرار تھے۔ وہ یہودیت اور عیسائیت وغیرہ مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے' لیکن انہیں قلبی سکون اور ذہنی اطمینان حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ انہوں نے یونیورسٹی کی تعلیم کا سلسلہ ختم کیا تو صحافت کے میدان میں آ گئے۔

۱۹۲۰ء میں جب کہ وہ بیس برس کے نوجوان تھے' انہوں نے ویانا کی سکونت ترک کر دی اور پراگ چلے گئے جو چیکوسلوا کیہ کا مشہور شہر اور اس کا دارالحکومت ہے۔ اس سے ایک سال قبل ۱۹۱۹ء میں ان کی والدہ وفات پا گئی تھیں۔ والدہ نے بیٹے کو ہیرے کی ایک انگوٹھی دی تھی۔ انہوں نے یہ انگوٹھی فروخت کر دی اور پراگ سے برلن چلے گئے۔ ۱۹۲۱ء میں انہوں نے اخبار ''یونائیٹڈ ٹیلیگراف'' کے ایڈیٹر سے ملازمت کے لیے بات کی تو اس نے ان کی قابلیت کا اندازہ کرنے کے لیے انہیں معروف روسی ناول نگار میکسیم گورکی کی بیوی مادام گورکی کا انٹرویو لینے کی ذمہ داری سپرد کی۔ انہوں نے مادام گورکی کا انٹرویو لیا جو ایڈیٹر کو پسند آیا اور انہیں اس اخبار کا رپورٹر مقرر کر دیا گیا۔

۱۹۲۲ء میں محمد اسد کے ماموں فلسطین میں مقیم تھے۔ انہوں نے ان کو فلسطین آنے کی دعوت دی' چنانچہ وہ اسکندریہ کے راستے فلسطین پہنچے۔ اس اثنا میں جرمنی کے مشہور اخبار Frankfurter Zeitung نے' جس کا شمار یورپ کے ممتاز ترین اخباروں میں ہوتا تھا' ان کو شرق اوسط کے بعض ملکوں میں اپنا خصوصی نامہ نگار مقرر کر دیا۔

اب ان کا کاروان زندگی ایک ایسا موڑ کاٹتا ہے جو انہیں اسلام کو سمجھنے اور اس سے قلبی لگاؤ کا باعث بنا

Marfat.com

ہے۔ وہ اپنے اخباری فرائض کی انجام دہی کے لیے ڈیڑھ سال ان ملکوں میں رہے۔ دمشق میں بھی ان کا قیام رہا۔ شاہ اردن امیر عبداللہ سے بھی ان کی ملاقات ہوئی۔ اپنے اخباری فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں ان اسلامی ممالک کی بہت سی اہم شخصیتوں سے ملنے اور ان سے گفتگو کرنے کے انہیں مواقع حاصل ہوئے۔ اس زمانے میں اسلام کے موضوع کی بعض کتابوں کا انہوں نے مطالعہ کیا' لیکن ان میں زیادہ کتابیں وہ تھیں جو اسلام کے بارے میں جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں لکھی گئی تھیں۔ اس وقت وہ عربی بول تو لیتے تھے' لیکن عربی کتابیں اچھی طرح پڑھ نہیں سکتے تھے۔ تاہم غیر عربی زبانوں کی مدد سے اسلام کے افکار ونظریات بہت حد تک ان کے ذہن میں راسخ ہو گئے تھے۔

اس نواح میں ڈیڑھ سال کے قیام کے بعد ۱۹۲۳ء کے موسم خزاں میں وہ استنبول اور صوفیہ وغیرہ کے راستے ویانا واپس آ گئے اور کچھ عرصہ اپنے والد کے پاس رہے جو ویانا میں سکونت پذیر تھے۔ بعدازاں برلن پہنچے۔ وہیں ان کی ملاقات ایلسا (Elsa) نامی ایک خاتون سے ہوئی جو بعد میں ان کے عقد میں آئیں۔ یہ خاتون محمد اسد سے عمر میں چودہ پندرہ سال بڑی تھیں۔

اب ۱۹۲۴ء کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سال کے موسم بہار میں اخبار ''فرینکفرٹر'' کی طرف سے انہیں دوسری مرتبہ شرق اوسط کے سفر پر بھیجا گیا۔ اس سفر میں انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا اور بہت سے مشہور اصحاب علم اور ارباب حکومت سے ملاقاتیں ہوئیں اور ان سے طویل گفتگوؤں کا سلسلہ جاری رہا۔ دو سال وہ ان ممالک کی سیاحت کرتے رہے۔ پھر پورٹ سعید کے راستے وہ قاہرہ گئے اور مصر' فلسطین' شام' عراق' ایران اور افغانستان کے طویل سفر کے بعد ۱۹۲۶ء کے موسم سرما کے آخر میں ہرات سے ترکمانستان پہنچے۔ وہاں سے سمرقند' بخارا' تاشقند اور دیگر علاقوں سے گزرتے ہوئے ماسکو گئے۔ وہاں سے واپس اپنے وطن آ گئے۔

گذشتہ سطور میں عرض کیا گیا ہے کہ شرق اوسط کے پہلے سفر میں محمد اسد نے شاہ اردن امیر عبداللہ سے ملاقات کی تھی۔ اس سرزمین کے دوسرے سفر کے دوران ان کی ملاقات طہران میں ایران کے حکمران رضا شاہ پہلوی سے اور کابل میں افغانستان کے بادشاہ امان اللہ خاں سے ہوئی۔ وہ کچھ عرصہ امان اللہ خاں کے ہاں بہ طور مہمان رہے۔ مصر گئے تو اس دور کے شیخ الازہر مصطفیٰ مراغی سے ملاقات کی اور اسلام کے بنیادی افکار کے موضوع پر ان سے طویل بحثیں ہوئیں' جو ان کے لیے اسلام سے قریب تر ہونے کا باعث بنیں۔ اس دور میں انہیں اسلام کے اخلاقی پہلوؤں کو حیطۂ فہم میں لانے میں بہت مدد ملی۔ بقول ان کے اب انہیں یقین ہو گیا تھا کہ عام مغربی لوگوں کے ذہن میں اسلام کا جو تصور پایا جاتا ہے' اس کا اسلام کی اصل تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

''مجھے یقین ہو گیا کہ انسان کے لیے قرآن کا نقطہ نظر مادیت کے تصور سے پاک ہے۔ اس میں اللہ اور اس کے احکام کو سمجھنے کا بے پناہ شعور پایا جاتا ہے اور عقلی رنگ میں اس کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر شے کا خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ نیز قرآن جو تعلیمات پیش کرتا ہے' اس میں ذہنی' جذباتی اور رحانی

Marfat.com

تقاضوں اور معاشرتی معاملات کے درمیان کامل ہم آہنگی اور بہ درجہ غایت توازن کارفرما ہے۔''

یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ شرق اوسط کے سفر ثانی میں وہ اسلام کے متعلق صرف مطالعہ کتب اور علماء کی گفتگو ہی سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے مسلمانوں کی عام زندگی کو بہت قریب سے دیکھا۔ رمضان کے روزوں سے بھی وہ اثر پذیر ہوئے' اذان کی دلکش آواز بھی ان کے لیے اسلام سے قرب کا باعث بنی۔ پھر بعض ان پڑھ اور سماجی اعتبار سے کمزور لوگوں کے بہ ظاہر چھوٹے چھوٹے اعمال نے بھی اسلام سے وابستہ کرنے میں ان کی معاونت کی۔ اس کی مثال دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ''ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ ایک مسلمان عورت کسی غیر مسلم مرد سے کیوں شادی نہیں کرسکتی؟ اس سوال کا جواب ایک گفتگو کے دوران ایک معمولی پڑھے لکھے مسلمان نے دیا اور جواب کی صحت میں ایسے دلائل پیش کیے کہ میں ان سے بے حد متاثر ہوا۔''

اسی طرح وہ بتاتے ہیں کہ وہ اپنے ماموں کی دعوت پر بذریعہ ریل اسکندریہ سے بیت المقدس جارہے تھے کہ ایک اسٹیشن پر ریل رکی۔ وہاں ایک عرب بدو نے جوان کا ہم سفر تھا' خوانچہ فروش سے ایک روٹی خریدی اور اس کے دو ٹکڑے کیے۔ ایک ٹکڑا وہ مجھے دینے لگا تو میں نے لینے سے کچھ تامل کیا۔ اس پر بدو مسکرایا اور کہا آپ بھی مسافر ہیں' میں بھی مسافر ہوں' جب ہم دونوں ایک ہی راستے پر اکٹھے چل رہے ہیں تو یہ بیگانگی کیوں؟ بدو کے اس طرز عمل اور گفتگو نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میں نے اس سے روٹی کا ٹکڑا لے لیا۔

وہ کہتے ہیں کہ ''جب میں اس چھوٹے سے واقعے پر غور کرتا ہوں تو میرا دل کہتا ہے کہ عربی اخلاق سے میری وابستگی اور محبت کی بنیاد اسی بدو کے رویے سے پڑی' جس نے ہر قسم کی اجنبیت کے باوجود اپنے رفیق سفر کو اپنی آدھی روٹی دے دی۔ انسانیت کی ہم دردی کا یہ ایسا کردار تھا جو ہر قسم کے تصنع سے پاک اور ہر نوع کے تکلف سے مبرا تھا۔ شرق اوسط کے دوسرے سفر کے اختتام پر جب وہ ہرات سے کابل جارہے تھے تو ان کا باطن اسلام قبول کرچکا تھا۔ اس کی شہادت ایک عام مسلمان نے دی۔ وہ اس طرح کہ سردیوں کے دن تھے' وہ گھوڑے پر سوار تھے اور ان کے گھوڑے کا ایک نعل نکل گیا۔ وہ نعل لگوانے کے لیے کسی لوہار کی تلاش میں تھے کہ ایک شخص نے بات چیت کرتے ہوئے ان سے کہا: ''تم مسلمان ہو' لیکن اس کا خود تمہیں علم نہیں۔'' اس صورت حال کا اظہار ایک موقعے پر محمد اسد ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ''اسلام میرے اندر اس ڈاکو کی طرح آیا جو رات کو کسی کے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرے اندر ڈاکو چوری کے لیے نہیں' نیکی کے لیے داخل ہوا تھا' لیکن میں اس پر کئی سال غور کرتا رہا کہ مجھے ظاہری طور پر بھی اسلام قبول کرلینا چاہیے۔''

دراصل محمد اسد کے ذہن میں اسلام کے متعلق تبدیلی شرق اوسط کے دوران سفر ہی میں آنا شروع ہوگئی تھی۔ اس کا ثبوت (بقول ان کے) یہ ہے کہ ۱۹۲۳ء کے موسم خزاں کے آغاز میں جب وہ شام سے یورپ جارہے تھے تو یورپ کو دیکھ کر انہیں اجنبیت کا احساس ہورہا تھا۔ وہاں کے لوگوں سے انہیں گھن آتی تھی اور وہ بے حد مکروہ اور حقیر دکھائی دے رہے تھے۔

Marfat.com

۱۹۲۶ء میں محمد اسد نے ''ایلسا'' سے شادی کی جو عمر میں ان سے چودہ پندرہ سال بڑی تھیں اور پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ اب یہ دونوں میاں بیوی مل کر قرآن مجید پڑھتے اور اس کے مختلف مقامات پر اچھی طرح غور کرتے۔ قرآن کے مطالعہ سے محمد اسد کے سامنے اسلام کی ایسی مکمل تصویر آ گئی تھی جس نے ان کے ذہن وقلب کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ قرآن کی اخلاقی تعلیمات اور عملی زندگی کے درمیان جو گہرا تعلق ہے' اس سے یہ دونوں میاں بیوی نہایت متاثر ہوئے۔ قرآنی نقطہ فکر کے اس پہلو نے خاص طور سے ان پر اثر ڈالا کہ اللہ تعالیٰ انسان کو جبراً اپنی اطاعت کا حکم نہیں دیتا' بلکہ وہ انسان کی عقل' اس کے دماغ اور اس کے شعور سے اپیل کرتا اور کامل غور وفکر سے کام لینے کی دعوت دیتا ہے۔

اب آیئے دیکھتے ہیں' محمد اسد نے کہاں اسلام قبول کیا اور کس کے سامنے کلمہ شہادت پڑھا۔

یہ ستمبر ۱۹۲۶ء کی بات ہے کہ وہ برلن میں مسلمانوں کی انجمن کے صدر کی خدمت میں گئے اور ان کے ذریعے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے نہایت احترام کے ساتھ ان کو کلمہ پڑھایا اور فرمایا: آپ کا پیدائشی نام لیوپولڈ ہے اور یونانی زبان میں ''لیو'' کے معنے شیر کے ہیں' اس لیے ہم آج سے آپ کو محمد اسد کے نام سے موسوم کریں گے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد ان کی اہلیہ محترمہ ایلسا نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

بعد ازاں (۱۹۲۶ء ہی میں) محمد اسد اپنی اہلیہ کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ روانگی سے قبل انہوں نے تین اخباروں سے معاہدے کیے اور جب تک وہ سعودی عرب میں رہے' ان اخباروں کو رپورٹیں بھیجتے رہے۔ یہ ان کا ذریعہ آمدنی تھا جو کئی سال جاری رہا۔

۱۹۲۶ء میں محمد اسد اپنی اہلیہ سمیت حج پر گئے ہیں تو ان کا ارادہ وہاں مستقل قیام کا تھا۔ وہ بحری جہاز سے گئے اور جدہ کی بندرگاہ پر جہاز سے اترے۔ وہاں سے مکہ مکرمہ گئے اور عمرہ کیا۔ بیت اللہ شریف کی زیارت کر کے وہ بہت خوش ہوئے' لیکن اس سے نو دن بعد مکہ مکرمہ میں ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔

قیام حجاز کے زمانے میں ان کی ملاقات اس زمانے کے انڈونیشیا کے ممتاز عالم اور سیاسی رہنما حاجی آنموس سلیم سے ہوئی۔ حاجی صاحب ممدوح نے ان کا تعارف معروف سنوسی رہنما اور مشہور مجاہد آزادی سید احمد شریف سے کرایا۔

سید احمد شریف سنوسی کو محمد اسد کے متعلق جب بتایا گیا کہ انہوں نے حال ہی میں اسلام قبول کیا ہے تو انہوں نے اسد صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا ''میرے نوجوان بھائی! مسلمان معاشرے میں آنے پر میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔'' اس کے بعد سید احمد شریف سے ان کے گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔

اب دیکھتے ہیں کہ سعودی عرب کے حکمرانوں سے محمد اسد کا تعارف کس طرح ہوا اور ان سے مراسم کیوں کر بڑھے؟ یہ ۱۹۲۷ء کا واقعہ ہے۔ اس سے دو سال قبل شاہ عبدالعزیز (ابن سعود) نے حجاز فتح کر لیا تھا۔ ایک دن حرم کعبہ کے کتب خانے میں محمد اسد مصروف مطالعہ تھے کہ سلطان ابن سعود کے فرزند گرامی شہزادہ فیصل (مرحوم) وہاں آئے تو

Marfat.com

کتب خانے کے مہتمم نے محمد اسد کا شہزادے سے تعارف کرایا۔ اس سے آگے جو کچھ ہوا' اس کا ذکر خود محمد اسد کی زبانی سنیے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تعارف کے بعد فیصل نے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے جب احتراماً اپنا سر جھکایا تو انہوں نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے نرم انداز میں میرا سر سیدھا کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور گرم جوشی کا اظہار۔ وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ ہم نجدی لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے آگے سر نہیں جھکانا چاہیے۔ عبادت کے وقت صرف اللہ کے سامنے سر جھکانا چاہیے۔''

اس کے بعد شہزادہ فیصل نے محمد اسد کی ملاقات اپنے والد محترم سلطان ابن سعود سے کرائی۔

بہت جلد سلطان ابن سعود سے محمد اسد کے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے اور باہم ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ سلطان نے ان کو اپنا مشیر بنایا اور پورے علاقہ نجد کی سیر و سیاحت کی اجازت دے دی اور ضروری سہولتیں فراہم کر دیں۔ سلطان ممدوح نے نجد کی تمام اہم شخصیتوں سے کہہ دیا تھا کہ محمد اسد ہمارے مجاہد دوست ہیں اور ہمیں بے حد عزیز ہیں۔ جو شخص ان سے دوستوں کی طرح ملے گا' ہم اسے اپنا دوست سمجھیں گے اور جو ان سے عناد رکھے گا' ہم اسے اپنا مخالف قرار دیں گے۔

آئندہ سطور میں ایک عجیب و غریب بلکہ نہایت خطرناک واقعہ ملاحظہ فرمائیے:

قیام سعودی عرب کے زمانے میں محمد اسد کی ملاقات لیبیا کے عظیم مجاہد عمر مختار سے ہوئی جو آگے چل کر بہت بڑی مہم جوئی کا باعث بنی۔ محمد اسد اس وقت سنوسی تحریک سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کے خیال میں اس دور میں یہی ایک تحریک تھی جو اسلامی معاشرے کی تکمیل کے لیے جدوجہد کر رہی تھی' لیکن معاملہ یہ تھا کہ جس زمانے میں محمد اسد سعودی عرب میں قیام پذیر تھے' اس زمانے میں یہ تحریک نہایت نازک دور سے گزر رہی تھی' بلکہ اسد صاحب کے بقول اپنی بقا کی آخری جنگ لڑ رہی تھی۔ تحریک کے سربراہ سید احمد شریف تھے۔ ان کا رابطہ عمر مختار سے رہتا تھا جو مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ اٹلی کی حکومت سے برسرِ پیکار تھے اور ''برقہ'' کے علاقے میں ان کا قیام تھا۔

۱۹۳۰ء کے موسم خزاں میں محمد اسد کی ملاقات مدینہ منورہ میں سید احمد شریف اور ان کے ایک رفیق خاص محمد ازدی سے ہوئی۔ سات آٹھ دن ان کے باہم مشورے ہوتے رہے۔ بالآخر طے پایا کہ عمر مختار برقہ کے علاقے سے نکل آئیں اور ''کفرہ'' کو اپنا مرکز بنالیں جو ساحل سمندر سے بہت دور صحرائے اعظم میں واقع ہے۔ وہاں سے وہ اپنے مجاہدین کی مدد سے اٹلی کے خلاف مزاحمت کا سلسلہ جاری رکھیں۔ سنوسی رہنما سید احمد شریف بڑے اولوالعزم بزرگ تھے۔ وہ محمد اسد پر بے حد اعتماد کرتے تھے۔ انہوں نے عمر مختار تک پیغام پہنچانے کا بہ درجہ غایت نازک اور خطرناک فریضہ محمد اسد کے سپرد کیا۔ ان کو روانہ کرنے سے پہلے سید احمد شریف نے ان سے حلف لیا کہ وہ مجاہدین کے وفادار رہیں گے۔ محمد اسد کہتے ہیں کہ اس موقعے پر میں نے جس یقین اور عزم کے ساتھ حلف اٹھایا۔ اس سے پہلے کبھی

Marfat.com

نہیں اٹھایا تھا۔

اب اس سے آگے کی داستان سنیے!

حلف اٹھانے کے بعد محمد اسد خفیہ طور سے ایک رہنما کے ساتھ بندرگاہ ینبوع کے قریب سے ایک کشتی پر سوار ہوئے اور چار دن کے سفر کے بعد مصر کے ساحل پر قصیر کے شمال میں کشتی سے اترے اور وہاں سے بذریعہ بس اسیوط پہنچے۔ اسیوط سے ریل میں بیٹھے اور بنی سویف کے مقام پر اترے۔ یہاں انہیں ایک سنوسی رہبر ملا۔ اس نے اونٹ پر سوار کر کے نخلستان سیوا کے راستے سے انہیں لیبیا کی سرحد پر پہنچا دیا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں اٹلی کے بہت سے فوجی اور پہرے دار چوکس کھڑے تھے اور سنوسی مجاہدین اور ان کے معاونین پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے لیکن محمد اسد بے حد احتیاط کے ساتھ ان سے بچتے ہوئے دو سنوسی مجاہدوں کے ساتھ طویل و عریض بے آب و گیاہ صحرا میں مسلسل آٹھ روز سفر کرنے کے بعد طلوع فجر سے پہلے اس مقام پر پہنچے جہاں مجاہدین کی معیت میں عمر مختار ڈیرہ جمائے ہوئے تھے۔ محمد اسد نے جب ان کو سید احمد شریف کا یہ پیغام پہنچایا کہ آپ برقہ کے علاقے کو چھوڑ کر کفرہ کو اپنا مرکز بنالیں تو انہوں نے نہایت افسردہ لہجے میں بتایا کہ کفرہ پر آج سے پندرہ دن پہلے اٹلی کی فوجیں قبضہ کر چکی ہیں۔

اب محمد اسد کا یہ طویل اور خطرناک سفر ناکام ہو گیا تھا۔ ان کی واپسی کا سفر اور بھی زیادہ پُر خطر تھا۔ اٹلی کی فوج نے ہر طرف لوہے کی خاردار تاریں لگادی تھیں۔ وہ ان فوجیوں کی نظروں سے اور خاردار تاروں کے حصار سے کس طرح بچ کر نکلے اور کس طرح واپس مدینہ منورہ پہنچے۔

یہ ایک دلچسپ اور پیچ دار داستان ہے' جس کی تفصیل ان کی کتاب ''روڈ ٹو مکہ'' (شاہراہ مکہ) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اس واقعہ سے ٹھیک آٹھ مہینے بعد اٹلی کی حکومت نے عمر مختار کو گرفتار کر لیا اور پھر انہیں پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

محمد اسد چھ سال سعودی عرب میں سکونت پذیر رہے۔ اس اثنا میں انہیں عربی زبان میں پوری مہارت حاصل ہو گئی تھی۔

اس کے بعد محمد اسد برصغیر کا رخ کرتے ہیں...... ۱۹۳۲ء میں انہوں نے سعودی عرب کی سکونت ترک کی اور وہاں سے برصغیر کا عزم کیا۔ وہ سب سے پہلے کشمیر گئے۔ وہاں ان کی ملاقات ''خطبات اقبال'' کے مترجم اور ''اقبال کے حضور میں'' کے مصنف سید نذیر نیازی سے ہوئی۔ کشمیر میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد وہ دہلی چلے گئے۔ وہاں تقریباً تین سال ان کا قیام قرول باغ میں رہا۔ دہلی میں ان کی ملاقاتیں بہت سے اصحاب علم سے ہوئیں۔ دہلی سے ڈیرہ دون گئے۔ کچھ مدت وہاں ٹھہرے۔ بعد ازاں عازم حیدر آباد (دکن) ہوئے اور وہاں کے مشہور تحقیقی رسالے ''اسلامک کلچر'' کے مدیر مقرر کیے گئے۔ وہیں ان کی ملاقات مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ہوئی۔ حیدر آباد میں ان کا قیام زیادہ عرصہ نہیں رہا۔ ۱۹۳۸ء کی ابتدا میں وہ لاہور آئے۔ یہاں اقبال سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس وقت اقبال بیمار

Marfat.com

تھے۔ لاہور میں ان دنوں دو جرمن ڈاکٹر مقیم تھے' اسد نے اقبال کو ان سے علاج کرانے کا مشورہ دیا' بلکہ سید نذیر نیازی اپنی کتاب ''اقبال کے حضور میں'' میں لکھتے ہیں کہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۸ء کو علامہ محمد اسد ان دو جرمن ڈاکٹروں کو اقبال کے پاس لائے بھی تھے۔ (یہ واقعات محمد اسد کی کتاب ''شاہراہ مکہ'' اور ان سے متعلق بعض اخباروں کے مضامین کی مدد سے بیان کیے گئے ہیں)۔

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری عالم گیر جنگ شروع ہو گئی۔ محمد اسد چوں کہ جرمن تھے' اس لیے انہیں ہندوستان کی انگریزی حکومت نے گرفتار کر کے دہلی میں نظر بند کر دیا۔ ان کی گرفتاری غالباً ایبٹ آباد سے ہوئی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد انہیں رہا کیا گیا۔ رہائی کے بعد انہوں نے کچھ وقت ڈلہوزی کے پہاڑی مقام پر گزارا۔

محمد اسد کی رہائی سے تقریباً دو سال بعد اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان معرض قیام میں آ گیا۔ اپنی تحریرات میں انہوں نے اسلامی دستور اور اسلامی نظام حکومت کے متعلق تفصیلات بیان کیں۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ اس وقت نواب افتخار حسین خاں (آف ممدوٹ) تھے۔ انہوں نے محمد اسد سے رابطہ قائم کر کے ۱۹۴۸ء میں ادارہ برائے اسلامی تعمیر نو (Department of Islamic Reconstruction) کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس کے ڈائریکٹر محمد اسد کو بنایا گیا۔ ڈپٹی ڈائریکٹر تھے سید نذیر نیازی۔ رفقائے ادارہ تھے مولانا محمد حنیف ندوی' شاہ محمد جعفر پھلواری' مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی' سید شبیر احمد شاہ اور مولانا شفیق الرحمٰن لکھوی۔ اس ادارے کی طرف سے ایک مجلّہ جاری کیا گیا تھا' جس کا نام ''عرفات'' تھا۔ مجلّہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ یہ ادارہ تھوڑا عرصہ ہی قائم رہا۔ پنجاب کے آخری انگریز گورنر سر فرانسس موڈی نے اسے ختم کر دیا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ ملک مسلمانوں کا تھا' حکومت مسلمانوں کی تھی اور اس میں اسلامی معاملات کی تحقیق کے لیے حکومت نے جو ادارہ قائم کیا تھا' وہ انگریز گورنر کو منظور نہ تھا' چنانچہ اس نے اس ادارے کا خاتمہ کر دیا۔

۱۹۵۰ء میں محمد اسد کو شرق اوسط کے ڈویژن کا سربراہ بنا کر پاکستان کی وزارت خارجہ میں منتقل کیا گیا۔ اس منصب کے زمانے میں انہوں نے پاکستان کے ساتھ اسلامی ملکوں کے تعلقات کو مستحکم کرنے کی انتہائی جدوجہد کی۔ بعد ازاں ۱۹۵۲ء کے آغاز میں انہیں نیویارک میں اقوام متحدہ کے پاکستانی مشن میں وزیر مطلق (Minister of Plenipotentiary) کی حیثیت سے بھیجا گیا۔ حکومت پاکستان کی طرف سے جو کام ان کے سپرد کیا گیا' وہ اسے نہایت اخلاص اور محنت سے انجام دینا چاہتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں پاکستان کے وزیر خارجہ' سر ظفر اللہ خاں تھے اور وہ پکے مرزائی تھے' بلکہ (نعوذ باللہ) وہ مرزا صاحب کے آخری دور کے ''صحابی'' تھے۔ اس کے برعکس علامہ محمد اسد مرزائیوں کے شدید مخالف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سر ظفر اللہ نے ان کے وزارت خارجہ کے سلسلے کے ہر کام میں رکاوٹ پیدا کی' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں مجبوراً ان خدمات سے علیحدہ ہونا پڑا۔

اب آیئے علامہ محمد اسد کی تصانیف کی طرف:

۱۔ روڈ ٹو مکہ: یہ علامہ محمد اسد کی ایک مشہور تصنیف ہے' جس میں انہوں نے کافی حد تک اپنے حالات زندگی بیان

Marfat.com

کیے ہیں۔اس انگریزی کتاب کا ''الطریق الی مکۃ'' کے نام سے عربی ترجمہ ہوا۔اردو ترجمہ ''شاہراہ مکۃ'' کے نام سے کیا گیا۔اس کی تلخیص ''طوفان سے ساحل تک'' کے نام سے لکھنؤ کے کسی اہل علم نے کی۔''روڈ ٹو مکۃ'' علامہ ممدوح نے قیام برصغیر کے زمانے میں لکھی تھی۔

۲۔ اسلام ایٹ دی کراس روڈز: یہ کتاب انہوں نے ۱۹۳۳ء میں دہلی کے زمانہ قیام میں لکھی تھی۔پہلی مرتبہ وہیں مارچ ۱۹۳۴ء میں چھپی۔پھر لاہور میں چھپی۔اس کتاب نے بہت شہرت پائی اور بہت پڑھی گئی۔پاکستان میں اس کے ناشر شیخ محمد اشرف تاجر کتب لاہور تھے۔اس میں اسلام کے متعلق نہایت ضروری امور کی خوب صورت انداز میں وضاحت کی گئی ہے۔

۳۔ ان کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ''اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول'' کے نام سے مولانا غلام رسول مہر نے کیا تھا جو غلام علی اینڈ سنز لاہور کی طرف سے شائع ہوا تھا۔اپنے موضوع کی یہ ایک اہم کتاب ہے۔ ۱۹۶۱ء میں یہ کتاب یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس برکلے نے شائع کی تھی۔اس کا اردو ترجمہ ۱۹۶۳ء میں چھپا۔

۴۔ صحیح بخاری کا انگریزی ترجمہ: علامہ محمد اسد کی حدیث کی موضوع پر یہ بہت بڑی خدمت ہے۔یہ ترجمہ انہوں نے تقسیم ہند سے قبل اس وقت کیا تھا جب وہ برصغیر میں قیام پذیر تھے۔افسوس ہے ترجمہ مکمل نہیں ہوسکا تھا۔

۵۔ قرآن مجید سے متعلق ان کی عظیم خدمت ''دی میسج آف دی قرآن'' کے نام سے انگریزی ترجمہ قرآن اور اس کی تفسیر ہے جو ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔اس ترجمہ وتفسیر کی تکمیل انہوں نے امریکہ کے دوران قیام میں کی۔کہا جاتا ہے کہ یہ اہم کام انہوں نے رابطہ عالم اسلامی کے کہنے سے کیا تھا' لیکن بعض علمائے کرام نے اس کے بعض مقامات پر اعتراض کیا تو رابطہ عالم اسلامی نے اسے شائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔پھر یہ ترجمہ مع تفسیر امریکہ سے شائع ہوا۔

اس کے علاوہ ان کی اور بھی مطبوعہ کتابیں ہیں اور بہت سے تحقیقی مسودات ہیں جو ان کی بیگم حمیدہ کے پاس کینیڈا میں محفوظ ہیں۔معلوم ہوا ہے کہ ان کی اشاعت کا اہتمام حکومت پاکستان کی وزارت خارجہ کی طرف سے کیا جارہا ہے۔

اس موقعے پر اگر علامہ محمد اسد کے فقہی مسلک کا تذکرہ بھی کر دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

علامہ ممدوح کا قبول اسلام کے فوراً بعد کا چھ سال پر مشتمل طویل عرصہ سعودی عرب میں سلطان ابن سعود (کے مشیر خاص) اور نجدی علما کی مجالس علمیہ میں گزرا تھا اور وہ سخت قسم کے مذہبی لوگ تھے' جنہیں اس وقت بھی وہابی کہا جاتا تھا' اب بھی وہابی کی نسبت ان کے ساتھ چسپاں ہے۔یہی تاثر ہمیشہ علامہ ممدوح پر غالب رہا۔لاہور میں ان سے قریبی تعلق رکھنے والوں کی وسیع فہرست میں مولانا حنیف ندوی اور مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی کے علاوہ علامہ کے گہرے اور مخلص ترین دوست محمد حسین بابری تھے۔یہ حضرات انہیں اہل حدیث قرار دیتے تھے۔محمد حسین بابری خاص طور سے انہیں ''پکا وہابی'' کہا کرتے تھے۔

Marfat.com

بابری صاحب کے بقول مرزائیت سے انہیں سخت نفرت تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ متعدد اہل علم ان کے پاس بیٹھے تھے اور مختلف مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اسی اثنا میں اسد صاحب کے پرانے ملنے والے ایک صاحب آئے۔ انہوں نے ان کو سلام کیا' لیکن انہوں نے ان کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ نہ ان کی طرف متوجہ ہوئے' نہ ان سے کوئی بات کی۔ وہ حیران کہ یہ کیا معاملہ ہے اور ان کے معمول کے خلاف یہ بے رخی کیوں ہے؟ انہوں نے بابری صاحب سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ کسی نے ان سے کہا ہے کہ آپ کا رجحان مرزائیت کی طرف ہو گیا ہے۔ وہ یہ سنتے ہی اسد صاحب کے سامنے کھڑے ہو گئے اور قسم کھا کر کہا کہ ان کا مرزائیت سے ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ آپ کو کسی نے بالکل غلط اطلاع دی ہے۔ اس سے اسد صاحب کی خفگی دور ہو گئی اور انہوں نے ان سے مصافحہ بھی کیا اور خیر و عافیت بھی پوچھی۔

۱۹۳۸ء میں گوجرانوالہ کی انجمن اہل حدیث کا سالانہ جلسہ ہوا۔ اس جلسے میں علامہ محمد اسد کو خاص طور سے دعوت شرکت دی گئی تھی۔ وہ جلسے میں آئے اور انگریزی میں تقریر کی' جس میں اہل حدیث کی علمی مساعی کا تذکرہ فرمایا۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم نے اس تقریر کا حاضرین کو اردو ترجمہ سنایا۔

یہاں علامہ محمد اسد کے متعلق اسی قسم کا ایک اور واقعہ سنتے جایئے۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ کلکتہ کی جماعت اہل حدیث نے جمعیت تبلیغ اہل حدیث کے نام سے ایک تبلیغی سلسلہ شروع کیا تھا اور مختلف اوقات میں اس کے عام جلسے منعقد کیے جاتے رہے۔ ان جلسوں میں ملک کے مشہور اصحاب علم تقریریں کرتے تھے۔ ستمبر ۱۹۳۴ء میں اس کا جلسہ بہ صدارت مولانا ابوالکلام آزاد منعقد ہوا تھا۔ اس جلسے میں مولانا نے جو خطبہ صدارت ارشاد فرمایا تھا' وہ ''خطبات ابوالکلام'' (مرتبہ مالک رام) میں طبع ہو چکا ہے۔

جمعیت تبلیغ اہل حدیث کلکتہ کا چوتھا سالانہ جلسہ ۲۶' ۲۷' ۲۸ مارچ ۱۹۳۷ء کو ہوا تھا۔ اس کی صدارت کے لیے علامہ محمد اسد کا نام تجویز کیا گیا تھا۔ علامہ ممدوح خود تو کسی وجہ سے اس اجلاس میں تشریف نہیں لا سکے تھے البتہ انہوں نے اپنا انگریزی خطبۂ صدارت جمعیت کے منتظمین کو ارسال فرما دیا تھا' جو مولانا عبداللہ الکافی القرشی نے حاضرین کو پڑھ کر سنایا تھا۔ یہ خطبہ مولانا غلام رسول مہر کے اس کتب خانے میں محفوظ ہے جو ان کی وفات کے بعد عجائب گھر (لاہور) میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

مولانا عبداللہ الکافی القرشی مشہور اہل حدیث عالم تھے۔ قیام پاکستان کے بعد کلکتہ سے مشرقی پاکستان چلے گئے تھے اور ان کی کوششوں سے ۱۹۴۸ء کے شروع میں آل بنگال و آسام جمعیت اہل حدیث کا قیام عمل میں آیا تھا۔ وہ اس جمعیت کے صدر تھے۔ عام طور سے اسے مرکزی جمعیت اہل حدیث مشرقی پاکستان کہا جاتا تھا۔ مولانا عبداللہ الکافی کی وفات ۴ جون ۱۹۶۰ء کو ہوئی۔ ان کے بڑے بھائی مولانا عبداللہ الباقی القرشی تھے' جن کا اس سے ساڑھے آٹھ سال پہلے یکم دسمبر ۱۹۵۲ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوا تھا۔

علامہ محمد اسد عام شرعی مسائل کے سلسلے میں امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ سے بہت متاثر تھے۔

Marfat.com

وہ اردو جانتے اور سمجھتے تھے۔ بولتے بھی تھے۔ لیکن چوں کہ اردو سے انہیں زیادہ لگاؤ نہیں تھا' اس لیے اس زبان میں گفتگو کرتے وقت بعض اوقات کوئی نہ کوئی لطیفہ اپنا رنگ دکھا جاتا تھا۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ دوران گفتگو میں جب کوئی پنجابی کا لفظ آ جاتا تو بڑی دلچسپ صورت حال پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کی انہوں نے ایک دو مثالیں بھی دی تھیں۔

مضمون کے آغاز میں عرض کیا گیا ہے کہ محمد حسین بابری نے علامہ محمد اسد سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ یہ مولانا محی الدین احمد قصوری' مولانا محمد علی قصوری' مولانا داؤد غزنوی اور مولانا محمد حنیف ندوی کے رفیق کار اور ان کی جماعت کے ترجمان ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے ایڈیٹر ہیں۔ ان بزرگان ذی مرتبت میں سے مولانا محی الدین احمد قصوری اپریل ۱۸۸۹ء میں پیدا اور ۲۴ جنوری ۱۹۷۱ء کو فوت ہوئے۔ والدین نے ان کا نام برکت علی رکھا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں کلکتے گئے تو مولانا کے نام کی وجہ سے اپنا نام محی الدین احمد رکھ لیا تھا۔

ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب تھے جن کی تاریخ ولادت اگست ۱۸۹۲ء اور تاریخ وفات ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء ہے۔ ان دونوں بھائیوں کے تفصیلی حالات میں اپنی کتاب ''قصوری خاندان'' میں لکھ چکا ہوں جو ۱۹۹۴ء میں چھپی تھی۔ علاوہ ازیں اپنی ایک ضخیم کتاب ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' میں بھی مختصر الفاظ میں ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی ولادت جولائی ۱۸۹۵ء میں ہوئی اور ۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء کو ان کا انتقال ہوا۔ ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''نقوش عظمت رفتہ......!''

مولانا محمد حنیف ندوی کی تاریخ پیدائش ۱۰ جون ۱۹۰۸ء اور تاریخ وفات ۱۲ جولائی ۱۹۸۷ء ہے۔ ان کے مفصل حالات میں اس فقیر نے ایک مستقل کتاب ''ارمغان حنیف'' کے نام سے مرتب کی ہے۔ نیز اپنی دو کتابوں ''قافلہ حدیث'' اور ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' میں بھی ان کی علمی خدمات کا تذکرہ خاصی تفصیل سے کیا ہے۔

درج ذیل سطور میں محمد حسین بابری کے متعلق چند گزارشات پیش کرنا مقصود ہے۔

محمد حسین بابری ۱۹۰۲ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم صرف میٹرک تک حاصل کر سکے' لیکن لاہور کے پرانے سیاست دانوں (اگرچہ ان کا تعلق کسی سیاسی جماعت سے ہو) عالموں' شاعروں' ادیبوں' اخبار نویسوں' مقرروں' کاروباری لوگوں کے بارے میں بے حد معلومات رکھتے تھے اور ان میں سے کسی طبقے یا کسی شخص کے متعلق گفتگو شروع کر دیتے تو ایسے ایسے واقعات بیان کرتے' جن کا بہت کم لوگوں کو علم ہوتا۔

وہ اپنے ملنے والوں کے خیر خواہ اور دوستوں کے دوست تھے۔ کوئی کام ان کے ذمے لگا دیا جاتا تو اس کو سرانجام دینے کی پوری کوشش کرتے۔ سیاسی ذہن کے اعتبار سے پکے مسلم لیگی تھے' لیکن لوگوں سے مراسم کا دائرہ وسیع تھا' اس کی راہ میں سیاسی نقطہ فکر کو حائل نہیں ہوتے تھے۔

Marfat.com

مولانا محمد حنیف ندوی کے وہ عقیدت مند دوست تھے۔ میرا تعلق ان سے ۱۹۵۳ء میں مولانا ندوی کی وساطت سے ہوا تھا۔

پورا قد' گداز جسم بھرا ہوا' سرخی مائل داڑھی' مونچھ سے آزاد گول چہرہ' مناسب نقش ونگار' آنکھوں پر نظر کی عینک۔ سردیوں میں انگریزی سوٹ' گرمیوں میں پینٹ بوشرٹ میں ملبوس۔ کھنک دار آواز' نہایت غیور اور ابھری ہوئی انا کے مالک۔ نرم کے سامنے بے حد نرم اور اکڑباز کے سامنے مرنے مارنے کو تیار۔ دو چیزیں ان کی زندگی کا جز تھیں جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ ایک ان کا سائیکل اور ایک بڑا سا بیگ جو سائیکل کے ہینڈل کے ساتھ بائیں جانب لٹکا رہتا تھا۔ اس بیگ کو ہم تھیلا بھی کہا کرتے تھے اور خانہ انوری بھی۔ یہ تھیلا ان کے ضروری کاغذوں' کاپیوں اور کتابوں کا امین تھا۔ ہم انہیں میجر صاحب کہا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ جب میں لوہاری دروازے کے اندر رہتا تھا' وہ میرے گھر آئے۔ گھنٹی بجائی' لیکن میں گھر میں نہیں تھا' واپس چلے گئے۔ میں شام کو گھر آیا تو بیوی نے بتایا میجر صاحب آئے تھے اور گھنٹی بجا کر چلے گئے۔ میں نے پوچھا اکیلے ہی تھے' کہا نہیں سائیکل اور تھیلا بھی ان کے ساتھ تھے۔

انہیں مجھ سے کوئی تکلف نہ تھا۔ وہ میرے گھر بھی تشریف لاتے تھے' جب تک میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی ادارت سے وابستہ رہا' اس کے دفتر بھی آتے رہے۔ پھر ۱۹۶۵ء میں میرا تعلق ادارہ ثقافت اسلامیہ سے ہوا' وہاں بھی ان کی آمد ورفت رہی۔ خالص علمی باتیں بھی کرتے تھے اور مناسب مواقع پر لطائف کا سلسلہ بھی جاری رکھتے تھے۔

مرزائیت سے انہیں شدید نفرت تھی۔ شیعیت کے متعلق بھی ان کے جذبات خاصے تیز تھے۔ اس موضوع پر ان کے مطالعے کا دائرہ کافی پھیلا ہوا تھا۔ جو بات کرتے اس کا حوالہ دیتے تھے' لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ بعض شیعہ حضرات سے ان کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ میکلیگن روڈ پر ایک درزی خانہ تھا' جہاں بعض سکولوں کے بچوں کی وردیاں تیار کی جاتی تھیں۔ یہ درزی خانہ دو آدمیوں نے جاری کیا تھا۔ ایک کا نام طفیل حسین تھا جو شیعہ تھے اور لاہور کے علاقہ وسن پورہ کے رہنے والے تھے۔ دوسرے آغا محمد سعید تھے جو اہل حدیث سے قریب تر تھے اور شادباغ میں قیام پذیر تھے۔ آغا محمد سعید شیعیت پر کھل کر تنقید کرتے تھے۔ ان دونوں کے دو دوست اور تھے اور وہ تھے یہی محمد حسین بابری اور سید شیر احمد شاہ۔ سید شیر احمد شاہ پکے اہل حدیث تھے اور اپنے وسیع مطالعہ کی روشنی میں شیعیت کے ناقد۔ بابری صاحب اور شاہ صاحب دونوں کی درزی خانے میں آمد ورفت رہتی تھی۔ میں بھی ہفتے میں ایک آدھ دفعہ اپنے اس دور کے دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ سے واپسی پر وہاں جاتا تھا اور پھر دوپہر کا کھانا وہیں کھایا جاتا تھا۔ طفیل حسین صاحب تو کم گو تھے' لیکن یہ تینوں کھل کر باتیں کیا کرتے تھے۔

سید شیر احمد شاہ صاحب کی ایک بیٹی اس وقت محکمہ تعلیم میں ڈپٹی ڈائریکٹر تھیں' ان کا نام یاد نہیں رہا' انہیں مس بخاری کہا جاتا تھا۔ ایک دن شاہ صاحب ان کے بارے میں مجھ سے کچھ مشورہ لے رہے تھے۔ اس اثنا میں بابری

Marfat.com

صاحب بھی آ گئے' وہ بھی کسی سلسلے میں مجھ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ دوران گفتگو میں شاہ صاحب نے دو تین مرتبہ مس بخاری' مس بخاری کہا تو بابری صاحب نے ان سے کہا یہ کیا آپ نے بخارا بخارا کی رٹ لگا رکھی ہے' بات جلدی ختم کیجئے' میں بھی ان سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔

شاہ صاحب گرم مزاج تھے' بابری صاحب کے الفاظ سن کر طیش میں آ گئے۔ پھر کئی دن دونوں کی بول چال بند رہی۔ بڑی مشکل سے صلح کرائی۔

طفیل حسین صاحب کی ایک عزیزہ کی شادی سرگودھا میں ان کے ایک عزیز سے ہوئی تھی۔ کسی معاملے میں میاں بیوی کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا تو معاملہ انقطاع تک پہنچ گیا۔ فیصلہ یونین کونسل کے جس چیئرمین نے کرنا تھا' وہ اس شخص کے دوست تھے جس سے جھگڑا تھا۔ طفیل حسین صاحب کو شبہ تھا کہ وہ لڑکی کے خلاف فیصلہ کریں گے۔ اس کا ذکر انہوں نے بابری صاحب سے کیا۔ بابری صاحب اسی وقت میرے پاس پہنچے۔ چیئرمین سے میرے اچھے مراسم تھے۔ میں نے چیئرمین صاحب کو معاملے کی نوعیت بتائی اور فیصلہ طفیل حسین صاحب کے حق میں ہو گیا۔ اسی گفتگو کے دوران مجھے پتا چلا کہ شیعہ حضرات طلاق کو ''صیغہ'' کہتے ہیں۔ افسوس ہے اس فقیر کے یہ تمام دوست اپنی اپنی باری سے سفر آخرت پر روانہ ہو گئے ہیں۔

بات کچھ لمبی ہو گئی۔ میں دراصل عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ محمد حسین بابری لاہور میں علامہ محمد اسد کے مخلص ترین دوست تھے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

ا۔ پاکستان میں علامہ محمد اسد کی تصنیف ''اسلام ایٹ دی کراس روڈز'' کے ناشر شیخ محمد اشرف تاجر کتب تھے۔ علامہ نے شیخ صاحب کو یہ لکھ کر دیا تھا کہ اس کی رائلٹی محمد حسین بابری کو دی جائے۔ وہ خود اس رائلٹی سے دستبردار ہو گئے تھے۔ چنانچہ شیخ صاحب باقاعدہ اس کی رائلٹی بابری صاحب کو دیتے رہے۔ کچھ عرصہ رقم کی ادائیگی میں تاخیر ہوئی تو بابری صاحب نے مجھے کہا کہ میں شیخ صاحب کو اس طرف توجہ دلاؤں' چنانچہ میں نے شیخ صاحب کو بابری صاحب کا پیغام پہنچایا۔ اس وقت شیخ صاحب کے نوجوان نواسے شہزاد صاحب بھی موجود تھے۔ اسی اثنا میں شیخ صاحب وفات پا گئے تو ان کے قائم کردہ اشاعتی ادارے کا انتظام ان کے نواسے شہزاد صاحب نے سنبھالا اور رائلٹی کی رقم جو کئی ہزار روپے تھی' بابری صاحب کو ادا کر دی اور اس کی اطلاع مجھے دی۔

بابری صاحب نے ''اسلام ایٹ دی کراس روڈز'' کا اردو ترجمہ بھی کرایا تھا جو مجھے بھی دکھایا تھا اور مولانا محی الدین احمد قصوری اور مولانا محمد حنیف ندوی کی خدمت میں بھی پیش کیا تھا۔ اس کی کتابت بھی کرائی گئی تھی' لیکن افسوس ہے ترجمہ چھپ نہیں سکا۔ گذشتہ دنوں (۲۰۰۴ء میں) اس کا اردو ترجمہ مکتبہ دارالسلام لاہور کی طرف سے شائع ہوا جو ڈاکٹر محبوب سبحانی صاحب نے کیا ہے۔

۲۔ اسد صاحب کے لاہور کے زمانہ قیام میں محمد حسین بابری ان کے خاص مشیر تھے۔ ضلع شیخوپورہ کے کسی مقام پر ایک برطانوی کمپنی کو حکومت پاکستان کی طرف سے کوئی ترقیاتی کام دیا گیا تھا۔ کمپنی کے ارکان انتظامیہ میں سے چند ارکان کا

Marfat.com

تعلق محمد اسد صاحب سے بھی تھا' انہیں کسی سلسلے میں ایک محنتی اور قابل اعتماد شخص کی ضرورت تھی۔ اس کا ذکر انہوں نے اسد صاحب سے کیا تو انہوں نے محمد حسین بابری کو وہاں بھیجا اور کہا کہ ان میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں' جن کی آپ کو ضرورت ہے۔ بابری صاحب کچھ عرصہ وہاں رہے۔ وہ لوگ ان سے بہت خوش تھے' لیکن اسد صاحب کا ان کے بغیر گزارا نہ ہوسکا' انہیں واپس لاہور بلالیا گیا۔

۳۔ محمد حسین بابری کا مسکن ۵۱ عمر دین روڈ وسن پورہ تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا' لیکن اسد صاحب اور ان کی بیگم ہفتے عشرے بعد ضرور ان کے گھر جاتے تھے۔ اس دور کی متعدد تصویریں بابری صاحب کے پاس تھیں جو میں نے دیکھی تھیں۔

۴۔ اسد صاحب پاکستان سے چلے گئے تھے' لیکن محمد حسین بابری سے ان کی خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ان کے تمام خطوط بابری صاحب نے پوری حفاظت کے ساتھ اپنے پاس رکھے تھے۔

۵۔ اسد صاحب کی جو کتاب کہیں سے شائع ہوتی تھی' وہ بابری صاحب کو ضرور بھیجی جاتی تھی۔ ان کے پاس ''روڈ ٹو مکہ'' کا انگریزی ایڈیشن بھی تھا' اس کا عربی ترجمہ ''الطریق الی مکہ'' بھی تھا اور اردو ترجمہ ''شاہراہ مکہ'' بھی ان کے پاس موجود تھا۔

۶۔ اسد صاحب کی پہلی بیوی کے بیٹے طلال سے بھی بابری صاحب کی خط و کتابت تھی۔

۷۔ ۱۹۴۸ء میں جو ادارہ اسلامی تعمیر نو کے نام سے بنایا گیا تھا' اس کے گروپ فوٹو میں علامہ محمد اسد' سید نذیر نیازی' مولانا محمد حنیف ندوی' مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی' سید شبیر احمد شاہ وغیرہ حضرات شامل تھے۔ یہ گروپ فوٹو بھی محمد حسین بابری کے پاس موجود تھا۔

۸۔ ایک مرتبہ تقریباً ڈیڑھ مہینے بعد بابری صاحب میرے دفتر تشریف لائے۔ عرض کیا حضور! اتنا عرصہ کہاں رہے؟ مسکراتے ہوئے جواب دیا ذرا سوئٹزرلینڈ تک گیا تھا۔ تعجب سے پوچھا کیوں؟ کہا اسد صاحب نے بلایا تھا۔

اس وقت اسد صاحب جنیوا کے قریب کہیں رہتے تھے۔ بابری صاحب ان کی دعوت پر وہاں گئے اور ایک مہینے سے زیادہ دن ان کے پاس رہے۔

۹۔ اسد صاحب نے پنکھے' استریاں' میز' کرسیاں وغیرہ بہت سی چیزیں بابری صاحب کو دی تھیں۔ میں کبھی ان کے گھر جاتا تو وہ نہایت مسرت کے ساتھ بعض چیزیں دکھایا اور بتایا کرتے تھے کہ یہ ان کو اسد صاحب نے عنایت کی تھیں۔

۱۰۔ اگر کسی شخص کے بارے میں بابری صاحب کو بتایا جاتا کہ لاہور میں اسد صاحب کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے تو وہ بسا اوقات خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے' لاہور میں کوئی ایسا شخص نہیں' جس کے اسد صاحب سے دوستانہ مراسم ہوں اور مجھے اس کا علم نہ ہو۔ مجھ سے زیادہ کوئی اسد صاحب کا دوست تھا اور نہ ان کا راز دان۔ مجھے ان کی ذاتی اور گھر کی ہر بات کا علم تھا۔

کسی زمانے میں بابری صاحب کی مالی حالت بہت کمزور تھی' لیکن وہ بے حد صابر تھے' کسی کو اپنی غربت کا

Marfat.com

پتہ نہیں چلنے دیتے تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے ایک مرتبہ بتایا کہ تقسیم ملک سے کچھ عرصہ قبل کی بات ہے کہ انہیں بابری صاحب کہیں لے جانا چاہتے تھے۔ ان کے پاس تو سائیکل تھا' لیکن مجھے تانگے پر جانا تھا' تانگے کا کرایہ نہ ان کے پاس تھا' نہ میرے پاس۔ مولانا فرماتے تھے اس وقت میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بے ساختہ زبان سے یہ الفاظ نکلے ''یا اللہ! اگر تو ہمیں نہیں دیتا تو ہمارے دوستوں کو تو دے۔''

بعد میں ایسا وقت آیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بارگاہ سے ضرورت کے مطابق دونوں کو عطا فرمایا۔ محمد حسین بابری کی اصل سواری بائیسکل تھا۔ ان کا جسم بوجھل ہو گیا تھا۔ وہ ایک دفعہ سائیکل سے گرے اور انہیں کافی چوٹیں آئیں پھر صحت یاب نہیں ہو سکے اور انہوں نے ۵ جنوری ۱۹۸۳ء کو وفات پائی اور ان کے دوست علامہ محمد اسد ان سے نو سال بعد ۲۰ فروری ۱۹۹۲ء کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

اب سوال یہ ہے کہ علامہ محمد اسد کے وہ خطوط' مختلف کاغذات اور تصویریں وغیرہ کہاں ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ کچھ عرصہ پیشتر اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کے مدیر جناب محمد ارشد صاحب مجھ سے ملے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ علامہ محمد اسد صاحب پر پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھ رہے ہیں' میں اس سلسلے میں ان سے تعاون کروں۔ یہ میرے لیے مسرت کی بات تھی۔ میں نے ان سے محمد حسین بابری اور علامہ محمد اسد کے دوستانہ مراسم کی وضاحت کی اور ان سے عرض کیا کہ ان کے خطوط اور تصویریں وغیرہ بابری صاحب کے بڑے بیٹے جناب مقبول حسین کے پاس محفوظ ہیں اور وہ ۵۱ عمر دین روڈ وسن پورہ میں رہتے ہیں۔ ان سے ملیے' انہیں میرا اسلام پہنچائیے اور اپنا مقصد بیان کیجئے' انشاء اللہ آپ کامیاب ہوں گے۔ چنانچہ وہ مقبول حسین سے ملے' ان سے بات کی اور انہوں نے کمال مہربانی سے تمام خطوط' کاغذات اور تصویریں وغیرہ ان کے حوالے کر دیں اور وہ آج کل اپنا مقالہ لکھ رہے ہیں۔ میرے ساتھ ان کا رابطہ قائم ہے.........

نہایت افسوس ہے' ۲۵ فروری ۲۰۰۲ء کو محمد حسین بابری کے بیٹے مقبول حسین بابری بھی وفات پا گئے۔

علامہ محمد اسد کے دو قریبی دوست محمد حسین بابری اور مولانا محمد حنیف ندوی میرے مشفق تھے اور میرے ان سے نہایت بے تکلفانہ قریبی تعلقات تھے' لیکن میری یہ حرماں نصیبی ہے کہ میں علامہ ممدوح کے بارے میں ان سے زیادہ معلومات حاصل نہ کر سکا۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ علامہ محمد اسد کی وفات کی خبر میں نے اخبار ''جنگ'' میں پڑھی تھی جو صرف دو سطروں پر مشتمل تھی اور ایسی جگہ دی گئی تھی کہ کوئی اسے پڑھ نہ سکے۔ اس کے بعد ''جنگ'' ہی میں ان کے متعلق مولانا کوثر نیازی کا مضمون پڑھا-- سنا تھا کہ یہ مضمون ان کی کتاب ''جنہیں میں نے دیکھا'' میں بھی چھپا تھا' لیکن افسوس ہے وہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔

انہی دنوں ان کے بارے میں ایک مضمون کراچی کے ایک ہفت روزہ (غالباً ''تکبیر'') میں شائع ہوا تھا جو

Marfat.com

جناب ثروت صولت صاحب کا تحریر فرمودہ تھا۔ اس میں فاضل مضمون نگار نے علامہ محمد اسد سے دہلی میں اپنی ملاقات کا ذکر بھی کیا تھا۔ وہ دلچسپ مضمون تھا۔ افسوس ہے وہ بھی میرے پاس نہیں ہے، لیکن اس کے بعض مندرجات میرے ذہن میں محفوظ ہیں اور حافظے کی مدد سے ان میں سے بعض باتیں اس مضمون میں درج کی گئی ہیں۔ ان کے مختصر سے حالات کے متعلق ان کی کتاب ''شاہراہ مکہ'' سے بھی کچھ مدد ملی ہے۔

(در: الاخوۃ (لاہور)' جولائی ۲۰۰۵ء' ص ۱۸-۲۰ و ستمبر ۲۰۰۵ء، ص ۳۷-۴۲۔ نیز رک: برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن از محمد اسحاق بھٹی۔ دہلی ۲۰۰۸ء، ص ۵۰۷-۵۲۹)۔

Marfat.com

محمد ارشد

محمد اسد

بطور ترجمان وشارح حدیث

(عمومی جائزہ)

خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ اور آپؐ کے ارشادات و ہدایات کہ جس کے مجموعہ کا معروف نام حدیث وسنت ہے، قرآن حکیم کی مستند شرح وتفسیر ہے۔حدیث وسنت کی دین وشریعت میں مرکزی حیثیت کے پیش نظر قرآن حکیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین اولین صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور ان کے بعد آنے والوں نے اس (حدیث وسنت) کی حفاظت، جمع وتدوین، نشر واشاعت اور تعلیم وتدریس کے لئے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں۔[1] احادیث وسنن کے محفوظ ومرتب مجموعوں کی بدولت امت کو ہر دور میں اپنے ہادی وپیشوا صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ ایمانی وروحانی اور علمی میراث ملتی رہی جو صحابہ کرام کو براہ راست حاصل تھی۔تاریخ اسلامی کے ہر دور میں احادیث وسنن کے مجموعوں نے اسلامی مزاج وماحول اور امت کے روحانی ودینی وجود کے بقاء وتسلسل میں اہم کردار ادا کیا۔[2] حدیث وسنت درحقیقت مستند اسلامی طرز حیات (عقائد واعمال وطرز زندگی) کا ایک ایسا معیار ومیزان ہے جس میں ہر دور کے مصلحین ومجددین امت کے عقائد واعمال اور رجحانات ومیلانات کو تول سکتے ہیں اور امت کے تاریخی سفر میں پیش آنے والے تغیرات وانحرافات سے واقف ہو سکتے ہیں۔یوں امت دینی وروحانی معاملات میں افراط وتفریط سے محفوظ رہ سکتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ احادیث کے مرتبہ مجموعے ہمیشہ تجدید واصلاح کی کاوشوں اور صحیح اسلامی فکر کا سرچشمہ رہے ہیں۔[3]

انیسویں اور بیسویں صدی میں مغرب کی ترقی یافتہ اور مہم جو اقوام نے عالم اسلام کے کثیر ممالک پر تسلط قائم کر لیا۔دنیائے اسلام پر مغرب کے سیاسی ومعاشی اور تہذیبی وفکری غلبہ واستیلاء کو استحکام ودوام سے ہمکنار کرنے کے لئے مغرب کے مسیحی ویہودی مبلغین ومستشرقین نے مغربی استعمار کے ہراول دستہ کے طور پر مسلمان ملت کے افراد کی

Marfat.com

گردنوں پر سے ان کے قدیم مذہب (اسلام)، تہذیبی و سماجی اور اخلاقی اقدار و روایات کا قلادہ اتارنے اور انہیں ''بزعم خویش'' مہذب و متمدن اور روشن خیال بنانے کا ذمہ و منصب سنبھال لیا۔[4] ان مستشرقین نے مسلمان ملت کو دین اسلام کی حقانیت وابدیت اور بالخصوص پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت سے بدظن کرنے[5] اور احادیث و سنن کے مجموعوں کو ساقط الاعتبار اور بے وقعت ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔[6]

مغرب کے سیاسی و تہذیبی تسلط کے اس دور میں دنیائے اسلام کے مختلف خطوں میں مصلحین اور دانشوروں کے ایسے گروہ منظر عام پر آئے جو مغربی تہذیب و تمدن کی چمک دمک سے مرعوب اور مستشرقین کی تحقیقات و تصنیفات سے متاثر تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں اس گروہ کے سرخیل سرسید احمد خان اور ان کے معتمد خاص مولوی چراغ علی جب کہ دنیائے عرب میں مفتی محمد عبدہ' تھے۔ ملت کے ادبار و انحطاط پر مغموم اور اس کے احیائے نو کے آرزو مندان مصلحین نے تجدید و اصلاح مذہب کا بیڑا اٹھایا اور احادیث و سنن کے ذخیروں سے قطع نظر مغرب کے جدید افکار و تصورات کو معیار بنا کر قرآن کی تفسیر کی طرح ڈالی۔ ان مصلحین نے حدیث و سنت کی روایات و حفاظت اور اس کی حجیت کے بارے میں ایسا نقطہ نظر ظاہر کیا جو بہت زیادہ حد تک مستشرقین کے خیالات سے ہم آہنگ تھا۔ سرسید احمد خان، مولوی چراغ علی[7] اور مفتی محمد عبدہ'[8] کے پیروکاروں نے حدیث و سنت کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار کیا کہ اس کی حقیقت ہی مشتبہ و مشکوک نظر آنے لگی۔[9]

ذہنی و فکری انتشار کے اس دور میں علماء و مفکرین کی ایک کثیر تعداد نے خالص علمی انداز میں حدیث و سنت کے بارے میں مستشرقین اور ان کے خوشہ چین مسلمان مصنفین کے پیدا کردہ شکوک و شبہات کو رفع کرنے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اس روحانی و علمی میراث پر ملت کے اعتماد کو بحال کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ حدیث و سنت کے ان ترجمانوں (کہ جن کی فہرست خاصی طویل ہے)[10] میں نومسلم فاضل و مفکر محمد اسد (۱۹۰۰ء-۱۹۹۲ء) کا نام اور کام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔[11]

محمد اسد ۱۹۳۰ء کی دہائی میں برصغیر پاک و ہند کے علمی و فکری افق پر حدیث و سنت کے ایک پُرجوش ترجمان و وکیل، مغربی تہذیب و تمدن اور دنیائے اسلام کے مختلف خطوں (ترکی، ایران اور مصر وغیرہ) کے مسلم معاشروں کی مغربی اقدار و تصورات کے مطابق تشکیل نو (Westernization) کے ایک شدید ناقد بن کر ابھرے تھے۔ انہوں نے قبول اسلام کے بعد اپنی پہلی لیکن انتہائی مختصر تصنیف Islam at the Crossroads (دہلی ۱۹۳۴ء)[12] میں ایک طاقتور، مؤثر اور دل آویز اسلوب میں حدیث و سنت کی ثقاہت و تاریخی حیثیت کے بارے میں مستشرقین اور تجدد پسندوں کے نقطہ نظر سے تعرض کرتے ہوئے اس (حدیث و سنت) کی حجیت کو ثابت کیا ہے۔ مسلم معاشرہ کی سالمیت و بقا، اس کے دینی و روحانی مزاج کے تسلسل و دوام کے حوالہ سے حدیث و سنت کی ضرورت و اہمیت کو ذہن نشین کرایا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے انکار سنت کے نفسیاتی اور سماجی و تہذیبی عوامل و محرکات کی نشاندہی کرتے ہوئے احادیث و سنن کے سرمایہ سے قطع تعلقی و محرومی کے بھیانک عواقب و نتائج سے بھی خبردار کیا ہے۔[13]

Marfat.com

محمد اسد کا تصور حدیث وسنت

محمد اسد (راسخ العقیدہ علماء وشارحین حدیث کی طرح) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور آپؐ کے ارشادات و روایات کو قرآن حکیم کی مستند ترین شرح گردانتے ہیں اور قرآن حکیم کے ساتھ ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اطاعت واتباع کو اسلامی طرز حیات میں ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ان کے الفاظ ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قرآن کریم کے بعد شریعت کا دوسرا بنیادی ماخذ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے احکام وتعلیمات کی مستند شرح ہمارے لئے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے۔عملی زندگی میں قرآن کے احکام کے اطلاق اور ان کی تعبیر وتشریح میں کسی نزاع سے بچنے کے لئے واحد ذریعہ بھی حدیث وسنت ہی ہے۔ اسی طرح عملی اہمیت کی بہت سی باتوں کی تفصیل قرآن حکیم میں نہیں ملتی چنانچہ ان کے لئے (بھی) سنت نبوی سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے عقل وفہم گواہی دیتے ہیں کہ جس ہستی پر قرآن حکیم کا نزول ہوا اس سے بہتر کوئی ترجمان نہیں ہوسکتا جو قرآن کی آیات کی عملی تفسیر کر سکے۔'' [15]

اسد کی رائے میں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کے روحانی وتہذیبی وجود کی بقا اس کے جداگانہ تشخص کا استحکام ''الاعتصام بالسنۃ'' ہی میں مضمر ہے۔سنت وہ صداقت اور اٹل حقیقت ہے جو ملت کو موجودہ زبوں حالی اور انتشار وافتراق سے نجات دلا سکتی ہے۔سنت، ملت کے جسد کے لئے فطری غذا کا درجہ رکھتی ہے۔لہٰذا اس فطری غذا کو ترک کر کے اصلاح احوال کی غرض سے اختیار کی جانے والی تدابیر ہرگز کارگر ثابت نہیں ہوسکتیں۔اسد رقمطراز ہیں:

''ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت وہ کلید ہے جس کے ذریعے اسلام کو تیرہ سو برس قبل عروج حاصل ہوا ہے۔سوال یہی ہے کہ آخر یہ آج ہمارے دور میں اسلام کے عروج کا ذریعہ کیوں نہیں بن سکتی؟ سنت کی پیروی اسلام کے وجود اور ترقی کے مماثل ہے جب کہ سنت سے انحراف اسلام کے انتشار اور انحطاط کے مماثل ہے۔'' [16]

اسد نے انکار حدیث وسنت کے عوامل ومحرکات کا بڑی بالغ نظری سے جائزہ لیا ہے۔ان کے خیال میں مغربی تہذیب وتمدن اور طرز حیات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کے پیش کردہ نظام حیات سے کسی طور پر بھی ہم آہنگ نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ مغربی تہذیب وتمدن کی چمک دمک سے مرعوب افراد جو اس تہذیب کی تعظیم وتقدیس میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اسے علم وعقل انسانی کی آخری دریافت خیال کرنے لگتے ہیں، سنت نبوی اور مغربی تہذیب وتمدن میں مفاہمت کو محال خیال کرتے ہوئے سنت ہی سے انکار کر بیٹھتے ہیں، کیونکہ سنت کے انکار کے بعد قرآن کی آیات کی من مانی تاویل کر کے اسے مغربی تہذیب وتمدن کی روح سے ہم آہنگ کرنے کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ [17]

اسد ''ادیان وملل'' کی تاریخ کے وسیع وعمیق مطالعہ کے سبب حدیث وسنت کی صحت وحجیت سے انکار اور عملی

Marfat.com

زندگی وتشریعی امور میں اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کے بارے میں مستشرقین اور ان کے ہم خیال مسلمان مصلحین کی طرف سے شکوک وشبہات پیدا کرنے اور اس کے نتیجے میں احادیث وسنن کے مرتبہ مجموعوں پر سے افراد امت کے اعتبار و اعتماد کے اٹھ جانے کے معنوی خسارے سے بھی بخوبی آگاہ ہیں۔ان کی رائے میں حدیث وسنت سے قطع تعلق امت کو اپنی دینی وروحانی میراث سے محروم، اپنی اصل سے سرگشتہ وحیران اور اپنے مبداء وآغاز سے اجنبی بنا کر رکھ دے گی۔اسد رقمطراز ہیں:

> ''سنت نبوی ہی وہ آہنی ڈھانچہ ہے جس پر اسلام کی عمارت کھڑی ہے۔اگر آپ کسی عمارت کا ڈھانچہ ہٹا دیں تو کیا آپ کو اس پر تعجب ہوگا کہ عمارت اس طرح ٹوٹ اور بکھر جائے جس طرح کاغذ کا گھروندا۔''[۱۸]

مذہبی مصلحین کا وہ گروہ جو خود کو 'اھل الذکر و القرآن'' کے نام سے موسوم کرتا ہے' قرآن حکیم کی تفسیر وتفہیم کے لئے حدیث وسنت کی ضرورت سے قطعاً انکاری ہے اور عوام الناس کو براہ راست فہم وتدبر قرآن کی دعوت دیتا ہے۔اسد کی نگاہ میں اس گروہ کی دعوت دھوکہ اور فریب کے سوا کچھ نہیں۔اسد کے الفاظ میں:

> ''ایک نعرہ، ہم آج کل تواتر سے سنتے چلے آرہے ہیں۔آیئے قرآن کی طرف رجوع کریں لیکن سنت کے غلامانہ پیرو کار نہ بنیں۔یہ نعرہ روح اسلام سے عدم واقفیت کا مظہر اور ایک دھوکہ وفریب ہے۔جو لوگ اس طرح کی رائے رکھتے ہیں' ان کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جو محل [فہم وتدبر قرآن] میں داخل ہونا چاہتا ہے لیکن وہ اس کلید [سنت] کو استعمال نہیں کرنا چاہتا جو اس محل [قرآن حکیم] کا دروازہ کھول سکتی۔''[۱۹]

محمد اسد نے سنت کی اطاعت واتباع کے بارے میں مستشرقین کے خیالات سے بھی تعرض کیا ہے۔انہوں نے مستشرقین کے اس خیال کہ ''سنت کی سختی سے پیروی دنیائے اسلام کے زوال وانحطاط کا محرک بنی ہے کیونکہ سنت کی پیروی انسانی فکر وعمل کی آزادی اور معاشرہ کی فطری ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے'' کی علمی وعقلی طرز پر تردید کی ہے۔[۲۰] فاضل مصنف نے انتہائی اختصار کے ساتھ انسانی عقل وفہم کی کوتاہیوں اور نارسائیوں کے پیش نظر نبوت و رسالت اور وحی والہام کی ضرورت واہمیت کو اجاگر کیا ہے۔اسد لکھتے ہیں:

> ''ایک ایسا مذہب جو فوق العقلی بنیادوں پر قائم ہے' کے مسائل میں ہمیں لابدی طور پر ایک ایسے ہادی وپیشوا کی ضرورت لاحق ہوتی ہے جس کا دماغ انسانی دماغوں سے فائق اور جس کا قلب انوار الہیہ سے معمور ہو یعنی ہمیں ایک نبی ورسول کی ضرورت ہے جو اللہ کی طرف سے مبعوث ہوا ہو۔''[۲۱]

اسد نے احادیث کی روایت وحفاظت کے متعلق مستشرقین کے پیدا کردہ شبہات ووساوس کو رفع کرنے کا بھی اہتمام کیا ہے۔ان کی رائے میں احادیث نبوی انتہائی سخت جانچ پڑتال کے بعد نسل در نسل آگے منتقل ہوتی رہی ہے۔

Marfat.com

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے پورے صدق واخلاص اور دیانت وامانت سے کام لیتے ہوئے احادیث روایت کیں۔ اسد کے الفاظ ہیں:

''کسی حدیث کے غلط ہونے کی پہلی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس کے ابتدائی راوی یعنی کسی صحابی یا بعد کے راویوں میں سے کسی ایک نے قصداً غلط بیانی کی ہو۔ جہاں تک صحابہ کا تعلق ہے، ایسی غلط بیانی کا گمان بھی نہیں ہوسکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا جس درجہ گہرا اثر صحابہ پر تھا، وہ تاریخی حیثیت سے پوری طرح ثابت ہے۔ لہٰذا یہ کسی طرح قرین قیاس نہیں کہ جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادنیٰ اشارہ پر جان قربان کردینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے، وہ آپ کے ارشادات کے ساتھ بددیانتی برتیں گے۔ خصوصاً اس صورت میں جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ان تک پہنچ چکا تھا۔ **من کذب علی متعمداً فلیتبؤ و مقعدہ من النار** (جو شخص قصداً میرے متعلق جھوٹ بیان کرے، اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔)

[البخاری، کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی حدیث ۱۱۰/الترمذی، ابواب العلم، باب ماجاء فی تعظیم الکذب علی رسول اللہ، حدیث ۲۶۵۹] [۲۲]

اسد نے متاخرین راویان احادیث اور محدثینؒ کرام کی عدالت وثقاہت اور جمع وتدوین احادیث کے سلسلہ میں ان کے حزم واحتیاط کا بھی مؤثر انداز میں دفاع کیا ہے۔ اسد کے بقول کسی دور میں بھی احادیث کی تنقید وتحقیق کا کام بند نہیں ہوا۔ موضوع وضعیف احادیث محدثین کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکیں۔ محدثین کرام بالخصوص امام بخاری اور امام مسلم نے صرف ان ہی احادیث کو جمع کیا جو شک وشبہ سے بالاتر اور تنقیدی معیار پر پورا اترتی تھیں۔ محدثین کرام کے تدوین وجمع احادیث وسنن کے بارے میں معین کردہ اصول ومعیارات (تنقید وتحقیق احادیث اور ان کے قبول ورد کے لئے) بہرحال یورپی محققین و ناقدین کے وضع کردہ ان اصول و معیارات سے زیادہ کڑے تھے جو انہوں (مستشرقین) نے قدیم تاریخ کے مآخذ کی جانچ پرکھ کے لئے استعمال کیے ہیں۔ [۲۳]

محمد اسد نے اپنی اس تصنیف میں بڑے اخلاص اور دلسوزی کے ساتھ اطاعت واتباع سنت کی دعوت کو ایک انتہائی مؤثر اور دلآویز اسلوب میں پیش کیا ہے۔ حدیث وسنت کی بابت ان کے قلم سے بعض ایسے جملے نکلے ہیں جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے عمیق وپختہ قلبی وروحانی تعلق اور ان کی حمیت دینی کے آئینہ دار ہیں۔ اسد رقمطراز ہیں:

''اگر ہم عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہیں تو ہم نہ صرف اخلاقی بلکہ عقلی حیثیت سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات وارشادات

Marfat.com

پر بے چون و چرا عمل کرنے کے پابند ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض احکام صریح طور پر زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جن کی اہمیت مقابلتاً کم ہے۔ ہمیں چاہیے کہ جو زیادہ اہم ہیں ان کو کم اہمیت کرنے والوں پر مقدم سمجھیں لیکن ہمیں یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی غیر ضروری سمجھ کر اس سے بے اعتنائی برتیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم ہدایت الٰہی پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم روح اسلام کے ساتھ مخلص رہنا چاہتے ہیں تو پھر سنت نبوی کو صوری و معنوی اعتبار سے اپنانے کے پابند ہیں۔[۲۴] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بزرگ ترین پیغمبر ہیں اور ہمیشہ اللہ کی منشا کے تحت ہی قدم اٹھاتے ہیں...... ایک ایسی ہستی جسے ''عالمین'' کے لیے رحمت بنایا گیا ہو [وما ارسلناک الا رحمة اللعالمين] ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قابل تقلید ہوتی ہے۔ اس کی رہنمائی کو مسترد کرنا یا اس کے فرمودات و ارشادات کو نظر انداز کرنا اللہ کے رحم کو مسترد کرنے یا اسے کمتر سمجھنے کے مترادف ہے۔''[۲۵] [القرآن ۲۱:۱۰۷]

اسد اس امر پر یقین محکم رکھتے ہیں کہ اسلام کی حقیقت حدیث نبوی سے بے نیاز ہو کر قطعاً حاصل نہیں ہو سکتی۔ موصوف واشگاف الفاظ میں کہتے ہیں:

''ہم اسلام کو دیگر تمام ادیان سے اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ ''اسلام'' دیگر ادیان کی طرح کوئی عام اور معمولی دین نہیں بلکہ کامل و جامع دین ہے اور وہ شخصیت جو ہمارے لے یہ دین لے کر آئی دوسرے دینی پیشواؤں کی طرح کوئی عام پیشوا نہیں بلکہ ہادیٔ کامل ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و افعال اور ارشادات و احکام کا اتباع عین اسلام کی پیروی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بے اعتنائی و انحراف اسلام کی حقیقت سے بے اعتنائی و انحراف ہے۔[۲۶] ...... مسئلہ (اطاعت و اتباع) سنت کے بارے میں ہمارا رویہ مستقبل میں اسلام کے بارے میں ہمارے رویے کو متعین کرے گا۔''[۲۷]

فاضل مصنف نے اطاعت و اتباع سنت کے اسرار و حکم بھی بیان کیے ہیں۔ انہوں نے افراد کی روحانی و اخلاقی تربیت، اسلامی معاشرے کے داخلی نظم و ضبط اور استحکام و اتحاد اور اس کے افراد کی عادات و اطوار اور افکار و خیالات میں ہم آہنگی و موٴقف کی غرض سے سنت کی افادیت کو عقلی و منطقی انداز میں ذہن نشین کرایا ہے۔[۲۸] ان کی رائے میں سنت کی پیروی معاشرے کو ہیئت کے اعتبار سے ہم آہنگ اور مستحکم بناتی ہے۔ مخاصموں ...... اور آویزشوں کو جو سماجی مسائل کے نام سے مغربی معاشرے میں ایک قابل ذکر الجھاؤ پیدا کرتی ہیں پروان چڑھنے سے روکتی ہے۔ چنانچہ جدلیاتی ابہام سے آزاد، قانون ربانی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کے ٹھوس ستونوں پر تعمیر اسلامی معاشرہ، اپنی تمام

Marfat.com

تر توانائیاں حقیقی مادی اور علمی فکری بھلائی پر خرچ کر کے فرد کو روحانی مقاصد کے حصول کے لئے تیار کرتا ہے۔[۲۹]

محمد اسد نے اپنی اس تصنیف میں اسلام کے نظریاتی ڈھانچے میں حدیث وسنت کے مقام و مرتبہ کو جس مؤثر انداز میں پیش کیا ہے وہ انہی کا خاصہ ہے۔ بلاشبہ یہ مختصر تصنیف عصر حاضر میں دین اسلام کی حمایت ودفاع کے لئے وجود میں آنے والے علم کلام کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔[۳۰] نامور نومسلم دانش ور محمد مارماڈیوک پکتھال کی رائے میں اسے عصر جدید کے اسلامی احیائی ادب میں نمایاں مقام حاصل ہے۔[۳۱] یہ تصنیف جدید تعلیم یافتہ افراد کو مغربی تہذیب وتمدن کے تفوق و بالادستی اور اس کی عظمت وتقدیس کے تصور سے رہائی دلانے اور ان کے قلوب واذہان میں ''حدیث وسنت'' کی اہمیت وافادیت پر ایمان و یقین کو راسخ کرنے میں بڑی مفید ثابت ہوئی ہے۔[۳۲] علامہ سید سلیمان ندوی حدیث و سنت کے بارے میں محمد اسد کے خیالات کی ستائش میں رطب اللسان ہیں جبکہ برصغیر پاک و ہند اور عالم عرب کے دو نامور مفکرین اور اسلامی بیداری کے قائدین، سید ابوالحسن علی ندوی[۳۴] اور سید قطب شہید[۳۵] اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے متعدد جرائد ورسائل میں محمد اسد کی اس تصنیف کی تلخیص وترجمہ شائع ہو چکا ہے۔[۳۶] عرب و ہند کے علمی وفکری حلقوں میں اس تصنیف کو حاصل ہونے والی مقبولیت کا اعتراف مسیحی مستشرق ولفریڈ کینٹ ویل اسمتھ نے بھی کیا ہے۔[۳۷]

ترجمہ وشرح ''صحیح البخاری''

حدیث وسنت کے سلسلہ میں محمد اسد کا دوسرا اہم علمی کام امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری کے مرتبہ مجموعہ احادیث ''الجامع الصحیح'' کے چند منتخب ابواب وکتب کا انگریزی زبان میں ترجمہ وتشریح ہے۔[۳۸] ''صحیح بخاری'' کی کتاب الوحی، کتاب الایمان، کتاب المناقب (باب فضائل اصحاب النبیؐ تا باب اسلام سلمان الفارسی) اور کتاب المغازی (باب قتل ابی رافع عبداللہ الحقیق تک) پر مشتمل یہ ترجمہ وتشریح جو پانچ اقساط میں عرفات پبلی کیشنز سری نگر و لاہور (۱۹۳۵ء-۱۹۳۸ء) اور یکجا ایک جلد میں جبرالٹر (اسپین) سے شائع (۱۹۸۱ء) ہوا ہے۔[۳۹] شروح کتب احادیث میں ایک منفرد اور امتیازی شان کا حامل ہے۔

مصنف نے قسط اول (مشتمل بر کتاب الوحی و کتاب الایمان) کے آغاز میں ایک مختصر لیکن انتہائی جامع دیباچہ بھی رقم کیا ہے۔[۴۰] اس دیباچہ میں انہوں نے اپنی ابتدائی تصنیف Islam at the Crossroads کی طرح اسلام کے نظریاتی ڈھانچے میں حدیث وسنت کے مقام کی توضیح کے ساتھ ساتھ حدیث وسنت کی صحت اور اس کی تاریخی حیثیت کے بارے میں مغربی مستشرقین کی تحقیقات اور ان کے مسلمانوں کی جدید تعلیم یافتہ نسل کے قلوب واذہان پر منفی اثرات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس دیباچہ میں خاص طور سے کتب احادیث وسنن میں ''صحیح البخاری'' کے مقام ومرتبہ، اس کے نمایاں خصائص وامتیازات اور فہم اسلام میں اس کی کلیدی حیثیت پر کلام کیا گیا ہے۔ عصر جدید میں دعوت اسلام کے حوالے سے اس عظیم الشان مجموعہ احادیث کے ترجمہ وتشریح (بزبان انگریزی) کی ضرورت واہمیت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ دیباچہ میں مذکور مصنف کے خیالات کا ملخص حسب ذیل ہے:

Marfat.com

ا۔ اسلام جو کبھی زبردست روحانی قوت اور حیات آفرین عامل تھا' آج اس کی گرفت جدید تعلیم یافتہ نسل کے دل و دماغ پر سے ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کے حاسہ دینی کے احیاء و بیداری ے لئے اسلامی تعلیمات کے تازہ فہم و ادراک اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کہ ''جن میں اسلام کی روح کا مستند ترین اظہار ہوا ہے'' سے زندہ و حقیقی تعلق از بس لازم ہے کیونکہ سنت نبوی اسلام کے حقیقی و کامل فہم کی کلید ہے۔

۲۔ یورپی مستشرقین نے احادیث کی حجیت اور تاریخی حیثیت کو پوری قوت سے چیلنج کیا ہے۔ ان مستشرقین کی تصانیف نے احادیث پر جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اعتماد کو متزلزل کر دیا ہے۔ احادیث کی صحت کی جانچ پرکھ کے بارے میں مستشرقین کا انداز تحقیق تاریخی دیانت کے اصولوں سے میل نہیں کھاتا بلکہ یہ اسلام کے بارے میں ان کے تعصب و عناد کا مظہر ہے۔ تاہم یہ امر افسوسناک ہے کہ اسلام کے نظریہ حیات میں احادیث کی انتہائی اہمیت کے باوجود مسلمان علماء کی طرف سے جدید علمی و سائنسی بنیادوں پر ان (احادیث) کے استناد کو ثابت کرنے کی کوئی مؤثر کوشش نہیں کی گئی ہے۔

۳۔ قرآن و احادیث کی گذشتہ ادوار میں کی جانے والی تشریحات آج کے دور کے لئے کافی نہیں۔ ماضی کے فقہی و کلامی مباحث اور جدلیاتی موشگافیاں عصر جدید کے مقتضیات کے مناسب حال نہیں۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ماضی کے تشریحی سرمایہ کو بیچ میں لائے بغیر نئے سرے سے احادیث کی تفہیم و تشریح کی طرف توجہ دی جائے۔

محمد اسد نے دراصل اسی علمی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ''صحیح البخاری'' کے ترجمہ و تشریح کا بیڑا اٹھایا۔ فاضل مصنف نے اپنی اس گراں قدر تصنیف میں تشریح احادیث کا جو اسلوب اختیار کیا ہے' اس کی حسب ذیل خصوصیات قابل ذکر ہیں:

ا۔ اس میں دین اسلام کی حقانیت اور پیغمبر اسلام کی نبوت و رسالت کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا جدید مغربی انسان کی نفسیات و ذہن (دین و مذہب اور ایمان و عقیدت کے بارے میں) کو پیش نظر رکھ کر احادیث کی تشریح بیان کی گئی ہے۔ انسانی عقل و فہم کی محدودیت اور اس کی کوتاہی و نقص پر کلام کرتے ہوئے وحی و الہام اور نبوت و رسالت کی حاجت کو واضح کیا گیا ہے۔ [۴۱]

۲۔ اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے کہ ''اسلام'' ہرگز کوئی نیا مذہب نہیں ہے بلکہ یہ اسی الہامی پیغام کا تسلسل و استمرار ہے جس کی تبلیغ حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام نے کی تھی۔ [۴۲]

۳۔ اس میں سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور آپ کی تعلیمات کا موازنہ گذشتہ انبیاء کی سیرتوں اور ان کی تعلیمات سے کیا گیا ہے۔ مسیحیت اور یہودیت کے مقابلے میں اسلام کو ایک کامل و جامع دین کہ جس میں روح و مادہ، دین و دنیا اور عقیدہ و عمل کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے' کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ [۴۳]

۴۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ اور آپ کی احادیث کے بارے میں مسیحی مبلغین، مغربی مستشرقین اور تجدد پسند مسلمان مصنفین نے جن غلط فہمیوں کو ہوا دی ہے، ان کے ازالے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ [۴۴]

Marfat.com

۵۔اسلام کے تصور عبادات اور جہاد و ہجرت پر ایک اچھوتے انداز میں کلام یا گیا ہے۔علاوہ ازیں مقاصد شرعیہ پر بھی بحث کی گئی ہے۔[۴۵]

۶۔اس میں روایتی کلامی مباحث' کیفیت نزول وحی، مسئلہ تقدیر، مسئلہ جبر و اختیار، ایمان اور عمل صالح، ایمان میں کمی وبیشی کا مسئلہ، عصمت رسول، معجزات، اسراء و معراج وغیرہ پر مختلف کلامی مسالک کی آراء کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے مصنف نے اپنا نقطہ نظر بیان کیا ہے۔[۴۶] مسئلہ ختم نبوت[۴۷] مسئلہ وراثت انبیاء[۴۸] پر استدلال کا ایک نیا اسلوب متعارف کرایا ہے۔

۷۔اس میں جا بجا احادیث کی اسناد پر تنقیدی نگاہ بھی ڈالی گئی ہے۔''الجامع الصحیح'' میں معلق و مرسل احادیث کی نشاندہی کی گئی۔اس سلسلہ میں بعض محدثین کی آراء پر تنقید بھی کی گئی ہے۔[۴۹]

اس کے علاوہ بعض تاریخی واقعات، تحویل قبلہ، وادالبنات کی رسم جاہلی، جنگ بدر میں امیہ بن خلف کا قتل، قبل از اسلام نجاشی کا مذہب، حضرت عائشہؓ کی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح اور رخصتی کے وقت) عمر، حضرت عمرؓ کا قبول اسلام وغیرہ کی تعبیر عام مؤرخین اور سیرت نگاروں کے اسلوب سے ہٹ کر کی گئی ہے۔مصنف نے ان واقعات کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں'[۵۰] وہ تاریخ (ایام جاہلیت وعہد اسلام) سے ان کی گہری واقفیت کی مظہر ہیں۔[۵۱]

۸۔فکر اسلامی پر یونانی وعجمی اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے اور ان کے منفی و مثبت نتائج کا جائزہ لیا گیا ہے۔قدیم اسلامی علم الکلام پر رائے زنی بھی کی گئی ہے۔[۵۲]

محمد اسد کے قلم سے ''صحیح البخاری'' کے چند منتخب ابواب وکتب کا یہ ترجمہ وتشریح درحقیقت مغربی تعلیم سے بہرہ ور مسلمان نسل کو تعلیمات نبوی کی حقیقی روح سے روشناس کرانے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اہل مغرب کے سامنے انہی کی علمی زبان اور محاورے (Diction) میں پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وتعلیمات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔حدیث وسنت کے بارے میں مستشرقین کی اڑائی ہوئی گرد وغبار کو صاف کرنا اور دین اسلام کے اس سرچشمہ صافی پر امت کے اعتماد واعتبار کو بحال کرنا تو اس کا بنیادی مقصد معلوم ہوتا ہے۔[۵۳]

حدیث وسنت کے موضوع پر محمد اسد کی اس تصنیف کو بھی علمی وفکری حلقوں میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔فاضل مصنف اور اس کی تصنیف (ترجمہ وشرح صحیح البخاری) کے بارے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جس رائے کا اظہار کیا ہے' سطور ذیل میں طوالت کے باوجود اسے نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

> ''نہایت مسرت کی بات ہے کہ ہمارے ایک جرمن (آسٹروی) نومسلم بھائی نے حدیث کی سب سے زیادہ اہم کتاب بخاری کو انگریزی میں منتقل کرنا شروع کر دیا ہے۔فاضل مترجم کے متعلق ہمارا یہ خیال ہے کہ موجودہ دور میں جتنے یورپین حضرات نے اسلام قبول کیا ہے' ان میں شاید بہت ہی کم آدمی ایسے ہوں گے جو دل ودماغ اور عملی

Marfat.com

زندگی کے لحاظ سے اس قدر مکمل مسلمان ہوئے ہوں۔ ان کی کتاب Islam at the Crossroads دیکھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ نومسلم تو درکنار جو لوگ پشتی مسلمان ہیں، ان میں بھی بہت کم ایسے ہوں گے جو اسلام کو اتنا صحیح سمجھتے ہوں اور جنہوں نے اسلام کی روح کو اتنی اچھی طرح جذب کیا ہو۔ یہ چیز محض فہم ہی کی حد تک نہیں ہے بلکہ انہوں نے حجاز میں رہ کر عربی زبان اور علوم دینیہ کی تحصیل بھی کی ہے اور اسلامی لٹریچر کا کافی مطالعہ کر چکے ہیں۔ اس بناء پر وہ ہر طرح اس کے اہل ہیں کہ بخاری جیسی مشکل کتاب کا ترجمہ اور تحشیہ انگریزی زبان میں کر سکیں۔ ترجمہ کا پہلا حصہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے جو کتاب الایمان کے خاتمہ تک جا پہنچا ہے۔ ہمارے نزدیک مترجم نے سمجھنے اور سمجھانے کا حق ادا کر دیا ہے۔ خصوصاً جہاں کہیں انہوں نے جدید ذہنیتوں کے مطابق احادیث کی مشکلات کو حل کیا ہے، وہ تو ان ہی کا حصہ ہے۔''[۵۴]

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی مذکورہ تحریر سے محمد اسد کے ترجمہ و شرح بخاری کی علمی و دعوتی قدر و قیمت کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ افسوس کہ حوادث زمانہ کے سبب اسد کا یہ علمی شاہکار ادھورا و نا تمام رہ گیا۔ بصورت دیگر یہ عالم اسلام کے جدید تعلیم یافتہ علمی حلقوں اور مغربی دنیا میں تعلیمات نبوی کی تفہیم و اشاعت کا ایک انتہائی مؤثر وسیلہ بن جاتا۔

حواشی

۱۔ دیکھئے: گیلانی، مناظر احسن: ''تدوین حدیث'' مکتبہ اسحاقیہ کراچی (س-ن)، حمید اللہ: محمد (حدیث نبوی کی تدوین و حفاظت [دیباچہ ''صحیفہ ہمام بن منبہ'']اکیڈمی آف لائف اینڈ لیٹرز، کراچی (س-ن) ص ۱۵-۵۷، وہی مصنف: ''خطبات بہاولپور'' ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء (خطبہ ۲، تاریخ حدیث شریف) ص ۴۱-۴۵، خالد علوی ''حفاظت حدیث'' الفیصل، لاہور ۱۹۹۹ء؛ Siddiqi, Muhammad Zubair: *Hadith Literature: Its Origin, Development, Special Features and Criticism.* Calcutta 1861, reprint: Cambridge 1993. Azami, M. M.: *Studies in Early Hadith Literature.* Lahore: Suhail, 2001 and *Studies in Hadith Methodology and Literature,* Lahore: Suhail Academy, 2002.

Marfat.com

۲۔ اسلامی معاشرہ و ماحول کی تشکیل وحفاظت اور امت کے روحانی و دینی تسلسل کے لئے حدیث وسنت کے کردار کے جائزہ کے لئے دیکھئے: ندوی، سید ابوالحسن علی ''حدیث کا بنیادی کردار، اسلامی مزاج و ماحول کی تشکیل وحفاظت میں'' مجلس نشریات اسلام آباد، کراچی ۱۹۸۲ء۔

۳۔ ملاحظہ کیجئے: ندوی، سید ابوالحسن علی، ''تاریخ دعوت وعزیمت'' (۶ جلدیں) مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۸۳ء۔ ۱۹۸۵ء۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، ''تجدید واحیائے دین'' اسلامک پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۴ء

۴۔ تحریک استشراق کے تاریخی پس منظر اور سیاسی وتہذیبی اغراض ومقاصد اور اسلام کے بارے میں مستشرقین کے خیالات وتصورات کے لئے ملاحظہ کیجئے:

Ahsan, M. M. "Orientalism and the Study of Islam in the West" *Muslim World Book Review* 1:4 (1981); 51-60, Said, Edward W. *Orientalism*, London. 1978. Hourani, Albert, *Islam in European Thought,* New York 1992; Khalaf, Samir. "Protestant Images of Islam: Disparagaing Stereotypes Reconfirmed", *Islam and Christian-Muslim Relations,* 8:2 (1997) 211-229; Smith, Jane I. "Christian Missionary Views of Islam in the 19th-20th Centuries", *Muslims and the West: Encounter and Dialogue,* Islamabad. (2001) 146-177; Ahmad, Waseem. "The Changing Face and Nature of Orientalism", *Hamdard Islamicus,* xxiv:4 (2001) 73-78.

ندوی، سید ابوالحسن علی: ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش''، مجلس نشریات اسلام، کراچی (۱۹۸۱ء) ۲۵۵۔۲۶۸؛ وہی مصنف: ''اسلامیات اور مغربی مستشرقین ومسلمان مصنفین'' مجلس نشریات اسلام، کراچی (۱۹۹۲ء) ۹۔۱۸؛ فاروقی، خواجہ احمد: ''مستشرقین کے تصور اسلام کا تاریخی پس منظر'' معارف (اعظم گڑھ) ۱۳۰:۵ (نومبر ۱۹۸۲ء) ۳۲۵۔۳۳۶؛ نظامی، خلیق احمد: ''مستشرقین کے افکار ونظریات کے مختلف دور در: ''عالم اسلام اور عیسائیت'' (اسلام آباد) جون ۱۹۹۴ء، ص ۵۔۱۳، جولائی ۱۹۹۴ء/ ۸۔۱۷؛ واٹ، مانٹ گمری: ''مستشرقین کا مطالعہ اسلام'' (مترجم ادارہ) در: ''عالم اسلام اور عیسائیت'' ۸،۴ (دسمبر ۱۹۹۸ء) ۲۶۔۳۷؛ السباعی، الشیخ مصطفیٰ: اسلام اور مستشرقین، (اردو ترجمہ ''المستشرقون والاسلام'') مترجمہ، سلطان شمسی ندوی، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۸۲ء؛ العقیقی، نجیب: ''المستشرقون'' (۳ مجلدات) دار المعارف، القاہرہ، ۱۹۶۴ء۔۱۹۶۵ء؛ زکریا، ہاشم زکریا، ''المستشرقون والاسلام'' لجنۃ التعریف بالاسلام، القاہرہ ۱۹۶۵ء الدسوقی، محمد ''الاسلام والمستشرقون'' القاہرہ، ۱۹۷۲ء؛ محمد البہی: ''المستشرقون'' القاہرہ ۱۹۶۴ء؛ شلبی، عبدالجلیل، ''الاسلام والمستشرقون'' القاہرہ ۱۹۷۷ء؛ صبرہ، دکتور عفاف:

Marfat.com

''المستشر قون ومشکلات الحضارہ'' دارالنہضۃ العربیہ،القاہرہ ۱۹۸۰ء۔

۵۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے بارے میں مستشرقین کے خیالات وتصانیف کے مطالعہ کے لئے ملاحظہ کیجئے:

Stubbe, Henry: "The Character of Mahomet and Fabulous Inventions of the Christians Concerning Him and His Character", *Islamic Literature,* IX: 8, 9 (Aug.-Sep. 1957) 105-115; Guenther, Alan M. "The Image of the Prophet as Found in Missionary Writings of the Late Nineteenth Century", *The Muslim World,* 90:1, 2(2000) 43-70; Rodinson, Maxime. "A Critical Survey of Modern Studies on Muhammad", *Studies on Islam,* Trans. and Ed. Merlin L. Swartz, New York, Oxford (1981) 23-85; Buaben, Jabal Muhammad. *Image of the Prophet Muhammad in the West: A Study of Muir, Margoliouth and Watt,* Leicester. The Islamic Foundation, 1996.

اس موضوع پر اردو اور عربی میں کتب ومقالات کے لئے دیکھئے۔محمد ریاض ''مستشرقین کی کتب سیرۃ رسول'' فکر ونظر (اسلام آباد) ۳۰:۲ (جولائی۔دسمبر ۱۹۹۲ء) ۳۱۷۔۳۵۲؛ نثار احمد ''مستشرقین اور مطالعہ سیرت'' نقوش،رسول نمبر (ج ۱۱) ۴۸۲۔۵۶۰؛ خلیل،عماد الدین، ''المستشر قون والسیرۃ النبویۃ'' البعث الاسلامی (لکھنؤ) ۲۶:۱،۲ (رمضان و شوال ۱۴۰۲ھ) ص ۱۱۲۔۱۴۱؛ انور الجندی: ''تقییم جدید الکتاب الغربیین للسیرۃ النبویۃ وتحولات جدیدۃ بعد مرحلۃ من الحلو والتعصب'' البعث الاسلامی، ۸:۳۰ (جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ) ۲۵، ۳۰/۳۷: ۹ (جمادی الثانیہ ۱۴۰۶ھ) ۲۵:۳۰/۳۷:۹ (جمادی الثانیہ ۱۴۰۶ھ) ۶۴۔۷۷۔ مستشرقین کی کتب سیرت کے تنقیدی مطالعہ کے لئے دیکھئے:

Qureshi, Zafar Ali. *Prophet Muhammad and His Western Critics.* 2 Vols. Lahore, Idara Ma'arif Islami, 1992.

۶۔ حدیث وسنت کی تاریخی حیثیت اور اس کی حجیت کے بارے میں مستشرقین میں سے سب سے زیادہ تنقید ولیم میور (۱۸۰۹ء-۱۹۰۵ء) اسپرنگر (م۔۱۸۹۳ء)، گولڈزیہر (۱۸۵۹ء-۱۹۲۱ء) اور جوزف شاخت (۱۹۰۲ء-۱۹۶۹ء) کی طرف سے ہوئی ہے۔دیکھئے:

Sprenger, Alois. "On the Origin of Writing Down Historical Records among the Musulmans" *Journal of the Asiatic Society of Bengal,* 25 (1856) 303-329; Muir, Sir William. *Mahomet and Islam,* London, 1898

Marfat.com

and *The Life of Mohammad,* New York (1975) 29-76; Goldziher, Ignaz. *Introduction to Islamic Theology and Law.* Trans. Andras and Ruth Hamori. Princeton (1981) 37-47, 230-245 and *Muslim Studies,* 2 vols. Trans. S. M. Stern, London. 1967; Schacht, Joseph. *Introduction to Islamic Law.* Oxford, 1964 and *The Origins of Muhammadan Jurisprudence,* Oxford 1950, repr. 1964; Berg, Herbert. *The Development of Exegesis in Early Islam: The Authenticity of Muslim Literature From the Formative Period,* Surrey, 2000 (Ch. 2, Hadith Criticism pp. 12-61); Coulson, Noel. "European Criticism of Hadith Literature", *Arabic Literature to the End of the Umayyad Period,* ed. A.F.L. Beeston, *et. al.* Cambridge (1983) 271-288.

عربی و اردو مقالات کے لئے دیکھئے الندوی، محمد صدر الحسن ''المستشرقون والسنۃ النبویۃ'' در ''البعث الاسلامی'' ۲۸: ۷ (ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ) ص ۴۳۔۵۲۔ الندوی، تقی الدین: ''السنۃ مع المستشرقین والمستشرین در ''البعث الاسلامی'' ۲۷: ۱، ۲ (رمضان، شوال ۱۴۰۲ھ) ۱۶۴۔۱۸۲؛

حدیث و سنت کے بارے میں اگناتس گولڈزتسیہر اور جوزف شاخت کے خیالات کے تنقیدی جائزہ کے لئے دیکھئے۔ الاعظمی، محمد مصطفیٰ ''شاخت اور حدیث نبویؐ''، معارف (اعظم گڑھ) ۱۳۸: ۵ (نومبر ۱۹۸۶ء) ۳۲۵۔۳۴۸/۱۳۹: ۱ (جنوری ۱۹۸۷ء) ۸۵۔۹۶۔؛ السباعی، الشیخ مصطفیٰ، ''السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی''، المکتب الاسلامی، بیروت (۱۹۸۵ء) ص ۱۸۷۔۲۳۵۔ مزید دیکھئے:

Azami, M.M. *Studies in Early Hadith Literature,* Lahore 2001; Ansari, Zafar Ishaq. "A Critique of Joseph Schacht's Argument. E. Silentio", *Essays on Islam,* Vol. 1. Ed. Hakeem Muhammad Said. Karachi (1992) 244-255.

۷۔ حدیث و سنت کے بارے میں سرسید احمد خاں اور مولوی چراغ علی کے نقطہ نظر کے لئے ملاحظہ کیجئے:
عبداللہ، سید ''سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ'' مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، (۱۹۹۴ء) ۲۰۔۳۳، ۶۸۔۷۲؛ اکرام، شیخ محمد: ''موج کوثر'' ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور (۱۹۹۷ء) ۱۵۶۔۱۶۸؛ عزیز احمد ''برصغیر میں اسلامی حدیث'' (مترجم جمیل جالبی) ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور (۱۹۹۷ء) ۷۵۔۸۵، ۹۶۔۱۰۳ مزید دیکھئے:

Marfat.com

Rahman, A. N.M. Wahidur-. "Modernist Muslims' Approach to Hadith: Aligarh School", *Hamdard Islamicus*, xvi:4, 13-26, and "Modernists' Approach to the Qur'an: Sir Sayyid Ahmad Khan and Moulvi Chiragh Ali", *Islam and the Modern Age*, xxii:2 (1991) 91-114; Baljon, J.M.S. *The Reforms and Religious Ideas of Sir Sayyid Ahmad Khan*, Lahore, (1970) 70-104, 132-143; May, L.S. *The Evolution of Indo-Muslim Thought After 1857*, Lahore (1970) 37-89; Haq, S. Moinul, *Islamic Thought and Movements*, Karachi (1979) 456-492; Smith, Wilfred Cantwell. *Modern Islam in India*, Lahore (1969) 6-24.

۸۔ محمد عبدہ کے مذہبی و اصلاحی افکار و خیالات کے لئے دیکھئے:

Adams, C.C. *Islam and Modernism in Egypt*. London (1933) 104-175; Hourani, Albert. *Arabic Thought in the Liberal Age 1798-1939*, London, New York, (1970) 130-160.

۹۔ تفصیلی مطالعہ کے لئے دیکھئے: بلخی، افتخار احمد ''فتنہ انکار حدیث کا منظر و پس منظر'' (۳ جلدیں) مکتبہ چراغ راہ کراچی (۱۹۵۵ء-۱۹۶۰ء)، خالد رندھاوا ''برصغیر میں انکار حدیث کا لٹریچر'' در: محدث، لاہور ۳۴: ۹،۸ (اگست، ستمبر ۲۰۰۲ء) ۲۲۱-۲۳۷، عبدالحمید، بمیر: ''فتنہ انکار السنۃ فی شبہ القارہ الہندیۃ الباکستانیۃ'' مکتبہ دارالاسلام لاہور ۲۰۰۲ء

Abdul Latif, Sayyid "Towards Re-Orientation of Islamic Thought", An [اس مقالہ کے ذیلی عنوان] - *The Islamic Review*, XLII: 1 (Jan. 1955) 6-12 Examination of the Views of the Group that Reject The Hadith as Apocryphal کے تحت حدیث و سنت کے بارے میں برصغیر پاک و ہند، عرب ممالک اور ترکی کے متجددین کے نقطہ نظر کا جائزہ پیش کیا گیا ہے]

Adams, Charles J. "The Authenticity of Prophetic Hadith in the Eyes of Some Modern Muslims", *Essays on Islamic Civilization Presented to Niyazi Berkes*, ed. Donald P. Little, Leiden, (1976) 25-47; Juynboll, G.H.A. *The Authenticity of the Tradition Literature: Discussions in Modern Egypt*, Leiden, (1969); Brown, Daniel. *Rethinking Tradition in Modern Islamic Thought*, New York (1999).

Marfat.com

۱۰۔ ان حامیان حدیث وسنت میں سے الشیخ مصطفیٰ السباعی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، محمد حمید اللہ اور محمد مصطفیٰ الاعظمی کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر نے اپنی تصنیف ''السنۃ ومکانتہا فی التشریع اسلامی'' میں گولڈزتسیہر اور احمد امین کے خیالات کا مفصل طور سے تنقیدی جائزہ (ص ۲۳۶۔۲۷۴) لیا ہے۔ یہ تصنیف علمی وفکری حلقوں سے داد تحسین وصول کر چکی ہے۔ [دیکھئے سید ابوالحسن علی ندوی ''حدیث کا بنیادی کردار'' (پیش لفظ) ص ۵، وہی مصنف ''اسلامیات اور مغربی مستشرقین ومسلمان مصنفین'' کراچی (۱۹۹۲ء) ص ۶۵] سید ابوالاعلیٰ کی علمی وتصنیفی سرگرمیوں کا ایک اہم موضوع نبوت ورسالت اور حدیث وسنت کے بارے میں جدید ذہن کے شبہات کا ازالہ رہا ہے۔ سید مودودی سالہا سال تک منکرین حجیت حدیث [غلام احمد پرویز، نیاز فتح پوری وغیرہ] کے خلاف برسر پیکار رہے۔ ان کی اہم تحریروں ''سنت کی آئینی حیثیت'' ترجمان القرآن منصب رسالت نمبر ۵۶:۶ (ستمبر ۱۹۶۱ء) ۹۔۲۳۵ کے علاوہ تفہیم القرآن میں بھی اس موضوع پر شاندار بحثیں ملتی ہیں] دیکھئے اشاریہ تفہیم القرآن، مرتبہ خالد علوی وجمیلہ شوکت، ادارہ ترجمان القرآن لاہور (۱۹۹۳ء) مزید دیکھئے:

Ahsan, M. M. "Mawlana Mawdudi's Defence of Sunnah", *Arabia*, 26 (October 1983) 44-46.

محمد حمید اللہ اور محمد مصطفیٰ الاعظمی نے حدیث وسنت کی تاریخی حیثیت کو مستحکم دلائل کی روشنی میں ثابت کیا ہے۔

۱۱۔ محمد اسد (Leopold Weiss) نے پولینڈ کے شہر Lvóv جو کہ اس وقت سلطنت آسٹریا کا حصہ تھا کے ایک یہودی ربی خاندان میں (۱۹۰۰ء) میں آنکھ کھولی۔ خاندانی روایت کے مطابق یہودی علماء سے مقدس مذہبی کتب کی تعلیم حاصل کی۔ ویانا یونیورسٹی سے ادب، فلسفہ اور تاریخ کی تعلیم کے بعد وہ مشہور جرمن اخبار (Frankfurter Zeitung) کے مراسلہ نگار کے بطور مشرق وسطی چلے (۱۹۲۲ء) آئے۔ عربی واسلامی تہذیب وثقافت اور معاشرت کے مشاہدہ اور اسلام کے عمیق مطالعہ کے حلقہ بگوش اسلام (۱۹۲۶ء) ہوئے۔ قبول اسلام کے بعد کئی سال (۱۹۲۶۔۱۹۳۲ء) سرزمین حجاز میں مقیم رہے۔ اس دوران انہوں نے عربی زبان وادب پر دسترس کے علاوہ علوم اسلامیہ میں درک حاصل کیا۔ مسجد نبوی میں درس حدیث سے استفادہ کیا۔ اسد، امام سید احمد سنوی (لیبیا میں اطالوی استعمار کے خلاف مزاحمت کے قائد اور شمالی افریقہ کے مشہور صوفی سلسلہ ''السنوسیۃ'' کے پیشوا) اور مشہور نجدی عالم قاضی القضاۃ عبداللہ بلیہد کی صحبتوں سے بھی فیض یاب ہوئے۔ سلطان عبدالعزیز ابن سعود (م ۱۹۵۳ء) کے معتمد ومقرب خاص رہے۔ ۱۹۳۲ء میں برصغیر پاک وہند چلے آئے جہاں ان کے حکیم الامت محمد اقبال اور سید ابوالاعلیٰ مودودی سے قریبی روابط استوار ہو گئے تھے۔ اس نے عرفان پبلی کیشنز کے نام سے اپنا ذاتی مطبع (سری نگر ۱۹۳۵ء لاہور ۱۹۳۶۔۱۹۳۹ء) بھی قائم کیا، جہاں سے انہوں نے بخاری شریف کے ترجمہ وشرح (بزبان انگریزی) کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ محمد مارماڈیوک پکتھال کے انتقال کے بعد مجلہ ''اسلامک کلچر'' (حیدر آباد دکن) کے مدیر (۱۹۳۶-۱۹۳۸ء) بھی رہے۔ بعد ازاں انہوں نے Arafat: A Monthly Critique of

Marfat.com

Muslim Thought کے نام سے اپنا انگریزی مجلہ جاری (۱۹۴۶ء) کیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ حکومت پنجاب کے قائم کردہ Department of Islamic Reconstruction کے ناظم کے منصب پر فائز (۱۹۴۷ء۔۱۹۴۹ء) ہوئے۔ موصوف نے وزارت خارجہ میں مشرق وسطیٰ ڈویژن کے ناظم اعلیٰ (۱۹۴۹ء۔۱۹۵۲ء) کے طور پر مشرق وسطیٰ کے ساتھ پاکستان کے سیاسی وسفارتی روابط کے قیام میں سرگرم کردار ادا کرنے کے علاوہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے Minister Plenipotentiary کے طور پر بھی خدمات انجام (۱۹۵۲ء۔۱۹۵۳ء) دیں۔

اسد عرصہ چالیس سال تک مغرب میں اسلام کے ایک پُر جوش اور صادق ومخلص سفیر کے طور پر سرگرم عمل رہنے کے بعد فروری ۱۹۹۲ء میں اس جہان فانی سے اپنے رب کے حضور پہنچ گئے۔ عصر جدید میں احیائے اسلام، اسلامی اصول واقدار کی اساس پر اسلامی معاشرہ اور ریاست کی تشکیل نو، ان کی علمی وفکری سرگرمیوں کا بنیادی موضوع ہے۔ اسلامی فقہ وقانون، اسلام میں ریاست وحکومت کے بنیادی اصول' مغربی تہذیب وتمدن کی تنقید وتردید، ترجمہ وتفسیر قرآن اور امام بخاری کی ''الجامع الصحیح '' کے بعض ابواب کا انگریزی ترجمہ وتشریح جیسے متنوع موضوعات پر انہوں نے گراں قدر تصانیف (جو مغرب میں ''اسلام'' کے تعارف کا ایک انتہائی مؤثر وسیلہ بن گئی ہیں) یادگار چھوڑی ہیں۔

حالات زندگی، علمی وتصنیفی سرگرمیوں اور افکار وخیالات کے تجزیاتی مطالعہ کے لئے دیکھئے:

Asad, Muhammad. *The Road to Mecca,* London: Max Reinhardt. 1954, 4th rev. edn. Gibraltar: Dar al-Andalus, 1993; Ruthven, Malise. "Muhammad Asad: Ambassador of Islam", *Arabia: the Islamic World Review,* No. 1 (September 1981) 59-62; Nawwab, Ismail Ibrahim. "A Matter of Love: Muhammad Asad and Islam", *Islamic Studies,* 39:2 (2000) 155-232. Hofmann, Murad. "Muhammad Asad: Europe's Gift to Islam", *Islamic Studies.* 39:2 (2000) 233-248; Zillur Rahim, Hasan "Muhammad Asad: Scholar and Visionary", *Iqra* (April 1998) 25-27; Azam, K.M. "Unforgetable Pakistani", *The News International* (July 1, 2000) 6; Iqbal, Mazaffar "A Forgotten Pakistani", *The News* (June 23, 2000): 6.

ندوی' سید ابوالحسن علی ''المفکر الاسلامی المعتدی البارز محمد اسد در: ''البعث الاسلامی'' ۳۷:۴ (ذوالحجہ ۱۴۱۲ھ) ۹۳۔۹۶۔ وہی مصنف ''اسلامیات اور مغربی مستشرقین ومسلمان مصنفین'' ص ۳۶۔۳۸۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ ''دارالاسلام'' مرتبہ اختر حجازی، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور (۱۹۹۵ء) ۳۶۔۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۷۲۔۷۳،

Marfat.com

۷۷-۷۹۔ثروت صولت ''علامہ محمد اسد مرحوم'' در:ماہنامہ''نوائے اسلام'' (دہلی)، (جولائی ۱۹۹۲ء) ۳۰-۳۶۔ حیدر، خواجہ رضی ''قائد اعظم خطوط کے آئینہ میں'' نفیس اکیڈمی، کراچی (۱۹۸۵ء) ص ۴۲۹-۴۳۱۔خان' ایچ بی ''شاہراہ مکہ'' نوری پبلی کیشنز کراچی (۱۹۷۶ء) باب چہارم (محمد اسد کے حالات) ص ۱۰۲-۱۴۹۔اختر' محمد کلیم' علامہ محمد اسد اور علامہ محمد اقبال' در ''اقبال اور مشاہیر کشمیر'' اقبال اکادمی لاہور ۱۹۹۷ء ص ۱۰۳-۱۱۳۔سعید احمد: ''اسلامیہ کالج، لاہور کی صد سالہ تاریخ'' ادارہ تحقیقات پاکستان (جامعہ پنجاب) لاہور (۲۰۰۱ء)، ۲۴۰-۲۴۲۔

۱۲۔ یہ کتاب پہلی بار قرول باغ، دہلی سے شائع (۱۹۳۴ء) ہوئی۔اب تک اس کے درجنوں ایڈیشن نکل چکے ہیں۔متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی طبع ہو چکا ہے۔ڈاکٹر عمر فروخ کے قلم سے اس کا عربی ترجمہ ''الاسلام علی متفرق الطرق'' کے نام سے دار القلم للملایین، بیروت سے متعدد بار طبع (بار سوم ۱۹۵۱ء) ہو چکا ہے۔اردو میں بھی اس کے متعدد تراجم ہو چکے ہیں۔ایک ترجمہ دعوۃ اکیڈمی، اسلام آباد سے' دوسرا طاہر منصور فاروقی کے قلم سے آگہی پبلشرز لاہور (۲۰۰۰ء) سے شائع ہو چکا ہے۔

۱۳۔ مصنف نے حدیث و سنت پر اظہار خیال اس کتاب کی دو فصلوں Hadith and Sunnah اور The Spirit of the Sunnah (شیخ محمد اشرف' لاہور ۱۹۸۵ء) ۱۱۲-۱۴۹ میں کیا ہے۔

۱۴۔ Islam at the Crossroads (شیخ محمد اشرف' لاہور ۱۹۷۵ء) ص ۱۱۳۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۱۲-۱۱۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۲۹-۱۳۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۰۸-۱۰۹

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۱۸-۱۱۹

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۳۱-۱۳۲

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۳۵

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۲۲-۱۲۳

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۱۹-۱۲۱

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۳۷-۱۳۸

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۴۷-۱۴۸

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۴۸-۱۴۹

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۳۹-۱۴۷

Marfat.com

۲۹۔ ایضاً،ص ۱۳۵۔۱۳۶

۳۰۔ پروفیسر خورشید احمد رقم طراز ہیں "بلا شبہ زیر مطالعہ دور [۱۹۱۴ء۔۱۹۷۲ء] میں کم از کم [انگریزی زبان میں] دو کتابیں ایسی شائع ہوئی ہیں جنہیں [اسلام کی] فکری تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ یعنی امیر علی کی "روح اسلام" اور علامہ اقبال کی "اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید" [The Reconstruction of Religious Thought in Islam] اسی سلسلہ میں محمد اسد کی Islam at the Crossroads کا شمار بھی ہوسکتا ہے۔ دیکھئے "دینی ادب (بیسویں صدی)" در: "تاریخ ادبیات مسلمان پاک و ہند" مدیر خصوصی سید فیاض محمود، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، اردو ادب، ج ۵ ص ۲۶۲۔

۳۱۔ Pickthall, M.M.: "The Need of the Sunnah (Review of the "Islam at the Crossroads") *Islamic Culture,* (Oct. 1934). 665-668

۳۲۔ اس ضمن میں مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر خورشید احمد اور نومسلم خاتون دانشور مریم جمیلہ کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ دیکھئے:

Jameela, Maryam. "Review of the *Islam at the Crossroads*" *Muslim World Book Review,* 5:2 (1985) 39-41; Nasr, S.V.R. "Islamist Intellectuals of South Asia: The Origins and Development of a Tradition of Discourse", *Studies in Contemporary Islam* 1:2 (1999) 23-37; Esposito, John L. and Voll, John O. "Khurshid Ahmad Muslim Activist-Economist", *Islamic Resurgence. Challenges, Directions and Future Perspectives,* ed. Ibrahim M. Abu Rabi, Islamabad (1995) 35-36; Esposito, John L. and Voll John O. eds. *Makers of Contemporary Islam,* New York (1997) 41-56, 59.

دریابادی، عبدالماجد "خط بنام سید ابوالحسن علی ندوی" در "پرانے چراغ" از ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی (س۔ن) ج ۲، ص ۱۵۷۔

۳۳۔ سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں "ہم کو اپنے نومسلم بھائیوں میں سے سب سے زیادہ جس کی شخصیت نے متاثر کیا ہے وہ آسٹریا کے ایک گمنام نومسلم لیوپولڈ ویس معروف بہ "محمد اسد" ہیں۔ موصوف نے اپنی ایک مختصر لیکن جامع کتاب Islam at the Crossroads بزبان انگریزی شائع کی ہے۔ اس میں موجودہ حالات و خیالات کے پیش نظر اسلام کی تعلیم کو بطور طریق نجات پیش کیا ہے۔ بعض مسلمانوں میں اس وقت یورپین تجدد اور "احادیث و سنن نبویہ" سے روگردانی کی بدعتوں کو "اصلاح" کے نام سے پیش کرنے کی جو افراط و تفریط پیدا ہو رہی ہے۔ اس کی غلطیاں نہایت

Marfat.com

صحت اور نکتہ سنجی کے ساتھ ظاہر کی ہیں" دیکھئے "شذرات"، معارف (اعظم گڑھ) ۳۴:۴ (اکتوبر ۱۹۳۴ء) ۲۴۲-۲۴۳۔

۳۴۔ سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی متعدد تحریروں میں مغربی تہذیب وتمدن کی تنقید اور حجیت حدیث وسنت کے اثبات میں محمد اسد کے افکار وخیالات سے گہرا تاثر لینے کا برملا طور پر اعتراف کیا ہے۔ دیکھئے سید ابوالحسن علی ندوی "کاروان زندگی" مجلس نشریات اسلام کراچی (س-ن) حصہ اول، ص ۲۳۱۔ "میری علمی ومطالعاتی زندگی" در "مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حیات وافکار کے چند پہلو" مرتبہ سفیر اختر، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد (۲۰۰۲ء) ص ۳۹۔ سید ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں:

"ان [محمد اسد] کی کتاب Islam at the Crossroads (اسلام دوراہہ پر) نے نہ صرف ایشیا بلکہ پورے عالم اسلام میں مسلمانوں کے نئے تعلیم یافتہ اور صاحب فکر طبقہ میں اپنے دین وتہذیب کی طرف سے خود اعتمادی اور یقین کی روح پھونک دی۔ ایک طویل زمانہ سے عالم اسلام میں سنت نبوی اور اسلامی تہذیب وخود اعتمادی اور یقین کی روح پھونک دی۔ ایک طویل زمانہ سے عالم اسلام میں سنت نبوی اور اسلامی تہذیب وتمدن کا علمی وفکری طور پر اس طرح دفاع نہیں کیا گیا جیسا کہ اس کتاب میں (اسلامیات اور مغربی مستشرقین ومسلمان مصنفین، ص ۳۶-۳۷)۔ سید صاحب مزید فرماتے ہیں "محمد اسد نے Islam at the Crossroads کے نام سے ایک ایسی پُرمغز اور فاضلانہ کتاب لکھی جس سے ہندوستان اور عالم اسلامی کے علمی ودینی حلقوں میں ایک ذہنی جنبش پیدا ہوگئی۔ انہوں نے پہلی مرتبہ معذرت آمیز اور نیازمندانہ طرز تحریر چھوڑ کر مغربی تہذیب پر پُراعتماد طریقہ پر بھرپور تنقید کی۔ اسی کے ساتھ انہوں نے "سنت وحدیث" کی طرف سے طاقتور وکالت کی اور اسلامی نظام زندگی میں ان کی اہمیت اور ضرورت ثابت کی" (سید ابوالحسن علی ندوی "پیش لفظ وتعارف" "طوفان سے ساحل تک" از محمد اسد [اردو ترجمہ The Road to Mecca] مترجم محمد الحسنی ندوی، مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۹۷ء ص ۳۰۔ سید ابوالحسن علی ندوی کی مختصر تصنیف "حدیث وسنت کا بنیادی کردار اسلامی مزاج وماحول کی تشکیل وحفاظت میں" پر اسد کے خیالات وآراء کی چھاپ نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔

۳۵۔ سید قطب شہید کی تصنیف "العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام" [داراحیاء کتب العربیہ القاہرہ، (الطبعۃ الرابعۃ ۱۹۵۴ء)] کا باب ہشتم، حاضر الاسلام ومستقبلہ (ص ۲۲۵-۲۵۲) واضح طور پر محمد اسد کے خیالات کی بازگشت معلوم ہوتا ہے۔

۳۶۔ پہلی بار اس کی تلخیص محمد عزیر کے قلم سے "اسلام اور تعیین راہ کی کشمکش" کے عنوان سے ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) ۳۴:۵ (دسمبر ۱۹۳۴ء) ۴۵۵-۴۲۶ میں جبکہ دوسری بار عبدالعزیز خالد کے قلم سے قسط وار روزنامہ "نوائے وقت" لاہور ۱۲۰ کتوبر ۲۰۰۰ء؛ ۳، ۲۴ نومبر ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی۔ حدیث وسنت سے متعلق مباحث کا ترجمہ محمد معین خان کے قلم سے "اسلامی معاشرہ میں سنت کی اہمیت" اور "مسلمانوں کی ثقافتی پستی" کے عنوانات سے ماہنامہ "بینات" کراچی ۳:۱ (دسمبر ۱۹۶۳ء) ۵۱-۶۰، ۳:۲ (جنوری ۱۹۶۴ء) ۹۵-۱۰۱ اور "الاعتصام" لاہور حجیت حدیث نمبر (۱۷ فروری ۱۹۵۶ء)

Marfat.com

۲۷-۳۰ میں (روح سنت، مترجم محمد حنیف ندوی) شائع ہو چکا ہے۔

۳۷۔ Smith, Wilfred Cantwell. *Islam in Modern History,* Princeton (1957) pp. 4-5; and *Modern Islam in India,* pp.91, 163-164

۳۸۔ مصنف نے ''صحیح البخاری'' کے مکمل ترجمہ وتشریحی حواشی کی آٹھ جلدوں (چالیس اقساط) میں اشاعت کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کے علاوہ ایک مبسوط مقدمہ (جس میں وہ تاریخ تدوین حدیث، حدیث کے درایتی اصول اور امام بخاری کی ''الجامع الصحیح'' کے خصائص وامتیازات پر کلام کرنا چاہتے تھے) بھی سپرد قلم کرنا چاہتے تھے۔ موصوف نے ترجمہ وتشریح کا تین چوتھائی کام مکمل کر لیا تھا جبکہ ''مقدمہ'' کے لیے لوازمہ بھی فراہم کر لیا تھا۔ تاہم ابھی وہ ترجمہ وتشریح کی پانچ اقساط ہی شائع کر پائے تھے کہ جنگ عظیم دوم کے آغاز پر انہیں برطانوی حکام نے گرفتار کر لیا۔ طویل عرصہ نظر بندی (۱۹۳۹ء-۱۹۴۵ء) کے سبب ان کی علمی وتصنیفی سرگرمیاں معطل رہیں۔ رہائی کے بعد وہ ترجمہ وتشریح کی اشاعت کے سلسلہ کو دوبارہ جاری نہ کر سکے۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پنجاب سے ہجرت کے دوران ان کا ذاتی کتب خانہ اور ترجمہ اور تشریح بخاری کا مسودہ ضائع ہو گیا۔ دیکھیے Muhammad Asad: *Preface: Sahih al-Bukhari,* Gibraltar (1981).

۳۹۔ مصنف نے ترجمہ وتشریح میں وانستہ طور پر امام بخاری کی ترتیب ابواب وکتب کو پیش نظر نہیں رکھا ہے بلکہ کتاب الوحی وکتاب الایمان کے فوراً بعد کتاب المناقب اور کتاب المغازی لے آئے ہیں۔ اس سے ان کا مقصود ماقبل اسلام عربوں کی مذہبی وتہذیبی وسماجی زندگی، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور اس کے نتیجے میں اسلامی معاشرے کا ارتقاء اور فرضیت احکام میں تدریج کے پہلو کو اجاگر کرنا ہے۔

۴۰۔ Muhammad Asad. *Preface to Sahih al-Bukhari,* Srinagar, Arafat Publications, 1935.

۴۱۔ *Sahih Al-Bukhari, Gibraltar.* 1981, p.15

۴۲۔ ایضاً، ص ۳۸، ۱۸۷

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۸، ۱۹، ۲۶، ۳۹، ۴۰، ۵۸، ۸۰، ۹۲، ۱۴۹، ۱۵۰

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۹۸، ۲۰۰، ۳۱۶-۳۱۷

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۶، ۳۹، ۴۰، ۷۹، ۱۹۲، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۶۳

۴۶۔ کلامی مسائل کے لئے دیکھیے ایضاً، ص ۱۶، ۱۷، ۳۵-۳۶، ۴۷، ۴۵، ۶۲-۶۳، ۶۷، ۷۸، ۱۸۲-۱۸۳، ۱۸۷-۱۹۱

۴۷۔ ایضاً، ص ۷۸۱

۴۸۔ ایضاً، ص ۳۱۲-۳۱۵

۴۹۔ ایضاً، ص ۵۸، ۶۱، ۱۳۲، ۱۳۶، ۱۷۲-۱۷۳، ۲۲۳، ۲۶۳

Marfat.com

۵۰۔ ایضاً،ص ۶۰، ۱۴۵، ۱۶۰، ۱۶۸، ۱۷۲

۵۱۔ ایضاً،ص ۳۶، ۵۸، ۱۸۲، ۱۸۳

۵۲۔ دیکھئے Preface to Sahih Al-Bukhari و بمواقع عدیدہ۔

۵۳۔ S.H. "Review of the Sahih Al-Bukhari", *Islamic Culture* (Oct. 1936) 671-672; Hofmann, Murad. "Muhammad Asad: Europe's Gift to Islam", *Islamic Studies* 39:2 (2000) 39; Jameela, Maryam. "Review of Sahih Al-Bukhari: The Early Years of Islam", *Muslim World Book Review,* 3:3 (1983) 3-4.

۵۴۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی' 'انگریزی ترجمہ صحیح البخاری مع شرح (از جناب محمد اسد صاحب)'' در ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' ۴/۱۰: (ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ) ۳۱۷-۳۱۸۔ سید مودودی، چودھری نیاز علی خان مرحوم کے نام ایک خط (۱۹ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ) میں رقمطراز ہیں'' جناب محمد اسد صاحب سے حیدرآباد میں ایک مرتبہ مل چکا ہوں۔ ان کی کتاب Islam at the Crossroads اور ترجمہ صحیح بخاری دونوں میری نظر سے گزری ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ دور جدید میں اسلام کو جتنے غنائم یورپ سے ملے ہیں' ان میں یہ سب سے قیمتی ہیرا ہے۔ اسلام کی اسپرٹ اس میں پوری طرح حلول کر گئی ہے اور اسلام کو اس نے ان علماء سے زیادہ اچھی طرح سمجھا ہے جو پچاس پچاس برس سے درس و تدریس میں مشغول ہیں۔'' سید ابوالاعلیٰ مودودی، خطوط الاسلام'، مرتب اختر حجازی، ادارہ ترجمان القرآن لاہور ۱۹۹۵ء، ص ۳۸۔ مزید دیکھئے: رفیع الدین ہاشمی' 'خطوط مودودی' 'منشورات (منصورہ) لاہور ۱۹۹۵ء ص ۵۶۔

(در: فکر و نظر (اسلام آباد)، جلد ۴۲-۴۳، شمارہ ۴، (۲۰۰۵ء)، ص ۳۲۹-۳۴۹)

Marfat.com

کلیم اختر

علامہ محمد اسد اور علامہ محمد اقبال

بین الاقوامی شہرت کے حامل اسلامی مفکر اور مصنف علامہ محمد اسد ۲۳ فروری ۱۹۹۲ء کو سپین کے شہر ماربیا میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے--انا للہ وانا علیہ راجعون۔

راقم نے علامہ محمد اسد کا اسم گرامی (جن کا سابقہ نام لیو پولڈ ویس Leopold Weiss تھا) بچپن میں اپنے والد ماجد میاں غلام علی مرحوم اور ان کے دوست ڈاکٹر نور حسین مرحوم سے سنا تھا۔ یہ دونوں بزرگ علامہ محمد اسد سے ان دنوں آشنا ہوئے تھے' جب برطانوی ہند کی حکومت نے جنگ عالمگیر کے دوران علامہ مرحوم کو نظر بند کر دیا تھا اور انہوں نے نظر بندی کے وہ دن سرینگر کے محلہ نگر مل باغ کی ایک کوٹھی میں گزارے تھے اور سردار وزیر محمد خان ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس' جوان دنوں ایس پی سرینگر تھے' ان کی نگرانی پر مامور تھے--والد مرحوم اور ڈاکٹر نور حسین مرحوم کے سردار وزیر محمد خان گہرے دوست تھے اور تینوں ادبی وعلمی ذوق وشوق رکھتے تھے اور یہی ادب نوازی ان تینوں کی قدر مشترک تھی۔ (کشمیر میں اردو)۔

ترک وطن کے بعد جب ہم لوگ سرینگر سے سیالکوٹ پناہ گزین ہوئے تو وہاں پر بھی ہمارے بزرگ علامہ محمد اسد کا ذکر جمیل بالالتزام کرتے اور جب The Road to Mecca چھپ کر آئی تو یہ کتاب فوری طور پر خریدی گئی اور اسے بڑی محبت وخلوص سے پڑھا گیا اور یہ حقیقت ہے کہ دنیائے اسلام کے علاوہ مغربی دنیا میں بھی اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوئی۔ ۱۹۶۰ء میں جب سابق وفاقی وزیر اور اٹارنی جنرل چوہدری نذیر احمد خان مرحوم نے "محبان عالم اسلام" (الاحباء) تنظیم قائم کی اور اسلامی ممالک کی دولت مشترکہ کا تصور پیش کیا تو چوہدری صاحب مرحوم نے جن مفکرین اسلام سے رابطہ قائم کیا' ان میں علامہ محمد اسد سرفہرست تھے۔ چوہدری صاحب مرحوم کے علامہ محمد اسد سے دیرینہ تعلقات تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ علامہ محمد اسد ان کے مشن" کامن ویلتھ آف مسلم سٹیٹس" میں مدومعاون ثابت ہو سکتے ہیں' کیونکہ ان کے تعلقات کئی اسلامی ملکوں کے سربراہان سے تھے--راقم کو "الاحباء" کی تنظیم کا بانی سیکرٹری جنرل ہونے کا شرف حاصل ہے اور آج تک اس جماعت سے بالحمد تعلق قائم ہے۔ اس تنظیم کے موجودہ صدر جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ سابق چیف جسٹس آف پاکستان ہیں۔ علامہ محمد اسد نے الاحباء کی اتحاد عالم اسلامی کی

Marfat.com

کوششوں کو سراہا تھا اور لاہور میں چوہدری نذیر احمد خان کے مہمان بنے تھے۔ علامہ محمد اسد کے روابط اور تعلقات' علامہ محمد اقبال کے مصاحب خاص سید نذیر نیازی مرحوم سے بھی تھے جو اکثر اپنی صحبتوں میں ان کا ذکر خیر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ جس ہستی سے مرحوم علامہ محمد اسد کو پیار اور خلوص تھا' وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات گرامی تھی۔ دراصل علامہ محمد اسد کا مسلم مفکرین سے گہرا تعلق تھا اور یہ ایک فطری بات تھی۔ بہرحال آپ جن لوگوں سے متاثر ہوئے' ان میں علامہ محمد اقبال اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں علامہ محمد اسد لکھتے ہیں:

''سارے مشرق وسطیٰ کے طول وعرض میں برسوں کی سیاحت کے بعد بالآخر ۱۹۲۶ء میں مشرف بہ اسلام ہوا۔ اس تبدیلی مذہب کے بعد تقریباً چھ سال عرب میں مقیم رہا اور سلطان ابن سعود کا تقرب حاصل رہا' عرب کو چھوڑ کر میں ہندوستان گیا اور وہاں عظیم مسلم مفکر وشاعر محمد اقبال سے نیاز حاصل ہوا جن کو پاکستان کے تخیل کو روحانی بنیاد استوار کرنے میں سب سے سبقت حاصل ہے۔ موصوف ہی کے آمادہ کرنے پر میں جلد ہی مشرقی ترکستان' چین اور انڈونیشیا کے سفر کے اہتمام سے باز آیا اور ہندوستان میں رہ کر اس ریاست اسلامی کے فکری عناصر ترکیبی ومبادی کی وضاحت میں سعی ومعاونت کرنے لگا جس کے خدوخال موصوف کے ذہن میں ہنوز ایک خواب کی مانند مبہم وناصاف تھے۔ تاہم میرے اور علامہ موصوف دونوں کے نزدیک یہی دھندلا سا خواب اس واحد راہ کی نشاندہی کرتا تھا جس پر گامزن ہو کر ہم اسلام کی خوابیدہ آرزوؤں کو بیدار کر سکتے تھے۔''(۱)

یاد رہے کہ ''طوفان سے ساحل تک'' علامہ محمد اسد کی مشہور کتاب ''دی روڈ ٹو مکہ'' کا اردو ترجمہ ہے جس کے مترجم محمد الحسنی ندوی ہیں اور مولانا سید ابوالحسن ندوی نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے۔ ندوی نے اس کتاب کو ''سفرنامہ'' سے تعبیر کیا ہے۔

علامہ اسد کی علامہ اقبال سے ملاقات کے ضمن میں سید نذیر نیازی مرحوم اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''--۱۹۳۷ء میں حضرت علامہ اقبال کی وفات سے چند ہفتے پہلے چوہدری نیاز علی صاحب جاوید منزل (میوروڈ لاہور) تشریف لائے۔ علامہ محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویس) بھی ان کے ساتھ تھے۔ چوہدری صاحب نے علامہ محمد اقبال کی مزاج پرسی کے بعد عرض کیا کہ انہوں نے قلعہ جمال پور میں ایک وقف دارالسلام کے نام سے قائم کیا ہے تاکہ وہاں مسلمانوں کی اصلاح وتربیت اور دینی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ ان کی خواہش تھی کہ حضرت علامہ اس کام میں ان کی رہنمائی فرمائیں اور جیسا کہ ان کا مشورہ ہو اس کے مطابق بعض علمائے دین کو دارالسلام آنے کی دعوت دی جائے۔ حضرت علامہ نے فرمایا کہ دینی مدارس کی کوئی کمی نہیں۔ بہتر ہوگا چوہدری صاحب اس وقف سے کوئی اور کام لیں۔ چوہدری صاحب نے عرض کیا کہ آپ ہی فرمائیے اس وقف سے کیا کام لینا چاہیے۔''

حضرت علامہ نے فرمایا:

Marfat.com

''میرے نزدیک اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت فقہ اسلامی کی تشکیل جدید ہے۔ بحالت موجودہ ہم روز بروز اسلام سے دور ہٹ رہے ہیں اور اس کی وجہ ہیں وہ سیاسی واجتماعی مسائل' جنہوں نے موجودہ زمانے میں ایک خاص شکل اختیار کر لی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء ان مسائل کو سمجھیں اور حالات کو اسلامی شرائع کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ اس پر سوال پیدا ہوا کہ اکابر علماء کا تو دارالسلام آنا محال نظر آتا ہے۔ وہ اپنے اپنے مراکز میں بیٹھے دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ حضرت علامہ نے کہا یہ ٹھیک ہے' مگر اس کے باوجود ملک میں ایسے پڑھے لکھے نوجوانوں کی کمی نہیں جن کے دل میں اسلام کا درد ہے اور جو مسائل حاضرہ سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں' ان میں نئے اور پرانے تعلیم یافتہ بھی شامل ہیں۔ ضرورت ان کو جمع کرنے کی ہے۔ پھر حضرت علامہ نے محمد اسد صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چوہدری نیاز علی سے کہا ''دیکھیے یہ آپ کے سامنے بیٹھے ہیں کیوں نہ یہ اس کام کو ہاتھ میں لیں؟'' چوہدری صاحب نے کہا کہ اسد صاحب ضرور اس کام میں میرا ہاتھ بٹائیں گے مگر اس کام کے لیے تو ایک جماعت کی ضرورت ہے۔''(۲)

علامہ محمد اقبال کے نزدیک سب سے اہم کام فقہ اسلامی کی تشکیل جدید تھی اور زندگی کے آخری ایام میں تو یہ سب سے بڑا مسئلہ ان کے سامنے تھا اور بقول مولانا عبدالمجید سالک:

''فقہ اسلامی کے متعلق ڈاکٹر صاحب عمر بھر یہی کہتے رہے کہ بلاشبہ ہمارے فقہا و مجتہدین نے فقہ پر بڑی محنت کی ہے اور ان کی یہ محنت صرف قابل داد و تحسین ہی نہیں بلکہ اس سے ہر دور کے مسلمانوں کو استفادہ کرنا چاہیے' لیکن آج کے دور میں ضرورت ہے کہ اصول فقہ کو زمانہ حال کی ''جیورس پروڈنس'' کے انداز پر از سر نو مدون کیا جائے تاکہ ہم مسلمانوں کے لیے نہایت واضح نظام شریعت مہیا کر سکیں اور دنیا کو یہ بھی بتا سکیں کہ ہمارا قانون دنیا بھر کے قوانین و شرائع پر بہ ہزار وجوہ فضیلت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہ کام خود کرنا چاہتے تھے' لیکن انسانی عمر بہت کوتاہ ہے اور کام بہت ہی بڑا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کام کسی ایک آدمی کے کرنے کا بھی نہیں' اس لیے وہ محض اصول پیش کر سکے اور اپنے ہر خطبے میں انہوں نے مسلمان اہل شریعت اور ماہرین قانون کی توجہ اس کام کی طرف مبذول کرائی۔ اب اگر مستقبل میں اہل علم اور اہل فکر کی کوئی جماعت اس کام کی تکمیل پر کمر بستہ ہوگی تو یہ بھی ڈاکٹر اقبال ہی کی تلقین و ہدایت کا نتیجہ ہوگا۔''(۳)

علامہ محمد اقبال کی یہ خواہش تھی کہ علامہ محمد اسد یہ کام سنبھالیں اور فقہ اسلام کی جدید تدوین کریں جو عصر جدید کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں علامہ محمد اقبال نے مولانا سید انور شاہ کشمیری ثم دیوبندی سے بھی رجوع کیا تھا۔

علامہ محمد اقبال اس سے پیشتر علامہ محمد اسد سے متعارف ہو چکے تھے اور ان سے جب وہ دہلی میں مقیم تھے' سید نذیر نیازی کی وساطت سے اور براہ راست بھی خط و کتابت ہوئی تھی۔ سید نذیر نیازی کو ۲۷ جون ۱۹۳۴ء کو علامہ

Marfat.com

اقبال نے لکھا تھا:

''مسٹر محمد اسد (Leopold Weiss) کو ایک خط لکھا تھا۔اس کا جواب نہیں آیا۔ان سے بھی دریافت کریں کہ میرا خط ان کو ملا ہے یا نہیں۔ڈاک خانہ سے دریافت کرنا چاہیے کہ جو خطوط میں نے لکھے ہیں' وہ آپ تک کیوں نہیں پہنچے۔والسلام محمد اقبال''(۴)

علامہ محمد اقبال کی یہ خواہش تھی کہ علامہ محمد اسد دہلی میں قرول باغ میں رہتے تھے اور سید نذیر نیازی ان کے ہمسایہ تھے اور بقول نیازی صاحب:

''اتفاق سے انہیں مکان بھی ملا تو قرول باغ میں اور ایک طرح سے میرے دیوار بہ دیوار یعنی اتنا قریب کہ روز ملاقات ہو جاتی۔چند دنوں میں دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔''(۵)

۱۹۳۴ء میں ہی علامہ محمد اسد کی مشہور کتاب ''اسلام ایٹ دی کراس روڈز'' (Islam at the Crossroads) شائع ہوئی' جسے ہر طبقہ فکر کے لوگوں نے پسند کیا اور علامہ محمد اقبال نے بھی اس کتاب کو پذیرائی بخشی تھی۔سید نذیر نیازی رقم طراز ہیں:

''حضرت علامہ نے ان کی تصنیف Islam at the Crossroads کو پسند فرمایا تھا۔اسد صاحب ان دنوں اگرچہ صحیح بخاری کا ترجمہ کر رہے تھے' لیکن ایک طرح سے تھے بیکار' اس لئے میں نے ان کی مرضی پا کر حضرت عامہ سے درخواست کی کہ انہیں اسلامیہ کالج سے منسلک کر دیا جائے۔''(۶)

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ علامہ محمد اسد نے صحیح بخاری کا ترجمہ کیا اور یہ کتاب چھپ بھی گئی اور اسے سرینگر سے شائع کیا گیا۔سنہ اشاعت ۱۹۳۵ء ہے۔علامہ محمد اقبال نے اس کتاب کو اپنی ذاتی لائبریری میں رکھا۔اب وہ نسخہ اقبال میوزیم' میوروڈ میں موجود ہے۔اس پر لکھا ہے۔''صحیح بخاری-مرتبہ محمد اسد'' یہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور اعمال کا مکمل ریکارڈ' جو صحابہؓ سے ان کے پیروؤں تک پہنچا اور جنہوں نے تیسری صدی ہجری میں انہیں مرتب کیا۔یہ امام ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل ابن المغیرہ البخاری کی روایات ہیں اور محمد اسد نے عربی سے ان کا ترجمہ کرتے ہوئے کچھ تشریحی اشارات اور کچھ فہرستیں بھی ان میں شامل کی ہیں۔جلد اول-الہام کس طرح شروع ہوا-مطبوعہ عرفات پبلی کیشنز' سرینگر ۱۹۳۵ء۔''(۷)

جہاں تک علامہ محمد اسد کے اسلامیہ کالج لاہور میں ملازمت کا تعلق ہے' علامہ محمد اقبال نے سید نذیر نیازی کو لکھا ''محمد اسد صاحب کو میں نے خط لکھ دیا ہے۔''

چونکہ علامہ محمد اقبال کو علامہ محمد اسد کے ذریعہ معاش کی بے حد فکر رہتی تھی۔وہ چاہتے تھے کہ وہ کہیں ملازم ہو جائیں۔وہ ان کی دینی علمیت و بصیرت کے مداح تھے' لہٰذا سید نذیر نیازی کو ۲۹ جون ۱۹۳۴ء کو لکھا:

''معلوم نہیں محمد اسد کیا کرتے ہیں؟ شاید وہ کوئی انگریزی اخبار یا رسالہ نکالنے والے ہیں۔میرا خیال تھا کہ ان کو کہیں دینیات کا یا عربی زبان کا پروفیسر کر دیا جائے۔ان کی انگریزی کتاب سے معلوم ہوتا ہے

Marfat.com

کہ وہ دین اسلام کے اسرار سے ناواقف نہیں' اگرچہ ان کے Pessimism سے مجھے اتفاق نہیں۔
والسلام۔محمد اقبال"(۹)

۱۹۳۴ء میں سر شیخ عبدالقادر کے بعد علامہ محمد اقبال انجمن حمایت اسلام لاہور کے صدر منتخب ہوئے اور ۱۹۳۷ء تک اس عہدہ پر فائز رہے یعنی چار سال تک انجمن ہذا کے صدر رہے۔آپ نے ۱۴ جولائی ۱۹۳۴ء کو جنرل کونسل کے اجلاس کی صدارت فرمائی اور ۲۵ جولائی ۱۹۳۷ء کو علالت طبع کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا۔روئیداد جنرل کونسل انجمن حمایت لاہور مورخہ ۲۵ جولائی ۱۹۳۷ء میں لکھا ہے:"علامہ اقبال نے جب علالت طبع کی وجہ سے انجمن حمایت اسلام کی صدارت سے استعفیٰ دیا تو جنرل کونسل نے علامہ موصوف کی خدمات کو سراہتے ہوئے قرارداد پاس کی اور ان کی صحت یابی کے لئے دعا کی۔"

کہنا یہ ہے کہ جن دنوں علامہ محمد اسد کے لئے علامہ محمد اقبال پروفیسر کی اسامی کے لئے کوشاں تھے تو اس وقت وہی انجمن حمایت اسلام لاہور کے صدر بھی تھے۔انہوں نے ۲۲ جولائی کو سید نذیر نیازی کو لکھا:

"محمد اسد صاحب سے کہئے کہ کالج کمیٹی منگل کے روز ان کے معاملے کا فیصلہ کرے گی۔میں نے خلیفہ شجاع الدین سیکرٹری کمیٹی سے کہہ دیا ہے کہ فیصلہ سے ان کو مطلع کر دیں۔والسلام محمد اقبال۔"(۱۰)

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ علامہ محمد اقبال کی یہ خواہش تھی کہ علامہ محمد اسد دینیات کے پروفیسر بنیں اور یہ خدمات اسلامیہ کالج لاہور میں سرانجام دیں جہاں ان کی تقرری کا فیصلہ ہو گیا تھا۔۱۴ جولائی ۱۹۳۴ء کو علامہ محمد اقبال نے جو تحریری تقریر جنرل کونسل میں کی تھی' اس میں فرمایا:

"اول! دینیات کی تعلیم۔اب میری استدعا آپ سے یہ ہے کہ اس معاملہ پر کافی غور و خوض کے بعد زمانہ حال کے مقتضیات کے مطابق انجمن کے کالج اور سکولوں میں دینی اور اخلاقی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔مجھے یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں کہ انجمن حمایت اسلام کی آئندہ کامیابی (بلکہ ایک قومی ادارہ ہونے کی حیثیت سے اس کی آئندہ زندگی) صرف اسی ایک مسئلہ کے کامیاب حل پر انحصار رکھتی ہے۔مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ اراکین کالج کمیٹی اس ضروری امر کے متعلق کچھ فیصلہ کر چکے ہیں۔اب آپ کا اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانا باقی ہے۔مجھے یقین ہے کہ جلد ایسا کیا جائے گا۔"

یہ اشارہ علامہ محمد اسد کی تقرری کے فیصلہ کی طرف تھا۔اس تقریر میں آپ نے مسٹر عبداللہ یوسف علی کے بارے میں فرمایا:

"مسٹر عبداللہ یوسف علی اگر اس عہدہ جلیلہ پر واپس آ سکتے تو ہماری بہت سی مشکلات کا حل ہو جاتا یعنی اسلامیہ کالج کے پرنسپل دوبارہ بن جاتے۔"(۱۱)

علامہ اقبال پڑھے لکھے اور علوم جدیدہ سے واقف دانش مندوں کی تلاش میں رہتے تھے۔جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ علامہ محمد اقبال' علامہ محمد اسد کے بارے میں متفکر رہتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ وہ جلد از جلد لاہور آ جائیں اور

Marfat.com

اسلامیہ کالج سے منسلک ہو جائیں۔ انہوں نے سید نذیر نیازی کو خط میں لکھا:

''۔۔۔محمد اسد صاحب سے کہہ دیں کہ کالج کمیٹی کی میٹنگ منگل کی بجائے جمعرات کو ہو گی۔ جو فیصلہ ہو گا اس سے آپ کو مطلع کیا جائے گا۔''(۱۲)

۲۸ جولائی ۱۹۳۴ء کے خط بنام سید نذیر نیازی میں لکھتے ہیں:

''محمد اسد صاحب سے کہہ دیجئے کہ کالج کمیٹی نے ان کا تقرر منظور کر لیا ہے۔ امتحاناً چھ ماہ کے لیے ان کی تنخواہ مقرر کرنے کا اختیار انہوں نے یعنی کالج کمیٹی نے مجھ کو دیا ہے۔ کمیٹی سے باقاعدہ اطلاع آنے پر میں ان کو خط لکھوں گا۔ میرے خیال میں ان کو کم تنخواہ پر بھی یہ جگہ قبول کر لینی چاہیے کیونکہ اس جگہ کے امکانات بہت ہیں۔

والسلام محمد اقبال''(۱۳)

اس خط کے دو روز بعد یعنی ۳۰ جولائی کو لکھتے ہیں:

''مسٹر محمد اسد کے متعلق لکھ چکا ہوں۔ ان کا خط بھی آج آیا تھا۔ میرا پیغام ان تک پہنچا دیں جس میں میں نے کالج کمیٹی والے فیصلہ کی اطلاع دے دی ہے۔ کمیٹی نے ان کے حق میں فیصلہ کیا ہے یعنی ان کو ملازم رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اور مجھ کو اختیار دیا ہے کہ میں ان کی تنخواہ مقرر کر دوں۔ ابھی تک میرے پاس باقاعدہ اطلاع کمیٹی کی طرف سے نہیں آئی۔ مولوی غلام محی الدین صاحب سیکرٹری انجمن سے زبانی سنا ہے۔ اطلاع آنے پر میں ان کو خود لکھوں گا۔ فی الحال میں ان کو صرف اسی قدر مشورہ دیتا ہوں کہ کچھ تنخواہ پر بھی اس جگہ کو قبول کر لیں۔ وہ ۳۵۰ روپیہ ماہوار پر راضی ہیں مگر کالج کے فنڈ ابھی اس تنخواہ کی شاید اجازت نہیں دیتے۔ وہ خود اس میں reasonable reduction کر دیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر آئندہ چھ ماہ میں انہوں نے تعلیم دہی کو عمدگی کے ساتھ سرانجام دیا تو انجمن ان کی تنخواہ بڑھا دے گی۔ میرے خیال میں وہ فی الحال ۲۵۰ روپیہ ماہوار قبول کر لیں۔ اگر یہ ناممکن ہے تو اطلاع دیں۔ اگر مجوزہ رسالہ بھی وہ نکالتے ہیں تو ممکن ہے اس سے ان کی آمدنی میں اضافہ ہو۔''(۱۴)

اس ضمن میں سید نذیر نیازی کا بیان ہے کہ ''اسد صاحب سے گفتگو ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ میں خود ہی لاہور جا رہا ہوں۔ حضرت علامہ سے مل کر سب باتیں کر لوں گا۔''(۱۵)

علامہ محمد اسد اس عرصہ میں لاہور میں مقیم رہے اور ان کا علامہ اقبال سے مسلسل رابطہ رہا اور یہ وہ ایام ہیں جب علامہ اقبال صاحب فراش تھے۔ اس ضمن میں سید نذیر نیازی اپنی معروف کتاب ''اقبال کے حضور میں'' جز و اول جنوری تا ۲۱ مارچ ۱۹۳۸ء کے صفحہ ۳۸۶ میں لکھتے ہیں:

''اسد صاحب کا دیر سے خیال تھا کہ بعض جرمن ڈاکٹر جو لاہور میں مقیم ہیں اور مطب کر رہے ہیں کیوں نہ وہ بھی حضرت علامہ کو دیکھ لیں۔ ان کا طریق علاج اگرچہ مختلف ہے اور بہت ممکن ہے وہ علاج کریں

Marfat.com

تو سب سے الگ تھلگ رہ کر یعنی اس شرط پر کہ ان کے علاج میں کسی دورے کا دخل نہ ہو لیکن ان سے مشورہ لینے میں کیا حرج ہے۔ ان میں ایک تو ڈاکٹر سیلزر تھے اور دوسرے ڈاکٹر کالیش۔ میں نے اسد صاحب سے کہہ رکھا تھا آپ ان میں سے کسی سے بات کرلیں۔"(۱۶)

بہرحال علامہ محمد اسد کی سعی سے ڈاکٹر سیلزر "جاوید منزل" آئے اور انہوں نے علامہ محمد اقبال کا طبی معائنہ کیا اور گفتگو بھی کی۔ بقول سید نذیر نیازی ان ایام میں علامہ محمد اسد ماڈل ٹاؤن میں رہائش پذیر تھے اور علامہ محمد اقبال سے ملتے رہتے تھے۔

قیام پاکستان کے فوراً ہی بعد علامہ محمد اسد حکومت پاکستان سے وابستہ ہوگئے تھے۔ خود اسی تعلق کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام وجود میں آیا تو حکومت پاکستان کی طرف سے میں ایک محکمہ "اسلامی تعمیرِ جدید" کی تنظیم ونگرانی پر مامور کیا گیا' جس کا مقصد ریاست اور ملت کے بارے میں اسلام کے معیاری تصور کی تفصیل وتوضیح تھی جس سے یہ نوزائیدہ سیاسی جماعت استفادہ کرسکے۔ اس باب میں دو سال کی انتہائی حرکت آفریں جدوجہد کے بعد میری خدمات پاکستان کے محکمہ خارجہ کو منتقل کردی گئیں اور میرا تقرر وزارت خارجہ میں حلقہ مشرق وسطیٰ کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے ہوا۔ چنانچہ پاکستان اور دیگر ممالک اسلامیہ کے باہمی رشتہ کو مضبوط اور استوار بنانے کے لئے میں نے خود کو وقف کردیا اور بالآخر اقوام متحدہ کے لئے نیویارک میں مجھے پاکستان کے وفد اور اس کی مہم سے متعلق آگاہ کردیا گیا۔"(۱۷)

علامہ محمد اسد پولینڈ کے شہر لوو (Lwow) کے مکین تھے۔ ان کا تعلق یہودیوں کے ایک خاندان سے تھا۔ ان کے والد ایک پڑھے لکھے انسان تھے' لیکن علامہ اسد ابتدا ہی سے ایک روحانی خلا محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز ایک صحافی کی حیثیت سے کیا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں مشرق وسطیٰ کا دورہ کیا' جہاں اسلامی اور عربی تہذیب وتمدن کو دیکھنے کا موقع ملا اور ساتھ ہی ساتھ مذاہب عالم کا تقابل بھی کرتے رہے۔ اس کے بعد سوویت یونین جانے کا موقع ملا اور اشتراکی معاشرہ کو دیکھا۔ پھر جرمنی گئے جہاں انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"اب مجھے یقین ہوگیا کہ قرآن کسی انسان کی حکمت ودانائی کا نتیجہ نہیں ہے جو ایک دور دراز جزیرۃ العرب میں تاریخ کے کسی دور میں تھا' اس لیے کہ یہ انسان لاکھ سمجھدار' حکیم اور دانا سہی مگر پھر بھی اس عذاب کی پیش گوئی نہیں کرسکتا جو بیسویں صدی کی خصوصیت سے مجھے قرآن کے اندر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ اونچی اور گہری آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس بات کا واضح اور کھلا ہوا نتیجہ یہ تھا کہ میں ایک مسلمان ہندوستانی دوست کے پاس گیا جو اس وقت برلن میں مسلمانوں کی انجمن کے صدر تھے اور ان سے اسلام قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے اپنا داہنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں

Marfat.com

نے بھی اپنا داہنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا اور دو گواہوں کی موجودگی میں میں نے کہا
اشہد ان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمد الرسول اللہ۔ میرے دوست نے کہا کہ آپ کا نام (Leopold) ہے۔ لیو کے معنی یونانی شیر کے ہوتے ہیں اس لئے ہم آج سے آپ کو "محمد اسد" کہیں گے۔ چند ہفتے بعد میری بیوی نے بھی اسلام قبول کر لیا۔"

۱۹۳۴ء میں علامہ محمد اسد نے Islam at the Crossroads لکھی تھی جسے ہر طبقہ فکر کے لوگوں نے پسند کیا تھا اور جن دنوں یعنی ۱۹۴۶ء میں جب آپ ڈلہوزی میں قیام پذیر تھے تو ایک انگریزی ماہنامہ Arafat کے نام سے شائع کیا تھا۔

علامہ محمد اسد قرآن حکیم کے مطالعے اور اس کے اعجاز سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے۔ پھر احادیث نبوی کو پڑھا اور صحیح بخاری کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا یعنی آپ سیرت رسول اکرمؐ کے ہر گوشہ سے منور ہوئے اور دین مبین کی تبلیغ و اشاعت سے منسلک ہو گئے۔ علامہ محمد اقبال کے فکر و نظر کا منبع اور سرچشمہ بھی قرآن حکیم اور احادیث نبویؐ تھا۔ ان دونوں مفکروں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ دین مصطفویؐ ہی عالم انسانیت کی رہبری اور رہنمائی کا یارا رکھتا ہے اور عہد حاضر کے تقاضوں پر بھی پورا اترتا ہے مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ دین اسلام کی حقیقی روح کو عوام الناس تک پہنچایا جائے۔ علامہ محمد اقبال کی یہ خواہش تھی کہ فقہ اسلامی کی جدید طرز پر تدوین ہو۔ اس سلسلہ میں انہوں نے علامہ سید محمد انور شاہ دیو بندی سے بھی رجوع کیا تھا اور علامہ محمد اسد کی توجہ بھی اس طرف مبذول کرائی تھی جنہوں نے اپنی زندگی میں اسلام کی حقانیت کی تبلیغ کی اور جب تک جئے' اپنے تبلیغی مشن کو جاری و ساری رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے اس جہان رنگ و بو سے اٹھ جانے کے بعد دنیائے اسلام ایک ایسے مبلغ اور عالم سے محروم ہو گئی جس کے دل میں وہی تڑپ' وہی امنگ اور وہ ولولہ تھا جو علامہ محمد اقبال میں تھا جنہیں ایرانی مفکر اور دانش ور ڈاکٹر علی شریعتی نے "مصلح قرن آخر" کے نام سے پکارا ہے۔ محمد اسد اسی ترجمان حقیقت کا ہم قدم بھی تھا اور ہم آواز بھی!

(در: اقبال اور مشاہیر کشمیر از کلیم اختر، لاہور ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۳-۱۱۴)

حواشی

۱۔ طوفان سے ساحل تک، ص ۳۶

۲۔ ہفت روزہ ایشیا-اقبال نمبر ۱۷ اپریل ۱۹۶۹ء۔

۳۔ یاران کہن ص ۳۵

۴۔ مکتوبات اقبال، ص ۱۵۹

۵۔ ایضاً، ص ۱۵۹

Marfat.com

٦۔ ایضاً

۷۔ آثار علامہ اقبال، ص ۱۱۳

۸۔ ایضاً، ص ۱۷۱

۹۔ مکتوبات اقبال، ص ۱۶۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۷۴

۱۱۔ اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۲۷-۱۲۸۔

۱۲۔ مکتوبات اقبال، ص ۱۷۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۷۸

۱۴۔ ایضاً ص ۱۷۹-۱۸۰۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۸۰۔

۱٦۔ اقبال کے حضور میں، ص ۳۸۳

۱۷۔ طوفان سے ساحل تک، ص ۳۷

Marfat.com

محمد ارشد

اسلام اور مغرب

(نومسلم دانشور محمد اسد کی نظر میں)

اسلام اور مغرب' ممتاز نومسلم دانشور اور مفکر محمد اسد (۱۹۰۰ء-۱۹۹۲ء) کی تحریروں کا ایک اہم موضوع ہے۔ان کی کوئی بھی تالیف ایسی نہیں ہے جس میں کسی نہ کسی حوالے سے اس موضوع پر اظہار خیال نہ کیا گیا ہو۔اس سلسلہ میں ان کے خیالات و آراء کو حسب ذیل عنوانات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ اسلام اور مغرب کے مابین منافرت اور کشمکش کے اسباب ومحرکات

۲۔ دین محمدیؐ (Islam) استشراق کے اہداف ومقاصد اور اس کے اثرات ونتائج

۳۔ اسلام بمقابلہ تہذیب مغرب-اسلام اور مغربی تہذیب کے مابین حقیقی و جوہری فرق وامتیاز' نیز مغربی تہذیب سے اخذ واکتساب کے حدود

۴۔ اسلام اور مغرب- مکالمہ ومفاہمت

۵۔ مغرب میں دعوت اسلام-ضرورت واہمیت

سطور ذیل میں مذکورہ موضوعات ومسائل سے متعلق محمد اسد کے خیالات کے جائزہ کے علاوہ مغرب میں دعوت اسلام کے ضمن میں ان کی علمی خدمات پر بھی نگاہ ڈالی جائے گی۔

اسلام اور مغرب: باہمی منافرت اور کشمکش کے اسباب ومحرکات

محمد اسد کی رائے میں اہل مغرب کا دنیا کے تمام مذاہب اور تہذیبوں کے بارے میں رویہ مغایرت اور لاتعلقی و بے اعتنائی کا ہے' جبکہ اسلام کے بارے میں ان کا رویہ شدید نفرت و بے زاری اور حسد ورقابت کا ہے جو جنون کی حد تک بڑھی ہوئی ہے۔ اسلام' اس کی تہذیب اور اس کے پیروؤں کے بارے میں اہل مغرب کی مخاصمت اور ان کے بغض وعناد کے محرکات عقلی نہیں' بلکہ خالصتاً جذباتی و سیاسی نوعیت کے ہیں [۱-ب] اور ان کی جڑیں بعض تاریخی حوادث و واقعات خصوصاً صلیبی جنگوں (Crusades) میں پیوست ہیں۔ [۲] اسد کے خیال میں صلیبی

Marfat.com

جنگوں(۳) نے دنیائے مغرب کے ذہن ونفسیات اوراس کی تہذیب پر انتہائی دوررس، عمیق اورانمٹ اثرات مرتب کیے۔ صلیبی جنگوں (۱۰۹۵ء-۱۲۹۱ء) میں یورپ کی متحدہ مسیحی دنیا کو مسلم افواج کے ہاتھوں جوزک پہنچی، اس سے عالم مسیحیت کو ایک شدید ذہنی صدمہ (trauma) لاحق ہوا۔ اس ذہنی صدمہ نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اس کے رویے کو ہمیشہ کے لیے ایک متعین جہت "نفرت، بغض وعناد اور دشمنی ورقابت کی" دے دی۔ اس دوران میں مغرب ایک نئے مذہبی وثقافتی شعور اور سیاسی اتحاد سے ہمکنار ہوا۔ مزید براں مغرب میں ایک ایسی تہذیب اور ایک ایسے ادب نے جنم لیا جس کی تخلیق میں اسلام اور مسلمانوں سے نفرت اور دشمنی نے زبردست قوت محرکہ کا کردار ادا کیا۔ چنانچہ اس دور میں مغربی ذہنوں کو اس (اسلام) کی جانب سے متنفر و بدگمان کرنے کی غرض سے اسلام کی تعلیمات کو دانستہ طور پر مسخ کر کے پیش کرنے کی مہم نے زور پکڑا۔ اس مہم نے یورپ کی اقوام کے ذہن وفکر کو شدید طور سے متاثر کیا، بلکہ اس پر انمٹ اثرات مرتب کیے۔(۴) اسد کے الفاظ میں:

> "صلیبی جنگوں کے زخموں نے یورپ کو مذہبی وثقافتی شعور اور جذبہ اتحاد سے ہمکنار کیا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی مقدر ہو گیا کہ مستقبل میں جب بھی اسلام کو کسی مغربی کے سامنے پیش کیا جائے تو یہ تلخ تجربات اس دین (اسلام) کو اپنی حقیقی واصلی صورت میں پیش ہی نہ ہونے دیں۔ صلیبی جنگوں سے جو نقصان پہنچا وہ محض جنگی ہتھیاروں کے باہمی تصادم تک محدود نہ تھا بلکہ وہ بہت بڑی حد تک ایک ذہنی وفکری نقصان تھا جو اس طور سے واقع ہوا کہ اسلامی تعلیمات کو دانستہ مسخ کر کے مغربی ذہنوں کو اسلام کی جانب سے بدگمان کیا جانے لگا۔(۵) چنانچہ صلیبی جنگوں ہی کے دنوں میں یہ مضحکہ خیز تخیل مغربی اذہان میں جاگزیں ہو گیا اور یہ تخیل آج بھی جوں کا توں موجود ہے کہ اسلام بداخلاقی وبدکرداری اور بہیمانہ جارحیت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس میں بجائے تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کے محض چند ظاہری رسوم کی ادائیگی پر زور دیا جاتا ہے۔ اس دور میں یورپیوں نے پیغمبر اسلامؐ کے اسم محمدؐ کو از راہ نفرت اور استحقار واستخفاف تبدیل کر کے ماہاؤنڈ (Mahound) کر دیا۔(۶) غرض مسلمانوں سے خوف زدہ یورپ نے ہر ہر حوالے سے اسلام، اس کی تہذیب اور اس کی روحانی وسماجی اقدار کے بارے میں دشمنی کا رویہ اختیار کر لیا۔"(۷)

اسد کی رائے میں اسلام سے مغربیوں کی نفرت وبدگمانی اور رقابت ودشمنی جو مذہب کی راہ سے وجود میں آئی اور صلیبی جنگوں کے دوران خوب پروان چڑھی، مابعد دور میں بدستور زندہ وتوانا رہی۔ اسی نے اندلس میں مسلمانوں کے خلاف وہاں کی مسیحی رعایا کو برسرپیکار کیا اور مسلمانوں سے جنگ وقتال کے لیے ان کو نئے ولولے سے سرشار کیا گیا۔ اندلس میں مسلم سلطنت کی تباہی پر تو یورپ خوشی ومسرت سے جھوم اٹھا تھا۔(۸) اسد کی رائے میں اسلام کے

Marfat.com

بارے میں تعصب وعناد اہل مغرب کی سرشت میں داخل ہو گیا۔ (۹) مابعد صدیوں میں جب اہل مغرب کے دل و دماغ مذہب کی گرفت سے آزاد ہونا شروع ہوئے تب بھی اسلام کے بارے میں ان کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اٹھارہویں صدی کا فرانسیسی فلسفی وشاعر والٹیر (م: ۱۷۷۸ء) جو آزادفکری و روشن خیالی میں بڑی شہرت رکھتا تھا' اسلام دشمنی میں پیش پیش تھا۔ وہ اسلام اور پیغمبرؐ سے حد درجہ دشمنی رکھتا تھا۔ (۱۰) یہی نہیں آج جبکہ مذہب کی گرفت سے اہل مغرب کے دل ودماغ بڑی حد تک آزاد ہو چکے ہیں' اسلام کے بارے میں ان کے قدیم تعصبات پوری شدت و قوت سے موجود ہیں۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ آج بھی مغرب کے سر پر صلیبی جنگوں کی پرچھائیں موجود ہیں اور آج بھی اسلام اور مسلمانوں کی جانب اس کے جو خیالات اور جذبات ہیں' اس میں اس سخت جان بھوت کے واضح آثار ارتسامات پائے جاتے ہیں۔ اسد کے الفاظ میں:

It seems an irony of history that the age-old Western resentment against Islam, which was religious in origin, should still persist subconsciously at a time when religion has lost most of its hold on the imagination of Western man. The shadow of the Crusades hover over the West to this day; and all its reactions towards Islam and the Muslim World bear distinct traces of that die-hard ghost.[11]

ترجمہ: ''تاریخ کی یہ بھی ایک ستم ظریفی ہے کہ اسلام سے مغربیوں کی قدیم نفرت مذہب کی راہ سے وجود میں آئی۔ آج جبکہ مذہب کی گرفت سے اہل مغرب کے اذہان بڑی حد تک آزاد ہو چکے تھے۔ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اہل مغرب کی عداوت ومنافرت کا جذبہ اب بھی غیر شعوری طور پر موجود اور باقی ہے...... مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ آج بھی مغرب کے سر پر صلیبی جنگوں کی پرچھائیں موجود ہے اور آج بھی اسلام اور مسلمانوں کی جانب اس کے جو خیالات اور جذبات ہیں' ان میں اسی سخت جان بھوت کی واضح علامات اور نشانیاں پائی جاتی ہیں۔''

محمد اسد کا یہ کہنا کہ قرون وسطیٰ میں اسلام کا دانستہ طور پر ایک غلط سلط اور مسخ شدہ تصور پیش کیا گیا' نیز یہ کہ اہل مغرب تا حال خود کو صلیبی جنگوں کے اثرات سے آزاد نہیں کرا سکے ہیں' ایک ایسی حقیقت ہے' جس کو نارمن ڈینئیل جیسا انصاف پسند استشراق کا معروف مغربی نقاد تو ایک طرف' (۱۲) مانٹ گمری واٹ جیسا متعصب مستشرق بھی تسلیم کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ (۱۳)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مغرب کے اسلام کے بارے میں مخاصمانہ ومعاندانہ رویے کے اسباب و محرکات صرف اور صرف تاریخی نوعیت کے ہیں؟ کیا صرف تاریخی حادثات و واقعات ہی اسلام کے بارے میں اہل مغرب کے طرز فکر وعمل کو متعین ہمیشہ کے لئے کیے ہوئے ہیں یا پھر اس کا کوئی اور بھی سبب ہے؟ محمد اسد نے اس سلسلہ

Marfat.com

میں ایک اور سبب کی نشان دہی بھی کی ہے'ان کی رائے میں ایک اہم سبب ومحرک وہ نفسیاتی خوف ہے جو اسلام کی قوت وصلاحیت کے بارے میں اہل مغرب کو لاحق ہے۔ دین اسلام اہل مغرب کے تصور حیات وکائنات اور ان کی تہذیبی و سماجی اقدار کو پوری قوت وطاقت سے چیلنج کرتا ہے۔ مسلم دنیا میں اسلام کے احیاء اور مغربی معاشروں میں اسلام کی ترویج واشاعت اور اس کے استحکام کا لازمی نتیجہ انہیں اپنے تہذیبی وسماجی اور سیاسی واقتصادی نظام کی تحلیل اور تباہی و بربادی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ بایں وجہ آج جبکہ مغرب کی مادیت پرستی کی ماری ہوئی مضطرب و بے چین روحیں روحانی وقلبی سکون اور طمانیت کی تلاش وجستجو میں سرگرداں ہیں اور بسا اوقات مختلف مذہبی وروحانی نظاموں کی طرف اندھا دھند لپکتی ہیں' اسلام کے بارے میں ایک توحش محسوس کرتی ہیں۔ اسلام کے برعکس دیگر مشرقی روحانی و مذہبی نظاموں کے بارے میں اہل مغرب کے ہمدردانہ وروادارانہ رویے کا اہم اور بنیادی سبب یہی ہے کہ ان کی طرف سے ان کے تہذیبی وسماجی وجود اور سیاسی واقتصادی نظام کو نقصان پہنچنے کا کوئی امکان یا اندیشہ نہیں پایا جاتا۔ (۱۴) اسد نے اہل مغرب کے اسلام کے بارے میں رویے کا موازنہ پیغمبر اسلام کی بعثت' اعلان نبوت اور آپ کی دعوت وتعلیمات کے بارے میں کفار مکہ کی ہٹ دھرمی' حسد ورقابت اور مخاصمت سے کیا ہے۔ یعنی جس طرح سے اہل مکہ نے پیغمبر کی دعوت کو اپنے موجودہ مذہبی وسماجی' اقتصادی وسیاسی اور تہذیبی واخلاقی وجود کے لیے ایک سنگین خطرہ گردانتے ہوئے بڑی سختی اور تندی وتیزی سے اس کو ٹھکرا دیا تھا' بلکہ اس کو مٹانے کے درپے ہو گئے تھے' بعینہ حال اس وقت اسلام کے بارے میں امریکہ ویورپ کا ہے۔ ان کے الفاظ میں:

I sometime wonder because the values of Islam constitute a potential challenge to many western concepts of spiritual and social life.(۱۵) ...In one way or other, all prophets have challenged the established order of their times; is it therefore, so surprising that almost all of them were persecuted and ridiculed by their kinsfolk and that the latest of them, Muhammad, is ridiculed in the West to this day?(۱۶)

ترجمہ: ''میں بسا اوقات خیال کرتا ہوں کہ اہل مغرب کی اسلام دشمنی کا سب سے بڑا سبب شاید یہی ہے کہ اسلام کی تعلیمات واقدار مغرب کے تہذیب وسماجی تصورات واقدار کو شدید طور سے چیلنج کرتی ہیں. سب نبیوں نے اپنے اپنے طریقہ پر رائج الوقت نظام کو چیلنج کیا تھا۔ اس لیے اس بات پر کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے کہ تقریباً وہ سب ہی اپنی اپنی قوم کے مظالم اور ان کی طرف سے اہانت واستہزاء سے دوچار ہوئے اور یہی وجہ تو ہے کہ پیغمبر آخر الزماں کا نام تو یورپ میں آج تک اہانت واستہزاء کے ساتھ لیا جاتا ہے۔''

اسد نے اسلام سے مغرب کو لاحق جس نفسیاتی خوف اور اندیشوں کا ذکر کیا ہے۔ آرنلڈ جے۔ ٹائن بی بھی

Marfat.com

اس امر کو تسلیم کرتا ہے۔فلسفہ تاریخ کے اس مغربی عالم کے نزدیک کمیونزم کی طرح اسلام ایک ایسی مغرب مخالف تحریک اور قوت ہے کہ جس کی تاخت کا مقابلہ مادی (جنگی) ہتھیاروں سے ممکن ہی نہیں۔[۱۷] ۱۹۹۰ء کی دہائی کے آغاز سے (افغانستان سے سوویت افواج کی واپسی کے بعد سے) مغرب کے حکمران' پالیسی ساز اور دانش ورسب برملا طور سے اسلام کو ایک خطرہ قرار دینے لگے ہیں۔وہ اپنی سابق مسلم نوآبادیات میں احیائے اسلام کی تحریکوں کو ان ممالک میں اپنے اثر ونفوذ اور طویل المدت سیاسی واقتصادی اور تزویراتی مفادات کے لیئے' جب کہ مغربی ممالک میں آباد مسلم اقلیتوں خصوصاً مسلم آبادی میں بلند شرح افزائش کو مغربی تہذیب کے وجود و بقا کے لیے خطرہ گردانتے ہیں۔[۱۸] مزید برآں وہ اس ''مزعومہ خطرہ'' کے انسداد و تدارک کی غرض سے قوت و طاقت اور دھونس کے ہر حربے کے استعمال کو ناگزیر قرار دینے لگے ہیں۔[۱۹] اس ''مزعومہ خطرہ'' کے ازالہ کی غرض سے دنیائے مغرب اور بالخصوص امریکہ کا رویہ انتہائی جارحانہ ہو گیا ہے۔اہل مغرب کے اس طرز فکر و عمل سے محمد اسد کے مذکورہ خیال کی تصویب ہو جاتی ہے۔

استشراق:اہداف و مقاصد اور نتائج واثرات

محمد اسد نے استشراق (Orientalism) کے مبدأ و آغاز' اس کے مقاصد واہداف' اس کی تکنیک' حیلہ طرازیوں اور اس کے اثرات ونتائج کا بھی جائزہ لیا ہے۔ان کی رائے میں استشراق کا تانا بانا صلیبی جنگوں کے دور میں تیار ہوا۔صلیبی جنگوں کے دوران اور ان کے بعد یورپ میں ایک ایسا ادب وجود میں آنا شروع ہوا' جس میں اسلام دشمنی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔اسد نے اس سلسلہ میں قرون وسطیٰ میں یورپ میں وجود میں آنے والی رزمیہ نظم Chanson de Roland کا بطور خاص ذکر کیا ہے' جو صلیبی جنگوں کے دور میں تصنیف ہوئی تھی۔ جس میں جنوبی فرانس میں ''مسلم وحشیوں'' پر عالم مسیحیت کی فتح وظفر مندی کی افسانوی داستان بیان کی گئی تھی اور جو فوراً ہی سارے یورپ کا ایک طرح سے قومی ترانہ بن گئی تھی۔[۲۰] ''یہ کوئی اتفاقی امر نہ تھا کہ اس رزمیہ نظم پر ایسے یورپی ادب کی بنیاد پڑی جو سابقہ مقامی ادبیات سے جداگانہ اور ممتاز حیثیت کا حامل ہے' اس لیے کہ اسلام دشمنی تو مغرب کی گھٹی میں پڑ چکی تھی۔''[۲۱]

اسد کی سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ مغرب میں مطالعہ اسلام یعنی استشراق کی روایت کا آغاز خالصتاً منفی مقاصد کے تحت ہوا۔مسیحی علماء ومبشرین نے اسلام اور عربی زبان وادب سے واقفیت منفی مقاصد کے تحت پیدا کی۔پھر اس واقفیت کو اسلام کے عقائد وتعلیمات' اس کی تاریخ بالخصوص پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وشخصیت اور اسلامی تہذیب وتمدن کے بارے میں اہل مغرب کے ذہنوں میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کی غرض سے ایک حربے کے طور پر استعمال کیا۔[۲۲] اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مستشرقین کا رویہ مخالفانہ ومعاندانہ اور روایتی کینہ پروری پر مبنی ہے جبکہ بدھ مت' ہندومت' اور دیگر مذاہب کے متعلق' رواداری اور غیر جانبداری کا ہے۔وہ ان مذاہب کے متعلق متوازن اور قابل فہم رویہ اختیار کرتے ہیں' لیکن جونہی وہ اسلام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ان کا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے'

Marfat.com

اس میں نفرت کے جذبات اور تعصبات شامل ہوتے ہیں۔ چند مستثنیات کے سوا یورپ کے بیشتر مستشرقین اسلام سے متعلق اپنی تحریروں میں غیر علمی جانبداری کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔ ان کی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کو گویا علمی اور غیر جانبدار تحقیق کے قابل ہی نہیں سمجھا جاتا بلکہ وہ کوئی ملزم ہے جو منصفین (مغربی مستشرقین) کے کٹہرے میں کھڑا ہے۔ چنانچہ بعض مستشرقین تو وکیل استغاثہ کا کردار ادا کرتے ہوئے اس (اسلام) سے اعتراف جرم کرانے پر بضد ہیں۔ کچھ دوسرے ایسے وکیل صفائی کا انداز اپناتے ہوئے کہ جسے پوری طرح سے یقین ہے کہ اس کا مؤکل (اسلام) قصوروار اور مجرم ہے' بڑی نیم دلی کے ساتھ اس کا مقدمہ لڑتے اور نیم دلی کے ساتھ اس کی صفائی پیش کرتے ہیں۔''(۲۳) اسد مستشرقین کے طرز تحقیق اور طریق اخذ و ترتیب نتائج بالفاظ دیگر ان کی تحقیقی تکنیک کو ہرگز لائق اعتبار نہیں گردانتے۔ ان کے خیال میں: ''یورپی مستشرقین نے مطالعہ اسلام اور پھر استنباط واستخراج یعنی اخذ و ترتیب نتائج کے لیے جو تکنیک اختیار کی ہے' اس سے ان مذہبی عدالتوں' جو قرون وسطیٰ میں کیتھولک کلیساؤں نے اپنے مخالفین کو سزائیں دینے کے لئے قائم کی تھیں' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ مستشرقین شاذ و نادر ہی کھلے ذہن کے ساتھ تاریخی حقائق کی تحقیق و تفتیش کرتے ہیں۔ بلکہ اپنی تحقیقات کا آغاز پہلے سے ایک طے شدہ نتیجے (مفروضے)' جو ان کی متعصبانہ سوچ کی پیداوار ہوتا ہے' سے کرتے ہیں۔ وہ اپنے پہلے سے طے شدہ متعینہ نتائج کے اثبات و احقاق کے لیے ایسے شواہد اکٹھے کرتے ہیں جو ان کے من پسند نتائج کی تصدیق و تائید کرتے ہوں اور پھر جب من پسند شواہد ملنے ممکن نہ ہوں تو وہ ان کو سیاق و سباق سے الگ کر کے اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ ان کے طے شدہ موقف کی توثیق ہو۔ اس تحقیق عمل کے دوران میں وہ اپنی کینہ پروری کے سبب دوسرے فریق (مسلمانوں) کے دلائل اور ان کے پیش کردہ شواہد کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ چنانچہ ان کی اس روش اور طریق کار کے نتیجے میں جو وسیع ذخیرہ ادب وجود میں آیا ہے' اس میں ہمیں اسلام اور اس سے نسبت رکھنے والی ہر چیز کی انتہائی مسخ شدہ تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔''(۲۴)

اسد نے مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے اثرات و نتائج کا جائزہ بھی لیا ہے۔ ان کی رائے میں مستشرقین (قدیم و جدید) کی کاوشوں اور ان کے خیالات و تصورات نے عام مغربی ذہنوں کو مسموم کر دیا ہے۔ چنانچہ ان کی تحریریں مغرب میں اسلام کی دعوت و تبلیغ اور اس کی تفہیم کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن گئی ہیں۔ ان مستشرقین کی نگارشات کے زیر اثر عام یورپی و امریکی افراد اسلام کو کسی طور بھی درخور اعتنا نہیں گردانتے۔ وہ اسلام اور اس کی روحانی اور اخلاقی تعلیمات کو کسی بھی نقطہ نگاہ سے کچھ زیادہ وقیع اور قابل احترام نہیں سمجھتے نہ وہ اسے عیسائیت اور یہودیت سے موازنہ کے قابل خیال کرتے ہیں۔(۲۵) مستشرقین نے عام یورپی افراد کے ذہنوں کو زہر آلود بنا دیا ہے۔ مشرف بہ اسلام ہونے سے قبل محمد اسد خود اپنے ماحول کے زیر اثر اسلام کے بارے میں وہی رویہ رکھتے تھے جو عام مغربیوں کا تھا۔ تاہم اپنے مشرق وسطیٰ کے پہلے سفر (۲۴-۱۹۲۲ء) کے بعد یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوئے:

...so many erroneous views about Islam itself were prevalent throughout the West.... My own observations had by

Marfat.com

now convinced me that the mind of the average Westerner held an utterly distorted image of Islam.(۲۶)

ترجمہ: ''اس سے پہلے (مشرق وسطی کے سفراور عربی واسلامی تہذیب ومعاشرت کے عمیق مشاہدہ سے پہلے) اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں میرے جو افکار و تاثرات تھے' ان کو میں طبعی طور پر مغربی حیات وکائنات (Western world-view) کا نتیجہ سمجھتا تھا۔ میں اپنے شعور وخیال سے ہٹ کر کوئی بات سوچ ہی کیسے سکتا تھا۔ میں بہرحال ایک مغربی نوجوان تھا جس کے رگ وریشہ میں یہ عقیدہ پیوست ہوتا ہے کہ اسلام اور اس کی تمام تعلیمات کی حیثیت تاریخ انسانی کے ایک رنگین بغلی دروازے سے زیادہ نہیں' اور جو روحانی اور اخلاقی کسی بھی نقطہ نگاہ سے کچھ زیادہ وقیع اور قابل احترام نہیں۔ اس لیے نہ صرف یہ کہ اس کو اس درجہ پر نہیں رکھا جاسکتا جس کا وہ مستحق ہے' بلکہ اس کو دوسرے مذاہب عیسائیت اور یہودیت سے موازنہ کے قابل بھی نہیں سمجھا جاتا......ایک عام یورپین کے دماغ میں اسلام کی جو تصویر ہے وہ بالکل مسخ شدہ اور بگڑی ہوئی ہے۔''

۱۹۳۰ء کی دہائی کے نصف اول (۱۹۳۴ء) اور پھر ۱۹۵۰ء کی دہائی کے نصف اول (۱۹۵۴ء) میں استشراق کے بارے میں اسد نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا' بالفاظ دیگر انہوں نے استشراق کے نقد واحتساب کی جس روایت کا آغاز کیا تھا بعدازاں یہ عمل ایک اکیڈیمک ڈسپلن کی صورت اختیار کر گیا۔ مغربی مصنف نارمن ڈینئل اور بالخصوص فلسطینی نژاد امریکی دانش ور ایڈورڈ ڈبلیو سعید (م ۲۰۰۳ء) نے اس کو خوب آگے بڑھایا۔ ان دونوں نے مستشرقین کی بدباطنی کا پردہ خوب چاک کیا ہے' ان کے مکروفریب اور دسیسہ کاریوں کو طشت ازبام کیا ہے' ان کو بے نقاب کیا ہے اور انہیں اسلام اور مغرب کے مابین کشمکش کو ہوا دینے کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ (۲۷-الف) نقد استشراق کے سلسلہ میں محمد اسد کو بلاتردد مذکورہ دونوں مصنفین کا پیش رو قرار دیا جاسکتا ہے۔

تہذیب مغرب بمقابلہ اسلام

محمد اسد نے مغربی تہذیب کا ناقدانہ جائزہ بھی لیا ہے۔ اس کے تشکیلی عناصر وعوامل اور جوہری خصائص کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے منفی وتاریک پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے۔ اسلام اور مغربی تہذیب کے مابین جوہری وحقیقی فرق وامتیاز کو واضح کیا ہے۔ (۲۷-ب) مغربی تہذیب کے دیگر تہذیبوں خصوصاً اسلامی تہذیب پر تفوق وبالادستی کے تصور وخیال کی نفی وتردید کرتے ہوئے مسلم ملت کو اس کی تقلید ونقالی کے مضمرات اور نتائج سے آگاہ کیا ہے۔ مزید برآں اس (تہذیب مغرب) سے اخذ واکتساب کے میدانوں اور شعبوں کی نشان دہی کرتے ہوئے اس کے حدود کا تعین بھی کیا ہے۔ ذیل میں ان امور ومسائل پر محمد اسد کے خیالات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

محمد اسد کی رائے میں مغربی تہذیب جس کا تانا بانا اور بنیادی ڈھانچہ یونانی ورومی تہذیبوں کے آثار وباقیات پر استوار ہے' کو ان قدیم تہذیبوں کے جملہ بنیادی خصائص خصوصاً مادیت پرستی' مذہبی اور اخلاقی وروحانی اقدار سے اعراض وانکار' زیادہ سے زیادہ مادی قوت کا حصول' اپنے وطن اور قوم کے لئے کمزور اور محکوم اقوام کا استحصال یعنی

Marfat.com

قومیت پرستی (Nationalism) وغیرہ بہ کمال وتمام منتقل ہوئے ہیں۔[۲۸] چنانچہ جس طرح سے قدیم یونان اور رومن سلطنت کا ذہنی وفکری اور تہذیبی و معاشرتی ماحول کلی طور پر افادیت پسند اور مذہب بے زار (مخالف) تھا' بعینہ جدید مغرب کا تہذیبی وسماجی ماحول افادیت پسند اور مذہب دشمن ہے۔ جدید مغرب کی فکر اگرچہ مذہب کو ایک سماجی روایت کے طور پر تو برداشت کرتی ہے لیکن وہ آسمانی والہامی اخلاقیات کا عملی زندگی سے کوئی تعلق روا نہیں رکھتی۔ مغربی تہذیب صاف طور پر خدا کا انکار تو نہیں کرتی لیکن اس کے موجودہ ذہنی وفکری نظام میں خدا کے لئے کوئی جگہ اور ضرورت باقی نہیں رہی۔ اصولی طور پر مغربی ذہن عملی زندگی سے خدا کو نکال باہر کرنے کی طرف گامزن ہے۔[۲۹]

اسد نے مغربی تہذیب کے بنیادی اجزاء لادینیت (سیکولرازم)' قوم پرستی (نیشنل ازم) اور مادیت و افادیت پرستی (Materialism and Utilitarianism) کے منفی نتائج ومضمرات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ ان کے خیال ورائے میں مغرب نے الہامی رشد وہدایت کی ضرورت کا سختی سے انکار کر کے خود کو کسی مسلمہ ومستند اخلاقیاتی نظام اور خیر وشر' معروف ومنکر اور حق وباطل کے کسی معتبر معیار ومیزان اور کسوٹی سے محروم کر لیا ہے' چنانچہ ذاتی مفاد اور ملکی وقومی مصالح کو تقدس کا درجہ حاصل ہو گیا ہے اور اس نے ایک مذہب اور اخلاقی اقدار کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ مغرب نے آرام وآسائش' دولت اور مادی ترقی کو خدا بنا لیا ہے۔[۳۰] قومیت پرستی' جو مغربی تہذیب کا ایک اہم ستون اور جس نے مغرب میں مذہب کا درجہ اختیار حاصل ہے' نے تو حق وراستی اور عدل وانصاف کے اصولوں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔ اس نے کمزور ومحکوم اقوام کے بے رحمانہ استحصال کو سند جواز فراہم کی ہے۔[۳۱] غرض بے خدا تہذیب نے انسانیت کو اضطراب وانتشار کے علاوہ ایک انتہائی عمیق اخلاقی بحران سے ہمکنار کیا ہے۔[۳۲] محمد اسد کے نزدیک مغربی تہذیب کا ثمرہ ایک ایسی انسانی نسل کی تخلیق ونمود ہے جس کی اخلاقیات (Morality) محض عملی افادیت (Practical Utility) تک محدود ہے اور جس کے نزدیک نیکی وبدی اور حق وباطل کا معیار محض مادی کامیابیاں ٹھہرا ہے۔ جدید مغربی انسان کی سوچ میں بنیادی ستم یہ ہے کہ وہ مادی اشیاء کے علم (سائنس وٹیکنالوجی) اور آسائشات کو انسان کی روحانی واخلاقی ترقی کے متماثل خیال کرنے لگا ہے۔[۳۳] چنانچہ ایک عام مغربی انسان صرف اور صرف ایک ہی ایجابی مذہب سے واقف ہے اور وہ ہے مادی ترقی کی پرستش اور زندگی کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ اور پُر آسائش بنانا۔ جدید یورپی وامریکی انسان کے ہاں بطن پرستی کے علاوہ زندگی کا کوئی اعلیٰ وارفع مقصد وغایت باقی ہی نہیں رہا۔[۳۴] مغربی معاشروں میں مسلمہ اخلاقی اقدار اور فضائل ومحاسن مثلاً اولاد کے لیے محبت اور اس کے لیے ایثار' احترام والدین سب اپنی اصلیت واہمیت کھو چکے ہیں۔ خاندانی نظام شکست سے دوچار ہو چکا ہے۔ مزید برآں قدیم جنسی اخلاقیات (Sexual Morality) تحلیل ہو کر رہ گئی ہے۔ جنسی ضبط وازدواجی وفاداری جدید مغرب میں تو قصہ پارینہ بن چکی ہے اور جنسی ضبط کی جگہ ایک نئی اخلاقیات' جو انسانی جسم کی لامحدود آزادی یعنی جنسی بے راہ روی کی دعویدار ہے' نے لے لی ہے۔[۳۵]

محمد اسد دنیائے مغرب کو عالم دجال اور اس کی تہذیب کو دجالی تہذیب سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے خیال

Marfat.com

میں جس طرح سے دجال یک رخا یعنی ایک آنکھ کی بصارت سے محروم ہوگا اور پھر اپنی شعبدہ بازیوں اور حیلہ طرازیوں کے سبب ضعیف الاعتقاد افراد کے لیے فتنہ و آزمائش کا موجب ہوگا اور اس طرح کے لوگ اسے خدا سمجھ کر اس کی پرستش میں مبتلا ہو جائیں گے [۳۶] بعینہ حال تہذیب مغرب کا ہے (یعنی یک رخی ہے)۔ اس نے انسانی زندگی کے ایک انتہائی اہم پہلو "اخلاقی و روحانی پہلو" کو یکسر نظر انداز کر رکھا ہے۔ چنانچہ وہ انسان کی مادی و جسمانی اور معاشرتی احتیاجات اور اس کی روحانی امنگوں (آدرشوں) کے مابین ہم آہنگی و توازن قائم کرنے میں ناکام رہی ہے۔[۳۷] اس تہذیب نے قدیم مذہبی اخلاقیات سے تو دامن چھڑا لیا ہے تاہم کسی معقول اخلاقی نظام کی آفرینش میں بھی ناکام رہی ہے۔ مزید برآں مغربی تہذیب نے اپنی حیرت انگیز ترقیوں، نت نئی ایجادات اور اپنی ظاہری چمک دمک سے کمزور و پس ماندہ مسلمان اقوام کو مسحور و مرعوب اور ان کی نگاہوں کو خیرہ کر رکھا ہے۔ چنانچہ عالم اسلام ہے کہ اس کی پرستش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اسد کے نزدیک احادیث و روایات میں دجال کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں، وہ مغربی تہذیب و تمدن پر پوری طرح سے منطبق ہوتی ہیں۔ ان کے الفاظ میں:

The world of franjis (Europeans/Occidentals) has become the world of Dajjal, the Glittering, the Deceptive One. It is "one eyed": that is, it looks upon only one side of life--material progress--and is unaware of its spiritual side. With the help of its mechanical marvels it enables man to see and hear far beyond his natural ability and to cover endless distances at an inconceivable speed. And its material advancement is so powerful and so glittering that the weak in faith are coming to believe that it is a godhead in its own right; but those who have remained conscious of their creator clearly recognize that to worship the Dajjal means to deny God--Instead of realizing that man's advancement and the progress of science is a bounty from our Lord, more and more people in their folly are beginning to think that it is an end in itself and fit to be worshipped.[۳۸]

اسد نے پرستش دجال (مغربی تہذیب) کے اثرات و نتائج کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ان کے خیال میں مغربی انسان خدا اور مذہب سے رشتہ توڑ لینے اور پھر دجال پرستی کے سبب اپنی فطرت مسخ کر چکا ہے۔ زندگی اس کے نزدیک ایک معمہ بن چکی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش میں موجود دوسرے انسانوں ہی سے نہیں، بلکہ خود اپنی ذات سے بھی اجنبی و

Marfat.com

بیگانہ ہو چکا ہے اور انتہائی تنہائی سے دوچار ہے۔ وہ داخلی طمانیت اور مسرت و شادمانی سے ناآشنا و محروم اور ایک انتہائی کرب و اذیت میں مبتلا ہے، جس کا اظہار نت نئی سائنسی و فنی ایجادات و ابداعات کی صورت میں رونما ہو رہا ہے۔ کیوں کہ اس (مغربی انسان) نے ہلاکت خیز تنہائی کے احساس کو مٹانے کے لیے خارجی ظواہر میں پناہ ڈھونڈنا چاہی ہے۔ چنانچہ سائنسی علوم و فنون میں ترقی اور دیگر شاندار مادی ترقیاں مغربی انسان کے اخلاقی و روحانی مایوسی (Frustration) اور ایک نامعلوم خوف اور شدید عدم تحفظ کے داخلی احساسات کی پیداوار ہیں۔[۳۹] اسد کے خیال میں الہامی رشد و ہدایت اور کسی مسلمہ اخلاقیاتی نظام اقدار سے محروم مغربی تہذیب و تمدن اپنی تمام تر مادی و سائنسی ترقیوں، نت نئی بے شمار ایجادات و اختراعات کے باوصف انسانیت کو داخلی اطمینان، حقیقی فلاح اور سعادت و مسرت سے ہرگز ہمکنار نہیں کر سکتی بلکہ روحانی و اخلاقی نصب العین سے محروم مغرب کی سائنس اور ٹیکنالوجی انسانیت کے لیے وبال جان بن چکی ہے۔ اس نے انسانیت کو تباہی و ہلاکت کے گڑھے کے کنارے لا کھڑا کیا ہے۔[۴۰] اسد کے نزدیک مغربی تہذیب خودکشی کرنے کے درپے ہے اور بڑی تیزی سے زوال و بربادی کی طرف گامزن ہے۔ ان کی رائے میں مغربی معاشرہ بحیثیت مجموعی گمراہی و کج روی میں مبتلا ہو چکا ہے۔ چنانچہ اگر وہ اپنی موجودہ روش پر قائم رہا اور اس نے اپنے موجودہ طرز فکر و عمل میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ کی اور اس نے اپنا تعلق کسی ماورائی (الہامی) روحانی و اخلاقی نظام سے نہ جوڑا تو اس کی ہلاکت و بربادی ایک یقینی امر ہے۔ محمد اسد کے الفاظ میں:

Western civilization is chaotic and in its innermost self-destructive[۴۱] and can there be any doubt that modern Western society, with its loss of all spiritual convictions and of social morality...... can there be any doubt that this soceity has entirely gone astray from the deepest truths of life and now blindly rushes towards self-destruction?[۴۲] ......As things stand at present, Western civilization is about to expend the last remnants of a moral idealism, subconsciously inherited from its past. Unless it is able to replace those swiftly vanishing remnants by a new, adequate structure of Idealism, it is bound to go to the way of all other worn-out civilizations and to perish in a welter of conflicts, suffering and confusion. And there is no indication as yet that the western world is going to produce out of itself, such a new structure of idealism."[۴۲-ب]

Marfat.com

ترجمہ: ''کیا اس امر میں کوئی شک وشبہ باقی رہ جاتا ہے کہ جدید مغربی معاشرہ کلی طور پر روحانی اذعانات (Spiritual Convictions) اور سماجی و اجتماعی اخلاقیات سے قطعی طور پر تہی دامن ہو چکا ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ مغربی معاشرہ بے راہ روی کا شکار ہے اور زندگی کی ابدی سچائیوں سے بہت دور جا پڑا ہے اور خودکشی و ہلاکت کی طرف بڑی تیزی سے گامزن ہے۔ اگر مغربی تہذیب اور معاشرہ اپنی اسی ڈگر پر قائم رہا اور اس نے جلد اپنا رشتہ کسی روحانی و مذہبی ضابطۂ حیات اور سماجی اخلاقیات کے نظام سے نہ جوڑا تو دنیا کی دیگر تہذیبوں کی طرح یہ بھی انجام کار تباہی و بربادی سے دوچار ہو کر رہے گا۔ تاہم اس وقت تو دور دور اس کے کوئی آثار نظر نہیں آتے کہ مغربی دنیا ازخود کوئی اخلاقی و روحانی نظام وضع کر سکے گی۔''

چنانچہ ان کی رائے میں مغربی اقوام اور ان کی تہذیب و تمدن اور سائنسی علوم و فنون پر قرآن حکیم کے ان الفاظ کا انطباق و اطلاق پوری طرح سے صادق آتا ہے[۴۳]:

مثلهم كمثل الذى استو قد ناراً فلما أضاء ت ماحوله ذهب الله بنورهم و تركهم فى ظلمت لا يبصرونoصم بكم عمى فهم لا يرجعون.[۴۴]

ترجمہ: ''ان کی (عجیب) مثال تو ان کی سی (عجیب) مثال ہے جنہوں نے آگ جلائی پھر جب آگ نے اپنے اردگرد کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی سلب کر لی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہیں (وہ) بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں تو اب وہ واپس نہ ہوں گے۔''[۴۵]

اسد نے مغربی تہذیب و تمدن کے منفی و تاریک پہلوؤں اور اس کے خوفناک انجام سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بہت زیادہ حد تک علامہ محمد اقبال اور الجزائری مفکر مالک بن نبی (۱۹۰۳ء-۱۹۷۳ء) کے خیالات سے مشابہت رکھتے ہیں۔ دونوں ہی کے نزدیک مغربی تہذیب و تمدن انسانیت کو درپیش مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے سے عاجز و قاصر ہے، بلکہ انسانیت کو ہلاکت و بربادی کی طرف دھکیلنے کی ذمہ دار ہے۔ دونوں ہی کو اس تہذیب کا مستقبل بڑا تاریک دکھائی دیتا ہے۔ دونوں ہی کی نگاہ میں یہ تہذیب بڑی تیزی سے اپنے برے انجام کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے۔[۴۶-الف]

مغربی تہذیب کی بالادستی اور تفوق و فضیلت کے تصور کی حقیقت-ناقدانہ جائزہ

محمد اسد نے مغربی تہذیب کے دیگر تہذیبوں بالخصوص اسلامی تہذیب پر تفوق و بالادستی کے تصور کو بڑی شدت سے چیلنج کیا ہے۔[۴۶-ب] بہت سے مغربی دانشوروں، مفکرین[۴۷] اور اہل حکومت[۴۸] کے دعوؤں کے برعکس محمد اسد کا دعویٰ یہ ہے کہ مغربی تہذیب ایک آفاقی و عالمی تہذیب بننے کی قوت و صلاحیت سے قطعاً عاری ہے۔ ان کے خیال میں اخلاقی قوت اور روحانی حکمت سے یکسر تہی دامن اور خیر و شر کے کسی مسلمہ معیار سے محروم و عاری مغربی تہذیب نہ تو انسانیت کو تہذیبی وحدت و یکجائی سے ہمکنار کر سکتی ہے اور نہ ہی اس کے لیے ایک مثالی و آفاقی تہذیب کی حیثیت اختیار کر سکتی ہے۔[۴۸-ب]

Marfat.com

اسد کے الفاظ میں:

With the same arrogance with which they assume that Occidental civilization is the summit of all possible civilizations......(۴۹) Is there any sign that the civilization now dominant in the West contains the promise of leading mankind towards that unity of civilization and culture of which our dreamers dream? There is no such sign. There is not the slightest indication that the West, having lost every trace of ethical wisdom, will be able to solve unaided even its own economic and spiritual problem, not to speak of the problems of all mankind. On the other hand, there is a lot of indication to the contrary. True, Western civilization possesses great physical and scientific power: but it is also true that this power has reached its present peak at the expense of social morality, and that it now threatens to transform the earth into a wilderness; ......the whole social aspect of Western civilization - its entertainments - is overshadowed by the desire to stimulate sexual appetites and to make promiscuity appear "reasonable"; the crass materialism and the worship of money expressed;......and so forth; and lastly, the ethical frustration evident in the lack of any agreement about the meaning of Good and Evil, and the submission, in all social and economic matters, to the rule of "expediency" that painted lady of the streets, willing to please anybody, at anytime, whenever she is invoked: does all this (and much more of the same kind) provides an indication that Western civilization possesses the spiritual quality necessary for becoming the final, ideal civilization of mankind?(۵۰)

ترجمہ: ''اہل مغرب اس تکبر اور گھمنڈ میں مبتلا ہیں کہ ان کی تہذیب دنیا کی تمام تہذیبوں کا منتہائے کمال

Marfat.com

ہے۔ کیا اس بات کے کوئی آثار و قرائن موجود ہیں کہ مغرب میں جس تہذیب کا غلبہ ہے وہ انسانیت کو تہذیبی وحدت، کہ جس کا خواب مغرب کے اہل دانش و اہل سیاست دیکھ رہے ہیں، سے واقعتاً ہمکنار کر سکی گی؟ حقیقت یہ ہے کہ ایسی کوئی علامت اور امکان دور دور تک نظر نہیں آتا۔ اس بات کی ہلکی سی امید بھی نہیں پائی جاتی کہ اخلاقیاتی دانائی (Ethical Wisdom) سے قطعی طور پر محروم اور تہی دامن مغرب ساری انسانیت تو کجا خود اپنے ہی اقتصادی و سماجی، تہذیبی اور روحانی و اخلاقی مسائل کو بھی سلجھا سکے گا۔ یہ سچ ہے کہ مغرب کے پاس بے پایاں مادی و سائنسی قوت موجود ہے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ مغرب نے یہ قوت و طاقت سماجی اخلاقیات کو قربان کر کے حاصل کی ہے چنانچہ مغرب کی یہ قوت و طاقت ساری انسانیت کو ہلاکت و بربادی سے دوچار کرنے کے درپے ہے۔ مغرب کی تہذیب کے جملہ سماجی پہلو اور اس کی تفریحات پر اس خواہش کا غلبہ ہے کہ وہ جنسی اشتہاء کو انتہائی حد تک برانگیختہ کر دے حتیٰ کہ جنسی بے راہ روی لوگوں کی نگاہ میں ایک قبیح و شنیع اور نامعقول و معیوب فعل ہرگز نہ رہے۔ چنانچہ عالم مغرب ہے کہ اندھی مادیت پرستی، دولت کی پرستش، اخلاقیاتی خیبت (Ethical Frustration) میں مبتلا ہے اور اس کے پاس خیر و شر، نیکی و بدی کی کوئی معروضی اور دائمی و ابدی کسوٹی اور معیار و میزان موجود نہیں ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں شخصی اور قومی مصلحت نے خیر و شر کی میزان کی جگہ لے لی ہے۔ مغرب میں گلیوں اور بازاروں میں چلتی پھرتی آراستہ و پیراستہ عورت خود کو ہر اس شخص کے حوالے کرنے اور اس شخص کی دل لگی کا سامان بننے کو ہمہ وقت تیار ہے، جو بھی اس جنس ارزاں کا طالب ہو۔ کیا اس سب کچھ کی موجودگی میں اس بات کا کوئی امکان باقی رہ جاتا ہے کہ مغربی تہذیب ساری انسانیت کے لیے آخری و حتمی اور معیاری و مثالی تہذیب بن سکتی ہے؟"

اسلامی تہذیب و معاشرت کا تفوق و فضیلت

اسد کی رائے میں کسی ایک تہذیب کی دوسری تہذیبوں پر تفوق و فضیلت کا دارومدار سائنسی و طبعی علوم میں اس کی حیرت انگیز ترقی اور نت نئی ایجادات و اختراعات پر نہیں، بلکہ اس امر پر ہوتا ہے کہ اس میں کس قدر اخلاقی قوت و توانائی پائی جاتی ہے۔ نیز اس میں انسانی زندگی کے مادی و جسمانی اور اخلاقی و روحانی پہلوؤں کو باہم منظم و مربوط کرنے اور ان دونوں کے تقاضوں کی تکمیل کے ضمن میں اعتدال و توازن قائم کرنے کی قوت و صلاحیت کس قدر پائی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر اسد کے نزدیک کسی تہذیب کی فضیلت و برتری (دوسری تہذیبوں پر) کا معیار اس کی داخلی اخلاقی و روحانی قوت میں مضمر ہے۔ اسد کے الفاظ میں:

The superiority of one culture or civilization over another does not consist in the possession of a greater amount of material knowledge, but in its ethical energy, in its greater possibility to explain and to co-ordinate all aspect of human life. And in this respect Islam surpasses every other culture.(۵۱)

Marfat.com

خاص اس نقطہ نظر سے وہ (اسد) جب اسلامی تہذیب کا مغربی تہذیب سے موازنہ کرتے ہیں تو انہیں اسلامی تہذیب صرف مغربی تہذیب ہی پر نہیں بلکہ دنیا کی دیگر تمام تہذیبوں پر فائق و برتر نظر آتی ہے جب کہ مغربی تہذیب' اسلامی تہذیب کے مقابلے میں ہیچ اور کم تر نظر آتی ہے۔ اسد بلاشک و تردد اسلام کی اخلاقی' معاشرتی اور تہذیبی اقدار کو مغرب کے تہذیبی و معاشرتی اقدار و تصورات پر ہر ہر اعتبار سے فائق گردانتے ہیں اور اس امر پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ اسلام کی اخلاقیات (Ethics)، انفرادی و اجتماعی اخلاقی اقدار (Morality)' مثلاً عدل و انصاف' اخوت و بھائی چارہ' ایثار و خیر خواہی اور حریت و مساوات کے بارے میں اس کے تصورات مغربی تہذیب کے تصورات سے قطعی طور پر انتہائی ارفع و اعلیٰ ہیں۔ اسلام نے نسلی و قومی عصبیت و منافرت کو منسوخ و متروک قرار دے کر اخوت اور مساوات کے لیے راہ ہموار کی۔ اسلام طبقاتی اونچ نیچ' رنگ و نسل' زبان اور پیشہ کی اساس پر نسل انسانی کے مختلف گروہوں کے مابین امتیاز کی نفی کرتا ہے' جب کہ مغربی تہذیب اب تک نسلی و قومی مخاصمتوں کے تنگ دائروں سے باہر نکلنے میں ناکام رہی ہے۔ تمام مغربی تاریخ یونانیوں اور رومیوں کے عہد سے لے کر آج تک طبقاتی آویزشوں سے عبارت ہے۔(۵۲) اسد کی رائے میں اسلام کا تصور حیات و کائنات اور اس کا معاشرتی و تہذیبی نظام' مغرب کے تصور و طرز حیات اور اس کی سماجی اقدار و روایات سے کہیں زیادہ پُرشکوہ' پُرسکون و بے اضطراب اور فطری و انسانی ہے۔ اسلامی معاشرہ اپنی داخلی قوت' پیوستگی اور سماجی تنظیم و استحکام کے اعتبار سے دیگر تمام انسانی معاشروں اور اقوام پر فوقیت رکھتا ہے۔ قرآن حکیم کی تعلیمات نے اسلام کے تہذیبی و معاشرتی ڈھانچے کو ٹھوس و مضبوط بنیاد فراہم کی ہے۔ جب کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ نے اس کے گرد ایک آہنی بندھن اور زنجیر کس دی ہے چنانچہ بیرونی (اجنبی) تہذیبی و سماجی اقدار کی یورش کے مقابلے میں اسلامی معاشرے کی قوت مزاحمت و مدافعت آج بھی ناقابل تسخیر ہے۔ اسلامی معاشرہ ایک ترقی پسند معاشرہ ہے جو بہت حد تک داخلی آویزشوں سے پاک اور اخوت و بھائی چارے کا علم بردار و آئینہ دار ہے۔(۵۳)

تقلید مغرب

اسد کے نزدیک اسلام محض ایک دین ہی نہیں ہے بلکہ ایک کامل و اکمل تہذیب بھی ہے۔(۵۴) اسلامی تہذیب اپنی نوعیت و ماہیت اور خصائص کے اعتبار سے مغربی تہذیب سے وسیع و عمیق طور سے مختلف ہے۔ اسلام کے اصول و تعلیمات مغربی اقدار حیات سے ہرگز میل نہیں کھاتے جبکہ مغربی تہذیب کے بنیادی اصول و اقدار اسلام کی روح سے متصادم ہیں۔(۵۵) اسلامی تہذیب ایک نظریاتی تہذیب ہے' اس کا منبع و مصدر قرآنی نظریہ حیات و کائنات ہے اور اس کی شناخت بلکہ اس کے وجود کا جواز دین و شریعت سے وابستہ ہے۔(۵۶) اس میں اخلاقی و روحانی اقدار کو دوسری ہر چیز پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کے برعکس مغربی تہذیب اپنے تصورات و مناہج (Perceptions and Methods) کے اعتبار سے کلی طور پر مذہب دشمن ہے۔ نتیجتاً مختلف امور و مسائل میں دونوں تہذیبوں کے رویوں

Marfat.com

اور نقطہ ہائے نظر میں نا قابل عبور خلیج پائی جاتی ہے۔ (۵۷) چنانچہ ان دونوں ''اسلام اور تہذیب مغرب'' کا سنجوگ کسی طور پر ممکن نہیں، نہ ہی دونوں کی بیک وقت پیروی ممکن ہے۔ (۵۸) مغربی تہذیب کے دونوں مرکزی ستون لادینیت (سیکولر ازم) اور قومیت پرستی (نیشنل ازم) تو رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے دین (اسلام) کی روح کے انتہائی منافی ہی نہیں بلکہ اس کی جڑ کاٹ دیتے ہیں۔ (۵۹) اسد کی رائے میں عملی زندگی (انفرادی و اجتماعی) میں تہذیب مغرب کی تقلید کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کو عملی زندگی کی تشکیل و تنظیم میں ایک فیصلہ کن عامل و محرک کی حیثیت سے محروم کر دیا جائے اور اسے محض ایک ایسا روحانی نظام بنا کر رکھ دیا جائے جسے انسانوں کی عملی زندگی سے کوئی سروکار نہ ہو۔ (۶۰) مغربی تہذیب اور اسلام کے مابین موافقت ممکن نہیں۔ مغربی تہذیب کی، نیز اس کے طرز زندگی و طرز معاشرت و نظام سیاست کی تقلید و پیروی اسلام پر، بطور ایک عملی مذہب اور نظام سیاست و حکومت کے، کاری ضرب لگائے بغیر ممکن ہی نہیں۔ غرضیکہ اسلام اور مغربی تہذیب کے مابین موافقت و ہم آہنگی ممکن ہی نہیں:

The moral basis of modern Western civilization is incompatible with Islam......to go further and to imitate Western civilization in its spirit, its mode of life and its social organization is impossible without dealing a fatal blow to the very existence of Islam as a theocratic and a practical religion.(۶۱)

اسد کی رائے میں تہذیب مغرب کے بے قید و بند اخذ و قبول یعنی مغربیت و غرب زدگی (Westernization) کا عمل اسلام کے بنیادی مذہبی و اخلاقی، تہذیبی و سماجی اور سیاسی اصول و اقدار سے بتدریج دستبرداری کا راستہ ہموار کرتا ہے۔ چنانچہ کسی بھی شخص کا مغربی تہذیب، جو مذہبی نقطہ نظر اور رویے کی مخالف و دشمن ہے، کے مزاج سے ہم آہنگی پیدا کر کے دین و شریعت پر قائم رہنا ایک امر محال ہے۔ (۶۲) مغربی تہذیب و معاشرت و طرز زندگی کی انفرادی و اجتماعی طور پر تقلید و نقالی میں بلاشک و تردد اسلامی تہذیب کے وجود و بقا اور اس کے احیائے نو کے لئے ایک عظیم خطرہ پنہاں ہے۔ (۶۳) چنانچہ آج اگر عالم اسلام مغربیت کے بڑھتے ہوئے رجحان و میلان کے سبب اپنے ماضی سے بیگانہ و نا آشنا اور اپنی تہذیبی و روحانی اساس و خودارادیت سے محروم ہوتا چلا جا رہا ہے (۶۴) تو یہ کوئی اچنبھے کی بات بھی نہیں ہے کیونکہ مغرب کی تہذیبی و معاشرتی اقدار اور طور طریقوں اور عادات و اطوار کی نقالی کا انجام بالآخر مغربی نظریہ حیات و کائنات کو قبول کرنے اور اسلامی نظریہ حیات سے دستبرداری کی صورت میں ہی نکلتا ہے۔ (۶۵) محمد اسد دنیائے اسلام کو اس کی موجودہ زبوں حالی و پستی اور پس ماندگی سے نکال باہر کرنے کے لیے مغربیت/غرب زدگی (Westernization) کی روش کو ہرگز طور پر دانش مندانہ طرز فکر و عمل خیال نہیں کرتے۔ (۶۶) انہوں نے مقلدین مغرب یعنی دنیائے اسلام میں سیکولر ازم اور مغرب کی تہذیب و معاشرت کی ترویج و اشاعت کے علمبرداروں پر بھی شدید نقد کیا ہے اور انہیں کوتاہ نظر و کوتاہ اندیش بتلایا ہے۔ ان کی رائے میں مقلدین

Marfat.com

مغرب اسلام کی روح اور اس کی حقیقت سے بیگانہ و نا آشنا ہیں اور ساتھ ہی مغربی تہذیب وتمدن کی روح اور اس کی حقیقت و ماہیت خصوصاً اس کے تاریک پہلوؤں کے ادراک سے بھی عاری ہیں۔ان کی نگاہیں مغربی تہذیب وتمدن کی ظاہری چمک دمک سے خیرہ ہو چکی ہیں۔(٦٧)

محمد اسد نے تجدد و مغربیت کے داعیوں کی ذہنی نفسیات اور ان کے تخلیق کردہ علمی و ادبی ذخیرے کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ذہنوں پر منفی اثرات کا جائزہ بھی پیش کیا ہے' بالخصوص حدیث وسنت کی حجیت کے انکار اور دین کے دیگر مسلمات کے بارے میں ان کے طرز فکر کا نقد و احتساب بھی کیا ہے۔ان کے خیال میں ''روشن خیال'' مقلدین مغرب' جو مغرب کے جدید افکار و خیالات سے مرعوب و متاثر اس کی تہذیب وتمدن اور طرز زندگی وطرز معاشرت کے گرویدہ و دلدادہ ہیں' اسلام کے احکام وتعلیمات کی من مانی تعبیر وتشریح کر کے بلکہ ان کو توڑ مروڑ کر اول الذکر کے ساتھ ان کی کامل ہم آہنگی و موافقت ثابت کرنے کے لئے سرگرداں ہیں۔ان کی اس ذہنی سرگرمی کا مدعا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کسی نہ کسی طرح سے مغربیت یعنی تقلید مغرب کے رویے کو مذہبی جواز فراہم کر دیا جائے۔(٦٨) اسد رقم طراز ہیں:

> ''مسلمان متجددین و مصلحین کے دل و دماغ پر مغربی افکار و خیالات کا اس قدر غلبہ ہو گیا ہے کہ مغربی تہذیب وتمدن کی فضیلت و برتری کا تصور تو گویا ان کے عقیدہ و اذہان کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔چنانچہ وہ لاشعوری طور پر اسلام کے اصول و مقاصد کو مغرب کے فکر و فلسفہ اور اقدار و روایات سے ہم آہنگ کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔وہ اسلام کی ایسی ہر ہر تعلیم جو انہیں تقلید مغرب کی راہ میں رکاوٹ بنتی معلوم ہوتی ہے' کے بارے میں دور از کار تاویلات سے کام لیتے ہیں خصوصاً حدیث وسنت کے ذخیرے کو ساقط الاعتبار قرار دے کر مسترد کر دیتے ہیں۔''(٦٩)

اسد کی رائے میں مقلدین مغرب کے تخلیق کردہ عذر خواہانہ علمی و ادبی ذخیرے نے مسلم افراد کے دل و دماغ میں اپنے دین' تہذیب وتمدن و تاریخ اور طرز حیات و معاشرت کے بارے میں احساس کمتری کو پروان چڑھایا ہے۔اسلامی اصول و اقدار کے مطابق معاشرہ و ریاست کی تعمیر جدید پر ان کے عزم و ایمان کو مجروح کیا ہے اور اسے ضعف سے دوچار کیا ہے جبکہ تعلیم یافتہ طبقات میں مغربی تہذیب و معاشرتی' طرز سیاست و حکومت اور نظام تعلیم کی غلامانہ تقلید اور اندھی نقالی کے رجحان کو تقویت پہنچائی ہے۔(٧٠) اسد کے خیال میں متجددین و مقلدین مغرب کے افکار و خیالات اور ان کی علمی و ادبی سرگرمیاں عالم اسلام کے جدید تعلیم یافتہ طبقات میں ذہنی و فکری ارتداد کا بڑا سبب و محرک بنی ہیں۔چنانچہ اسلام کی قوت و صلاحیت پر ان کے اعتماد کو ضعف اور گزند پہنچا ہے اور تجدد و مغربیت کا عمل' جو گذشتہ ڈیڑھ دو صدیوں سے جاری ہے' احیائے اسلام کی راہ میں ایک کوہ گراں بن گیا ہے۔اسد کے الفاظ میں:

On the whole these "reformist" activities resulted in

Marfat.com

subordinating the ethics of Islam to the views prevalent in Europe: and so they merely deepened the uneasy feeling of inferiority in the Muslims and still further undermined their belief in the possibility of a reconstruction of their society on truly Islamic lines. While the misguided, though well intentioned, endeavours of our early "liberals" udermined the Muslims' belief in possibility of an Islamic revival, the cultural masquerade of their successors is based on conscious or sub-conscious denial of the desirability of such a revival: ......for our fashionable Muslim gentlemen have grown accustomed to confusing "modernity" with an apping of Western customs and any attempt to make the *Shari'ah* of Islam a basis of our social life is dismissed by them as "reactionary."(۷۱-الف)

ترجمہ: ''یہ مقلدین مغرب جدیدیت (Modernity) کو مغربی عادات واطوار کی اندھی و بہری تقلید کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں اور شریعت اسلامیہ کو اجتماعی زندگی کی اساس بنانے کی ہر کوشش کو ''رجعت پسندی'' کہہ کر سختی سے مسترد کر دیتے ہیں...... دوسرے درجے کے معذرت خواہانہ ادب نے مسلمانوں میں مغرب کی کورانہ تقلید کے رجحان کو تقویت پہنچائی ہے۔ اس نوع کے ادب نے اسلام کی عملی تعلیمات کا صریح طور پر انکار تو نہیں کیا تاہم یہ دکھانے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شریعت کو مغربی دنیا کے سماجی اور معاشی نظریات کا تابع ضرور بنایا جا سکتا ہے۔ یوں اس ادب نے مغرب کی تہذیب اور اس کی معاشرتی اقدار کی تقلید کو جائز اور روا قرار دیا ہے اور اسلام کے اہم ترین اور بنیادی معاشرتی اصولوں سے بتدریج دستبرداری کی راہ ہموار کی ہے...... کسی بیرونی تہذیب کی تقلید کا رجحان احساس کمتری سے پیدا ہوتا ہے۔ ان مسلمانوں کا جو مغربی تہذیب کی تقلید کرتے ہیں یہی اور صرف یہی معاملہ ہے۔ مقلدین مغرب...... تہذیب مغرب سے مرعوب ومسحور یہ افراد جب مغربی تہذیب کی قوت' اس کی سائنسی ترقیوں اور فنی ہنر مندی اور اس کی سطحی وظاہری آب وتاب کا موازنہ دنیائے اسلام کی موجودہ قابل افسوس پستی اور زبوں حالی سے کرتے ہیں تو اس بات کا یقین کرنے لگتے ہیں کہ ہمارے موجودہ دور میں مسلمانوں کے لیے مغربی طور طریقوں کی تقلید ونقالی کے علاوہ اور کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے۔ اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کے لیے اسلام کو مورد الزام ٹھہرانا ان کی عادت بن گئی ہے۔ یہ ہمارے نام نہاد ''روشن خیال'' دانش ور اور صاحبان عقل وخرد معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور خود اپنے آپ کو اور دوسروں کو بھی یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام اور مغربی تہذیب میں کامل موافقت و ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور ان دونوں میں کوئی فرق واختلاف نہیں پایا جاتا۔''(۷۱-ب)

Marfat.com

مختصر یہ کہ محمد اسد مسلمانوں کے اسلامی تشخص وتہذیبی خود ارادیت کے تحفظ و بقا ہی کے لیے نہیں بلکہ خود احیائے اسلام کی غرض سے مغربی تہذیب کی تقلید سے چھٹکارے کو از حد ضروری خیال کرتے ہیں۔ان کی رائے میں اگر مسلمان واقعی طور پر سچے دل سے اسلامی اقدار کو محفوظ رکھنا اور ان کو حیات تو بخشنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ مغربی تہذیب کی تقلید ونقالی کا سودائے خام یکسر اپنے دماغ سے نکال دیں' کیونکہ مغربی تہذیب کے ذہنی اثر سے اسلام کو جونقصان پہنچ رہا ہے یا پہنچے گا وہ اس تہذیب کی تقلید سے حاصل ہونے والے نفع کے مقابلے میں کہیں زیادہ بھاری ہو گا۔ (۷۲)

مغربی تعلیم

اسد نے جدید مغربی تعلیم کی نوعیت و ماہیت' اس کے خصائص اور مسلم معاشرہ پر مرتب ہونے والے اس کے اثرات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ان کی رائے میں جدید مغربی نظام تعلیم' جو دراصل یورپ کے مذہبی' تہذیبی و سماجی اقدار وتصورات' اس کے تصور انسان و کائنات اور اس کے مخصوص تاریخی تجربات پر مبنی ہے' اپنی ماہیت کے اعتبار سے مذہب وروحانیت کا دشمن ہے۔ (۷۳) چنانچہ اس بات کی توقع ہرگز نہیں کی جاسکتی کہ مسلم نوجوانوں کو دی جانے والی یہ مغربی تعلیم اسلام دشمن مؤثرات سے پاک ہوگی۔مغربی تعلیم لازمی طور پر مسلمانوں کی نوجوان نسل کے حاسہ دینی کو کمزور کر دیتی ہے۔حضور رسالت مآبؐ کے لائے ہوئے دین پر ان کے ایمان و یقین اور اسلام کی مخصوص دینی تہذیب اور اس کی نظام معاشرت وسیاست پر ان کے اعتماد کو ضعف سے دوچار کر دیتی ہے' گویا یہ ان کے دینی وفکری ارتداد کا موجب بن جاتی ہے۔ (۷۴) اسد کے خیال میں جدید مغربی تہذیب کا ذہنی وفکری ماحول اس قدر شدید طور سے مذہب دشمن ہے کہ وہ مسلمانوں کی نئی نسل کی مذہبی صلاحیتوں اور امکانات پر خبیث عفریت کی طرح مسلط ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مسلم نوجوانوں کو دی جانے والی مغربی طرز کی تعلیم کا نتیجہ یقیناً یہی برآمد ہوگا کہ یہ نوجوان آگے چل کر مذہب دشمنی کا رویہ اختیار کر بیٹھیں گے۔ (۷۵)

محمد اسد مسلم ممالک میں مغربی تعلیم کی ترویج واشاعت کو ان ممالک میں اسلامی تہذیب ومعاشرت کے احیائے نو کی راہ میں سب سے بھاری رکاوٹ خیال کرتے ہیں۔ (۷۶) وہ مغربی طرز کے جدید اسکولوں میں یورپی فلسفہ' ادب اور تاریخ کی تعلیم وتدریس کو بے حد مضر خیال کرتے ہیں۔گوکہ وہ مغربی زبانوں کی تعلیم کے خلاف ہرگز نہیں۔ان کی رائے میں یورپی ادب یورپی اقوام کی تہذیب ومعاشرت اور ان کے ذہنی وفکری میلانات ورجحانات کا عکاس اور آئینہ دار ہے۔یورپی ادب تعصب اور جانب داری سے معرا نہیں' اس میں یورپ کی مذہبی اور تہذیبی ومعاشرتی اقدار اور ان کے ذہنی رویے کے بارے میں جو بے پناہ مبالغہ آرائی کی گئی ہے وہ خام اور ناپختہ ذہنوں کو پورے طور پر اخذ و قبول کر لینے پر مائل کرتی ہے۔اس طرح مغربی تہذیب کے ساتھ نہ صرف یہ کہ افلاطونی محبت وگرویدگی (Platonic Adoration) کا میدان ہی تیار ہو جاتا ہے بلکہ اس تہذیب' جو روح اسلام کے منافی ہے' کی عملاً تقلید کے لئے راہیں ہموار ہو جاتی ہیں۔چنانچہ آج مسلم اداروں میں یورپی ادب کی تعلیم جس صورت میں مروج ہے وہ مسلم نوجوانوں

Marfat.com

کو اسلام سے اور اس کی تہذیب و معاشرت سے بیگانہ و اجنبی بنا دینے کا سبب بن رہی ہے۔(۷۷) اسد کی رائے میں یورپی تاریخ میں ''رومی بمقابلہ وحشی'' کا قدیم تصور پوری طرح سے سمویا گیا ہے۔ اہل یورپ نے تاریخ کو تعبیر و تشریح کا ایسا اسلوب و منہج اختیار کیا ہے کہ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یورپی اقوام اور ان کی تہذیب دنیا کی دیگر اقوام اور ان کی تہذیبوں سے ارفع و اعلیٰ ہیں۔ اس سے ماضی دنیا میں اہل یورپ کی جستجوئے اقتدار اور غلبہ و استیلاء کو ایک طرح سے اخلاقی جواز مل جاتا ہے۔ چنانچہ اس نوع کی تاریخ کے مطالعہ سے نوخیز مسلم نوجوان عظمت یورپ کے قائل ہو جاتے ہیں اور خود اپنی تہذیب، اپنے دین اور اپنے ماضی کے بارے میں مایوس ہو جاتے ہیں۔ اس طرح مسلم اداروں میں یورپی تاریخ کی تدریس و تعلیم کے ذریعے گویا مسلم نوجوانوں کو اپنے ہی حال اور مستقبل کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھنے اور مغربی آدرشوں (Ideals) کے سامنے تسلیم و سپردگی کی باقاعدہ تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔(۷۸-الف) اسد بغیر کسی ترمیم و اصلاح کے مسلم ممالک میں مغربی تعلیم کی ترویج و اشاعت کے نتائج و مضمرات کا جائزہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> ......through the instrumentality of Western schools and of Western-oriented methods of education in the Muslim world, the distrust of Islam as a social doctrine is being systematically planted in the minds of the younger generation of Muslim men and women.(۷۸-ب)

ترجمہ: ''مغربی درس گاہوں کے ذریعے سے نیز اسلامی دنیا میں مغربیوں کے جاری کردہ طریق تعلیم کے ذریعے سے اسلام کے خلاف بے اعتمادی پیدا کی جارہی ہے۔ مردوں اور عورتوں کی نئی نسل کے ذہنوں میں منظم طریق پر یہ عقیدہ بٹھایا جارہا ہے کہ اسلام کے عمرانی اصول قابل اعتماد و قابل عمل نہیں۔''

محمد اسد مسلم نوجوان نسل کو ذہنی و فکری ارتداد سے بچانے نیز دین اسلام اور اس کی تہذیب پر ان کے اعتماد و ایقان کو راسخ و مستحکم کرنے کی غرض سے مسلم ممالک میں رائج جدید مغربی نظام تعلیم کی بھی تشکیل نو چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ جدید مغربی طرز کے اسکولوں کے نصابات میں ترمیم و اصلاح کا ایک خاکہ بھی تجویز کرتے ہیں۔ وہ ان سکولوں کے نصابات میں یورپی فلسفہ، ادب اور تاریخ کی تعلیم و تدریس کو فائق و برتر حیثیت دینے کو ہرگز مناسب خیال نہیں کرتے البتہ وہ مغربی زبانوں کی تدریس کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے۔ اسد کہتے ہیں:

> ''اگر مجھے ایک ایسی مثالی مجلس تعلیم جو صرف اسلامی ملحوظات (Considerations) کے تابع ہوتی ہو، کے سامنے اپنی تجاویز کو پیش کرنے کا موقع میسر آتا تو میں اس بات پر بہت زور دیتا کہ مسلم اسکولوں میں مغرب کی تمام ذہنی

Marfat.com

تحصیلات میں سے صرف علوم فطرت (Natural Sciences) اور ریاضی کی تعلیم دی جائے اور ان اسکولوں کے تعلیمی نصاب میں آج جو برتر و غالب حیثیت یورپی فلسفہ، ادب اور تاریخ کو حاصل ہے وہ یک قلم موقوف کر دی جائے۔ جہاں تک یورپی ادب کا تعلق ہے اسے نظر انداز تو نہیں کرنا چاہیے البتہ نصاب میں اس کا حصہ بھی اتنا ہی رہے جو کسی مغربی زبان کی تعلیم کے لئے ضروری ہو۔"(۷۹)

اسد نے مسلمانوں کی نوجوان نسل کے ذہنوں میں اسلامی شعور کی بیداری اور مغربی تعلیم کے مذموم و مہلک اثرات کے سد باب کے لئے متبادل اقدامات بھی تجویز کیے ہیں۔ وہ اس نظام تعلیم میں شامل فاسد و مضر اجزاء کو نکال باہر کر کے اس میں ایسے اجزاء شامل کرنا چاہتے ہیں جو مسلم نوجوان نسل کے دل و دماغ میں عقیدہ و ایمان کی آبیاری کر سکیں۔ ان کی رائے میں مسلم اسکولوں میں یورپی ادب کی تعلیم کی جگہ ایک معقول و متمیز اسلامی ادب کو دی جائے کہ جس کے ذریعے سے طلبہ کو اسلامی تہذیب و ثقافت کے تعمق و ثروت سے روشناس کرایا جا سکے اور اس کے مستقبل کے بارے میں ان کے دلوں میں امید کی ایک جوت جگائی جائے۔(۸۰) اسد خالص مسلم نقطہ نگاہ سے دنیا کی ایک تاریخ کی ترتیب و تدوین کے تصور کے علمبردار ہیں۔ ان کے خیال میں اگر یہ اہم علمی کام انجام نہ دیا گیا اور اسلام، مسلمانوں اور ان کی تہذیب و ثقافت کے بارے میں تعصب اور نفرت و حقارت سے مملو یورپی تاریخ کی تعلیم و تدریس سے ہماری نئی پود کے ذہنوں کی آبیاری کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہا تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ ہماری نوجوان نسل کا اپنے مذہب، اپنی تاریخ اور اپنی تہذیب و ثقافت کے بارے میں احساس کمتری شدید سے شدید تر ہوتا چلا جائے گا اور وہ اس احساس کمتری کو قابو میں لانے کے لئے مغربی تہذیب و ثقافت کو بہ تمام و کمال اخذ و جذب کر لیں گے اور اپنی زندگی میں سے اسلام کو باہر نکالنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔(۸۱)

مغربی طرز تعلیم کے بارے میں اسد کا یہ تجزیہ جوان کے ذاتی تجربات و مشاہدات 'ترکی، ایران، ہندوستان وغیرہ میں مغربی تعلیم کی ترویج اور اس کے پیدا کردہ نتائج سے متعلق' پر مبنی ہے، بہت حد تک مبنی بر حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ گذشتہ سوا سو سال سے مسلم دنیا کے جدید تعلیم یافتہ طبقات کے دین اسلام کے احکام و تعلیمات اور اس کی تہذیبی و سماجی اقدار و روایات سے انحراف و روگردانی نے تو اسلام کے خلاف بغاوت کی سی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہ طبقات اسلام، فقہ و شریعت اور اس کی تہذیب و تمدن کو ناکارہ و فرسودہ خیال کرتے ہیں اور مسلم معاشروں کی موجودہ پس ماندگی و خستہ حالی سے فلاح و نجات مغرب کی تہذیبی و سماجی اقدار اور اس کے سیاسی و اقتصادی نظام کی مطلق تقلید و نقالی میں خیال کرتے ہیں۔ یہ طبقات مسلم ممالک میں اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں کی تعمیر و تشکیل نو میں اسلام کو کوئی مؤثر کردار دینے کو ہرگز آمادہ نہیں۔ ترکی، مصر، الجزائر، لیبیا، مراکش، تیونس، انڈونیشیا اور خود وطن عزیز پاکستان کے مقتدر طبقات، جنہوں نے جدید مغربی طرز کے ملکی اور غیر ملکی تعلیمی اداروں میں تعلیم پائی ہے، کا اسلام کے احکام و تعلیمات اور اس کے تہذیبی و سماجی اقدار کے بارے میں معاندانہ و سرکشی کا رویہ اس امر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔(۸۲) اس حقیقت

Marfat.com

یعنی جدید مغربی تعلیم کے مفاسد کا ادراک علامہ محمد اقبال کو بھی تھا' چنانچہ انہوں نے مغربی طرز تعلیم کی خامیوں اور کمزوریوں اور ان کے منفی نتائج و ثمرات کو خوب آشکارا کیا تھا (۸۳) اور تو اور خود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' جس کے مؤسس سر سید احمد خاں مغربی تہذیب و معاشرت اور نظام تعلیم کی ترویج و اشاعت کے علمبردار اور پُر جوش داعی تھے' کے ذمہ داروں کو بیسویں صدی کے ربع اول کے بعد سے اس حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا کہ اس یونیورسٹی کے فضلاء کی اکثریت الحاد و دہریت میں مبتلا ہے۔ چنانچہ اصلاح احوال بالفاظ دیگر طلبہ کے اندر حقیقی اسلامی سپرٹ پیدا کرنے کی غرض سے نصاب تعلیم میں دینیات کے عنصر کو پہلے کی بہ نسبت کچھ بڑھانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ یونیورسٹی کے ذمہ داروں کا خیال تھا کہ اس طرح سے طلبہ کے اندر الحاد و لادینیت کے بڑھتے ہوئے رجحان کے آگے بند باندھا جا سکتا ہے۔(۸۴)
محمد اسد نے جدید مغربی طرز تعلیم کے مہلک اثرات کے سدباب کے لئے جو لائحہ عمل تجویز کیا ہے وہ اس لائق ہے کہ اس پر فوری توجہ دی جائے۔ اسکولوں میں اسلامی ادب کی مؤثر تعلیم و تدریس اور تاریخ عالم کی اسلامی نقطہ نگاہ سے تدوین جدید سے متعلق ان کی تجاویز بھی مسلم دانشوروں اور محققین کو دعوت غور و فکر دیتی ہیں۔ ان کے دو معاصرین سید ابوالحسن علی ندوی اور سید قطب شہید نے بھی اسلامی ادب کے نظریے کے علاوہ تاریخ کی تدوین جدید کے خیال کی ترجمانی کی ہے۔(۸۵)

مغربی تہذیب و تمدن سے اخذ و اکتساب اور اس کے حدود

مغربی تہذیب و تمدن اور نظام تعلیم پر محمد اسد کی تند و تیز تنقیدات اور پھر اس کی تقلید و نقالی کے بارے میں ان کے مذکورہ تجزیے کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلم اقوام مغربی تہذیب و تمدن کے بارے میں کون سا رویہ اختیار کریں کہ وہ اپنے معاشروں میں موجود غربت و افلاس اور پس ماندگی سے چھٹکارا پا سکیں' جدید سائنسی ترقیوں کے ثمرات سے مستفید ہو سکیں اور ساتھ ہی اپنے اسلامی و تہذیبی تشخص کے تحفظ و بقاء کو بھی یقینی بنا سکیں۔ یہ ایک بہت اہم اور توجہ طلب مسئلہ ہے۔ سید ابوالحسن علی ندوی نے کئی دہائی پہلے (۱۹۶۳ء) اس مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت کے بارے میں لکھا تھا:

> ''میرے نزدیک یہی اس وقت مسلم ممالک کا سب سے بڑا اور حقیقی مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ نہ فرضی ہے نہ خیالی مسلم ممالک کی اندرونی کمزوریوں اور مغربی تہذیب کے نفوذ و استیلاء کی کیفیت نے (جس کی نظیر تہذیب انسانی کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی)' ان ممالک کے مادی و سیاسی اقتدار نے سارے مسلم ممالک کے سامنے اس مسئلہ کو نہایت روشن سوالیہ نشان بنا کر کھڑا کر دیا ہے' جس کا جواب سب کو دینا ہے اور اس سگنل کے بغیر کسی ملک کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ مغربی تہذیب کے بارے میں یہ ممالک کیا رویہ اختیار کرتے ہیں اور اپنے معاشرے کو موجودہ زندگی سے ہم آہنگ بنانے اور زمانہ کے قاہر تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کون سی راہ اختیار کرتے ہیں اور

Marfat.com

اس میں کس حد تک ذہانت و جرأت کا ثبوت دیتے ہیں؟ اسی سوال کے جواب پر اس بات کا انحصار ہے کہ دنیا کے نقشہ میں ان قوموں کی نوعیت کیا قرار پاتی ہے' ان ملکوں میں اسلام کا مستقبل کیا ہے اور وہ اس زمانہ میں اسلام کے عالمگیر و ابدی پیغام کے لیے کہاں تک مفید ہوسکتے ہیں؟ اس بات کی عرصہ سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ اس مسئلہ کا علمی و تاریخی جائزہ لیا جائے اور ایک حقیقت پسند مفکر کی حیثیت سے نظر ڈالی جائے اور افراط و تفریط سے بچ کر اس کا تجزیہ کیا جائے کہ اسلامی معاشرہ کے لئے (جس کے لئے نہ صرف اسلام کے عقائد و اخلاق اور نظریہ حیات کی پابندی ضروری ہے بلکہ اپنے منصب کے لحاظ سے دعوت و امامت اور احتساب کائنات بھی اس کا فریضہ ہے) ترقی کرنے اور زندگی کے رواں دواں قافلہ کے ساتھ جانے کے لیے صحیح اور معتدل راہ کیا ہے؟ آج تمام مسلم ممالک کو سب سے زیادہ اسی مخلصانہ مشورہ کی ضرورت ہے' اس سلسلہ میں ذرا سی غلطی اور تھوڑی سی بے اعتدالی ان کو کہیں سے کہیں لے جاسکتی ہے۔''(۸۶)

سید ابوالحسن علی ندوی نے امت مسلمہ کو درپیش جس انتہائی اہم ترین مسئلہ کا ذکر آج (۲۰۰۶ء) سے تقریباً تینتالیس سال پہلے (۱۹۶۳ء میں) کیا تھا وہ مسئلہ نہ صرف یہ کہ آج بھی زندہ و توانا ہے بلکہ اس نے اب پہلے سے بھی کہیں زیادہ اہمیت اختیار کرلی ہے۔ غیرملکی استعماری طاقتوں کی طرف سے مسلم ممالک میں تعلیمی وسماجی اور سیاسی اصلاحات کا مطالبہ زور پکڑ گیا ہے۔ مغربی طاقتوں کے دبدبے سے مرعوب اور قوت ایمانی وحمیت ملی سے محروم مسلم حکومتیں اپنے اقتدار کے تحفظ و استحکام کی غرض سے ان مغربی طاقتوں کے متعینہ ایجنڈے کے مطابق اصلاحات خصوصاً تعلیمی نظام کی سیکولرائزیشن کی طرف گامزن ہیں اور بزور قوت مغرب کی تہذیبی وسماجی اقدار کو مسلم معاشروں پر مسلط کرنے کے درپے ہیں۔ گذشتہ صدی ڈیڑھ صدی کے دوران میں مغربی تہذیب وتمدن سے اخذ و اکتساب کے بارے میں جو رویے سامنے آئے وہ زیادہ تر افراط و تفریط-یعنی مغربی تہذیب وتمدن کی کامل تقلید و نقالی یا پھر اس کے مکمل استرداد کے مظہر تھے۔(۸۸) بلاشبہ بعض ارباب دانش نے خذ ما صفا دع ما کدر کے اصول کو اپناتے ہوئے افراط و تفریط کے رویوں سے ہٹ کر ایک درمیانی راستہ تلاش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔(۸۸) تاہم سنجیدہ علمی وفکری حلقوں کے ہاں اب بھی یہ احساس پایا جاتا ہے کہ مغرب کی تہذیب وتمدن سے اخذ و اکتساب کے بارے میں ماضی میں امت مسلمہ کا رویہ معتدل ومتوازن اور حقیقت پسندانہ نہیں رہا۔ اس ضمن میں مولانا ابوعمار زاہد الراشدی مدیر ماہنامہ ''الشریعۃ'' (گوجرانوالہ) کا یہ بیان قابل ذکر ہے:

''مغرب کی لادینی جمہوریت ہو' مطلق جمہوریت ہو یا اس کی مجموعی تہذیب وترقی ہو' اس پر مسلم امہ کا رد عمل حقیقت پسندانہ ہے اور حالات کے معروضی تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ہمارا ردعمل دو انتہاؤں کے درمیان

Marfat.com

پنڈولم (Pendulum) بنا ہوا ہے۔ ایک طرف اسے مکمل طور پر قبول کر لینے کی بات ہے اور دوسری طرف اسے مکمل طور پر مسترد کر دینے کا جذبہ ہے' ہمارے ردعمل کے اس پنڈولم کو درمیان میں قرار کی کوئی جگہ نہیں مل رہی اور یہی ہمارا اصل المیہ ہے۔''(۸۹)

مولانا زاہد الراشدی کے خیال میں مغرب کی تہذیبی وسیاسی یلغار کا راستہ روکنے یا پھر اس کی زد سے اپنی تہذیب وثقافت کو بچانے کے لئے ہمارے دینی اور علمی وفکری حلقوں کا جو ردعمل سامنے آیا یا آ رہا ہے' اس کا وہ رخ تو یقیناً خطرناک ہے جس میں مغرب کے سامنے سپر اندازی اور اس کے فلسفہ ونظام کو مکمل طور پر قبول کرنے کی تلقین کی جا رہی ہے لیکن وہ رخ بھی اس سے کم خطرناک نہیں جس میں مغرب کی ہر بات کو رد کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔(۹۰) تحریک اسلامی کے ایک ممتاز دانش ور ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کے نزدیک بعض امور ومسائل ایسے ہیں جن پر غور وبحث کی ضرورت باقی ہے۔ خاص طور پر یہ امر اب بھی وضاحت طلب ہے کہ اسلام پر قائم رہتے ہوئے دور جدید کے مسلمان انسانی عقل وتجربہ اور معاصر نظاموں سے اخذ وترک کا طریقہ کس حد تک اختیار کر سکتے ہیں۔ کیا اسلام ہر اعتبار سے خود کفیل ہے اور دنیا کی اسلامی تعمیر نو میں کسی اور ماخذ سے رہنمائی حاصل نہیں کرنی ہے۔ کیا فرد کی تربیت معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل کے باب میں مغرب کا ہر طریقہ مردود ہے اور ہم اپنا طریق کار تمام تر اپنے ماضی کی روشنی میں خود مرتب کر سکتے ہیں۔(۹۱) مسئلہ کی نزاکت اور اہمیت کے پیش نظر یہ امر بے حد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محمد اسد ایسا نو مسلم دانش ور جو مشرق ومغرب کے مزاج اور ان کی روح سے بخوبی آگاہ وباخبر ہے اور جسے جدید دنیائے اسلام کے مسائل سے بھی بخوبی واقفیت حاصل ہے' کا اس باب میں مؤقف معلوم کیا جائے' یعنی یہ معلوم کیا جائے کہ وہ (اسد) مغربی تہذیب وتمدن' تجربی علوم اور مغرب کی سائنسی ایجادات واختراعات اور سماجی وسیاسی تجربات واجتہادات سے اخذ واکتساب کے سلسلہ میں کیا نقطہ نگاہ رکھتے ہیں۔

امر واقعی یہ ہے کہ اسد مغربی تہذیب وتمدن اور اس کے سیاسی وسماجی اقدار ونظریات پر کڑی تنقید کے باوجود اسے کلیتاً مسترد نہیں کرتے۔ نہ ہی وہ انہیں شر اور فساد کا منبع گردانتے ہوئے ان سے اخذ واستفادہ کو شجر ممنوعہ قرار دیتے ہیں۔ ان کی رائے میں مغربی تہذیب وتمدن کے بعض پہلو' مثلاً سیکولرازم' قومیت پرستی' مادیت پرستی واباحیت پسندی' اخلاقی وجنسی بے راہ روی اور معاشرتی زندگی کے بہت سے طور طریقے ایسے ہیں جو مسترد کئے جانے کے قابل ہیں جب کہ بعض دوسرے پہلو ایسے بھی ہیں جن سے استفادہ ناگزیر ہے۔ گویا محمد اسد مغرب کی تہذیب وتمدن سے' اس کے فاسد وصالح اجزاء وعناصر میں فرق وامتیاز کرتے ہوئے خذ ما صفا ودع ما کدر کے اصول کو رہنما بناتے ہوئے مغربی تہذیب سے اخذ واکتساب کے حق میں ہیں۔ وہ مختلف تجربی وسائنسی علوم وفنون کے میدان میں مغرب کے اجتہادات اور تجربات واکتشافات کو دنیائے اسلام کی موجودہ پس ماندگی وزبوں حالی سے نکال باہر کرنے کے لئے انتہائی ضروری خیال کرتے ہیں' تاہم مکمل تسلیم' سپردگی اور غلامانہ ذہنیت کے ساتھ نہیں بلکہ مجتہدانہ روش کو اپناتے ہوئے۔(۹۲) اسد کی رائے میں وہ سب سے اہم چیز جس میں مغرب سے اخذ واستفادہ ملت اسلامیہ کے لئے منفعت

Marfat.com

بخش ہوسکتا ہے، وہ سائنسی علوم وفنون اوران کا منہاج وطریق کار (Scientific Matter and Method) ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ مغرب کے علوم قطعیہ (Exact Sciences) کا مطالعہ کرنے اور ان کو اخذ و قبول کرنے سے بالکل نہ ہچکچائیں۔ البتہ وہ مغربی فلسفہ وفکر کے کسی بھی جزو کو اخذ وجذب کرنے سے گریز کریں۔"(۹۲)

اسد دراصل مغرب سے سائنسی علوم وفنون کا اخذ واکتساب کے ضمن میں بھی چھان پھٹک والی بصیرت سے کام لینے کے حامی وداعی ہیں۔ ان کے خیال میں: "سائنسی تحقیقات کے معاملہ میں جو غفلت مسلمانوں سے ماضی میں سرزد ہوئی ہے اس کی تلافی مغربی علوم کی بے قید و بند قبولیت سے ہرگز نہیں کی جاسکتی۔ ہماری تمام تر پس ماندگی اور افلاس کا اس مہلک اثر کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں ہوسکتا جو مغربی علوم کی اندھی تقلید کے ہاتھوں دنیائے اسلام کے مذہبی ممکنات پر پڑے گا۔ اگر ہم اسلام کی حقیقت وصداقت (Reality) کو ایک تہذیبی عامل کی حیثیت سے محفوظ و مصئون رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں مغرب کے ذہنی ماحول سے ہر وقت اور ہر آن چوکنا رہنا ہوگا۔"(۹۴) اسد کو اس حقیقت کا بھی بخوبی ادراک ہے کہ اس وقت بہت سے علوم قطعیہ مثلاً جوہری طبیعیات (Atomic Physics) خالص تجربی تحقیق وتفحص کی سرحدوں کو عبور کرکے فلسفہ کے میدان میں داخل ہو چکے ہیں، لہٰذا کئی صورتیں ایسی ہیں جن میں تجربی سائنس اور ظنی قیاسی فلسفہ (Speculative Philosophy) کے مابین خط امتیاز کا کھینچنا انتہائی مشکل ہے، تاہم وہ اس کو ہرگز ناممکن خیال نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں مستقبل میں خواہ کچھ ہی پیش آئے مغرب کے ذہنی رویہ کے آگے غلامانہ سرتسلیم خم کیے بغیر جدید سائنس کا سیکھنا اور سکھانا آج بھی ممکن ہے، البتہ اس کے لئے بے انتہا مجتہدانہ کوششوں کی ضرورت ہے۔ مسلم سائنس دانوں کا فرض ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ سائنسی تفحص کے آخری کنارہ پر پہنچ جائیں تو اس وقت مغرب کے فلسفیانہ نظریات سے دامن جھاڑ کر خود اپنے ہی یعنی اسلامی فکر ونظر سے ایسے ایسے نتائج استنباط کر جائیں جو مغربی سائنس دانوں کی اکثریت کے استنباط کردہ نتائج سے بالکل مختلف ہوں۔ اسد کے الفاظ میں:

It will be the duty and the opportunity of Muslim scientists, when once they reach those border lines of scientific investigation, to apply their powers of speculative reasoning independently of Western philosophical theories. Out of their own Islamic attitude they probably will arrive at conclusions different from those of the majority of the modern Western scientists.(۹۵)

اسد کی رائے میں یہی دراصل وہ نکتہ اور مقام ہے جہاں اسلامی تہذیب کو اپنا جداگانہ وجود منوانے کے لئے تگ ودو کرنا پڑے گی۔(۹۶) ان کے ان خیالات سے واضح طور پر یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ جدید طبعی علوم کی تدوین نو بالفاظ دیگر وہ جدید طبعی علوم کی اسلامی تشکیل کے تصور وخیال کے داعی ہیں۔ وہ جدید مغربی علوم کو مغربی فکر وفلسفہ کی

Marfat.com

زہرناکی سے پاک صاف کر کے ہی ان کی تحصیل کے حق میں ہیں۔ چنانچہ ان کو اپنے اس نقطہ نظر کی بناء پر جس کا اظہار انہوں نے ۱۹۳۴ء میں کیا تھا' بلاتردد علوم کی اسلامی تشکیل (Islamization of Knowledge) کے تصور و خیال (۹۷) کا نقیب قرار دیا جا سکتا ہے۔(۹۸)

سائنسی مواد و منہاج کے علاوہ محمد اسد ریاستی اداروں کی تشکیلات کے سلسلہ میں بھی مغرب کے اجتہادات و تجربات سے استفادہ کے حق میں ہیں' مثلاً وہ حکومت کی تشکیل کے سلسلہ میں مغرب میں رائج انتخابات کے طریق کار کو ایک بہترین طریقہ خیال کرتے ہیں۔ امریکہ میں رائج صدارتی نظام حکومت کو اسلامی نظام حکومت کے زیادہ ہم آہنگ دیکھتے ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدن سے اخذ و اکتساب کے ضمن میں اسد کے خیالات کا لب لباب یہ ہے:

۱۔ اسلام کے عقائد' اس کا نظام اخلاقیات و معاشرت' اس کی تہذیب اور اس کے معیارات خیر و شر بہر طور مغرب کے فکر و فلسفہ' اس کے نظریہ حیات و کائنات' اس کے تہذیبی و معاشرتی اقدار و طرز حیات سے انتہائی درجہ برتر و فائق ہیں' لہٰذا اس باب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں کو مغرب سے کچھ لینے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔

۲۔ صرف اور صرف ایک ہی چیز ایسی ہے جس کا مغرب سے اخذ و اکتساب مسلمانوں کے لئے منفعت بخش ہو سکتا ہے اور وہ قطعی طبعی علوم (Exact Sciences) ہیں' البتہ وہ بھی اپنی خالص اور اطلاقیاتی صورت میں۔ ملت اسلامیہ کو مغرب کے فکر و فلسفہ کے بارے میں محتاط روش اختیار کرنی چاہیے۔

۳۔ مغربی دنیا سے سائنسی علوم کی طلب و جستجو دنیائے اسلام کے لئے ایک ناگزیر صورت کا درجہ رکھتی ہے' تاہم اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کسی مسلمان کا مغربی تہذیب کو اسلامی تہذیب سے برتر و فائق گرداننا اور پھر اس کی تقلید و نقالی کرنا ہرگز مناسب نہیں۔

گویا محمد اسد مغربی تہذیب سے استفادہ کے بارے میں اخذ و انتخاب (Pick and Choose) کے رویے ہی کو مناسب خیال کرتے ہیں۔ پروفیسر خورشید احمد کا اس رویے کے بارے میں کہنا یہ ہے کہ: ''اسلامی نشاۃ ثانیہ کا موجودہ مرحلہ تقاضا کرتا ہے کہ مغربی نمونوں (Models) کی غلامانہ نقالی سے احتراز کیا جائے اور ایک چھان پھٹک والی بصیرت اختیار کی جائے کہ بیرونی تہذیب سے کیا لینا چاہیے اور کیا نہ لینا چاہیے' خذ ما صفا و دع ما کدر کی میزان پر یہ کام انجام دینا وقت کی ضرورت ہے۔ اس سے ثبات اور لچک دونوں کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ اسلامی معاشرہ بہت سے طریقوں سے مغربی تجربے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اجنبی ثقافتوں کے تسلط کو اپنی ثقافت کی قیمت پر جاری رکھا جائے۔''(۹۹)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا معاصر تہذیبوں سے اخذ و اکتساب کے سلسلہ میں اخذ و انتخاب (Pick and Choose) کا طریق کار قابل عمل بھی ہے کہ نہیں۔ مغربی دانش وروں کا ایک کثیر گروہ جس کے سرخیل آرنلڈ۔ جے ٹائن بی اور ہملٹن اے۔ آر۔ گب ہیں' اس حکمت عملی کو قطعی طور پر ناقابل عمل قرار دیتے ہیں۔ ٹائن بی کی

Marfat.com

رائے میں یہ بات عملاً ناممکن ہے کہ غیر مغربی اقوام جو جدید علوم وفنون خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں پس ماندہ ہیں' مغرب سے سائنس اور ٹیکنالوجی تو حاصل کر لیں جب کہ اس کی تہذیبی وسماجی اقدار اور ان کے رہن سہن کے طور طریقوں کی اثر پذیری سے خود کو محفوظ و مامون رکھیں یا ان کو مسترد کر دیں۔ مغرب کا فلسفہ حیات اور اس کی تہذیبی و سماجی اقدار اور اس کے علوم وفنون سب آپس میں گہرے طور پر مربوط و باہم پیوست ہیں اور دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ لہٰذا ان میں کسی ایک کو مسترد کر کے کسی دوسرے کو اخذ وقبول کرنا بالفاظ دیگر اس معاملے میں اخذ وانتخاب (Pick and Choose) کی روش اختیار کرنا ممکن نہیں ہے۔ مسلم دنیا کو بھی مغرب کی جدید سائنس و ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ اس کی دوسری چیزوں کو بھی جلد یا بدیر اختیار و قبول (شعوری ولاشعوری طور پر) کرنا ہی پڑے گا۔[100]

ہملٹن گب کی رائے میں بھی جدید کاری (Modernization) اور مغربیت (Westernization) دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چنانچہ ایسے مسلم ممالک جہاں مغربی طرز کا اقتصادی نظام رواج پا رہا ہے نیز جہاں مغرب سے ٹیکنالوجی حاصل کر کے صنعتی ترقی کا عمل پروان چڑھ رہا ہے' ان ممالک کا غرب زدگی سے محفوظ رہنا اور اس کے مقابلے میں اسلام کی سماجی وتہذیبی اقدار و روایات پر قائم رہنا امر محال ہے۔[101]

مغربی تہذیب وتمدن سے اخذ واکتساب کے بارے میں آرنلڈ ٹائن بی اور ہملٹن گب کا تجزیہ و نقطہ نظر خواہ کچھ بھی ہو' محمد اسد ہی نہیں دوسرے سر آوردہ مسلم مفکرین بھی مغرب سے ہر چیز خوب چھان پھٹک کر اخذ وقبول کرنے کے حامی ہیں۔ یہ کوئی ناممکن چیز بھی نہیں ہے۔ نظام تعلیم کو صالح بنیادوں پر استوار کر کے اور جدید نوجوان نسل کے دل و دماغ میں جذبہ اسلامیت بیدار کر کے یہ منزل' جو انتہائی گنجلک اور دشوار گزار ہے' سر کی جا سکتی ہے۔ مغرب سے بلا روک ٹوک اور چھان پھٹک کے بغیر اخذ واکتساب سے متعلق محمد اسد کا یہ کہنا کہ ''مسلمانوں کی مادی حالت تو شاید بہتر ہو جائے گی' البتہ اس سے جو نقصان لازم آئے گا وہ اس کے مقابلے میں بہت بھاری ہوگا''،[102] ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں۔ غرضیکہ امت مسلمہ مغربی تہذیب سے اخذ واکتساب کے اس سلسلہ میں حزم واحتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

اسلام اور مغرب—مکالمہ و مفاہمت

اسد نے اسلام اور مغرب کے مابین عمیق و وسیع اختلافات اور باہمی کشمکش کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ وہ اسلام اور مغرب کے مابین مکالمہ و مفاہمت کو ناممکن قرار دے کر ان کے باہمی تصادم کو ناگزیر خیال کرتے ہیں۔[103] امر واقعی یہ ہے کہ وہ اسلام اور مغربیت بالفاظ دیگر عالم اسلام اور دنیائے مسیحیت کے مابین مکالمہ و مفاہمت کو انسانیت کے حال اور مستقبل کی بہتری اور اس کی نجات و فلاح کے لیے انتہائی ناگزیر خیال کرتے ہیں۔[104] چنانچہ انہوں نے اس میں حائل رکاوٹوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان مثبت بنیادوں کی نشان دہی بھی کی ہے جن پر مکالمہ و مفاہمت کے باہمی عمل کو استوار کیا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

اسد کے نزدیک دنیائے اسلام اور مغرب کے مابین مکالمہ و مفاہمت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ باہمی بداعتمادی (Mutual Distrust) ہے۔ مسلمانوں کی بھاری اکثریت کی مغرب کے بارے میں بداعتمادی و بدگمانی گذشتہ دو صدیوں کے دوران میں آزاد مسلم ممالک پر مغرب کی استعماری طاقتوں کے غاصبانہ تسلط اور محکوم مسلم اقوام کے ساتھ ان کی طرف سے روا رکھے جانے والے جارحانہ و غیر منصفانہ برتاؤ کے سبب سے ہے۔ ان کی رائے میں نوآبادیاتی دور اب بھی ختم نہیں ہوا ہے۔ کم و بیش ہر مسلمان ملک مغربی طاقتوں کی چیرہ دستیوں کی زد میں ہے۔ مزید برآں غیر ملکی تسلط سے آزادی وحق خود ارادیت کے حصول کے لیے مختلف مسلم اقوام کی جدوجہد (کشمیر، فلسطین، بوسنیا، چیچنیا، پٹانی، مورو لینڈ وغیرہ وغیرہ میں) کے بارے میں مغرب کا رویہ انتہائی امتیازی اور غیر منصفانہ ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ زیادہ تر مغربیوں کا اسلام کے بارے میں رویہ متعصبانہ و معاندانہ اور گہرے نفاق کا مظہر ہے۔ چنانچہ ایک طرف اسلامی تمدن کے رومانوی پہلوؤں مثلاً اَلف لَیلَة وَ لَیلَة جیسی داستانوں اور خیالی قصوں، عمر خیام کی شاعری یا پھر الحمراء (اندلس) کے طرز تعمیر اور اس کے حسن و جمال کی خوب ستائش کی جاتی ہے تو دوسری طرف پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں ہرزہ سرائی اور آپ کی اہانت و تنقیص کا سلسلہ ہے کہ ختم نہیں ہو پاتا۔ بدیں وجہ مسلمان اہل علم و فکر کی اکثریت مغرب کے بارے میں بدگمان ہے۔ چنانچہ مغرب اور عالم اسلام کے مابین مثبت تعلقات کا قیام باہمی عزت و احترام اور ایک دوسرے کے حقوق کو حقیقی معنوں میں تسلیم کرنے سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک عالم مغرب مسلمانوں کے دین، ان کی مقدس مذہبی شخصیات اور ان کے تہذیبی و سماجی اصول و اقدار کے بارے میں معاندانہ رویہ ترک نہیں کرتا ان کے بارے میں اپنے قدیم متعصبانہ رویے میں مثبت تبدیلی کا مظاہرہ نہیں کرتا اور مسلمانوں کے جائز سیاسی مقام و حیثیت اور حقوق کو تسلیم نہیں کرتا، مزید برآں مسلم ممالک میں اسلامی بیداری کی تحریکوں کو ان کے صحیح تناظر میں دیکھنے اور ان پر شدت و جنونیت پسندی (Fanaticism) اور طرح طرح کے دوسرے القابات چسپاں کرنے کا سلسلہ موقوف نہیں کرتا، دنیائے اسلام سے اس کے تعلقات میں بہتری نہیں آ سکتی[(۱۰۵)] اور نہ اس (مغرب) کے بارے میں مسلمانوں کے دلوں میں موجود نفرت و بدگمانی ہی دور ہو سکتی ہے۔[(۱۰۵)]

گویا محمد اسد کے نزدیک اسلام اور دنیائے مغرب کے مابین مفاہمت کی راہ میں تین بڑی رکاوٹیں یعنی مغرب کا استعماری و نوآبادیاتی کردار، دنیائے اسلام کے مسائل و معاملات میں مغربی اقوام کا معاندانہ طرز عمل و دوہرے معیارات اور مغربی استشراق ہے۔[(۱۰۷)] چنانچہ مکالمہ و مفاہمت کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے ضروری ہے کہ مغرب ان امور کے متعلق اپنے رویے میں مثبت تبدیلی پیدا کرے۔ اسد اسلامی و مغربی دنیاؤں میں مفاہمت کے عمل میں مغرب، جو سیاسی، اقتصادی اور عسکری قوت کے اعتبار سے دنیائے اسلام پر فوقیت و بالادستی رکھتا ہے، کی طرف سے پہل (اقدام) کو ضروری خیال کرتے ہیں۔[(۱۰۸)] وہ مغرب سے دنیائے اسلام کے بارے میں انصاف پسندی اور خیر سگالی کا رویہ اختیار کرنے کا بھی مطالبہ کرتے ہیں:

We Muslim must demand a greater measure of fairness in

Marfat.com

the Christian attitude towards us: in other words, we demand and expect that the Christian Occident should cease to apply, as it has hitherto been doing, different standards to our and their own concerns. If liberty is something valuable, it must be recognized as a moral and political right not only of the peoples of the West but of the Muslim peoples as well. All in all, it is high time for the Occident to show its goodwill towards the Islamic World. ......It is the moral duty of the Christians to approach the problems of the Islamic World in the same spirit of justice and fair-play as they approach, and demand for, their own concerns.[109]

اسد نے ان دونوں متحارب فریقوں کے مابین باہمی تعاون اور مفاہمت کی بنیادوں اور تدابیر کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ان کی رائے میں اسلامی و مسیحی دنیاؤں کے درمیان مفاہمت اسلام اور عیسائیت کی حقیقی روح کی بنیاد پر ہی ہو سکتی ہے۔ اسلام اور عیسائیت کے عقائد و تعلیمات میں کتنا ہی بُعد کیوں نہ ہو' دونوں کے اخلاقیاتی و اخلاقی اقدار و ضوابط (Ethical and Moral Valuations) میں بہت حد تک ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور یہی چیز ان کے مابین تعاون و مفاہمت کا حقیقی سبب بن سکتی ہے۔ دونوں فریقوں کے مابین مفاہمت کی بنیاد اور اس کا نکتہ آغاز مذہب ہی ہو سکتا ہے۔[۱۱۰] اسد نے اسلام اور مغرب کے مابین مفاہمت و مکالمہ کے لیے اسلام اور عیسائیت کے درمیان موجود مشترکہ اقدار کو بنیاد بنانے کی جو بات کی ہے' آرنلڈ' جے ٹائن بی[۱۱۱] ڈبلیو۔ مانٹ گمری واٹ[۱۱۲] کے علاوہ بعض مسیحی رہنما[۱۱۳] بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں۔ تاہم مغرب کے استعماری عزائم اور اس کے جارحانہ و معاندانہ رویے سے متعلق عالم اسلام کے خدشات و ذہنی تحفظات کو یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں۔[۱۱۴]

مغرب میں دعوت و تعارف اسلام کی ضرورت و اہمیت

محمد اسد کو اس حقیقت کا بخوبی احساس ہے کہ مغربیوں کا از خود اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اپنی قدیم ذہنیت کو بدلنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس بات کے امکانات انتہائی حد تک کم ہیں کہ مغرب عدل و انصاف اور احترام باہمی کے اصولوں پر مسلمانوں سے مکالمہ و مفاہمت چاہے گا۔[۱۱۵] دریں صورت وہ (اسد) اسلام اور مغرب کے درمیان مفاہمت بلکہ صحیح تر معنوں میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مغرب کی بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کے ازالے' کہ اسی صورت میں ان کی نظر میں مغرب کے رویے میں کسی مثبت تبدیلی کی امید کی جا سکتی ہے' کی غرض سے مغربی دنیا میں حکمت و بصیرت کے ساتھ اسلام کی دعوت و تبلیغ کو انتہائی حد تک ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں مغربی ممالک میں مؤثر انداز میں اسلام کے عقائد و تعلیمات کا تعارف ہی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں

Marfat.com

مغربیوں کے صدیوں پرانے تعصبات اور غلط فہمیوں کے ازالہ کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اسد اس امر کے شاکی ہیں کہ موروثی مسلمانوں نے ماضی میں اہل مغرب کے سامنے مؤثر، دلنشین اور قابل فہم انداز میں اہل مغرب کے محاورہ (Diction) میں نیز ان کی ذہنی وفکری سطح کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام کو پیش کرنے کی انتہائی کم کوشش کی ہے۔ اسد کے الفاظ ہیں:

On the other hand, the Muslims themselves must become fully concsious of the fact that until now they have done very little to make the teachings of Islam fully understandable to the West. A new, cogent presentation of Islam by Muslim thinkers and writers is dispensable for a mutual understanding between the two worlds of faith: for, the ideology of Islam contains many a points which is not *à priori* clear or intellectually appealing to a Christian. ......Hence, it is the moral duty of the Muslims to bring the intellectual premises of Islam closer the understanding of the Christians.[116]

ترجمہ: ''مسلمانوں کو اس حقیقت کا پورا پورا شعور وادراک ہونا چاہیے کہ اب تک انہوں نے اسلام کو اہل مغرب کے سامنے معقول وقابل فہم اور مؤثر ودلنشین انداز میں پیش کرنے کی بہت کم کوشش کی ہے۔ اسلام اور دنیائے مغرب کے مابین مفاہمت کے لیے یہ امر انتہائی ناگزیر ضرورت کا درجہ رکھتا ہے کہ مسلمان مفکرین ومصنفین اہل مغرب کے سامنے اسلام کی تعلیمات کو مؤثر اسلوب اور پیرائے میں پیش کریں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اسلامی نظریہ حیات کے بہت سے اصول اور نکات ایسے ہیں جو مغرب کے مذہبی وتہذیبی ماحول میں پلے بڑھے افراد کے لیے بظاہر کوئی جاذبیت اور کشش نہیں رکھتے۔ دریں صورت مسلمانوں کا مذہبی واخلاقی فریضہ ہے کہ وہ اسلام کے عقلی ودانش مندانہ اصول (Intellectual Premises of Islam) کو مغرب کے مسیحیوں کے فہم کے قریب تر لائیں۔''

اسد مغرب کے عامۃ الناس کی اسلام سے دوری کا ذمہ دار بڑی حد تک موروثی مسلمانوں ہی کو گردانتے ہیں:

However, what may be described as "the popular mind" of Europe and America has not yet been able to achieve a balanced attitude *vis-à-vis* Islam and things Islamic. To a large extent it is the Muslims themselves who are to blame for this state of affairs. On the one hand, they have not succeeded in presenting Islamic thought to the

Marfat.com

West in a continued, systematic manner, taking Western mentality and Western literary associations fully into consideration; and, on the other hand, Muslim assertions of their religious and socio-political aims are often too strident to be regarded as valid, objectively justified expressions in the necessary dialogue between Islam and the West.(۱۱۷)

ترجمہ: ''جہاں تک اسلام کے بارے میں یورپ اور امریکہ کے عمومی ذہن کا تعلق ہے' اس میں اسلام اور اس سے متعلقہ امور کے بارے میں متوازن رویہ دیکھنے میں نہیں آیا' بڑی حد تک اس کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ایک طرف وہ مغرب میں اسلامی فکر کو اور اسلام کے پیغام کو مسلسل اور کسی قاعدہ قرینہ سے پیش نہیں کر سکے ہیں کیونکہ انہوں نے مغربی ذہنیت اور مغربی میلانات ورجحانات کو پیش نظر نہیں رکھا۔ دوسری طرف مسلمانوں نے اپنے مذہب اور سماجی وسیاسی مقاصد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بہت تند وتیز ہے اس لئے اس کو معقول تصور نہیں کیا گیا' حالانکہ اسلام اور مغرب میں مکالمہ کے لئے معقول اور مدلل بات کہنے کی ضرورت ہے۔''

اسد نے مغرب میں دعوت اسلام کے ضمن میں (موروثی) مسلمانوں کی جس غفلت و کوتاہی اور اہل مغرب کی ذہنی وفکری سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے تعارف اسلام کی جس ضرورت کا ذکر کیا ہے اس کا احساس بعض دوسرے اہل علم وفکر کو بھی ہے۔سید ابوالحسن علی ندوی نے تو ماضی میں مغرب میں دعوت اسلام کے سلسلہ میں پیروایان اسلام کی کوتاہی کو تو اسلامی تاریخ کا ایک دلخراش بلکہ شرمناک واقعہ قرار دیا ہے۔(۱۱۸) ان کے خیال میں ''اگر مغربی دنیا اور اسلام کا سنجوگ ہو جاتا تو آج دنیا کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہو سکا جس کا نتیجہ سزا کے طور پر آج اسلامی ممالک بھگت رہے ہیں۔آج اسلامی ممالک جس غلامی میں مبتلا ہیں اور مغرب کے ارادوں کے جس طرح وہ تابع ہو گئے ہیں' مغرب جو معاملہ کر رہا ہے اور جو کھیل کھیل رہا ہے'...... وہ سزا ہے مسلمانوں کی اس کوتاہی کی کہ مسلمانوں نے وقت پر اس کو خدا کا پیغام نہیں سنایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام سے آشنا نہیں بنایا۔''(۱۱۹) محمد اسد کی طرح سید ابوالحسن علی ندوی یہ بھی کہتے ہیں:

> ''یہ آج ہمارا کام ہے کہ اسلام کا ایک ایسا متوازن' ایسا جامع تخیل ان کے سامنے پیش کریں کہ وہ یہ سمجھیں کہ اسلام ہی ان کی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔اگر امریکہ کا اسلام سے' نبوت محمدیؐ سے' آسمانی تعلیمات سے' اسلامی اقدار سے رشتہ قائم ہو جائے تو آج ساری دنیا پر رحمتوں کے دروازے کھل جائیں۔آج دنیا کی قسمت بدل جائے' جنگوں کے بادل چھٹ جائیں' دلوں سے نفرت دور ہو جائے اور انسان انسان کا شکاری نہ رہے۔''(۱۲۰)

Marfat.com

محمد اسد نے اسلام اور مغرب کے درمیان تصادم و کشمکش کو مفاہمت میں بدلنے کے لئے مغرب میں دعوت و تبلیغ اسلام کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ موجودہ حالات میں جب کہ امریکہ اپنے یورپی اتحادیوں اور مسلم گماشتوں اور حاشیہ برداروں سمیت پوری قوت وطاقت سے دنیائے اسلام سے برسر جنگ ہے' انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ رعونت و تکبر میں مبتلا اور جنگی و اقتصادی طاقت کے نشے میں بدمست امریکہ و یورپ کبھی مسلمانوں سے عدل و انصاف اور پُرامن بقائے باہمی کے اصولوں پر مکالمہ و مفاہمت کو تیار نہ ہوں گے۔ دنیائے اسلام میدان جنگ میں امریکہ اور مغربی ممالک کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے۔ دریں حالات اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ محمد اسد کی بتائی ہوئی تدبیر پر عمل کیا جائے۔ مسلم دانش ور اور مصنفین' مادیت اور حرص وہوس کی ستائی ہوئی مغرب کی بے چین روحوں کے سامنے اسلام کی دعوت کو مؤثر طور پر پیش کریں اور ان کو حلقہ بگوش اسلام بنانے کا کام انجام دے کر دنیائے اسلام کو مغرب کے شر سے محفوظ کرلیں۔

مغرب میں دعوت اسلام-محمد اسد کی کاوشوں کا جائزہ

مغرب میں دعوت و تبلیغ اسلام کا کام جتنا اہم اور ضروری ہے اتنا ہی مشکل اور نازک بھی ہے۔ چنانچہ وہ مسلم دعاۃ اور مبلغین سے خصوصی علمی استعداد اور اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کا متقاضی ہے۔ مغرب میں دعوت اسلام کے وظیفہ کی بجا آوری کے لئے ضروری ہے کہ مبلغین و دعاۃ علوم اسلامیہ میں گہرا درک رکھتے ہوں' یہودیت و مسیحیت کے عقائد و تعلیمات سے بھی بخوبی آگاہ ہوں۔ وہ مغربی زبانوں پر دسترس رکھتے ہوں۔ مزید برآں اہل مغرب کی ذہنی و فکری سطح ان کی مذہبی نفسیات اور ان کے اسلوب تحریر و تقریر سے بھی آشنا ہوں بلکہ اس میں خوب اعلیٰ درجے کی مہارت رکھتے ہوں۔ جرمن نومسلم دانش ور مراد ہوف مان کے بقول:

> ''روزمرہ مشاہدہ اور تجربہ سے اور یہ امر انتہائی افسوس ناک بھی ہے کہ موروثی مسلمان بہت زیادہ حد تک مغربی دنیا کو اپنے عقیدہ و مذہب کی تبلیغ مؤثر طور پر کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ آخر کیوں؟ اس لئے کہ ایک مغربی انسان کا طرز فکر' اس کی ذہنی ساخت اور مذہبی نفسیات ایک مشرقی انسان سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا ان تک دعوت پہنچانے کے لئے داعی کو چاہیے کہ وہ ان کے ذہنی و فکری ارتقاء اور اسلام کے بارے میں ان کی تاریخی غلط فہمیوں کا لحاظ رکھے۔''(۱۲۱)

ایک دوسرے نامور نومسلم دانش ور حسن عبدالحکیم (Gai Eaton) نے بھی مغرب میں دعوت و تبلیغ اسلام بالفاظ دیگر مغرب میں اسلام کے تعارف کے سلسلہ میں موروثی مسلمانوں- جن میں روایت پسند اور تجدد پسند دونوں طرح کے لوگ شامل ہیں' کے اسلوب تحریر و تقریر کے غیر مؤثر ہونے اور اہل مغرب کی طرف سے درپیش مذہبی نوعیت کے اہم سوالات کے اسلامی نقطہ نظر سے تسلی و اطمینان بخش اور موثر و دلنشیں جوابات پیش نہ کرنے کا شکوہ کیا ہے۔(۱۲۲) مذکورہ دونوں مسلم دانش ور بھی' جو مسیحیت سے اسلام کی طرف اپنے ذہنی و قلبی سفر کے تجربے سے گزر چکے ہیں' مغرب

Marfat.com

میں تعارف دعوت اسلام کے سلسلہ میں اہل مغرب کے ذہن ونفسیات اوران کے اسلوب تحریر وتقریر نیز دین اسلام کے بارے میں ان کے رویے سے گہری واقفیت کو ناگزیر ضرورت قرار دیتے ہیں۔ مراد ہوف مان کی رائے میں ''یہ بات واضح طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ مغرب کی تمام غلط فہمیوں کے ڈانڈے تاریخی حقائق وارتقاء سے جا ملتے ہیں۔ (لہٰذا) کوئی بھی شخص جو اس تہذیبی پیش رفت سے آگاہ نہیں ہے مغرب میں دعوت وتبلیغ کا فرض کامیابی سے ادا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ کسی بھی خطے میں دعوت کا کام وہی کریں جو اس خطے کی مخصوص تہذیبی روایات میں پیدا ہوئے ہوں یا پلے بڑھے ہوں۔ داعی کو پتہ ہونا چاہیے کہ تبدیلی لانے اور قائل کرنے کے لیے کیا کرنا ضروری ہے۔ اسلام کو ان غلط فہمیوں کا جواب انہی لوگوں کے ذریعے دینا چاہیے جو مخاطبین اور سامعین کے سامنے ان کی بولی انہی کے لب ولہجہ میں بولتے ہوں۔''(۱۲۳)

مغربی دنیا سے تعلق رکھنے والے مذکورہ دونوں نومسلم دانشوروں (مراد ہوف مان اور حسن عبدالحکیم) نے مغرب میں دعوت وتبلیغ اسلام کی حکمت عملی کے بیان میں جن ضروری شرائط اور مطالبات کا ذکر کیا ہے اور ایک کامیاب داعی ومبلغ کے لئے جو معیار مقرر کیا ہے' دعوت وتبلیغ کے میدان میں سرگرم عمل خال خال ہی ایسے افراد ہوں گے جو اس پر پورا اترتے ہوں گے۔ تاہم محمد اسد اپنے معاصر ڈاکٹر محمد حمید اللہ (۱۹۰۸ء-۲۰۰۲ء) کی طرح ہر اعتبار سے اس پر پورا اترتے تھے۔(۱۲۴)

اسد اپنے خاندانی و مذہبی اور تہذیبی و سماجی پس منظر اور اپنے وسیع وعمیق مطالعہ اسلام پھر اعلیٰ ادبی صلاحیتوں کی بدولت اہل مغرب کے سامنے اسلام کی ترجمانی کا وظیفہ بہتر طور پر انجام دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ مغرب میں دعوت اسلام کی راہ میں درپیش رکاوٹوں کا بھی گہرا ادراک رکھتے تھے۔ سب سے اہم یہ کہ کلموا الناس علی قدر عقولھم کے مصداق وہ اہل مغرب کے سامنے مذہبی امور ومسائل پر انہی کی زبان اور محاورے میں بحث و گفتگو کرنے اور اسلام کے عقائد وتعلیمات کی مؤثر دلنشین اسلوب و پیرائے میں تفہیم وتشریح پر یدطولیٰ رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اعلیٰ ادبی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے بڑی سبک دستی اور مہارت سے اہل مغرب کے سامنے اسلام کی دعوت' بذریعہ تحریر وتقریر ہر دو طرح سے' پیش کی۔ مغرب میں دعوت وتعارف اسلام بالفاظ دیگر اسلام' پیغمبر اسلام اور اسلامی تہذیب وتمدن اور نظام معاشرت کے بارے میں اہل مغرب کی غلط فہمیوں کا ازالہ اور ان کے سامنے اسلام کی حقیقی واصلی تصویر پیش کرنا' نیز اسلام کے عقائد وتعلیمات اور اس کے احکام ومسائل کی ان کی ذہنی سطح کی رعایت کرتے ہوئے ترجمانی وتشریح کرنا اسد کی جملہ تصنیفی سرگرمیوں کا اہم اور بنیادی مقصد وغایت معلوم ہوتا ہے۔ اسد نے اپنی خودنوشت سرگزشت حیات The Road to Mecca کی تصنیف میں سراسر اسی مقصد کو پیش نظر رکھا ہے۔ وہ اپنی اسی سرگزشت حیات کی غایت تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں نے سنجیدگی سے غور کیا کہ اپنی زندگی کی کہانی لکھ ڈالوں اور اس کے ذریعہ سے' خواہ کتنے ہی مختصر پیمانے پر سہی' میں اس دبیز پردہ کے اٹھانے میں مدد کروں' جو مغربی ذہن اور اسلام کے درمیان حائل ہے۔ میں نے

Marfat.com

اسلام کو عجیب وغریب راستہ سے پایا۔ میں نے خیال کیا کہ کیا یہ صورت زیادہ بہتر نہ ہوگی کہ میں اسلام اور مسلم تہذیب و معاشرت کے بارے میں ذاتی تاثرات و تجربات کو مغربی قارئین تک پہنچا کر' اسلامی اور مغربی دنیاؤں کے درمیان باہمی مفاہمت میں مددگار ثابت ہوں۔ آخر کتنے لوگ ہیں جو مغربیوں سے اسلام کے متعلق میری طرح سے بات کر سکتے ہیں۔ میں مسلمان ہوں اور ساتھ ہی ساتھ نسلی اعتبار سے مغربی ہوں۔ اس لیے میں اسلام اور مغرب دونوں ہی کی عالمانہ زبانوں میں بحث و گفتگو کر سکتا ہوں۔"(۱۲۵) اہل مغرب کو اسلام' جیسا کہ وہ ہے' سے متعارف کرانے کا جذبہ اور لگن اسد کی دوسری تصانیف میں بھی کارفرما نظر آتی ہے۔(۱۲۶) اسلام میں مملکت وحکومت کے بنیادی اصول کے موضوع پر اپنی کتاب کے دیباچہ میں انہوں نے لکھا:

> I am now placing it a new before the public in the hope that it may contribute something towards a realization of the great dream common to all those to whom "Islam" is more than an empty word, as well as towards a better understanding of Islamic ideology by the non -Muslim West - an understanding so vitally needed in our time.(۱۲۷)

گویا اس کتاب کی تصنیف سے اسد اسلامی ریاست کے بارے میں اہل مغرب کی غلط فہمیوں کا ازالہ چاہتے ہیں۔ انہوں نے قرآن حکیم کے ترجمہ وتفسیر میں بھی اپنے اس مقصد کو پوری طرح سے پیش نظر رکھا ہے۔ وہ اس کے ذریعے سے اہل مغرب کو قرآن کے پیغام سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ مستشرقین نے قرآن حکیم کے بارے میں مغربی دنیا کے ذہنوں میں جو غلط فہمیاں پیدا کر رکھی ہیں اسد اپنے ترجمہ وتفسیر قرآن The Message of the Qur'an کے ذریعے ان کے ازالہ کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔(۱۲۸) تحریر و تصنیف کے ساتھ ساتھ وہ مغربی ممالک کے بعض مؤقر علمی وتحقیقاتی مراکز (رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز' لندن' وغیرہ) کے علاوہ ان ممالک میں سرگرم مختلف اسلامی تنظیموں' مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (یو-ایس-اے) اور اسلامک کونسل آف یورپ (لندن) وغیرہ کی طرف سے منعقدہ کانفرنسوں اور مجالس مذاکرہ میں محاضرات وخطبات پیش کرتے رہے۔(۱۲۹) علاوہ ازیں مختلف مغربی ممالک میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگراموں میں بھی اسلامی مسائل وموضوعات پر اسلام کے مؤقف کی ترجمانی کے علاوہ اسلام کا تعارف پیش کرتے رہے۔(۱۳۰) جنیوا میں قیام کے دوران میں بھی محمد اسد ترجمہ وتفسیر قرآن میں مشغولیت وانہماک کے ساتھ ساتھ تعارف وترجمانی اسلام کا وظیفہ بھی انجام دیتے رہے۔ چنانچہ مختلف اسلامی موضوعات ومسائل پر ان کی سوئس ریڈیو سے گفتگوئیں نشر ہوتی رہیں۔(۱۳۱) سوئس ریڈیو سے نشر ہونے والی ایک گفتگو سے متعلق رقم طراز ہیں:

Marfat.com

I was invited by the Swiss radio to deliver a very long talk on Islam--since this talk was a very important one (it was a part of a cycle of talks by some of Europe's leading intellectuals on various important questions of the present time). I had to prepare it very carefully and consequently to spend some time on it .. this talk, I understand, has caused a very great response from the public.(۱۳۲)

اسد نے ان خطبات میں اسلام اور مغرب کے مابین تصادم و کشمکش کے اسباب و محرکات کا جائزہ لینے کے علاوہ ان دونوں کے مابین مکالمہ و مفاہمت کی حکمت عملی پر اظہار خیال کیا۔ ان خطبات میں اسد نے دین اسلام کو انسانیت' خصوصاً اہل مغرب' کے لئے راہ نجات اور فلاح وسعادت کے طور پر پیش کیا۔(۱۳۳)

محمد اسد کا اسلوب دعوت اسلام

محمد اسد نے تہذیب و تمدن مغرب سے مرعوب و مسحور موروثی مسلمانوں' جو مذہب کو ایک فرسودہ و دور از کار رفتہ چیز خیال کرتے ہیں' اور پھر اہل مغرب کے سامنے اسلام کی دعوت کو پیش کرتے ہوئے جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کے حسب ذیل پہلو بطور خاص نمایا ہیں:

۱۔ انہوں نے عملی زندگی کی تعمیر و تشکیل اور خیر و شر اور حق و باطل کے معیارات کی تعیین میں انسانی عقل و فہم کی کوتاہی و نقص اور اس کی درماندگی و عاجزی کو واضح و آشکارا کرتے ہوئے انسان کی روحانی و اخلاقی' معاشرتی و سیاسی اور معاشی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں الہامی رشد و ہدایت کی احتیاج کو واضح و اجاگر کیا ہے۔

۲۔ انہوں نے تواتر و تسلسل کے ساتھ اپنی تحریروں میں دین اسلام کا یہودیت و مسیحیت سے جب کہ اسلامی تہذیب و معاشرت کا مغربی تہذیب و معاشرت سے تقابل و موازنہ کا طریق کار اختیار کیا ہے۔ یہودیت و مسیحیت کے عقائد و تعلیمات پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ ایک متوازن و صالح معاشرہ کے قیام میں' جو افراد کی روحانی و اخلاقی اور مادی و جسمانی احتیاجات کی تکمیل اور اس کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کے نشوونما میں معاون ہو' ان کی ناکامی کے اسباب کا جائزہ پیش کرتے ہوئے اس باب میں دین اسلام کی قوت و صلاحیت اور اس کی کامرانیوں کو اجاگر کیا ہے۔ مزید برآں انہوں نے مذہب سے مغربی دنیا کی بغاوت و انحراف اور اس روش کے نتیجے میں رونما ہونے والی تباہ کاریوں کو صراحت سے بیان کیا ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن اور اس کے طرز حیات کے منفی و تاریک پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہوئے' اس پر اسلامی تہذیب و معاشرت کی فضیلت و برتری کو ثابت کیا ہے۔ اسلامی تہذیب و معاشرت کے محاسن و خصائص کو انہوں نے نہایت عمدگی و متاثر کن انداز میں بیان کیا ہے۔

Marfat.com

۳- اسد نے عالم انسانی خصوصاً دنیائے مغرب کو درپیش گوناگوں مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے میں مغرب کے سیاسی و معاشی نظاموں کی ناکامی و درماندگی کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اس کے لیے ایک نئے معاہدہ عمرانی (Social Contract) کی احتیاج واضح کی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اسلام کو ایک متبادل معاہدہ عمرانی اور راہ نجات و سعادت کے طور پر پیش کیا ہے۔ (۱۳۴)

ان کی دعوت کا بنیادی و مرکزی نکتہ یہ ہے کہ تمام ادیان و مذاہب نیز انسانی عقل و فہم کے تراشیدہ نظریہ ہائے حیات کے مقابلے میں صرف اور صرف اسلام ہی ایک ایسا دین اور نظریہ حیات ہے جو انسان کی روحانی و اخلاقی ضروریات کی تکمیل کا سامان فراہم کرنے کے ساتھ معاشرتی و سیاسی اور تہذیبی زندگی کا ایک جامع پروگرام پیش کرتا ہے۔ تاریخ اسلام کے ابتدائی عہد (عہد نبوی و خلافت راشدہ) میں اسلامی نظریہ حیات کو عملی زندگی میں متشکل کرنے کا ایک انتہائی کامیاب تجربہ ہو چکا ہے۔ اسلام آج بھی ایک زندہ قوت ہے۔ آج بھی انسانیت کو درپیش روحانی و اخلاقی اور سماجی و سیاسی مسائل اور الجھنوں کو سلجھانے کی پوری پوری قوت و صلاحیت رکھتا ہے۔ آج انسانیت جس قدر دین اسلام کی محتاج ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ (۱۳۵)

محمد اسد نے اپنی سرگذشت قبول اسلام The Road to Mecca میں بھی دین اسلام کو جدید انسانیت کے لئے بطور راہ نجات و سعادت پیش کرتے ہوئے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خیال میں عصر جدید کا انسان پیغام اسلام کا' عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے انسانوں سے بھی بڑھ کر محتاج ہے۔ آج کا انسان انفرادی طور پر ہی نہیں بلکہ جدید معاشرہ بحیثیت مجموعی نجات و فلاح کا محتاج ہے۔ اسد پورے یقین سے کہتے ہیں:

> ......the ideal placed before them by the Arabian Prophet thirteen centuries ago I thought, that we latecomers needed that message even more desperately than did the people of Muhammad's time. The world in which I was living, the whole of it, was wobbling because of the absence of any agreement as to what is good and evil spiritually and, therefore, socially and economically as well. I did not believe that individual man was in need of "salvation": but I did believe that modern society was in need of salvation. More than any previous time, I felt with mounting certainty, this time of ours was in need of an ideological basis for a new social contract: it needed a faith that would make us

Marfat.com

understand the hollowness of material progress for the sake of progress alone- and nevertheless would give the life of this world its due; that would show us how to strike a balance between our spiritual and physical requirements: and thus save us from the disaster into which we were rushing headlong.(۱۳۶)

بلاشبہ محمد اسد نے اسلام کے عقائد و تعلیمات اور احکام و مسائل کی تعبیر و تشریح اس طور سے کی ہے کہ جو جدید انسان کے لئے قابل فہم ہو۔ جو بقول سید سلیمان ندوی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی جدید ذہنیتوں کو اسلام کے حقائق ذہن نشین کرا سکے اور دین و مذہب کے بارے میں ان کے شبہات کا ازالہ کر سکے۔(۱۳۷) دعوت اسلام کے سلسلہ میں اسد کے اسلوب و منہج کے مذکورہ خصائص ان کی جملہ تحریروں میں پوری طرح سے کارفرما نظر آتے ہیں۔ دعوت اسلام بالفاظ دیگر اسلام کی تفہیم و تشریح کے ضمن میں ان کے معاصرین میں سے سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قطب شہید کے اسلوب میں بھی یہی رنگ نظر آتا ہے۔(۱۳۸)

محمد اسد کی علمی و فکری اور دعوتی کاوشوں کے اثرات و نتائج

اگرچہ اسد کی تحریروں نے پشتینی مسلمانوں کے قلوب و اذہان کو بھی متاثر کیا ہے تاہم ان کی علمی و فکری اور دعوتی سرگرمیوں کا زیادہ اثر مغربیوں پر مرتب ہوا ہے۔(۱۳۹) ان کی تصانیف مغرب میں اسلام کے مؤثر تعارف کا وسیلہ ثابت ہوئی ہیں، جن کے مطالعہ سے بیسیوں متلاشیانِ حق کو راہ ہدایت نصیب ہوئی ہے۔ متعدد نومسلم مغربی دانشوروں نے اسد کی نگارشات سے تحریک پا کر مغرب و مشرق میں اسلام کی ترجمانی و وکالت کی راہ اختیار کی ہے۔ ان میں مریم جمیلہ (ولادت: ۱۹۳۴ء) اور معروف جرمن سفارت کار مراد ہوف مان، جرمن نومسلم اور قرآن مجید کی جرمن زبان میں مترجم فاطمہ گریم (ولادت: ۱۹۳۴ء/مشرف بہ اسلام ۱۹۶۰ء) اور یونی ورسٹی آف ٹیکساس میں اسلامی و مشرق وسطیٰ کی تاریخ کے استاد اور اسلامک سینٹر Tucson کے روح رواں محمد اسد بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مریم جمیلہ اپنے اسلام کی طرف کشاں کشاں چلے آنے میں محمد اسد کی سرگذشت قبول اسلام The Road to Mecca کی تاثیر و تحریک کی معترف ہیں تو ان کی Islam at the Crossroads کو اپنی ذہنی و فکری تشکیل میں ایک اہم عامل گردانتی ہیں۔ موصوفہ اسد کی مؤخر الذکر تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

The importance of this book cannot be overstated - as *The Road to Mecca* inspired her to embrace Islam, so *Islam at the Crossroads* not only left a decisive impact on her thought but also determined the direction of her entire literary career. Without this book, none of the

Marfat.com

reviewer's own books could have been written. A classic on the subject, it has exerted much influence on thinking Muslims throughout the World.(۱۴۰)

مراد ہوف مان بھی مریم جمیلہ کی طرح محمد اسد کی تصانیف اور افکار و خیالات سے گہرے طور سے متاثر ہوئے ہیں۔(۱۴۱) جرمن نومسلم فاطمہ گریم کو اسلام کے در پر لانے میں سید مودودی کے رسالہ "دینیات" کے انگریزی ترجمہ Towards Understanding Islam کے علاوہ محمد اسد کی The Road to Mecca نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔(۱۴۲) سڈنی (آسٹریلیا) کی نومسلم تزین عبداللہ (Tazin Abdullah) بھی محمد اسد کی تحریروں بالخصوص ان کی سرگزشت قبول اسلام کے مطالعہ سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئیں۔(۱۴۳) کچھ ایسا ہی ماجرا امریکی نومسلم ڈاکٹر محمد اسد (Michael Berdine 'ولادت: ۱۹۴۵ء) جو اس وقت اسلامک سینٹر Tucson' (یو ایس اے) کے ایک اہم ذمہ دار اور یونیورسٹی آف ٹیکساس میں اسلامی اور مشرق وسطیٰ کی تاریخ کے استاد ہیں' کے ساتھ پیش آیا۔(۱۴۴)

مغرب میں دعوت و تعارف اسلام کے ضمن میں محمد اسد کے دَین (Contribution) مغربی افراد کے قلوب و اذہان پر اثرات کے پیش نظر مراد ہوف مان کا کہنا یہ ہے:

> We are close enough to the end of the 20th century to verify that nobody during the last 100 years has surpassed the Austrian Muhammad Asad (formerly Leopold Weiss of Jewish descent) in his monumental contribution to the explanation and propagation of Islam in the West. His impact is not only due to the respect paid to his deep wisdom and learning; the moral qualifications of this intrepid Muslim earned him equal recognition.(۱۴۵)

محمد اسد کی علمی و فکری اور دعوتی کاوشوں کی عصر حاضر میں معنویت و افادیت

بایں ہمہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ محمد اسد نے اسلام اور مغرب کے مابین رابطہ استوار کرنے' ان دونوں کے مابین حائل خلیج کو پاٹنے اور ایک طرح سے پل سازی کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ بالفاظ دیگر اہل مغرب کے سامنے اسلام کا حقیقی و اصلی رخ پیش کرنے کی ایک مؤثر اور کامیاب کوشش کی ہے۔(۱۴۶) سہ ماہی مجلہ "اقراء" (امریکہ) کے مدیر حسن ظل الرحیم کے الفاظ میں:

> Muhammad Asad stood alone among contemporary

Marfat.com

Muslims for his extraordinary perception of, and contribution to Islam. With his command of the English language, his knowledge of the Bible and Biblical sources, as well as Jewish history and civilization, Asad was more successful than most in communicating to Muslim and non-Muslim readers the essence of Isalm in both its historical and timeless context. As Islam enters the most critical phase of its development in the West, Muhammad Asad's legacy assumes an urgency no thinking Muslim can afford to ignore."(۱۴۷)

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے بعد سے جس طور سے مغربی خصوصاً امریکی مستشرقین و مصنفین اور ذرائع ابلاغ نے اسلام اور اس کے پیروکاروں کو ہدف بنالیا ہے اور دونوں کی جو انتہائی مسخ شدہ اور تاریک تصویر اہل مغرب کے سامنے پیش کی جارہی ہے،(۱۴۸) اس تناظر میں محمد اسد کی نگارشات کی افادیت پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ مغرب میں دعوت اسلام جیسے اہم کام سے دلچسپی رکھنے والوں کو اسد کے اسلوب سے یقیناً بڑی رہنمائی فراہم ہوسکتی ہے۔

حواشی

۱۔ محمد اسد کے احوال و آثار، علمی و فکری کاوشوں اور تصانیف و تالیفات کے تعارف کے لیے ملاحظہ ہو:

Ismail Ibrahim Nawwab, "A Matter of Love: Muhammad Asad and Islam," *Islamic Studies*, 39:2 (2000), 155-232; Murad Hofmann, "Muhammad Asad: Europe's Gift to Islam," *Islamic Studies*, op. cit., pp.233-248.

(۱-ب) اسلام اور مغرب کے مابین کشمکش کے اسباب کے بارے میں اسد کے خیالات کے بارے میں ملاحظہ ہو:

Islam at the Crossroads, Lahore: Sh. Muhammad Ashraf, 6th edn. 1975, pp. 62-82; Idem; *The Road to Mecca*, London: Max Reinhardt, 1954, pp. 3-7; Idem, *This Law of Ours*, Gibraltar:

Marfat.com

Dar-al-Andalus,1987, pp. 119-128.

اس موضوع پر دیگر متعدد مسلم وغیر مسلم مصنفین نے بھی اظہار خیال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

Mahmoud M. Ayoub, "Roots of Christian-Muslim Conflict", *The Muslim World*, Lxxix:1 (1989): 25-45; Rollin Armour Sr. *Islam, Christianity and the West: A Troubled History*, New York: Orbis Books, 2000.

2) *Islam at the Crossroads*, p. 63

۳۔ صلیبی جنگوں کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو:

S. Runciman, *A History of the Crusades*, 3 Vols., Cambridge: Cambridge University Press, 1951-54; Stanley Lane-Poole, *Saladin and the Fall of the Kingdom of Jerusalem*, Lahore: Sind Sagar Academy (n.d.).

4) *Islam at the Crossroads*, pp. 66-68; *The Road to Mecca*, pp. 6-7

5) *The Road to Mecca*, pp. 6-7

6) *Islam at the Crossroads*, pp. 67،70-71 ; See also: *The Road to Mecca*, pp. 6-7

7) *Islam at the Crossroads*, p. 79

8) Ibid. p. 71 .

صلیبی جنگوں کے اندلس کے مسیحی عوام پر اثرات نیز مسلمانوں کے خلاف ان کی وحشیانہ کارروائیوں کے بارے میں ملاحظہ ہو:

T.B. Irving, *Islam Resurgent: The Islamic World Today*, Lahore: Suhail Academy, 1983, pp. 1-10, especially Ch.1 "(Andalusia and the Crusades: the European Face to Islam)," pp. 11-23.

9) *Islam at the Crossroads*, p. 74

10) Ibid. p. 73

ممتاز فرانسیسی فلسفی ومصنف والٹئیر نے ۱۷۱۴ء میں Muhammad and Fanaticism (La Fanatisme ou Mahomet le Prophet) کے عنوان سے ایک ڈرامہ لکھا تھا جس میں حضرت

Marfat.com

محمدؐ کی نا قابل تسلیم تصویر پیش کی تھی کہ بعد میں اس نے اپنی ایک دوسری تحریر (Essays on Morals) Essai sur les moeurs میں پیغمبر اسلام کو ایک عظیم مدبر و حکمران کی صورت میں بھی پیش کیا۔ ملاحظہ ہو: ڈبلیو۔ مانٹ گمری واٹ "مستشرقین کا مطالعہ اسلام" (مترجمہ: سفیر اختر) عالم اسلام اور عیسائیت' ۸:۴ (اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۸ء) ص ۳۳۔ مزید ملاحظہ ہو:

Hichem Djait, Europe and Islam, Berkeley: University of California Press, 1985, pp. 21 -23.

Norman Daniel, *Islam, Europe and Empire,* Edinburgh: Edinburgh University Press, 1966, p. 25.

11) *The Road to Mecca,* p. 7

اسلام کے بارے میں مغرب کے رویے سے متعلق اسد نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے تقریباً انہی کا اعادہ ایک دوسرے نومسلم فاضل ودانش ور حسن عبدالحکیم (Gai Eaton) نے بھی کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

Gai Eaton, *Islam and the Destiny of Man,* Lahore: Suhail Academy, 1997, pp. 16-19

۱۲۔ نارمن ڈینئل (Norman Daniel) غالباً پہلا غیر مسلم مغربی مصنف ہے جس نے قرون وسطیٰ اور عہد جدید کے مغربی مسیحی و یہودی علماء و ادباء کی طرف سے دانستہ طور پر اسلام کی تعلیمات کو مسخ کرنے اور پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں غلط فہمیوں کو ابھارنے کی کوشش کے شرح وبسط سے جائزے کے علاوہ استشراق (Orientalism) کے سیاسی و اقتصادی محرکات بالفاظ دیگر مسلم اقوام وممالک پر غلبہ وتسلط کی غرض سے استشراق اور مغرب کی استعماری طاقتوں کے مابین گٹھ جوڑ کو آشکارا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

Norman Dniel, *Islam and the West: The Making of an Image,* 1960, Oxford: One World, 1993, repr. 1997; Idem. *Islam, Europe and Empire,* op. cit.

۱۳۔ مانٹ گمری واٹ نے اس حقیقت کا اعتراف اپنی متعدد تحریروں میں کیا ہے ملاحظہ ہو: ڈبلیو۔ مانٹ گمری واٹ "مستشرقین کا مطالعہ اسلام"، حوالہ مذکورہ، صفحات ۲۸-۲۹۔ مزید ملاحظہ ہو:

W. Montgomery Watt, *The Majesty that was Islam,* London: Sidgwick & Jackson, 1974, pp. 247-248; Idem. *Islam and Christianity Today: A Contribution to Dialogue,* London: Routledge & Kegan Paul, 1983, p.4.

Marfat.com

14) *The Road to Mecca,* pp. 4-5

اسد نے اسلام کی طرف سے مغرب کولاحق نفسیاتی خوف اور اندیشوں سے متعلق جو خیال ظاہر کیا ہے۔ایک دوسرے نو مسلم دانش ورٹی بی اروِنگ (م:۲۰۰۳ء) نے اس کا اعادہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"The [Western] world worries about Islam because it has a system of values and these are dangerous if they are taken seriously since they act a basis for conduct. It is a coherent civilization or culture", See: Thomas B. Irving, *Islam Resurgent: The Islamic World Today,* op. cit., p.1

15) *The Road to Mecca,* p. 5

16) Ibid. p. 291

17) Arnold J. Toynbee, *Civilization on Trial,* London: Oxford University Press, 1949, pp. 21-22.

۱۸۔ تفصیلی جائزہ کے لیے ملاحظہ ہو:

Jochen Hippler and Andrea Lueg, *The Next Threat: Western Perceptions of Islam,* London: Pluto Press, 1995; Robert Spencer, *Islam Unveiled: Disturbing Questions about the World's Fastest Growing Faith,* San Francisco: Encounter Books, 2002; H.T. Norris, *Islam in Balkans: Religion and Society between Europe and the Arab World,* Columbia; University of South Carolina Press, 1993,p. 258; John L. Esposito, *The Islamic Threat: Myth or Reality?* New York: Oxford University Press, 1992, repr. 1999, pp. 212-289.

۱۹۔ اس سلسلہ میں امریکی دانش ور سیموئیل ہنٹنگٹن بطور خاص قابل ذکر ہے۔موصوف نے ''تہذیبوں کے تصادم'' کا نظریہ پیش کر کے اسلام کو مغربی تہذیب کے لیے ایک ''خطرہ'' کے طور پر پیش کرتے ہوئے قوت وطاقت کے استعمال سے اس کی بیخ کنی کی وکالت کی ہے۔ملاحظہ ہو:

Samuel P. Huntington, *Clash of Civilizations and the Remaking of World Order,* New York: Simon & Schuster, 1997.

Marfat.com

۲۰۔ مذکورہ رزمیہ نظم کے مباحث، زمانہ تصنیف اور یورپی ادب پر اس کے اثرات کے جائزہ کے لیے ملاحظہ ہو:

Encyclopaedia Britannica, 1974, 2:740.

21) *The Road to Mecca*, p. 7.

22) Muhammad Asad, *This Law of Ours*, p. 124; *Islam at the Crossroads*, p. 74

23) *Islam at the Crossroads*, pp. 62-64

مستشرقین کی عمومی نفسیات کے جائزہ کے لیے ملاحظہ ہو:

Hichem Djait, *Europe and Islam*, Ch.3 "(European Scholarship and Islam)", pp. 42-73

24) *Islam at the Crossroads*, p. 64

مستشرقین کی تحقیقات اور ان کے اسلام و پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں خیالات و تصورات کے بارے میں ملاحظہ ہو:

Daniel J. Vitikus, "Early Modern Orientalism", Michael Frasseto and David R. Blanks (Eds.), *Western Views of Islam in Medieval and Early Modern Europe*, op. cit. pp. 207-230; Albert Hourani, *Islam in European Thought*, Cambridge 1991; Maxime Rodinson, "The Western Image and Western Studies of Islam", in: Joseph Schacht and C.E. Bosworth. (Eds.), *The Legacy of Islam*, Oxford and New York: 1979, pp. 9-62; Idem. "A Critical Survey of Modern Studies on Muhammad", in: Marlin L. Schwartz (Ed. and Tr.), *Studies on Islam*, New York: 1981, pp. 23-85; Alan M. Gunther, "The Image of the Prophet as Found in Missionary Writings of the Late Nineteenth Century", *The Muslim World*, 90: 1 (2000): 43-70; Jabal Muhammad Bauben, *Image of the Prophet Muhammad in the West: A Study of Muir, Margoliouth and Watt*, Leicester: The Islamic Foundation, 1996; Samir Khalf; "Protestant Images of Islam: Disparaging Stereotypes Reconfirmed. "*Islam and Christian-Muslim*

Marfat.com

Relations, 8:2 (1997): 211-229; Muhammad Benaboud, "Orientalism on the Revelation of the Prophet: The Cases of W. Montgomery Watt, Maxime Rodinson and Duncan Black Macdonald", *American Journal of Islamic Social Sciences,* 3:2 (1986): 309-321; Ahmad Gunny, *Preceptions of Islam in European Writings,* Leicester: The Islamic Foundation, 2004; Jan. Smith, "Christian Missionary Views of Islam in the 19th-20th Centuries", in Zafar I. Ansari and John L. Esposito (Eds), *Muslims and the West: Encounter and Dialogue,* Islamabad: 2001 .

25) *The Road to Mecca,* p. 75

26) Ibid. pp. 75,1 90

۲۷۔ نارمن ڈینیئل کے بارے میں ملاحظہ ہو: حاشیہ ۱۲۔ استشراق پر ایڈورڈ سعید کی تنقیدات کے لیے ملاحظہ ہو:

Edward W. Said, *Orientalism,* London: Routledge, 1978; Idem. *Covering Islam,* New York: Pantheon Books, 1981; Idem. *Reflection on Exile and Other Literary and Cultural Essays,* London: Granta Books, 2001, ("Orientalism", pp. 356-371); Idem. "Orientalism Revisited" *Dawn,* August 11, 2003; Idem. "Orientalism Revisited: Manufactured Clash of Civilizations", *Dawn,* August, 12, 2003.

۲۷-ب) انیسویں صدی کے نصف آخر سے دنیائے اسلام میں متعدد ایسے مصلحین اور دانش ور منظر عام پر نمودار ہوئے ہیں جنہوں نے اسلام اور مغربی تہذیب کے مابین کسی بنیادی اور حقیقی و جوہری فرق و اختلاف سے انکار کیا اور مغربی تہذیب و معاشرتی اقدار کو قابل تقلید گردانا۔ چنانچہ انہوں نے عامۃ الناس کو بھی اس کی تقلید و نقالی کی پُر زور تاکید و تلقین کی۔ اس سلسلہ میں سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) کے بعد سلطنت عثمانیہ کے ضیاء گوک الپ (۱۸۸۵ء-۱۹۲۴ء) کا نام بطور خاص قابل ذکر ہے۔ مؤخر الذکر مغربی تہذیب کے بنیادی اصول و تصورات سیکولر ازم اور قومیت پرستی (نیشنل ازم) وغیرہ کو قطعاً اسلام کے منافی خیال نہیں کرتے (سرسید کے خیالات کے بارے میں ملاحظہ ہو: سید ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، حوالہ مذکورہ، صفحات ۹۵-۱۰۵۔ مؤخر الذکر کے خیالات و افکار کے لئے ملاحظہ ہو، کتاب مذکورہ، صفحات ۶۱-۶۶) مملکت پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف، جو

Marfat.com

"روشن خیال واعتدال پسند اسلام" کے تصور کے علمبردار و پرچارک ہیں اور اسلام اور مغربی تہذیب کے مابین موافقت وہم آہنگی چاہتے ہیں، بھی اسلام اور سیکولرازم کے مابین کوئی فرق واختلاف خیال نہیں کرتے، نہ ہی وہ مغربی طرز زندگی، طرز لباس وطرز بود وباش کو اسلام کی تہذیبی وسماجی قدروں کے منافی خیال کرتے ہیں۔ مزید برآں نظام تعلیم کو کلی طور پر سیکولر بنیادوں پر قائم کرنا چاہتے ہیں (ترکی کے مصطفیٰ کمال، ایران کے رضا شاہ ومحمد رضا شاہ پہلوی اور افغانستان کے امیر امان اللہ خاں کی طرح)۔ جنرل پرویز مشرف کے طرز فکر وخیالات اور ان کے تنقیدی جائزہ کے لیے ملاحظہ ہو: پروفیسر خورشید احمد "کونسا اسلام؟ بش اور مشرف کا یا محمد عربی کا؟"، ترجمان القرآن، ۱۳۲، ۳:۳ (مارچ ۲۰۰۵ء)، صفحات ۳-۲۸۔

28) *Islam at the Crossroads*, pp. 36-37, 41-42, 44-45; Muhammad Asad, "The Causes of Our Stagnation", *Arafat*, 1:4 (Dec. 1946), pp. 99-100

اسد نے مغربی تہذیب وتمدن کے جن تشکیلی عناصر اور اس کے بنیادی خصائص کا ذکر کیا ہے ان کو متعدد دوسرے اہل علم نے بھی صراحت سے اجاگر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: سید حسین نصر "مغربی ثقافت کی جڑیں" (مترجمہ: نذیر الدین مینائی)، عالم اسلام اور عیسائیت، ۸، ۱:۱ (جنوری-مارچ ۱۹۹۸ء)، صفحات ۱۴-۲۸ مزید ملاحظہ ہو:

Syed Muhammad Naquib Al-Attas, *Islam and Secularism*, Lahore: Suhail Academy, 1998, pp. 1-14.

29) *Islam at the Crossroads*, p. 43

30) Muhammad Asad, "Is Religion a Thing of the Past?", *Arafat*, 1:2 (Oct. 1946): 38-40; *Islam at the Crossroads*, pp. 36-37

31) Is Religion a Thing of the Past?, op. cit., pp. 41-42, 46.

قوم پرستی کے جن مفاسد کی اسد نے نشان دہی کی ہے، آرنلڈ جے ٹائن بی نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ اس کی رائے میں قوم پرستی کا تصور ایک بدی اور تخریبی قوت ثابت ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو:

Arnold J. Toynbee, *Christianity Among the Religions of the World*, New York: Charles Scriber's Sons, 1957, pp. 79-81.

32) "Is Religion a Thing of the Past?" op. cit. pp. 40-42, 46

33) *Islam at the Crossroads*, p. 34.

34) Ibid. pp. 32-33, 36-55-56; *The Road to Mecca*, pp. 70-71

35) Ibid. pp. 57-58; Ibid. pp. 55-59,70-71.

Marfat.com

اسد نے مغربی تہذیب کے جن تاریک پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ الجزائری مفکر مالک بن نبی اور بوسنیا کے سابق صدر عالی جاہ عزت بیگووچ (۱۹۲۵ء-۲۰۰۳ء) نے بھی اس کو خوب اجاگر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

Alija Ali Izetbegovic, *Islam between East and West,* Indianpolis: American Trust Publications, 2nd rev. edn. 1989; Malek Bennabi, *Islam in History and Society* (Trans. Asma Rashid), Islamabad: Islamic Research Institute, 1988, pp. 33,61-72.

۳۶۔ دجال کے قیامت سے قبل ظہور اور اس کے اوصاف کا تذکرہ تفصیل سے احادیث و روایات میں وارد ہوا ہے۔ کتب احادیث میں اس کا بالعموم تذکرہ کتاب الفتن والملاحم کے ذیل میں ہوا ہے' ملاحظہ ہو: صحیح مسلم' کتاب الفتن' باب ذکر الدجال' حدیث ۷۳۶۱-۷۳۸۲ وسنن ابی داؤد' باب خروج الدجال' حدیث ۴۳۱۵-۴۳۲۴

37) *The Road to Mecca,* pp. 292-295; see also: Muhammad Asad, "And Why Not Western Civilization?" *Arafat,* 1:6 (Feb. 1947), pp. 187-190.

اسد کے علاوہ بعض دوسرے مسلم دانش وروں' بشمول مولانا عبدالماجد دریابادی' نے بھی مغربی تہذیب و تمدن کو دجال سے تعبیر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: مولانا عبدالماجد دریابادی: اسلام-مسلمان اور تہذیب جدید (مرتبہ: محمد موسیٰ بھٹو)' حیدر آباد: سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ' ۲۰۰۴ء' بمواقع عدیدہ۔ بھارتی مسلم دانش ور اسرار عالم نے تو دجال کے عنوان سے دو جلدوں میں کتاب تصنیف کی ہے' جس میں جدید مغربی طاقتوں اور ان کی آلہ کار اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کو دجال کے ظہور کی پہلی باضابطہ شکل قرار دیا گیا ہے۔ ان کی رائے میں اقوام متحدہ کا چارٹر' مسیح دجال کا چارٹر ہے۔ عالم اسلام پر عالم مسیحیت و یہودیت کا غلبہ اور اقوام متحدہ کا قیام ظہور دجال ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ ملاحظہ ہو: اسرار عالم: دجال' لاہور: ادارہ تخلیقات' ۲۰۰۴ء' خصوصاً ج ا' باب ا (ضرورت مجالہ) صفحات ۱۱-۸۴۔ قادیانیوں کی لاہوری شاخ کے امیر مولانا محمد علی لاہوری نے بھی مغرب کی مسیحی اقوام اور ان کی تہذیب و تمدن بالخصوص سائنس اور ٹیکنالوجی میں اس کی حیرت انگیز ترقیوں اور اکتشافات و ایجادات کو دجال سے تعبیر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: مولانا محمد علی لاہوری: بیان القرآن' لاہور: احمدیہ انجمن اشاعت اسلام' ۱۳۸۸ھ' ۲:۸۱۱-۸۱۵۔ دجال کی حقیقت اور اس کے ظہور کے بارے میں مسلمانوں کے مختلف کلامی مسالک کے تصورات اور دور جدید کے بعض مصلحین اور دانش وروں (بشمول محمد اسد) کے نقطہ نظر کے لئے ملاحظہ ہو:

Zeki Saritopark, "The Legend of *al-Dajjal* (Anti-Christ): The Personification of Evil in the Islamic Tradition", *The Muslim Wrold,* 93:2 (2003): 291-308.

Marfat.com

38) *The Road to Mecca*, pp. 292-293.

39) Ibid. pp. 294, 308-31 0

اسد نے قرآن حکیم کی سورت التکاثر کی تفسیر میں بڑے بلیغ انداز میں جدید دور کی مادیت پرستی اور اس کے ہولناک نتائج کا ذکر کیا ہے۔ محمد اسد کو اس سورۃ میں جدید مغرب کی حقیقی تصویر نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

Muhammad Asad, *The Message of the Qur'an*, Gibraltar: Daral-Andelus, p. 973,fn. 1,3

40) *The Road to Mecca*, pp. 294-295. See also. Muhammad Asad, "Construction or Destruction?," *Arafat*, 1 :6 (Feb. 1947): 187-188, 191-192.

41) Muhammad Asad, "That Business of Imitation", *Arafat*, 1:7 (April 1947) p. 203.

42) "That Business of Imitation", op, cit., pp. 215; See also, "Construction or Destruction"? op. cit., pp. 190-191 ; *The Road to Mecca*. p. 305

42-b) *Construction or Destruction?*, op. cit., pp. 190-191 .

43) *The Road to Mecca*, p. 295; See also: *Construction or Destruction'?* op. cit. p. 191

۴۴۔ البقرہ۲: ۱۷-۱۸

۴۵۔ مولانا عبدالماجد دریابادی: تفسیر ماجدی، کراچی: مجلس نشریات اسلام ۱۹۵۹ء، ج ا، ص: ۷۰-۷۱

۴۶۔ مغربی تہذیب کے بارے میں ڈاکٹر محمد اقبال کے افکار و خیالات کے جائزہ کے لیے ملاحظہ ہو: خلیفہ عبدالحکیم: فکر اقبال، لاہور: بزم اقبال ۱۹۸۸ء (ساتواں باب: مغربی تہذیب و تمدن پر علامہ اقبال کی تنقید) صفحات ۱۹۳-۲۳۹۔ عبدالمغنی، "تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ: فکر اقبال کی روشنی میں"، سہ ماہی اقبال (لاہور) ۴۹: ۱، ۲ (جنوری-اپریل ۲۰۰۲ء)، صفحات ۱۳-۴۰؛ خالد علوی: اقبال اور مسلم تشخص، اسلام آباد: دعوۃ اکیڈمی ۲۰۰۲ء۔ مالک بن نبی کی تنقید تہذیب مغرب کے بارے میں ملاحظہ ہو:

Malek Bennabi, *Islam in History and Society*, pp. 33, 62-72.

46ب) "Is Religion a thing of the Past?", *Arafat*, 1:2 (Oct. 1946), p. 49; *The Road to Mecca*, pp.2-3, 295.

Marfat.com

۴۷۔ ان مغربی دانش وروں میں آرنلڈ جے۔ٹائن بی سے لے کر سیموئل ہنٹنگٹن اور فرانسس فوکویاما تک ایک گروہ کثیر شامل ہے۔آرنلڈ جے۔ٹائن بی جو مغربی تہذیب وتمدن طرز حیات اور اس کے نظام سیاست وحکومت نیز اس کے تیسری دنیا میں سرعت سے نفوذ پر نازاں ہے۔مغرب کے سیاسی تجربات اور اس کے جمہوری و سیاسی اداروں کو انسانی فکر وفہم اور اجتہادات واختراعات کی معراج خیال کرتا ہے۔ملاحظہ ہو:

Arnold J. Toynbee, *The Present Day Experiment in Western Civilization,* London: Oxford University Press, 1962, pp. 24-50; Idem. *The World and the West,* London: Oxford University Press, 1954, pp. 1-84.

فرانسس فوکویاما جدید مغرب بالخصوص امریکہ کے سیاسی و معاشی نظام اور اس کی تہذیبی وسماجی اقدار کو عقل انسانی کی آخری اور قطعی وحتمی دریافت خیال کرتا ہے۔ملاحظہ ہو:

Francis Fukuyama, "History and September 11", Kenbooth and Tim Dunne (Eds.), *Worlds in Collision: Terror and the Future of Global Order,* New York: Palgrave Macmillan, 2002, pp. 28-29

فوکویاما کا کہنا ہے کہ انسانی تاریخ اپنے ارتقاء کے سارے مراحل طے کر چکی ہے اور اس کا آخری ثمرہ مغرب کا سیکولر جمہوری نظام اور آزاد منڈی کی معیشت ہے۔اب کوئی منزل سر کرنے کے لئے نہیں بچی' اب کوئی نیا نظام نہیں آئے گا۔ جب کہ ہنٹنگٹن کا کہنا ہے کہ مغربی تہذیب جو اس وقت عالمی تہذیب ہے اور جو ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے کر اسے یک رنگ بنانے کے چکر میں ہے' اس کا دوسری تہذیبوں بالخصوص اسلامی تہذیب سے تصادم ناگزیر ہے۔فوکویاما کے خیالات کے تفصیلی مطالعہ کے لیے دیکھیے:

Francis Fukuyama, *The End of History and the Last Man,* London: Penguine, 1993.

سیموئل ہنٹنگٹن اور فرانسس فوکویاما کے خیالات کے تنقیدی جائزہ کے لیے دیکھیے: عبدالقدیر سلیم "مغرب اور اسلام- تہذیبوں کا تصادم"، ترجمان القرآن، ۱۲۷:۳ (مارچ ۲۰۰۰ء) صفحات ۴۳-۵۶۔

۴۸۔ امریکی صدر جارج بش اور دیگر عہدیداران ملکی تو اس کا اظہار کئی بار کر چکے ہیں۔اطالوی وزیر اعظم سلویو برلسکونی (Silvio Berlusconi) نے بھی یہ دعویٰ کرنا ضروری خیال کیا کہ مغربی تہذیب کو اسلامی تہذیب پر بلاشک و تردد تفوق وفضیلت حاصل ہے۔موصوف کے الفاظ میں:

"We should be conscious of the superiority of our civilization which consists of a value system that has given people

Marfat.com

widespread prosperity in those countries that embrace it, and guarantees respect for human rights and religion. This respect certainly does not exist in the Islamic countries". See: U. Schmetzer, "Leader says Islam is Inferior to the West", *Tribune News Services*, September 28, 2001 .

بحوالہ

Abdelaziz Testas, "Models of Cultural Exclusion and Civilizational Clashes", *Islam and Christian-Muslim Relations,* 14:2 (2003): 183.

صدر بش اور اٹلی کے وزیر اعظم کے خیالات کے بارے میں ملاحظہ ہو: ارشاد احمد حقانی ''مغربی اور غیر مغربی دنیا کی کشیدگی-صدر بش کا سطحی تجزیہ''، روزنامہ جنگ، ۳/اکتوبر ۲۰۰۱ء، ص ۱۰۔

48ب) *The Road to Mecca*, pp. 295-296

''کیونکہ مغربی تہذیب انسان کی اجتماعی و انفرادی ضروریات' اس کے جسمانی و مادی مطالبات اور اس کی روحانی امنگوں کے درمیان کوئی توازن پیدا نہیں کرسکی ہے۔ اس نے اپنے قدیم دینی و روحانی سرمایہ اور نظام اخلاقیات کو تو خیرباد کہہ دیا ہے لیکن اس کی جگہ پر کسی دوسرے اخلاقی نظام کا انتظام نہیں کرسکی...... مغربی اقوام بے پناہ علمی و سائنسی ترقیوں کے باوجود اپنی سفلی و احمقانہ خواہشات پر قابو پانے میں ناکام رہی ہے۔ مغربی اقوام کی لامحدود و بے لگام علمی و سائنسی ترقیاں' اپنے جلو میں جنگ و جدل' عالمگیر بدامنی' انتشار و انارکی اور افراتفری و بےچینی کو لیے ہوئے ہیں...... ایک سچے مذہب کی تعلیمات سے محروم مغربی انسان اپنی علمی و سائنسی ترقیوں کی روشنی سے حقیقی فائدہ اٹھانے سے قاصر و عاجز ہے۔ مقام تعجب ہے کہ اس سب کے باوجود عقلی غرور اور تہذیبی انانیت میں مبتلا مغرب کے لوگ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ انہی کی تہذیب دنیا کو روشنی اور مسرت و سعادت عطا کرسکے گی۔ چنانچہ اگر اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں انہوں نے مسیحیت کی دنیا بھر میں اشاعت اور غلبے کے متعلق سوچا تھا تو آج وہ مسیحیت کی بجائے مغربی تہذیب اور طرز حیات کو دنیا پر مسلط کرنے اور اس عقیدہ کی اشاعت کے لیے کوشاں ہیں کہ تمام تر انسانی مسائل کارخانوں' تجربہ گاہوں اور اعداد و شمار کے مراکز (Desks of Statistics) میں حل کیے جاسکتے ہیں۔''

49) "Is Religion a Thing of the Past?", *Arafat,* 1 :2 (Oct. 1946): 49.

50) Muhammad Asad, "Construction or Destruction?" *Arafat* 1:6 (Feb. 1947): 1 87-1 88; See also: *The Road to Mecca,* pp. 294-295.

51) *Islam at the Crossroads,* p. 99.

Marfat.com

52) *Islam at the Crossroads,* pp. 98-99

53) Ibid. pp. 2-3, 40-41

54) Ibid. pp. 32-33; Muhammad Asad, "This Law of Ours", *Arafat,* 1:4 (Dec. 1946), pp. 101-103

55) Muhammad Asad, "Construction or Destruction", pp. 170-174.

56) Muhammad Asad, "The Outline of a Problem", *Arafat,* 1:1 (Sep. 1946), pp. 31-32.

57) *Islam at the Crossroads,* p. 54.

۵۸۔ اسد نے اپنی تصانیف میں سے The Road to Mecca اور Islam at the Crossroads کے علاوہ مجلّہ ''عرفات'' میں مطبوعہ اپنے مقالات میں بتفصیل دونوں تہذیبوں کی روح، ان کے منابع اور خارجی مظاہر کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے اور ان کے مابین موجود جوہری فرق واختلاف کو واضح کیا ہے۔

59) "Is Religion a Thing of the Past?", op. cit.,pp. 41 , 59

60) "The Outline of a Problem", op. cit,. pp. 14-15; *Islam at the Crossroads,* pp. 109-1 10

61) *Islam at the Crossroads,* p. 61

62) Ibid. pp. 103, 106-107; "Construction or Destruction?" op. cit., p. 184

63) Ibid. pp. 101, 109-110, 150

64) Ibid. pp. 108-109, 184

65) Ibid. pp. 100, 104-105; That Business of Imitation, op. cit., .p. 212.

جدید ایران میں مغربیت (غرب زدگی) کے خلاف زوردار آواز وہاں کے مشہور افسانہ نگار و ناول نویس جلال آل احمد (۱۹۲۳ء-۱۹۶۹ء) نے بلند کی۔ اس نے محمد رضا شاہ (۱۹۴۱ء-۱۹۷۸ء) کی طرف سے ملک میں مغربی تہذیبی و معاشرتی اقدار کی ترویج کو ایرانی قوم کی تہذیبی وسماجی تشخص وخودارادیت کو ملیامیٹ کرنے کے مترادف قرار دیا تھا۔ اس نے مغربیت (Westernization) یعنی ملک و معاشرہ کو مغربی رنگ میں رنگ دینے کی پالیسی کو ''غرب زدگی'' کا نام دیا۔ جلال آل احمد کے بعد یہ اصطلاح بالخصوص تجدد ومغربیت کے ناقدین ومخالفین کی تحریروں میں کثرت سے استعمال ہوتی رہی۔

Marfat.com

جلال آل احمد کی تنقید مغرب کے بارے میں ملاحظہ ہو:

Jalal Al-i-Ahmad, *Occidentosis: A Plague From the West* (Trans. R. Campbell; ed. Hamid Algar), Berkeley: Mizan Press, 1984; Wahid Akhtar "The Evil of Westernization - A Review Article", *Al-Tawhid,* IV:1 (Sep. - Nov. 1986): 153-170.

66) "The Outline of a Problem", op. cit., p. 16; *Islam at the Crossroads,* p. 109.

67) "Is Religion a Thing of the Past?", op. cit., pp. 53-54, 59; *Islam at the Crossroads,* pp. 101-104

68) *Islam at the Crossroads,* p.103; "That Business of Imitation", op. cit., p. 200.

69) "That Business of Imitation", op. cit., p.205

70) *Islam at the Crossroads,* p. 103

71-A) "That Business of Imitation", op. cit., pp. 205-206

71-B) *Islam at the Crossroads,* pp. 103-107.

72) Ibid. pp. 99-100

73) Ibid. p. 91

74) Ibid. pp. 83-84

75) Ibid. pp. 85-86

76) " That Business of Imitation", op. cit., pp. 193-194,199, 204.

77) *Islam at the Crossroads,* pp. 94-95

مغربی ادب کے جن خصائص اور ان کے اثرات و نتائج کا تذکرہ محمد اسد نے کیا ہے اس کے ثبوت کے لیے لمبے چوڑے دلائل اور شواہد کی ضرورت نہیں۔ یورپ کے کم و بیش تمام ادبی شہ پارے مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں تعصب و تنگ نظری سے مملو ہیں (ملاحظہ ہو: حبیب الحق ندوی، ''مغرب کے عالم ادبی شہ پارے مذہبی شہ پارے ہیں''، جریدہ (کراچی)، عدد ۲۴ (۲۰۰۴ء)، صفحات ۱۹۹-۲۱۲)۔ دانتے (Dante) کے ادبی شہ پارے *The Divine Comedy* کو اس ضمن میں ایک اعلیٰ مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں پیغمبرؐ اور آپؐ کے پیروؤں کی حد درجہ تضحیک کی گئی ہے۔ انگریزی زبان کے مشہور شاعر اور افسانہ نگار

Marfat.com

چاؤسر (Chaucer) نے بھی اپنی نگارشات میں اپنے مذہبی عقائد اور وقت کے عام دینی رجحانات کو سمونے کی کوشش کی ہے جبکہ اسلام کو تمسخر واستہزاء کا نشانہ بنایا ہے۔ غرض دانتے اور چاؤسر کے ادبی شہ پاروں میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں قدیم تعصبات اور غلط فہمیوں کا خوب اظہار ہوا ہے۔ دانتے کی ادبی تخلیقات کے تنقیدی جائزہ کے بارے میں ملاحظہ ہو: حبیب الحق ندوی، "مغرب کے عالمی ادبی شہ پارے مذہبی شہ پارے ہیں"، حوالہ مذکورہ، صفحات ۲۰۹-۲۱۲۔ مزید ملاحظہ ہو:

Shawkat Toorawa, "Muhammad, Muslims and Islamophobia in Dante's *Commedia*", *The Muslim World,* LXXXII: 1 -2 (1992): 133-143.

چاؤسر کے ادبی شہ پارے *Canterbury Tales* کے تنقیدی جائزہ کے لئے ملاحظہ ہو:

Brenda Deen Schildgen, *Pagans, Tartars, Moslems and Jews in Chaucer's Canterbury Tales,* Gaineville: University Press of Florida, 2001 .

مغربی ادب میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں موجود تعصبات کے عمومی جائزے کے لئے ملاحظہ ہو:

Norman Daniel, *Islam, Europe and Empire,* op. cit. pp. 20-35; Reid Barbour, *Literature and Religious Culture in Seventeenth-Century England,* Cambridge: Cambridge University Press, 2002; Cynthia Scheinberg, *Woman's Poetry and Religion in Victorian England: Jewish Identity and Christian Culture,* Cambridge: Cambridge University Press, 2000.

78-A) *The Road to Mecca,* pp.3-5; *Islam at the Crossroads,* p. 97

78-B) Muhammad Asad, *The Principles of State and Government in Islam,* Gibraltar: Dar al-Andalus, 1980,p.98.

محمد اسد نے یورپی تاریخ سے متعلق جس حقیقت کی نشاندہی کی ہے۔ اس ضمن میں یورپی مؤرخین میں سے اشپنگلر کی The Decline of the West' ٹائن بی کی A Study of History اور ایڈورڈ گبن کی The Rise and Fall of Roman Empire کو تاریخ کی تشریح وتعبیر کے اس اسلوب کے اعلیٰ نمونے کے بطور پیش کیا جاسکتا ہے۔ مغربی مؤرخین کی کتب (یورپی وامریکی تاریخ پر) کے اندر اسلام اور مسلم افراد سے تعصب و عناد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اندلس اور مشرقی یورپ (کہ جہاں صدیوں تک مسلم۔مسیحی تصادم وکشمکش برپا رہی) تو

Marfat.com

ایک طرف لاطینی امریکہ کے تاریخی مآخذ میں بھی یہ عنصر بہ تمام وکمال موجود ہے۔ملاحظہ ہو:

Rukhsana Qambar, "Anti-Islamic Bias in Sources on Latin America: Preliminary Findings", *Islamic Studies,* 42: 4 (2003): 651-685.

79) *Islam at the Crossroads,* p. 94.

80) Ibid. p. 95.

81) Ibid. p. 98.

۸۲۔ مذکورہ مسلم ممالک میں تجدد و مغربیت خصوصاً جدید مغربی تعلیم کے اثرات کے جائزہ کے لئے ملاحظہ ہو:

Hamilton A.R. Gibb, *Modern Trends in Islam,* Chicago: University of Chicago Press, 1978, pp.51 -52; Muhammad Fadhel Jamali, "The Impact of Western Education on the Muslim World: Some Major Problems Facing It", *The Islamic Review,* 54:11 (Nov. 1966): 5-10; Malek Bennabi, *Islam in History and Society,* op. cit., pp. 2-58; Reza Arasteh, *Education and Social Awakening in Iran,* Leiden: E.J. Brill, 1962, pp. 1 14-133.

۸۳۔ جدید مغربی تعلیم پر علامہ محمد اقبال کے تنقیدی افکار و خیالات کے بارے میں ملاحظہ ہو: سید ابوالحسن علی ندوی: نقوش اقبال' کراچی: مجلس نشریات اسلام' ۱۹۸۳ء، صفحات ۸۵-۹۶۔

۸۴۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی انتظامیہ نے اصلاح نصاب اور اس میں دینیات کے عنصر کے اضافہ کے لیے ایک مجلس (مجلس اصلاح نصاب و دینیات) تشکیل دی تھی' جس نے اس سلسلہ میں ممتاز اہل علم' جن میں سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی شامل تھے' سے تجاویز طلب کیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اصلاح احوال کی غرض سے علی گڑھ میں رائج نظام تعلیم میں موجود بنیادی و اصلی نقص کی نشان دہی کی اور مسلمانوں کے لیے جدید تعلیمی پالیسی کی تفصیل سے وضاحت کی۔ سید مودودی کی ان تجاویز اور تعلیمی اسکیم کے بارے میں ملاحظہ ہو: سید ابوالاعلیٰ مودودی: تعلیمات' لاہور: اسلامک پبلی کیشنز' ۱۹۸۲ء، صفحات ۷-۵۰۔

۸۵۔ سید ابوالحسن علی ندوی کے خیالات کے لئے ملاحظہ ہو: انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر' کراچی: مجلس نشریات اسلام (س-ن)، خصوصاً مقدمہ، حوالہ مذکورہ، صفحات ۱۴-۲۶؛ وہی مصنف: تاریخ دعوت و عزیمت، کراچی: مجلس نشریات اسلام' ۱۹۸۲ء ج ۱، مقدمہ۔ سید قطب کے خیالات کے بارے میں ملاحظہ ہو: سید قطب. اسلام میں عدل اجتماعی (مترجمہ: ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی)، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، صفحات ۵۵۲-۵۶۸۔

Marfat.com

۸۶۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش' حوالہ مذکورہ، صفحات ۱۱-۱۲۔

۸۷۔ خالدہ ادیب خانم: ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش (مترجمہ: سید عابد حسین)، دہلی: مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ' ۱۹۳۵ء؛ سید ابوالحسن علی ندوی: مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش' بمواقع عدیدہ۔

۸۸۔ اس سلسلہ میں پرنس سعید حلیم پاشا (۱۸۶۵ء-۱۹۲۱ء) اور علامہ محمد اقبال کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ سعید حلیم پاشا کے افکار و خیالات کے بارے میں ملاحظہ ہو: سعید حلیم پاشا: خدا کی بادشاہت (مترجمہ: مولانا سید ہاشمی فرید آبادی)، لاہور: دفتر جمعیت دعوت و تبلیغ اسلام' ۱۹۲۷ء، مزید ملاحظہ ہو: محمد ریاض، ''اقبال اور سعید حلیم پاشا''، اقبال ریویو، ۱۲:۲ (جولائی ۱۹۷۱ء)، صفحات ۴۸-۶۲۔

۸۹۔ مولانا ابوعمار زاہد الراشدی، ''عالم اسلام اور مغرب: متوازن رویے کی ضرورت''، ماہنامہ الشریعۃ (گوجرانوالہ)، ۱۶:۳ (مارچ ۲۰۰۵ء)، ص ۲۔

۹۰۔ مولانا ابوعمار زاہد الراشدی ''عالم اسلام اور مغرب: متوازن رویے کی ضرورت''، ص ۲۔

۹۱۔ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی ''تحریک اسلامی - آج کے چند غور طلب مسائل''، ترجمان القرآن، فروری ۱۹۹۶ء، ص ۵۴-۵۶، ۵۹۔

92) *Islam at the Crossroads*, pp. 89-90,100

93) Ibid. p. 92-93

94) Ibid. p. 100

95) Ibid. p. 93.

96) Ibid. p. 93.

۹۷۔ علوم کی اسلامی تشکیل کے تصور کے جائزہ کے لئے ملاحظہ ہو:

Taha J. al-Alwani, "The Islamization of Knowledge: *Yesterday and Today*", *American Journal of Islamic Social Sciences*, 12:1 (1995): 81-101; A.K. Brohi, *A Faith to Live by*, Islamabad: National Hijra Council, 1984, Ch.II "(Islamization of Knowledge)", pp. 215-226.

۹۸۔ اسد کے معاصرین میں سے سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جدید سماجی و سائنسی علوم کو الحاد و لادینیت سے پاک اور انہیں اسلامی نظریہ حیات کے تابع کرنے کی ضرورت کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا۔ اس ضمن میں ان کے افکار و خیالات کے جائزہ کے لئے ملاحظہ ہو:

Abdul Rashid Moten, "Islamization of Knowledge in Theory

Marfat.com

and Practice: The Contribution of Sayyid Abul Ala Mawdudi", *Islamic Studies*, 43:2 (2004): 247-272

گذشتہ صدی کی آخری دو دہائیوں میں جدید سماجی وطبعی علوم کی اسلامی تشکیل کا موضوع مسلمان اہل علم کی خصوصی توجہ کا مستحق ٹھہرا۔ اس تصور کو عملی صورت دینے میں جن مسلم دانشوروں نے اہم کردار ادا کیا' ان میں اسماعیل راجی فاروقی شہید (م:۱۹۸۶ء) بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے خاص اس مقصد سے امریکہ میں ایک ادارہ عالمی ادارہ فکر اسلامی (International Institute of Islamic Thought) کے نام سے قائم کیا۔ جدید علوم کی اسلامی تشکیل کے بارے میں اسماعیل راجی الفاروقی کے خیالات نیز اس باب میں ان کی عملی مساعی کے بارے میں ملاحظہ ہو:

Ataullah Siddiqui, "Ismail Raji al-Faruqi: From Urubah to Ummatic Concerns", *American Journal of Islamic Social Sciences*, 16:3 (1999): 1-25; Ismail R. Al-Faruqi, "Islamization of Knowledge" *Knowledge for What?*: Proceedings and Papers of the Seminar on Islamization of Knowledge, Islamabad: National Hijra Council, 1986, pp. 1-50.

۹۹۔ پروفیسر خورشید احمد، ''تہذیب کا مستقبل اور اسلام''، ترجمان القرآن ۱۲۹:۴ (اپریل ۲۰۰۲ء)، ص ۳-۷

۱۰۰۔ ٹائن بی کے الفاظ میں:

Possibly experience has already shown that this attempt to pick and choose (aimed at receiving from the West the maximum amount of Western technology while taking the minimum amount of the rest of our civilization) may not be practicable in the long run. If you once commit yourself to taking one element from some alien civilization you may find yourself led on, in unexpected ways, into being constrained also to receive other, elements which, at first sight, might seem to have no connection with the element that you have originally taken intentionally and deliberately. In the long run, it may not be possible to take a part and leave the rest; what

Marfat.com

that is all the non-western civilization have been trying to do during the last two hundred years. They have been trying to take as much possible of our technology and as little as possible of the rest of our civilization."

Arnold J. Toynbee, *Christianity Among the Religions of the World,* New York: Charles Scribner's Sons, 1957, p. 51

آرنلڈ جے۔ ٹائن بی نے اپنی بعض دوسری تصانیف میں بھی اسی نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

Arnold Toynbee, *The World and the West,* Oxford: Oxford University Press, 1954, pp 66-84. pp 99-100; Idem. *Civilization On Trial,* London and N. York: Oxford University Press, 1949, pp. 184-212.

۱۰۱۔ ہملٹن گب کے الفاظ میں:

A wave of antipathy, if not contempt, for every thing to do with Western civilization has of late become manifest in the Arab World . The plain truth of the matter is that "modernization" means "westernization". But on the other hand, it would be impossible for the Arabs [Muslims] to follow the path taken by the Turkish Rupublic without losing their identity completely. This, then, is the question:how in a world in which technology is making progress at a ever vaster scale, can the social values and cultural ideals of Islam be reaffirmed in such a way as to rebuild a stable society endowed with a vigorous and homogeneous social order capable of playing an active and constructive role.

Hamilton A.R. Gibb, *Studies on the Civilization of Islam,* (1962), repr. Lahore: Islamic Book Service, 1987, p. 331.

ہملٹن گب کی رائے میں جدید دنیائے اسلام کو درپیش مسائل کا واحد حل صرف اور صرف غرب زدگی

Marfat.com

(Westernization)ہی میں پنہاں ہے۔ بالفاظ دیگر اگر جدید دنیائے اسلام مغربیت کی روش اختیار کر لے تو اس کو درپیش موجودہ بحران سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

Hamilton Gibb, *Modern Trends in Islam,* Chicago: University of Chicago Press, 1945, reper 1972.

102) *Islam at the Crossroads,* p. 99-1 00.

۱۰۳۔ بعض مغربی خصوصاً امریکی دانش ور جن میں برنارڈ لیوئس (Bernard Lewis)، ڈینیئل پائپس (Daniel Pipes) اور سیموئیل ہنٹنگٹن (Samuel Huntington) سرفہرست ہیں 'اسلام اور مغرب (دنیائے اسلام اور دنیائے مغرب) کے مابین تصادم کو ناگزیر گردانتے ہیں اور اس مزعومہ تصادم میں پہل کا ذمہ دار بھی اسلام کے پیروؤں کو گردانتے ہیں۔ چنانچہ وہ ان کے خلاف قوت و طاقت کے بھرپور استعمال کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ مذکورہ امریکی دانش وروں کے خیالات کے بارے میں ملاحظہ ہو: خورشید احمد، ''تہذیبوں کا تصادم۔ حقیقت یا واہمہ''، ماہنامہ ترجمان القرآن (لاہور)، ۱۳۳:۵ (مئی ۲۰۰۶ء)، ص ۳-۱۴۔ مزید دیکھیے:

Bernard Lewis, "The Roots of Muslim-Rage", *Atlantic Monthly,* 266:3 (Sep. 1990): 47-60; Daniel Pipes, *Militant Islam Reaches America",* New York: W. Norton & Company, 2002, especially Part-1 , Ch-1 ("Islam a Threat?") and Ch.2 ("The Imaginary Green Peril") pp. 3-37; Samuel Huntington, *Clash of Civilization and the Remaking of the World,* N. York: Simon & Schuster, 1997; Idem. "The Age of Muslim Wars," *The Newsweek,* Dec. 2001, pp. 6-13.

John L. Esposito, *The Islamic Threat: Myth or Reality?* New York: Oxford University Press, pp. 219-221, 226-232; Edward W. Said, *Reflections on Exile and other Literary and Cultural Essays,* London: Granta Books, 2001 , pp.1 98-215, 569-592; Idem. "Orientalism Revisited", Daily *Dawn* (Lahore), August, 12, 2003; Mohammed M. Karabal, "Clash of Civilizations or Clash of Religions", *American Journal of Islamic Social Sciences,* 11:1 (1994): 132-135.

Marfat.com

مذکورہ مستشرقین کے ان خیالات کے مضمرات خصوصاً دنیائے اسلام کی اسلامی تحریکوں کے بارے میں امریکی پالیسی پر ان کے اثرات کے جائزہ کے لیے دیکھیے:

Graham E. Fuller, *The Future of Political Islam,* New York: Palgrave, 2003, Ch.8 ("Islamism and the West: Huntingtion and the Clash of Civilizations"): 145-165.

104) "There can be no doubt that a better understanding between the two cultural entities is endeed most desirable in the interests of the whole world and the world's future".

Muhammad Asad, "The Encounter of Islam and the West", *This Law of Ours,* op. cit., pp. 121-122.

105) Ibid..

۱۰۶۔ اسد کے متذکرہ بالا خیالات و آراء میں امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کے اس استفسار' جو اس نے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو پیش آنے والے حادثات کے دس روز بعد امریکی کانگرس سے خطاب کے دوران حیرانی و سرگردانی کے عالم میں کیا تھا' کہ Why Muslims hate America? (مسلمان امریکہ سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟) کا جواب بھی موجود ہے۔ صدر بش نے از خود اس کے اسباب و محرکات کا تجزیہ بھی پیش کیا تھا' جس میں اس نے دنیائے اسلام کے بارے میں امریکہ کے ان استعماری ہتھکنڈوں اور طور طریقوں' جو سابقہ نو آبادیاتی طاقتوں کا طرہ امتیاز تھے' سے متعلق تجاہل عارفانہ کا اظہار کیا تھا۔ اس نے امریکی خارجہ پالیسیوں میں کسی خامی اور نقص کو تسلیم کرنے کے بجائے مخالفین کو سراسر گمراہ اور غلط کار ٹھہرایا۔ صدر بش کے مذکورہ خطاب کے اہم نکات اور اس کے تنقیدی جائزہ کے لیے ملاحظہ ہو: ارشاد احمد حقانی' "مغربی اور غیر مغربی دنیا کی کشیدگی- صدر بش کا تجزیہ"' روزنامہ جنگ' ۳/ اکتوبر' ۲۰۰۱ء' ص ۱۰۔

۱۰۷۔ ممتاز مسلم دانش ور محمود مصطفیٰ ایوب (م: ۲۰۰۳ء) کی نگاہ میں بھی اسلام اور مغرب کے مابین مکالمہ و مفاہمت کی راہ میں بڑی رکاوٹیں: مغرب کا استعماری و نو آبادیاتی کردار' دنیائے اسلام میں مغرب کی مسیحی تبشیری سرگرمیاں اور استشراق (Orientalism) ہیں۔ چنانچہ جب تک ان تینوں امور و مسائل کے بارے میں مغرب کے طرز فکر و عمل میں کوئی تبدیلی نہیں رونما ہوتی' دنیائے اسلام کے ساتھ اس کے تعلقات میں مفاہمت اور بہتری رونما نہیں ہو سکتی۔ ملاحظہ ہو:

Alwi Shihab, "Christian- Muslim Relations in the Twenty-first Century", in *Islam and Christian-Muslim Relations,* 15:1 (2004): 67-68.

108) "The Encounter of Islam and the West", p.123.

Marfat.com

109) *Ibid.*, pp. 126-127.

110) *Ibid.*, p. 126.

111) See Arnold J. Toynbee, *Christianity Among the Religions of the World*, New York: Charles Scribner's Sons, 1 957, pp. 85-93.

112) See: W. Montgomery Watt, *Islam and Christianity Today. A Contribution to Dialogue*, London: Routledge, 1983, pp. 4-5, 144-146.

۱۱۳۔ ڈاکٹر جارج کیری (George Carey) سابق آرچ بشپ-کنٹربری نے جامعہ الازہر (القاہرہ) میں اکتوبر ۱۹۹۵ء میں اپنے خطبہ میں بھی مسلم مسیحی مفاہمت ومکالمہ کے لیے دونوں مذاہب کے مابین بعض مشترک اقدار کو بنیاد بنانے کا تذکرہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

George Carey, "The Challenges Facing Christian-Muslim Dialogue", *Islam and Christian-Muslim Relations*, 7:1 (1996): 95-101 .

معروف مسیحی عالم پروفیسر Hans Küng بھی اسلام اور مغرب کے مابین مکالمہ ومفاہمت کے سلسلہ میں مذہب و اخلاق ہی کو بنیاد بنانے کے حق میں ہیں۔ ملاحظہ ہو:

Hans Küng, "Christianity and World Religions: The Dialogue with Islam as One Model"، *The Muslim World*, LXXVII:2 (1987): 80-95.

۱۱۴۔ امریکی دانش ور گراہم ای۔فلر (Graham E. Fuller) بھی دنیائے اسلام اور امریکہ کے مابین تعلقات میں بڑھتی ہوئی تلخی ومخاصمت کو کم کرنے کے لئے دونوں کے مابین مکالمہ ومفاہمت کو ضروری خیال کرتا ہے تاہم وہ ایک دوسرے طریقے سے اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اسلام کے عقائد وتعلیمات اور اس کے قدیم روایتی تہذیبی، سماجی ڈھانچے کو مسلمانوں کی مغرب سے مفاہمت کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ گردانتا ہے۔ جبکہ امریکی دھونس دھاندلی اور ترغیب وترہیب کے ذریعے مسلم ممالک کے نظام تعلیم میں جوہری تبدیلی کے علاوہ دیگر سماجی اصلاحات کو ضروری خیال کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

Graham E. Fuller, *The Future of Political Islam*, New York: Palgrave, 2003, pp. 159-165.

۱۱۵۔ مغرب بالخصوص امریکہ جو صیہونی مشیروں کے اکسانے پر عالم اسلام سے تصادم کی راہ پر چل پڑا ہے اور جو بے پناہ

Marfat.com

اقتصادی وجنگی قوت کے نشہ میں بدمست باعث افہام وتفہیم کی کسی بات کو خاطر میں نہیں لا رہا۔ چنانچہ مسلم دانش وروں کے نزدیک مغرب سے مکالمہ کے امکانات کافی حد تک مخدوش ہو گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو: خالد علوی: ''نئے عالمی نظام کی تشکیل اور امت مسلمہ کی ذمہ داریاں''، دعوۃ (اسلام آباد)، ۱۰:۳ (جون ۲۰۰۳ء)، ص ۳۶؛ فضل الرحمن فریدی: ''اشارات''، ماہنامہ زندگی (نئی دہلی)، ۳۱:۴ (اپریل ۲۰۰۵ء)، صفحات ۳-۷۔ مذکورہ دونوں مسلم دانش وروں کے نزدیک دو فریقوں کے درمیان مکالمہ برابری کی سطح پر ہوتا ہے (جو باقی نہیں رہی) اور کمزور فریق مکالمہ کی حیثیت میں نہیں ہوتا۔ مغلوب اور غالب کے مابین مکالمہ کبھی راہ راست کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتا۔ مغرب قوت کے استکبار کی بنا پر اپنی تہذیب کو بالاتر تہذیب گردانتا ہے اور اس امر کو اپنا فطری حق سمجھتا ہے کہ کمزور اور مغلوب دنیائے اسلام اپنی تہذیب اور ثقافت کو از کار رفتہ سمجھ کر اس کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔ یہ دونوں مسلم دانشور مغرب کے بعض اداروں کی طرف سے منتخب مسلم ''علماء اور دانش وروں'' کے ساتھ مکالمہ کو ایک ڈھونگ اور پاکھنڈ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس کی نتیجہ خیزی کے بارے میں پُر امید نہیں۔ فلسطینی نژاد امریکی مسیحی دانش ور ایڈورڈ سعید (م ۲۰۰۳ء) بھی مغربی یہودی و مسیحی مستشرقین، ذرائع ابلاغ اور حکومتوں کے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں شدید معاندانہ و جارحانہ رویے کی موجودگی میں عالم اسلام اور مغرب کے مابین مفاہمت و مکالمہ کے بارے میں پُر امید نہیں۔ ایڈورڈ سعید کی رائے میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عالم مسیحیت، امریکہ و یورپ کی جارحانہ کارروائیوں، مستشرقین اور ذرائع ابلاغ کے منفی و مذموم پروپیگنڈا کی موجودگی میں عالم اسلام اور مغرب کے مابین مکالمہ و مفاہمت کے امکانات معدوم ہو گئے ہیں:

> ......thus the polarity is deepened and the chance of dialogue between cultures postponed the anti-Islam compaign virtually eliminates the possibility of any sort of equal dialogue between Islam arid the Arabs, and the West or Israel Islamophobia I often think it has been more of a hindrance than a help in understanding what moves people and societies. (Edward W. Said, *Covering Islam,* London: Vintage, 1997, Introduction, pp. xv, xxxv, lix).

116) "The Encounter of Islam and the West", op. cit., p. 127.

117) *Islam at the Crossroads,* Last rev. edn. Gibralter: Dar-al-Andalus, 1982, p. 57, fn. 6.

۱۱۸۔ سید ابوالحسن علی ندوی: نئی دنیا (امریکہ) میں صاف صاف باتیں، کراچی: مجلس نشریات اسلام (س-ن)، ص ۶۱، نیز صفحات ۲۸-۲۹، ۴۰، ۴۲۔

Marfat.com

۱۱۹۔ ایضاً، ص ۴۷۔

۱۲۰۔ ایضاً، ص ۶۲۔ مغرب میں دعوت اسلام کی ضرورت واہمیت کے بارے میں سید ابوالحسن علی ندوی کے خیالات کے بارے میں مزید دیکھئے: سید ابوالحسن علی ندوی: مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں، کراچی: مجلس نشریات اسلام، (س-ن)، صفحات ۴، ۷، ۱۷، ۱۸، ۴۳-۴۵۔

121) Murad W. Hofmann, "Review" [by Jeffery Lang] of *Struggling to Surrender. Some impressions of An American Convert to Islam,* in: *Islamic Studies,* 36:4 (1997): 682.

122) Gai Eaton, *Islam and the Destiny of Man,* Lahore: Suhail Academy. 1997, pp. 11-12.

۱۲۳۔ مراد ہوف مان: ''اسلام: مغرب کے اندیشے اور مسلم ردعمل'' (مترجم: راشد بخاری)، مغرب اور اسلام (اشاعت خاص' خطبات بیاد خرم مراد) ۴: ۳، ۴ (جولائی-دسمبر ۲۰۰۰ء)، صفحات ۴۶-۴۷۔ موصوف نے اپنے بعض دوسرے خطبات میں بھی ایسی ہی خیالات کا اظہار کیا ہے' دیکھیے: مراد ہوف مان: مستقبل اسلام کے سائے میں (مترجم: ن-م)، نئی دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی، ۲۰۰۰ء، ص ۳۲۔

۱۲۴۔ مغرب میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی دعوتی وتبلیغی خدمات کے جائزہ کے لئے ملاحظہ ہو: محمد ارشد: ''مغرب میں دعوت اسلام- ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کاوشوں کا ایک جائزہ''، فکر ونظر (اسلام آباد)، ۴۰، ۴۱: ۴، (اپریل-ستمبر ۲۰۰۳ء)، صفحات ۳۲۹-۳۵۹۔

۱۲۵۔ اس تصنیف کی غرض وغایت کے بارے میں اسد رقم طراز ہیں:

...I began to think seriously about setting down the story of my life and thus helping, in however small a measure, to lift the heavy veil which separates Islam and its culture from the Occidental mind. My way to Islam had been in many respects unique: how many men were able to talk to Westerners about Islam as I could? I was a Muslim - but I was also of Western origin: and thus I could speak the intellectual languages of both Islam and the West". *The Road to Mecca,* p.8.

۱۲۶۔ محمد اسد نے ترجمہ وشرح بخاری کا بیڑا بھی اسی مقصد کے لیے اٹھایا کہ اس کے ذریعے سے جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں اور خصوصاً غیر مسلموں کو رسول اللہ کی تعلیمات کی تبلیغ کر سکیں۔ اسد رقم طراز ہیں:

Marfat.com

A translation of *Sahih al-Bukhari* which is accepted by all Muslims as اصح الکتب بعد کتاب اللہ ("the most authentic book after the Book of Allah") will, so I hope, open the eyes of many English educated Muslims who were never able to read traditions in their original form. It is curious that in all these years no one thought of it before, and that it fell to the lot of a "new Muslim" to open a new avenue of *Tabligh* among educated Muslims and non-Muslims," see: Muhammad Asad, Presidential Address - Given at 4th Annual Session of Jamieet [sic. Jamiyyi'at]. Tabligh Ahle Hadis, Calcutta, Calcutta: Secretely Jameet Tabligh Ahle Hadis (n.d.), pp.21 -22.

127) Muhammad Asad. *The Principles of State and Government in Islam*, Gibraltar: Dar al-Andalus, 1 980, Author's Note, p. vii

128) Muhammad Asad, *The Message of the Qur'an*, Gibraltar: Dar al-Andalus, 1980, Foreword, pp.ii-iv.

۱۲۹۔ ان کانفرنسوں میں پیش کیے گئے چند ایک خطبات ان کے مجموعہ مقالات This Law of Ours صفحات ۱۶۹-۱۷۳،۱۸۳-۱۹۵، میں بھی شامل ہیں۔

۱۳۰۔ ۱۹۵۶ء میں جرمنی میں قیام کے دوران میں اسد نے Hannover ریڈیو سے تعارف اسلام کے ضمن میں ایک سلسلہ نشریات میں حصہ لیا۔ پروگرام کے انچارج احمد شیمان (Ahmad Heinrich Schiemann) کے بقول:

"Asad has also been with us at Hannover. We have togather made a couple of broadcasts on Islam with good success, and many people seem to have learned through us for the first time of the real contents of Islam".

احمد شیمان بنام محمد سلیم (لاہور)، محررہ ۲۸ جولائی ۱۹۵۶ء، از Hannover۔ جرمنی۔ احمد شیمان نے اپنے ایک دوسرے خط میں لکھا:

"We have also made three mutual broadcasts on Islam with

Marfat.com

Mr. Asad and it was very pleasant to hear him recite the Qur'an in Arabic and his explanation of Islam was very impressive".

احمد شیمان بنام محمد حسین بابری (لاہور) محررہ ۲۶ دسمبر ۱۹۵۶ء از Hannover۔ جرمنی۔

۱۳۱۔ سوئس ریڈیو سے ۵۹-۱۹۵۸ء میں نشر ہونے والی اسد کی دو تقریریں/گفتگوئیں The Encounter of Islam and the West اور Islam and the Spirit of Our Times کے عنوان سے ان کے مجموعہ مقالات وخطبات This Law of Ours میں شامل کی گئی ہیں۔ اسد کے یہ خطبات جرمن زبان میں تھے جو محمد اسد اور Hans Zbinden کی مرتبہ کتاب بزبان جرمن Islam und Abendland (جنیوا ۱۹۶۰ء) میں بھی شامل ہیں۔ اسد نے ان دونوں خطبات کا خود انگریزی میں ترجمہ کیا جو ان کے مجموعہ مقالات وخطبات This Law of Ours میں شامل ہیں۔

۱۳۲۔ محمد اسد بنام محمد حسین بابری۔ محررہ ۲ دسمبر ۱۹۵۹ء از جنیوا۔

۱۳۳۔ سوئس ریڈیو سے نشر ہونے والے ان خطبات کے متن کے مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو:

Muhammad Asad, *This Law of Ours and Other Essays*, Gibraltar: Dar al-Andalus,1 987, pp.1 19-1 35.

۱۳۴۔ معاہدہ عمرانی فرانسیسی مفکر روسو (م: ۱۷۷۸ء) کی طرف منسوب ہے۔ اسد کے نزدیک یہ نظریہ بھی جبر و استحصال اور طبقاتی کشمکش سے پاک ایک عادلانہ ومنصفانہ معاشرہ وریاست کی تشکیل وقیام میں ناکام رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک نئے معاہدہ عمرانی جس کی اساس اسلام کے اصول وتصورات پر قائم واستوار ہو کو انسانیت کی فلاح ونجات کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

Muhammad Asad, "The Legend of Social Contract", in: *Arafat*, 1:4 (Dec. 1946): 109-117

135) Muhammad Asad, "The Social Contract Islam", in: *Arafat*, 1:4 (Dec. 1946), p. 117.

136) *The Road to Mecca*, p. 305

۱۳۷۔ سید سلیمان ندوی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے محمد اسد کی دینی تشریحات کے بارے میں آراء کے لئے ملاحظہ ہو۔ سید سلیمان ندوی: شذرات' معارف (اعظم گڑھ)' ۳۴:۴ (اکتوبر ۱۹۳۴ء)، صفحات ۲۴۲-۲۴۳؛ سید ابوالاعلیٰ مودودی: ''انگریزی ترجمہ صحیح البخاری معہ شرح''، ترجمان القرآن ج ۱۰، عدد ۴ (۱۳۵۶ھ)، صفحات ۳۱۵-۳۱۶۔

۱۳۸۔ موخرالذکر دونوں مسلم مفکرین نے بھی اسلام کو ایک مکمل نظریہ حیات کے طور پر پیش کیا ہے، دیگر مذاہب اور انسانوں

Marfat.com

کے خود تراشیدہ نظریہ ہائے حیات کے مقابلے میں اسلام کی فضیلت وتفوق کو واضح کیا ہے۔ساتھ ہی ایک عادلانہ اور طبقاتی رقابت وکشمکش سے پاک معاشرہ کے قیام میں جدید نظاموں کی ناکامی بلکہ ان کی برپا کی ہوئی آفات کو نمایاں کیا ہے۔سید مودودی اور سید قطب کے اسلوب تفہیم وتشریح دین کے بارے میں ملاحظہ ہو:

Seyyed Vali Reza Nasr, *Mawdudi and the Making of the Islamic Revivalism,* New York: Oxford University Press, 1996, pp. 49-68, 107-125; Aref Ali Nayed, *The Radical Qur'anic Hermeneutics of Sayyid Qutb,* (Occasional Paper 15), Islamabad: Islamic Research Institute, 1994.

۱۳۹۔ محمد اسد کی علمی، فکری اور دعوتی سرگرمیوں کے اثرات کے جائزہ کے لیے ملاحظہ ہو:

Murad W. Hofmann, "Muhammad Asad: Europe's Gift to Islam", *Islamic Studies,* 39:2 (2000), pp. 236, 237,243.

140) Maryam Jameela, "Review" of "*Islam at the Crossroads*", *Muslim World Book Review,* 5:4 (1985), p. 41

مریم جمیلہ کے اسلام کی طرف سفر، ذہنی وفکری تشکیل میں کارفرما عوامل اور ان کی تصنیفی وتالیفی سرگرمیوں کے لیے ملاحظہ ہو:

Maryam Jameela, *Islam and Modernism,* Lahore: Muhammad Yusuf Khan, 1968, pp. vii-xiii; Raheela Sadiq, "Maryam Jameelah: Her Life and Service for Islam," *Al-Adwa,* xii-xiii, : 18-19 (2003): 25-32.

141) Murad W. Hofmann, *Diary of a German Muslim,* Köln: IB, Verlag Islamische Bibliothek, 1987, pp.41 -43, 50-53. 152-153

مراد ہوف مان نے اپنی اس ڈائری (روزنامچے) میں متعدد مقامات پر اسد سے اپنی ملاقاتوں، مختلف مسائل پر تبادلہ خیالات، ان سے محبت وعقیدت اور تاثر پذیری کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۴۲۔ فاطمہ کریم "اسلام کے در پر لانے والے" (مترجم: ن-م)، ترجمان القرآن ۱۳۰:۱۰ (اکتوبر ۲۰۰۳ء)، ص ۴۷۔

143) Tazin Abdullah, "A Journey of My Own", http://www.newagebd.com/aug4tho3/270803/oped.html

144) Muhammad Asad, "It started with the Adhan",

Marfat.com

http://Islamonline.net/english/journey/jour44.shtml

145) Hofmann, *Diary of a German Muslim,* p. 50

۱۴۶۔ اسلام اور مغرب کے مابین رابطہ کی استواری و پل سازی کے سلسلہ میں محمد اسد کے کام کے جائزہ کے لئے ملاحظہ ہو:

Daniel Lindenberg, "Muhammad Asad: 20th Century Bridge between Orient and Occident", Paper Presented in the International Conference "Is the Dialogue between Cultures Possible?", December 11-13, 2003. Organized by Royal Academy of the Kingdom of Morocco, Rabat.

147) Hasan Zilur Rahim, "Muhammad Asad: Visionary Islamic Scholar", *Washington Report on Middle East Affairs,* September, 1995, pp. 45-46

148) See: Touqir Hussain,"Islam and the West: Distorting Realities", Daily *Dawn,* April, 25, 2004, April 26,2004.

(در: فکر ونظر (اسلام آباد)' جلد ۴۳ شمارہ ۴ (اپریل تا جون ۲۰۰۶ء)' ص ۴۷-۹۲)

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

Marfat.com

ڈاکٹر زاہد منیر عامر

علامہ محمد اسد اور پنجاب یونیورسٹی---وصل و فصل

محمد اسد نے پولینڈ کے ایک یہودی گھرانے میں لمبرگ (موجودہ یوکرائن) میں ۲ جولائی ۱۹۰۰ء کو آنکھ کھولی۔ ان کا خاندانی نام Leopold Weiss رکھا گیا۔ مذہبی صحائف اور عبرانی کی تعلیم کے بعد پہلی جنگ عظیم کا طوفان انہیں آسٹریائی فوج میں لے گیا۔ فوجی زندگی کے تجربے نے زیادہ طول نہیں کھینچا اور وہ جلد اپنی تعلیم کی طرف لوٹ آئے۔ انہوں نے ویانا یونی ورسٹی میں فلسفہ، تاریخ، آرٹ، طبیعیات اور کیمیا کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۲ء میں پہلی بار مشرق وسطیٰ کا سفر اختیار کیا اور مصر، اردن، فلسطین، شام اور ترکی کے اسفار کیے۔ ۱۹۲۴ء کے دوسرے سفر میں انہوں نے مصر، عمان، شام، طرابلس، عراق، ایران، افغانستان، وسط ایشیا کی سیاحت کی۔ اپنے طویل تجربے اور مشاہدے اور مسلسل مطالعے کے بعد انہوں نے ۱۹۲۶ء میں برلن میں اسلام قبول کیا اور اپنا اسلامی نام محمد اسد رکھا۔ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور قاہرہ میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ وہ عالمی صحافت سے متعلق تھے اور اس حیثیت میں دنیا کا ایک بڑا حصہ دیکھنے کے بعد ۱۹۳۲ء میں ہندوستان آئے۔ یہاں ان کا قیام امرت سر، لاہور، سری نگر، دہلی اور حیدر آباد دکن میں رہا۔ وہ علامہ اقبال سے ملے، علامہ اقبال نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اسلامیہ کالج لاہور میں نسل نو کو اسلامیات کا درس دیں۔ سید نذیر نیازی کے نام ۱۹۳۴ء کے متعدد خطوط میں اسد کے حوالے سے علامہ اقبال کا اظہار خیال موجود ہے۔[1] اسی سال ان کی کتاب Islam at the Crossroads[2] شائع ہوئی، جس کے بارے میں علامہ اقبال نے لکھا:

> "This work is extremely interesting. I have no doubt that coming as it does from a highly cultured European convert to Islam it will prove an eye-opener to our younger generation."[3]

علامہ اقبال سے ملاقات کے بعد انہوں نے ایک آزاد اسلامی ریاست کے قیام کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ اس کے بعد وہ اپنی تحریروں میں اسی نصب العین کے حصول کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اس آزاد مملکت

Marfat.com

کے لیے اسلامی دستور کے راہ نما اصول بھی مرتب کیے۔ ان کی انہی خدمات کے باعث انہیں Intellectual Co-founder of Pakistan بھی کہا گیا ہے[4]۔ قیام پاکستان اسد کے خوابوں کی تعبیر تھا۔ اپنے خوابوں کی اس تعبیر کے بارے میں خود انہوں نے بھی ایک جگہ لکھا ہے:

"For which I my self had worked and striven since 1933."[5]

۱۹۳۵ء میں انہوں نے صحیح بخاری کے انگریزی ترجمے اور تشریح کی اشاعت کا کام شروع کیا اور اس کے پانچ اجزاء شائع کیے[6]۔ جنوری ۱۹۳۷ء میں حیدرآباد دکن سے نکلنے والے رسالے Islamic Culture کے مدیر مقرر ہوئے۔ یہ رسالہ اکتوبر ۱۹۳۸ء تک ان کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے (یکم ستمبر ۱۹۳۹ء-۱۴ اگست ۱۹۴۵ء) میں برطانوی حکومت نے انہیں گرفتار کرلیا۔ طویل عرصے تک صعوبتیں جھیلنے اور صدمے اٹھانے کے بعد رہا ہوئے اور ۱۹۴۶ء میں ایک ماہانہ رسالے ''عرفات'' کا اجراء کیا۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے موقع پر ڈلہوزی سے لاہور آ گئے اور ماڈل ٹاؤن میں مقیم ہوئے۔

قیام پاکستان کے بعد انہیں اسلامی تعمیر نو کے ایک نئے محکمے Department of Islamic Reconstruction کا ڈائریکٹر بنایا گیا۔ انہوں نے وزارت خارجہ میں ڈپٹی سیکریٹری اور مڈل ایسٹ ڈویژن کے انچارج کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کرتے رہے۔ ۱۹۵۱ء میں حکومت پاکستان کے نمائندے کے طور پر سعودی عرب گئے۔ اگلے برس انہیں اقوام متحدہ میں پاکستان کا سفیر مقرر کیا گیا جہاں انہوں نے Committee on Information from Non-Self Govt. Territories کے چیئرمین اور Disarmament Commission of the Security Council کے رکن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۴ء میں ان کی مشہور کتاب The Road to Mecca[7] شائع ہوئی۔ اقوام متحدہ میں پاکستان کی سفارت سے مستعفی ہونے کے بعد انہوں نے سوئٹزرلینڈ، بیروت، شارجہ اور لبنان کے اسفار کیے۔ ۱۹۶۱ء میں ان کی کتاب The Principles of State and Govt. in Islam[8] شائع ہوئی۔ ۱۹۶۴ء میں انہوں نے مراکش میں رہائش اختیار کرلی جہاں وہ ۱۹۸۱ء تک مقیم رہے۔ ۱۹۸۰ء میں قرآن حکیم کے ترجمے اور تشریحات پر مبنی ان کی کتاب The Message of the Quran[9] شائع ہوئی۔ ۱۹۸۳ء میں جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے نفاذ اسلام کے سلسلے میں راہ نمائی کے لیے ایک بار پھر انہیں پاکستان بلایا اور انہوں نے انصاری کمیشن کے اجلاس میں شرکت کی۔

حصول آزادی کے بعد وہ پہلے شخص تھے جنہیں پاکستانی پاسپورٹ جاری کیا گیا تھا۔ پہلے پاکستانی پاسپورٹ کے حامل اس محب وطن کا یہ آخری سفر پاکستان ثابت ہوا۔ وہ پاکستان سے ۳-اگست ۱۹۸۳ء کو لندن چلے گئے تھے جہاں سے انہوں نے پرتگال کا سفر اختیار کیا۔ ۱۹۸۷ء میں وہ ہسپانیہ لوٹے (اسی سال ان کی آخری کتاب This Law of Ours and Other Essays[10] شائع ہوئی) اور یہیں ۲۰ فروری ۱۹۹۲ء کو انہوں نے

Marfat.com

زندگی کی آخری سانس لی۔اب وہ غرناطہ کے مسلم قبرستان میں آرام فرما ہیں۔

جیسا کہ سطور ماقبل سے ظاہر ہے، عالمی سطح کے ایک نام ور دانش اور علوم اسلامی کے ایک ماہر کی حیثیت سے وطن عزیز نے ان کی خدمات سے استفادہ کیا۔ملک کی قدیم ترین اور بزرگ ترین جامعہ، پنجاب یونیورسٹی نے بھی علامہ اسد کے علم وفضل سے استفادے کی راہیں کشادہ کیں۔علامہ اسد پر اب تک جو تحقیقی کام سامنے آچکا ہے، اس میں پنجاب یونیورسٹی اور علامہ اسد کے حوالے سے معلومات کا فقدان ہے۔علامہ اسد کی پہلی سوانح[11] (Leopold Weiss alias Muhammad Asad) جرمن زبان میں لکھی گئی اس میں پنجاب یونی ورسٹی بلکہ پاکستان ہی کا کوئی تذکرہ ممکن نہیں تھا اس لیے کہ یہ کتاب ۱۹۲۷ء تک کے احوال سے بحث کرتی ہے۔اس کے بعد حال ہی میں The Truth Society کی طرف سے علامہ اسد کے احوال وآثار اور ان کے بارے میں لکھے جانے والے مضامین، دوضخیم مجلدات کی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔[12] ایک ہزار سے زائد صفحات کے اس مجموعے میں بھی جہاں علامہ اسد کی زندگی کے بیشتر پہلو زیر بحث آ گئے ہیں، اقبال اور اسد، اسد اور خیری برادران وغیرہ جیسے ارتباطی موضوعات پر بھی کلام کیا گیا ہے لیکن علامہ اسد کی زندگی کے اس ورق سے متعلق معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ علامہ اسد کے افکار کے حوالے سے پی۔ایچ ڈی کی سطح کا ایک مقالہ بھی تحریر کیا جا چکا ہے۔[13] اس کے اوراق بھی Europe's Gift to Islam کی طرح اسلامک کلوکیم میں علامہ اسد کے تقرر کے مختصر تذکرے کے سوا علامہ اسد اور پنجاب یونی ورسٹی کے حوالے سے خاموش ہیں۔

ذیل کے مضمون میں ہم پنجاب یونی ورسٹی کے ساتھ علامہ اسد کے ربط وتعلق کے تین مظاہر پر بات کریں گے جن میں سے اول الذکر دو پہلو ایسے ہیں جو اس مضمون کے ذریعے پہلی بار واضح کیے جارہے ہیں۔

پہلی بار اس ضمن میں علامہ مرحوم کے اپنے خطوط اور پنجاب یونی ورسٹی کے اعلیٰ اداروں کی رودادوں کی مدد سے لی گئی ہے۔اس مضمون میں پیش کیے جانے والے علامہ اسد کے تمام خطوط غیر مطبوعہ ہیں اور ان سطور کے ساتھ پہلی بار اشاعت پذیر ہو رہے ہیں۔

(۱)

قیام پاکستان کے بعد نئے ملک کی اسلامی شناخت کے سلسلے میں جو اقدامات کیے گئے، ان میں ایک، ملک کی قدیم ترین اور بزرگ ترین جامعہ، پنجاب یونی ورسٹی میں علوم اسلامی کے شعبے کا قیام بھی شامل تھا۔پنجاب یونیورسٹی نے یونیورسٹی کی ایک وحدت کے طور پر ۱۸۸۲ء میں آغاز کیا تھا لیکن ہنوز اس میں علوم اسلامی کا کوئی شعبہ موجود نہیں تھا۔اس حقیقت اور نئے وطن کے تقاضوں کے پیش نظر پنجاب یونی ورسٹی کی سنڈیکیٹ نے اپنے اجلاس ۵ فروری ۱۹۴۹ء میں یہ فیصلہ کیا کہ یونی ورسٹی میں اسلامیات کا ایک شعبہ قائم کیا جائے۔[14] جامعات میں جب نئے شعبے قائم کیے جاتے ہیں تو ان میں تدریس اور سربراہی کے لیے اس مضمون کی رسمی سند رکھنے والے تو مہیا نہیں ہوتے البتہ ان

Marfat.com

مقاصد کے لیے ایسے علماء کا انتخاب کیا جاتا ہے جو اس شعبہ علم میں درجہ کمال پر فائز ہوں۔ علامہ محمد اسد ۱۹۲۶ء میں قبول اسلام کے بعد علوم اسلامی سے سنجیدگی کے ساتھ وابستہ رہے اور انہوں نے اتنا کمال بہم پہنچایا کہ جب پنجاب یونی ورسٹی نے علوم اسلامی کا شعبہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کی مسند صدارت کے لیے حکام کی نگاہ انتخاب علامہ محمد اسد پر جا کر رکی۔ پنجاب یونی ورسٹی سنڈیکیٹ کے جس اجلاس (۵ فروری ۱۹۴۹ء) کا ابھی ذکر ہوا اور اس میں وائس چانسلر نے شعبہ اسلامیات کی صدارت کے لیے علامہ اسد کا نام تجویز کیا، اس وقت پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک تھے جو اس منصب پر ستمبر ۱۹۴۷ء سے ستمبر ۱۹۵۰ء تک فائز رہے۔ یونی ورسٹی نے ایک خط کے ذریعے علامہ اسد کو اس پیش کش سے مطلع کیا۔ یہ اطلاع رجسٹرار کیپٹن محمد بشیر کی طرف سے مراسلہ نمبر ۱۲۴۴۳/ جی ایم مورخہ ۸ فروری ۱۹۴۹ء کو دی گئی۔ رجسٹرار کی طرف سے بھیجے جانے والے خط کا متن درج ذیل ہے:

To

Allama M. Asad

Director, Department of Islamic Reconstruction,

West Punjab, Lahore.

Sir,

I have the honour to inform you that the Syndicate has appointed you as an honorary head of the department of the Islamiyyat of this University. Kindly acknowledge.

I have etc. etc.

Signatured

Deputy Registrar (Admin.)

for Registrar

یہ مراسلہ ملنے پر علامہ اسد نے اس پیش کش کو قبول کر لیا جس کا اظہار ان کے ایک خط سے ہوا جس میں انہوں نے یونی ورسٹی رجسٹرار کے منقولہ خط کی رسید دیتے ہوئے یونی ورسٹی کا شکریہ ادا کیا۔ علامہ اسد کا یہ خط ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کو لکھا گیا، خط کا متن درج ذیل ہے:

February 12, 1949

Captain M. Bashir, B.Sc. Hons. (Edin)

Registrar, University of the Punjab,

Lahore.

Marfat.com

I thank you for your letter No. 1243/LM dated the 3rd February, 1949, informing me that the Syndicate has appointed me as honorary Head of the Department of Islamiyyat of the University, for which honour I am grateful.

Yours truly,

Signatured

(M. ASAD)

یونی ورسٹی میں سنڈیکیٹ کے فیصلوں کی توثیق سینٹ کا ادارہ کیا کرتا ہے۔ علامہ اسد کے اعزازی صدر شعبہ اسلامیات مقرر کیے جانے کا فیصلہ سینٹ کے اجلاس منعقدہ ۲۹ مارچ ۱۹۴۹ء میں پیش کیا گیا۔ سینٹ نے جس کی توثیق کر دی۔ سینٹ کے مذکورہ اجلاس کی روداد میں درج ہے:

The Senate at its meeting held on 29th March, 1949, has approved the following items:

15. That the recommendations of the Syndicate relating to the appointment of the following persons in the various University Teaching Departments be approved (Vide paragraphs 16 and 2, 3, 32 and 38 of the Syndicate Proceedings, dated the 5th and 11th February, 1949, respectively):

1. Allama Muhammad Asad, as Honorary Head of the Department of Islamiyat.

Copy of the above forwarded for information and necessary action to the A.R.A. and D.R.A./H.A.A./Asstt. Misc/Mr. Hassan Din with files to inform the persons concerned and Head of the Teaching Departments.[15]

اس تقرر پر گیارہ ماہ گزرنے کے بعد علامہ اسد نے استعفیٰ پیش کر دیا۔ انہوں نے وائس چانسلر کے نام اپنے خط میں استعفیٰ کا سبب اپنی مصروفیات کو بتایا اور کہا کہ میں ان مصروفیات کی موجودگی میں اعزازی صدر شعبہ اسلامیات کے فرائض سے انصاف نہیں کر سکتا اس لیے فوری طور پر میرا استعفیٰ قبول کر لیا جائے۔ علامہ اسد کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ آیا وائس چانسلر لاہور میں موجود ہیں یا نہیں چنانچہ انہوں نے استعفیٰ کا خط ایک سر پوش مراسلے کے ساتھ رجسٹرار کو

Marfat.com

بھجوایا اور اپنے سرپوش مراسلے میں یہ لکھا کہ شعبہ اسلامیات سے متعلق میرے پاس جو فائلیں ہیں، وہ بھی ڈپٹی رجسٹرار ایڈمن کو واپس کی جا رہی ہیں۔ رجسٹرار کیپٹن محمد بشیر کے نام علامہ اسد کے خط کا متن درج ذیل ہے:

3. Chamba House Lane.

Lahore, January 24, 1950.

My dear Capt. Bashir,

As I am not sure whether the Vice-Chancellor is at present in Lahore, I am sending my resignation from the post of Honorary Head of the Deptt. of Islamiyyat to you, with the request to place it before him at the earliest opportunity. The files in my possession relating to this Department are being returned to the Deputy Registrar (Adm.).

Thanking you,

Yours sincerely,

Signatured

Capt. M. Bashir, M.Sc. (Edin).

Registrar

University of the Punjab,

LAHORE.

اس سرپوش مراسلے کے ساتھ بھیجے جانے والے استعفیٰ پر مبنی وائس چانسلر کے نام علامہ اسد کا خط درج ذیل ہے:

3. Chamba House Lane,

Lahore, January 24, 1950.

The Vice-Chancellor,

Punjab University, Lahore.

Dear Sir,

Owing to my pre-occupatins I am not in a position to do justice to my office as Honorary Head of the Department of

Marfat.com

Islamiyyat, Punjab University, and request you therefore kindly to accept my resignation from this office with immediate effects.

Yours truly,

Signature

(M. ASAD)

یہ استعفیٰ وائس چانسلر صاحب کے ملاحظہ میں لایا گیا اور انہوں نے ۲۵ جنوری ۱۹۵۰ء کو اس پر اپنے دستخط ثبت کیے اور اسے سنڈیکیٹ کی اطلاع کے لیے بھجوا دیا گیا۔ اس مقصد کے لیے ذیل کا دفتری نوٹ تیار کیا گیا:

Office Note

Subject: Resignation of Allama Muhammad Asad as Honorary Head of the Department of Islamiyyat.

At the time of creation of Islamiyyat as a subject for various University Examinations, Allama M. Asad was appointed as Honorary Head of the Department of Islamiyyat. The Allama has tendered his resignation on the grounds that owing to his pre-occupations he is not in a position to do justice to his office, and requests that his resignation be accepted with immediate effect.

The Syndicate may accept his resignation and appoint a substitute in his place.

حسب ضابطہ یہ استعفیٰ سنڈیکیٹ کے اجلاس میں پیش کیا گیا جس کی منظوری کے بعد معاملہ سینٹ میں لے جایا گیا۔ سینٹ کے اجلاس منعقدہ ۳۰ مارچ ۱۹۵۰ء کی روداد مظہر ہے کہ سینیٹ نے علامہ اسد کے استعفیٰ سے متعلق سنڈیکیٹ کی سفارش کی توثیق کر دی۔ سینیٹ کی روداد میں لکھا گیا ہے:

That the recommendations of the Syndicate relating to the acceptance of the resignation of the following person be approved (vide paragraph 7 and 15, 17 and 20 of the Syndicate

Marfat.com

proceedings dated 6th February 1950 and 7th March 1950 respectively)

4. Allama Muhammad Asad, as honorary head of the department of Islamiyyat.[16]

علامہ اسد کے استعفیٰ کے بعد یونی ورسٹی نے صدر شعبہ اسلامیات کا منصب علامہ علاء الدین صدیقی (۳ نومبر ۱۹۰۷ء-۲۷ دسمبر ۱۹۷۷ء) کو پیش کیا۔ علامہ صاحب موصوف نے یہ منصب قبول کیا۔ یوں وہ پنجاب یونی ورسٹی شعبہ اسلامیات کے دوسرے سربراہ قرار پائے (بعض اصحاب نے انہیں پہلا سربراہ[17] قرار دیا ہے) سنڈیکیٹ کے اجلاس منعقدہ 7 مارچ 1950ء میں علامہ اسد کا استعفیٰ منظوری کے لیے پیش کیا گیا۔ اسی اجلاس میں اعزازی صدر شعبہ اسلامیات کے طور پر علامہ علاء الدین صدیقی کا تقرر کر دیا گیا۔ یہ تقرر مستقل انتظام ہو جانے تک کے لیے ۵۰۰ روپے ماہانہ تنخواہ پر یکم جولائی ۱۹۵۰ء سے کیا گیا[18] اور اس تقرر کی اطلاع انہیں ۲۷ مارچ ۱۹۵۰ء کو اسسٹنٹ رجسٹرار جنرل نے ایک مراسلے کے ذریعے دی۔ گزشتہ صفحات میں پیش کیے جانے والے شواہد کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پنجاب یونی ورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے اولین سربراہ علامہ اسد تھے جو اس منصب پر گیارہ ماہ تک فائز رہے۔ شعبے کا قیام اور اس کے ابتدائی مراحل انہی کے دور میں طے پائے جیسا کہ ان کے استعفیٰ میں شعبے کے ریکارڈز کی واپسی کا اشارہ ظاہر کر رہا ہے۔[19]

(۲)

شعبہ اسلامیات کی صدارت سے مستعفی ہونے کے بعد بظاہر پنجاب یونی ورسٹی سے علامہ اسد کا تعلق ختم ہو گیا، لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ یونی ورسٹی اس کے بعد بھی اس امر کی مشتاق رہی کہ علامہ اسد کسی طرح اس سے وابستہ ہو جائیں۔ پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک (۱۸۹۲ء...۱۹۸۲ء) بھی علامہ اسد کے ایک قدردان اور مداح تھے۔ وہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور جون ۱۹۵۰ء تک اس منصب پر خدمات انجام دیتے رہے۔ انہوں نے اسلامی آئین کے خدوخال واضح کرنے کے لیے پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین خان کے ساتھ مل کر ۵، ۶، ۷ مارچ ۱۹۵۰ء کو آل پاکستان پولیٹیکل سائنس کانفرنس مقرر کروائی۔ اس کانفرنس کا پہلا اجلاس مسلم نظریہ سیاست و حکمرانی کے موضوع پر ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت علامہ اسد کو تفویض کی گئی۔[20] اس واقعہ کے بعد کم از کم دو بار علامہ اسد کا پنجاب یونی ورسٹی سے انسلاک ہوا۔

پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج میں السنہ شرقیہ کے ساتھ جرمن اور فرانسیسی زبانوں کی تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ان میں ہسپانوی اور روسی زبانوں کی تدریس کا بھی اضافہ ہوا۔ رفتہ رفتہ ترکی اور جاپانی کی تدریس کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا، یہاں تک کہ چیف جسٹس عبدالرشید کی قیادت میں قائم ہونے والے آٹھ رکنی

Marfat.com

پنجاب یونی ورسٹی کمیشن نے یہاں ایک لینگویج یونٹ قائم کرنے اور اس ادارے کو کالج آف اورینٹل اینڈ ویسٹرن لینگویجز بنانے کی سفارش کی۔[21] آزادی کے بعد ڈاکٹر برکت علی قریشی یہاں جرمن زبان کی تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ ڈاکٹر قریشی بنیادی طور پر پروفیسر عربی کے منصب پر فائز تھے۔ وہ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں اورینٹل کالج سے منسلک ہوئے اور مئی ۱۹۴۸ء میں پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کے انتقال کے بعد پرنسپل اورینٹل کالج مقرر ہوئے۔ فروری ۱۹۵۰ء میں انہیں سفیر بنا دیا گیا۔ انہوں نے سفیر پاکستان کی حیثیت سے شام، لبنان اور اردن میں سفارتی خدمات انجام دیں[22] اور جون ۱۹۵۱ء میں اپنے پرانے مناصب پر یعنی پروفیسر عربی اور پرنسپل اورینٹل کالج کی حیثیت سے واپس آ گئے۔ ڈاکٹر قریشی نے جرمنی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ انہوں نے ۱۹۲۸ء میں برلن یونی ورسٹی سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ جرمن زبان پر بھی دسترس رکھتے تھے لہٰذا اورینٹل کالج میں جرمن زبان کی تدریس کا فریضہ بھی وہی انجام دیتے تھے۔ فروری ۱۹۵۰ء میں ان کے سفیر بن کر چلے جانے پر اس تدریسی سلسلے میں خلل واقع ہوا۔ انہوں نے تدریس زبان کے کورس کا آغاز ۱۷- اکتوبر ۱۹۴۹ء کو کیا تھا۔ ابتدائی درجے کی اس کلاس میں بیس طالب علم شریک تھے۔ یکم فروری ۱۹۵۰ء کو جب کہ ابھی اس سلسلے پر تین ماہ بھی پورے نہیں ہوئے تھے، وہ رخصت پر چلے گئے۔ اگرچہ ابھی شعبہ اسلامیات کی صدارت سے علامہ اسد کے استعفیٰ کے واقعہ کو محض دو ماہ گزرے تھے، یونی ورسٹی نے جرمن کورس کے تدریسی سلسلے کو بحال رکھنے کے لیے علامہ اسد کو دعوت دی۔ علامہ اسد عربی، فارسی، فرانسیسی، پرتگالی، ہسپانوی اور اردو میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔[23] انگریزی، جرمن اور ڈچ، عبرانی پر ان کی گرفت مسلمہ تھی چنانچہ ان سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ پیر، منگل، بدھ اور جمعرات کو جرمن زبان پر چار لیکچر دے دیا کریں۔ اس خدمت کے عوض انہیں دو سو روپے ماہوار معاوضے کی پیش کش کی گئی۔ پیش کش کا خط رجسٹرار کی طرف سے ڈپٹی رجسٹرار ایڈمن نے ارسال کیا۔ خط میں لکھا گیا:

Senate Hall,

March 20, 1950.

Allama M. Asad,

3 - Chamba House Lane,

Golf Road, Lahore.

Sir,

I have been directed by the Vice-Chancellor to enquire if you would be willing to take German Classes. At the present moment there is only one elementary class consisting of 20 students. The Course was started by Principal B. A. Kuraishi on

Marfat.com

the 17th October, 1949 and no instruction has been imparted after the 1st February, 1950. The lecturer would be expected to take four periods a week i.e., on Monday, Tuesday, Wednesday and Thursday. The recommendation offered by the University is Rs. 200/ p.m.

An early reply is requested.

I have etc.,

Signatured

Deputy Registrar (Admin.)

for Registrar.

یوں معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اسد نے اس پیش کش پر سنجیدگی سے غور کیا۔ انہیں یہ خط ملا تو وہ کراچی کے لیے عازم سفر تھے چنانچہ انہوں نے کوئی حتمی جواب دینے کی بجائے خط کی رسید دینے پر اکتفا کیا اور لکھا کہ کراچی سے واپسی پر وہ اس پیش کش کا بہتر جواب دے سکیں گے اور یہ توقع بھی ظاہر کی کہ ہوسکتا ہے کراچی میں ان کی ملاقات وائس چانسلر صاحب (جو اس وقت ڈاکٹر عمر حیات ملک تھے) سے بھی ہو جائے اور ایسا ہونے کی صورت میں وہ وائس چانسلر صاحب سے بھی اس مسئلے پر تبادلہ خیال کریں گے۔ رجسٹرار کے نام علامہ اسد کا یہ خط ۲۲ مارچ ۱۹۵۰ء کو چنبہ ہاؤس لاہور سے لکھا گیا۔ خط کا متن:

Chamba House Lane,

Lahore, March 22, 1950.

Deputy Registrar (Adm.),

Punjab University, Lahore.

Dear Sir,

With reference to your letter No. 1064/G, dated the 20th instant, I have to inform you that I am leaving for Karachi tomorrow morning, and cannot, therefore, give you a final reply regarding the matter under consideration. I shall be, however, back in Lahore within a week or so, and shall contact you then. In Karachi I hope also to meet the Vice-Chancellor

Marfat.com

and to discuss the matter with him as well.

Yours truly,

Signatured

(M. ASAD)

کراچی سے واپسی کے بعد علامہ اسد نے کیا جواب دیا، آیا کراچی میں وائس چانسلر پنجاب یونی ورسٹی سے ان کی ملاقات ہوئی یا نہیں اس کا کچھ علم نہیں، تاہم بعدازاں جرمن زبان کی تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ اگلے ہی برس ڈاکٹر برکت علی قریشی واپس آ گئے جنہوں نے اپنی سبکدوشی (۱۹۵۴ء) تک فرائض تدریس انجام دیے۔ ان کے بعد ڈاکٹر بشارت علی (۱۹۵۴ء-۱۹۵۵ء)، ڈاکٹر براؤن (۱۹۵۵ء-۱۹۶۰ء)، ڈاکٹر پیٹر شونکل (۱۹۶۰ء-۱۹۶۱ء) اور مسز ارسلا جینکی[24] اس شعبے میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔

(۳)

پنجاب یونی ورسٹی کے ساتھ علامہ اسد کا آخری ربط انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم کے حوالے سے ہوا۔ یہ کلوکیم قیام پاکستان کے بعد یونی ورسٹی کی پہلی بین الاقوامی سرگرمی تھی۔ اس کی تحریک امریکہ میں پاکستان کے سفیر امجد علی نے کی تھی، جو اس وقت مرکزی وزیر خزانہ تھے۔ اس کلوکیم کے اخراجات حکومت پاکستان نے برداشت کیے اور اس کے لیے پچاس ہزار روپے اور پھر تین لاکھ روپے کی گرانٹ دی گئی۔[25] اس علمی مجلس مذاکرہ میں مسلم دنیا کے چالیس ملکوں سے علماء اور دانش وروں نے شرکت کی اور مذہب اور ثقافت کے موضوعات پر مقالات پیش کیے۔ یہ اپنی نوعیت کا دوسرا انٹرنیشنل کلوکیم تھا۔ پہلا کلوکیم لائبریری آف کانگریس اور پرنسٹن یونی ورسٹی کے زیر اہتمام ۱۹۵۳ء میں امریکہ میں منعقد ہوا تھا۔ اس دوسرے کلوکیم کے لیے وطن عزیز کی چھ جامعات کے نمائندوں پر مشتمل ایک کلوکیم کمیٹی قائم کی گئی تھی جس میں مختلف حلقوں سے تجاویز طلب کرنے کے بعد کلوکیم کے لیے بہ تفصیل ذیل نو موضوعات بحث تجویز کیے۔

۱۔ اسلامی ثقافت اور اس کا مفہوم۔ ۲۔ اسلام کا تصور ریاست۔ ۳۔ مسلم معاشروں کے لیے جدید تصورات اور سماجی اقدار کا چیلنج۔ ۴۔ اجتہاد کا کردار اور اسلام میں قانون سازی کے امکانات۔ ۵۔ سائنس کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر۔ ۶۔ مغربی تاریخ اور ثقافت پر اسلام کے اثرات۔ ۷۔ اسلام کے سماجی ڈھانچے میں معاشیات۔ ۸۔ دوسرے ادیان کے بارے میں اسلام کا رویہ اور روابط۔ ۹۔ عالمی امن کے قیام میں اسلام کا کردار۔[26]

اس نہایت اہم کلوکیم کے انتظامات کے لیے علامہ اسد کو دعوت دی گئی، جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ پنجاب یونی ورسٹی چانسلرز کمیٹی کی روداد مظہر ہے کہ علامہ اسد نے یکم مارچ ۱۹۵۷ء کو کلوکیم کے ڈائریکٹر کا منصب سنبھالا۔ اس منصب کے لیے ذیل کی شرائط طے کی گئی تھیں:

(A) He would be paid a consolidated sum of Rs. 2500/-

Marfat.com

p.m. for the period he would act as Director.

(B) He would be entitled to get return passage from Beirut to Lahore in respect of himself and his wife.[27]

بعد ازاں انہیں ایک صدر شعبہ جتنے مالی اختیارات بھی دے دیے گئے، چانسلرز کمیٹی کے اجلاس ۳۰ مارچ ۱۹۵۷ء کی روداد میں درج ہے:

The honorary treasurer had recommended that Mr. Muhammad Asad who had been appointed Project Officer of the International Islamic Colloquium be deligated the same financial power as were exercised by Heads of the University Departments.[28]

علامہ اسد نے وائس چانسلر سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ان کی اہلیہ پولا حمیدہ کو ان کی سیکریٹری کے طور پر کام کرنے کی اجازت دی جائے چنانچہ وائس چانسلر کی سفارش پر چانسلرز کمیٹی نے اپنے ۲۰-اپریل ۱۹۵۷ء کے اجلاس میں مندرجہ ذیل امور منظور کیے:

(2) Mr. Muhammad Asad the Project Officer be designated as Director of Colloquium.

(3) Mrs. Pola Hamida Asad's offer to act as Secretary in an honorary capacity be accepted with thanks.[29]

علامہ اسد کو اس کلوکیم کے انتظامات کے لیے بیروت سے بلوایا گیا تھا۔ انہیں اپنے اسباب کی بیروت سے کراچی اور کراچی سے لاہور منتقلی کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے یونی ورسٹی سے درخواست کی کہ اس مقصد کے لیے ایک ہزار روپے پیشگی دے دیے جائیں، جنہیں وہ بعد ازاں بالاقساط ادا کر دیں گے۔ وائس چانسلر نے چانسلرز کمیٹی کے اجلاس سے پہلے سپیشل کیس کے طور پر اس رقم کی پیشگی منظوری دے دی۔ طے یہ کیا گیا کہ اس رقم کی واپسی دو سو روپے ماہوار اقساط کے ذریعے سے کی جائے گی۔ اقامتی افسر محاسبہ (Resident Auditor) نے چانسلرز کمیٹی کے اجلاس میں یہ مؤقف اختیار کیا کہ رقم کی واپسی تین اقساط میں ہو جانی چاہیے۔ بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ وائس چانسلر کے اقدام کی توثیق کر دی جائے تاہم اگر علامہ اسد کا کام اقساط پوری ہونے سے پہلے ختم ہو جاتا ہے تو بقیہ رقم ان کی آخری تنخواہ سے منہا کر لی جائے گی۔ چانسلرز کمیٹی کی روداد کا اقتباس درج ذیل ہے:

Audit objection in regard to the number of installments for recovering the amount advanced to Mr. M. Asad for

Marfat.com

transportation of his house-hold belongings.

Mr. M. Asad, Director, International Islamic Colloquium, had requested for an advance of one month's salary to enable him to meet expenses in connection with the shipment and transportation charges of his household belongings from Beirut to Karachi, and Karachi to Lahore. The Vice-Chancellor, in anticipation of the approval of the Chancellor's committee, sanctioned the advance as a special case. The recovery of the amount was to be made at the rate of Rs. 200 per mensum. The Resident Senior Auditor while allowing the payment to be made provisionally desired that the sanction of the Chancellor's committee should be obtained and that the recovery be made in three instalments.

After discussion, resolved to confirm the action taken by the Vice-Chancellor and to permit Mr. Asad to repay the loan at the rate of Rs. 200 per mensum and in case his assignment ended prior to the adjustment of the amount the entire balance to recovered from his last month's pay.[30]

ان شرائط و معاملات کے بعد علامہ اسد نے پوری توجہ اور محنت کے ساتھ اسلامک کلوکیم کے لیے کام شروع کیا۔ پاکستان ایک نیا ملک تھا اور پنجاب یونی ورسٹی کی طرف سے پہلی بار عالمی سطح کے دانش وروں کو بلایا جا رہا تھا۔ علامہ اسد نے اپنے روابط کے ذریعے "مختلف ملکوں کے علماء سے رابطہ قائم کر کے ان سے اس علمی اجتماع کے لیے مقالات لکھوائے اور انہیں کلوکیم میں شرکت پر آمادہ کیا۔" صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب کے مطابق "اسلامک کلوکیم کی تاریخ میں علامہ محمد اسد کا کردار مرکزی تھا"[31] لیکن افسوس کہ کلوکیم کے انتظامات کرنے کے بعد علامہ اسد کو اس سے علیحدہ ہونا پڑا۔ ان کے بعد کلوکیم کے ڈائریکٹر کا منصب ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے حصے میں آیا جب کہ جوائنٹ ڈائریکٹرز کے طور پر علامہ علاء الدین صدیقی (صدر شعبہ اسلامیات) اور کیپٹن محمد بشیر (رجسٹرار) کا تقرر کیا گیا۔ سیکریٹری کے طور پر شیخ امتیاز علی (پرنسپل یونی ورسٹی، لا کالج) اور محمد افضل (سیکریٹری سیکنڈری بورڈ) مقرر ہوئے۔

Marfat.com

کلوکیم سے علامہ اسد کی علیحدگی کے بارے میں دو مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ایک رائے کے مطابق علامہ اسد کو یونی ورسٹی سے کچھ شکایات پیدا ہوئیں۔دوسرے مؤقف کے مطابق علامہ اسد سے وائس چانسلر صاحب کے اختلافات اس کا سبب بنے۔پہلے مؤقف کا اظہار رسالہ "ترجمان القرآن" کے ایک اداریے سے ہوتا ہے جو کلوکیم کے انعقاد کے بعد لکھا گیا جس میں کلوکیم کے حوالے سے تفصیل سے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا گیا:

"......ان تراجم کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ محمد اسد صاحب کی شکایات بالکل بجا تھیں اور یہ لوگ اس معیار کو قائم نہیں رکھ سکے جس کی مجلس مذاکرہ متقاضی تھی اور جس کی یقین دہانی اسد صاحب کا استعفیٰ قبول کرتے وقت بار بار کرائی گئی تھی......"[32]

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اسد کا اختلاف انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم کے مقالات کی اشاعت سے متعلق تھا اور بعض روایات کے مطابق ان کا خیال تھا کہ عربی مقالات کے انگریزی تراجم اور انگریزی مقالات کے عربی تراجم شائع کیے جائیں، جیسا کہ علامہ اسد کے شخصیت نگار محمد ارشد نے لکھا ہے: "علامہ اسد انگریزی زبان میں پیش کیے جانے والے مقالات کا عربی وارد و جب کہ عربی زبان کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے مترجمین کی خدمات حاصل کرنے میں شیخ الجامعہ سے اختلافات کے سبب اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔"[33]

لیکن رسالہ "ترجمان القرآن" کے محولہ اقتباس کا دوسرا حصہ پھر بھی واضح نہیں ہوتا جس میں کہا گیا ہے کہ "جس (معیار) کی یقین دہانی اسد صاحب کا استعفیٰ قبول کرتے وقت بار بار کرائی گئی تھی......" اس جملے سے بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ کس نے یقین دہانی کروائی تھی......؟ اور کس کو کروائی گئی تھی......؟ اسد صاحب اختلافات کے باعث مستعفی ہو رہے تھے تو ایسے میں انہیں کیا یقین دہانی کروائی جا سکتی تھی......؟ ایک مؤقف یہ ہے کہ وائس چانسلر صاحب کلوکیم کے انتظامات کی جانب سے فکرمند تھے اور کلوکیم کے انعقاد میں ایک ماہ رہ گیا تھا جب انہوں نے علامہ اسد کو بلا کر باز پرس کی جس نے تلخ صورت اختیار کر لی اور علامہ اسد فوری طور پر مستعفی ہو گئے۔راقم الحروف نے شیخ امتیاز علی صاحب سے علامہ اسد کے استعفیٰ کی وجوہ دریافت کیں تو انہوں نے بتایا کہ دنیا بھر سے سکالرز کو بلایا گیا تھا۔لاہور میں اچھے معیار کا ایک ہی ہوٹل (فلیٹیز) تھا۔انتظامیہ پر مہمانوں کے قیام اور سیکورٹی کے مسائل کا دباؤ تھا۔وائس چانسلر اس حوالے سے فکرمند تھے۔کلوکیم کے انعقاد میں ایک ماہ رہ گیا تھا جب انہوں نے علامہ اسد کو بلا کر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا اور غالباً انہیں سخت سست کہا، جس پر ناراض ہو کر علامہ اسد نے فوری طور پر استعفیٰ پیش کر دیا۔[34]

سابق وزیر تعلیم ڈاکٹر محمد افضل جو اس زمانے میں پنجاب یونی ورسٹی سے منسلک تھے،ان کی رائے یہ ہے کہ علامہ اسد" کانفرنس کے معاملات میں پوری دلچسپی نہ لے سکے"[35] اور وائس چانسلر میاں افضل حسین نے ان سے" کام جلدی نپٹانے کا تقاضا کیا،اس پر تکرار ہوئی۔"[36]

لیکن کلوکیم کے بعد اخبارات و جرائد نے جو تبصرے کیے ان میں بعض تبصروں سے علامہ اسد کے استعفیٰ کی کچھ اور وجوہ بھی معلوم ہوتی ہیں، جیسا کہ گزشتہ سطور میں ماہنامہ "ترجمان القرآن" لاہور کے اقتباس سے ظاہر ہے کہ

Marfat.com

کچھ شکایات علامہ اسد کو تھیں اور استعفیٰ کا سبب محض انتظامی امور نہیں تھے جب کہ شیخ امتیاز علی صاحب اور ڈاکٹر افضل صاحب کی آراء سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ شکایات وائس چانسلر صاحب کو تھیں اور اسی کش مکش میں نباہ کا رشتہ ٹوٹ گیا۔

وجوہ جو بھی رہی ہوں علامہ اسد نے ۲ دسمبر ۱۹۵۷ء کو ڈائریکٹر انٹرنیشنل اسلامک کلو کیم کے منصب سے استعفیٰ دے دیا۔ اب یونی ورسٹی کی طرف ان کے واجبات بقایا تھے چنانچہ انہوں نے یونی ورسٹی سے تین ہزار سات سو پچپن روپے کا مطالبہ کیا تا کہ وہ اور ان کی اہلیہ پاکستان سے واپس جا سکیں۔ ان کا مطالبہ چانسلرز کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۲۵ جنوری ۱۹۵۸ء میں زیر غور آیا۔ خزانہ دار نے یہ موقف اختیار کیا کہ کنٹریکٹ ملازمین کو واپسی کا ٹکٹ اس صورت میں دیا جاتا ہے جب انہوں نے اپنے کنٹریکٹ کی مدت پوری کر لی ہو۔ علامہ اسد چونکہ کار مفوضہ کی تکمیل سے پہلے مستعفی ہو گئے ہیں اور انہوں نے استعفیٰ سے پہلے ایک ماہ کا نوٹس بھی نہیں دیا اس لیے انہیں اور ان کی اہلیہ کو واپسی کا ٹکٹ نہیں دیا جا سکتا۔ اجلاس کو بتایا گیا کہ علامہ اسد نے سپیشل کیس کے طور پر ایک ماہ کا نوٹس دینے کی شرط ختم کرنے کی درخواست کی ہے۔ اس پر طویل بحث و تمحیص ہوئی جس کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک ماہ کا پیشگی نوٹس دیے جانے کی شرط ختم کرتے ہوئے علامہ اسد کو مطلوبہ رقم دے دی جائے۔ چانسلرز کمیٹی کی روداد میں خزانہ دار کا موقف اس طرح رپورٹ کیا گیا ہے:

All temporary employees were required to give one month's notice if they resigned. Mr. Asad did not give the required notice. He had, however, requested that the condition of the notice be waived as a special case and that he be paid a sum of Rs. 3755/- to cover his traveling expenses as well as those of his wife from Lahore to Bandoum, including incidental charges. The Treasurer was of the view that the payment of return fair for Mr. Asad and his wife could only have been admissible if the return journey would be undertaken by Mr. Asad on the expiry of period of his appointment.[37]

بحث و تمحیص کے بعد کیے جانے والے فیصلے کے الفاظ یہ ہیں:

After some discussion, resolved that the condition of one month's notice be waived and that Mr. Asad be paid the same amount as was paid to him for the inward journey.[38]

Marfat.com

یہ تجربہ پنجاب یونی ورسٹی اور علامہ اسد کے وصل کو دائی فصل میں تبدیل کرنے کا باعث بنا۔اس کے بعد حکومت پاکستان کی طرف سے انہیں ادارہ تحقیقات اسلامی کی سربراہی کی پیش کش کی گئی اور وائس چانسلر کے برابر منصب اور سرکاری خرچ پر اپنے ملک سے پاکستان آمدورفت کی سہولتیں پیش کی گئیں۔ادارہ ثقافت اسلامیہ کی سربراہی کی پیش کش بھی کی گئی لیکن انہوں نے یہ مناصب قبول نہیں کیے۔

ان کے استعفیٰ کے بعد اسلامک کلوکیم حسب پروگرام ۲۹دسمبر ۱۹۵۷ء سے ۸جنوری ۱۹۵۸ء تک لاہور میں منعقد ہوا اور اس میں پیش کیے جانے والے مقالات کا مجموعہ انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم پیپرز کے نام سے شائع کیا گیا[39] لیکن اس میں علامہ اسد کا کوئی ذکر نہیں۔

حواشی

1- سید نذیر نیازی کے نام علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل مکتوبات میں علامہ اسد اور ان کے اسلامیہ کالج لاہور سے تعلق کے حوالے سے ذکر موجود ہے۔مکتوب مورخہ ۲۷جون ۱۹۳۴ء (جس میں علامہ اسد کو خط لکھنے کا ذکر ہے) ۲۳جولائی ۱۹۳۴ء؛ ۲۸جولائی ۱۹۳۴ء؛ ۳۰جولائی ۱۹۳۴ء؛ ۱۱- اگست ۱۹۳۴ء اور ۳۱-اکتوبر ۱۹۳۴ء۔ دیکھیے: سید مظفر حسین برنی: کلیات مکاتیب اقبال، اردو اکادمی، دہلی، جلد سوم، ص ۵۲۹ و مابعد۔

2- Muhammad Asad, *Islam at the Crossroads,* Lahore, Arafat Publications, 1934.

3- Ibid. (some press opinions)

4- M. Ikram Chaghatai (ed.) *Muhammad Asad: Europe's Gift to Islam,* The Truth Society and Sang-e-Meel Publications, 2006, Lahore, Vol. I, Introduction, p. iii.

اسد کے سوانحی اشارات کے سلسلے میں بھی اس کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

5- اقبال کا فکر و فن: مرتبہ افضل حق قرشی، یونیورسل بکس، لاہور ۱۹۸۸ء، ص ۲۱۲۔

6 Muhammad Asad, *Sahih al-Bukhari,* (Translated from the Arabic with explanatory notes) Lahore, Arafat Publications.

Muhammad Asad, *Sahih al-Bukhari, The Early Years of Islam,* Gibraltar, Dar al Andalus, 1981, Preface.

7- New York, Simon and Schuster, 1954.

8- Berkeley, California, University of California Press, 1961.

Marfat.com

9- Mecca, Muslim World League.

10- Gibraltar, Dar al Andalus, 1987.

11- G. Windhager, *Leopold Weiss alias Muhammad Asad, Von Galizien nach Arabien 1900-1927,* Vienna: Böhalu.

12- M. Ikram Chaghatai (ed.), op. cit., Vol. I and II, pp. 1240.

13- محمد ارشد، "اسلامی ریاست کی تشکیل جدید..... محمد اسد کے افکار کا تنقیدی مطالعہ"، تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ ڈی، شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، اپریل ۲۰۰۷ء۔

14- Proceedings of Meeting of the Syndicate of the University of the Punjab, dated 5-02-1949, paragraph 16, No. 1834/GM, dated 19-02-1949.

15- The Senate at its meeting held on 29th March, 1949 has approved the following items:

15) That the recommendations of the Syndicate relating to the appointment of the following persons in the various University teaching Departments be approved (vide paragraphs 16 & 2 3, 32 and 38 of the Syndicate proceeding dated the 5th and 11th February 1949 respectively):

1. Allama Muhammad Asad as honorary Head of the Department of Islamiyyat.

16- Proceedings Meeting of Senate, March 30, 1950, Para No. 12.

17- مثال کے طور پر دیکھئے: مرقع صدیقی، مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت، لاہور، مجلس فاضلین علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب لاہور، پاکستان، ۲۰۰۳، ص ۱۸۵، ۷۹، ۱۴۔

18- Proceedings of Meeting of the Syndicate of the University of the Punjab, dated the 7-03-1950 paragraph 15, No. 15 after considering item no. 24 on the deffered agenda, it was decided to accept the resignation of Allama Muhammad Asad and to appoint Mr. Ala-ud-Din Siddiqi as honorary head of the Department of

Marfat.com

Islamiyyat in his place.

19- علامہ اسد کو شعبہ اسلامیات کی سربراہی پیش کیے جانے کا ذکر سب سے پہلے راقم الحروف نے کیا لیکن جس کتاب میں یہ ذکر ہوا وہاں یہ مبحث زمانہ زیر بحث سے متعلق نہیں تھا اس لیے محض اس طرف اشارہ کیا جا سکا (تاریخ جامعہ پنجاب جلد دوم لاہور پنجاب یونی ورسٹی ۲۰۰۴ء، ص ۳۴۶) اب زیر نظر مضمون کے ذریعے وضاحت کی جا رہی ہے کہ علامہ اسد نے منصب قبول کرنے کے بعد اور اس منصب پر گیارہ ماہ تک فائز رہنے کے بعد یہ معذرت کی تھی۔

20- All Pakistan Political Science Association, Proceedings of the First All Pakistan Political Science Conference 1950, Lahore, The Punjab University Press, 1950.

بحوالہ محمد ارشد، محولہ بالا، ص ۱۲۵۔

21- غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب، لاہور، جامعہ پنجاب، ۱۹۸۲ء، ص ۲۶۱۔

22- غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، تاریخ یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور، لاہور، اورینٹل کالج، ۱۹۶۲ء، ص ۱۸۷۔

23- Murad, Wilfried Hofmann, "Meeting Muhammad Asad" (Lisbon 21 September 1985), in *Muhammad Asad, Europe's Gift to Islam,* edited by M. Ikram Chaghatai, Lahore, The Truth Society and Sang-e-Meel Publications, 2006, Vol. II, p. 1142.

24- غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، تاریخ یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور، اورینٹل کالج، 1962ء، ص ۲۲۹-۲۲۸۔

25- غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب، لاہور، جامعہ پنجاب، ۱۹۸۲ء، ص ۲۹۰۔

26- Alauddin Siddiqui, Foreword, *International Islamic Colloquium Papers,* December 29, 1957-January 8, 1958, Lahore, Punjab University Press, 1960, p. VII.

27- Proceedings of the Chancellor's Committee, University of the Punjab, Lahore, dated 25th January, 1958.

28- Proceedings of the Chancellor's Committee, University of the Punjab, Lahore, dated 30th January, 1957.

29- Proceedings of the Chancellor's Committee, University of the Punjab, Lahore, dated 20th April, 1957.

30- Proceedings of the Chancellor's Committee, University of the Punjab,

Marfat.com

Lahore, dated 30th November, 1957.

31- صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب، محولہ بالا، جائے مذکور۔

32- "اشارات"، ماہ نامہ ترجمان القرآن، لاہور، مرتبہ سید ابوالاعلیٰ مودودی، لاہور، جمادی الآخر، ۱۳۷۷ھ، جلد ۴۹، عدد ۴، ص ۱۱۔

33- محمد ارشد، محولہ بالا۔

34- پروفیسر شیخ امتیاز علی سے راقم الحروف کی ٹیلی فونی گفتگو، ۱۹ جون ۲۰۰۷ء۔

35- ڈاکٹر محمد افضل در: یاران مکتب، جلد دوم، حصول پاکستان کی جدوجہد، عینی شہادتیں، مرتبہ بیدار ملک، لاہور، پاکستان سٹڈی سنٹر، پنجاب یونی ورسٹی، قائداعظم کیمپس، ۱۹۹۲ء، ص ۲۱۴-۲۱۳۔

36- ایضاً۔

37-38 Proceedings of the Chancellor's Committee, University of the Punjab, Lahore, dated 25th January, 1958.

39- دیکھیے حوالہ نمبر ۳۲۔

(در: اقبالیات (لاہور)، جولائی ۲۰۰۷ء، ص ۷-۲۴)

Marfat.com

سید اشفاق حسین

محمد اسد
عالم اسلام کے صفِ اول کے مفکر اور مفسر

محمد اسد کے بارے میں اسلامی دنیا بہت کم جانتی ہے اس لئے کہ ابھی تک ان کی سوانح حیات نہیں لکھی گئی ہے۔ ان کا یہ مختصر تعارف مارٹن کریمر کی ۱۹۹۹ء کی لکھی ہوئی کتاب سے ماخوذ ہے جس کا عنوان The Jewish Discovery of Islam ہے۔

محمد اسد جن کا یہودی نام (Leopold Weiss) تھا، شہر لوو (Lvóv) میں جولائی ۱۹۰۰ء میں ایک باوقار اور متمول یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا بنجامن وائس شہر کے چیف ربیّ تھے۔ ان کے والد اکیوا وائس کو بھی ربیّ بنانے کی تعلیم دلوائی گئی لیکن وہ بجائے ربیّ بننے کے بیرسٹر بنے اور شہر کے بڑے بینک کے مالک کی بیٹی مالکہ (Malka) سے شادی کی۔ اکیوا وائس نے قانونی پریکٹس لوو میں شروع کی لیکن بعد میں پہلی جنگ عظیم سے پہلے ویانا (Vienna) منتقل ہو گئے۔ انہوں نے بھی اپنے بیٹے لیوپولڈ وائس کو خاندانی پیشہ اور وقار قائم رکھنے کے لئے ربیّ بنانے کے خیال سے مذہبی تعلیم دلوائی۔ محمد اسد بہت ذہین تھے اور بہت اعلیٰ یادداشت کے مالک تھے اس لئے تیرہ سال کی عمر میں انہوں نے یہودی مذہب کی تمام ضروری کتابوں کو قریب قریب حفظ کر لیا اور عبرانی زبان، جرمن زبان اور لاطینی پر عبور حاصل کر لیا۔ مذہبی کتابیں پڑھ کر ان کے دل میں یہودیت کے بارے میں تحقیر آمیز سوچ پیدا اس لئے ہوئی کہ گو وہ اپنی قوم اور مذہب کے کچھ اخلاقی اقدار کو اچھا سمجھتے تھے لیکن ان کی قوم جو اپنے آپ کو خدا کی چنندہ قوم مانتی تھی اور جس کی توریت اور تالمود کا خدا صرف اہل یہود کی بہبود اور حفاظت کرنے والا خدا تھا۔ اس نے اس عقیدہ کو ناقابل قبول سمجھتے تھے اور اسے دنیا کے دوسرے مذاہب سے حقارت کا باعث گردانتے تھے اس لئے محمد اسد نے بھی اپنے والد کی طرح ربیّ بننا رد کر دیا لیکن اس فیصلہ نے نوجوانی میں کسی اور مذہب کی طرف مائل نہیں کیا۔

۱۹۱۸ء میں محمد اسد نے ویانا یونیورسٹی میں فنون لطیفہ کے طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لیا لیکن ۱۹۲۰ء میں والد کی مرضی کے خلاف یونیورسٹی کی تعلیم منقطع کر کے برلین صحافی بننے کے لئے چلے گئے جہاں انہیں ایک نیوز ایجنسی

Marfat.com

میں ملازمت مل گئی۔۱۹۲۲ء میں انہیں ان کے ماموں ڈورین فیگن بام(Dorian Feigenbaum) نے بیت المقدس بلایا۔ یہ دعوت انہوں نے قبول کی۔ ڈورین سائیکو انالسٹ تھے۔ فرائیڈ کے پسندیدہ شاگرد تھے اور بیت المقدس کے پاگل خانے کے مہتمم تھے۔ وہ خود صیہونی (Zionist) نہیں تھے لیکن ان کے چھوٹے بھائی آریے (Aryeh) جو آنکھوں کے ڈاکٹر تھے، بہت کٹر ذائنسٹ تھے۔ بیت المقدس پہنچ کر محمد اسد کو اپنے چھوٹے ماموں آریے سے تبادلۂ خیالات کرنے پر صیہونیت کی غیر اخلاقیت کا سخت احساس ہوا۔ وہ اپنی کتاب The Road to Mecca میں تحریر کرتے ہیں کہ ''میں شروع ہی سے صیہونیت پر معترض رہا۔ میں اس بات کو غیر اخلاقی سمجھتا تھا کہ یہودی لوگ حکومت برطانیہ کی خفیہ مدد سے ہجرت کر کے فلسطین صرف اس مقصد سے پہنچیں کہ اپنی اکثریت بنا کر وہاں کے قدیم باشندوں کو ان کے ملک سے محروم کر دیں۔'' ان کے اس اصولی اعتراض کو اور تقویت ملی جب ان کی تحریر کے مطابق (''جب ایک دن میں نے سرِ شام بیت المقدس کے باب جافا میں نقرئی لیکن سرمگیں افق کے سامنے ایک بدو کو کھڑا ہوا دیکھا۔ میرے دماغ میں ایک بجلی سی چمکی جس نے دل و دماغ کو روشن کر دیا اور مجھ پر اس حقیقت کا اظہار ہوا کہ حضرت داؤدؑ کے زمانے کی بنیادیں حضرت ابراہیمؑ کے زمانے کی بنیادوں کی طرح عربوں کی زمین میں موجود ہیں اس لئے عرب بدو ان سے قریب تر ہیں نہ کہ آج کا یہودی جو اپنے آپ کو ان بزرگوں کا خلف سمجھتا ہے'') بیت المقدس کے قیام کے دوران وہ صیہونیت کے بہت معتبر اور بڑے رہنماؤں مثلاً مناہم یوشکن اور حایم وائز مین سے متعدد مرتبہ ملے اور ان پر اپنی مخالفت کا اظہار کیا۔ وہاں ان کی ملاقات ایک ہم خیال مشہور ڈچ یہودی صحافی سے ہوئی جس کا نام جیکب عزرائیل ڈی ہان(Jacob Israel de Haan) تھا۔ یہ ملاقات قریبی دوستی کا پیش خیمہ تھی۔ جیکب کو اس کی صیہونیت کی مخالفت اور اس کے یورپ میں شائع شدہ مضامین کی وجہ سے ہگانہ (Haganah) نے ۱۹۲۴ء میں قتل کر دیا۔

بیت المقدس میں محمد اسد نے اسلام کے بارے میں پڑھنا شروع کیا اور اپنے آپ کو عربی سیکھنے پر مائل کیا۔ ۱۹۲۲ء میں جرمن اخبار Frankfurter Zeitung نے فلسطین میں اپنا نمائندہ مقرر کر دیا تھا۔ وہ اس اخبار میں صیہونیت کے خلاف اور فلسطینی عربوں کی حمایت میں لکھتے رہے اور حکومت برطانیہ کی چالبازیوں اور عرب دشمنی کو اجاگر کرتے رہے۔ ۱۹۲۳ء میں جیکب اسرائیل ڈی ہان نے محمد اسد کو امیر عبداللہ (۱۸۸۲ء-۱۹۵۱ء) سے ملا دیا تھا۔ یہ ملاقات محمد اسد کے لئے کئی عرب حکمرانوں سے ملاقات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں اسد کے مضامین کا ایک کتابچہ جرمنی میں شائع ہوا۔ ان کے اخبار کے ایڈیٹر نے انہیں کتابچے کو مکمل کتاب میں تشکیل دینے کی ہدایت کی اور اس کام کو پورا کرنے کے لئے دو سال کے عرصہ کی مہلت تحقیق اور تحریر کے لئے دی۔ اس عرصہ میں انہوں نے وسطی ایشیا، افغانستان، ایران، عراق، شام، کردستان اور مصر کا سفر کیا تا کہ وہ اسلام کی مختلف اشکال کا مطالعہ کر کے اسے اچھی طرح سمجھ سکیں۔ قاہرہ میں ان کی ملاقات شیخ مصطفیٰ المراغی (۱۸۸۱ء-۱۹۴۵ء) سے ہوئی۔ شیخ صاحب اسلام کے بہت بڑے اصلاحی مفکر تھے جن کو بعد ازاں الازہر یونیورسٹی کا ریکٹر مقرر کیا گیا تھا۔ اس ملاقات نے محمد اسد کو دماغی

Marfat.com

روشنی بخشی اوران کی اسلام کے بارے میں معلومات میں بہت اضافہ کیا۔اس ملاقات کے بعد محمد اسد پر یہ انکشاف ہوا کہ مغربی ناقدین کا یہ قول کہ مسلمانوں کے زوال اور ابتری کا باعث اسلام ہے، بالکل غلط ہے اس لئے کہ یہ ناقدین اپنی تعصب کی وجہ سے اسلام کو غلط سمجھے۔محمد اسد پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ اگر تمام دنیا اسلام کا صحیح مفہوم سمجھ لے تو اسلام تمام انسانوں کو نہ صرف ترقی کی راہ پر گامزن کر دے بلکہ انہیں ان دینی اور اخلاقی اقدار سے نوازے جو یہودی، عیسائی اور دوسرے مذاہب دینے کے قابل نہیں رہے ہیں۔اس دو سال کے تحقیقی سفر کے بعد محمد اسد فرینکفرٹ واپس لوٹے۔ ایک عیسائی جرمن عورت سے شادی کر کے ازدواجی زندگی گزارنے لگے۔اور چونکہ وہ اپنی کتاب نہ لکھ پائے اس لیے ایڈیٹر سے ناچاقی ہوئی اور انہیں اخبار سے مستعفی ہونا پڑا۔وہ فرینکفرٹ چھوڑ کر برلن گئے جہاں انہوں نے چند چھوٹے اخبارات اور رسالوں کے لیے مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ایک دن جب وہ برلن کی زمیں دوز ٹرین میں سفر کر رہے تھے، انہیں یکا یک یہ احساس ہوا کہ باوجود جرمنی کی صنعتی اور اقتصادی ترقی کے ٹرین میں بیٹھے ہوئے مسافر مسکرا نہیں رہے تھے اور مغموم نظر آ رہے تھے۔ان کو معاً خیال آیا کہ جس بدو کو باب جافا میں کھڑا دیکھا تھا، وہ کتنا مطمئن نظر آیا تھا۔جب وہ گھر پہنچے تو انہوں نے قرآن کھولا اور جب ان کی نظر ان آیات پر پہنچی تو وہ وہیں جم کر رہ گئی ''تمہارے دماغوں پر لالچ اس طرح مسلط ہوگئی ہے کہ تم قبر میں جانے تک زیادہ سے زیادہ حصول زر کے پیچھے بھاگ رہے ہو اور تم اگر یہ بات یقین سے جان لو تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ لالچ نے تمہیں کس دوزخ میں جھونک دیا ہے'' (سورۃ ۱۰۲: آیات ۱تا۶)۔ان آیات نے محمد اسد کو یقین دلا دیا کہ قرآن الہامی کتاب ہے۔دوسرے دن وہ برلن کی اسلامک سوسائٹی گئے اور یہودیت ترک کر کے اسلام قبول کر لیا اور ان سے تبادلہ خیالات کے بعد ان کی بیوی (Elsa) بھی مسلمان ہوگئیں۔جب ان کے جاننے والوں نے ان سے پوچھا کہ اسلام کیوں قبول کیا تو اس کا جو جواب انہوں نے دیا اس کا ذکر وہ اپنی کتاب The Road to Mecca میں اس طرح کرتے ہیں ('' قرآن کا علم ایسی مربوط، ہمہ گیر اور متوازن موسیقی ہے جس میں کوئی حرکت فاضل نہیں، نہ اس میں کم و بیش کی کوئی گنجائش ہی ہے۔اور پھر بات تو آخر صحبت کی ہے جو کئی عناصر کا مجموعہ ہے جس میں اپنی خواہشات، امیدیں، ارادے، صلاحیت اور کمزوریاں سب ہی شامل ہیں'')۔ان کے خاندان کے لوگوں نے سمجھا کہ وہ اپنے والد کی مخالفت میں مسلمان ہوئے۔انہوں نے اسلام قبول کرنے کی وجوہات کا خط اپنے والد کو لکھا جس کا کوئی جواب نہ آیا۔چند ماہ کے بعد ان کی بہن نے لکھا کہ وہ اپنے والد کے لئے مر چکے۔جواباً انہوں نے والد کو ایک اور خط لکھا جس میں دعویٰ کیا کہ ان کے دل میں والد کی محبت اور بڑھ گئی ہے اس لئے کہ اسلام والدین کی قدر و منزلت کا حکم دیتا ہے۔اس خط کا بھی کوئی جواب نہ آیا۔جنوری ۱۹۲۷ء میں محمد اسد اور ان کی بیوی حج کرنے مکہ گئے اور پہلا حج کیا۔بدقسمتی سے حج کے نو دن بعد ایلسا سخت بیمار ہوئیں اور انتقال کر گئیں جس وجہ سے محمد اسد بہت عرصہ تک مغموم رہے لیکن اس وقت سے ان کی سعودی عرب کی زندگی کا آغاز ہوا۔ جلد ہی ان کی ملاقات شاہ ابن سعود (۱۸۸۰ء-۱۹۵۳ء) سے ہوئی اور دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب ہوگئے۔ محمد اسد نے کئی مضامین یورپ کے اخباروں کے لئے لکھے جن میں ابتدا میں ابن سعود کی تعریف کی۔

Marfat.com

۱۹۲۸ء میں ایک عراقی عبداللہ جملودی شاہ ابن سعود کے مشیر مقرر کیے گئے۔ وہ حکومت برطانیہ کے جاسوس تھے۔ انہوں نے اپنی رپورٹ میں حکومت برطانیہ کو لکھا کہ محمد اسد جو شاہ سعود اور ان کے سیکرٹری شیخ یوسف یاسین سے بہت قریب ہو گئے ہیں، شاید بالشوک جاسوس ہیں۔ یہ خبر بالکل غلط تھی اور شاید حسد کی بنا پر دی گئی تھی۔ ۱۹۲۹ء میں شاہ سعود نے محمد اسد کو کویت اس مشن پر بھیجا کہ وہ خفیہ طور پر معلوم کریں کہ باغی سردار فیصل الدویش کو اسلحہ کون دے رہا ہے اور اس کی مالی امداد کون کر رہا ہے۔ محمد اسد کی معلومات کے مطابق یہ دونوں کام حکومت برطانیہ کر رہی تھی۔ ۱۹۲۸ء میں محمد اسد نے ایک قبیلہ کی عرب خاتون سے شادی کی۔ یہ شادی ۱۹۳۰ء میں طلاق کے ذریعہ ختم ہوئی۔ اسی سال انہوں نے ایک دوسری منیرا نامی عرب خاتون سے شادی کی اور مدینہ میں مستقل طور پر رہائش اختیار کی۔

محمد اسد امید کرتے تھے کہ شاہ سعود "سعودی عرب میں خالص اسلامی حکومت قائم کریں گے" لیکن جلد ہی ظاہر ہو گیا کہ ابن سعود بھی دوسرے مشرقی حکمرانوں کی طرح مطلق العنان رہنا چاہتے تھے اور ایک انصاف، ترقی پسند اور مساوات پر مبنی معاشرہ قائم کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ انہوں نے ملک میں امن و امان تو قائم کیا لیکن جبر و استبداد کے ذریعے۔ انہوں نے خود اپنے اور اقرباء کے لیے عیش و عشرت اور فضول خرچی کی راہ پسند کی اس لئے اپنے ضمیر کا امتحان لینے کی صلاحیت کھو بیٹھے۔ ان کے لاتعداد خوشہ چیں پیدا ہو گئے تھے جو سب افسوس ناک حرکات میں ملوث تھے۔ محمد اسد اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں کہ "ابن سعود جو جوانی میں ایک سچی اسلامی حکومت کے خواب دیکھتے تھے، انہیں بھول گئے جس کے نتیجہ میں اہل نجد بہت مایوس ہوئے اور شاہ سعود کو فریبی سمجھنے لگے۔" محمد اسد کے مطابق ابن سعود وہ عقاب تھا جو کبھی نہیں اڑا۔

شاہ سعود سے مایوس ہو کر محمد اسد نے سوچا کہ شاید سنوسی تحریک صحیح اسلامی حکومت کا پیش خیمہ ہو اس لئے وہ بڑے سنوسی سید احمد (۱۸۷۳ء-۱۹۳۲ء) کے ایما پر خفیہ مشن پر سرینائکا (Cyrenaica) گئے لیکن ۱۹۳۲ء میں اٹلی کی فوجوں نے سنوسی تحریک کو نیست و نابود کر دیا۔ اسی سال شاہ سعود محمد اسد سے اس لئے ناراض ہوئے کہ ان کی بیوی منیرا کے خاندان پر شاہ سعود کے خلاف سازش کا شبہ ہو گیا تھا اس لئے جون ۱۹۳۲ء میں محمد اسد ہندوستان، ترکستان، چین اور انڈونیشیا کے دورے پر روانہ ہوئے۔ دورے کے اختتام پر جب وہ ہندوستان پہنچے تو انہوں نے اپنے خطبات کا سلسلہ جاری کیا۔ برطانوی جاسوسی کے محکمہ کی رپورٹ کے مطابق محمد اسد نے ایک شرانگیز شخص اسمٰعیل غزنوی سے رابطہ کیا جس کی مدد سے ہم خیال لوگوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۳۲ء میں محمد اسد لاہور پہنچے جہاں انہوں نے کشمیری مسلمانوں سے ملاقاتیں کیں اور کشمیر گئے۔ برطانوی خفیہ رپورٹ کے مطابق کشمیر میں انہوں نے کیمونسٹ خیالات پھیلانے کی کوشش کی جس کے باعث کشمیر کے مہاراجا نے انہیں کشمیر سے جلاوطن کرنے کی کارروائی کی اس لئے وہ کشمیر سے لاہور واپس آئے۔ لاہور میں وہ علامہ اقبال سے ملے۔ علامہ نے اس بات پر راضی کیا کہ وہ اسلامی حکومت کا واضح خاکہ تیار کریں۔ علامہ سے ملاقاتوں کے بعد محمد اسد اسلامی مفکر کی حیثیت سے ابھرے۔ ۱۹۳۴ء میں انہوں نے ایک کتابچہ زیر عنوان Islam at Crossroads لکھا۔ اس میں انہوں نے مغرب کی مادہ پرستی کی

Marfat.com

مذمت کی اور دعویٰ کیا کہ اسلام کا مقابلہ مغرب کی مادہ پرست تہذیب سے ہے۔ انہوں نے نشاندہی کی کہ صلیبی جنگوں کو مغرب کی ملوکیت سے ایک خط استوار جوڑتا ہے اور مغرب کے علوم مشرق کے ماہرین اسلام کے خلاف سازشاً تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس کتابچہ کو ہندوستان اور پاکستان میں متعدد بار شائع کیا گیا۔ ۱۹۴۶ء میں اس کا ترجمہ عربی میں ہوا جسے پڑھ کر مصری مفکر سید قطب بہت متاثر ہوئے اور کروسیڈ رازم کی تشکیل کی۔

۱۹۳۶ء میں محمد اسد حیدر آباد دکن گئے۔ نظام حیدر آباد نے مارمادوک پکتھال کے زیر ادارت ایک جریدہ بنام Islamic Culture شائع کروانا شروع کروا دیا تھا۔ اسی سال پکتھال کے انتقال پر نظام نے اس جریدہ کی ادارت محمد اسد کے سپرد کر دی۔ محمد اسد نے اس جریدہ کے لئے متعدد عالمانہ مضامین لکھے۔ ۱۹۳۶ء میں محمد اسد اور ان کے والد کے درمیان صلح ہو چکی تھی اور آپس میں خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ جب جرمنی نے آسٹریا پر قبضہ کر لیا اور یہودیوں پر جبر و استبداد کا عذاب پڑا تو ۱۹۳۸ء میں محمد اسد انگلستان اس لئے گئے کہ اپنے خاندان کے لوگوں کو نازیوں سے بچائیں۔ انہوں نے لندن میں بہت کوشش کی کہ ان کے آسٹریا کے ویزے کی میعاد بڑھا دی جائے لیکن وہ ناکام رہے اور اپنے خاندان کے افراد کو آسٹریا سے باہر نہ نکال سکے اس لئے جون میں وہ ہندوستان لوٹ آئے۔ ۱۹۳۹ء میں جب انگلستان نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا تو ہندوستان میں رہنے والے جرمن اور اٹلی کے باشندوں کے ساتھ محمد اسد کو بھی ایک جنگی ملزموں کے کیمپ میں نظر بند کر دیا گیا۔ ان کے الفاظ میں ''قید و بند کے چھ سال اپنے بیرک کی لمبائی کو روز ناپتے گذرے اور ہر قدم پر سوچتا رہا کہ مسلمان اپنا لائحہ عمل اور قوانین کے غیر مبہم نظریات پر ابھی تک متفقہ طور پر کیوں نہیں پہنچ پائے۔'' اس سوچ نے انہیں اپنی اسلامی شخصیت پر ثابت اور جامد رکھا۔

۱۹۴۶ء میں جب محمد اسد رہا کئے گئے تو انہوں نے پاکستان کو مسلمانوں کی جائے پناہ اور اسلامی لائحہ عمل اور سیاست کا ڈھانچہ گردانا اور تقسیم ہند پر پاکستان آئے۔ ۱۹۴۷ء میں حکومت پاکستان نے انہیں Directorate of Islamic Reconstruction کے سربراہ کے عہدہ پر فائز کیا۔ چونکہ انہیں بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں کے ان مفکرین سے اختلاف تھا جو جمہوریت کو اسلام کا تضاد سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے تاریخ اسلام کا تحقیقی جائزہ لیا جس سے انہیں اسلامی حکومتوں میں انتخابات، مجلس شوریٰ کی تشکیل اور متعدد پارٹیوں کے قیام کے ثبوت ملے۔ ان کی بناء پر ۱۹۴۸ء میں انہوں نے اپنی تجاویز کتابی شکل میں زیر عنوان Islamic Constitution-Making حکومت پاکستان کو پیش کیں۔ ان کی تجاویز کے مطابق پاکستان میں ایک آزاد خیال، کثیر الجماعت، جمہوری اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ یہ پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ ان تجاویز پر عمل نہیں ہوا۔ انہوں نے لکھا تھا ''میری تجاویز کے پاکستان کے منشور میں خال خال نشانات ملتے ہیں یا وہ اس دیباچہ میں ہیں جو پاکستان کی Constituent Assembly نے ۱۹۴۹ء میں لکھا تھا۔'' پاکستان ان خطوط پر نہیں چلا جو علامہ اقبال اور محمد اسد کے قائم کردہ تھے۔ پاکستان کا قیام ایک تاریخی ضرورت سمجھی گئی تھی جس کے بغیر ممکن تھا کہ زیادہ ترقی یافتہ اور متمول ہندو اکثریت مسلمانوں پر غالب آ جاتی۔ علامہ اقبال کا نظریہ پاکستان محمد علی جناح صاحب کے نظریہ سے مختلف تھا اس لئے

Marfat.com

کہ جناح صاحب ۱۹۴۶ء تک تقسیم ہندوستان کے قائل نہیں تھے۔ پاکستان مسلمانوں کے لئے ملک تو بنا لیکن اس کے حکمرانوں نے اسے صحیح اسلامی ملک نہیں بننے دیا۔

۱۹۴۹ء میں محمد اسد اپنے عہدہ سے دستبردار ہو کر محکمہ امور خارجہ میں منتقل ہوئے جس میں انہیں مشرق وسطیٰ کے امور کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۵۱ء میں انہیں اقوام متحدہ میں سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ اس طرح وہ تقریباً بیس سال برصغیر میں قیام کے بعد مغرب میں پہنچے۔ نیویارک پہنچنے کے فوراً بعد ان کی ملاقات نومسلم امریکی خاتون سے ہوئی جنہوں نے اپنا نام بدل کر اسلامی نام حمیدہ اپنا لیا تھا۔ محمد اسد کو ان سے محبت ہو گئی اس لئے انہوں نے اپنی بیوی منیرا سے طلاق حاصل کی اور حمیدہ سے نکاح کر لیا جو حمیدہ کے ساتھ تاعمر قائم رہا۔ ان کے ایک پاکستانی ساتھی نے حسد کی وجہ ان کی حمیدہ سے محبت کو ایک ذلت آمیز واقعہ بنا کر حکومت پاکستان کو پیش کیا جس کی وجہ سے محمد اسد اپنی ملازمت سے مستعفی ہوئے۔ ان کے استعفیٰ کو اس وقت کے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین نے قبول کر لیا۔ ۱۹۵۳ء میں جب ناظم الدین برطرف کر دیئے گئے تو محمد اسد کو امید ہوئی کہ شاید انہیں دوبارہ یو۔ این۔ کے عہدہ پر بحال کر دیا جائے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ نیویارک میں ان کے ایک امریکن دوست نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنی آپ بیتی ایک کتابی شکل میں لکھیں تا کہ معاش کی صورت نکل آئے۔ انہوں نے ناشر Simon and Schuster سے رابطہ قائم کیا۔ ناشر نے ان کے ساتھ معاہدہ کر کے کچھ رقم پیشگی دی۔ اس طرح ۱۹۵۴ء میں ان کی کتاب The Road to Mecca شائع ہوئی جو بے حد مشہور اور مقبول ہوئی۔ اس کتاب میں روحانی تلاش اور ریگستانی زندگی کا عمدہ امتزاج ہے۔ قبول اسلام پر اس سے بہتر کوئی اور کتاب میری نظر سے نہیں گذری۔ اس کتاب کے پُر زور اثر کا اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک اکیس سالہ یہودی لڑکی نے اپنے باپ کی مرضی کے خلاف جب یہ کتاب پڑھی تو تہیہ کر لیا اور محمد اسد کی طرح وہ بھی مسلمان ہو گئی اور اپنا نام مریم جمیلہ رکھا اور پاکستان پہنچ کر اسلامی اقدار کی حمایت اور مغرب کی اقدار کی مذمت کی پُر جوش آواز بن گئی۔ اس کتاب کے ترجمے مختلف زبانوں میں شائع ہوئے۔ اس کامیابی کی وجہ مختلف اداروں نے محمد اسد کو اپنے خطبات پڑھنے کے لئے مدعو کرنا شروع کر دیا۔ مولانا مودودی نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا ''میں محمد اسد کی اسلامی عقائد کی تشریح اور مغربی کلچر کی مادہ پرستی کی مذمت کی بے حد قدر کرتا ہوں مگر افسوس اس پر ہے کہ گو تبدیل مذہب کے بعد اسد اسلام اور صوم وصلوٰۃ کے بہت پابند رہے لیکن اب وہ اسی طرح ترقی پسند مسلمان بن گئے ہیں جیسے ترقی پسند یہودی ہیں۔ ان میں یہ تبدیلی اس وقت سے آئی ہے جب سے انہوں نے ایک جدید امریکن عورت سے شادی کر لی۔ کوئی شخص جو سچے مسلمان کی زندگی اپناتا ہے وہ اپنی کاروباری صلاحیتیں کھو دیتا ہے۔ یہی المیہ محمد اسد کے ساتھ ہوا ہے جو ابتدائی زندگی میں جدید آرام و آسائش کی زندگی گذار چکے تھے اور جب قبول اسلام کے بعد ان کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو انہیں یکے بعد دیگرے حالات سے کئی سمجھوتے کرنے پڑے۔'' میں یہ سمجھتا ہوں کہ مولانا مودودی کی رائے درست نہیں۔ اسد کی امریکن بیوی اسد سے ملنے سے پہلے مسلمان ہو چکی تھی۔ ہر مسلمان کو حقوق العباد کو پورا کرنے کے لئے مشقت اور تجارت کی ہدایت دی گئی ہے نہ کہ صوفیانہ رویہ اختیار کرنے کی۔ مولانا

Marfat.com

صاحب خود اکثر متمول میزبانوں کے گھر قیام کرتے تھے اور ان کی اپنی نوشتہ کتابوں سے کافی آمدنی ہوتی تھی۔ مولانا صاحب کے اعتراضات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی اور مفکر کو اپنے سے بہتر یا اپنا ہم پلہ ماننے کے قائل نہیں تھے۔ جہاں تک مجھے علم ہے محمد اسد مسلمان ہونے کے بعد تمام عمر اجتہاد کرتے رہے۔ انہوں نے سچے مسلمان کی طرح زندی گذاری۔ وہ ترقی پسندی کے قائل تھے اسی لئے وہ قدامت پسند اور لکیر کے فقیر ملاؤں اور مولویوں سے منحرف ہو گئے تھے۔

۱۹۶۰ء میں محمد اسد اور حمیدہ نیویارک سے جنیوا منتقل ہوئے۔ وہاں محمد اسد نے قرآن کے انگریزی ترجمہ کی اس لئے ابتدا کی کہ وہ کسی مترجم کے ترجمہ سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کی تحقیق کے مطابق کسی مترجم کو عربی زبان کے باریک نکات پر کلی طور پر عبور نہیں تھا۔ انہوں نے تحریر کیا ''کلاسیکی عربی کے علاوہ وسطی سعودی اور مشرقی سعودی بدو قبیلوں کی زبان اور تلفظات کو جاننا ہر مترجم کے لئے اشد ضروری ہے۔ چونکہ اس ضرورت کو یورپی زبانوں کے مترجموں نے پورا نہیں کیا اس لئے ان کے تراجم کئی جگہوں پر غلطیوں سے پُر ہیں اور قرآن کے مفہوم اور روح کی صدائے باز گشت بن گئے ہیں۔'' ترجمہ جیسے اہم اور صبر آزما کام کے لئے مالی امداد کی ضرورت تھی اس لئے محمد اسد نے شاہ فیصل بن عبدالعزیز سے رابطہ قائم کیا۔ شاہ فیصل نے نہ صرف خود مالی امداد دی بلکہ مسلم ورلڈ لیگ سے بھی مالی امداد دلوائی۔ ۱۹۶۴ء میں محمد اسد نے پہلے سات سپاروں کا ترجمہ شائع کیا جسے پڑھ کر ملاؤں اور اماموں میں کھلبلی پیدا ہوگئی اور اس پر اعتراضات کی بارش ہونے لگی۔ یہ کہا گیا کہ اسد کے بعض آیات کے ترجمے مجازیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اسد فرشتوں کے وجود کے قائل نہیں ہیں اور داشتہ رکھنے کی اجازت کے قائل ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے مردہ جسم کے آسمانی سفر کو قبول نہیں کرتے وغیرہ۔ ان اعتراضات کی وجہ سے شاہ فیصل نے مالی امداد بند کر دی اس لئے وہ جنیوا سے تنجیہ ۱۹۶۴ء میں منتقل ہوئے۔ محمد اسد کو خود اپنے مالی وسائل سے اور چند دوستوں کی مالی امداد سے جس میں سعودی تیل کے وزیر ذکی یمانی بھی شامل تھے، ترجمہ مکمل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ ۱۹۸۰ء میں محمد اسد کا قرآن کا انگریزی ترجمہ زیر عنوان The Message of the Quran جبرالٹر سے شائع ہوا۔ ان کے ترجمے کی تعریف ایک انگریز نومسلم نے یوں کی ہے ''قرآن کی آیات سے دماغی رابطہ قائم کرنے میں اور عربی زبان کے منفرد اور عمیق معنے سمجھانے میں اسد کے ترجمے میں جو دماغی قوت ہے وہ انگریزی میں نایاب ہے۔'' ملاؤں نے اسد کے ترجمے کو مسترد کر کے ان سے اسد کے دل میں اور انحراف بڑھا دیا۔ اسد کی اسلام سے محبت آخری دم تک قائم رہی۔ انہیں صحیح اسلام کسی بھی اسلامی مسلک یا اسلامی ملک میں نہ مل سکا۔ ۱۹۸۳ء میں محمد اسد تنجیہ سے پرتگال کے شہر سانترا میں منتقل ہوئے اور چند سالوں کے بعد اسپین کے شہر میجاس (Mijas) میں منتقل ہوئے جہاں ۱۹۹۲ء میں اکانوے سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ انہیں قرطبہ کے مسلم قبرستان میں دفنایا گیا۔ انہوں نے اپنے مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا اور امام بخاری کی احادیث پر بھی ایک کتاب لکھی۔ صدر پاکستان مرحوم جنرل ضیاء الحق نے محمد اسد کو پاکستان واپس آنے کی دعوت دی تھی جسے محمد اسد نے قبول نہیں کیا۔ انہیں گورنر ریاض شاہ سلمان بن عبدالعزیز نے بھی سعودی عرب واپس آنے کی دعوت دی۔ گو اسد نہیں گئے

Marfat.com

لیکن وعدہ کیا کہ وہ ایک کتاب زیرعنوان Home Coming of the Heart لکھیں گے لیکن اس کے ختم ہونے سے پہلے وہ انتقال کر گئے۔

محمد اسد جیسی عظیم اسلامی شخصیت کے انتقال پر بہت کم مسلمانوں نے توجہ دی۔ صرف مشتاق پارکر صاحب نے ایک کتاب زیرعنوان Death of a Muslim Mentor لکھی جس میں محمد اسد کے آخری سالوں کے حالات شامل ہیں۔ محمد اسد پر جو بھی الزامات رجعت پسند اور قدامت پسند مسلمان علماء نے لگائے ان کے جوابات اسد نے The Islamic World Review کے اکتوبر ۱۹۸۱ء کے شمارے میں شائع کروائے جن پر متعدد مغربی علماء نے کتابیں اور مضامین لکھے۔ زیرعنوان A Tribute to Mohammad Asad ایک ویڈیو فلم بھی ہے جو انٹرنیٹ پر شاید مل سکتی ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ محمد اسد جیسی اہلیت، قابلیت، فراست اور قرآن کی صحیح ترجمانی کرنے والی شخصیت کا ملنا اگر ناممکن نہیں تو بے حد محال ضرور ہے اسی وجہ سے ان انگریزی داں مسلمانوں میں The Message of the Quran بہت مقبول ہے جن کے ذہن اسلام کو سمجھنے اور اس کے احکامات پر عمل کرنے میں رجعت پسندی اور قدامت روی کے قائل نہیں ہیں۔ میں اپنے مسلمان بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ محمد اسد کے ترجمہ کو پڑھیں۔ اس سے مستفید ہوں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

(در: "ساحل" (یوکے)، نومبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۸-۲۱) ٭

Marfat.com

پروفیسر خورشید احمد

محمد اسد: قیمتی ہیرا

بیسویں صدی میں امت اسلامیہ کے علمی افق کو جن روشن ستاروں نے تابناک کیا، ان میں جرمن نومسلم محمد اسد (لیوپولڈ ویز) کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ اسد کی پیدائش ایک یہودی گھرانے میں ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ ۲۳ سال کی عمر میں ایک نوعمر صحافی کی حیثیت سے عرب دنیا میں تین سال گزارے اور اس تاریخی علاقے کے بدلتے ہوئے حالات کی عکاسی کے ذریعے بڑا نام پایا لیکن اس سے بڑا انعام ایمان کی دولت کی بازیافت کی شکل میں اس کی زندگی کا حاصل بن گیا۔ ستمبر ۱۹۲۶ء میں جرمنی میں مشہور خیری برادران میں سے بڑے بھائی عبدالجبار خیری کے دست شفقت پر قبول اسلام کی بیعت کی اور پھر آخری سانس تک اللہ سے وفا کا رشتہ نبھاتے ہوئے اسلامی فکر کی تشکیل اور دعوت میں ۶۶ سال صرف کر کے بالآخر ۱۹۹۲ء میں رب حقیقی سے جا ملے۔

محمد اسد کی داستان محض ایک انسان کی داستان نہیں، ایک تاریخ ساز دور کی علامت اور عنوان ہے۔ ایک بے تاب روح، خطروں کو انگیز کرنے والا ایک نوجوان، ایک تہذیب سے ایک دوسری تہذیب کا مسافر، ایک محقق اور مفکر، ایک سیاسی تجزیہ نگار اور سفارت کار اور سب سے بڑھ کر قرآن کا ایک مخلص خادم -- اسد کی چند آراء سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن فکری اور تہذیبی میدانوں میں ان کے مجتہدانہ اور مجاہدانہ کارناموں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اسد نے مسلمانوں کی نئی نسلوں کے افکار کو متاثر کیا اور اسلامی دنیا میں اپنا مقام بنایا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ بیسویں صدی میں مغربی دنیا سے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والے اشخاص میں سب سے نمایاں مقام محمد اسد ہی کو حاصل ہے اور بجا طور پر زیر نظر کتاب * میں اسے 'اسلام کے لیے یورپ کا تحفہ' قرار دیا گیا ہے۔ ان کے لیے یہ الفاظ ایک دوسرے جرمن نومسلم ولفریڈ ہوف مین (Wilfred Hoffmann) نے استعمال کیے ہیں، اور یہ بھی بڑا نادر توارد ہے کہ خود مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی چودھری نیاز علی خاں صاحب کے نام اپنے ایک خط میں غالباً ۱۹۳۶ء میں محمد اسد کے بارے میں یہ تاریخی جملہ لکھا تھا: ''میرا خیال ہے کہ دور جدید میں اسلام کو جتنے غنائم یورپ سے ملے ہیں، ان میں یہ سب سے زیادہ قیمتی ہیرا ہے۔''

یہ تحقیقی کتاب اس ہیرے کی زندگی، خدمات اور نگارشات پر مشتمل ہے جسے محمد اکرام چغتائی صاحب نے

Marfat.com

بڑی محنت، محبت اور قابلیت سے مرتب کیا ہے اور اس سلسلے میں امت مسلمہ پر بالعموم اور ملت اسلامیہ پاکستان پر بالخصوص جو قرض تھا' اسے فراخدلی سے ادا کر دیا ہے۔ یہ ایک فرض کفایہ تھا جو انہوں نے اور ٹروتھ سوسائٹی نے ادا کیا ہے اور ہم اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے بہترین اجر کی دعا کرتے ہیں۔

محمد اسد سے میرا بھی اولین تعارف' سیکڑوں بلکہ ہزاروں نوجوانوں اور طالبین حق کی طرح ان کی پہلی کتاب Islam at the Crossroads کے ذریعے ہوا۔ میری اپنی زندگی میں قیام پاکستان کے بعد کے دو سال بڑے فیصلہ کن تھے اور ایک طرح میں بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح ایک دوراہے پر کھڑا تھا--ایک طرف مغربی تہذیب اور مغرب سے اٹھنے والی تحریکوں کی چمک دمک تھی اور دوسری طرف تحریک پاکستان کا نظریاتی آدرش اور اسلام کے لیے ایک عالمی پیغام اور تحریک انقلاب ہونے کا احساس۔ دونوں کی اپنی اپنی کشش تھی اور میرے جیسے نوجوانوں کا معما کہ

اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

اقبال کے ایمان افروز کلام اور مولانا مودودی کے دل و دماغ کو مسخر کرنے والے لٹریچر کے ساتھ جس کتاب نے خود مجھے اس دوراہے سے نجات دلائی اور شاہ راہِ اسلام کی طرف رواں دواں کر دیا، وہ اسد کی یہی کتاب تھی۔ اس وقت سے اسد سے ایک گہرا ذہنی اور قلبی تعلق قائم ہوا اور پھر اس وارفتگی کے عالم میں تلاش بسیار کے بعد ''عرفات'' کے شمارے اور صحیح بخاری کے ترجمے کے پانچ ابواب حاصل کیے اور ورد جان کر لیے۔ ''اسٹوڈنٹس وائس'' (اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کا انگریزی ترجمان) کے دورِ ادارت میں محمد اسد سے بھرپور استفادہ کیا اور ان سے ملنے کے لیے بے چین رہا۔ یہ خواہش ۱۹۵۴ء میں پوری ہوئی جب محمد اسد چند دن کے لیے پاکستان آئے۔ کراچی میں سندھ کلب میں میری اور ظفر اسحاق انصاری اور خرم مراد کی ان سے ملاقات ہوئی اور جو تصویر ذہن میں بنائی تھی، اس کے مطابق پایا۔

اس زمانے میں اسد پاکستان کے اقوام متحدہ کے مشن سے فارغ ہو چکے تھے اور وزارت خارجہ کے افسران سے خاصے بددل تھے۔ انہوں نے یہ ذکر بھی کیا کہ Road to Mecca (شاہ راہِ مکہ) شائع ہو رہی ہے (بلکہ مجھے فخر ہے کہ اس کا ایک نسخہ انہوں نے مجھے بھیجا جس پر ''اسٹوڈنٹس وائس'' میں تبصرہ میں نے ہی لکھا تھا)۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اس کی دوسری جلد لکھنا چاہتا ہوں جس میں پاکستان کی اس وقت کی قیادت پر تنقید بھی ہوگی۔ افسوس یہ جلد شائع نہ ہو سکی اور پتا نہیں اس کے نوٹس یا نامکمل مسودہ کہاں ہے۔ اس مجموعے میں بھی اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ محمد اسد نے میرے نام ایک خط میں بھی دو سال بعد اس کا ذکر کیا تھا۔

محمد اسد کی گم شدہ پونجی میں اس مذکورہ دوسری جلد کا نامکمل مسودہ یا نوٹس، صحیح بخاری کے کچھ دوسرے ابواب کے بارے میں ان کے نوٹس، اور اقوام متحدہ میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے ان کی تقاریر میری نگاہ میں قابل ذکر ہیں اور اب بھی ان کی تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ کم از کم اقوام متحدہ کے ریکارڈ سے ان کی تقاریر کی نقول حاصل

Marfat.com

کی جا سکتی ہیں۔اسی طرح جو خطوط اور رپورٹیں انہوں نے وزارت خارجہ کو اس زمانے میں لکھی تھیں، انہیں بھی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

محمد اسد سے میرے تعلق کی نوعیت ایک استاد اور شاگرد اور ایک ہیرو اور اس کے مشتاق (fan) کی ہے اور جو تعلق ۱۹۴۹ء میں قائم ہوا تھا وہ ۱۹۹۲ء تک قائم رہا۔ پھر ان سے بار ہا ملاقاتیں ہوئیں اور ان کی شفقت میں اضافہ ہی ہوا۔ ۱۹۷۶ء کی لندن کانفرنس میں برادرم سالم عزام کے ساتھ مجھے کانفرنس کے سیکرٹری جنرل کے فرائض انجام دینے کی سعادت حاصل ہے اور اس زمانے میں محمد اسد سے ہمہ وقت استفادے کا موقع ملا۔ فکری اعتبار سے میں نے ان کی اپروچ میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی، البتہ امت کے حالات سے دل گرفتگی اور مسلمانوں کی قیادتوں سے مایوسی آخری ۳۰ سال میں کچھ زیادہ ہی محسوس ہوئی۔

افکار و علمی خدمات

محمد اسد کبھی بھی سرگرم کارکن (activist) نہ تھے لیکن فکری اعتبار سے ان کا کارنامہ بڑا واضح ہے اور اس میں چار چیزیں بہت نمایاں ہیں:

پہلی چیز مغربی تہذیب اور یہود عیسائی روایت (Judo-Christian Tradition) کے بارے میں ان کا واضح اور مبنی برحق تبصرہ و تجزیہ ہے۔ مغرب کی قابل قدر چیزوں کے کھلے دل سے اعتراف کے ساتھ مغربی تہذیب اور عیسائی تہذیبی روایت کی جو بنیادی خامی اور کمزوری ہے، اس کا نہایت واضح ادراک اور دوٹوک اظہار ان کا بڑا علمی کارنامہ ہے۔ زندگی کی روحانی اور مادی خانوں میں تقسیم برائی کی اصل جڑ ہے اور اس سلسلے میں عیسائی روایت اور مغربی تہذیب کا اسے اس کی انتہا تک پہنچا دینے کا انہیں مکمل ادراک تھا۔ اس حوالے سے اپنی زندگی کے کسی بھی دور میں وہ کسی کشش و پیچ یا الجھاؤ (confusion) کا شکار نہیں ہوئے۔ مغرب کے تصور کائنات، انسان، تاریخ اور معاشرے پر ان کی گہری نظر تھی اور اسلام سے اس کے تصادم کا انہیں پورا پورا شعور و ادراک تھا۔ وہ کسی تہذیبی تصادم کے قائل نہ تھے مگر تہذیبوں کے اساسی فرق کے بارے میں انہوں نے کبھی سمجھوتہ نہ کیا۔ اسلام کے ایک مکمل دین ہونے اور اس دین کی بنیاد پر اس کی تہذیب کے منفرد اظہار کو یقینی بنانے اور دور حاضر میں اسلام کی بنیاد پر صرف انفرادی کردار ہی نہیں، بلکہ اجتماعی نظام کی تشکیل نو کے وہ داعی تھے اور اپنے اس مؤقف کو دلیل اور یقین کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ اسلام کا یہ جامع تصور ان کے فکر اور کارنامے کا دوسرا نمایاں پہلو ہے۔

ان کا تیسرا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے امت کے زوال کے اسباب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور اس سلسلے میں جن بنیادی کمزوریوں کی نشان دہی کی، ان میں تصور دین کے غبار آلود ہو جانے کے ساتھ، سیرت و کردار کے فقدان، دین و دنیا کی عملی تقسیم، اجتہاد سے غفلت اور رسم و رواج کی محکومی اور سب سے بڑھ کر قرآن و سنت سے بلاواسطہ تعلق اور استفادے کی جگہ ثانوی مآخذ پر ضرورت سے زیادہ انحصار بلکہ ان کی اندھی تقلید شامل ہیں۔ فقہی

Marfat.com

مسالک سے وابستگی کے بارے میں ان کی پوزیشن ظاہری مکتب فکر سے قریب تھی۔ ان کی دعوت کا خلاصہ قرآن وسنت سے رجوع اور ان کی بنیاد پر مستقبل کی تعمیر وتشکیل تھا۔ قرآن ان کی فکر کا محور رہا اور حدیث اور سنت کو وہ اسلامی نشاۃ ثانیہ کی اساس سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے تمام بڑے قیمتی مضامین کے باوصف جن کا موضوع اسلامی قانون، اسلامی ریاست اور مسلمانوں کی اصل ثقافتی شناخت تھا، ان کا اصل علمی کارنامہ قرآن پاک کا ترجمہ وتفسیر اور صحیح بخاری کے چند ابواب کا ترجمہ اور تشریح ہے جن کی حیثیت میری نگاہ میں اس دور میں کلاسیک کی ہے۔ پھر ''روڈ ٹو مکہ'' ان کی وہ کتاب ہے جو علمی، ادبی، تہذیبی، ہر اعتبار سے ایک منفرد کارنامہ اور صدیوں زندہ رہنے والی سوغات ہے۔

محمد اسد کے کام کی اہمیت کا چوتھا پہلو دور جدید میں اسلام کے اطلاق اور نفاذ کے سلسلے میں ان کی حکمت عملی اور اسی سلسلے میں تحریک پاکستان سے ان کی وابستگی اور پاکستان کے بارے میں ان کا وژن اور وہ عملی کوششیں ہیں جو ''عرفات''، قومی تعمیر نو کے ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے ان کی نگارشات، ان کی تقاریر اور پھر ان کی دو کتابیں: Islam at the Crossroads اور The Principles of State and Government in Islam ہیں۔ ''عرفات'' کے زمانے کے یہ مضامین دور حاضر میں نفاذ اسلام کا وژن اور اس کے لیے واضح حکمت عملی پیش کرتے ہیں۔ چند امور پر اختلاف کے باوجود اس باب میں محمد اسد کے وژن اور فکر اور دور جدید کی اسلامی تحریکات کے وژن میں بڑی مناسبت اور یکسانی ہے حالانکہ وہ کبھی بھی ان تحریکوں سے عملاً وابستہ نہیں رہے۔ اس سلسلے میں ایک جرمن مبصر کارل گنٹر سائمن (Karl Günter Simon) کے مضمون سے ایک اقتباس دل چسپی کا باعث ہوگا جو محمد اسد سے ایک اہم انٹرویو پر مبنی ہے اور جرمن پرچے، Frankfurter Allgemeine Zeitung میں ۱۸ نومبر ۱۹۸۸ء کو ان کے انتقال سے چار سال قبل شائع ہوا تھا:

> لیوپولڈ ویز کو بھلایا جا چکا ہے لیکن کم سے کم اسلامی دنیا میں محمد اسد مشہور ہیں۔ وہ اس سال ۸۸ برس کے ہو جائیں گے۔
>
> احیائے اسلام کے لیے ہمیں باہر سے ماڈل تلاش نہیں کرنے چاہئیں۔ ہمیں بس پرانے بھولے ہوئے اصولوں کو تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بیرونی تہذیبیں ہمیں نیا تحرک دے سکتی ہیں لیکن کوئی غیر اسلامی چیز اسلام کے مکمل نمونے کا بدل نہیں بن سکتی، خواہ اس کا ماخذ مغرب ہو یا مشرق۔ اسلام کے روحانی اور اجتماعی ادارے (خود مکمل ہیں، ان کو کسی بیرونی مدد سے) بہتر نہیں بنایا جا سکتا۔ اسلام کا زوال درحقیقت ہمارے قلوب کی موت یا دلوں کا خالی ہو جانا ہے......''

کیا یہ اخوان المسلمون کا کوئی مناظرانہ مؤقف ہے؟ یا بنیاد پرستوں کا اعلان، خواہ وہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہوں؟ قطعی نہیں۔ یہ جدید بیانات ایک پرانی کتاب میں پائے جاتے ہیں جو ۱۹۳۳ء میں لکھی گئی، یعنی Islam at the Crossroads۔ یہ محمد اسد کی پہلی کتاب تھی (حوالہ مذکورہ کتاب، ص ۲۴)

Marfat.com

اقبال اس فکر کو ۱۱-۱۹۱۰ء سے پیش کر رہے تھے۔ حسن البناء نے ۱۹۲۸ء میں تحریک اخوان المسلمون کا آغاز اسی پیغام کے ساتھ کیا۔ سید مودودی نے ۱۹۳۳ء میں ''ترجمان القرآن'' اسی کلمے کی بنیاد پر اجتماعی زندگی میں انقلاب برپا کرنے کے لیے نکالا اور محمد اسد نے ۱۹۳۳ء میں یہی بات اپنے دل نشین انداز میں کہی۔ دو کا تعلق برعظیم پاک و ہند سے تھا، ایک مصر کے گلزار کا پھول تھا اور ایک یورپ کے روحانی قبرستان کی زندہ آواز -- لیکن سب ایک ہی بات کہہ رہے تھے، اس لیے کہ ان سب کی رہنمائی کا سرچشمہ قرآن پاک اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھی۔ محمد اسد بیسویں صدی میں اسلام کے نشأۃ ثانیہ کے معماروں میں سے ایک تھے اور انہوں نے مغرب اور مشرق کے فرق کو ختم کر کے اسلام کے عالمی پیغام کی صداقت کو الم نشرح کیا۔

تحریک پاکستان اور پاکستان سے تعلق

محمد اسد کے یہاں پاکستان اور تحریک پاکستان کے اصل مقاصد اور اہداف کا بڑا واضح ادراک ہے اور آج کی پاکستان کی نام نہاد قیادتوں کے لیے اسد کی تحریروں میں بڑا سبق ہے اور پاکستانی قوم کے لیے عبرت کا پیغام بھی۔ دیکھیے محمد اسد فروری ۱۹۴۷ء میں اپنے پرچے ''عرفات'' میں کسی وضاحت، فکری سلاست اور علمی دیانت کے ساتھ پاکستان کے تصور کو بیان کرتے ہیں۔ ماضی میں ابھرنے والی بہت سی اصلاحی تحریکوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''تحریک پاکستان اس طرح کی تمام صوفیانہ تحریکوں سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ یہ کسی روحانی رہنما پر لوگوں کے اعتقاد سے جذبہ و توانائی حاصل نہیں کرتی، بلکہ اس کا یہ ادراک -- جو بیش تر معاملات میں ہدایت دیتا ہے اور علمی حلقوں میں صاف صاف سمجھا جاتا ہے -- کہ اسلام (پورے نظام زندگی کی تعمیر نو کی) ایک معقول تدبیر ہے اور اس کی سماجی و اقتصادی اسکیم انسانیت کو درپیش تمام مسائل کا حل فراہم کر سکتی ہے اور اس کا واضح تقاضا یہ ہے کہ اس کے اصولوں کی پیروی کی جائے۔ نظریہ پاکستان کا یہ علمی پہلو اس کا سب سے اہم پہلو ہے۔ اس کی تاریخ کا ہم کھلی آنکھوں سے مطالعہ کریں تو ہم یہ پائیں گے کہ اپنے اولین دور میں اسلام کی فتح کی وجہ اس کی انسان کی فہم، دانش اور عقل عام سے اپیل ہے۔
>
> تحریک پاکستان، جس کی کوئی نظیر جدید مسلم تاریخ میں موجود نہیں ہے، ایک نئے اسلامی ارتقا کا نقطہ آغاز ہو سکتی ہے۔ اگر مسلمان یہ محسوس کریں اور جب پاکستان حاصل ہو جائے تب بھی محسوس کرتے رہیں کہ اس تحریک کا حقیقی تاریخی جواز اس بات میں نہیں ہے کہ ہم اس ملک کے دوسرے باشندوں سے لباس، گفتگو یا سلام کرنے کے طریقے میں مختلف ہیں، یا دوسری آبادیوں سے جو ہماری شکایات ہیں، اس میں، یا ان لوگوں

Marfat.com

کے لیے جو محض عادتاً اپنے کو مسلمان کہتے ہیں، زیادہ معاشی مواقع اور ترقی کے امکانات حاصل کریں، بلکہ ایک سچا اسلامی معاشرہ قائم کرنے میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کے احکامات کو عملی زندگی میں نافذ کرنا۔'' (ص ۸۶۳-۸۶۵)

پھر مئی ۱۹۴۷ء میں جب قیام پاکستان کے امکانات افق پر روشن ہو گئے تھے، قائداعظم اور لیاقت علی خاں کی تقریروں اور دعووں کا حوالہ دینے کے ساتھ کس دل سوزی سے پاکستان کی انفرادیت (uniqueness) کو بیان کرتے ہیں:

''جہاں تک مسلمان عوام کا تعلق ہے، تحریک پاکستان ان کے اس وجدان کا حصہ ہے کہ وہ ایک نظریاتی برادری ہیں، اس لیے ایک خود مختار سیاسی وجود کا حق رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ محسوس کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ان کی برادری کا وجود دوسری برادریوں کی طرح کسی نسلی وابستگی یا کچھ ثقافتی روایات کے اشتراک پر مبنی نہیں ہے، بلکہ صرف اور صرف اس حقیقت پر مبنی ہے کہ وہ اسلام کے نظریہ حیات سے مشترک وابستگی رکھتے ہیں اور یہ کہ انہیں اپنی برادری کے وجود کے لیے جواز ایک سماجی و سیاسی نظام قائم کر کے فراہم کرنا چاہیے جس میں اس نظریہ حیات، یعنی شریعت کا عملی نمونہ دیکھا جا سکے گا۔'' (ص ۹۱۲)

پھر دیکھئے کہ کس فکری دیانت اور جذبہ ایمانی کے ساتھ اپنے دل کو چیر کر ملت اسلامیہ پاکستان اور اس کی قیادت کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ پہلے ان کو مغرب کے تجربات سے متنبہ کرتے ہیں کہ تمہیں آزادی ملنے والی ہے، مگر دیکھو محض غیر مسلموں کے اعتراضات اور نفع عاجلہ کے چکر میں نہ پڑ جانا بلکہ اپنے اصل مقصد پر قائم رہنا۔ اس غلط فہمی میں بھی نہ رہنا کہ اسلام تو طویل عرصے کا ہدف ہے اور فوری طور پر وہ کرنے کے چکر میں پڑ جاؤ جو وقتی مصلحت کا تقاضا ہو۔ کہتے ہیں:

''ہم یہ نہیں چاہتے۔ ہم پاکستان کے ذریعے اسلام کو صرف اپنی زندگیوں میں ایک حقیقت بنانا چاہتے ہیں۔ ہم اس لیے پاکستان چاہتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک اس قابل ہو کہ لفظ کے وسیع ترین مفہوم میں ایک سچی اسلامی زندگی بسر کر سکے اور یہ بالکل ناممکن ہے کہ کوئی شخص اللہ کے رسول کی بتائی ہوئی اسکیم کے مطابق زندگی گزار سکے، جب تک کہ پورا معاشرہ شعوری طور پر اس کے مطابق نہ ہو اور اسلام کے قانون کو ملک کا قانون نہ بنائے۔'' (ص ۹۱۸)

ایک جملے میں محمد اسد نے پوری تحریک۔ پاکستان کا جوہر اور ہدف یوں بیان کر دیا جو مئی ۱۹۴۷ء میں ان کے اس مضمون کے آخری پیراگراف کا حصہ ہے:

Marfat.com

''مسلمان عوام وجدانی طور پر پاکستان کی اسلامی اہمیت کومحسوس کرتے ہیں اور واقعی ایسے حالات کی خواہش رکھتے ہیں جن میں معاشرے کے ارتقا کا نقطہ آغاز لا الہ الا اللہ ہو۔'' (ص ۹۲۵)

افسوس کہ پاکستان کی سیاسی قیادتوں نے اس اصل منزل کو مفاد پرستی اور وقتی مصلحتوں کی تلاش میں گم کر دیا۔محمد اسد کو اس کا بے پناہ قلق تھا۔

دو منفرد پہلو

محمد اسد کی زندگی کے دو پہلو ایسے ہیں جن کا اعتراف نہ کرنا بڑا ظلم ہوگا اور ان مین سے کم از کم ایک میں' مجھے وہ دور حاضر میں منفرد نظر آتے ہیں۔ میں نے سیکڑوں نومسلموں کے حالات زندگی کا مطالعہ کیا ہے اور ایک بڑی تعداد سے ذاتی طور پر تعلقات رکھنے کی سعادت پائی ہے۔

نوجوانی میں ایک کتاب ابراہیم باوانی مرحوم کی دعوت پر Islam Our Choice کے عنوان سے مرتب بھی کی تھی اور اس کے لیے بھی بڑی تعداد میں قبول اسلام کی سچی داستانوں کو پڑھا تھا۔ستاروں کی اس کہکشاں میں ایک سے ایک دل نواز شخصیت کی تصویر حیات دیکھی جا سکتی ہے اور ہر ہر فرد اسلام کی کسی نہ کسی خوبی کا فریفتہ ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوا۔زیادہ کا تعلق اسلام کی تعلیمات اور قرآن کے دل فریب پیغام سے ہے،لیکن محمد اسد کی ایک ذات ایسی ہے جو مسلمانوں سے مسحور ہو کر اسلام کی متلاشی اور پھر اس کی گرویدہ ہوئی۔

دل پر پہلی ہی چوٹ اس وقت لگی جب ۲۳ سالہ جرمن نوجوان عرب دنیا میں ٹرین میں سفر کرتا ہے اور کھانے کے وقت اس کا عرب ہم سفر اس اجنبی کو جانے بغیر اسے کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دیتا ہے۔خود پسند اور اپنی ذات کے خول میں گم مغربی دنیا کے اس نوجوان کے لیے یہ بڑا عجیب تجربہ تھا۔پھر جس سے بھی وہ ملتا ہے،جس بستی میں جاتا ہے،جس جگہ قیام کرتا ہے،اسے ایک دوسری ہی قسم کی مخلوق ملتی ہے جن کے باہمی تعلقات، بھائی چارے،محبت اور دکھ درد میں شرکت پر مبنی ہیں۔عجیب معاشرہ ہے جو مسافر کی قدر کرتا ہے اور مہمان داری کو سعادت سمجھتا ہے۔جو کھانا کھلا کر بل پیش نہیں کرتا۔

لیو پولڈ ویز کو یہ تجربہ بڑا عجیب لگتا ہے مگر اس کی روح اس دنیا میں بڑا سکون اور بڑی اپنائیت پاتی ہے۔ روح کی پیاس کے لیے یہاں سیرابی کا بڑا سامان ہے۔یہ کلچر اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور وہ اس جستجو میں لگ جاتا ہے کہ انسانی معاشرے کے اس ماڈل کو بنانے والے عناصر کیا ہیں-- یہ اسے اسلام اور اس کے حیات بخش پیغام تک لے آتے ہیں۔تین سال کی صحرانوردی میں وہ اس تہذیب سے دور ہوتا جاتا ہے جہاں اس نے آنکھ کھولی تھی اور اب اس کی آنکھوں کو وہ دنیا بھا جاتی ہے جس میں اب وہ زندگی گزار رہا ہے۔پھر اسلام،جیسا کہ اس نے ایک جگہ لکھا ہے،اس کے دل میں بس ایک چور کی طرح خاموشی سے داخل ہو جاتا اور پھر اس دل کو اپنا گھر بنا لیتا ہے۔چور کی تمثیل یہاں ختم ہو

Marfat.com

جاتی ہے۔ چور چپکے چپکے داخل ہوتا ہے مگر کچھ لے کر چپکے چپکے نکل جاتا ہے۔ اسلام داخل تو چپکے چپکے ہی ہوتا ہے لیکن کچھ لینے کے لیے نہیں، کچھ دینے کے لیے اور پھر ہمیشہ اسی گھر میں رہنے کے لیے۔

لیوپولڈ ویز ایک طلسمی عمل کے ذریعے اسی دنیا کا ہو جاتا ہے جس کی خبر دوسروں کو دینے کے لیے صحافی کے لباس میں وہ ان کے درمیان آیا تھا۔ اب یہاں اس نے نہ ختم ہونے والی دوستیاں استوار کر لی ہیں۔ اب یہاں اس نے اس معاشرے کی ان اقدار کو جو اس کے لیے پہلے بالکل نئی تھیں، اپنی شخصیت کا حصہ بنالیا ہے۔ اب اس کے دل کی دنیا میں ایک انقلاب آ گیا ہے اور بالآخر وہ چیز جو غیر شعوری طور پر اس کے روح و بدن میں داخل ہوگئی تھی، وہ اسے شعوری طور پر قبول کر لیتا ہے اور کلمۂ شہادت ادا کر کے اس کا پوری دنیا کے سامنے اعلان کر ڈالتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں انسان اسلام کے راستے مسلمانوں میں داخل ہوئے۔ محمد اسد مسلم دنیا کے بیسویں صدی کے گئے گزرے حال میں بھی مسلمانوں کے ذریعے اسلام تک پہنچا اور پھر اسلام کو اس نے اس طرح اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا کہ مسلمانوں ہی کی حالت کی اصلاح کے لیے دل گرفتہ اور سرگرم عمل ہو گیا۔ تبدیلی (conversion) یا رجوع (reversion) کی تاریخ کا یہ بڑا دل چسپ اور سبق آموز واقعہ ہے۔

محمد اسد کی زندگی کا دوسرا پہلو جس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا، وہ یہ ہے کہ اسد نے صرف اسلام ہی کو قبول نہیں کیا بلکہ عملاً اس نے اسلامی دنیا ہی کو اپنا مسکن بنالیا۔ اس نے مغرب سے دین کا ناطہ ہی نہیں توڑا بلکہ جغرافیائی سفر کر کے وہ پھر اس دنیا کا حصہ ہی بن گیا جس نے اسے مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچا۔ وہ امریکہ اور یورپ میں بھی رہا لیکن اس کی روح کو سکون بدوؤں (bedouins) کی دنیا ہی میں ملتا ہے۔ اس کی آخری شریک حیات پولا اسد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اسد کی روح بدوی (bedouin) تھی اور صحرا کی دنیا میں وہ سب سے زیادہ اپنے گھر کی طرح ہوتا تھا۔ اس نے صحیح معنوں میں ہجرت کی اور اپنی اسلامی زندگی کے ۶۶ سال عرب دنیا، ہندوستان، پاکستان اور تیونس میں گزارے اور آخری ایام میں اس کا قیام اسپین کے اس علاقے میں رہا جو اندلس اور عرب دنیا کا روحانی اور ثقافتی حصہ تھا بلکہ آج بھی اس کی فضائیں باقی اسپین سے مختلف اور عرب دنیا کے ہم ساز ہیں۔

محمد اسد یورپ کا اسلام کے لیے تحفہ، محمد اسد کی زندگی، اس کے افکار و نظریات، اس کے اثرات اور تاریخی خدمات کا ایک جامع مرقع ہے۔ پہلی جلد میں اسد کی شخصیت، افکار اور علمی اور ثقافتی خدمات کے بارے میں ۲۸ مضامین ہیں جن میں علمی اور تحقیقی مقالات کے ساتھ شخصی تاثرات اور اسد کی کتابوں پر تنقیدی نگارشات شامل ہیں جو ان کی زندگی اور ان کے افکار کے ہر ہر پہلو کے بارے میں سیر حاصل معلومات فراہم کرتے ہیں اور ان ایشوز کو زیر بحث لاتے ہیں جن پر اسد نے کلام کیا ہے۔ دوسری جلد کا بیش تر حصہ محمد اسد کے قیمتی مضامین اور رشحات قلم کا مجموعہ ہے اور اس سارے علمی خزانے کو ایک جگہ جمع کر کے مرتب محترم نے بڑی قیمتی خدمت انجام دی ہے۔ اس طرح ان دو جلدوں میں محمد اسد کی شخصیت اور ان کے افکار اور علمی خدمات کا بھرپور احاطہ کر لیا گیا ہے۔ محترم محمد اکرام چغتائی صاحب نے یہ خدمت بڑی محنت اور دقت نظر سے انجام دی ہے اور تلاش و جستجو اور تحقیق و تسوید کا بڑا اعلیٰ معیار قائم کیا

Marfat.com

ہے۔طباعت کا معیار بھی نہایت نفیس ہے اور سارا کام بڑی خوش ذوقی سے انجام دیا گیا ہے۔جیسا کہ میں نے عرض کیا پوری امت کی طرف سے دی ٹروتھ سوسائٹی اور صاحب کتاب نے یہ فرض کفایہ ادا کیا ہے اور اسی کتاب کے ایک مقالہ نگار مظفر اقبال کا یہ گلہ کہ اسد ایک فراموش شدہ (forgotten) پاکستانی ہے،اب کسی نہ کسی حد تک دور ہو گیا ہے۔اس خدمت کے لیے محمد اکرام چغتائی صاحب اور ان کے رفقائے کار مبارک باد کے مستحق ہیں۔

(در: ترجمان القرآن، اگست ۲۰۰۶ء،ص ۶۱-۷۱)

☆ Muhammad Asad (Leopold Weiss): Europe's Gift to Islam. Edited annotated and written by M. Ikram Chaghatai. 2 vols., Lahore: The Truth Society/Sang-e-Meel Publications, 2006.

Marfat.com

ڈاکٹر تحسین فراقی

اسد کا قصہ طولانی ہے لیکن مختصر یہ ہے

(چند تاثرات محمد لیوپولڈ اسد کے سلسلے میں)

معاصر عالمی منظرنامے پر صرف ایک اچٹتی، سرسری سی نگاہ ڈالیے، اندازہ ہو جائے گا کہ موجودہ نسل انسانی کس آتش بار جہنم زار میں زندہ ہے۔ بظاہر یہ زمینی سیارہ ان گنت انسانوں کا ایک بھراپُرا خانوادہ ہے مگر معیاری سطح پر کس قدر نامطمئن، ناآسودہ، مضطرب اور دل ریش ہے۔ فسادِ فکر و نظر نے ہر جگہ ایک قیامت اٹھا رکھی ہے اور ظھر الفساد فی البر و البحر کی دل شکن اور اعصاب سوز صورتِ حال نے حال کو بے حال اور انسانی مستقبل پر ایک مستقل اور بڑا سوالیہ نشان قائم کر دیا ہے۔

اس دردناک صورتحال میں ملت اسلامی کی حالت اور دگرگوں ہے۔ ستاون مسلم ممالک کی ایک ارب سے زیادہ آبادی ریت کے بے ثبات ٹیلوں کی طرح ہے جس کو مغربی افکار و استعمار کی سفاک آندھی ریزہ ریزہ، ذرہ ذرہ فضا میں بکھیر رہی ہے۔ شخصی مسلم حکومتیں اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے مغربی اور امریکی استعمار سے گٹھ جوڑ کیے ہوئے ہیں۔ عوام اور حکام میں فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ مجھے ''ارمغان حجاز'' کی ایک دوبیتی بار بار یاد آتی ہے۔ یہ دوبیتی کیا ہے، عالم اسلام کی بے بسی کی ایک جیتی جاگتی تفسیر ہے:

مسلماں فاقہ مست و ژندہ پوش است ز کارش جبرئیل اندر خروش است
بیا نقش دگر ملت بہ ریزیم کہ ایں ملت جہاں را بار دوش است!

پھر معاً مجھے سورۂ محمد کی آخری آیت کا صاف اور کھرا انتباہ سنائی دیتا ہے: وَ اِن تَتَوَلَّوا یَستَبدِل قَوماً غَیرَکُم: ''اور اگر تم روگردانی کرو گے تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا۔'' ہمیں گوش ہوش سے سننا چاہیے کہ ملت اسلامی کا بے مثل مفکر موجودہ ملت اسلامیہ کو اس دھرتی کا بوجھ کہہ رہا ہے اور اس کی جگہ ایک نئی ملت کے نقش تازہ کی طرح ڈال دینا چاہتا ہے، عین قرآنی روح کے مطابق۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

دوسری جانب مغربی اور بالخصوص امریکی استعمار کا دیو استبداد مسلم ممالک میں نئی نئی فتنہ پردازیوں کا بیج بو کر

Marfat.com

انہیں بے بس اور لاچار کر کے ہڑپ کرتا جا رہا ہے۔ بظاہر جمہوریت کا علم بردار ہے مگر شخصی حکومتوں کو اپنے لیے زیادہ مفید مطلب سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے سفید کاندھوں پر غریب وغیر مہذب' رنگ دار مشرقی ممالک کا بوجھ لے رکھا ہے' جسے ایک عرصے سے "White man's burden" کہا جاتا رہا ہے۔ ٹائن بی اور برنارڈ لوئس سے لے کر فرانسس فوکویاما اور ہنٹنگٹن تک' سارے مغربی دانشور مغربی تہذیب کو نوع انسانی کی فکر کی معراج اور آخری منزل قرار دے رہے ہیں۔ مغرب کے دوہرے معیاروں کا یہ عالم ہے کہ مسلمانوں کے قبلہ اول کی مسجد کو آگ لگا دینا جائز مگر بامیان کے بدھ کے مجسمے کو منہدم کرنے کی کوشش ایک جرم عظیم! یہ کیسے بے انصاف اور بے ضمیر ہاتھ ہیں جو انڈونیشیا سے تی مور کو چھین کر اسے آزادی کا تاج پہناتے ہیں مگر فلسطین کے مسلمانوں کو آزادی سے محروم کر کے ان کے وطن میں صیہونی درندوں کو آباد کرتے ہیں اور ان کو ایٹمی اور کیمیائی اسلحے سے لیس کرتے ہیں۔ یہ وہی مغرب ہے جس نے صلیبی جنگوں کا آغاز کر کے اس بات پر فخر کا اظہار کیا تھا کہ ایک لڑائی میں مسلمانوں کے قتل عام کے نتیجے میں ان کے خون کے سیل رواں میں ان صلیبیوں کے گھوڑے گھٹنے گھٹنے ڈوب گئے تھے' اور جو آج بھی افغانستان' عراق اور لبنان کے نہتے شہریوں پر بم برسا کر انسانیت کا خون کر رہا ہے۔ ان کا ٹرومین کس قدر جھوٹا اور سفاک ہے کہ دو دنوں میں پانچ لاکھ افراد کو موت کی نیند سلا دیتا ہے' اور اب چھپن برس بعد ٹرومین کے وارثوں نے اس قدر ایٹم بم ذخیرہ کر لیے ہیں کہ وہ ان سے اس دنیا کو چالیس پچاس بار تباہ کر سکتے ہیں۔ ہاں! کسی مسلم ملک کے پُرامن ایٹمی تجربوں پر یہ بڑے مضطرب اور بے چین ہو جاتے ہیں۔ یہ دہشت گردی کی جنگ لڑ رہے ہیں مگر خود سب سے بڑے دہشت گرد ہیں۔ کاش! ہمارے یہاں کوئی نوم چومسکی ہوتا۔

قیامت کی اس صورت حال میں نوع انسانی کا بالعموم اور ملت اسلامیہ کا بالخصوص مستقبل کیا ہے اور مسلم ملت کے زوال وادبار کے اسباب کیا ہیں؟ اس کا ایک فکر افروز اور شافی تجزیہ اس مرد عظیم وفہیم نے فراہم کیا جس کو مراد ہوفمین نے ''اسلام کے لیے یورپ کا ارمغان'' قرار دیا تھا: **محمد اسد۔**

تھی جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی

محمد اسد (۱۹۰۰ء-۱۹۹۲ء) ان عظیم دانشوروں میں تھے جن پر ملت اسلامیہ اور بالخصوص پاکستان کی ملت فخر کر سکتی ہے۔ اگر ملت اسلامیہ کے محسنین کی ایک فہرست بنائی جائے تو اس میں اسد کا نام بھی یقیناً طلائی حرفوں میں لکھا جائے گا۔ ان کی پہلی باقاعدہ کتاب Islam at the Crossroads سے آغاز کر کے، The Road to Mecca سے ہوتے ہوئے The Principles of State & Govt. in Islam تک اور وہاں سے The Message of the Quran اور This Law of Ours & other Essays تک آ جائیے' ہر جگہ آپ کی ملاقات ایک ایسے سچے عاشق اسلام سے ہوگی جو دین حقہ کو ملت اسلامیہ ہی کی نہیں' پوری نوع انسانی کی نجات کا باعث سمجھتا ہے۔

محمد اسد کا اعتماد لائق داد اور ان کے تجزیے کی صلاحیت غیر معمولی تھی۔ اسلام پر ان کی پہلی کتاب چونتیس

Marfat.com

سال کی عمر میں لکھی گئی مگر یہ کتاب اسلام پر ان کے گہرے ایقان' اعتماد اور سنت نبویؐ سے ان کے عشق کی لازوال کہانی بیان کرتی ہے اور مسلم نشاۃ ثانیہ کی آرزو سے لبریز ہے۔ چونتیس سال کے اس نوجوان کی آرزومندی ملاحظہ فرمائیے' وہ کہہ رہا تھا:

"Islam as a spiritual and social phenomenon, is still, inspite of all the drawbacks, caused by the deficiencies of the Muslims, by far the greatest driving force mankind has ever experienced; and all my interest became, since then, centred around the problem of its regeneration." (p. 6)

محمد اسد کی تمام تحریروں کے تار و پود میں ایک ایسی چمک ہے جسے حکیمانہ بصیرت کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا۔ نفسیاتی امور کے گہرے فہم' عمیق مشاہدۂ فطرت' مذاہب عالم کے وسیع مطالعے' متعدد عمرانی تصورات پر گہری نگاہ' عربی اور کئی مغربی زبانوں پر قدرت' مشرق و مغرب کی سیر و سیاحت اور زندگی کے حرکی تصور کے ساتھ ساتھ ایمان و ایقان کے عطا کردہ توازن اور تجزیے اور بیان کی غیر معمولی صلاحیت نے ان کی تحریروں کو ملت اسلامیہ اور بالخصوص اس کی نئی نسل کے لیے ایک چراغ ہدایت کا درجہ دے دیا ہے۔ ان کی ''روڈ ٹو مکہ'' دل میں اترتے چلے جانے والے اسلوب میں ایک عجیب سپردگی کے عالم میں لکھی گئی ایک روحانی داستان ہے۔ یہ کتاب بھٹکے ہوئے بے جہت اور گرفتارِ تشکیک انسانوں کے لیے سکینت کا سامان فراہم کرتی ہے۔ نہایت گہرے مشاہدے اور لطیف جزئیات کی بُنت اس سیاحت نامۂ روح میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ ہرات سے کابل جاتے ہوئے اسد ایک قصبے ''دہ زنگی'' کے حاکم سے ملاقات کر کے اسلام کی عظمت رفتہ پر اس اعتماد سے اور اتنے ایقان انگیز لہجے میں گفتگو کرتے ہیں کہ دہ زنگی کا حاکم انہیں ''مسلمان'' کہتا ہے' درآنحالیکہ اس وقت تک اسد مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ یہ سلامتی فطرت اسد کو ابتدائے عمر ہی میں نصیب ہوگئی تھی۔

اسد کا قلم مغرب کے فسادِ فکر و نظر اور ملت اسلامیہ کے عوارض کا یکساں مہارت سے تجزیہ کرنے پر قادر تھا۔ ان کے نزدیک معاصر مغرب کا عیسوی مذہب سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ معاصر مغرب صرف اور صرف اپنی اس خارجی مادی دنیا کو اہمیت دیتا ہے اور اسی کو بنانے سنوارنے میں لگا ہے۔ وہ لذات دنیا کو ایک لالچی اور حریص انسان کی طرح ہڑپ کرنے میں جُتا ہے۔ اسد کے الفاظ سنیے:

"The modern West......as distinct from Christianity......adores life in exactly the same way as the glutton adores his food he devours it, but has no respect for it."

اس اقتباس سے مجھے سید حسین نصر کے الفاظ یاد آتے ہیں' جن کا مفہوم یہ ہے کہ قدیم فرد کا فطرت سے

Marfat.com

تعلق، عاشق کے محبوبہ سے تعلق کے مترادف تھا، یعنی رشتہ احترام جبکہ موجودہ مغربی انسان کا فطرت سے وہ تعلق ہے جو گاہک کا طوائف سے ہوتا ہے!

اسد کی رائے میں مغرب، اسلام کو صلیبی جنگوں کی ہزیمت کے تناظر میں دیکھتا ہے، اس لیے غم و غصے اور تعصب کے عالم میں اسلام کی تعلیمات کو مسخ اور پیغمبر اسلام کو Impostor کی صورت میں پیش کرتا رہا ہے اور کر رہا ہے۔ ان کے نزدیک موجودہ اہل یورپ نے عقل اور احساسات کے اس عضوی اتحاد (Organic coherence) کو کھو دیا ہے جو عربی اسلامی روح کا جز ولاینفک ہے۔

انگریزی کی ایک معروف مگر لغو ضرب المثل ہے:"All is fair in Love & War"۔اسلام کا تصور عشق اور تصور حرب اس کی نفی کرتا ہے۔ اسلام کے یہ دونوں تصورات بعض کڑی شرائط سے مشروط ہیں۔ صرف مغرب کے تصور حرب ہی کو لیجئے۔ یہ تصور دشمن کی ہر زندہ اور مرئی شے کو تہس نہس کر دینے کا موید ہے۔ ذرا ''روڈ ٹو مکہ'' کا ایک عبرت ناک اور روح کو لرزا دینے والا منظر دیکھیے۔ یہ وہ واقعہ ہے جب لیبیا کے قریے کفرہ کا سقوط ہوا اور جارح اطالویوں نے وہاں بربریت کا بازار گرم کیا۔ راوی کہتا ہے:

> ''رات بھر میں عورتوں کی آہ و فغاں اور چیخ پکار سنتا رہا جن کو اطالوی اور اریٹیری فوج لوٹ کھسوٹ رہی تھی...... (اگلے) روز اطالوی جرنیل نے، جتنے آدمی گاؤں میں زندہ بچ گئے تھے، سب کو امام سید محمد المہدی کی قبر پر جمع کیا اور ان کے سامنے قرآن مجید پھاڑ کر اپنے جوتوں سے روندا اور چیخ کر کہا: اب اپنے بدو نبی کو بلاؤ! اگر اس میں کچھ طاقت ہے تو تمہاری مدد کرے۔ پھر اس نے نخلستان کے تمام درختوں کو کاٹ دینے کا حکم دیا اور کنوؤں کو تباہ و برباد کروا دیا۔ سید احمد بدوی کے کتب خانے میں جتنی کتابیں تھیں، وہ سب جلوا دیں۔ دوسرے روز اس نے حکم دیا کہ تمام علما و مشائخ کو ہوائی جہاز پر لے جا کر بہت بلندی سے نیچے پھینک دیا جائے۔ رات بھر عورتوں کی چیخیں اور فریادیں اور فوجیوں کے قہقہے اور بندوقوں کی سنسناہٹ سنتا رہا۔''

قیاس فرما لیجیے کہ سقوط غرناطہ اور اسکندریہ کے کتب خانے کی آتش زنی سے لے کر کفرہ اور قانہ پر اندھی بمباری تک اور ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی سے لے کر کابل و بغداد کے سقوط تک اور کوسوو سے گوانتانا موتک ایک ہی کہانی ہے۔ وحشت، بربریت، سفاکی اور مغربی خون آشامی کی۔

جہاں تک مسلم ملت کے زوال و ادبار کا تعلق ہے، محمد اسد کے نزدیک اس کا سادہ سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ملت نے قرآن اور سنت سے ناتا توڑ لیا اور اسلام کی اصل روح بے رس تعبیرات اور حد سے بڑھی ہوئی فقہی موشگافیوں کے بوجھ تلے دب گئی، تاہم مغربی دانش وروں اور ان کے کم نظر مشرقی مقلدوں کے برعکس اسد کا اقبال ہی کی طرح ایقان تھا کہ نہ صرف مسلم ملت دوبارہ حیات تازہ سے ہم کنار ہو سکتی ہے بلکہ پوری دنیا کو فکری رہنمائی مہیا کر

Marfat.com

ذخیرہ محمد و بلقیس

سکتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور پاکستان سے محمد اسد کا تعلق کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔اقبال کے مشورے ہی سے محمد اسد نے پاکستان کو اپنی اسلامی فکر کی تشکیل نو کی جولاں گاہ بنایا اور اس کے لیے متعدد خدمات انجام دیں۔ان کی کتاب The Principles of State & Govt. in Islam اس ضمن میں ان کی فکری بصیرت اور فلسفہ قانون اسلام سے ان کی گہری آ گہی کی خبر دیتی ہے۔

دی ٹروتھ سوسائٹی اور ممتاز محقق محمد اکرام چغتائی مبارک باد کے حق دار ہیں کہ انہوں نے Muhammad Asad--Europe's Gift to Islam کے زیر عنوان دو ضخیم جلدوں میں اسد کی حیات و آ ثار اور ان کی منتخب تحریروں کا ایک اعلیٰ گلدستہ فراہم کر دیا ہے۔پہلی جلد میں مراد ہوفمان' خالد احمد' مظفر اقبال' اسماعیل ابراہیم نواب اور خود محمد اکرام چغتائی کی تحریریں خصوصیت سے لائق ذکر ہیں۔دوسری جلد میں محمد اسد کے مشہور مجلّے ''عرفات'' اور ان کی کتب کے مضامین کا ایک عمدہ انتخاب شامل کیا گیا ہے۔چغتائی صاحب نے بہت سلیقے اور ریاضت سے ان مضامین کو جمع کر کے ایک ایسی علمی خدمت انجام دی ہے جو نہ صرف اسد شناسی میں سنگ میل ثابت ہو گی بلکہ خود ملت اسلامیہ اور ملت پاکستانیہ کے افراد کے لیے بھی مشعل راہ بنے گی۔اسد پر جمع کیے گئے تنقیدی مضامین کی خوبی یہ ہے کہ یہ اسد کی تحریروں کا عمدہ اور بے لاگ تجزیہ فراہم کرتے ہیں' کتاب المناقب نہیں بنتے۔

پاکستان کی فکری رہنمائی کے باب میں اسد کی خدمات بڑی قابل قدر ہیں۔وہ پاکستان کو قرآن وسنت کے احکام پر مبنی ایک جدید اسلامی ریاست کے روپ میں دیکھنے کے متمنی تھے مگر پاکستان کی موجودہ عمرانی صورت حال کو دیکھیں تو یہ اسد کے مسلم تصور ریاست کی نفی کے مترادف اور ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔جس ملک میں جشن بہاراں کے نام پر ہر سال قاتل ڈور سے کئی معصوم بچوں کے حلقوم کٹ جاتے ہوں' جہاں ہر سال یوم آزادی کے نام پر نوجوانوں کو یک چرخہ موٹر سائیکلنگ' ہنگامہ آرائی اور اس کھیل میں موت کی بھینٹ چڑھ جانے کی مکمل چھوٹ ہو' جہاں معاشی فقر و فاقہ کے نتیجے میں خودکشیوں کا تناسب تشویش ناک حدود کو چھو رہا ہو' جہاں علمی ادارے تیزی سے زوال پذیر ہوں' جہاں امن و امان اور انصاف کا قحط ہو اور دیگر کئی معاشرتی مفاسد روز افزوں ہوں' وہاں میاں اسد اور ان کی تحریروں کو کون پوچھے گا؟ تاہم اس افسوس ناک صورت حال سے قطع نظر کرتے ہوئے میں حکومت پاکستان کے ارباب بست و کشاد سے عرض گزار ہوں کہ محمد اسد کی متعدد علمی' فکری اور عملی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے پاکستان کی کسی یونیورسٹی میں ''محمد اسد چیئر'' قائم کرنے کا اہتمام کرے' جہاں قانون اسلامی کے دو اہم ترین منابع: قرآن اور حدیث کی تعلیم اور عربی منابع قانون پر تدریس کا اہتمام کرے۔علاوہ ازیں تمام لاء کالجوں میں عربی زبان کی تدریس لازمی قرار دے' کسی شاہراہ کو ان کے نام سے منسوب کرے۔علاوہ ازیں اس امر کا اہتمام بھی کیا جائے کہ پاکستان میں اسد کی کتب کی اشاعت کا کام وسیع پیمانے پر ہو سکے۔

میں جانتا ہوں کہ اسد کی بعض تفسیری تعبیرات سے جائز اختلاف کیا گیا ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ صرف اسد کے باب ہی میں حقیقت ہے۔ہر اہم لکھنے والے کی تحریریں' مباحث اور اختلاف نظر کے در وا کرتی ہیں۔نبی اکرمؐ

Marfat.com

نے اپنے علمائے امت کے اختلاف کو رحمت فرمایا ہے۔ اسد کی تحریریں بھی بحیثیت مجموعی بڑی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ یہ سرمایہ صرف اہل مغرب کے سامنے اسلام کی عظمتوں کو نہایت اعتماد سے روشن کرتا ہے بلکہ ملت اسلامیہ کے افراد کے فکری سفر کے لیے بھی ایک وسیع شاہراہ کھولنے کا اہتمام کرتا ہے۔ محمد اکرام چغتائی ہمارے شکریے اور سپاس کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اسد کی تحریروں کا ضخیم انتخاب شائع کر کے پاکستان کی موجودہ مضمحل فکریات کے جامد تالاب میں ارتعاش پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

(یہ مضمون مرتب کی اسد پر انگریزی کتاب (دو جلد) کی تقریب رونمائی زیر اہتمام اقبال اکادمی پاکستان لاہور، منعقدہ ۱۸-اگست ۲۰۰۶ء میں پڑھا گیا)

Marfat.com

فہرست

اردو مطبوعات

افکار پریشاں	ایم۔آر۔کیانی	200.00
ایک جج ہنس بھی سکتا ہے شاید!	ایم۔آر۔کیانی	100.00
اک محشر خیال	افتخار احمد عدنی	80.00
غالب شناسی کے کرشمے	افتخار احمد عدنی	200.00
غالب کی فارسی غزلوں سے انتخاب ترجموں کے ساتھ	اردو ترجمہ افتخار احمد عدنی، انگریزی ترجمہ رالف رسل	300.00
اے مرے دشتِ سخن	جمیل الدین عالی	200.00
ارمغان عالی	جمیل الدین عالی	300.00
لاحاصل	جمیل الدین عالی	130.00
غزلیں، دوہے، گیت	جمیل الدین عالی	170.00
جیوے جیوے پاکستان	جمیل الدین عالی	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
بس اک گوشۂ بساط (خاکے، مضامین اور تاثرات)	[illegible]	[illegible]
دوہے	جمیل الدین عالی	250.00
خامہ بگوش کے قلم سے (مجموعہ کالم مشفق خواجہ)	مظفر علی سید (مرتب)	225.00
دبستانِ نظام	ڈاکٹر اسلم فرخی	350.00
نظام رنگ	ڈاکٹر اسلم فرخی	100.00
فرید و فردِ فرید	ڈاکٹر اسلم فرخی	100.00
صاحب جی سلطان جی	ڈاکٹر اسلم فرخی	100.00
سات سمندر پار	اختر ریاض الدین احمد	150.00
دھنک پر قدم	اختر ریاض الدین احمد	120.00
پھول کی زبانی	نجمہ انوار الحق	80.00
ابن خلدون اور جدید [illegible] نظریات	فہمیدہ [illegible]	120.00
نذرِ خسرو (پہیلیاں، کہہ مکرنیاں اور منتخب اشعار)	ڈاکٹر شان الحق حقی	100.00

تاریخ علوم اسلامیہ (۳ جلدی سیٹ)	فواد محمد سزگین، مترجم شیخ نذیر حسین	800.00
کہاں گئے وہ لوگ	محمد عمر	150.00
سید حسن غزنوی (حیات اور ادبی کارنامے)	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان	250.00
تاریخ مشغلہ	محمد اکرام چغتائی	36.00
پھر (شاعری)	زبیر وحید	100.00
فن مصوری (منتخب مضامین)	مرتبہ: شیما مجید	[illegible]
شیفتہ.....ایک مطالعہ	مرتبہ: شیما مجید	[illegible]
غالب..... نقش [illegible] رنگ رنگ	افتخار احمد عدنی	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

PUBLICATIONS

[illegible]	[illegible]	300.00
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	100.00
[illegible]	[illegible]	175.00
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	300.00
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	60.00

[illegible]-60-11-2

Marfat.com